بسم اللہ الرحمن الرحیم

پندرہ روزہ — لکھنؤ

تعمیر حیات

مجلس صحافت ونشریات دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

جلد نمبر ۳۷ — شمارہ نمبر ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰

۱۰؍۲۵؍ جولائی و ۱۰؍۲۵؍ اگست ۲۰۰۰ء مطابق ۷؍۲۲؍ ربیع الثانی و ۹؍۲۴؍ جمادی الاول ۱۴۲۱ھ

اس دائرہ میں اگر سرخ نشان ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اس شمارہ پر آپ کا چندہ ختم ہو چکا ہے۔ لہٰذا اگر آپ چاہتے ہیں کہ دین وادب کا یہ خادم ندوۃ العلماء کا ترجمان آپ کی خدمت میں پہنچتا رہے تو سالانہ چندہ مبلغ ۱۳۰؍ روپے بذریعہ منی آرڈر دفتر تعمیر حیات کے پتہ پر ارسال فرمائیں

گذارش

خط وکتابت اور منی آرڈر کرتے وقت کوپن (پیغام سلپ) پر خریداری نمبر کے ساتھ مکمل نام و پتہ ضرور لکھیں، خریداری نمبر ہر پتہ کی سلپ پر لکھا رہتا ہے اگر آپ جدید خریدار ہیں تو اس کی صراحت ضرور کریں اس سے دفتری کارروائی میں آسانی اور جلدی ہوتی ہے — منیجر

خط وکتابت کا پتہ

منیجر تعمیر حیات پوسٹ بکس نمبر ۹۳

ندوۃ العلماء لکھنؤ ۲۲۶۰۰۷ یوپی

ڈرافٹ سکریٹری مجلس صحافت ونشریات لکھنؤ کے نام سے بنائیں اور دفتر تعمیر حیات کے پتہ پر روانہ کریں

زر تعاون

سالانہ ——— ۱۳۰؍ روپے

فی شمارہ ——— ۶؍ روپے

بیرونی ممالک فضائی ڈاک ———

ایشیائی، یورپی، افریقی وامریکی ممالک ۳۰ ڈالر

بیرونی ممالک بحری ڈاک ———

بحری ڈاک جملہ ۱۵ ڈالر

پرنٹر پبلشر اطہر حسین نے ہارکیہ آفسٹ میں طبع کرا کے دفتر تعمیر حیات مجلس صحافت ونشریات ندوۃ العلماء لکھنؤ سے شائع کیا۔

حامد

عرضِ مرتب

شمس الحق ندوی

اللہ تعالیٰ کا بڑا کرم و فضل ہے کہ تعمیر حیات اپنے اور اپنے ادارہ کے عظیم سرپرست حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے کام و مقام کے سلسلہ میں مختلف اہل قلم اور اہل دانش کے تاثرات پر مشتمل خصوصی نمبر پیش کرنے کی ذمہ داری پوری کر رہا ہے۔ یہ فیصلہ کہ یہ خصوصی نمبر کس قدر کامیاب اور ذمہ داری کو پورا کرنے والا ہے، ہمارے قارئین کر سکیں گے یہ انسانوں کا کام ہے اور انسانوں کا کام کچھ نہ کچھ نقص کا حامل ہوتا ہے، البتہ ہماری کوشش رہی ہے کہ ایک جامع اور معیاری نمبر نکالنے کا جو فرض تعمیر حیات جیسے مجلہ پر عائد ہوتا ہے وہ فرض بخوبی انجام پالے۔

اس خصوصی نمبر کو بہتر معیار پر تیار کرنے میں مختلف حضرات نے قیمتی تعاون دیا جس کا اجمالی تذکرہ مولانا عبداللہ عباس صاحب ندوی کے اداراتی نوٹ میں آیا ہے۔ میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اس خصوصی توجہ کا تذکرہ کروں جو خود مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس صاحب ندوی نے فرمائی ہے۔ باوجود اپنی صحت کے ضعف کے اداریہ کے علاوہ اپنے اثر خامہ سے نمبر کو زینت بخشی۔ معتمد مال جناب ڈاکٹر وصی احمد صدیقی نے بھی اپنی بلیغ تحریروں سے نوازنے کے ساتھ ساتھ چونکہ اردو فارسی دونوں زبانوں کا ذوق رکھتے ہیں نظموں اور قطعات تاریخ وفات کے انتخاب میں پورا تعاون دیا۔ محترم ناظم صاحب ندوۃ العلما، اور مہتمم صاحب دارالعلوم کے تعاون کا مشکور ہوں، پروفیسر سید محمد اجتبا ندوی اور پروفیسر سید ضیاء الحسن ندوی کے علاوہ جن کے تعاون کا تذکرہ اداراتی نوٹ میں آگیا ہے، ناچیز کی اداری ذمہ داریوں میں خصوصی معاونت کرنے والوں میں خاص طور سے صحیفہ "الرائد" کے ایڈیٹر مولانا سید واضح رشید صاحب ندوی، رسالہ کاروانِ ادب کے رکن مولانا نذرالحفیظ ندوی قابل ذکر ہیں مولانا محمد حمزہ حسنی صاحب ندوی ناظرِ عام ندوۃ العلماء نے جن کو رسالہ "رضوان" نکالنے کا تجربہ ہے مضامین کے دیکھنے میں تعاون دیا۔ عزیز القدر مولوی محمود حسنی ندوی سلمہ نے کئی ہفتہ یہاں قیام کر کے مضامین کی فراہمی اور دوڑ دھوپ میں خاصی محنت کی۔ ان سب حضرات کا ممنون ہوں، دارالعلوم ندوۃ العلما اور ان سب حضرات کی نیک توقعات کے ساتھ یہ خصوصی نمبر قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔ یہ نمبر دوسرے مجلات کے مقابلہ میں تاخیر سے شائع کیا جارہا ہے، اس کو تاخیر سے شائع کرنے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ملک و بیرون ملک کے مجلات مولانا رحمۃ اللہ علیہ پر خصوصی نمبر شائع کر رہے تھے، اور متعدد ادارے سیمینار بھی منعقد کر رہے تھے اس لئے خیال ہوا کہ تعمیر حیات اپنا نمبر ذرا تاخیر سے نکالے تاکہ زیادہ جامع اور مکمل نمبر بن سکے۔ امید ہے کہ ہماری کوشش سودمند ثابت ہوگی۔

خصوصی نمبر کے سلسلے میں ادارہ کو بے شمار مضامین اور نظمیں بلا کسی موضوع کی تعیین کے محض تاثراتی وصول ہوئے ہیں جن میں اکثر تکرار ہے اگر ان تمام مضامین کو شائع کیا جائے تو تعمیر حیات کی ضخامت اتنی بڑھ جائے گی کہ اس کے اخراجات ادارہ کو پورا کرنا دشوار ہوگا، لہٰذا کمیٹی نے ضروری مضامین ہی کو باقی رکھا ہے امید ہے کہ جن حضرات کے مضامین نہیں شائع ہو رہے ہیں، معذرت قبول فرمائیں گے۔ کمیٹی نے بعض ایسے مضامین کو بھی نکال دیا ہے جو کئی جگہ شائع ہو چکے تھے یا کتابچہ کی شکل میں شائع ہوگئے ہیں۔ دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اس حقیر کوشش کو قبول فرمائے اور اس کے نفع کو عام کرے۔ (آمین)

> محفل کون و مکاں میں سحر و شام پھرے
> مئے توحید کو لے کر صفت جام پھرے

فہرست مضامین

حضرت مولاناؒ کی تصنیفات و تالیفات کا تجزیہ ۲۵۵

خاندان اور شخصیت ساز ماحول کے اثرات ۲۸۱

منظوم نذرانہ ہائے عقیدت

اداریہ

میراثِ علم وآگہی

تعمیر حیات کا یہ خصوصی شمارہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی یاد میں مرتب کیا گیا ہے، ہمیں اعتراف ہے کہ یہ پیش کش ناقص ہے اور ہم اپنے مربی ومحسن کا حق ادا کرنے میں کوتاہ ہیں، کوتاہی سے مراد یہ نہیں کہ آپ کی شخصیت کو ہم بڑھا چڑھا کر پیش کرنا چاہتے تھے اور نہ کر سکے، حاشا وکلا منقبت خوانی اور مبالغہ آرائی ہمارا شیوہ نہیں ہے اور نہ ہمارا دین اس کی اجازت دیتا ہے اور یہ بات ہمارے ذوق ومعیار کے بھی خلاف ہے، اپنی کوتاہی کا گلہ ہم اس لئے کر رہے ہیں کہ اپنے مخدوم ومربی کے واقعی اور حقیقی امتیازات کو جس خوبی اور دلآویز انداز میں پیش کرنا چاہتے تھے اس میں ہم کامیاب نہ ہو سکے۔

اللہ کی بندگی، دین سے وفاداری، قرآن کریم سے وابستگی، سنت سے شیفتگی، اسلام کو سربلند دیکھنے کی تڑپ، اور امت اسلامیہ کی آبرو باقی رہنے کی آرزو سے جو زندگی عبارت ہے، جس کے لئے اس زندگی کا حامل زندگی بھر روتا اور تڑپتا رہا، راتوں کو اٹھ کر سجدے کرتا اور ناک رگڑتا رہا اور جس کے دن اپنی شخصیت کی تعمیر میں نہیں، اپنے لئے ناموری اور خاندان کی سرفرازی کی جستجو میں نہیں بلکہ صرف اسلام کی سربلندی کے لئے جہد مسلسل میں گذرے ہوں اس کی زندگی کے ایک مرقع کو ہم پیش کرنا چاہتے تھے مگر پیش نہ کر سکے، اگر ایسا کر سکتے تو امت اسلامی کی ایک خدمت ہوتی، موجودہ اور آئندہ نسل کے لئے ایک دستاویز ہوتی، ایک بامقصد زندگی کیسے گذاری جاتی ہے، ایک روح کس طرح دین کے لئے بے قرار رہتی ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے مخلص بندوں کو ان کی بے سروسامانی کے باوجود کس طرح نوازتا ہے، اور کس طرح مقبولیت ومحبت کا تاج اس کے سر پر رکھتا ہے؟

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ۔ اللہ ان کی روح کو ہمیشہ شاداں رکھے۔ اس کے محتاج نہیں ہیں کہ دوسروں کی شہادتوں اور ثنا خوانیوں سے ان کے قد کو ناپا اور شخصیت کو تولا جائے، اگرچہ ہم خاک نشیں اسی کو معیار سمجھتے ہیں اور بار بار انھیں باتوں کو دہرایا کرتے ہیں لیکن راقم کی آرزو تھی کہ حضرت مرحوم کے امتیازی کارناموں پر زیادہ گفتگو کی جائے جن میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو انفرادیت بخشی تھی، مثال کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ حضرت مولانا کو "اہل دل" اور "خاصان خدا" کی سوانح نویسی کا خاص ذوق تھا، آپ نے اپنی تصنیفی زندگی کا آغاز حضرت سید احمد شہیدؒ کی سوانح نگاری سے کیا، تاریخ دعوت وعزیمت میں حضرت عمر بن عبد العزیزؒ، حضرت حسن بصریؒ، حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ، خواجہ معین الدین اجمیریؒ، شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ، مولانا جلال الدین رومیؒ کا ذکر کیا، پرانے چراغ کی لو بڑھا کر ان کی روشنی تیز کر دی، اور بعد میں بانی تبلیغی جماعت حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور اپنے شیخ مولانا شاہ عبد القادر رائے پوریؒ اور اپنے مشفق بزرگ حضرت مولانا محمد زکریا مہاجر مدنیؒ کی سوانح حیات تحریر فرمائی، ان سب کتابوں میں قدر مشترک دین کی دعوت ہے اور یہ دکھایا ہے کہ دین سے وابستگی ان بزرگوں کا اصلی جوہر تھا، پڑھنے والا ان شخصیات کا ضرور معترف ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ دین کی عظمت کا سکہ اس کے ذہن وقلب پر بیٹھ جاتا ہے، کشف وکرامات اور محیر العقول واقعات کا ذکر ہوتا تو یہ شخصیات ایک تاریخی اور افسانوی معیار کی سمجھی جاتیں اور ان کی تقلید محال اور ان کے راستہ پر چلنا حوصلہ بشری سے بلند بات ہوتی مگر " وَلَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ " کی تلقین نہیں ہو سکتی، مگر حضرت مولانا نے اسی پہلو کو اجاگر کیا ہے اور سوانح جات کو کردار سازی اور ایمان افروزی کا ذریعہ بنایا ہے، یہ سب کتابیں در اصل دعوت الی اللہ کی مختلف شکلیں ہیں، اہل علم جانتے ہیں کہ آپ کی جد وجہد کا مرکز دعوت دین تھا۔ دین کی دعوت، حکمت وموعظت کی طالب ہے جو ہر زمانہ میں مخاطب

کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہے۔ مخاطب کے علم وعقائد کا لحاظ رکھتے ہوئے ایسی بات کرنا جو اس کی عقل میں اتر جائے اور دل اس کو تسلیم کرے، یہی تمام انبیاء کا دستور رہا ہے' انبیاء کرام نے اپنی دعوتوں میں اس اصول کو ملحوظ رکھا ہے اور ان کی توضیح مولانا نے اپنے محاضرات میں بھی کی تھی، جو دارالعلوم ندوۃ العلماء کے "المعہد العالی للدعوۃ" نے لکچروں کی شکل میں پیش کئے تھے، جس کا ترجمہ "تبلیغ و دعوت کے معجزانہ اسلوب" کے نام سے شائع ہو چکا ہے، خود مولانا نے سیرت نگاری کے ذریعہ سے دعوت دین کا کام لیا ہے اور سچ یہ ہے کہ آپ نے سیرت نویسی کو نیا اسلوب بخشا، نئی طرز فکر دی، اور اس کو مقصد دعوت سے ہم آہنگ کیا، حضرت مولانا نے سیرت نبوی لکھ کر دنیا کے تاریخ دانوں کو ایک نیا رخ دکھلایا جو ان سے پہلے کسی نے سوچا بھی نہیں تھا، نبوت سے پہلے کے حالات جن کو عربی میں "ارھاصات النبوۃ" کہتے ہیں ان میں یہ دکھایا جاتا ہے کہ عرب دنیا کی بدترین قوم تھے، شراب نوشی ان کے اندر عام تھی، جوا، چوری ان کی شکم پروری کا ذریعہ تھا، ایک بات کے لئے چالیس چالیس ...... سال تک جنگ کرنا ان کا شیوہ تھا، ان کے اندر نبی امی پیدا ہوئے جنہوں نے مزاج وافتاد بدل ڈالے، اور ان میں خداترسی اور خداشناسی اور آخرت کا خوف رکھنے والے افراد پیدا ہو گئے۔

لیکن حضرت مولانا نے یہ دکھلایا کہ صرف عرب ہی نہیں بلکہ پوری دنیا ایک ظلمت کدہ تھی، اور ایک ایک ملک کا نام لے کر اور اس کی تسلیم شدہ تاریخی روایات کو سامنے رکھ کر یہ بتایا کہ یہ حال صرف عربوں کا نہیں بلکہ پوری دنیا کا تھا، اور فارس، ہند، چین، افریقی ممالک کا کوئی خطہ ایسا نہیں تھا جہاں شر خیر پر غالب نہ ہوا ور جہاں انسانوں کے حقوق کی پامالی نہ ہو رہی ہو، اور صرف عرب نہیں بلکہ دنیا کا ہر خطہ ان تعلیمات کا محتاج تھا اور جو لوگ ان تعلیمات سے بے بہرہ ہیں وہ آج بھی اس روشنی کے محتاج ہیں، یہ روشنی صرف ایک جگہ سے حاصل ہو سکتی تھی اور آج بھی حاصل ہو سکتی ہے، وہ قرآنی ہدایات اور سیرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود ہے۔

حضرت مولانا کی سیرت کے بہت سے گوشے اس لائق ہیں کہ ان کو اجاگر کیا جائے، اور ان سے تعمیر ملت کا کام لیا جائے، علمی خدمات میں قرآن کریم کا خاص وہبی ذوق، حدیث سے شغف اور اس پر بصیرت احکام واسرار شریعت کا سچا اور گہرا علم اور وہ تمام عناصر جن سے ان کی زندگی نے ایک مثالی کردار عالم اسلام کے سامنے پیش کیا، ضرورت ہے کہ ان کا تجزیہ کیا جائے اور ان سے دین کی خدمت کا کام لیا جائے۔ یہ سوانح نگاری یا منقبت خوانی کا موضوع نہیں ہے بلکہ اس کے لئے ایک مستقل اکیڈمی کی ضرورت ہے جو ریسرچ کرے اور اس کے نتائج سے اہل علم کو باخبر کرے، حضرت مولانا کی زندگی "سردم جواں، ہمیم رواں" اور ترقی پذیر ہے، ایک زمانہ تھا کہ آپ کا تعارف اس حیثیت سے کیا جاتا تھا کہ آپ ندوہ کے تفسیر وادب کے استاذ ہیں۔ ۱۹۴۱ء میں "الندوہ" کا تیسری بار اجرا ہوا تو اس کے مرتبین میں آپ کا نام اسی طرح لکھا جاتا تھا، پھر جب "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" کا پہلا ایڈیشن مصر سے شائع ہوا تو آپ کا تعارف "وکیل ندوۃ العلماء" یعنی نائب معتمد تعلیمات کی حیثیت سے کرایا گیا اور ڈاکٹر احمد الشرباصی نے آپ کے مختصر حالات "اُخی ابوالحسن" کے عنوان سے لکھے تھے، پھر وہ زمانہ بھی ہمارے معاصر اصحاب نے دیکھا جب کہ ندوہ کا تعارف یہ کرایا گیا کہ یہ وہ ادارہ ہے جس کے شیخ ابوالحسن علی ندوی سربراہ ہیں اور لکھنؤ وہ شہر ہے جس میں ندوۃ العلماء واقع ہے اور ڈاکٹر احمد الشرباصی کا انتقال ہوا تو ان کے تعزیتی نوٹ میں ڈاکٹر عدنان وزان وکیل وزارۃ شئون الاسلامیۃ نے لکھا کہ ڈاکٹر احمد الشرباصی کی عظمت کا اندازہ اس سے کیا جائے کہ انھوں نے عالم اسلام کے گل سرسبد شیخ ابوالحسن علی ندوی کی کتاب "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" کے ابتدائی صفحات میں مصنف کا تعارف کرایا تھا۔

بہرحال یہ باب تو بہت طویل ہے اور جیسا کہ شروع میں عرض کیا مجھے یا کسی کو حضرت مولانا مرحوم کے مقام و مرتبہ کو جاننے کے لئے کسی کے اعتراف یا شہادت کی ضرورت نہیں ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ جو علمی وفکری میراث آپ نے چھوڑی ہے اس کا بار اٹھانے والے نوجوان سامنے آئیں اور وہ مسافت جس کا طے کرنا ابھی باقی ہے اس کو طے کرنے کی لگن لوگوں کے دل میں پیدا ہو، حضرت مولانا نے جو میراث چھوڑی ہے اس کا تعلق ان کے خاندان یا ان کے مدرسۂ فکر اور درسگاہوں تک محدود نہیں ہے بلکہ وہ پورے عالم اسلامی کے لئے ایک مینارۂ نور ہے۔ جس کی روشنی صرف قرآن اور حدیث سے قائم ہے۔ مولانا کی آواز آج بھی فضاؤں میں گونج رہی ہے کہ ؎

سالہا گوش جہاں زمزمہ زا خواہد بود
ایں نواہا کہ دریں گنبد گرداں زدہ ام

(شبلی)

ادارتی نوٹ

تعمیر حیات کا یہ شمارہ بہت تاخیر سے آپ کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے، دراصل ہم لوگ یہ فیصلہ نہیں کرسکے تھے کہ کن مضامین کو اس خاص نمبر میں جگہ دی جائے اور کون مضامین کو چھوڑا جائے۔ اگر وہ تمام مضامین جو دوسرے رسالوں اور اخباروں میں آئے ہیں ان کو یکجا کرنا مقصود ہوتا تو اس کے لئے کئی جلدیں درکار تھیں، عربی اور اردو کے علاوہ دوسری زبانوں میں جو مضامین شائع ہوئے اور جو قصائد کہے گئے ان کے ترجمے ایک طویل مدت اور بڑی مشقت کے طالب تھے، اس شمارہ کی ترتیب کے لئے پروفیسر ضیاء الحسن ندوی صاحب (جامعہ ملیہ) اور پروفیسر سید محمد اجتبا ندوی صاحب (دہلی) کی رہنمائی سے فائدہ اٹھایا گیا، اور یہ طے کیا گیا کہ صرف وہ مضامین شائع کئے جائیں جو پہلے نہیں چھپے ہیں اور جن کو کسی رسالہ یا اخبار سے نقل نہیں کیا گیا لیکن ہم اس نہج پر بھی چلنے میں کامیاب نہیں ہوسکے کہ بعض حضرات نے اپنے تحریر کردہ مقالات ہمیں براہ راست بھیج دیئے اور ان کی کتابت کراچکے تو معلوم ہوا کہ یہ مضامین پہلے کسی رسالہ میں شائع ہوچکے ہیں، اس لئے باوجود ایک معیار طے کرلینے کے اس شمارہ میں چند مضامین ایسے بھی ہیں جو پہلے کسی خاص نمبر میں شائع ہوئے ہیں۔ آخری ترتیب اس طریقے پر انجام دی گئی ہے کہ پہلے وہ مقالات ہیں جن کے لکھنے والوں نے حضرت مولاناؒ کی کسی خاص انفرادی خصوصیت پر روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً قرآن، حدیث، فقہ، سیرت پر مولانا کے اسلوب اور طرز فکر کی نمائندگی ہوتی ہے دوسرے باب میں وہ مقالات رکھے گئے ہیں جو تاثراتی انداز یا عقیدت و محبت کی نشاندہی کرتے ہیں، ایک دو مضمون حضرت مولانا کے خاندان اور گھریلو تربیت سے متعلق بھی ہیں جو حضرت کے افراد خاندان نے مرتب کئے ہیں، تصانیف پر علاحدہ علاحدہ مضامین بہت کم ملے اگرچہ ضرورت تھی کہ اس پر جو کچھ لکھا جاچکا ہے اس کے علاوہ مستقل مقالات شائع کئے جائیں۔ اشعار اور نظموں کا انتخاب کرنا ایک دشوار کام تھا اس میں جناب قمر سنبھلی صاحب نے ادارہ کا تعاون کیا جس کے لئے ہم ان کے شکر گزار ہیں، الجمعیۃ، ہدایت، افکار ملی، نئی دنیا اور اس طرح کے متعدد اردو کے رسالوں نے اپنے خاص نمبر نکالے، اور عربی کے رسالوں میں الداعی، (دارالعلوم دیوبند) الصحوۃ الاسلامیہ (دارالعلوم حیدرآباد) البعث الاسلامی اور الرائد (دارالعلوم ندوۃ العلماء) کے مقالات بھی اس لائق تھے کہ ہم ان کو نمایاں کرتے، شائع کرتے، لیکن اس کی نوعیت ایک ڈائجسٹ کی ہوجاتی اس لئے باوجود دلی قدردانی اور لکھنے والوں کے جذبات کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے ہم نے یہی مناسب سمجھا کہ اس شمارہ کو غیر مطبوعہ مقالات سے مزین کیا جائے۔

دینِ حق کا ترجماں

● انور قاسمی

علم و فن کا پاسباں جاتا رہا — دینِ حق کا ترجماں جاتا رہا
نورِ قلبِ دوستاں جاتا رہا — خوش مقال و خوش بیاں جاتا رہا
ندوۃ العلماء کا وہ روحِ رواں — فکر کا اک آسماں جاتا رہا
اب رہوگے کس کی ٹھنڈی چھاؤں میں — فضلِ رب کا سائباں جاتا رہا
بے کسی پہ اپنے نالاں کیوں نہ ہوں — بے کسوں کا مہرباں جاتا رہا
اب سنوگے کس کی باتیں دوستو — واعظِ شیریں زباں جاتا رہا
اپنے سلف کی آخری وہ یادگار — اِس جہاں سے اُس جہاں جاتا رہا
دل سکوں پاتا تھا جس کی ذات سے — وہ مصدرِ امن و اماں جاتا رہا
پھول بوٹے پتیاں ہیں سوگوار — گلستاں کا پاسباں جاتا رہا
جن سے رونق تھی چمن میں چارسو — وہ عندلیبِ بوستاں جاتا رہا
گمرہوں کو جس نے لگایا راہ پر — وہ مردِ حق سوئے جناں جاتا رہا
بوالحسن تنہا سفر پر کیا گئے — علم کا اک کارواں جاتا رہا

اِک جہاں پہ جس کو انورؔ ناز تھا
وہ بلبلِ ہندوستاں جاتا رہا

کون اٹھا ہے آج عالم سے
پارہ پارہ ہے کیوں جگر غم سے
خون روتا ہے کیوں افق سرِ شام
سینہ شق ہے یہ کس کے ماتم سے

کلیدی مقالہ

مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

جامع صفات اور مجددانہ شان

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، ناظم ندوۃ العلماء

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ برصغیر کی ایک ممتاز اور غیر معمولی شخصیت کی حیثیت سے زندگی گزار کر گذشتہ سال کے اختتام پر اس دنیا سے رخصت ہوئے، ان کی وفات پر یہ صدی اختتام کے قریب پہونچی، اس صدی کو برصغیر کی تاریخ میں گذشتہ صدیوں پر یہ امتیاز حاصل رہا کہ اس میں یورپ کے جدید ترقی یافتہ تمدن سے برصغیر کو سابقہ پڑا جس نے اس کی تمدنی و اخلاقی قدروں پر خاصا اثر ڈالا، دوسری طرف غیر ملکی اقتدار کی چیرہ دستیوں اور حق تلفیوں کے ردعمل کے طور پر جذبۂ حریت کو فروغ ہوا، جس سے یہاں انقلاب کی راہ ہموار ہوئی، اور اس کے نتیجہ میں پورا برصغیر اپنے پرانے دور سے نکل کر نئے دور میں داخل ہوا۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت کا نشوونما اور ذہن کی تشکیل ان خاص حالات میں ہوئی اور انھوں نے حالات کو دیکھا اور سمجھا پھر اسلامی نقطۂ نظر سے ان کو دیکھا وہ ایسے حالات کو سمجھنے اور ان میں مثبت و تعمیری رویہ اختیار کرنے کے سلسلہ میں اعلیٰ خاندانی پس منظر رکھتے تھے۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے تاریخ اسلام کے مدوجزر کا اچھا مطالعہ کیا تھا انھوں نے سادہ دل مشرق اور شاطر و ہوشیار مغرب کی کشاکش کو دیکھا اور سمجھا، اور غیر ملکی اقتدار کے دور کے ختم کرنے کی کوششوں کا بھی مشاہدہ کیا، اور ان سے دلچسپی لی، پھر آزادی کا دور شروع ہونے پر انقلاب کے بعد کے مراحل کو بھی دیکھا اور اس کی پیچیدگیوں اور زندگی کی قدروں پر ان کے اثرات دیکھے، پھر ایک عالمِ دین اور ایک حساس دل رکھنے والے دانشور، اور ایک داعیِ حق اور ملتِ اسلامیہ کے دردمند فرزند کی حیثیت سے وقت کے تقاضوں کو سمجھنے اور اعلیٰ قدروں کی حامل زندگی کو استوار کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے علمی میدان میں داخل ہوئے، اور اپنے فکر و عمل سے ۶۵ سال سے زیادہ مدت تک ایک عظیم مفکر، معلم اور مصلح کی ذمہ داری انجام دی، مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی یہ ممتاز و سنجیدہ شخصیت کیسے بنی اس کا جواب خود ان کی شخصیت کی تشکیل میں کارفرما عوامل و اسباب میں ملتا ہے۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی رحمۃ اللہ علیہ ہندوستان کے ممتاز مؤرخ اور علم و ثقافت سے گہری واقفیت رکھنے والے عالمِ دین اور مصنف تھے، اس کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے ایک بڑے دینی و علمی ادارے (ندوۃ العلماء) کے سربراہ بھی تھے، ان کا جب انتقال ہوا تو ان کے ان صاحبزادے کی عمر صرف ۹ سال کی تھی، لہٰذا ان کو اپنے ان کم عمر صاحبزادے کی تعلیم و تربیت کا باقاعدہ موقع نہیں ملا، لیکن ان کے چھوڑے ہوئے اثرات سے اور ان کے سمجھدار و ذمہ دار پسماندگان سے اس کا مداوا ہوا، ان کے بڑے بیٹے مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ جو دینی تعلیم مکمل کر کے عصری تعلیم کے مراحل بھی پورے کر رہے تھے اور ان کی عالی ہمت اور دیندار اہلیہ یعنی مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی والدہ ماجدہ، پھر وہ قیمتی سرمایہ کتب جو اپنے پیچھے چھوڑ گئے تھے جو گھر کے اندر موجود تھا اور جس میں خود ان کی غیر معمولی خصوصیت کی حامل تصنیفات تھیں، ان کے ان نوخیز صاحبزادے کی تربیت کا ایک اچھا ذریعہ بنیں، مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے والد سے ملے ہوئے ذوق مطالعہ کے اثر سے اپنے گھر کے اندر موجود سرمایہ علمی سے آغاز عمر ہی میں اور خاص طور پر اردو ادب اور اخلاق و سیرت کے دائرہ میں خوب استفادہ کیا، پھر فکری و دعوتی مزاج کی تشکیل کے سلسلہ میں ان کے بڑے بھائی نے پوری توجہ کی، وہ قدیم و جدید دونوں علمی راہوں سے گذرے تھے، وہ دینی و علمی درسگاہ سے فضیلت کر کے جدید علوم کی طرف متوجہ ہوئے تھے اور سائنس میں B.Sc. کی امتیازی کامیابی حاصل کر کے (M.B.B.S.) کے کورس کی تکمیل کی تھی، اور اس کے اور میڈیکل پریکٹس کے ذریعہ سماجی زندگی کے معاملات اور اسلامی تقاضوں سے بخوبی واقف ہوئے تھے۔ وہ اسلامی سربلندی کے داعی اور اسلامی قدروں پر پورا اعتماد رکھتے تھے، چنانچہ اپنے نوخیز بھائی کی بہتر تعلیم نیز اخلاقی و دینی تربیت پر انھوں نے اور والدہ صاحبہ نے پوری توجہ صرف کی، والدہ صاحبہ اپنے مؤقر شوہر کے جلد انتقال کر جانے کی وجہ سے اپنی اولاد کو سنوارنے اور بنانے پر ساری توجہ مرکوز رکھنا ضروری سمجھتی تھیں، مولانا رحمۃ اللہ علیہ اپنے گھریلو سرمایۂ علم و ادب کے مطالعہ اور اپنی والدہ اور بھائی کی رہنمائی و تربیت سے آگے بڑھے تو ان کو علم و ادب کے دیگر پہلوؤں

میں کمال پیدا کرنے کے لئے وقت کے مشہور اساتذہ ملے، خاص طور پر حدیث شریف تفسیر قرآن اور ادبِ عربی میں ان کو امتیازی شان پیدا کرنے کے ذرائع حاصل ہوئے، تاریخ کے موضوع میں نمایاں صلاحیت خود اپنے گھر کے سرمایۂ علمی کے ذریعہ اور علمی رجحان اپنے خصوصی ماحول سے حاصل ہوچکا تھا، اس کے ساتھ ساتھ گھر کے دینی ذوق کے اثر سے باطنی اصلاح وتزکیۂ نفس کی طرف میلان ہوا جس کے حصول اور اس میں ترقی کی راہ وقت کے مشہور ومستند بزرگوں کی صحبت واستفادہ کے ذریعہ آسان ہوئی۔

ان تمام اسباب نے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو متعدد ومتنوع کمالات وخصوصیات کا حامل انسان بنادیا، وہ ایک طرف ممتاز مفکر ومصلح، دوسری طرف کامیاب معلم ومربی، اور تیسری طرف بااثر صاحبِ قلم اور صاحبِ اسلوب ادیب بنے۔

تاریخ کے مطالعہ سے مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے قوموں اور ملکوں کے عروج وزوال کے اسباب کو سمجھا، ہندوستان کے غلامانہ دور کی پریشانیوں وپسماندگی کا مشاہدہ کرنے کے ساتھ نئی حاصل ہونے والی آزادی کے بعد کی پیچیدگیوں نیز فرقہ وارانہ وطبقاتی کشمکش کے دلسوز مناظر دیکھ کر ملک وقوم کو بربادی سے بچانے کے جذبہ کے حامل بنے۔ علوم دینیہ میں دستگاہ پیدا ہونے سے مسلمانوں کی فلاح وصلاح کی مفید صورتوں سے آگاہ ہوئے اور اس کے لئے قدیم وجدید وسائل کا مفید اور صالح طریقہ کار اخذ کیا۔

تصنیف وذوقِ ادبی کے ذریعہ ذہنوں کو بیدار کرنے اور ترقی وکامرانی کی صحیح راہ دکھانے کی صلاحیت سے کام لینے کی کوشش کی، اور اپنی زندگی کو مفید اور تربیتی کاموں میں وقف کردیا۔ اس سلسلہ میں مولاناؒ نے دو خاص صفتوں کو حرزِ جان بنایا: ایک تو قوم وملت کی خیر خواہی وخیر طلبی، اور دوسرے زہد وقناعت کے ساتھ حصولِ مقصد کے لئے لگن اور قربانی، اس کے ساتھ ساتھ طبیعت کی نرمی، کریمانہ اخلاق، والہانہ جذبۂ عمل، فہم وفراست اور مقصد کی بلندی جیسی ممتاز صفات مولاناؒ کی خصوصیات بنیں، اپنی انہی صلاحیتوں سے انھوں نے متعدد اہم ترین مسائل حل کئے اور قوم کے دانشوروں اور رہبروں کو متأثر کیا، اور اپنوں اور غیروں کے دلوں میں اپنی جگہ بنائی۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت میں دو نمایاں صفتیں خاص طور پر قابلِ ذکر رہی ہیں، ایک تو ممکنہ حد تک وسعتِ قلبی، دوسری صفت دوسروں کی دل آزاری سے پرہیز، وسعتِ قلبی کا تو یہ حال تھا کہ دین وملت کی تعمیر میں حصہ لینے والے تمام لوگوں کے لئے اپنے دل میں جگہ رکھتے تھے، اور ان کی خوبیوں کا اعتراف کرتے، ان سے ملتے اور اظہارِ قدر کرتے تھے، بشرطیکہ وہ دین وملت کی بنیادی قدروں اور مسلمہ اصولوں کے خلاف کام نہ کر رہے ہوں۔ چنانچہ فقہی مسلک کا اختلاف، مکتبِ فکر کا فرق یا طریقۂ کار کا تنوع مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی نظر میں دوری اور ٹکراؤ کا سبب نہ تھا، بشرطیکہ اس کا کام اصل دین، اور ملت کی تقویت کو نقصان پہونچانے والا نہ ہو، اسی قاعدہ کے بموجب مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے دار العلوم دیوبند، مظاہر علوم سہارنپور، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اور جامعہ سلفیہ بنارس، اسی طرح جمعیت علماء ہند، جماعتِ اسلامی وغیرہ سب کو ان کی تعمیری اور ملی کوششوں اور دینِ حق کی نصرت کے زاویہ سے دیکھا، اور ان کے لئے اظہارِ قدر کیا، ان کے ذمہ داروں سے اخوت وہمدردی کا معاملہ رکھا اور حسبِ ضرورت تعاون کیا۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی دوسری صفت دوسروں کی دل آزاری سے پرہیز رہی ہے، مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی یہ صفت اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ کوئی شخص مولاناؒ کی تحقیر وتنقیص کرتا تو بھی مولاناؒ اس کا جواب نہ دیتے، اور اپنے معاونین ومحبین کو بھی ہدایت کرتے کہ وہ کوئی انتقامی رویہ اختیار نہ کریں، اور ان سے ایسا آدمی ملتا تو وہ اس سے اس بات کی شکایت بھی نہ کرتے، بلکہ شرافتِ نفس کے ساتھ معاملہ کرتے، اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ مولاناؒ کو تنقیص وتحقیر کے رویہ سے تکلیف نہیں ہوتی تھی، وہ حساس طبیعت تھے، ان کو ایسی بات سے تکلیف ضرور ہوتی تھی، لیکن انھوں نے اپنا وطیرہ برداشت اور رواداری کا رکھا، وہ یہ شعر پڑھتے تھے ؎

آسائشِ دوگیتی تفسیر ایں دوحرف است
بادوستاں تلطف، بادشمناں مدارا

دوسروں کا برا چاہنا یا انتقام لینا مولاناؒ کے یہاں بالکل نہ تھا، وہ دوسروں کی عیب جوئی سے بھی دور رہتے تھے، جن کو برا سمجھتے تھے بلاضرورت ان کی برائی کا بھی تذکرہ نہیں کرتے تھے، حتی کہ ان کے خدام کو بعض وقت یہ دھوکا ہوجاتا تھا کہ مولانا اپنے فلاں مخالف کے بارے میں بالکل ناواقف ہیں اور اس سے اس ناواقفیت میں دھوکا کھا سکتے ہیں، لیکن کسی نے توجہ دلائی تو اندازہ ہوا کہ مولانا بے خبر نہیں ہیں لیکن ظاہر نہیں کرتے۔ مولاناؒ کے اس رویہ کے نتیجہ میں ان سے متعدد دوری رکھنے والے ان کا محبت ہی کا رویہ دیکھ کر بالآخر ان سے قریب ہوئے۔

مولاناؒ کی ایک اہم خصوصیت دین وملت کی خدمت ودفاع کا جذبہ تھا، وہ کسی کو بھی دین وملت کو نقصان پہونچاتے دیکھتے یا دین کے مسلّمہ حقائق یا دین کے بنیادی حقوق پر حملہ آور

ہوتا دیکھتے تو اس کا سخت نوٹس لیتے تھے، اور اس میں کسی کی پرواہ نہیں کرتے تھے، اس کی مثالیں ان کے مختلف مضامین اور تصنیفات میں بآسانی دیکھی جاسکتی ہیں، انھوں نے عربوں کے ساتھ عقیدت و محبت کے باوجود عرب قومیت کی مخالفت بلکہ سخت تردید کی، اور ترک قوم کے کارناموں کی وجہ سے ان کی قدر و محبت رکھنے کے باوجود موجودہ ترک حکمرانوں کے الحادی رویہ کی سخت مذمت کی، اور اپنی اسی غیرتِ دینی کے تقاضہ سے حسبِ ضرورت اپنی زبان و قلم کو مؤثر ڈھنگ سے استعمال کیا۔ انھوں نے ہندوستان میں اسلامی ثقافت کو غیر اسلامی ثقافت میں مدغم کرنے کی کوششوں کی کھل کر مخالفت کی، اور اس سلسلہ میں تقریریں کیں اور مضامین لکھے، اور اس ملک میں مسلمانوں کی کثیر آبادی کے بسے ہونے کے ناطے اس بات کی تحریک چلائی کہ تمام مذاہب کو اپنے اپنے طریقہ سے کام کرنے کا موقع ملے، اور اکثریت اپنی اکثریت کی بنیاد پر اقلیت پر اپنے مذہب و تہذیب کو عائد نہ کرے، اور سب شریف پڑوسی کی طرح زندگی گذاریں۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ ملتِ اسلامیہ کی سماجی تعلیمی اور سیاسی ضرورتوں اور تقاضوں پر ان کی اہمیت کے مطابق نظر رکھتے تھے، اور کام کرنے والوں کے مابین طریقہ کار اور نقطہائے نظر کا جو فرق ہوتا اس کو اختلاف اور کشمکش کا موضوع نہ بناتے ہوئے اپنا ضروری تعاون دیتے تھے، ان کا مسلم پرسنل لا بورڈ، مسلم مجلسِ مشاورت، دینی تعلیمی کونسل سے تو ذمہ دارانہ بلکہ سرپرستانہ تعلق تھا، لیکن اس کے ساتھ وہ جمعیۃ علماء ہند، مسلم لیگ، و دیگر قومی کام کرنے والی جماعتوں کی مثبت اور لائق ستائش کوششوں کی بھی پوری قدر کرتے تھے، تعلیمی تحریکات میں، دینی تعلیم کی درسگاہوں کے علاوہ جن سے ان کا گہرا ربط تھا، ملت کی عصری درسگاہوں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جامعہ ملیہ دہلی وغیرہ کی بھی اہمیت و ضرورت کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے اور ان کی مشکلات کے حل کے لئے جو ادبی و اخلاقی تعاون دے سکتے تھے وہ دیتے تھے، ان کی نظر میں ملت کی بقاء و حفاظت و ترقی کی ضروری فکر کرنا مشترک فریضہ تھا، اس کے لئے اپنے جماعتی و نظریاتی اختلافات سے بلند ہو کر کام کرنے کی ضرورت سمجھتے اور اس پر عمل کرتے تھے، اور اس کے لئے ان کے اختیار میں جو تعاون ہوسکتا تھا وہ دیتے تھے، اسی کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں کی تمام جماعتیں ان پر متفق ہو جایا کرتی تھیں، اور اپنے آپس کے اختلاف و فرق کے باوجود ان کو اپنا مشترک ہمدرد اور مشیر سمجھتی تھیں۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے مختلف النوع و متعدد الفکر گروہوں کے ساتھ تعاون و تائید کا یہ مطلب نہیں ہوتا تھا کہ ان کی خود کوئی الگ رائے نہیں ہوتی تھی، بلکہ وہ محض ملت کی بقاء اور ترقی کی مصلحت کی خاطر چھوٹی اور انفرادی مصلحتوں کو نظر انداز کرکے بڑی مصلحت کے لئے ہمدردی و تعاون کرتے تھے ورنہ وہ ہر مسئلہ میں اپنی متعین رائے رکھتے تھے، اور غلط اور منحرف رجحانات کے ساتھ کوئی لوچ نہیں رکھتے تھے، بلکہ ان کے خلاف مثبت جد و جہد کرتے تھے، اور یہ بات ان کی تقریروں اور تصنیفات میں پوری طرح عیاں ملتی ہے، پھر مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا خدمتِ دین و ملت کا دائرہ صرف ہندوستان اور برصغیر تک محدود نہیں تھا، بلکہ پورے عالم اسلامی تک پھیل گیا تھا، وہ مشرق میں ملیشیا و انڈونیشیا تک اور مغرب میں افغانستان، ایران ترکی، مصر، الجزائر اور مراکش تک تھا، بلکہ یورپ و امریکہ میں مقیم مسلمانوں کی سوسائٹیاں تک مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے فکر و عمل کے دائرے میں تھیں، وہ جہاں جس تعاون کا تقاضہ سمجھتے اس کے کرنے کی کوشش کرتے، اور جہاں کمزوری یا انحراف محسوس کرتے وہاں اصلاح و تنقید کی اپنی آواز پہونچاتے، اور صحیح اسلام اور ملت کی صحیح مصلحت کی پاسداری کی طرف توجہ دلانے کا جرأت مندانہ کام انجام دیتے تھے، اس کے لئے عوام میں عمومی خطاب کا، اور حکومت کے ذمہ داروں کے لئے ملاقات و افہام و تفہیم کا طریقہ اختیار کرتے، مولاناؒ نے دینی و ملی خدمت کے لئے اپنا جو مزاج بنایا تھا اس میں مخاطب کے لئے اس کے مقام و حیثیت کے لحاظ سے جو اسلوبِ کلام مناسب ہوتا اور اس کا جو اچھا کام ہوتا اس کے لحاظ اور اس کے اعتراف کے ساتھ بات کرتے، لیکن اس سے کہنے والی بات زوردار طریقہ سے کہہ دیتے، تنقید ہوتی لیکن انداز محبانہ و مشفقانہ ہوتا، چنانچہ ان کی تلخ بات بھی برداشت کرلی جاتی، اس سلسلہ میں ان کو اپنے ملک کے چوٹی کے لیڈروں سے اور غیر ممالک کے سربراہانِ مملکت سے بات کرنے کے جو مواقع حاصل ہوئے انھوں نے ان مواقع سے فائدہ اٹھایا، اور استغناء کے ساتھ اور یہ محسوس کراتے ہوئے بات کی کہ ان کی کوئی مادی غرض نہیں ہے، اور یہ محض خیر خواہی میں ہے، اس کی تھوڑی بہت تفصیل ان کی خود نوشت سوانح اور ان کے مضامین اور سفرناموں میں دیکھی جاسکتی ہے۔

مولاناؒ کا یہ عمل غیر معمولی انداز کا ہوتا تھا، میں نے خود کئی ایسے موقع دیکھے کہ جہاں رواداری اور تنقید کو جمع کرنا خاصا دشوار تھا لیکن مولاناؒ ان سے حکمت اور جرأت کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے

مولاناؒ عرب اور مسلم حاکموں اور بادشاہوں سے ملے، ان میں ہر ایک کو نصیحت کی اور ان کے ملک کی خرابیوں کی طرف متوجہ کیا، خاص طور پر وہ سعودی بادشاہوں سے ملے، اردن کے بادشاہ اور مراکش کے بادشاہ اور مختلف حاکموں سے ملے، سب کو اصلاحِ حال اور ملک کی خدمت کی اور اعلاء کلمۃ اللہ کی تلقین کی، ان ملاقاتوں اور بااثر لوگوں سے اپنی ملاقاتوں میں اپنے نجی معاملہ میں پورے استغناء سے کام لیا، کبھی اپنی ذات یا خاندان کے کسی فرد کے لئے سفارش نہیں کی اور نہ ہدیہ قبول کیا، اور اگر کسی طرح ہدیہ یا انعام ملا تو اس کو ملی و دینی مقاصد کے اداروں کو دیدیا، اسی طرح فیصل ایوارڈ کے معاملہ میں کیا اور ملی اداروں کو دیدیا، دبئی سے ملنے والی ایک کروڑ ۱۲ لاکھ کی رقم سیکڑوں مدارس میں تقسیم کردی، برونائی سے ملنے والی رقم بھی دوسروں میں تقسیم کردی، ان کا یہ استغناء اس لئے نہیں تھا کہ ان کو رقم کی ضرورت نہیں ہوتی تھی، ان کو بعض وقت خاصی تنگی پیش آتی تھی تب بھی یہی کرتے تھے، کہتے تھے کہ ہم اگر کسی حاکم سے کچھ لیں گے تو ممنون ہوں گے، پھر جرأت کے ساتھ نصیحت یا تنقید نہ کرسکیں گے، چنانچہ ان کو جرأت سے بات کرنے میں ڈر نہیں لگتا تھا، لیکن حکمتِ دعوت کے تقاضہ سے خوش اخلاقی جتنی ضروری تھی وہ کرتے تھے۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ اپنے سماجی و ملی کاموں میں طریقۂ نبوت پر عامل ہونے کی کوشش کرتے تھے کہ مخاطب سے اس کی زبان اور فہم کے مطابق بات کی جائے، اور مخلصانہ و ہمدردانہ انداز میں اور اصل مرض کو سامنے رکھتے ہوئے معالجانہ جذبہ سے بات کی جائے۔

قرآن مجید میں انبیاء علیہم السلام کے پیغام حق پہونچانے کا جو تذکرہ آیا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ میں جو تفصیل ملتی ہے انھوں نے اس کو اپنے لئے مشعلِ راہ بنایا، نیز تاریخ میں اہل ایمان و عزیمت و مصلحینِ امت کے جو تذکرے ملتے ہیں ان سے اخذ فیض کیا، اور طریقۂ کار کے اس تنوع کو بھی سمجھا جو مختلف زمانوں اور مختلف ماحولوں اور مختلف حالات میں مصلحینِ امت نے اختیار کئے، اس میں مولاناؒ کے سامنے امام احمد بن حنبلؒ کا کلمۂ حق پر جمنا اور سخت آزمائش اور اذیت کے باوجود حق پر قائم رہنا، امام غزالیؒ کا علم میں کمال پیدا کرنے کے ساتھ اصلاحِ باطن اور روحانی ترقی کی فکر کرنا اور اس کی اہمیت کی تلقین کرنا، امام ابن تیمیہؒ کا دین کی بنیادی قدروں کی وضاحت کے ساتھ سماجی خرابیوں اور بددینی کا اپنی تصنیفات کے ذریعہ مقابلہ کرنا، اور دین کی صحیح فکر کی ترجمانی کرنا، مولانا جلال الدین رومیؒ کا حکیمانہ و مصلحانہ انداز کا ناصحانہ و مربیانہ کلام، حضرت مجدد الف ثانیؒ کا توحید پر زور اور حاکمانِ وقت کی بالواسطہ ناصحانہ انداز میں اصلاحِ حال کی کوشش، خواجہ معین الدین چشتیؒ اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ اور شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کی روحانی و مصلحانہ زندگی اور حکیمانہ اندازِ تربیت و اصلاح، حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی سماجی و تہذیبی بگاڑ اور سیاسی بدحالی کے دور میں حکیمانہ طریقہ سے اصلاح حال کی کوشش، اور تعلیم و تربیت کے نظام کی درستگی، اور رہنمائی کا کام، پھر حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے رفقاء کی اصلاحِ عقیدہ و عمل کے ساتھ ہجرت و جہاد کے عمل کو قائم کرنے کی کوشش شامل ہے۔ وہ حضرت سید احمد شہیدؒ کے طریقۂ دعوت و عمل سے بہت متاثر تھے، مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے ناصحانہ و مشفقانہ طرزِ دعوت کو دیکھ کر بعض ناقدوں نے کمزوری اور جذبہ جہاد سے دوری کا شبہ کیا ہے حالانکہ یہ مولانا کی حکمت پسندی اور افادیت کے خیال سے ہوتا تھا، وہ جہاد کو اہم فریضہ سمجھتے تھے لیکن شریعت نے اس کے لئے موقع و محل کی رعایت اور حکمتِ عملی کا جو قاعدہ مقرر کیا ہے اس کا لحاظ ضروری سمجھتے تھے۔

حضرت مولانا نے مذکورۃ الصدر اسلاف سے استفادہ کیا تھا اور موجودہ زندگی کے ان گوشوں میں جو مذکورہ بالا ائمہ امت کے یہاں ملتے ہیں، اپنے طریقہ کار کے لئے رہنمائی حاصل کی تھی اس سلسلہ میں ان کی مثال شہد کی مکھی کی طرح رہی جو ہر طرح کے پھولوں سے اپنی ضرورت کا رس لیتی اور شہد بناتی ہے، جو دوسروں کے کام آتا ہے۔ اس کے جسم میں ڈنک بھی ہوتا ہے جو کہ وہ اس وقت استعمال کرتی ہے جب اس کو تنگ کیا جائے، اور رکاوٹ ڈالی جائے، لیکن اس بات میں مولاناؒ قدرے مختلف تھے، وہ حتی الوسع انتقام نہیں لیتے تھے. اس کے بار بار موقع آئے کہ مولاناؒ کو جواب دینا چاہئے تھا لیکن مولاناؒ نے صبر اور خاموشی کو ترجیح دی۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ اپنی فکر بلند، معاملہ فہمی اور حق شناسی سے اور اسی کے ساتھ انحراف و گمراہی کے خطرات کو جلد محسوس کرتے ہوئے اپنی علمی صلاحیت اور داعیانہ طریقۂ کار کو مؤثر زبان و قلم کے ذریعہ بروئے کار لاتے، وہ ان کے ذریعہ اصلاح حال اور تلقین و تربیت کا کام لیتے تھے۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے امتِ اسلامیہ کی مجموعی و بنیادی مصلحت اور امت اسلامیہ کی وحدت و اتفاق کی اہمیت برابر رہتی تھی، خواہ وہ فکرِ صحیح کی ترویج ہو، انحراف و گمراہی کا مقابلہ ہو، امت کے اتحاد و سربلندی کا معاملہ ہو، یا دشمنانِ ملت کی گمراہ کن ریشہ دوانی کا مقابلہ ہو یا امتِ مسلمہ کو اس کے ماضی کے بلند مقام پر واپس

لانے کا معاملہ ہو، مولانا رحمۃ اللہ علیہ ان سب کاموں کے لئے کوشاں رہتے تھے، اور ان میں اپنی عقلی و عملی توانائیاں صرف کرتے تھے۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ ملک و بیرون ملک کے متعدد اداروں کے صدر یا ناظم اعلیٰ تھے ان کو عموماً ان کی شخصیت کے وزن کی وجہ سے اور خدمت دین و ملت میں گروہی اختلاف سے ان کے بلند ہونے کی بناء پر یہ اعلیٰ منصب دیئے گئے، ان متعلقہ اداروں نے ان کے زیر سرکردگی متعدد اہم کامیابیاں حاصل کیں، اور بڑی ترقی کی، اس میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی مخصوص حکمت عملی اور مخلصانہ فکرمندی کا خاصا دخل تھا، اداروں اور اجتماعی وحدتوں کی سربراہی کے فرائض انجام دینے میں مولاناؒ کا رویہ اپنے ساتھ کام کرنے والوں اور خصوصی معاونین پر عموماً اعتماد و اختیار کا ہوتا تھا، وہ اپنے جس معاون کی کارکردگی کو مقصد کے مطابق اور مخلصانہ محسوس کرتے، اس کو اس کی سمجھ اور معاملہ فہمی کے مطابق کام کرنے کا پورا موقع دیتے، اور اس کام کے کسی جز میں اس سے کوئی غلطی ہو جاتی تو اس کو برداشت کرتے، اور صرف متوجہ کر دینے پر اکتفا کرتے، لیکن اپنے معاون کے کام کے سلسلہ میں اس بات پر پوری نظر رکھتے تھے، کہ کام صحیح راستہ سے ہٹ نہ جائے، اور مقصد کے خلاف نہ ہو، اس سلسلہ میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے خود اپنے خاص تجربہ سے یہ سمجھ لیا تھا، کہ ان کے متعدد و متنوع کاموں میں کس کام میں کون بہتر اور کارگزار اور زیادہ قابل اعتماد معاون ہے، پھر اس کو نہ صرف یہ کہ اس کام کا ذمہ دار بلکہ اس کام میں اپنا ترجمان بنا لیتے تھے، چنانچہ مولاناؒ کے مختلف کاموں اور منصبوں میں مختلف معاونین رہے، جن کو ان کے متعلقہ کاموں میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے خاصا اعتماد حاصل رہتا تھا، وہ بھی اپنے متعلقہ کام کے مزاج اور حکمت عملی کے سلسلہ میں کوئی معاملہ ہوتا تو مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے رجوع کرتا، اور رہنمائی حاصل کرتا، لیکن جزوی اور عمومی معاملات میں اس کو اپنی صوابدید پر عمل کرنے کی آزادی ہوتی تھی۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے فکر و عمل کے دائرہ میں ندوۃ العلما کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی، اور اللہ تعالیٰ نے مولانا کے دور نظامت میں اس ادارہ کو بہت نوازا، اور اس کی شہرت، اور اہمیت پورے عالم اسلام میں تسلیم کر لی گئی اس کا دائرہ کار بہت وسیع ہوا، اور اس کے شعبوں اور شاخوں کی تعداد خاصی بڑھی، ظاہری ترقی کے ساتھ باطنی ترقی بھی خوب ہوئی، اس سب میں ایک طرف مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے معاونین کا بڑا حصہ ہے، اور دوسری طرف مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی اس فکرمندی کو کہ ادارہ اپنی خصوصیت اور معنویت اور اپنے مقام و منصب سے ہٹنے نہ پائے، بڑا دخل ہے، وہ وقتاً فوقتاً ذمہ داروں کو خطاب فرماتے، طلبا کو وقتاً فوقتاً نصیحت کرتے، اور صالح اور بلند کردار کی طرف متوجہ کرتے، اس سلسلہ میں ان کی تقریریں بڑی مؤثر اور دل پر اثر کرنے والی ہوتیں، وہ اپنے ماتحت اہم ذمہ داروں سے وقتاً فوقتاً دریافت کرتے کہ کام کی مقدار اور رفتار کیا ہے، اہم اور فیصلہ طلب معاملات میں رہنمائی کرتے، لیکن یہ سب ایسے محبانہ رویہ کے ساتھ ہوتا، کہ کام کرنے والوں کا دل بڑھتا، اور ان کے جذبہ میں ترقی ہوتی، ندوۃ العلما کے دائرہ میں نائب ناظم مولانا معین اللہ صاحب ندوی ان کے سب سے بڑے معتمد رہے، اور ان کی فکر و توجہ کا ندوۃ العلماء کی ان ترقیات میں جو مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے دور نظامت میں ہوئیں بڑا دخل ہے، اللہ تعالیٰ ان کی فکرمندیوں اور محنتوں کا بہترین صلہ عطا فرمائے، اور درجات بلند فرمائے، اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑا دینی جذبہ اور کام کا حوصلہ عطا فرمایا تھا۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی زیر سرپرستی دیگر اداروں اور انجمنوں کے معاملہ میں بھی ۔۔۔۔۔ ان کی طرف سے کم و بیش یہی مذکورہ اعتماد و ہمت افزائی کا طریقہ تھا اور امت اسلامیہ کے مصالح کے لئے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی فکر و نظر ایک ہی سطح اور طاقت کی ہوتی تھی۔

وہ آج اپنے ملک و قوم، اپنی ملت، اور اپنے قدردانوں سے جدا ہو گئے ہیں لیکن اپنے پیچھے اپنے کاموں اور اپنی خصوصیات و صفات کے روشن نقوش چھوڑ گئے ہیں جن کو قائم رکھنا اور آگے بڑھانا ان کے قدردانوں کی ذمہ داری ہے، اور اس ذمہ داری کو پورا کرنے میں ہماری اجتماعی و انفرادی بھلائی مضمر ہے۔

شوخیٔ تحریر تیری کس قدر تھی تابناک
عالم اسلام کی خاطر تھا تو بدر منیر
دین و ملت کیوں نہ ہو نازاں تری خدمات پر
پرسنل لا کے محافظ دینِ احمد کے مشیر

انفرادیت و اختصاص

حضرت مولانا علی میاں ندویؒ

بحیثیت مفسرِ قرآن

مولانا عبداللہ عباس ندوی

حضرت مولاناؒ کے اسلوب تفسیر کو سمجھنے کے لئے اور ان کی قرآن فہمی کا انداز جاننے کے لئے ہم ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ دوسرے اسالیب تفسیر کو سامنے رکھیں تاکہ آپ کے اسلوب کا امتیازی نشان واضح ہو سکے۔

تفسیر کا ایک رنگ وہ ہے جس کی نمائندگی شیخ جار اللہ محمود بن عمر زمخشری (م ۵۳۸ھ) صاحب "کشاف" کرتے ہیں، الفاظ کے لغوی معنی اور عربی کے قابل استناد دور کے اشعار سے ان کی تصدیق، نحوی ترکیب کی وضاحت اور جہاں ایک سے زیادہ امکانات پائے جاتے ہیں اور جن کی وجہ سے ایک آیت کی تفسیر مختلف شکلوں سے کی جاسکتی ہے ان کی توضیح، نیز قرآن کے اعجازی پہلو کو واضح کرنا، کلامی مسائل میں معتزلہ کے مسلک کی تائید، صاحب کشاف کی تفسیر کے جلی عنوانات ہیں۔ شیخ محمود کے معتزلانہ استدلال کی تردید کشاف کے موجودہ نسخوں میں ملتی ہے جو شیخ ناصر الدین احمد بن المنیر المالکی کی نظر سے کبھی اوجھل نہیں ہوئی۔

دوسرا طرز تفسیر امام طبری (م ۳۱۰ھ) اول المفسرین کا ہے جو ہر آیت کی تشریح کے لئے احادیث نبویہ سے استدلال کرتے ہیں، دوسرے مفسرین میں امام فخر الدین رازی (م ۶۰۶ھ) ہیں وہ قرآن کے تمام مضامین کا احاطہ کرنے والے تھے، ان کے یہاں احادیث سے استدلال بھی ہے، الفاظ کی تحقیق بھی ہے اور اپنے عصر کے یونانی فلاسفہ کے اعتراضات کے جوابات بھی ہیں، دل کو نرم کرنے والے اور قرآن سے شغف پیدا کرنے والے واقعات سے یہ تفسیر مزین ہے۔ لوگوں نے یہ بڑی بے انصافی کی ہے کہ ان کی تفسیر پر یہ پھبتی کس دی ہے کہ "فیہ کل شئی الا التفسیر" یعنی اس میں تفسیر کے علاوہ سب کچھ ہے، امام رازی نے ایک انوکھی بات یہ بھی کی ہے کہ التزام کے ساتھ ہر آیت کا تو نہیں لیکن بہت سی آیتوں کے درمیان ترابط اور نظم دکھایا ہے۔ یہودی اور نصرانی ناقدین نے جن کو اصطلاح میں "مستشرق" کہا جاتا ہے نظم آیات کے نظریے کی تردید اس طرح کی ہے کہ موجودہ ترتیب سور آیتوں کی تعداد کے مطابق ہے، سورۂ فاتحہ کو چھوڑ کر جتنی سورتیں ہیں ان میں جو سب سے طویل سورت ہے وہ پہلے ہے اور جو اس سے کم آیتوں پر مشتمل سورہ ہے وہ بعد میں، اسی طرح آخر تک نظم سور کی پابندی نظر آتی ہے۔ جن لوگوں نے اس ملک میں نظم آیات اور ربط معانی پر زور دیا ان میں شیخ عبید اللہ سندھی (م ۱۹۴۵ء) اور علامہ عبد الحمید فراہی (م ۱۹۳۰ء) سب سے آگے ہیں، شیخ سندھی کے انداز تفسیر کے ایک بڑے متبع حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ (م ۱۳۸۱ھ) تھے جو مفسر ہونے کے ساتھ ساتھ صوفیانہ جفاکشی اور علم و تقویٰ میں نمایاں مقام رکھتے تھے، ہمارے حضرت مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندوی قدس سرہ حضرت لاہوریؒ کے خاص، عزیز ترین، محبوب ترین شاگرد تھے، جن کو حضرت لاہوریؒ اپنی اولاد سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ناچیز راقم کی تالیف "میر کارواں" اور مولانا ممشاد علی قاسمی کی تالیف "حضرت مولانا مشاہیر امت کی نظر میں" اور خود حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی خود نوشت سوانح "کاروان زندگی" کا پہلا حصہ) حضرت مولانا پر حضرت لاہوریؒ کے احتیاط و تقویٰ اور زہد و ریاضت کا اثر پورا پورا پڑا لیکن تفسیر کے معاملہ میں مولانا کا مذاق مختلف رہا۔ انھیں خاندانی بزرگوں اور خانوادۂ شاہ علم اللہؒ و سید احمد شہیدؒ کے علماء کے رنگ تفسیر سے مناسبت رہی جو براہ راست حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ (م ۱۱۷۶ھ) کا فیض تھا، کسی نے لکھا تو نہیں ہے مگر راقم اتنی جسارت کر سکتا ہے کہ یہ کہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے یہاں بھی آیات و سور میں ربط و نظم ہے جس طرح ایک درخت کی جڑ کو اس کی شاخوں سے ربط رہتا ہے اور ہر ڈالی اپنی اصل سے مربوط رہتی ہے لیکن یہ کہنا کہ ایک آیت کے بعد دوسری آیت اور دوسری کے بعد تیسری معنوی طور پر سب مربوط ہیں اور ترتیب مصحف کے مطابق ایک سورۃ دوسری سورۃ سے مربوط ہے صحیح نہیں ہے، خواہ اس کے داعی امام رازی ہوں یا ماہیمی ہوں یا شیخ سندھی ہوں یا علامہ فراہی۔ راقم نے قرآن کے اسباق حضرت مولانا سے لئے ہیں، ان کے مواعظ سنے ہیں، قرآنی آیات سے استدلال اور ان سے ایسے نتائج نکالنا جو صرف ایک وہبی صلاحیت اور خداداد ذہانت کا طالب ہے، سنتا رہا ہے

مگر کبھی ربط آیات کی وہ بات نہیں سنی جو ربط ونظم کے ماننے والے حضرات کے یہاں ہے۔ حضرت مولانا علی میاں کی زندگی کا قرآن سے تعلق وہی رہا جو جسم کو روح سے ہوتا ہے، میں مثال کے طور پر آپ کے طرز استدلال کو آپ کے بعض مواعظ سے نقل کرتا ہوں جس سے اندازہ ہوگا کہ آپ کو قرآن کریم پر کتنا یقین، کس درجہ اعتماد اور کتنا گہرا شغف تھا، حضرت مولانا نے زندگی بھر ——— آیات قرآنیہ سے پوری ملت کے لئے پیغام تلاش کیا، اور ایسے پیغامات جن کی طرف متقدمین یا متأخرین کی نگاہ نہیں گئی تھی، مثلاً حضرت یعقوبؑ کا اپنے آخر وقت میں اپنی اولاد کو جمع کرکے یہ پوچھنا "مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِیْ" میرے بعد تم کس کو پوجوگے؟ اس واقعہ سے استدلال کہ ایک پیغمبر وقت کو دنیاوی زندگی میں سب سے اہم اور خطرناک موڑ یہی نظر آتا ہے کہ اس کی اولاد دین پر قائم رہے گی یا دنیا پرست ہو جائے گی، سوال یہ ہے کہ تم دین کو مانوگے یا دنیا کی پوجا کروگے، احکام الٰہی کے آگے سر بسجود ہوگے یا دنیاوی آرائش کے پیچھے بھاگوگے، اس آیت سے یہ لطیف استدلال کسی نے نہیں کیا تھا، اسی طرح جب آپ ۱۹۵۶ء میں ترکی تشریف لے گئے جہاں ملحد ملیٹری کی حکومت ہے اور جہاں آج کل سیکولر کا مفہوم یہ سمجھا جاتا ہے کہ جو اسلام کے مخالف اور معاند طریقۂ کار ہو اور جہاں مردوں کو داڑھی منڈانے اور عورتوں کو بے سر ڈھکے رہنے پر مجبور کیا جاتا ہو وہاں ہمارے مولانا نے ایک پیشین گوئی سنائی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شکنجہ سے اسلام پسندوں کو نکالے گا اور دین کا جھنڈا یہاں کی فضا میں پھر لہرائے گا، جس آیت سے استدلال کیا ہے وہ سورۂ کہف کی وہ آیت ہے جس میں حضرت خضرؑ ایک گاؤں میں جب جاتے ہیں اور لوگوں سے مہمانی طلب کرتے ہیں بستی والے مہمان بنانے پر راضی نہیں ہوتے مگر وہاں ایک گرتی ہوئی دیوار آپ دیکھتے ہیں اور اس کی مرمت کرنے لگتے ہیں حضرت موسیٰؑ جو اللہ کے حکم کے مطابق جناب خضرؑ کے مرافق تھے چیخ اٹھتے ہیں" لَوْ شِئْتَ لَاتَّخَذْتَ عَلَيْهِ أَجْرًا" حضرت خضر جواب میں کہتے ہیں کہ اس گرتی ہوئی دیوار کی جڑ میں ایک خزانہ ہے جوان بچوں کی میراث ہے جن کا باپ صالح تھا۔

"وَ اَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلَامَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِي الْمَدِيْنَةِ وَ كَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَ كَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا۔"

اور جو دیوار تھی سو وہ یتیم لڑکوں کی تھی جو شہر میں رہتے تھے اور اس کے نیچے ان کا خزانہ مدفون تھا، اور ان کا باپ ایک نیک بخت آدمی تھا۔

لہٰذا اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ ہے کہ یہ بچے جوان ہوں اور اپنا خزانہ نکال لیں کیونکہ اللہ کی رحمت کا یہی تقاضہ ہے اور خضرؑ فرماتے ہیں کہ میں نے یہ کام اپنی طرف سے نہیں کیا تھا (بلکہ یہ اللہ کا حکم تھا)۔

"فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَا اَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا، رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ۔"

تو تمہارے پروردگار نے چاہا کہ وہ اپنی جوانی کو پہونچ جائیں اور پھر اپنا خزانہ نکالیں یہ تمہارے پروردگار کی مہربانی ہے اور یہ کام میں نے اپنی طرف سے نہیں کئے۔

حضرت مولانا نے ترکوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اس ملک میں دین کا خزانہ دفن ہے اور تمہارے صالح آباء و اجداد دین سے وابستہ تھے آج یہ دین کی دیوار اس ملک میں گرتی ہوئی نظر آرہی ہے اور ظاہر بیں نگاہیں دیکھ رہی ہیں کہ یہ دیوار اب گری جب گری۔ لیکن غیرت خداوندی کا تقاضہ کچھ اور ہے، دین کی دیوار اس سرزمین پر استوار رہے گی اور آج نہیں تو کل سب سے زیادہ پائدار، سب سے زیادہ پختہ اور مستحکم دیوار دین کی دیوار ہوگی۔

یہ استدلال اور یہ قوت ویقین اور اللہ تعالیٰ کے کلام پر اور اس کے ہر ہر لفظ پر اس درجہ گہرا یقین ایک وہبی طاقت کا مظہر ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندہ ابوالحسن علی کو عطا فرمایا تھا۔ اللہ تعالیٰ ان سے راضی رہے اور اپنے انعامات سے ان کو راضی رکھے، اور یہ پیشین گوئی پوری کرے۔

حضرت مولانا مرحوم کا اسلوب تفسیر حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تقلید تو نہیں ہے اور نہ اس کی مکمل پیروی، لیکن جس طرح شاہ صاحب کی نظر قرآن کی عمومی تذکیر اور اس کی آفاقی دعوت پر ہے، اسی طرح حضرت مولانا علی میاںؒ کی نظر بھی دعوت دین کے عالمگیر پہلو پر ہے اور جیسا شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ نماز کی مشروعیت۔ (داخل شرع ہونا) اللہ تعالیٰ کے ذکر ومناجات کے لئے ہے جیسا کہ ارشاد ہے:۔

"وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ۔"

(الحج آیت ۳۷)

یعنی نماز میرے ذکر کے لئے قائم کرو، ——— اور تاکہ انسان کے حواس وقویٰ رویت باری تعالیٰ کے لئے آخرت میں تیار ہوسکیں جیسا کہ حدیث میں ہے:

سترون ربکم کما ترون هٰذا القمر لا تضامون فی رویته فان استطعتم الا تغلبوا علی صلاة قبل طلوع الشمس وصلاة قبل غروبها فافعلوا۔

تم اپنے رب کو اس طرح دیکھوگے جیسے اس چاند کو دیکھ رہے ہو، اس رویت میں

کوئی دھندلکہ نہیں ہے جہاں تک ہو سکے
فجر اور عصر کی نمازوں سے غافل نہ رہو۔
اور جیسا کہ زکوٰۃ کے بارے میں شاہ
صاحب لکھتے ہیں کہ اس کی مشروعیت اس لئے
ہے کہ طبیعت کے اندر سے بخل کا مادہ نکلے اور ضرورت
مندوں کی ضرورت پوری کرنے کا جذبہ ابھرے،
اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ ادا کرنے والوں کے لئے فرمایا:

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ
اللَّهُ مِن فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا لَّهُم بَلْ هُوَ
شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ
الْقِيَامَةِ (آل عمران - ۱۸۰)

اور جو لوگ اس مال میں بخل کرتے ہیں جو کچھ
اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے دے رکھا ہے
وہ ہرگز یہ نہیں سمجھیں کہ یہ ان کے حق میں اچھا
ہے۔ نہیں بلکہ ان کے حق میں بہت برا ہے
یقیناً انھیں قیامت کے روز طوق پہنایا
جائے گا اس مال کا جس میں انھوں نے
بخل کیا۔

یا یہ کہ حج کی فرضیت اس لئے ہوتی ہے کہ شعائر اللہ
کی عظمت لوگوں کے دلنشیں کر دی جائے جیسا
کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي الخ
(آل عمران - ۹۶)

بے شک پہلا گھر جو لوگوں کے لئے بنایا
گیا کہ....

یا یہ آیت کریمہ:

إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِن شَعَائِرِ اللَّهِ
(البقرۃ - ۱۵۸)

صفا و مروہ اللہ کے شعائر میں ہیں۔

اسی طرح قصاص، جہاد، احکام و معاملات
کی آیات میں شاہ صاحب کی نظر عمومی حقیقت
کی طرف رہتی ہے [لہ] بعینہٖ یہی انداز تفسیر اپنے
استاذ محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ
کے یہاں دیکھا اور طالب علمی کے زمانہ سے اب
تک یہی رنگ ان پر غالب ہے، یہی نہیں بلکہ تمام
دینی و اختلافی مسائل میں ان کی نظر ایک عمومی
حکم پر رہتی ہے، ان کا پہلا دعوتی رسالہ
"دعوتان متنافستان" دیکھئے اس میں حق
و باطل کا معرکہ کسی خاص واقعہ سے متعلق نہیں
ہے۔ بلکہ ایمان کی دعوت اور اس کے مقابلہ
میں جاہلیت کی دعوت دونوں کے مزاج سے
بحث کی ہے اور جس طرح شاہ صاحب نماز،
روزہ، حج، زکاۃ، کی مشروعیت پر کوئی آیت
اور احادیث پیش کرتے ہیں مولانا بھی سیرت ﷺ
و سیر صحابہؓ کا کوئی واقعہ بطور استشہاد لے آتے
ہیں اس کی ایک تازہ مثال ہے کہ ردّ شیعیت
میں سیکڑوں کتابیں لکھی گئی ہیں، جن میں شیعہ
عقائد، ان کی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین
کی شان میں گستاخی و بے ادبی، تقیہ اور متعہ
کا ان کی کتابوں سے ثابت ہونا اور اس کی نوعیت
پر بحث ہوتی ہے، زیادہ تر ان کے عقائد شیعہ
کو ان ہی کی کتابوں سے ثابت کیا گیا ہے، اس
طرز کی بیسیوں نہیں بلکہ سیکڑوں کتابیں مناظرانہ
انداز کی موجود ہیں مگر اس موضوع پر مولانا کا
رسالہ "صورتان متضادتان" [لہ] "دو متضاد
تصویریں" ایک عمومی رنگ لئے ہوئے ہے،
اور اس میں اصولی باتیں ہیں، جن کو عقل عام
تسلیم کرے اور پھر کسی مناظرہ کی ضرورت بھی
نہ رہ جائے [ٹہ] یہی حال تفسیر کا ہے، ان کے درس
تفسیر میں انسانیت کے لئے عام دعوت جو ہر
زمانہ اور ہر مقام کے لئے یکساں طور پر فطرت کا
تقاضہ بن کر سامنے آتی ہے نمایاں ہے۔

حضرت مولانا نے تفسیری مطالعہ اور
قرآن فہمی کی نعمت پر متعدد جگہوں پر تفصیل سے
لکھا ہے، جن کو راقم نے اپنی کتاب "میر کارواں"
میں نقل کرنے کی کوشش کی ہے۔ نیز "میرے
مطالعۂ قرآن کی سرگذشت" کے عنوان سے رسالہ
"صبح صادق" (لکھنؤ) قرآن نمبر میں شائع ہوا تھا
جس کو راقم نے "میر کارواں" میں نقل کیا ہے، اس
مقالہ میں مولانا لکھتے ہیں:

"ادب کے نصاب کی تکمیل کے بعد جو شیخ
خلیل عرب کا طبع زاد اور خود ایجاد تھا
مجھے خوش قسمتی سے علامہ تقی الدین
ہلالی مراکشی کی صحبت میسر آئی جو عربیت
اور نحو میں عصر حاضر کے یگانہ اشخاص
میں سے تھے اور ان کو امام فن کہنا بجا
ہوگا، ادب کے بعد میں نے کچھ فقہ کی تعلیم
حاصل کی اور دو سال ندوۃ العلماء میں
مولانا حیدر حسن خاں صاحب سے
درس حدیث کی تکمیل کی، اسی زمانہ میں
کچھ تفسیر بیضاوی کا حصہ مولانا سے
پڑھا، جو درس نظامی کے بڑے فاضل
استاد اور کہنہ مشق مدرس تھے، کچھ عرصہ
کے لئے میں نے لاہور جا کر مولانا عبید اللہ
صاحب سندھی کے طرز پر ان کے شاگرد رشید
مولانا احمد علی صاحبؒ کے تفسیر کے
درس میں شرکت کی، اس درس پر قرآن
مجید سے سیاسی نکات کے استنباط کا
ذوق غالب تھا، اس طرز سے مجھ کو زیادہ
مناسبت نہیں ہوئی، لیکن مولانا کے
اخلاق، ان کی زاہدانہ زندگی اور ان کے
جذبۂ توحید سے بہت نفع ہوا۔

لاہور سے آنے کے بعد اور
حدیث سے فارغ ہونے کے بعد کا
زمانہ کلیۃً تفسیر کے مطالعہ میں گذرا،
میں یہ کہنا بھول گیا تھا کہ میں نے

شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی بعض تفسیریں اور مولانا حمید الدین فراہی کے رسائل بھی پڑھے، اب سارا وقت تفاسیر کے مطالعہ میں گذرنے لگا، زیادہ تر خود مطالعہ کرتا تھا اور جو اشکال پیش آتا اس کو دوسری کتابوں سے حل کرنے کی کوشش کرتا، اس زمانہ میں تفسیر جلالین نیز علامہ بغوی کی ضخیم تفسیر معالم التنزیل، علامہ زمخشری کی کشاف کا لفظ بہ لفظ پڑھا علامہ نسفی کی مدارک کا نصف حصہ تو مجھے یاد ہے، لفظاً لفظاً پڑھا، دوسرے حصے پر نظر ڈالی۔

تفسیر کے مطالعہ کے سلسلے میں ایک عجیب تجربہ ہوا کہ ہر شخص کی کسی ایک سے تشفی نہیں ہو سکتی، ذہن وعقلیت کے مدارج اتنے مختلف اور متضاد ہیں کہ ایک شخص کو بیک وقت مطمئن نہیں کرسکتا، بعض اوقات ایک غبی آدمی کو ایک شبہ پیش آتا ہے، ذہین آدمی کا ذہن بھی اس شبہ کی طرف منتقل نہیں ہوتا وہ اس سے تعرض کئے بغیر گذر جاتا ہے، میرے بعض اشکالات معروف تفسیروں سے حل نہیں ہوئے، کسی حاشیہ یا کسی غیر معروف تفسیر میں ان کا جواب مل گیا، اس سلسلہ کی تفصیلات طویل ہیں۔

جب دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تفسیر کا درس میری حقیر ذات سے متعلق ہوا تو تفسیر کا زیادہ گہرا مطالعہ کرنے کا موقع ملا، اس زمانہ میں علامہ آلوسی کی تفسیر روح المعانی سے بڑی مدد ملی، تجربہ یہ ہوا کہ تفسیر کبیر ہمارے جدید حلقوں میں جس قدر بدنام ہے بہانتک کہا گیا کہ "فیہ کل شیئ الا التفسیر" اس بدنامی وحقارت کی وہ ہرگز مستحق نہیں، بہت سے زوائد کے باوجود اس میں بعض بڑی کام کی باتیں ہیں، اور بعض ایسی چیزیں ہیں جو عام کتابوں میں نہیں ملتیں، اس زمانۂ تدریس میں اگر چہ احیاناً بعض اور تفسیروں کے دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا مثلاً ابو حیان کی "البحر المحیط"، لیکن ان کا ذہن پر کوئی اثر نہیں۔ علامہ رشید رضا کی "تفسیر المنار" بھی قابل استفادہ ہے اور اس سے بھی جدید مباحث میں مدد مل سکتی ہے، مدرسانہ نقطۂ نظر سے فی الجملہ بڑی مفید ثابت ہوئی "اعراب القرآن" سے بھی کافی مدد ملی۔

اس وقت تک مولانا عبد الماجد دریابادیؒ کی تفسیر ماجدی شائع نہیں ہوئی تھی، انگریزی میں ان کے حواشی تیار ہو رہے تھے مجھے بعض اشکالات کے سلسلہ میں جن کا تعلق قدیم تاریخ اور دوسرے مذاہب وصحف سے تھا کبھی کبھی استفادہ کے لئے دریاباد جانے کا اتفاق ہوا، اور بعض بڑی کام کی باتیں معلوم ہوئیں، اب یہ معلومات تفسیر ماجدی میں نشر ہو چکی ہیں، اور قرآن مجید کے طالب علم کے لئے اس کا مطالعہ نہایت مفید ہے، خصوصاً ان لوگوں کے لئے جن کے پاس اصل مآخذ کی طرف رجوع کرنے کا وقت یا ذریعہ نہ ہو۔

زمانۂ تدریس کے بعد جب اپنی بعض علمی ضرورتوں کی بنا پر تفسیر طبری دیکھنے کا اتفاق ہوا تو آنکھیں کھل گئیں اور معلوم ہوا کہ یہ نہ صرف تفسیر بلکہ تاریخ وادب کا بھی ایک وسیع کتب خانہ ہے جس کا کسی کے پاس موجود ہونا ایک نعمت عظمیٰ ہے۔ عرب جاہلیت کے عادات، عقائد معاشرت اور احکام قرآنی کا ماحول اور پس منظر جاننے کے لئے اس سے زیادہ مستند اور وسیع ذخیرہ نہیں۔

اس سلسلہ میں بڑی کوتاہی ونا سپاسی ہوگی اگر ایک ایسی کتاب کا ذکر نہ کیا جائے جو اگر چہ کوئی مفصل تفسیر نہیں لیکن فہم قرآن کا بہت بڑا نمونہ ہے اور تفسیر کے طالب علموں کے لئے ایک نادر تحفہ ہے شاید بہت سے قارئین کا ذہن متوجہ نہ ہو، یہ حضرت شاہ عبد القادر علیہ الرحمہ کا ترجمہ ہے اس کی قدر ان لوگوں کو ہو سکتی ہے جو تفسیر کا تفصیلی اور اعلیٰ مطالعہ کر چکے ہوں اور ان کو مشکلات قرآن کا اندازہ ہو اور یہ معلوم ہو کہ اہل تفسیر کو قرآن مجید کے بعض مطالب کے ادا کرنے میں اور اس کے بعض مفردات کی شرح وتفسیر میں کیسی کیسی دقتیں پیش آتی ہیں اس کے بعد جب وہ شاہ صاحب کا ترجمہ پڑھیں گے تو اندازہ ہوگا کہ شاہ صاحب نے کس خوبی اور کامیابی کے ساتھ ان مشکلات کو عبور کیا ہے، اور قرآنی الفاظ کے لئے وہ اردو کے کیسے موزوں الفاظ لاتے ہیں جو بعض اوقات بالکل برمحل معلوم ہوتے ہیں اس کے لئے مثال کے طور پر صرف ایک آیت پیش کرتا ہوں، سورۂ شعراء کی آیت ہے:

"قَالُوْا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ اِنَّا لَنَحْنُ الْغٰلِبُوْنَ" عربی میں عزت کا لفظ نہ صرف غلبہ کا مرادف ہے اور نہ صرف

شرف کا اور دونوں لفظ مل کر بھی اس موقع پر اس مفہوم کو ادا نہیں کر سکتے، زمخشری جیسے صاحب ذوق اور راسخ الفہم ادیب کو بھی اس کا پورا مترادف نہیں مل سکا۔ شاہ صاحب نے اس کا جو ترجمہ کیا ہے اس میں اس لفظ کی صحیح ترجمانی آگئی ہے، وہ فرماتے ہیں "اور بولے فرعون کے اقبال سے ہم ہی زبر رہیں گے"، یہی اس آیت کا صحیح ترجمہ ہے، شاہ صاحب کے بعد جس نے بھی اس ترجمہ کو اختیار کیا سب نے شاہ صاحب کی تتبع میں اختیار کیا۔ یہ ایک مثال ہے۔ شاہ صاحب کے ترجمے میں ایسے نوادر اور جواہرات بہت ملتے ہیں، ہمارے استاذ مولانا حیدر حسن خاں صاحبؒ فرماتے تھے کہ مدرسہ سہارنپور کے بانی مولانا محمد مظہر صاحب نانوتوی علیہ الرحمۃ سب تفسیریں پڑھانے کے بعد آخر میں شاہ صاحب کا ترجمہ پڑھ دیتے تھے۔

ان تعلیمی تجربات میں اتنا اضافہ کرتا ہوں کہ قرآن مجید کے فہم کا اصل دروازہ تب کھلتا ہے، جب آدمی بغیر کسی انسانی حجاب کے ذریعہ اس کلام کے ذریعہ صاحب کلام سے ہم کلام ہو، اس کا راستہ قرآن مجید کی بکثرت تلاوت ہے اور نوافل اور ان بندگانِ خدا کی صحبت جو اس کتاب کے حقیقی لذت آشنا اور حقیقت شناس ہیں اور جن کے رگ وپے میں یہ کلام بس گیا ہے، ضرورت اس کی ہے کہ پڑھنے والا اس کتاب سے براہ راست تعارف و انس حاصل کرے اور اس کو ایسا محسوس ہو کہ براہ راست مخاطب ہے، شاعر نے کچھ غلط نہیں کہا کہ ؎

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی، نہ صاحب کشاف

---

[۱] ملاحظہ ہو مقدمہ حجۃ اللہ البالغۃ۔

[۲] یہ کوئی مستقل کتاب نہیں تھی بلکہ مولانا محمد منظور نعمانی کی ردِ شیعیت پر کتاب کا مقدمہ تھا۔ اس مقدمہ کے شاہزادہ طلال بن عبد العزیز نے اپنے خرچ پر ۵ ہزار نسخے چھپوائے۔

[۳] یہی وجہ ہے کہ ایران و ہند کے شیعہ علماء اور اہل قلم نے اس کا نوٹس لیا اور اس کے جواب میں دس سے زائد رسائل شائع ہو چکے ہیں، تقیہ اعتراضات تو ہمیشہ سے سنتے آئے ہیں اور اس پر مناظرے بھی ہو چکے ہیں اور اپنی ضد پر قائم ہیں۔

قیادت

اگر مسلمانوں کے لئے ترقی کا کوئی راستہ ہے اس ملک میں عزت پانے کا، قیادت کا تو یہ کہ وہ داعی بن کر قیادت کریں، حریف بن کر نہیں عددی اقلیت ہونے نے تو ایک طرح سے قسمت پر مہر لگادی ہے۔ اگر مسلمان داعی کی حیثیت حاصل کریں گے تو اللہ اس کے طفیل میں آپ کو سب کچھ عنایت کرے گا۔

(حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ)

عملی زندگی

اسلام کے اعلیٰ اصولوں میں دنیا اسی وقت کشش محسوس کرے گی جب ان کا مظاہرہ ہم اپنی عملی زندگی میں کریں گے۔

(حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ)

روح حضرت مولانا علی میاں ندویؒ سے

• از عنبر ناصری القاسمی

گری ہے برق مرے گھر پہ تیرے جانے سے
جگر ہے زخم سے چھلنی مرا زمانے سے
ترے فراق میں ہوش و حواس کھو بیٹھے
نہ آسکیں گے کبھی اب مرے منانے سے
زمانہ اور کبھی لایا مگر وہ عاجز ہے
ادیبِ وقت تمہاری نظیر لانے سے
جہاں میں آہ وبکا ہے "علی میاں" نہ رہے
سبھی نڈھال ہوئے غم کے تیر کھانے سے
شبِ فراق نہیں کم کسی قیامت سے
یہاں خرد بھی ہراساں ہے آزمانے سے
تڑپ رہے ہیں قلم رو رہی ہیں تصنیفیں
جمالِ علم و ادب! تیرے چلے جانے سے
تری مثال زمانے میں کوئی آتا ہے
ہزار سال میں قدرت کے کارخانے سے
چمن میں شور بپا ہے کہ گلستاں نہ رہا
اُدھر سے چیخ نکلتی ہے آشیانے سے
عرب عجم میں یتیمی سی چھا گئی ہے تمام
تمہاری ذات کا رشتہ تھا اس گھرانے سے
کہاں سے آپؒ کی مدحت بیاں کرے عنبر
یہی دعا ہے خدا دے کوئی خزانے سے۔

تاریخ وفات

یَاغَفُوْرُ یَاسَتَّارُ یَاوَاحِدُ
۱۹۹۹ء
یَاقَاسِمُ یَاکَوْثَرُ یَاشَفِیْعُ
۱۴۲۰ھ

آہ چراغِ علوم دیں
۱۴۲۰ھ
آہ حضرت آہ
۱۴۲۰ھ
آہ بے بہا شخصیت
۱۴۲۰ھ
بے بہا روشنی ملت گم شد
۱۴۲۰ھ
آہ داغِ مولانا علی میاں ندوی
۱۴۲۰ھ
آفوہ وفاتِ بے بہا شخصیت
۱۹۹۹ء

• ——— رزاق افسر

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ اور فقہ اسلامی

مولانا عتیق احمد بستوی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت بڑی ہمہ جہت اور ہشت پہل ہے، بیسویں صدی کے نصف آخر کی اسلامی تاریخ پر ان کے اثرات اس قدر وسیع اور گہرے ہیں کہ ان کے تذکرے کے بغیر ہر تاریخ ادھوری رہے گی خواہ تحریکات اسلامی کی تاریخ ہو یا ادب اسلامی کی یا علوم اسلامی کی یا تحریکات اسلامی کی، عالم اسلام کے ہر خطہ کو اور زندگی کے ہر میدان کو انھوں نے کم و بیش متاثر کیا۔ برصغیر ہند و پاک تو ان کا وطن تھا، وہ اسلامیان ہند کی آبرو اور ان کی زبان و ترجمان تھے تقسیم ہند کے بعد ہندوستان میں اسلام کی جڑیں مستحکم کرنے اور تشخص اسلامی کی حفاظت میں ان کا بنیادی کردار رہا، بلاد عربیہ اور بلاد اسلامیہ میں ان کی دعوت دور دور پہونچی اور ان کے افکار و پیغام کو انتہائی عزت کی نگاہ سے دیکھا گیا، عالم اسلام کی سیاسی، سماجی تبدیلیوں پر ان کی نظر بہت گہری تھی، خطرات کا احساس بہت پہلے سے کر لیا کرتے تھے اور "نذیر عریاں" کی طرح صاف لفظوں میں خطرات سے آگاہ کرتے ان سے تحفظ کی تدبیریں بتاتے۔

دنیا میں جہاں جہاں مسلمان آباد ہیں (خواہ یورپ ہو یا امریکہ، آسٹریلیا ہو یا افریقہ) حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیفات و افکار کی خوشگوار روشنی وہاں تک پہونچی ہے اور ہر ملک کے تعلیم یافتہ طبقہ کے دل و دماغ پر مولانا مرحوم نے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔

حضرت مولانا کی شخصیت کی شاہ کلید

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کیا کچھ نہیں تھے، آپ بلند پایہ مفکر، زبردست داعی الی اللہ، شہرہ آفاق مصنف، مؤرخ، مفسر، ادیب و انشاپرداز، سحر بیان مقرر و خطیب اور ممتاز ترین مربی و عالم ربانی تھے، لیکن میری نظر میں ان کی شخصیت کی شاہ کلید دعوت الی اللہ ہے، ان کا دعوتی پہلو تمام دوسرے پہلوؤں پر حاوی اور غالب ہے، جب وہ سیرت نگاری کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو تاریخ اسلامی کی ان شخصیات کا انتخاب کرتے ہیں جن کی حیات اور کارناموں میں دعوت و عزیمت کا پہلو بہت نمایاں ہے" السیرۃ النبویہ" لکھتے ہیں تو حیات نبوی کے دعوتی پہلو کو سب سے زیادہ اجاگر کرتے ہیں، نصابی کتابیں مرتب کرنے میں انبیاء کرام کے ایمان افروز قصوں کو اپنی توجہات کا مرکز بناتے ہیں اور قصص النبیین جیسی البیلی کتاب وجود میں آتی ہے جس کی سطر سطر میں ادب کی چاشنی اور دعوت کی تڑپ ہے، مختارات میں ادب عالی کا انتخاب کرنے بیٹھتے ہیں تو عربی ادبیات سے ایسے شہ پارے تلاش کر کے لاتے ہیں جن میں دعوتی برق و رعد پنہاں ہیں، "ماذا خسر العالم" میں امت مسلمہ کے عروج و زوال کی داستان سناتے ہیں تو امت مسلمہ کو اس کا کھویا ہوا داعیانہ و قائدانہ مقام یاد دلاتے ہیں، ہندوستان کے مقامی حالات میں ان کا داعیانہ ذہن" پیام انسانیت" کے نام سے ایک نیا عنوان تراشتا ہے اور پیام انسانیت کے غلاف میں اسلام کی دعوت برادران وطن تک پہونچانے کی کوشش کرتے ہیں، غرضیکہ ان کی تمام تحریروں اور تحریکوں میں دعوت کی روح رچی بسی ہوئی ہے، اس لئے میرے خیال میں حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ سب سے اول اور سب سے آخر میں جلیل القدر عالم ربانی اور داعی الی اللہ تھے ان کے سارے کاموں اور کارناموں کو اگر ہم ایک لفظ میں کشید کر لینا چاہیں تو وہ لفظ "دعوت" ہے۔

داعی کا لفظ اس دور میں بڑا ہلکا اور پامال سا ہو گیا ہے حالانکہ یہ لفظ بڑا پرعظمت ہے، انبیاء کرام کی کوششوں کا سرعنوان "دعوت الی اللہ" ہے، صحابہ کرام کی دینی جد و جہد کا خلاصہ دعوت الی اللہ ہے، داعی انبیاء کرام کا وارث و امین ہوتا ہے، اس کے دل میں انبیاء والا سوز و گداز ہوتا ہے، اس کے دل و دماغ میں تمام انسانیت کے لئے خلوص و محبت، فکرمندی و دل سوزی کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہے، داعی الی اللہ بڑا احساس و زیرک ہوتا ہے، زمانہ کی حرکت و رفتار کا نباض، حقیقت آگاہ اور حق آشنا ہوتا ہے، خلوص و محبت کے ساتھ حکمت و دانائی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے، اس کی لغت میں مایوسی اور پست ہمتی کے الفاظ نہیں ہوتے، وہ ناامیدیوں میں امید کے چراغ جلاتا ہے۔

ایک بلند پایہ داعی عظیم مفکر بھی ہوتا ہے

اپنے دور کی فکری گتھیوں کو اسلامی بنیادوں پر سلجھاتا ہے، امت کی ذہنی و فکری رہنمائی کرتا ہے، اسی لئے علوم اسلامیہ سے وابستہ معرکۃ الآراء فکری مسائل میں بھی اسے اپنا موقف واضح کرنا ہوتا ہے۔

مولانا علی میاںؒ اور علوم اسلامیہ

علوم اسلامیہ میں حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو سب سے زیادہ دلچسپی تفسیر قرآن سے تھی، تفسیر قرآن سے مناسبت پیدا کرنے کے لئے انھوں نے حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کے درس قرآن میں شرکت کی اور امتیازی کامیابی حاصل کی۔ حضرت مولانا مرحوم نے ایک مدت تک بڑے ذوق و شوق سے تفسیر قرآن کا درس دیا۔ قرآن کی تلاوت اور قرآن میں تفکر و تدبر آخری عمر تک ان کا محبوب ترین مشغلہ رہا، ایک بار میں نے ان سے بہ ذریعہ خط مشورہ چاہا کہ کن تفسیروں کو مطالعہ میں رکھا جائے تو انھوں نے تحریر فرمایا:-

"تفسیر کے سلسلے میں میرا تجربہ اور مشاہدہ یہ ہے کہ متن قرآن زیادہ سے زیادہ پڑھیں اور اس سے ذاتی ربط پیدا کریں، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کا رسالہ "الفوز الکبیر" ضرور مطالعہ میں رکھیں، باقی کسی ایک تفسیر کا مشورہ دینا بہت مشکل ہے۔"

ان کی تحریروں اور تقریروں کا سب سے بڑا سرچشمہ قرآن کریم تھا، آیات قرآنی سے تذکیر و استنباط میں ان کا ذہن بڑا اخاذ اور رسا تھا، اپنی برجستہ تقریروں میں انھوں نے آیات قرآنی اور مضامین قرآنی کا جس کثرت اور لیاقت کے ساتھ استعمال کیا ہے اس سے ان کے تبحر علمی، دقیقہ سنجی اور نکتہ رسی کا اندازہ ہوتا ہے۔

احادیث نبویہ سے انھیں بہت مناسبت تھی فن حدیث انھوں نے بڑے جلیل القدر اساتذہ سے سیکھا۔ ان میں نمایاں ترین نام حضرت مولانا حیدر حسن خاں صاحب اور شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے ہیں، کچھ دنوں انھوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں صحیح بخاری اور دیگر کتب حدیث کا درس بھی دیا۔

علم فقہ کی تحصیل بھی انھوں نے ماہر فن اساتذہ سے کی، لیکن اس علم سے تدریسی اشتغال کا انھیں زیادہ موقع نہیں ملا، اس لئے مسئلہ بتانے اور فتویٰ دینے سے وہ ہمیشہ گریز فرماتے تھے، کوئی اگر مسئلہ پوچھتا تو مفتی صاحب ندوۃ العلماء یا کسی دوسرے استاذ فقہ کے پاس بھیج دیتے، استفتاء پر مشتمل خطوط دارالافتاء ندوۃ العلماء یا مجلس تحقیقات شرعیہ بھجوا دیتے۔

ائمہ مجتہدین اور فقہ اسلامی مولانا کی نظر میں

بیسویں صدی میں متجددین کا ایک طبقہ پوری اسلامی فقہ کو ائمہ مجتہدین کی ذاتی رائے قرار دے کر مسترد کر دینے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ شریعت کا جوا گردن سے اتار پھینکا جائے، یہ طبقہ فقہائے مجتہدین کے علمی کارناموں کا استخفاف کر رہا تھا اور ان کے خلاف زبان طعن دراز کر رہا تھا، اس پس منظر میں حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے فقہ اسلامی اور فقہائے اسلام کا زبردست دفاع کیا۔ اپنی متعدد تحریروں میں فقہائے مجتہدین کے کارناموں کو خراج تحسین پیش کیا اور نئی نسل کے دل و دماغ میں فقہ اسلامی اور فقہاء کے اجتہادی کارناموں کی اہمیت جاگزیں کر دینے کی کوشش کی، حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی تحریر فرماتے ہیں:

"اسلام جزیرۃ العرب سے (جہاں زندگی سادہ اور تمدن انتہائی محدود تھا) نکل کر مصر و شام، عراق و ایران اور دوسرے وسیع، زرخیز اور سرسبز و شاداب خطوں میں پہونچ گیا تھا جہاں کا نظام تمدن و معیشت، تجارت، انتظام ملکی سب بہت وسیع اور پیچیدہ شکلیں اختیار کر گئے تھے، اس وقت ان نئے حالات و مسائل میں اسلام کے اصول کی تطبیق کے لئے بڑی اعلیٰ ذہانت، معاملہ فہمی، باریک بینی، زندگی اور سوسائٹی سے وسیع واقفیت، انسانی نفسیات اور اس کی کمزوریوں سے باخبری، قوم کے طبقات اور زندگی کے مختلف شعبوں کی اطلاع اور اس سے بیشتر اسلام کی تاریخ، روایات اور روح شریعت سے گہری واقفیت، عہد رسالت اور زمانۂ صحابہؓ کے حالات سے پوری آگاہی اور اسلام کے پورے علمی ذخیرہ (قرآن و حدیث اور سنت، قواعد) پر کامل عبور کی ضرورت تھی۔

یہ اللہ کا بڑا فضل تھا اور اس امت کی اقبال مندی کہ اس کار عظیم کے لئے ایسے لوگ میدان میں آئے جو اپنی ذہانت، دیانت اخلاص اور علم میں تاریخ کے ممتاز ترین افراد ہیں، پھر ان میں سے چار شخصیتیں امام ابوحنیفہ (م ۱۵۰ھ) امام مالک (م ۱۷۹ھ) امام شافعی (م ۲۰۴ھ) امام احمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ) جو فقہ کے چار دبستان فکر کے امام ہیں، اور جن کی فقہ اس وقت تک عالم اسلام میں زندہ اور مقبول ہے۔ اپنے تعلق باللہ، للہیت، قانونی فہم، علمی انہماک اور جذبہ خدمت میں خاص طور پر ممتاز ہیں، ان حضرات نے اپنی پوری زندگی اور اپنی ساری قابلیتیں اس بلند مقصد اور اس اہم خدمت کے لئے وقف کر دی تھیں، انھوں نے دنیا کے کسی جاہ و اعزاز اور کسی لذت و راحت سے

سرکار نہیں رکھا تھا۔ امام ابو حنیفہ کو دو بار عہدۂ قضا، پیش کیا گیا اور انھوں نے انکار کیا، یہاں تک کہ قید خانہ میں ہی آپ کا انتقال ہوا۔ امام مالکؒ نے ایک مسئلہ کے اظہار میں کوڑے کھائے اور ان کے شانے اتر گئے، امام شافعیؒ نے زندگی کا بڑا حصہ عسرت میں گزارا اور اپنی صحت قربان کر دی۔ امام احمدؒ نے تن تنہا حکومت وقت کے رجحان اور اس کے سرکاری مسلک کا مقابلہ کیا اور اپنے مسلک اور اہل سنت کے طریقہ پر پہاڑ کی طرح جمے رہے، ان میں سے ہر ایک نے اپنے موضوع پر تن تنہا اتنا کام کیا اور مسائل و تحقیقات کا اتنا بڑا ذخیرہ پیدا کر دیا جو بڑی بڑی منظم جماعتیں اور علمی ادارے بھی آسانی سے نہیں پیدا کر سکتے۔

اسلام کی ابتدائی صدیوں میں ان ائمۂ فن اور صاحب اجتہاد علماء کا پیدا ہو جانا اس دین کی زندگی اور اس امت کی کارکردگی کی صلاحیت کی دلیل تھی، ان کی کوششوں اور ذہانتوں سے اس امت کی عملی معاملاتی زندگی میں ایک نظم اور وحدت پیدا ہو گئی اور امت اس ذہنی انتشار اور معاشرتی بے نظمی اور ابتری سے محفوظ ہو گئی، جس کی دوسری قومیں اپنے ابتدائی عہد میں شکار ہو چکی ہیں، اور وہ تدریجی طور پر ایسے لادینی راستے پر پڑ گئیں کہ ان کے لئے لادینی نظام زندگی اختیار کرنا ضروری ہو گیا، یا پھر ایسے غیر اسلامی قوانین کو انھیں اختیار کرنا پڑتا، جو اس کی دینی روح اور اصول و مبادی سے متصادم ہوں اور وہ مسیحی یورپ کے نظریہ دین و سیاست کی تفریق کے ان اصولوں کو اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتے جو خاص حالات و ماحول اور مسیحی مذہب کی مخصوص وضع اور ساخت کا نتیجہ تھا۔

اگر خدانخواستہ علمائے متقدمین فقہی اجتہاد، احکام اور مسائل کے استنباط و استخراج میں کسلمندی اور سستی اور ڈھیل سے کام لیتے اور جدوجہد کے بجائے راحت و آرام کو اختیار کرتے یا ان کے علمی کارنامے اہمیت کے حامل نہ ہوتے اور ان کے فطری ملکہ اور صلاحیت میں جمود و تعطل پیدا ہو جاتا تو اس وقت کی حکومت عملی زندگی اور وقت کے مطالبات و تقاضوں سے مجبور ہو کر رومی اور ایرانی قوانین کو اسلامی دنیا پر منطبق کر دیتی، اس لئے کہ نئے حالات و مسائل سے مسلمانوں کا مقابلہ تھا، تجارت و زراعت، جزیہ و خراج، محکومین اور مفتوحہ ممالک کے نئے نئے مسائل درپیش تھے، قدیم عادات و رواج کا بہت بڑا ذخیرہ اور نئی نئی ضروریات تھیں جو مسلمانوں کی قوت فیصلہ اور اسلامی احکام کی منتظر تھیں۔ ان میں سے نہ کسی ضرورت کو ٹالا جا سکتا تھا اور نہ سرسری طور پر ان سے گذرا جا سکتا تھا، حکومت مفصل و مکمل آئین و قانون سلطنت کی طالب تھی، حکومت کی انتظامی مشین کو روکا نہیں جا سکتا تھا، اور قانون اسلامی کی ترتیب میں تاخیر ہوتی تو وہ رومی یا ایرانی قانون کو اختیار کرنے پر مجبور تھیں، جس کا نتیجہ وہ ہوتا جو اس وقت کی نام نہاد اسلامی سلطنتوں کا ہوا ہے، علماء کی ذرا سی غفلت اور محافظین سنت کی دماغی کاہلی اور راحت پسندی اس امت کو ہزاروں برس کے لئے اسلامی معاشرت اور اس کے اجتماعی قوانین کی برکت سے محروم کر دیتی ؂

یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

اور مساجد میں تھوڑے وقت اور محدود مدت کے لئے دینداری کی زندگی گذارنا اور اپنے گھروں بازاروں اور عدالتوں میں زیادہ وقت جاہلی یا لادینی زندگی گذارنا اس کے لئے نوشتۂ تقدیر بن جاتا، جیسا کہ اس وقت ان ملکوں اور حکومتوں کا حال ہے جس کا سرکاری مذہب تو عیسائیت ہے لیکن ان کے پاس مسیحی قانون شریعت موجود نہیں یا جیسا کہ (انتہائی شرمندگی اور افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے) ان ملکوں اور حکومتوں کا حال ہے جو عقیدے اور عبادات کی حد تک تو مسلمان کہلاتی ہیں لیکن اسلام کو قانون شریعت کے طور پر قبول نہیں کرتیں، اگر یہ بات اس مسیحیت کے لئے قابلِ قبول اور گوارا ہے جو دستور اور قانون سازی کے سرچشمہ سے محروم ہے اور دین کو زندگی پر منطبق کرنے پر اس کو اصرار بھی نہیں لیکن یہ کسی طرح بھی اس اسلام کے لئے قابلِ قبول نہیں ہو سکتا جو دین و دنیا اور عبادت و سیاست کا جامع ہے۔

چنانچہ امت اسلامیہ اپنی زندگی کے انتہائی سنگین مرحلہ سے گزر رہی تھی بلکہ وہ ایک ایسے دوراہے پر کھڑی تھی جہاں ایک غلطی یا معمولی لغزش بھی اس کے رشتہ حیات کو اسلامی نظام اور قانون سے کاٹ کر رکھ دیتی اور آنے والی نسلوں کو ایسی زندگی گذارنے پر مجبور کر دیتی جس میں دین و مذہب کی ہلکی سے ہلکی پرچھائیں بھی نہ پائی جاتی۔

اسی طرح اس بات کی شدید ضرورت تھی کہ عبادات کے احکام و مسائل بیان کئے جائیں تاکہ سہو و نسیان اور انسانی بھول چوک اور شریعت کی ناواقفیت کی وجہ سے

جو باتیں پیش آتی ہیں ان کو حل کیا جائے جو لوگ نئے نئے اسلام کے دائرے میں داخل ہوئے ہیں ان کے مسائل کا حل، نماز میں بھول چوک، رکعات میں کمی زیادتی، روزہ دار کے احکام و مسائل، زکوٰۃ کب اور کن چیزوں پر کتنی مقدار میں فرض ہے، اسی طرح حج جیسی عبادت جس کی ادائیگی میں خاصا وقت صرف ہوتا ہے اور ایک بڑے رقبہ میں حاجی کو شعائر حج ادا کرنے کے لئے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کی ضرورت پیش آتی ہے اور قدم قدم پر سنت اور اسوۂ نبویؐ کا لحاظ اس کو رکھنا پڑتا ہے۔ ان تمام امور میں فوری احکام اور بر وقت فیصلہ کی ضرورت تھی، کسی ادنیٰ تاخیر کی کوئی گنجائش نہیں تھی، اور نہ ہی اس بات کی ضرورت کہ ہر کس و ناکس کو قرآن و سنت سے براہ راست رجوع کرکے مسائل اخذ کرنے کا مشورہ دیا جائے، اس لئے ضروری تھا کہ احکام و جزئیات کا وجود ہو اور فقہی ذخیرہ آسانی کے ساتھ ہر ایک کو میسر آسکے، ایسے سرآمد روزگار علماء اور ماہرین شریعت کی موجودگی بھی ضروری تھی جو عوام کی رہنمائی کے لئے ہر وقت مستعد ہوں اسی بنا پر اسلام دیگر مذاہب کی طرح تاریخی یادگاروں کا ایسا میوزیم بننے سے محفوظ ہوگیا جہاں ہر طرح کی عبادات اور طرح طرح کی حرکات و سکنات پائی جاتی ہیں اس کا مشاہدہ ہمیں ان مذاہب کے ماہانہ یا سالانہ تہواروں میں اچھی طرح ہو جاتا ہے جن کے ماننے والوں میں عملی وحدت اور یک جہتی کا فقدان ہوتا ہے اور نہ ہی ان میں روحانیت اخلاقی و دینی رنگ پایا جاتا ہے، اس کے برعکس مسلمانوں کی مساجد، حج کے مقامات اور شعائر کی ادائیگی، سب میں یکسانیت، نظم و وحدت، ہم آہنگی اور باہمی ربط و اتحاد پایا جاتا ہے، ان میں عقیدے اور عبادات کی وحدت ہوتی ہے کہ ایک ہی شریعت کے آگے سب سرنگوں ہوتے ہیں اس کے دو بنیادی اسباب ہیں: ایک تو یہ کہ دینی تعلیمات میں حیرت انگیز وحدت اور اصالت ہے، دوسرے محدثین اور فقہاء کا کمال اور ان کا عظیم احسان ہے کہ انھوں نے اپنی غیر معمولی جد و جہد سے اسلامی شریعت کے ذخیرہ کو نہ صرف محفوظ اور باقی رکھا بلکہ قرآن و سنت اور یکساں دینی نظام سے اس کو مربوط کردیا۔

اسلامی فقہ کی تدوین و ترتیب اور شرعی احکام و مسائل کے استنباط میں جس اجتہادی بصیرت کا ثبوت دیا گیا وہ انتہائی بر وقت مناسب اور برمحل تھا اور فطری و منطقی تقاضوں اور اس انسانی، عالمی اور ابدی دین کی خصوصیات کے عین مطابق .... جس طرح صرف و نحو عربی زبان و بیان کے قواعد کی بنیاد قرآن مجید عربی اشعار اور اولین عرب کے کلام پر رکھی گئی اور ان کا تدریجی ارتقاء ہوا اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ فقہ کی تدوین انتہائی ضروری تھی کہ عرب و عجم پر یہ دین حاوی تھا اور اس کے دائرے میں داخل ہونے والا ہر مسلمان اس کا مکلف ہے، اس لئے بھی کہ فقہ کا تعلق مسلمان کی پوری زندگی سے ہوتا ہے اور عقیدہ و عبادت سے اس کا غیر معمولی ربط و تعلق اور اخروی عذاب و ثواب، نجات و ہلاکت اور سعادت و شقاوت کا دار و مدار ان فقہی احکام پر ہی ہے"۔ لے

دور حاضر اور اجتہاد

حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے اجتہاد و تقلید کے معرکۃ الآراء مسئلہ میں بھی نقطۂ اعتدال کی طرف امت کی رہبری کی، اپنے اپنے حدود و قیود میں دونوں کو ضروری قرار دیا، دور حاضر میں اجتہاد کی ضرورت و اہمیت تسلیم کرنے کے ساتھ وہ اس طبقہ پر سخت نکیر کرتے ہیں جو اجتہاد کے نام پر شریعت اسلامی کی حقائق ثابتہ سے کھلواڑ کرنا چاہتا ہے، ایک جگہ حضرت مولانا تحریر فرماتے ہیں:۔

"اس دور میں اجتہاد کی باتیں بہت ہو رہی ہیں اور یہ نعرہ لگایا جارہا ہے کہ اس زمانہ میں اجتہاد کی ضرورت ہے، چنانچہ اجتہاد کا نعرہ لگانا ایک طرح سے ترقی پسندی کی علامت بن گیا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ اجتہاد اس زمانہ کی حاجت اور اس دین کی ضرورت ہے جو زندگی کے قافلے کی رہنمائی اور قیادت کرتا ہے، خصوصاً اس زمانہ میں اور بھی اس کی ضرورت ہے جب کہ تمدن اور صنعت و تجارت نے ایسی غیر معمولی اور حیرت انگیز ترقی کرلی ہے جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا، جدید تجارتی معاملات اور معاہدوں میں ایسے فقہی احکامات اور فیصلوں کی ضرورت ہوتی ہے جو اسلامی فقہ کے اصولوں اور شریعت اسلامی کے مقاصد سے ہم آہنگ ہوں۔ لیکن شرعی مسائل اور جدید عصری ایجادات کے بارے میں جو لوگ اجتہاد کا نعرہ لگاتے رہتے ہیں وہ اسلامی دنیا کے وہ قائدین و مفکرین اور مغربی دانش گاہوں کے فضلاء ہیں

جنھوں نے خود مغربی تہذیب و تمدن کا سامنا
پورے عزم و ارادے اور ایمان و یقین سے
کرنے میں اپنی مہارت اور ذہانت و ذکاوت
کا ثبوت نہیں دیا ہے، حالانکہ ان کا فرض تھا
کہ مغربی تہذیب و تمدن اور اس کی سائنسی
ایجادات اور ترقی، اس کی خوبیوں اور خامیوں
کے درمیان تمیز کرکے وہی چیزیں لیتے جو
مشرقی قوموں اور ان کے دین و مذہب
اور تہذیب و مزاج سے میل کھائیں اور
ان قوموں کو بھی روشنی دکھاتے جو مادیت
کا شکار ہو چکی ہیں، وہ مغرب سے جو کچھ
حاصل کرتے پہلے اس سے اس غبار کو
جھاڑ دیتے جو قرون مظلمہ ہی سے ان کا
جز بن گئی ہے اور اب بھی اس کی وجہ سے
نفسیاتی کشمکش اور اعصابی تناؤ میں مبتلا
ہیں، مغربی دانش گاہوں کے ان فضلاء کو
اس کا کوئی حق نہیں پہونچتا کہ اس دور میں
وہ ان علوم سے فائدہ اٹھائیں، اس لئے کہ
جن میدانوں میں انھوں نے تخصص کیا ہے
اور جو ان کا خاص موضوع رہا ہے اس
میں بھی انھوں نے اپنے رول کو ادا نہیں
کیا اور نہ ہی نظام تعلیم و تربیت کو آزاد
اسلامی نظام تعلیم کے سانچے میں انھوں
نے ڈھالنے کی کوشش کی، حالانکہ یہ کام
بھی اجتہاد ہی کی طرح ہے لیکن انسان کی ہمیشہ
سے یہ خصوصیت رہی ہے کہ وہ خود کچھ نہیں
کر پاتا تو دوسروں کو مورد الزام ٹھہراتا اور
اس سے مطالبہ کر بیٹھتا ہے"۔

اس گرفت اور احتساب کے باوجود یہ
بات بہر حال اپنی جگہ صحیح ہے اور اس میں کوئی
شک نہیں کہ اجتہاد کی ضرورت اپنی جگہ پر ہے، اس
مسئلہ پر کوئی اختلاف نہیں، جو لوگ علوم شریعت
میں بصیرت اور اس پر دسترس رکھتے ہیں وہ اس
میدان میں اپنا قائدانہ کردار ادا کریں اور اصول فقہ
جیسے قیمتی خزانہ سے جس کی کوئی نظیر قوموں اور
ملتوں میں نہیں ملتی، احکام و مسائل کے استنباط
میں فائدہ اٹھائیں، فقہ کا یہ ذخیرہ عرصہ سے صرف
تاریخ بن کر رہ گیا ہے، جس سے ہمیں صرف یہ
معلوم ہوتا ہے کہ پہلے دور کے مجتہدین کس طرح
احکام و مسائل کا استنباط کیا کرتے تھے اس سے
زیادہ کچھ نہیں، لیکن وقت کی گھڑی کو نہ تو اپنی جگہ
روکا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کو معطل کیا جا سکتا
ہے اور نہ ہی اس کو ماضی کی طرف لوٹایا جا سکتا ہے،
جبکہ اسلام ایسی قوموں اور معاشرہ کا دین ہے
جو ان مسائل و مشکلات کے ساتھ ساتھ چلتا ہے بلکہ
ان کا سامنا کرتا ہے۔

اجتہاد کے معطل ہونے کی وجہ

مختلف ادوار، ملکوں اور شہروں میں
امت نے اجتہاد کو اختیار کیا اور علماء اس پر گامزن
رہے، مذاہب اربعہ کی کتابیں ان مثالوں سے
بھری پڑی ہیں، لیکن تاتاری حملہ کے بعد مذاہب اربعہ
(جدید مفہوم میں ہم اس کو علمی اکیڈمی یا ادارے
سے تعبیر کرتے ہیں) پر کسی قدر پژمردگی اور کمزوری
چھا گئی، اس لئے کہ تاتاری حملے نے خود اعتمادی اور
ذہانت کے سوتوں کو خشک کر دیا تھا۔

جو قومیں تاتاری قوموں کے ماتحت ہوئیں
ان کے اندر مسلح اور غیر مسلح لشکر کے مقابلے کی
جرأت ختم ہو کر رہ گئی، چنانچہ اسلامی دنیا کے
مشرقی حصے کے علماء نے اس خاص وقفہ میں اجتہاد
کی سرگرمیوں پر کسی حد تک پابندی لگانے ہی
میں عافیت سمجھی، اس لئے کہ انھیں اندیشہ ہونے
لگا کہ اگر اجتہاد کی اجازت دیدی گئی تو حکام اور
والیان سلطنت کے سیاسی اور انفرادی مصالح
کا اس میں خیال رکھا جائے گا اور اس سے نفع
کے بجائے نقصان زیادہ ہوگا، اس کا بھی امکان
ہے کہ دین میں تحریف کا سبب انفرادی اجتہاد
بن جائے یا اس امت کی رفتار میں انحراف اور کجی
پیدا ہو جائے، اگرچہ ان علماء کا یہ خیال وقتی طور
پر پابندی کے لئے تھا جس کی بنیاد فقہ کے اس
اصول پر رکھی گئی تھی کہ جلب منفعت پر دفع ضرر
کو ترجیح دی جانی چاہئے۔

اب اگر اجتہاد کا دروازہ کھولنا ہی ضروری
ہے تو ضرور کھولا جائے لیکن اصول فقہ کی کتابوں
میں اس کے لئے جو شرائط بیان کی گئی ہیں ان کا
لحاظ ضروری ہے، بہتر تو یہ ہے کہ انفرادی طور پر
اجتہاد کے بجائے اجتماعی طور پر اجتہاد کیا جائے،
وہ اس طرح کہ شریعت کے ماہرین کی ایک اکیڈمی
ہو جس میں کسی مسئلہ پر طویل غور و فکر، بحث
و مباحثہ اور تبادلۂ آراء اور قرآن و سنت اور فقہ
و اصول فقہ کے پورے ذخیرے کے بھرپور جائزے
کے بعد فیصلہ کیا جائے تاکہ کسی سازش یا کسی سیاسی
قوت یا استبدادی حکومت کا عکس نہ پڑنے پائے۔

اجتہاد کے حدود اور اس کا میدان

جدید طبقہ کے لوگ اجتہاد کی دعوت دیتے
ہیں خصوصاً عصری دانشگاہوں کے پرجوش جذباتی
نوجوان اور اسلامی ملکوں کے بعض سربراہ، ان کی
اس دعوت سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ مسئلہ
میں اجتہاد مطلق کی دعوت دے رہے ہیں، وہ مغربی
اقدار و فہم اور عصری پیمانوں کو جوں کا توں لینے پر
مصر ہیں، گویا کہ زمانہ پہلے اسلامی دور کی طرح ہو گیا
ہے جب اسلام نیا نیا آیا تھا اور انسانی سوسائٹی
مکمل طور پر انقلاب سے دوچار ہو چکی تھی اور گذشتہ
دور میں فقہاء اور مجتہدین نے جو نتائج نکالے
اور علم و تحقیق اور مطالعہ کے بعد جو اصول انھوں

نے بنائے تھے وہ اپنی قیمت اور اہمیت کھو چکے ہیں اور اب موجودہ زمانہ اور قوموں کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں، اس میں زیادہ سطحیت، لاپروائی، نام نہاد ترقی پسندانہ ادب کے پھیلائے ہوئے پروپیگنڈے کا اثر ہے، اس ادب نے نوجوانوں کے سامنے زمانہ کی ایسی تصویر کھینچی ہے جیسے یہ دور بالکل نیا ہے اور گذشتہ زمانہ سے یہ دور کسی طرح بھی ہم آہنگ نہیں، واقعہ یہ ہے کہ یہ تصویر تخیلات پر مبنی ہے اور اس میں ذرہ برابر حقیقت نہیں، واقعیت و منطقیت سے زیادہ اس میں جذباتیت سے کام لیا گیا ہے۔

اسلام ایک تغیر پذیر دنیا میں

یہاں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقالہ کا اختتام اس تقریر کے اقتباس پر کروں جو میں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایک سیمینار بعنوان "اسلام ایک تغیر پذیر دنیا میں" کی تھی۔

"زمانہ اپنی تغیر پذیری اور زیادہ صحیح الفاظ میں تغیر پرستی یا اقبال کے الفاظ میں" تازہ پسندی" کے لئے بدنام زیادہ ہے اور بد کم ہے، بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ زمانہ تغیر پذیری ہی کا نام ہے، زمانہ ثبات اور تغیر کے متوازن مرکب اور مجموعے کا نام ہے جب کبھی اس کا تناسب بگڑے گا یعنی ٹھہراؤ تغیر پر غالب آجائے گا یا تغیر ٹھہراؤ پر غالب آجائے گا تو زمانے، سوسائٹی اور تہذیب کا توازن بگڑ جائے گا، ان دونوں کے تناسب کا معاملہ کیمیاوی اجزا کے تناسب سے بھی کہیں زیادہ نازک ہے، زمانہ جہاں تغیر کی صلاحیت رکھتا ہے اور اس کو بدلنا چاہئے اس لئے کہ بدلنا زندگی کی کوئی کمزوری، کمی یا عیب نہیں وہ زندگی کا عین مزاج ہے اور زندگی کی تعریف ہے۔

جاوداں پیہم دواں ہردم جواں ہے زندگی

وہ زندگی زندگی کہلانے کی مستحق نہیں جس میں نمو کی صلاحیت مفقود ہو چکی ہو، وہ درخت شاداب اور پرثمر نہیں کہلایا جاسکتا جو اپنی نمو کی صلاحیت کھو دے۔

تغیر پذیری یا اس کے بجائے اگر آپ اس کو نمو یا ترقی کا نام دیں تو میرے خیال میں آپ اس کے ساتھ زیادہ انصاف کر سکیں گے۔ زمانہ تغیر قبول کرنے کے ساتھ مقابلہ کی بھی ایک طاقت رکھتا ہے، ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ زمانہ کتنا بدل گیا اور اس تبدیلی کے مظاہر بھی ہم کو صاف نظر آتے ہیں لیکن زمانے نے اپنی اندرونی صلاحیتوں کو باقی رکھنے اور اپنے صالح اجزاء و عناصر کو محفوظ رکھنے کے لئے کتنی کشمکش کی اور کس قوت مقابلہ سے کام لیا، عام حالات میں ہم اس کو نہیں دیکھ پاتے، اس کے لئے ایک خاص طرح کی خوردبین کی ضرورت ہے۔

ایک دریا ہی کو آپ لے لیں جو روانی اور حرکت کے لئے سب سے بہتر مثال ہو سکتا ہے، دریا کی کوئی موج اپنی پہلی موج کی بالکل عین اور مماثل نہیں ہوتی، لیکن دریا اپنی گذرتی ہوئی موجوں کے باوجود اپنے نام کے ساتھ، اپنے حدود کے ساتھ، اپنی بہت سی خصوصیات کے ساتھ ہزاروں برس سے قائم ہے، دجلہ و فرات آج بھی دجلہ و فرات کہلائیں گے اور گنگ و جمن آج بھی گنگ و جمن کہلاتے ہیں۔

زمانے کے اندر ٹھہراؤ بھی ہے اور بہاؤ بھی، اگر زمانہ ان دونوں خصوصیتوں اور صلاحیتوں میں سے کسی ایک سے محروم ہو جائے تو وہ اپنی افادیت کھو دے گا۔ اسی طرح کائنات میں جتنے بھی وجود، شخصیتیں اور ہستیاں ہیں سب کے اندر مثبت اور منفی لہریں برابر اپنا کام کرتی رہتی ہیں اور دونوں لہروں کے ملنے سے وہ فریضہ ادا ہو جاتا ہے اور وہ منصب پورا ہوتا ہے جو ان کے سپرد کیا گیا ہے۔

مذہب زندگی کا نگراں ہے

جہاں تک مذہب کا تعلق ہے، مذہب کے ایک پیرو اور طالب علم کی حیثیت سے میں مذہب کے لئے یہ پوزیشن قبول نہیں کر سکتا اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ حضرات بھی مذہب کے لئے یہ پوزیشن پسند نہیں کریں گے کہ مذہب ہر تغیر کا ساتھ دے، یہ کسی تھرمامیٹر کی تعریف تو ہو سکتی ہے کہ وہ درجۂ حرارت وبرودت بتلائے، یہ مرغ بادنما (WEATHER-COCK) کی بھی تعریف ہو سکتی ہے جو کسی اونچی عمارت یا ہوائی اڈے پر لگا دیا گیا ہے صرف یہ معلوم کرنے کے لئے کہ ہوا کس طرف کی چل رہی ہے لیکن مذہب کی تعریف نہیں ہو سکتی، میں سمجھتا ہوں کہ آپ حضرات میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہوگا کہ مذہب کو اس کے بلند مقام سے اتار کر تھرمامیٹر یا مرغ بادنما کا مقام دینا چاہتا ہو، کہ مذہب کا کام یہ ہے کہ وہ صرف زمانے کی تبدیلیوں کی رسید دیتا رہے، اکنالج (ACKNOWLEDGE) کرتا رہے یا اس کی عکاسی کرتا رہے، صحیح آسمانی مذہب کے تو کیا کسی نام نہاد مذہب کے پیرو یا اس کے نمائندے بھی اس پوزیشن کو قبول کر لینے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔

مذہب تغیر کو ایک حقیقت مانتا ہے اور اس کے لئے وہ ساری گنجائش رکھتا ہے جو ایک صالح، صحیح، فطری اور جائز تغیر کے لئے ضروری ہوں، مذہب زندگی کا ساتھ دیتا ہے، لیکن یہ محض ساتھ دینا، یا محض رفاقت اور پیروی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ مذہب کا فریضہ

یہ بھی ہے کہ وہ اس کا فرق کرے کہ یہ صالح تغیر ہے یہ غیر صالح تغیر ہے، یہ تخریبی رجحان ہے اور یہ غیر تخریبی رجحان ہے اس کا نتیجہ انسانیت کے حق میں یا کم از کم اس مذہب کے پیروؤں کے حق میں کیا ہوگا۔ مذہب جہاں رواں دواں زندگی کا ساتھ دینے والا ہے وہاں وہ زندگی کا محتسب نگران، گارجین (GUARDIAN) اور زندگی کا اتالیق بھی ہے۔

گارجین کا کام یہ نہیں ہے کہ جو ہستی اس کی اتالیقی میں ہے اس کے ہر صحیح و غلط رجحان کا ساتھ دے اور اس پر مہر تصدیق ثبت کردے۔ مذہب ایسا سسٹم نہیں ہے کہ جہاں ایک قسم کی مہر رکھی ہوئی ہے، ایک ہی طرح کی روشنائی ہے اور ایک ہی طرح کا ہاتھ ہے، جو دستاویز اور تحریر آئے، مذہب کا کام یہ ہے کہ وہ اس پر مہر تصدیق ثبت کردے، مذہب پہلے اس کا جائزہ لے گا پھر اس پر اپنا فیصلہ صادر کرے گا اور ترغیب اور بعض اوقات مجبوراً ترہیب کے ذریعہ اس سے باز رکھنے کی کوشش کرے گا، اور اگر کوئی غلط دستاویز اس کے سامنے آتی ہے جس سے اس کو اتفاق نہیں یا جس کو وہ انسانیت کے حق میں مہلک اور تباہ کن سمجھتا ہے تو نہ صرف یہ کہ وہ اس پر مہر تصدیق ثبت کرنے سے انکار کرے گا بلکہ اس کی بھی کوشش کرے گا کہ وہ اس کی راہ میں مزاحم ہو۔

یہاں اخلاقیات اور مذہب میں ایک فرق پیدا ہوجاتا ہے، مذہب اپنی ذمہ داری اور فرض سمجھتا ہے کہ غلط رجحان کو روکے، ماہر اخلاقیات و نفسیات کی ڈیوٹی صرف یہ ہے کہ وہ غلط رجحانات کی نشاندہی کردے یا اپنا نقطۂ نظر ظاہر کردے، لیکن مذہب اس کی کوشش کرے گا کہ وہ اس کا راستہ روک کر کھڑا ہوجائے۔

اگر ہم نے اس باریک بینی، گہرائی و گیرائی، امانت و احساس ذمہ داری، اس دین کے مزاج اور اس کے پیغام سے گہری واقفیت کا ثبوت دیا اور اسی کے ساتھ ہم نے موجودہ زمانہ کے مزاج و خصوصیات کو سمجھا جس میں نمو اور تغیر کی صلاحیت ہے اور ثبات و استقامت بھی، اور اس نے قدیم صالح عناصر کو باقی بھی رکھا ہے۔ اگر ہم نے ان خصوصیات کو اچھی طرح سمجھ لیا تو فقہ اسلامی کی ضرورت (وسیع معنوں میں) کو ہم پوری کرسکتے ہیں اور ہم اسلامی سوسائٹی کی بھی ضرورتوں کو پوری کرسکتے ہیں، اور اسلامی احکام اور دینی تعلیمات پر ہم اس مہذب اور ترقی یافتہ زمانہ میں بھی عمل کرکے دکھا سکتے ہیں اور اس زندگی کا بھی ساتھ دے سکتے ہیں جو تیزی اور انتہائی سرعت کے ساتھ ترقی کرتی جارہی ہے[1]

تقلید کے بارے میں مولانا کا نقطۂ نظر

تقلید کے مسئلہ میں بھی حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ بہت معتدل نقطۂ نظر رکھتے تھے۔ اس سلسلہ میں ان کا نقطۂ نگاہ حضرت شاہ ولی اللہؒ محدث دہلوی کے نقطۂ نگاہ سے ہم آہنگ تھا، حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے نقطۂ نظر کو حضرت مولانا علی میاںؒ نے بہت تفصیل کے ساتھ تحسین و استحسان کے انداز میں بیان فرمایا ہے، مولانا مرحوم رقم طراز ہیں:

"شاہ صاحب غایت انصاف اور حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے ایسے شخص کو تقلید کے بارے میں معذور سمجھتے ہیں جو کسی مذہب فقہی یا معین امام کا مقلد تو ضرور ہے لیکن اس کی نیت محض صاحب شریعت کی پیروی اور اتباع نبوی ہے لیکن وہ اپنے اندر اس کی اہلیت نہیں پاتا کہ وہ حکم شرعی اور جو چیز کتاب وسنت سے ثابت ہے اس تک براہ راست پہونچ جائے، اس کے کئی اسباب ہوسکتے ہیں، خواہ وہ عامی شخص ہے، یا اس کے پاس براہ راست تحقیق کرنے کے لئے وقت اور فرصت نہیں، یا ایسے وسائل (علم و تحقیق) حاصل نہیں جن سے وہ نصوص کا خود پتہ چلالے، یا ان سے مسئلہ استنباط کرلے، شاہ صاحب علامہ ابن حزم کا یہ قول نقل کرنے کے بعد کہ تقلید حرام ہے اور کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی کے قول کو بلا دلیل قبول کرلے تحریر فرماتے ہیں:

"ابن حزم کے قول کا مصداق وہ شخص نہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول کے علاوہ کسی کو اپنے لئے واجب الطاعت نہیں سمجھتا وہ حلال اسی کو گردانتا ہے جس کو اللہ اور اس کے رسولؐ نے حلال کیا اور حرام اسی کو مانتا ہے جس کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا، لیکن چونکہ اس کو براہ راست آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم (کے اقوال و احوال) کا علم حاصل نہیں، اور وہ آپ کے مختلف اقوال میں تطبیق دینے کی صلاحیت اور آپ کے کلام سے مسائل استنباط کرنے کی قدرت نہیں رکھتا، وہ کسی خدا ترس عالم کا دامن پکڑ لیتا ہے، یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ صحیح بات کہتا ہے، اور اگر مسئلہ بیان کرتا ہے تو اس میں وہ محض سنت نبوی کا پیرو اور ترجمان ہوتا ہے، جیسے ہی اس کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا یہ خیال صحیح نہیں تھا، اسی وقت وہ بغیر کسی بحث و اصرار کے اس کا دامن چھوڑ دیتا ہے، بھلا ایسے آدمی

کو کوئی کیسے مطعون کرے اور اس کو سنت و شریعت کا مخالف قرار دے گا؟

سب کو معلوم ہے کہ استفتاء اور افتاء کا سلسلہ عہد نبوی ﷺ سے لے کر برابر چلتا رہا ہے، اور دونوں میں کیا فرق ہے کہ آدمی ہمیشہ ایک سے فتوی لیتا ہے یا کبھی ایک سے فتوی لیتا ہے کبھی دوسرے سے، ایسی حالت میں کہ اس کا ذہن صاف ہے، اس کی نیت سلیم ہے، اور وہ صرف اتباع شریعت چاہتا ہے، یہ بات کیسے جائز نہیں؟ جب کہ کسی فقیہ کے بارے میں ہمارا یہ ایمان نہیں ہے کہ اللہ نے اس پر آسمان سے فقہ اتاری اور ہم پر اس کی اطاعت فرض ہے۔“ [3]

ایک دوسری جگہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ اجتہاد و تقلید کے بارے میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے معتدل نقطۂ نظر کی تمہید بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

”حضرت شاہ صاحب کے ان وہبی کمالات اور تجدیدی امتیازات میں سے جن سے اللہ تعالیٰ نے ان کو خاص طور پر نوازا تھا وہ متوازن اور معتدل مسلک اور وہ نقطۂ اعتدال ہے جو انھوں نے اجتہاد و تقلید کے درمیان اختیار کیا، اور جو ان کے طبع سلیم، ذوق صحیح اور حقیقت پسندی کا بہترین مظہر ہے، ایک طرف وہ لوگ تھے، جو ہر مسلمان کو خواہ وہ عام ہو یا خاص براہ راست کتاب و سنت پر عمل کرنے اور ہر معاملہ میں وہیں سے احکام حاصل کرنے کا مکلف قرار دیتے تھے اور تقلید کی مطلق حرمت کے قائل تھے، اگر ان کے کلام میں اس کی صراحت نہیں ملتی تو ان کے طرز عمل اور ان کی تحریروں سے قدرتی طور پر نتیجہ نکالا جاسکتا ہے، اس گروہ میں متقدمین میں علامہ ابن حزم پیش پیش نظر آتے ہیں، لیکن یہ بالکل ایک غیر عملی بات ہے اور اس کا ہر مسلمان کو مکلف قرار دینا تکلیف مالایطاق ہے۔

دوسری طرف وہ گروہ تھا جو تقلید کو اسی طرح ہر مسلمان پر واجب قرار دیتا تھا اور اس کے تارک کو سخت فقہی احکام ”فاسق“ اور ”ضال“ سے یاد کرتا تھا جیسا کہ پہلا گروہ مقلدین اور کسی خاص مذہب فقہی کے متبعین کو، یہ گروہ اس حقیقت کو بھول جاتا ہے کہ تقلید عوام کو نفسانیت اور خود رائی سے بچانے، مسلم معاشرہ کو انتشار و فوضویت (انارکی) سے محفوظ رکھنے، دینی زندگی میں وحدت و نظم پیدا کرنے، اور احکام شریعت پر بسہولت عمل کرنے کا موقع دینے کی ایک انتظامی تدبیر ہے لیکن انھوں نے اس انتظامی عمل کو تشریعی عمل کا درجہ دیدیا اور اس پر اس شدت سے اصرار کیا جس نے اس کو ایک مذہب فقہی اور مسئلہ اجتہادی کے بجائے منصوص اور قطعی عمل اور مستقل دین کا درجہ دیدیا۔“ [4]

حضرت مولانا علی میاںؒ جس طرح اجتہاد کے نام پر شریعت کے ساتھ کھلواڑ کرنے کے بارے میں سخت ترین نکیر کرتے ہیں، اسی طرح تقلید میں غلو وانحراف کا سختی کے ساتھ نوٹس لیتے ہیں، تقلید کی جائز اور فطری شکل کی وضاحت کرنے کے بعد اس میں غلو وانحراف کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

”رفتہ رفتہ عوام میں جہالت نے اثر کیا اور کہیں کہیں ائمہ کی حیثیت وسائط اور وسائل کے بجائے مقصود اور ایک طرح سے شارع و مطاع کی پیدا ہوگئی، لوگوں کو ان مذاہب سے بالذات دلچسپی اور ان کی اس درجہ عصبیت پیدا ہوگئی کہ وہ کسی حال میں ان کے ایک شوشہ یا نقطہ سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہ تھے، اس سلسلے میں عوام تو زیادہ قابل الزام نہیں ہیں کہ انھوں نے ان مذاہب کو سنت کی پیروی سمجھ کر اختیار کیا تھا اور ان کے لئے ترجیح کے اسباب معلوم کرنا اور ان کے مطابق ترک مذہب یا ایک مذہب سے دوسرے مذہب کی طرف انتقال مشکل بھی تھا اور خطرناک بھی، لیکن بہت سے علماء کی یہ حالت تھی کہ ان کو اگر اپنے امام یا مذہب کے کسی مسئلہ کا حدیث و سنت کے خلاف ہونا ثابت ہو جائے اور اس کا قطعی علم حاصل ہو جائے کہ اس مسئلہ میں اپنے امام کا مسئلہ مرجوح اور دوسرے امام یا مذہب کا مسئلہ راجح اور حدیث و سنت کے مطابق ہے اور اپنے مذہب اور عمل کے خلاف کیسی ہی صحیح و صریح احادیث ملیں تب بھی وہ اس مسئلہ کو ترک کرنے اور احادیث پر عمل کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے اور ان کی طبیعت اس کے لئے منشرح نہیں ہوتی۔“ [5]

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ اس بات کے داعی تھے کہ تمام فقہی مسالک کو امت مسلمہ کا مشترکہ سرمایہ تصور کیا جائے، تمام ائمہ فقہ کا احترام کیا جائے، بیجا تعصب و تشدد سے گریز کیا جائے اور نئے مسائل کے حل میں کتاب و سنت کے ساتھ تمام فقہی مسالک سے استفادہ

کیا جائے۔

فقہ اسلامی پر حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کی تحریریں مختصر ہیں لیکن جتنی بھی ہیں بڑی پر مغز اور فکر انگیز ہیں، آپ کی کتاب "ارکان اربعہ" احکام شریعت کے اسرار و حکم پر لاثانی کتاب ہے، اس موضوع پر امام غزالیؒ اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے جو کارنامہ انجام دیا تھا، اس کتاب کے ذریعہ اس کام کو آگے بڑھایا گیا ہے، اجتہاد کے موضوع پر حضرت مولانا کا ایک مختصر رسالہ ہے، "تاریخ دعوت و عزیمت کی جلد اول، دوم، پنجم میں فقہ اسلامی کی وکالت و ترجمانی میں طاقتور تحریریں ہیں، نئے مسائل کے حل کے لئے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے "مجلس تحقیقات شرعیہ" قائم فرمائی، اس ادارہ نے نئے مسائل کے حل میں خاصی پیش رفت کی، حضرت مولانا "مجمع الفقہ الاسلامی مکہ مکرمہ" کے رکن اور "مجمع الفقہ الاسلامی (الہند)" کے سرپرست تھے، "مجمع الفقہ الاسلامی الہند" کے متعدد سیمناروں میں موصوف نے گراں قدر خطبات پیش فرمائے، جنہیں "اجتماعی اجتہاد" کے نام سے شائع کر دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی تربت کو انوار سے بھر دے اور ہمیں ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

---

[1] مجلہ بحث و نظر فقہی سیمینار نمبر جلد ۲، شمارہ ۵، ۶ ص ۵۰ تا ۵۴۔

[2] ایضاً ص ۵۹ تا ۶۵۔

[3] تاریخ دعوت و عزیمت جلد ۵ ص ۲۰۸، ۲۰۹۔

[4] ایضاً ص ۲۰۴، ۲۰۵۔

[5] ایضاً جلد ۲ ص ۳۳۷، ۳۳۸۔

میں کہوں گا بوالحسن پوری صدی کا نام تھا

رؤف احمد نازش قاسمی (حیدرآبادی)

حضرت العلام مولانا علی فخرِ جہاں ؛ جاچکا سالار، سرگرداں ہے اس کا کارواں
گم سکوتِ بیخودی میں ہوچکا ہے ساز وہ ؛ اب تو سننے کے لئے ملتی نہیں آواز وہ
وہ زبانِ فیض سے درسِ احادیثِ نبیؐ ؛ جس کو سن کر جھوم اٹھیں خود بخاری ترمذی
اللہ اللہ کتنا تھا شاہِ عرب مردم شناس ؛ در کشائی کیلئے مفتاح دی حضرت کے پاس
کیا ہی وہ اعزاز تھا، وہ تو سراپا ناز تھا ؛ جان دیدینے کے قابل اس کا ہر انداز تھا
میں کہوں گا بوالحسن پوری صدی کا نام تھا ؛ وہ کہ خوش آغاز تھا انجام خوش انجام تھا
رو رہے ہیں انگلیوں کو آج قرطاس و قلم ؛ جا چھپا ہے اب کہاں پر ہائے وہ معجز رقم
ہائے وہ سلکِ تخیّل میں وہ تنظیمِ دُرر ؛ سوز سے خود پھڑ پھڑائیں مرغِ دل کے بال و پر
اس لسانیات کے ماہر پہ ہیں سب نوحہ خواں ؛ ساکت و جامد کھڑی ہے اک طرف اردو زباں
بلبلِ شیریں سخن کو آج ڈھونڈے ہے وطن ؛ آہ وہ تقریر میں اردو زباں کا بانکپن
گم ہوئی ہے دستِ ملت سے اسی کا ہے ملال ؛ بین الاقوامی اخوت کی کلیدِ بے مثال
ربطِ باہم کے لئے اب کون سرگرداں رہے ؛ اب کشودِ عقد پر ہے کون جو کوشاں رہے
ہائے وہ ماں باپ کا بیٹا تھا کیسا لاڈلا ؛ نورِ چشمِ عبدِ حی تھا قرۃِ خیر النساء
سایۂ عشقِ خداوندی میں وہ پل پل پلا ؛ سنّت نبویؐ کے سانچے میں وہ سرتاپا ڈھلا
شیخ زکریاؒ نے دل اس کا مصفّا کر دیا ؛ شیخِ قادر نے اسی قطرے کو دریا کر دیا

پرسنل لاء بورڈ کا روحِ رواں جاتا رہا
بوالحسن وہ نازشِ ہندوستاں جاتا رہا

(بقیہ)
مفکر اسلام ایک جامع اور متوازن شخصیت

امیر جماعت اسلامی ہند یہاں بیٹھے ہوئے ہیں، میں نے ہندوستان میں مسلم مجلس مشاورت کے پلیٹ فارم پر بھی یہ بات کہی تھی، اس وقت بھی اس پر ایمان رکھتا تھا اور اب بھی ایمان رکھتا ہوں کہ اگر ملت کے مفاد کا تقاضا ہو کہ حرفِ غلط کی طرح جماعتوں کو مٹا دیا جائے، تو میرے اخلاص کا تقاضا ہوگا کہ سب سے پہلے میں اسے قبول کروں۔ یہ وہ قربانی ہے جس کا سبق حضرت خالد بن ولیدؓ کی قربانی ہمیں دیتی ہے۔" (حدیث پاکستان۔ صفحہ ۱۷، ۱۶)

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

اور

تصوّف وسلوک

مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی۔ استاذ حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

تصوف ایک ایسی حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن جن حضرات کو اس کے صحیح حاملین اور اس راہ کے معتبر اور صحیح رہنماؤں کی صحبت وزیارت کی توفیق نہیں ہوسکی۔ ان کے سامنے تصوف کی اصطلاح ایک معمّا اور چیستاں بن کر رہ گئی، اور اسکے پس پردہ ایک ایسا خرافاتی نظام نظر آنے لگا جو روح شریعت سے متصادم اور کتاب وسنت کا متوازی نظام تھا جو ظاہر ہے۔ کوئی توحید کا متوالا اور سنّت کا شیدائی، غیرتِ ایمانی اور حمیّت اسلامی رکھنے والا انسان برداشت نہیں کرسکتا اور نہ کرنا چاہیئے، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا ہے۔

اس صورتحال سے ہم کو اندازہ ہوتا ہے کہ اس اصطلاح "تصوف" نے دین کی کتنی عظیم کتنی روشن اور کتنی اہم حقیقت پر پردہ ڈال دیا ہے اور بہت سے لوگوں کی راہ میں اس حقیقت کے حصول میں مانع بن گیا ہے۔

اس کے آگے مزید وضاحت کرتے ہوئے اس چیز کا ذکر فرماتے ہیں، جس نے خاص طور سے اس دینی حقیقت کو اور زیادہ غبار آلود کردیا ہے۔

" وہ پیشہ ور اور جاہ طلب و حقیقت فروش اور الحاد شعار اور فاسد العقیدہ، نام نہاد صوفی ہیں جنھوں نے دین میں تحریف کرنے، مسلمانوں کو گمراہ کرنے، معاشرہ میں انتشار پیدا کرنے، آزادی و بے قیدی کی تبلیغ کرنے کیلئے تصوف کو آلۂ کار بنایا۔ اور اس کے محافظ وعلمبردار بن کر لوگوں کے سامنے آئے، نتیجہ یہ ہوا۔ اہل غیرت واہل حمیت مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد ان سے بدظن ہوگئی، کچھ غیر محقق صوفی ایسے تھے جو اس شعبہ کی روح اور اس کے حقیقی مقاصد سے ناآشنا تھے، وہ مقصد و وسیلہ میں تمیز نہ کرسکے، بعض اوقات انھوں نے وسائل پر تو بہت اصرار کیا۔ اور مقاصد کو نظر انداز کردیا۔ اور اس شعبہ یا اس فن میں ایسی چیزیں داخل کیں جن کا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا، اور اس کو فن کی روح اور اس کا کمال قرار دیا بلکہ مقصود ومطلوب سمجھ بیٹھے

(تزکیہ واحسان ص ۱۵، ص ۱۶)

اس سلسلہ میں ان حضرات کو جنھوں نے اس شعبہ سے بالکل ہی گریز اختیار کرلیا مشورہ دیتے ہیں۔

"بہرحال واقعات ہمیشہ انسان کی خواہش کے تابع نہیں ہوتے۔ اب ہم کو فراخ دلی کے ساتھ اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہیئے اور قیود واصطلاحات اور خواہشات وتعصبات سے آزاد ہوکر سوچنا چاہیئے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم ایک دینی حقیقت سے محض ایک نئی اصطلاح اور ایک مروج نام کی وجہ سے گریز اختیار کرنے لگیں"۔

حضرت نے تصوف وسلوک کو ایک الہامی نظام قرار دیا ہے اور مثالیں دیکر اس کی خوب وضاحت فرمائی ہے، اذان کی خواب میں تلقین لیلۃ القدر کا طاق راتوں میں دیکھنا، تراویح کا اجتماعی نظام، قرآن مجید کا مصاحف میں جمع کرنا، قرن اول وثانی اور اس کے بعد کی ابتدائی صدیوں میں حدیث کی جمع وتدوین کا کام، مجتہدین کا استنباط علم نحو وقرأت، اصول فقہ اور قرآن اور اس کی زبان کو محفوظ کرنے والے تمام مفید علوم کی تدوین اور مدارس کی تعمیر، کتابوں کی نشر واشاعت وغیرہ ان مثالوں کو قدرے تفصیل کے ساتھ تحریر فرمانے کے بعد رقمطراز ہیں۔

"تزکیۂ نفس وتہذیب اخلاق کا وسیع ومحکم نظام جس نے بعد کی صدیوں میں ایک مستقل علم وفن کی شکل اختیار کرلی نفس وشیطان کے مکائد کی نشاندہی۔ نفسانی واخلاقی برائیوں کا علاج، تعلق مع اللہ اور نسبت باطنی کے ذرائع وطرق کی تشریح وتربیت جس کی اصل حقیقت تزکیہ واحسان کے ماثور وشرعی الفاظ میں پہلے سے موجود تھے اور جس کا عرفی و اصطلاحی نام بعد کی صدیوں میں "تصوف" پڑگیا۔ اس اجتماعی الہام کی

ایک درخشاں مثال ہے"
اس تربیت گاہ سے جو حضرات تیار ہو کر میدان میں آئے اور تاریخ میں قائدانہ کردار ادا کیا، ان کے بارے میں فرماتے ہیں۔
اس گروہ کی افادیت اور اس کی خدمات سے انکار یا تو وہ شخص کریگا جس کی تاریخ اسلام پر نظر نہیں، یا جس کی آنکھوں پر تعصب کی پٹی بندھی ہوئی ہے "(تزکیہ واحسان ۲۹، ۳۰ اس موضوع پر اس کتاب میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے مکمل کتاب کا مطالعہ مفید ہوگا)
ایک جگہ اس شعبہ کے تعلق سے لکھتے ہیں۔
" دین کے اس شعبہ اور اسلام کے اس رکن کا جس کو ہم تزکیہ یا احسان یا فقہ باطن کہتے ہیں صاف اقرار کرتے اور اس بات کو بلا تأمل قبول کرتے، کہ وہ شریعت کی روح دین کا لب لباب اور زندگی کی بنیادی ضرورت ہے، اور یہ کہ جب تک اس شعبہ کی طرف کماحقہٗ توجہ نہ کی جائے اس وقت تک کمال دین حاصل نہیں ہو سکتا اور اجتماعی زندگی کی بھی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ اور نہ صحیح معنیٰ میں زندگی کا لطف آسکتا ہے۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقاصد بعثت میں اس کو بیان کیا گیا ہے اور جو اوصاف تعلیم کتاب وحکمت وغیرہ کے بیان کئے گئے ہیں۔ ان اوصاف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخصوص صفت " تزکیہ " ہے "
تزکیہ کا مطلب کیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر کس طرح عمل کیا اور کیا اثرات مرتب ہوئے،
حضرت رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں :
" تزکیہ کا مطلب یہ ہے کہ آپ صرف پڑھ کر سنا دینے اور سمجھا دینے پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ اس تلاوت وتعلیم کا رنگ ان پر چڑھا دیتے ہیں۔ اس کتاب وتعلیم کو ان کے کانوں اور دماغوں سے گذار کر ان کے قلوب وارواح کو رنگین کرتے ہوئے ان کے اعضاء وجوارح سے جاری کر دیتے ہیں۔
اسی لئے آپ دنیا کے سب سے کامیاب ہادی ومرشد تھے صحابہ کی حیرت انگیز روحانی اخلاقی، ذہنی، علمی، تبدیلی اور اسلام کی ابتدائی کامیابی کا راز یہی تھا اور آج اسی کی کمی اسلامی زندگی کے ہر گوشہ میں سب سے زیادہ نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے۔
آگے تحریر فرماتے ہیں۔
تزکیہ کرنے والے آپ کی امت کے وہ اہل دل اور صاحب حال بزرگ ہیں جو آپ کے انفاس وانوار کے وارث وحامل ہیں انبیاء کی بعثت کا مقصد پورا کرنے کیلئے اور ان کی برکات پہونچانے کیلئے تزکیہ بھی اتنا ہی ضروری کام ہے جتنی کتاب وحکمت کی تعلیم، یوں سمجھنا چاہیئے کہ یہ تعلیم ہے وہ تربیت اور تکمیل انسانیت کے لئے دونوں کی ضرورت ہے۔
تزکیہ کی کمی اعلیٰ تعلیم کے باوجود اسی طرح محسوس ہوتی ہے جس طرح کھانے میں نمک کی کمی اور دونوں کے نتائج میں وہی فرق ہے جو اکبر مرحوم نے بیان کیا ہے، ؏
زباں گو صاف ہو جاتی ہے دل طاہر نہیں ہوتا۔
روز بروز یہ حقیقت واضح ہوتی جاتی ہے کہ دین جس چیز کا نام ہے وہ اعلیٰ سے اعلیٰ دینی تعلیم سے بھی نہیں پیدا ہوتی۔ ؏
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا
اہل دل نے ہمیشہ یہ ضرورت پوری کی اور امت کی اصلاح میں اور دین کی خدمت میں علماء کا اچھی طرح ہاتھ بٹایا، دونوں نے مل کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل نیابت کا فرض انجام دیا۔
(سیرت سید احمد شہیدؒ ص ۲۶۸ طبع ثانی)
اس مرتبۂ احسان کی اہمیت وعظمت کو بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔
مرتبۂ احسان جو نقد جان بلکہ دولت کونین دے کر بھی مل جائے تو ارزاں ہے۔ ؎
متاع وصل جاناں بس گراں است
گراں سودہ بجاں بودے چہ بودے
احسان سے مراد یقین واستحضار کی وہ کیفیت ہے جس کے لئے ہر صاحب ایمان کو کوشاں ہونا چاہیئے اور جس کا شوق ہر مرد مومن کے دل میں موجزن ہونا چاہیئے۔
(تزکیہ واحسان ص ۱۷)

اہل دل کی خدمت میں :-

یہ وہ شعبہ ہے جس کا تعلق قال سے کم حال سے زیادہ ہے یہ شنیدن سے زیادہ چشیدن ہے، یہاں کام قلب بریاں اور چشم گریاں کا ہے نہ عقل حیراں اور فکر پریشاں کا، یہ مشاہداتی اطمینان وسکون ہے نہ کہ اخباری معلومات اور فطری تخیلات، یہ سراپا عشق ہے جس سے اخلاص کے سوتے جاری ہوتے ہیں۔
علامہ اقبال نے اس کو یوں بیان کیا ہے ؎
سرّ دیں مارا خبر او را نظر
او درون خانہ ما بیرون در
ما کلیسا دوست، ما مسجد فروش
او ز دست مصطفیٰ پیمانہ نوش

اس فن کے ماہرین نے اس مقام پر فائز ہونے کے لئے چند امور کی بہت تاکید کی ہے جن میں سے تین بہت اہم اور بنیادی سمجھے گئے گئے۔

(۱) صحبت محبت کے ساتھ۔ (۲) کثرت ذکر۔ (۳) خود رائی سے مکمل پرہیز۔

حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ کی خدمت میں

اللہ والوں کی صحبت حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو شروع سے حاصل رہی، خاندان میں بھی ایسے حضرات موجود تھے جن کی صحبت سے استفادہ جاری تھا لیکن جس شخصیت کا اثر پڑا اور اس کی صحبت زندگی میں تبدیلی کا سبب بنی، وہ حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ کی ذاتِ گرامی ہے۔ مولانا نے کوچۂ یار کی دریافت اور کیفیات ایمانی و احسانی کی یافت کو نہایت خوبصورتی سے بیان کرتے ہوئے قارئین کو بھی اس نعمت بے بہا اور دولت سرمدی کی طلب پیدا کرنے اور اس کے لئے سعی کرنے کی تلقین کی ہے۔

"میری زندگی کا وہ بڑا مبارک دن اور بڑی سعید گھڑی تھی جب مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ سے نیاز حاصل ہوا۔ اگر حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ سے ملاقات نہ ہوئی ہوتی تو میری زندگی اچھی یا بری بہرحال میری موجودہ زندگی سے بہت مختلف ہوتی۔ اور شاید اس میں ادب و تاریخ اور تصنیف و تالیف کے سوا کوئی ذوق و رجحان نہ پایا جاتا۔ خداشناسی اور خدارسی راہ پائی ورا س روئی تو بڑی چیزیں ہیں۔ مولانا کی صحبت میں کم سے کم خدا طلبی کا ذوق، خدا کے نام کی حلاوت، مردانِ خدا کی محبت، اپنی کمی اور اصلاح و تکمیل کی ضرورت کا احساس پیدا ہوا اور ہم عامیوں کے لئے یہی بڑی دولت و نعمت ہے بلکہ بعض حقیقت شناشوں کے نزدیک یہی اصل دولت ہے۔"

(پرانے چراغ حصہ اوّل ص ۱۳۴)

اس تعلق کے بعد اپنے روحانی استفادہ کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

"میرا روحانی ربط اور مراسلت کا سلسلہ برابر جاری رہا اور ان کو بھی میرے حال پر وہ شفقت و عنایت رہی جس کا اندازہ ان کے مکاتیب سے ہوتا ہے۔ ۴۶ء میں جب وہ سفرِ حج سے واپس آئے تو میں نے تہنیت کا خط لکھا مولانا نے اس کے جواب میں مجھے لاہور بلایا، میں ہوشیار پور جالندھر ٹھہرتا ہوا لاہور حاضر ہوا، مولانا نے ایک روز تنہائی میں مجھے اپنے سلسلہ قادریہ میں اجازت مرحمت فرمائی اور اس کے لئے استخارہ و دعا کا انھوں نے جو غیر معمولی اہتمام مسجد خیف منیٰ میں کیا تھا اس کا ذکر فرمایا والحمد للہ علی ذالک۔"

مولانا احمد علی صاحبؒ نے اپنے خط میں تحریر فرمایا تھا

"میرے دل میں جو آپ کی عزت ہے اس کو ضبط تحریر میں لانے کی ضرورت نہیں سمجھتا، اسی محبت و عزت کا نتیجہ ہے کہ میں نے حج کی رات مسجد خیف میں آپ کے درجات کی ترقی کیلئے بارگاہِ الٰہی سے استدعا کی اور الحمد للہ اس نے بارگاہِ الٰہی میں قبولیت پائی۔"

ایک دوسرے خط میں اپنی محبت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

"چونکہ آپ میرے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ کا جو فضل بھی آپ پر ہو وہ میرے لئے صد فخر ہے، مجھے جس طرح مولوی حبیب اللہ سلمہٗ (حضرت کے بڑے صاحبزادہ) کی ترقی سے فرحت ہوسکتی ہے اسی طرح بلکہ واقعہ یہ ہے کہ بعض وجوہ کی بنا پر اس سے زیادہ خوشی اور سرور آپ کے درجات کی ترقی سے ہوتا ہے۔"

ایک خط میں اپنے تعلق کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں"

عزیز القدر سعادت شعار شرافت مآب ناشر لدین اللہ لحصول رضا اللہ تعالیٰ

مولوی ابوالحسن علی صاحب زیدت معالیکم۔

آپ کی دینی خدمات سے جتنا مجھے سرور حاصل ہوتا ہے غالباً اتنا دنیا میں کسی اور کو نہیں"۔

حضرت رائے پوریؒ کی خدمت میں

مولانا محمد الیاس صاحب کی خدمت میں حاضری اور کام میں مشغولیت کے ساتھ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب سے تعارف ہوا۔ اور خود حضرت مولانا کے الفاظ ہیں:

"یہ تعلق یوماً فیوماً نہیں آناً فآناً ترقی پذیر رہا اور شیخ آتنی جلدی بے تکلف ہوگئے جیسے میں برسوں سے حاضر ہوتا رہا ہوں"[1]

[1] (مولانا محمد الیاس سے تعلق، دعوت سے مناسبت، بنگلہ والی مسجد میں آمد و رفت کی تفصیل اور حضرت شیخ سے ان کے تعلقات خصوصی شفقتوں اور ملاقاتوں اور مراسلت کی تفصیل کیلئے سوانح حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب، مولانا محمد الیاس صاحب اور انکی دینی دعوت، مکاتیب مولانا الیاسؒ ملاحظہ فرمائیں)

حضرت شیخ باوجود اپنے بلند روحانی مقام اور مرجع خلائق ہونے کے اہل تعلق کو اپنے وقت کے مستند و مسلم مشائخ بالخصوص شیخ وقت حضرت مولانا عبدالقادر رائپوری کی طرف اصرار و تاکید سے متوجہ فرماتے رہتے تھے، ایک مکتوب میں حضرت مولانا کو لکھتے ہیں۔

"رائے پور کے جناب کے سفر کی حقیقی اہمیت بندہ کے نزدیک بہت ہے اس کو بار بار کیا عرض کروں، بندہ تو بہت ہی ضروری خیال کرتا ہے کہ اہل دل حضرات وہیں جائیں. جب بھی موقع مل سکے چند روز یکسوئی کے ساتھ ضرور تشریف لائیں"

(سوانح شیخ الحدیث ص۲۱۵)

ایک دوسرے مکتوب میں اس کی اہمیت اس طرح واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"انجمن میں آگ کی ضرورت ہوتی ہے اور للٰہی آگ انھیں درباروں سے ملتی ہے"

اس کے بعد رائپور حاضری کا سلسلہ شروع ہوگیا اور طرفین میں ایسا تعلق بڑھا کہ لوگوں کے لئے رشک و حسد کا ذریعہ بن گیا۔

"حضرت رائپوری نے ایسی شفقت و محبت کا برتاؤ کیا کہ حضرت اس کو شفقتِ مادری سے تعبیر فرماتے ہیں اور خطوط بھی اسی انداز کے تحریر فرماتے رہے،

ایک خط میں حضرت رائے پوری نے محبت آمیز اشعار لکھے، اور حضرت کو شمس تبریز اور اپنے کو مولانا روم کی جگہ قرار دیا ہے"

ایک خط میں اپنے مرید کو تحریر فرمایا؛ سیدی و مولائی حضرت اقدس دامت برکاتہم حضرت مولانا حضرت کو سیدی و مرشدی کبھی لکھا کرتے تھے اس کے جواب میں تحریر فرمایا۔

"حضرت آپ مجھے کیا سیدی و مرشدی لکھتے ہیں، احقر تو حضرت کا خادم ہے، اللہ تعالیٰ بہت ہی بلند درجے نصیب فرمائے، اکثر اوقات حضرت کا خیال رہتا ہے"۔ وغیرہ۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ اپنی مجلسوں میں حضرت کا تذکرہ بڑے والہانہ انداز سے فرماتے اور جب جب ذکر آتا طبیعت منشرح ہو جاتی اور اکثر یہ شعر پڑھتے۔

ذهب الذين يعاش فی اکنافهم

جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب خدمت میں حاضری ہوتی ہوگی تو کیا کیفیت ہوتی ہوگی۔

انبساط عید دیدن روئے تو
عیدگاہِ ما غریباں کوئے تو

حضرت نے ایک جگہ خود تحریر فرمایا ہے،

"ایسے عاشقانہ اور والہانہ تعلق کو مناسبت اور ترقی باطنی میں ہزار اذکار اور ریاضتوں سے زیادہ دخل ہے"،

اس تعلق کی تکمیل اجازت و خلافت سے سے ہوئی۔ کاروانِ زندگی میں تحریر فرماتے ہیں، حضرت رائپوری نے اپنے سفر لکھنؤ کے موقع پر جو اپریل ۱۹۴۸ء میں ہوا تھا، ۲۴ اپریل ۴۸ء کو ہمارے وطن دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی کو دوبارہ شرف بخشا۔ وہیں ایک روز بے سان و گمان حضرت شاہ علم اللہ اور سید صاحب کی مسجد سے باہر نکلتے ہوئے مجھ سے فرمایا میں آپ کو چاروں سلسلوں بالخصوص حضرت سید صاحب کے سلسلہ میں اجازت دیتا ہوں۔ (کاروان زندگی اول ص۳۵۳)

ان دو حضرات کے علاوہ بھی آپ اپنے زمانہ کے مشائخ اور اہل قلوب کی خدمت میں برابر حاضری دیتے اور ان کی بابرکت صحبتوں سے فیضیاب ہوتے رہے، ان تمام حضرات نے یہی نہیں کہ عنایت و شفقت فرمائی بلکہ بہت ہی بلند کلمات بھی فرمائے جو مختلف کتابوں میں درج ہیں۔

حضرت تھانویؒ نے مجمع الکمالات لکھا اس وقت آپ کی عمر تقریباً ۱۹، ۲۰ سال کی تھی۔ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ نے دعا دی، حضرت سید احمد شہیدؒ قدس اللہ سرہٗ العزیز کی تجدید ملت اسلامیہ کی خدمت کا علمبردار بنا کر نعمائے لدنیہ سے مالامال کرے۔

حضرت مولانا محمد الیاسؒ بانی جماعت تبلیغ نے "سیدی و سید عالمؒ" لکھ کر خطاب کیا۔ حضرت شاہ وصی اللہ صاحب فتحپوریؒ، حضرت شاہ یعقوب صاحب مجددیؒ، مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڈھیؒ سے بڑے بلند کلمات سنے گئے۔

غرضیکہ آپ اپنے زمانہ کے اہل دل اور اہل علم کے منظور نظر اور محبوب رہے، عالم اسلام میں جہاں بھی گئے وہاں کے اہل قلوب متوجہ ہوگئے اور آپ کی قدردانی میں انھوں نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اس طرح آپ کو علمائے ربانی اور مشائخ حقانی کی صحبت کا جتنا موقع ملا معاصرین میں سے کسی کو نہیں ملا۔ اور یہ بات بھی بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ جتنا فیض آپ کو مختلف مشائخ سے پہونچا کسی کو نہیں پہونچا۔ حضرت نے ہر پھول سے اس کا حسن و جمال اور ہر گل سے اس کی لطافت و بانکپن، سیکر پوری انسانیت کیلئے ایسا شہد تیار کر دیا جس میں تمام طبقوں کیلئے شفا کا سامان ہے۔

ذکر الٰہی اور مجاہدہ

ذکر کی اہمیت و فضیلت سے قرآنی آیات

اور نبوی تعلیمات معمور ہیں تصوف میں اس کی حیثیت ریڑھ کی ہڈی کی ہے، اس کے بغیر انسان سیدھا کھڑا نہیں ہوسکتا، متقدمین اور متاخرین سب اس پر متفق ہیں۔ ان حضرات نے ذکر الٰہی کے مختلف طرق اختیار کئے ہیں تاکہ بآسانی قلیل سے قلیل مدت میں اس کے نتائج واثرات ذاکر پر مرتب ہوسکیں۔

ذکر کی کثرت ہی سے یقین واطمینان، حضوری ودھیان، اخلاص واستحضار، جذب وکیف انوار وبرکات حاصل ہوتے ہیں۔ بلکہ اس کو زندگی کی روح اور ماحصل قرار دیا گیا ہے

اللہ اللہ ہے تو یار و جان ہے
ورنہ یارو جان بھی بے جان ہے

حضرت رحمہ اللہ سے ایک طالب نے ذکر کی تاثیر کے بارے میں سوال کیا، اثبات و نفی کے بارے میں فرمایا کہ اس سے ایمان ویقین مضبوط ہوتا ہے اور اثبات محض کی تاثیر کے بارے میں فرمایا۔ اس سے تعلق مع اللہ مضبوط ہوتا ہے۔

حضرت والاؒ نے بھی جب سلوک کی وادی میں قدم رکھا تو اس کو طے کرنے کے لئے ذکر الٰہی کو حرز جاں بنایا اور سلاسل میں جو طریقے ذکر کے مروج ہیں۔ اس کو اپنا کر منازل سلوک طے کئے اور بامراد اور کامراں رہے،

ہمارے حضرت کو اخفائے حال کا اس قدر خیال رہتا تھا کہ عرصہ دراز تک جو حضرات قریب رہے ان کے سامنے بھی اپنے حالات وکیفیات کے اظہار سے ہمیشہ گریز کیا، کاروان زندگی میں نہایت ہلکا سا اشارہ کیا ہے، لکھتے ہیں۔

"۱۹۳۴ء کے غالباً اپریل کے مہینہ میں مولانا کی ہدایت اور ایماء پر میں کچھ دن کے لئے ان کی صحبت وتربیت میں رہنے اور یکسوئی کے ساتھ ذکر وشغل کرنے کے لئے لاہور حاضر ہوا۔ مولانا نے ہدایت فرمائی کہ میں شاہی مسجد کے کسی حجرہ میں علیحدہ رہوں، مطالعہ اور علمی اشتغال سے بھی حتی الامکان احتراز کروں"۔

"تین مہینہ لاہور میں قیام رہا مسجد کے قیام میں کیا کیا اعمال واشغال تھے تفصیل سے کبھی کسی سے نہیں بیان کیا، جستہ جستہ ذکر کر دیا کرتے تھے۔ ایک پوچھنے والے سے اتنا بتایا کہ سوائے ذکر وتلاوت کے اور کوئی دوسرا کام نہیں تھا تنہا اتنی بڑی مسجد میں قیام تھا، نہ کسی سے ملاقات کی اجازت تھی اور نہ علمی کام کرنے کی۔

لطائف پر چھ ہزار اسم ذات کا ذکر فرمایا کرتے، ذکر قلبی کا بڑا اہتمام تھا جس کی وجہ سے ہمہ وقت ذاکر رہتے تھے۔

تہجد سے فارغ ہوکر نفی اثبات جہری کیا کرتے تھے۔ جس کا معمول آخر تک باقی رہا جوانی میں، اوابین کے بعد عشا تک ذکر میں مشغول رہتے؛

تنہا ایصال ثواب کے لئے گیارہ مرتبہ سے تیرہ مرتبہ تک سورۂ یٰسین کی تلاوت فرماتے، اور قرن اول کے اصحاب سے لیکر اس وقت کے ہر چھوٹے بڑے تعلق والے کا نام لیتے، اور جن حضرات کا نام لیتے پورے القاب وآداب کے ساتھ لیتے، رواداروی میں نام نہ لیتے، حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کا جب نام لیتے تو فاتح ہندوستان ضرور فرماتے، نام لینے میں گھنٹہ سوا گھنٹہ لگتا اور تقریباً روز کا معمول تھا۔

قرآن مجید تدریس کے زمانہ میں یاد کرنا شروع کیا۔ آپ کے بعض رفقاء کا بیان ہے کہ صبح سے دوپہر تک ٹہل ٹہل کر یاد کرنے کا معمول بھی رہا ہے۔ اس کے علاوہ تلاوت کے الگ معمولات تھے۔ اشراق وغیرہ سے فارغ ہوکر زبانی بھی سناتے تھے اور دیکھ کر بھی تلاوت فرماتے۔

آخر میں اپنے والد صاحب کی کتاب تہذیب الاخلاق جو حدیث کا انتخاب ہے کا مطالعہ فرماتے اور بہت مسرور ہوتے۔

صحیح بخاری کے ڈیڑھ دو صفحے سننے کا بھی معمول ہوگیا تھا جو بیماری کے دن تک جاری رہا، تکیہ کے قیام میں عزیز القدر مولوی بلال عبدالحی حسنی ندوی سلمہ اللہ ونفع بہ کے ذمہ یہ خدمت سپرد ہوئی اور دار العلوم کے قیام میں راقم کو یہ سعادت حاصل ہوتی، سنتے وقت اہتمام سے بیٹھ جاتے، خود بھی بسم اللہ پڑھتے اور اور نہایت خشوع سے یہ دعا کرتے، اللھم انفعنا بالآیات والذکر الحکیم اور توجہ فرماتے پھر میں تلاوت شروع کر دیتا۔

جہاں تک مجاہدہ وریاضت کا تعلق ہے پوری زندگی اس کا عکس جمیل ہے، ندوہ کے قیام میں بکثرت ایسا ہوتا کہ ناشتہ کی نوبت ہی نہ آتی بغیر اس کے تدریس میں مشغول ہوجاتے، سخت بیماریوں میں پرمشقت اسفار کی کثرت، دوسروں کی دلداری کی خاطر جان ومال کی پرواہ نہ کرنا، اس کو قلم بند کرنے کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔ (بعض حضرات نے مستقل اس پر مضامین لکھے ہیں ان کو دیکھا جاسکتا ہے۔)

خود رائی سے پرہیز

ایک عارف نے کوچۂ عشق میں قدم رکھنے کی شرط بیان کی ہے۔ اور اس کو ضروری قرار دیا ہے ؎

جب تک فنائے رائے کی ہمت نہ پائیے
کیوں آپ اہل عشق کی محفل میں آئیے

یہ اس راہ کا دستور ہے سب ہی اس پر چل کر کامیاب ہوئے ہیں حضرت مولانا نے بھی اس کو نبھایا ۔ بلکہ پوری زندگی اس پر عمل کر کے دکھایا ۔

حضرت اپنی تمام علمی اور فکری بلندیوں کے باوجود ہمیشہ اپنے بڑوں کی بات مان کر چلے، اپنے بڑے بھائی کی ہمیشہ بات مانی، فرماتے تھے، بات ماننے میں ہمیشہ فائدہ ہوا۔ ایک دو دفعہ نہیں مانی اس کی وجہ سے نقصان اٹھانا پڑا۔

حضرت رائپوری کے تعلق سے فرمایا۔ ایک مرتبہ ایک اہم سفر درپیش تھا۔ حضرت رائے پوری کی رائے یہ تھی کہ اس وقت سفر نہ کروں میں نے فوراً بات مان لی، حضرت نے امتحاناً میرے چہرے کو دیکھا کہ ناگواری تو نہیں ہوئی حضرت فرماتے تھے کہ الحمد للہ مجھ پر بالکل اثر نہیں پڑا ۔ حضرت رائے پوری اس سے بہت خوش ہوئے ۔ اس کے بعد عنایات و شفقتیں بہت فرمائیں۔

حضرت فرماتے ، یہ حضرات یہ بات بہت دیکھتے ہیں کہ خوشی دلی کے ساتھ کون بات مانتا ہے، حضرت رائے پوری کے وصال کے بعد حضرت شیخ الحدیث سے اہم چیزوں میں مشورہ کرنے لگے تھے یہ بھی معمول ہمیشہ قائم رہا، اور خوردوں میں بھی جو بات مانتا ، اس سے بہت خوش ہوتے اس کو دعائیں دیتے ۔ اس کو اس کے لئے ترقی کا زینہ قرار دیتے ۔

تربیت و تعلیم

حضرت مولانا طالبین وسالکین کی تربیت میں ان کی طبیعت ، ذوق ، مشغلہ ضرورت ، صحت و تحمل اور استعداد و ترقی کی صلاحیت کا لحاظ رکھتے تھے وہ ہر ایک کے حال کے مطابق اس کو ذکر کی تلقین کرتے تھے اور اس بات کا بھی خاص خیال رکھتے تھے ، کہ اس توہمات وخرافات اور عجمی اثرات کے دور میں عقیدۂ توحید پر ضرب نہ پڑنے پائے اور مقاصد و وسائل کا تمیز بھی مجروح نہ ہو ۔

ایک مسترشد نے عرض کیا میں دفتر میں کام کرتا ہوں میز پر آپ کی تصویر رکھنا چاہتا ہوں کہ حضرت نے سختی سے روک دیا ۔

ایک پرانے طالب نے تصور شیخ کی اجازت چاہی ۔ فرمایا حضرات نقشبند کے یہاں ہے ، لیکن ہمارے سلسلہ میں حضرت سید صاحبؒ کے بعد سے متروک ہے ۔ (تصور شیخ کے سلسلہ کی تفصیلات کیلئے سیرت سید احمد شہیدؒ کا مطالعہ مفید ہے)

سہولت کا بھی خاص خیال فرماتے ، ابتدائی طور سے صرف تین تسبیحات کی پابندی بتاتے بعض طالبین نے مزید چاہا ، اجازت نہیں دی ، بعض کو سورۃ الاخلاص کی ایک دو تسبیحیں بتادیں ۔

بعض کو معاملات کی صفائی ، فرائض کی پابندی ، جن دینی کاموں میں لگے ہوئے ہیں ان میں نیت کا استحضار رکھنے کی تلقین فرماتے ۔

اکثر طالبین کو قلبی ذکر پانچ سو مرتبہ بتادیتے ورنہ حسب استعداد و صلاحیت ذکر جہری بھی بتلاتے ۔

بعض کو بیعت کے بعد ہی چوبیس گھنٹہ کے معمولات بتادیئے ۔

معمولات کی پابندی ضروری سمجھتے ۔ ایک ، طالب کو لکھتے ہیں کہ معمولات کی پابندی رکھئے اس سے کام میں برکت و نورانیت آتی ہے ۔ اکثر و بیشتر بیعت کے الفاظ دہرانے کے بعد ہی حالات میں تغیر شروع ہوجاتا تھا ۔ ایسے بے شمار واقعات ہیں کہ سلسلہ میں منسلک ہونے کے بعد ہی دل کی حالت بدل گئی ۔ ایک صاحب جو بیعت وغیرہ کے قائل نہیں تھے ، وہ بیعت ہوتے ہوئے دیکھ رہے ہیں، ان الفاظ کا ان پر یہ اثر ہوا کہ گریہ طاری ہوگیا ۔ اور پھر استخارہ وغیرہ کرنے کے بعد بیعت ہوگئے ۔ مشائخ میں تنہا حضرت کی ذات تھی جن سے وہ حضرات بھی بیعت ہوئے جو بظاہر اس کے قائل نہ تھے بلکہ وہ ایسی جماعتوں سے ربط رکھنے والے ہوتے تھے جو تصوف کے نام سے گھبراتے ہیں ایسے ہی ایک موقع پر مزاحاً حضرت نے فرمایا" میری خانقاہ ماڈرن خانقاہ ہے"۔

حضرت بیعت میں جن باتوں کا عہد لیتے وہ نیچے درج کی جارہی ہیں ، بیعت کے بعد عام لوگوں سے خاص طور سے فرماتے ، نہ دلی سے نہ قطب سے نہ ابدال سے کسی سے کچھ نہیں ہوسکتا سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے ، یہ الفاظ بھی بیعت کے الفاظ کے ساتھ درج کئے جارہے ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ، اللہ کے سوا کوئی مالک و معبود نہیں ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے سچے رسول ہیں ۔

یا اللہ ہم توبہ کرتے ہیں کفر سے ، شرک سے بدعت سے ، زنا سے ، چوری سے ، پرایا مال ناحق کھانے سے ، کسی پر بہتان لگانے سے ، نماز چھوڑنے سے جھوٹ بولنے سے اور سب گناہوں سے جو ہم نے اپنی ساری عمر میں کئے ، چھوٹے ہوں یا بڑے اور اس بات کا عہد کرتے ہیں کہ تیرے سب حکموں کو مانیں گے ، تیرے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی تابعداری کریں گے ۔

اے اللہ تو ہماری توبہ قبول فرما ، ہمارے گناہوں کو بخش دے ، ہمیں توفیق دے نیک عملوں کی اپنے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی تابعداری کی ۔

اس کے بعد ہاتھ چھوڑ دیتے اور فرماتے ۔

یہ عقیدہ رکھیں کہ اللہ تعالیٰ ہی اس دنیا کا خالق ہے اور وہی حاکم و منتظم ہے اس نے دنیا کو

بنایا۔ اور وہی اس کو چلا رہا ہے، اس کے حکم کے بغیر نہ پتہ ہل سکتا ہے اور نہ ذرّہ اڑ سکتا ہے وہی روزی دیتا ہے۔ وہی شفا دیتا ہے، وہی عزت دیتا ہے، وہی ذلت دیتا ہے، وغیرہ۔ کبھی اس کے ساتھ اور باتیں بھی فرما دیتے۔

بیعت ہونے کے بعد مراسلت کے ذریعہ یا خدمت میں حاضر ہو کر اور خاص طور سے رمضان المبارک میں خدمت میں طالبین رہ کر اپنے حالات بتاتے اور رہنمائی لیتے، حضرت نے اس سلسلہ میں جن کو مناسب سمجھا اجازت بھی مرحمت فرمائی۔

ارادت و بیعت کا تعلق رکھنے والوں کے لئے جو شجرے سلاسل کے طبع کرائے گئے تھے ان کے لئے حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ہدایات و مشورے دیئے، جن کو اس کے ساتھ طبع کر دیا گیا تھا۔ یہاں ان ہدایات کو نقل کیا جا رہا ہے تاکہ تمام قارئین اور خاص طور سے حضرت کے متعلقین و متوسلین کو اس پر عمل کرنا آسان ہو جائے۔

بیعت کرنا اور سلسلہ میں داخل ہونا کوئی رسمی اور شوقیہ چیز نہیں ہے جس کے لئے کچھ ماننا اور کرنا نہ پڑے محض برکت یا شہرت مقصود ہو، یہ ایک عہد و معاہدہ اور ایک نئی دینی و ایمانی زندگی کا آغاز ہے جس میں زندگی میں کچھ تبدیلیاں، کچھ پابندیاں اور کچھ ذمہ داریاں ہیں۔

۱۔ سب سے پہلی اور ضروری بات یہ ہے کہ بیعت اور سلسلہ میں داخل ہونا کلمہ کی تجدید اور اسلامی عہد و معاہدہ اور اللہ و رسول کے احکام کے مطابق دینی و ایمانی زندگی شروع کرتے اور اسی کے مطابق زندگی گزارنے کا قصد و ارادہ اور عہد و معاہدہ سمجھا جائے۔

۲۔ سب سے ضروری بات یہ ہے کہ عقیدہ درست اور پختہ کیا جائے۔ اور اس بات کا اقرار اور اس پر ایمان ہو کہ اللہ کے سوا کسی کے ہاتھ میں جلانے اور مارنے، صحت اور شفا دینے اولاد دینے، روزی دینے اور قسمت اچھی بری کرنے کا اختیار نہیں ہے اور اس کے سوا کوئی بندگی کا مستحق نہیں، نہ اس کے سوا کسی کے سامنے سجدہ کیا جا سکتا ہے، نہ بندگی کی کوئی شکل اختیار کی جا سکتی ہے، نہ حاجت روائی اور مشکل کشائی کا سوال کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ سید المرسلین و خاتم النبیین محمد رسول اللہؐ کو اللہ کا آخری نبی، ذریعہ ہدایت، وسیلۂ شفاعت اور سب سے زیادہ محبت اور اتباع و پیروی کا مستحق سمجھا جائے۔ اور زیادہ سے زیادہ آپؐ کی سنتوں پر عمل کرنے کی کوشش کی جائے اور دینی و دنیوی زندگیوں میں آپ کی ہدایات آپ کے معمول اور دستور پر عمل کرنے کی کوشش کی جائے۔ آپ کی سیرت پاک کے مطالعہ کا اہتمام کیا جائے۔ اور آپ کی احادیث کے مجموعوں اور سیرت کی کتابوں کے مطالعہ کا شوق پیدا کیا جائے۔

۴۔ زندگی کو اسلامی قالب میں ڈھالنے اور صحیح مقاصد زندگی معلوم کرنے کے لئے راقم کی کتاب "دستور حیات" کو مطالعہ میں رکھا جائے نیز حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحبؒ کے مواعظ و ملفوظات کا مطالعہ کیا جائے۔

۵۔ سب سے اہم فریضہ اور ضروری چیز نمازوں کو اپنے وقت پر پڑھنا اور اہتمام اور سنتوں کی پابندی کے ساتھ ادا کرنا ہے۔ اس میں غفلت اور تساہلی کی تلافی کوئی چیز نہیں کر سکتی، نمازیں جماعت کے ساتھ حتی الامکان مسجد میں ادا کی جائیں، مستورات ان نمازوں کو اپنے وقت پر پڑھنے کی کوشش کریں، جو عام طور پر کاموں کی مصروفیت اور ذمہ داریوں کی وجہ سے فوت ہو جاتی ہیں۔ یا ان کا وقت نکل جاتا ہے۔

۶۔ دینی و دنیوی دونوں کاموں میں ثواب اور رضائے الٰہی کی نیت کی مشق کی جائے اخلاق و معاملات اور زندگی کے معمولات میں بھی اس کا اہتمام کیا جائے۔ تاکہ ان پر عبادت کا ثواب ملے اور ان کو حتی الامکان شریعت اور سنت کے مطابق کرنے کی کوشش کی جائے۔ اخلاقی و مزاجی کمزوریوں، حسد و کینہ، حد سے بڑھے ہوئے غصّے، بدگوئی اور بد زبانی اور مال و دولت اور دنیا کی حد سے بڑھی ہوئی محبت سے بچنے کی حتی الامکان کوشش کی جائے۔

۷۔ قرآن مجید کی جس قدر سہولت کے ساتھ ممکن ہو تلاوت کا معمول بنایا جائے۔

۸۔ فجر کی نماز سے پہلے یا بعد مغرب یا عشاء کے بعد (جس وقت آسانی سے ممکن ہو اور پابندی ہو سکے) ایک تسبیح درود شریف کی، ایک کلمہ سوم کی۔ اور ایک استغفار کی پڑھ لی جائے اور اگر اللہ تعالیٰ توفیق دے تو آخر شب میں کچھ رکعتیں تہجد کی بھی پڑھنے کی کوشش کی جائے۔ اور اپنے سلسلے کے مشائخ اور تعلق والوں کے لئے دعا کی جائے۔

باطنی کیفیات اور چند نمایاں صفات

عشق و محبت

حضرت نے ایک جگہ خود تحریر فرمایا ہے کامل الاحوال بزرگوں کی باطنی کیفیات کا اندازہ عامی کیا لگا سکتے ہیں ان حضرات کا احوال و مسلک یہ ہے کہ۔ ؂

عشق عصیاں است گر مستور نیست
لیکن پھر بھی پیمانہ جب لبریز ہوتا ہے

تو دو چار قطرے ٹپک پڑتے ہیں، ڈبڈباتی ہوئی آنکھیں ضبط گریہ اور اخفائے حال کی کوشش اس حقیقت کی غمازی کرتی ہیں جس سے سینہ معمور اور دل مخمور ہے کسی حقیقت شناس نے عرصہ ہوا کہا تھا ؎

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں

اصحاب احوال جب کسی شعر کا انتخاب کرتے ہیں تو اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ ان کے حقیقت حال کی تصویر اور ان کے دل کی سچی ترجمانی اور تعبیر ہے۔

حضرت کو علامہ اقبال کے اشعار سے ایسا ہی تعلق تھا، جن اشعار کا انتخاب کیا ہے اس سے حضرت کو سمجھا جا سکتا ہے، نقوش اقبال کا مطالعہ اس کے لئے مفید ہوگا۔ علامہ کے علاوہ بھی حضرت کا انتخاب بہت لاجواب ہے خواجہ میر درد کا یہ شعر حضرت پڑھتے تھے بڑے ذوق و شوق سے ؎

جائیے کس واسطے اے درد میخانہ کے بیچ
کچھ عجب مستی ہے اپنے دل کے پیمانہ کے بیچ

یہ اشعار بھی بڑے ذوق سے پڑھتے اور پوری پوری غزل سنا دیتے

نکل کے راہِ عشق سے چلوں تو کس طرف چلوں
کہاں سے لاؤں جان و دل یہ دے چکا وہ کھو چکا

علامہ کے یہ اشعار بھی بڑے والہانہ انداز سے پڑھا کرتے تھے۔

یہ غازی یہ تیرے پُراسرار بندے
جنھیں تو نے بخشا ہے ذوق خدائی

توحید و سنت سے ایسا عشق تھا کہ جس کا صحیح اندازہ وہی کر سکتے ہیں جو حضرت کے زیادہ قریب اور سفر و حضر میں ہم رکاب رہا کرتے تھے۔

کتنے درد و سوز سے آپ مولائی انی الی فضلک لفقیر وقتاً فوقتاً فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ عظمت و کبریائی کے پورے استحضار کے ساتھ کئی کئی مرتبہ خدایا عاقبت محمود گرداں فرماتے، تقریروں میں عقیدۂ توحید پر بہت زور دیتے، حضرت یوسفؑ کا وعظ، حضرت یعقوبؑ کی وصیت اور شیخ عبدالقادر جیلانیؒ شیخ شرف الدین منیریؒ نے توحید کے سلسلہ میں جو واقعات درج کئے ہیں ان کو خاص انداز سے بیان کرتے۔

اخیر میں اتنا غلبہ ہو گیا تھا کہ ہر بیعت کرنے والے، ایک ہو، یا زیادہ ہوں، الفاظ بیعت کے بعد عقیدہ توحید اختیار کرنے اور اس پر مضبوطی سے قائم رہنے کی وصیت فرماتے شرک و بدعت بیجا رسم و رواج اور قبر پرستی سے بچنے کی تلقین فرماتے۔

آستانوں اور درگاہوں پر جو کچھ ہو رہا ہے نہایت درجہ تأسف کا اظہار فرماتے اور ایک مرتبہ تقریر کرتے ہوئے فرمایا ان سجادوں کو الٹ دو، اس کو کھلا ہوا شرک قرار دیتے،

اس کے ساتھ سنت کا اہتمام یہاں تک عادی اور طبعی امور میں مکمل اس کا خیال رہتا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا والہانہ تعلق تھا۔ جو ہر شخص محسوس کر لیتا۔ جب مؤذن اذان دیتا تو فوراً ٹوپی لگا کر بیٹھ جاتے نہایت ادب و احترام سے الفاظ اذان دہراتے جب موذن محمد رسول اللہ کا کلمہ کہتا تو آپ لفظ محمد کو اتنی محبت اور پیار سے ادا فرماتے کہ سننے والوں کو بھی لطف آتا۔ اور نہایت ہی والہانہ انداز اور محبت بھرے لہجہ میں صلی اللہ علیہ وسلم بھی فرماتے آج بھی آپ کے شیریں الفاظ کانوں میں رس گھول رہے ہیں، اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت نصیب فرمائے اور مراتب عالیہ سے سرفراز کرے۔ آمین۔

تیسری کیفیت جو آپ کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے وہ اسلام کی فکرمندی اور دلسوزی ہے۔ یہ صفت ایسی غالب تھی کہ آپ مفکر اسلام کہلائے، بہت سے لوگ صرف الفاظ سے اظہار کرتے ہیں تو ان کو اس لقب سے سرفرازی حاصل ہو جاتی ہے حضرت والا کی فکرمندی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی بلکہ روح میں سرایت کر گئی تھی۔ جس کی وجہ سے آپ بے خوابی میں بھی مبتلا ہو جاتے۔ اور آخر میں کھانے کی اشتہا بالکل ختم ہو گئی تھی۔ حضرت والا نے اپنے مرشد مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ کے بارے میں تحریر فرمایا ہے۔ لیکن وہ خود حضرت کا حال تھا جو حدیث دیگراں میں آگیا ہے یا یوں کہیئے کہ شیخ کی نسبت حضرت میں منتقل ہو گئی تھی۔ اور جوش مار رہی تھی۔

اسلام کی فکرمندی اور مسلمانوں کے حالات سے دردمندی، طبیعت ثانیہ۔ اور پورے نظام زندگی کی روح رواں بن گئی تھی۔ اس کے لئے نہ زندگی کا کوئی شعبہ مخصوص تھا، نہ عمر کا کوئی وقت یہ درد جسم اور قوائے فکریہ میں اس طرح جذب ہو گیا تھا ؎

شاخ گل میں جس طرح باد سحرگاہی کا نم

جس گروہ سے آپ کا تعلق تھا۔ اس کا ذکر و شغل۔ اس کا انقطاع الی اللہ اس کی یکسوئی و بے نیازی اس کو مسلمانوں سے جدا نہیں اور بے فکر نہیں بناتی بلکہ اور زیادہ اسلام اور مسلمانوں کے درد میں مضطرب اور بے قرار بناتی ہے اور اس گروہ کا ہر فرد زبان حال سے کہتا ہے۔

مرادردیست اندر دل چو می گویم زبان سوزد
اگر دم درکشم ترسم کہ مغز استخواں سوزد

یہی درد کبھی زبان پر آکر آہ و فغاں میں تبدیل ہوجاتا، کبھی مسلمانوں کی کوتاہیوں اور ناسمجھیوں پر دردو قلق کے اظہار اور ملامت و تنبیہ پر آمادہ کرتا کبھی تنہائی میں آنسوؤں میں تبدیل و تحلیل ہوجاتا لیکن وہ دم کے ساتھ تھا اور اس سے کسی وقت قرار نہ تھا۔

چوتھی صفت
فنائیت وبے نفسی

حضرت نے اپنے مربی ومرشد حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی فنائیت وبے نفسی کے متعلق اپنا ذاتی مشاہدہ و تاثر جو کچھ بیان فرمایا وہ ہم سب حاضرین اور سفر وحضر میں ساتھ رہنے والوں کا بعینہ ــــ حضرت کی ذات کے متعلق ہے کہ کبھی ایک کلمہ بھی ایسا نہیں سنا جس میں اپنی تعریف کی بو آتی ہو۔ حب جاہ کا یہاں سرکٹا ہوا تھا۔

حضرت نے اپنے مرشد حضرت رائے پوری کا یہ واقعہ کئی مرتبہ سنایا کہ ایک مرتبہ کچھ بڑے حضرات خدمت میں حاضر ہوئے مجلس لگی ہوئی تھی حضرت خاموش تھے، خدام کو فکر ہوئی کہ حضرت کچھ کلام فرمائیں تاکہ نئے حاضرین پر اچھا اثر پڑے تو کسی نے پوچھا حضرت صبر کا کیا مطلب ہے حضرت خاموش رہے، پوچھنے والا سمجھا کہ حضرت نے سنا نہیں ذرا بلند آواز سے دوبارہ پوچھا۔ حضرت نے مولانا کی طرف متوجہ ہوکر فرمایا کہ علی میاں سے پوچھ لو، مولانا نے عرض کیا میں تو صرف اس کے ظاہری معنی بتا سکتا ہوں، اس پر حضرت نے فرمایا کہ میں تو وہ بھی نہیں بتا سکتا۔ اس کے بعد پھر برابر خاموشی رہی۔

یہی حال ہمارے حضرت کا پوری زندگی رہا، کوئی آئے نہ آئے، معتقد ہو نہ ہو کبھی کسی اشارہ کنایہ میں بھی نہیں کہا کہ مجھ سے بیعت ہوجائے۔ شروع میں تو اکثر دوسرے مشائخ کی خدمت ہی میں بھیجنے کا معمول تھا، جو حضرات اصرار کرتے ان کو بیعت فرمالیتے

حضرت نے اپنی زندگی میں نہ جانے کتنے کام کئے کیسے کیسے کارنامے آپ کی ذات سے وابستہ ہیں لیکن آج تک کسی نے یہ نہیں سنا کہ یہ میں نے کیا ہے یہ ہمارا کارنامہ ہے، میں اور ہم گویا آپ کی لغت میں تھے ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے بحر جود وسخا میں "ہم اور میں" ایسے گم ہوچکے تھے کہ جب زبان تحدیث نعمت کیلئے کھلی تو یہی سنا گیا کہ اللہ کی توفیق سے یہ کام ہوگیا یہ ہمارے والد صاحب کا اخلاص بھائی صاحب کی تربیت کا نتیجہ، ماں کی دعاؤں کا ثمرہ اور بزرگان دین کی صحبت اور شیخ کی توجہ کا اثر ہے ورنہ میں ایک دیہات کا رہنے والا نہ زیادہ ذہین نہ حافظ ؎

کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل
نسیم صبح تیری مہربانی

یہ کہتے ہوئے آپ کی آنکھیں آبدیدہ ہوجاتیں خاص طور سے اپنے بھائی مولانا ڈاکٹر عبدالعلی صاحب جو اصلاً آپ کے مربی رہے۔ جب بھی ذکر کرتے تو آنکھیں ضرور اشک کا نذرانہ پیش کرتیں۔

چاروں طرف سے مبشرات کے خطوط آتے زبانی بھی لوگ آکر بیان کرتے اور خود آپ بھی خواب میں دیکھتے، کبھی اپنے متعلق، کبھی کسی تصنیف کے تعلق سے، کبھی ان کا دوسروں کے سامنے ذکر کرتے اور نہ کبھی کسی تصنیف میں درج کرتے صرف ایک بات فرماتے، میں تو اس لائق نہیں ہوں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کے تعلق سے کوئی آپ کو خوشخبری دیتا تو دو ایک آنسو ٹپک جاتے۔ اور ایک آدھ اپنی نااہلی کا لفظ کہکر خاموش ہوجاتے۔

یہ صفت شروع سے اخیر تک قائم رہی اس کو آپ سلوک کیلئے بہت ضروری سمجھتے تھے ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں۔

اپنی نااہلی کا احساس اور اپنے کو سب سے ادنیٰ اور کسی قابل نہ سمجھنا اس راہ کی سب سے اونچی بات ہے۔ اور اسی میں سالک کی حفاظت اور اس کی ترقی کا راز ہے۔"

اپنے متعلق حضرت رائپوریؒ کو ایک خط میں حاضری کے تاثرات لکھتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں "جب اپنی بدعملی اور قطعی نااہلی پر نظر جاتی تھی اور خیال ہوتا تھا کہ ہم جیسے ایسی پاکیزہ مجلس کے حواشی میں بیٹھنے کے لائق نہیں تو حضرت کی عنایات خصوصی پر بہت ہی ندامت اور شکر کا جذبہ پیدا ہوتا تھا۔ اور دل سے دعا نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان بزرگوں کو ہم نااہلوں کی طرف سے جزائے خیر عطا فرمائیں"۔

اس فن میں حضرت کا کیا مقام تھا یہ اہل مقام جانیں، چند باتیں اس کے تعلق سے عرض کردی گئی ہیں کیفیات کی کچھ جھلکیاں پیش کرنے کی کوشش کردی گئی۔ ؏

سفینہ چاہیئے اس بحر بیکراں کیلئے

کوئی ہشت پہل ہیرا کہتا ہے، کوئی مجموعہ حسنات، کوئی پھولوں کا گلدستہ قرار دیتا ہے کوئی قوس وقزح، کوئی علم کا آفتاب کہتا ہے، کوئی عشق کا ماہتاب، کوئی ؏

اے طبیب جملہ علت ہائے ما

کوئی حکیم و دانائے راز کہکر پکارتا ہے جس کے ہزار پہلو ہوں، ہیچدانوں کے لئے کسی ایک کا بھی حق ادا کرنا مشکل ہے، بازار میں اپنی پونجی لے کر یہ غریب بھی نام لکھانے آیا ہے شاید اس کے حصہ میں بھی کچھ آجائے اور داماں رحمت میں جگہ پانے کا مستحق ہوجائے۔

واللہ ولی التوفیق۔

ندوۃ العلماء کے ناظم آہ! حضرت بوالحسنؒ

خلیلؔ پرتاپ گڈھی

ندوۃ العلماء کے ناظم آہ! حضرت بوالحسنؒ
حیف تجھ سے ہو گیا خالی یہ ندوہ کا چمن

ایک عالم، صاحبِ فکر ونظر جاتا رہا　　ایک دانشور، مؤرخ، راہبر جاتا رہا
رہنمائے قوم وملت، دیدہ ور جاتا رہا　　اک مبلّغ، لائق وفائق بشر جاتا رہا
دل میں تیری جانے کتنی خوبیاں ہیں موجزن
ندوۃ العلماء کے ناظم آہ! حضرت بوالحسنؒ

یوں تو فانی ہے ہر اک شئے اس جہاں کا ہر بشر　　لیک تیرا جانا چھلنی کر گیا دل اور جگر
ہوک سی اٹھتی ہے دل میں ہو رہی ہے چشم تر　　چاہتا ہے جی کہ ہو جائے یہ سب جھوٹی خبر
دل نہیں آمادہ سننے کو یہ رودادِ محن
ندوۃ العلماء کے ناظم آہ! حضرت بوالحسنؒ

ہے وہی ہریالی گلشن میں مگر بھاتی نہیں　　ہیں وہی گلہائے رنگا رنگ، بو آتی نہیں
اب وہی پرکیف نغمے کیوں فضا گاتی نہیں　　روشنئ ماہ وانجم نور برساتی نہیں
لٹ گئی کیسی بہار گلستان وانجمن
ندوۃ العلماء کے ناظم آہ! حضرت بوالحسنؒ

سب کے دل میں تیری عزت سب کے دل میں تیری چاہ　　باہری ملکوں کی کتنی انجمن کا سربراہ
درس حق پایا تھا اس نے جس پہ ڈالی اک نگاہ　　دینے والا کچھ نہ کچھ بے لوث ہے خاموش، آہ!
ہائے اس دنیائے فانی کا ہے یہ کیسا چلن
ندوۃ العلماء کے ناظم آہ! حضرت بوالحسن

سیکڑوں لکھیں کتابیں جن سے دفتر بھر گیا　　جاتے جاتے قوم کی خاطر بہت کچھ کر گیا
صاحب اوصاف کتنی آنکھیں کرکے تر گیا　　کرکے گرویدہ سبھی کو، ہائے! جادوگر گیا
سونی ہے مہمان خانے کی وہ علمی انجمن
ندوۃ العلماء کے ناظم آہ! حضرت بوالحسنؒ

ہو ترا مرقد منوّر دل سے ہے اپنی دعا　　مغفرت فرمائے تیری ہر طرح سے ہی خدا
صبر گھر والوں کو دے وہ مالکِ روزِ جزاء　　جنت الفردوس ہو تیرے لئے اس کی عطا
یہ چمن فانی ہے مل جائے بقا میں بھی چمن
ندوۃ العلماء کے ناظم آہ! حضرت بوالحسنؒ

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

بحیثیت ایک اُردو ادیب

پروفیسر وصی احمد صدّیقی، معتمد مال، ندوۃ العلماء

اس حقیر مضمون نگار نے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی کتابوں کی تلخیص لکھی، مضامین لکھے مگر نفسِ مضمون میں ہمیشہ ایسا کھویا رہا کہ تحریر کی ادبیت، اس کی سادگی اور پُرکاری کو اپنے بیان میں نہیں لاسکا، یہ وحدت الشہود والی بات رہی، کہ آفتاب کی روشنی کے سامنے ستاروں کی روشنی ماند ہوجاتی ہے. ظاہر ہے نفسِ مضمون کو میں نے آفتاب اور پیرایہ بیاں کو ستاروں سے تشبیہ دی ہے مگر ان ستاروں کی آنکھوں کو تراوٹ بخشنے والی ہلکی روشنی بھی اپنا حُسن رکھتی ہے۔ یہ مضمون اِنھیں ستاروں کی جھلملِ ہے،

حضرت مولاناؒ نے زیادہ تر عالمِ اسلام کی اصلاحی اور تجدیدی کوششوں کا تاریخی جائزہ لیا ہے، نامور مصلحین اور ممتاز اصحاب دعوت و عزیمت کا مفصّل تعارف کرایا ہے، اُن کے علمی کارناموں کی روداد بیان کی ہے، جو کچھ بھی لکھا ہے وہ ذاتِ محمدیؐ سے عشق اور نبوت محمدیؐ کی پیروی کا بیان ہے، کوئی بھی نغمہ ہو لے ہمیشہ حجازی رہی اُسی سے محبت کرتے ہیں اور اُسی کا بیان کرتے ہیں جن کی صفات حضرت مولاناؒ سے مشترک ہوں۔ یعنی دین کا احیاء اور مسلمانوں کی حفاظت کا کام۔ وہ لوگ جن کا مسلمانوں پر احسان ہے۔ ان حضرات کی سیرت اور تذکرہ کے سلسلے میں اُن کے زمانہ کی علمی اور فکری سطح کو بھی نمایاں کیا ہے اور ان کے علمی کمالات ہی کا ذکر نہیں کیا ہے. بلکہ ان کی زندگی کے باطنی پہلو کو بھی اجاگر کیا ہے۔

یہ مضمون اپنی فرد گزاشت کی تلافی کے لئے لکھا جارہا ہے لیکن عرض کردوں کہ صوفیا کا قول کہ نابودن دیگر و نادیدن دیگر میرے حسب حال کی کوشش رہے گی کہ حضرت مولاناؒ کے طرز انشا کا بیان بھی ہوجائے تاکہ خامہ نخلِ رطب فشاں ہوجائے.

حضرت مولاناؒ کی تحریر اتنی دلکش کیوں ہوتی ہے اور کیوں لوگوں کے احساسات کو چھوتی ہے. اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر کسی تحریر میں مجرّد افکار ہوں یا خالص حقیقتوں کا بیان ہو تو گو وہ ایک علمی تحریر ہوگی مگر اثر ڈالنے والی نہ ہوگی۔ مولاناؒ کا بیانِ حقیقت جذبات کی شکل میں دل میں ورود کرتا ہے۔ ان جذبات کا بیان حقیقی اور فطری زبان میں ہوتا ہے اور شاعرانہ زبان کے ملمّع سے بالکل محفوظ۔ یقیناً مناسب موقع پر حضرت مولانا پُرجوش اور استعارہ آمیز تحریر لکھ جاتے ہیں عبارت آرایانہ تکلف سے بالکل دور۔ مولانا کی زبان سالم اور مکمّل افکار کی تصویر ہوتی ہے۔ حقیقت اور جمال ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ فکر اور ادراک اور اظہار الگ ہونے کے باوجود ایک وحدت میں تبدیلی ہوجاتے ہیں علم لغت کی لفظی کثرت مترادفات کا زیادہ استعمال مولانا کی تصانیف میں کہیں کہیں مل جاتی ہے مگر وہ متن پر حاشیوں سے زائد نہیں

مولانا کی زبان کی ہم آہنگی اس درجہ کی ہے کہ اس سے اونچا درجہ تخیل میں نہیں آتا۔

حضرت مولانا حرف و معنی کے اندرونی رشتہ سے بخوبی واقف ہیں۔ فکر کی گہرائی اور تخیّل کی رعنائی اُن الفاظ سے ہم آہنگ ہوگا جو مولانا استعمال کرتے ہیں۔ اضطراب اور خلش کا بیان، مردانِ کار کے کارناموں کا ذکر، اقدار حیات کا تعین سب کے لئے الفاظ سے بنی ہوئی فضا الگ ہوجاتی ہے۔ لیکن آفاقیت اور ہمہ گیری سے کوئی بیان خالی نہیں ہوتا۔ اور یہ کمال بھی کہ چشم زدن میں اشیا کے باطن کو سامنے کردیا۔ اس شوق، عشق تپش، اور جذب کے ساتھ جو ان کے بیان کا خاصہ ہے۔ روانی اور بے ساختگی میں کہیں فرق نہیں آتا. ان کی مثالیں میں ابھی آپ کے سامنے لاؤں گا۔

حضرت مولانا نے زیادہ تر تاریخ. فلسفۂ تاریخ. مذہب سیرت اور سوانح کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ ان دائروں میں وسعت کم ہوجاتی ہے مگر حضرت مولاناؒ کے اندر جو تخلیقی فنکار چھپا ہے وہ چنگاری سے ستارہ ڈھونڈھتا ہے اور ستارہ سے آفتاب۔ عرفان حقیقت کا انحصار ادراک اور جستجو دونوں سے تعلق رکھتا ہے۔ اولین بات حقیقت ہے پھر خیال، مشاہدے کی احساسیت اور دلکشی اور پڑھنے والے میں انشراحِ صدر کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ یہ کاشفِ اسرارِ دین ہیں اور ان کے ضمیر پر نزول کتاب ہوتا ہے۔ حضرت مولانا کی کتابوں میں ایک ربطِ فکری ہوتا ہے۔ موضوعات الگ الگ ہونے کے باوجود سارے مضامین

ایک دوسرے کے معاون ہوتے ہیں، ایک دوسرے کی تشریح کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی معنویت میں اضافہ کرتے ہیں۔ الفاظ کا دروبست ایسا کہ ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے۔

حضرت مولاناؒ نے اپنی تحریروں میں خطیبانہ اثر انگیزی کو جگہ نہیں دی ہے۔ ان کے باطنی تقاضے اور فکری زاویے، کیفیتِ نفسی اُن کے سادہ بیان سے قاری تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہ زبان محاکاتی اور استدلالی ہوتی ہے نہ کہ قصّہ آفریں تحریر کی تشبیہ ایک شفاف شیشے سے دی جاسکتی ہے جس کے اندر سے لکھنے والے کے جذبات چھلک رہے ہیں۔ اعلیٰ پایہ کی تحریر کے لئے ایسی پرکار سادگی بالکل ایک خوبصورت سہل ممتنع غزل کی طرح طبیعت کو خوشی سے بھر دیتی ہے۔

یہ چھوٹا سا مضمون مولانا کی ساری تصانیف کا احاطہ نہیں کرسکتا، بہر حال اُن کی چند بہت معروف کتابوں سے اپنے بیان کی وضاحت کیلئے۔ نمونے پیش کرتا ہوں۔ سب سے پہلے میں حضرت مولاناؒ کی پہلی تصنیف سیرت سید احمد شہیدؒ کو لیتا ہوں۔ اس وقت کے نوجوان عالم کے قلم کی روشنائی شہید کے خون کی سُرخی سے مل گئی ہے ؎

اک خونچکاں کفن پر کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

زورِ بیاں کا اعجاز دیکھئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک غیر فانی معجزہ یہ ہے کہ آپ کے فیض کا چشمہ کبھی خشک نہیں ہونے پاتا۔ آپ کا نمونہ کبھی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوتا۔ آپ کے اُمّت کی ضرورتیں زیادہ دیر تک اٹکی نہیں رہتیں۔ اور وہ اس طرح کہ آپ کی مشعلِ نور سے براہِ راست مسلسل طریقہ پر سیکڑوں مشعلیں روشن ہوتی رہی ہیں۔ آپ کی کامل پیروی سے ہر زمانے میں اور تقریباً ہر جگہ کم و بیش ایسے انسان پیدا ہوتے رہے جن سے آپ کی یاد تازہ ہوتی تھی اور انبیاءؑ کی شان نظر آتی تھی۔ جن سے ظاہر ہوتا کہ اللہ کا کام بند نہیں ہوا۔ اور اللہ کا دین زندہ ہے

ان بزرگوں کے کئی طبقے ہیں، پہلے اور سب سے اونچے طبقہ کو صحابہ کرام کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جس طرح آنحضرتؐ نے نبوّت و کمالات، نبوّت کی تکمیل کردی۔ اس طرح ان حضرات نے آپ کی کامل پیروی کا حق ادا کردیا۔ اس کے بعد سلفِ صالحین اولیائے کاملین، مجاہدین۔ مرشدین۔ مصلحین و مجدّدین ہیں۔ یہ سب آپ کے کفش بردار اور آپ کے دین کے خادم ہیں اس سے زائد کچھ نہیں۔

اس تسلسل میں اب مولاناؒ کا الفاظ پر قابو دیکھئے۔ تشبیہات اور مثالوں کا ایسا حُسن کہیں اور دیکھنے میں مشکل سے ملے گا۔

ان لوگوں سے اللہ ہمیشہ اپنا کام لیتا رہا اِن سے ہزاروں کی آنکھیں روشن کیں، ہزاروں کے دل کے کنول کھلائے۔ ہزاروں کو جگایا۔ اِن کا ذکر عبادت ہے۔ اِن کی محبت ذخیرۂ آخرت ہے۔

یہ لوگ شب بیدار و شہسوار۔ اللہ کیلئے محبت کرتے تھے۔ تو اللہ ہی کیلئے دشمنی بھی کرتے تھے۔

اب اس تشبیب کے بعد گریز دیکھئے۔

پشاور کے فاتح اور تیرھویں صدی کے امیر المؤمنین کی زندگی میں اتباعِ نبوّت کی حیثیت بہت نمایاں نظر آئیگی انھوں نے اچھی طرح سمجھ لیا کہ اسلام عقائد و رسوم کا نام نہیں۔ وہ زمانے کی فضا۔ طبیعتِ بشری کا مذاق اور سوادِ اعظم کا رنگ بدلنا چاہتا ہے۔ یہ اس وقت ہوسکتا ہے کہ اس کو مادی اور سیاسی اقتدار حاصل ہو، شرعی حکومت کے بغیر شریعت پر پورا عمل بھی نہیں ہوسکتا۔ امر و نہی کے لئے سیاسی اقتدار اور مادّی قوت کی ضرورت ہے۔

سیّد صاحب نے "مسلمان" نام کی ایک قوم کے غلبہ کے لئے نہیں بلکہ "اسلام" نام کا ایک مکمل دین۔ عقیدہ۔ عمل اور مسلک زندگی کو قائم کرنے کے لئے اپنے خون کا پہلا اور آخری قطرہ بہایا۔

کیفیتِ ایمانی کے جان نواز جھونکے تاریخ اسلام میں بارہا چلے ہیں۔ لیکن ایمان و یقین خلوص و للّٰہیت کی ایسی بادِ بہاری ہمارے علم میں کم سے کم ہمارے ملک میں اس سے پہلے نہیں چلی۔ آدم گری اور مردم سازی۔ اصلاح و انقلاب کے ایسے محیّر العقول واقعات بھی اصلاح و تربیت کی تاریخ میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔

سیّد صاحب کے رفیقوں کے ذکر پر جب آتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ غار کے رفیقؓ ان کے ذہن میں آجاتے ہیں۔

"صدّیق کے لئے ہے خدا کا رسول بس"

مولانا یحییٰ علی عظیم آبادی کا ذکر مختصر ہے مولاناؒ نے دردؔ کی ایک رباعی لکھی ہے جسے وہ پڑھتے تھے کتاب دل کی بڑی سے بڑی تفسیر اس رباعی کے اثر کے برابر نہیں ہوسکتی۔

اتنا پیغام درد کا کہنا۔ جب صبا کوئے یار سے گذرے
کون سی رات آپ آئیں گے۔ دن بہت انتظار میں گذرے

حضرت اسمٰعیل شہیدؒ رحمۃ اللہ علیہ کے بیاں میں مولانا جذباتی ہوجاتے ہیں۔ دیکھئے کیسی دل کو پگھلا دینے والی تحریر لکھی ہے۔

سرحد کا قیام اور ہجرت کے بعد کا زمانہ ایک مسلسل جہاد کا زمانہ تھا جس میں یا تو عملاً جنگ تھی یا اس کی تیاری جنگ کی تدابیر اور انتظامات اور جنگی مہموں کی قیادت میں سب سے بڑا حصّہ آپ ہی کا تھا۔ اس مدّت میں میدانِ جنگ کے

نشیب و فراز اور حالات کے سب تغیرات پیش آئے۔ فتوحات بھی ہوئی۔ علمداری بھی قائم ہوئی۔ ایک دینی ریاست کا بھی انتظام کرنا پڑا۔ شکستیں بھی ہوئیں فتح کیا ہوا علاقہ بارہا ہاتھ سے نکل نکل گیا۔ دن رات کے ساتھیوں اور عمر بھر کے رفیقوں کو بارہا اپنے ہاتھ سے قبر میں اتارا، برسوں کی کھیتی دنوں اور گھنٹوں میں لٹ پھنک گئی۔ بالآخر عین میدانِ کارزار میں اپنے محبوب مقصد کیلئے اپنے محبوب امام و رفیق کے ساتھ راہِ خدا میں سر دیکر ثابت کردیا کہ۔

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم
سو اس عہد کو ہم وفا کر چلے

یہ تو اس شہید کے کارنامے کا ذکر تھا اب مولانا اس نا قدری کا ذکر کرتے ہیں جو ملّت کے ایک حصہ نے اُن کے ساتھ روا رکھی مولانا کا دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔

۱۳۶ برس کے طویل عرصہ میں شاید ہی کوئی دن ایسا طلوع ہوا ہو جس کی صبح کو اس شہید اسلام کی تکفیر و تفسیق کا کوئی فتویٰ نہ نکلا ہو۔ لعنت اور سب و شتم کا کوئی صیغہ نہ استعمال کیا گیا ہو۔ یہ ان لوگوں نے کیا جن کے جسم نازک میں آج تک اللہ کیلئے ایک پھانس بھی نہیں چبھی، جن کے پیروں میں اللہ کے راستہ میں کوئی کانٹا نہیں چبھا، جن کو (خون چھوڑکر کہ اس کا یہاں کیا ذکر) اسلام کی صحیح خدمت میں پسینے کا ایک قطرہ بھی بہانے کی سعادت نصیب نہیں ہوئی۔ تاریخ دعوت و عزیمت کی تمہید ملاحظہ کیجیے

اسلام اللہ تعالیٰ کا آخری پیغام ہے اور کامل و مکمل طور پر دنیا کے سامنے آچکا ہے اور اعلان کیا جاچکا ہے کہ آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کردیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کردی اور دین کی حیثیت سے اسلام کو تمہارے لئے پسند کرچکا۔

ایک طرف تو اللہ کا دین مکمل ہے دوسری طرف یہ حقیقت ہے کہ زندگی متحرک اور تغیّر پذیر ہے اور اس کا شباب ہر وقت قائم ہے۔

جاوداں پیہم دواں ہر دم رواں ہے زندگی

امام غزالی کے بارے میں لکھتے ہیں علوِ ہمت ان کی زندگی کا طغرائے امتیاز ہے انھوں نے علم و عمل کے دائرہ میں اپنے زمانہ کی سطح اور اپنے ہم عصروں کی کسی منزل پر قناعت نہیں کی وہ علم و عمل کے جس ترقی یافتہ مقام پر پہنچے ان کے کانوں میں یہی صدا آئی ؎

مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں ہے

مولانا روم کے بارے میں لکھتے ہیں:

توفیق الٰہی نے جب ان کو معرفت و آگہی کے مقام تک پہنچایا۔ اور قال سے حال۔ خبر سے نظر الفاظ سے معانی اور اصطلاحات و تعریفات کے لفظی علوم سے ترقی کرکے حقیقت و مغز تک پہنچے تو ان کو فلسفہ و علم کلام کی کمزوریوں اور استدلال اور قیاس کی غلطیوں کا اندازہ ہوا۔

دلوں میں دوبارہ دینی و غیبی حقائق کی وقعت۔ علوم انبیاء کی عظمت۔ عالمِ غیب کی وسعت اور قلب و روح۔ ایمان اور وجدان کی اہمیت کا نقش قائم کردیا۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں لکھتے ہیں۔

حضرت خواجہ کی سیرت اور زندگی کا مرکزی نقطہ جو ان کے تمام اخلاق و اعمال اور احوال کا محور ہے وہ عشق الٰہی کی نعمتِ خداداد ہے۔

ان کے تمام حالات اور اشغال گفتگو اور مجالس، اشعار اور اُن کے انتخاب واقعات اور اُن کی تخیل غرض ہر چیز اُسی سوزِ باطن اور اُسی حرارتِ عشق کا اظہار ہوتا ہے۔ ؏

شعلہا آخر ز ہر موئیم دمید
از رگِ اندیشہ ام آتش چکید

پرانے چراغ میں حضرت مولانا نے لکھا ہے کہ ان کو اپنے بیتے ہوئے دن، اپنے برتے ہوئے اشخاص اپنے بچھڑے ہوئے بزرگ اور گزرے ہوئے حالات سے بہت دلچسپی ہے، اس دشت کی سیّاحی میں اُن کی تیسری پشت ہے۔

خوبصورت تراکیب اور بہترین جملے پوری سیر برا میں بکھیرے ہوئے ہیں۔۔ بیت کے بجائے رب البیت۔ مکان کے بجائے مکیں سے واصل ہوئے۔ سمندر کو شکایت نہیں رہی کہ وہ اس دولت سے یکسر محروم رہے، جو زمین کے نصیب میں آئی۔

صحفِ سماوی کا انداز بیان۔ خطیبوں کا جوش اور برجستگی۔ عشاق کی مستی و وارفتگی عقل و جذب کی لطیف آمیزش ان جملوں کی داد دینے کیلئے خود قاری سخن فہم ہونا چاہیئے۔

شیخ حسن البنا مرحوم کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ان کی طاقت اور قوت کا اصل سرچشمہ فطرتِ سلیم۔ دل کی پاکیزگی، روح کی بالیدگی۔ اپنی غیرت و حمیّت اور اسلام کے لئے اضطراب اور بے چینی ہے۔ اُن کی دعوت نے عالمِ عربی کی نئی نسل میں اسلام کی سدا بہار صلاحیت اور اُس کے دائمی ہونے کا اعتماد بحال کیا۔ اور جدید دلوں میں ایمان کی نئی چنگاری روشن کی۔

مولوی محمد ثانی مرحوم پر حضرت مولانا نے جو مضمون تحریر کیا ہے اس میں قدیم عرب شاعر ابوالحسن التہامی کے دلدوز قصیدہ کا ذکر کیا ہے جو اُس نے اپنے جواں مرگ بیٹے کے مرثیے میں کہا ہے۔

موت کا قانون پوری مخلوق پر جاری و ساری ہے حقیقت میں یہ دنیا بقا اور استقرار کی جگہ نہیں اپنے مرحوم بیٹے سے مخاطب ہوکر کہتا ہے ہم تم دونوں ایک ہی میدان کے راہی تھے تم نے پیش قدمی کی۔ اور منزل پر پہنچ گئے۔ اور تمہارا باپ ابھی سرگرم سفر ہے۔

میرے پیش نظر صرف وہ کتابیں ہیں جو حضرت مولانا نے اردو میں لکھی ہیں یا خود اردو میں ان کا ترجمہ کیا ہے لوگ بتاتے ہیں کہ عربی میں لکھی ہوئی کتابوں میں حضرت مولانا نے روانیِ بیاں کا دریا بہادیا ہے۔ اردو تحریروں میں جو بہار کی فضا رہتی ہے گو ذکر خزاں کا ہو۔ اس سے اُس گلستاں کے رنگ و بو کا بھی قیاس کیا جاسکتا ہے مجھے انگریزی شاعر کیٹس کی وہ لائن بے حد پسند جو اس نے اپنی شہرۂ آفاق نظم THE GRECIAN URN میں لکھی ہے۔

سُنے ہوئے نغمے میٹھے ہوتے ہیں مگر ان سُنے نغمے اور زیادہ میٹھے ہوتے ہیں۔

حضرت مولانا کی کتاب "الطریق الی المدینہ" کا ترجمہ کاروانِ مدینہ کے نام سے ہوا ہے۔ اس کتاب نے بڑی شہرت پائی ہے اور اس کے مضامین ایسے ہیں جو از دل خیزد بر دل ریزد کے مصداق ہیں۔ وہی اثرات مرتب ہوتے ہیں جو قدسی یا جامی یا سعدی یا خسرو کے نعتوں کو پڑھ کر ہوتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لئے اِس عالمِ آب و گل سے الگ ہوجانا۔ اور اس خنک شہر میں پہنچ جانا جہاں اپنے سرکار آرام فرمارہے ہیں۔ مصنف کا دل امڈا آرہا ہے لیکن میرا یہ مضمون معنی سے زیادہ بیان کے ذکر میں ہے۔ ایک مضمون عالم نو جو اردو میں لکھا ہوا ہے اس کے چند جملے نقل کرتا ہوں۔

زمانہ کی رُت بدل گئی۔ انسان کیا بدلا جہاں بدل گیا۔ زمین وآسمان بدل گئے۔ آدم کی اولاد پر آدم کے کسی فرزند کا اتنا احسان نہیں جتنا محمد رسول اللہ علیہ وسلم کا دنیا کے انسانوں پر ہے۔ اگر اس دنیا سے وہ سب لے لیا جائے جو محمد رسول اللہ نے اس کو عطا کیا ہے تو انسانی تہذیب ہزاروں برس پیچھے چلی جائے گی۔

حضورؐ کی پیدائش کا دن مبارک کیوں نہ ہو کہ اس دن دنیا کا سب سے مبارک انسان پیدا ہوا جس نے اس دنیا کو نیا ایمان اور نئی زندگی عطا کی۔

بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے
وہ سب پود انھی کی لگائی ہوئی ہے۔

یہ دنیا کوئی خود رو جنگل نہیں بلکہ یہ مالی کا لگایا ہوا آراستہ باغ ہے۔ اور انسان اس باغ کا سب سے اعلیٰ پھول ہے۔ یہ پھول جو ہزاروں بہاروں کا سرمایہ ہے۔ انسان کا جو ہر انسانیت کی اس خالق کے سوا کوئی قیمت نہیں لگا سکتا۔

جب رات کو پورا شہر میٹھی نیند سوتا ہے اور یہ جیتی جاگتی دنیا ایک وسیع قبرستان ہوتی ہے دفعتاً موت کی اس بستی میں زندگی کا چشمہ اس طرح اُبلتا ہے جس طرح رات کی سیاہی میں صبح کی سپیدی نمودار ہو۔ الصلوٰۃ خیر من النوم سے اونگھتی ہوئی انسانیت کو تازگی اور زندگی کا نیا پیغام ملتا ہے جب کسی طاقت و سلطنت کا کوئی فریب خوردہ أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَىٰ اور مَالَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ کا نعرہ لگاتا ہے۔ تو ایک غریب مؤذن اسی کی مملکت کی بلندیوں سے اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہہ کر اس کے دعوائے خدائی کا تمسخر اڑاتا ہے۔ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہ کہہ کر حقیقی بادشاہت کا اعلان کرتا ہے،

ہماری آپ کی دنیا میں حکما اور فلاسفہ بھی آئے۔ ادبا اور شعرا بھی، فاتح و کشور کشا بھی سیاسی قائد اور قومی رہنما بھی مگر کسی کے آنے سے دنیا میں وہ بہار آئی جو پیغمبروں کے آنے سے پھر سب سے آخر سب سے بڑے پیغمبر محمدؐ کے آنے سے آئی۔ کون اپنے ساتھ شادابی وہ برکتیں، وہ رحمتیں نوع انسانی کے لئے وہ دولتیں اور انسانیت کے لئے وہ نعمتیں لے کر آیا جو محمدؐ لے کر آئے، تیرہ سو برس کی انسانی تاریخ پورے وثوق کے ساتھ آپ کو خطاب کرکے کہتی ہے۔

سرسبز سبزہ ہو جو ترا پائمال ہو
ٹھہرے تو جس شجر کے تلے وہ نہال ہو

حضرت مولانا کے مضمون حضور و سرور سے چند لائنیں۔

نظر اٹھا کر دیکھئے دونوں طرف پہاڑوں کی قطاریں ہیں۔ کیا عجب کہ ناقۂ نبوی اس راستہ سے گزرا ہو۔ یہ فضا کی دلکشی۔ یہ ہوا کی مشک بیزی اسی وجہ سے ہے۔

بھینی بھینی ہوا ہے اور ہلکی ہلکی چاندنی جس قدر طیبہ قریب ہوتا جارہا ہے۔ ہوا کی خنکی۔ پانی کی شیرینی اور ٹھنڈک لیکن دل کی گرمی بڑھتی جارہی ہے۔ سُنئے کوئی کہہ رہا ہے ؎

بادِ نسیم آج بہت مشکبار ہے
شاید ہوا کے رُخ پہ کھلی زلفِ یار ہے

وہ ایک بار ادھر سے گئے مگر اب تک
ہوائے رحمتِ پروردگار آتی ہے

وہ دانائے سُبل ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیِ سینا

خاک یثرب از دو عالم خوشتر است
اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است

داغِ غلامیت کرد رتبہ سرو بلند
میر ولایت شود بندہ کہ سلطاں خرید

محمد عربی کا بروئے ہر دو سرا است
کسے کہ خاک درش نیست خاک بر سر او

حضرت مولانا علامہ اقبال سے بے حد متاثر ہیں۔ کئی مضامین ان پر لکھے۔ اقبال در دولت پر ان کا بہترین مضمون ہے جسے عربی تقریر سے محمد الحسنیؒ اردو میں لائے ہیں ایسے ہی ایک کتاب "روائع اقبال" کے نام سے

عربی میں لکھی جس کا اردو ترجمہ مولانا شمس تبریز خاں صاحب نے کیا ہے۔ اور واقعی ترجمہ کا حق ادا کر دیا ہے۔ اس حقیر مضمون نگار کو اپنے مضمون کیلئے بہترین مواد اس کتاب سے مل سکتا ہے۔

شاعر اسلام اقبال، ان کی شخصیت کے تخلیقی عناصر۔ ان کا نظریہ علم وفن۔ ان کی طویل نظموں جیسے مسجد قرطبہ اور ذوق وشوق سب پر حضرت مولانا کی بہترین تحریریں ہیں۔ مگر میں نے خود سے عہد کیا تھا کہ صرف ان کتابوں کو سامنے رکھوں گا جو حضرت مولانا نے اردو میں لکھی ہیں یا خود ان کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اس لئے اقبال کے موضوع کو چھوڑ رہا ہوں مگر کتاب کے مقدمے سے جو پروفیسر رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے اور ظاہر ہے اردو میں لکھا ہے ایک اقتباس پیش کرتا ہوں۔

مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندویؒ جس گھرانے کے چشم وچراغ ہیں وہ صدیوں سے اب تک غیر منقطع طور پر مذہب واخلاق رشد وہدایت تصنیف وتالیف اور زبان وادب کا گہوارہ رہا ہے ان حسنات کی جلوہ گری ان کی شخصیت ہی میں نہیں، علمی ادبی اور دینی خدمات میں بھی ملتی ہیں۔ عربی زبان وادب نیز تحریر وتقریر میں موصوف کو جو غیر معمولی درک ہے اور عالم اسلام میں جو وزن اور وقعت حاصل ہے وہ ہندوستان کے شاید کسی عالم دین کے حصہ میں آئی ہو۔ اس بناء پر سید صاحبؒ کو ملت کا سفیر کبیر بننے کا حق پہونچتا ہے۔

سید صاحب کے ایک متبحر اور روشن خیال عالم دین اور شعر وادب کے مبصر ہونے کی حیثیت سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ موصوف نے اقبال کی تائید اور ترجمانی جس خوبی سے خوبی سے کی ہے اس سے میرے ایک دیرینہ خیال کی تصدیق ہوتی ہے کہ اقبال کا کلام ہمارے لئے اس صدی کا علم کلام ہے۔

حضرت والا کی تاریخ ادب اردو خاص طور پر اردو شاعری پر بے مثال نگاہ رکھنے کا اندازہ مجھے گل رعنا مؤلفہ جناب حکیم عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ (حضرت کے والد ماجد) پر مضمون لکھنے کے دوران ہوا۔ حضرت کا بے مثال مفسر قرآن اور محدث ہونا۔ ادبیات عربی کا زبردست واقف کار ہونا تو سب ہی کے علم میں ہے لیکن اس پر حیرت اس لئے نہیں کہ حضرت کی۔ ع

عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں

کے مصداق تھے۔ تاریخ اور فلسفہ تاریخ سے ماہرانہ تعلق بھی سمجھ میں آتا ہے۔ اردو اور فارسی کی شاعری سے لطف اندوز ہونا۔ اور اپنے مضامین میں ان کا حوالہ دینا بھی اس درجہ کے عالم کے لئے جو انتہائی خوش ذوق بھی ہو کوئی خاص بات نہ تھی مگر ادب اردو کی تاریخ۔ اردو شاعری کا ارتقاء اس پر ناقدانہ نظر اس کمال کے ساتھ تو ان باکمالوں کیلئے مخصوص تھا۔ جنھوں نے اپنی طالب علمی سے اس کی ابتدا کی ہو۔ اور اسی پر انتہا بھی ہو۔ انتہا سے میری مراد اُن کے علم کی پہچان اور قبولیت سے ہے۔

حضرت کو کب وقت ملا کہ وہ تاریخ ادب اردو کا مطالعہ کریں۔ حضرت نے انتہائی کم عمری میں سیرت سید احمد شہیدؒ جیسی تاریخی کتاب لکھی پھر ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین لکھی جو کہ تاریخ مذاہب اور فلسفۂ تاریخ اور مسلمانوں کے عروج وزوال کے منطقی اسباب کے بیان حرف آخر ہے اور جس نے لوگوں کو حیرت زدہ کردیا تھا۔ وہ کتاب جو مولانا کی پہچان بن گئی تھی اور ممالک اسلامیہ میں مولانا کا وزیٹنگ کارڈ کا کام کرنے لگی تھی۔ مقدمہ ابن خلدون نے یورپ کو چونکایا تھا اور حضرت مولانا کی کتاب نے اسلامی دنیا کے ساتھ ساتھ مغرب کو بھی۔ میں اکثر غور کرتا رہا ہوں کہ حضرت نے زوال مسلمین کے بجائے انحطاط مسلمین کیوں لکھا، پھر یہی خیال آیا کہ حضرت مولانا کا حساس دل زوال لفظ کی تاب نہیں لاسکا اور لا تقنطو کا پیغام ہمیشہ اُن کے سامنے رہا۔

اس کے بعد تو حضرت کی بے مثال کتابیں آنا شروع ہوئیں۔ تاریخ دعوت وعزیمت کی سیریز۔ کاروانِ زندگی کی سیریز۔ پرانے چراغ کی سیریز۔ نبی رحمت۔ المرتضیٰ اور دوسری کتابیں جو حالات حاضرہ سے متعلق تھیں جیسے مغرب سے صاف صاف باتیں۔ امریکہ میں صاف صاف باتیں وغیرہ وغیرہ، پھر حضرت مولانا کو کب وقت ملا کہ وہ اردو شاعری کی تاریخ اور تنقید کا مطالعہ کریں اور وہ کتابیں جو اس تاریخ سے متعلق تھیں نکات الشعرا، گلشنِ بے خار، وغیرہ پڑھیں۔ حضرت کے پاس کب فرصت تھی۔ اس بات کو لکھنے کی وجہ صرف اپنی حیرت کا اظہار ہے۔ اور میرا یہ فیصلہ کہ گو حضرت مولانا نے استادوں سے پڑھا مگر وہ اصل میں تلمیذ الرحمٰن تھے اور مصرع

"آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں"

کا مصرعہ غالب نے ان ہی کیلئے لکھا ہوگا۔ غالب جیسے بے مثال شاعر کی نگاہ مستقبل میں جھانک سکتی تھی۔ غالب کی شاعری میری نگاہ میں وادیوں میں بھٹکنے والی بھی تھی اور جزدیست از پیغمبری بھی، جہاں ان کے روز ابر اور شب ماہتاب کے مشغلہ کا خیال آتا ہے وہاں وہ شعر بھی ذہن میں آتا ہے۔

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گذاشتن
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ میں حضرت مولانا کے مقدمہ گلِ رعنا کی طرف لوٹ کر آتا ہوں۔

مقدمہ کی ابتدا اس نکتہ کی تفصیل سے ہوتی ہے کہ فارسی ادبیات کا اتنا وافر حصہ اور

اس کے ایسے دلکش و دل آویز نمونے نصابِ تعلیم میں داخل تھے، جن سے عام طور پر فارسی کا ذوق اور شعر و ادب سے لطف اٹھانے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی تھی۔ اور چونکہ فارسی اور اردو کا گہرا تعلق ہے اس لئے اردو میں بھی اس سے بیش قیمت مدد ملتی تھی۔ ۱۸۵۷ء اور اس کے کچھ عرصہ بعد تک جب تک ملک میں نیا نظامِ تعلیم رائج اور مقبول نہیں ہوا تھا علمی اور ادبی محفلوں میں اسی قدیم نصاب کے ساختہ و پرداختہ فضلاء صدر نشین ہوتے اس دور کے بعد بھی اسی طبقہ کے ہاتھ میں ملک کی ادبی اور علمی قیادت رہی۔ مولوی محمد حسین آزاد، خواجہ الطاف حسین حالی، ڈپٹی نذیر احمد دہلوی اور علامہ شبلی نعمانی جو زبان و ادب کے چار ستون تھے اسی طبقہ سے تعلق رکھتے تھے،

شعرائے اردو کے تذکرے فارسی میں تھے اور مولوی محمد حسین آزاد کی آب حیات وہ کتاب ہے جس نے پہلی مرتبہ اردو والوں کو اردو شاعری کی کہانی اردو میں سنائی ان کو خراج عقیدت ان کے سب سے بڑے ناقد مولانا حکیم عبدالحیؒ نے گلِ رعنا میں اور ان کے اس یگانہ کمالی کا جس طرح اعتراف کیا ہے اس پر اضافہ مشکل ہے۔

" سب سے بہتر اور عمدہ تصنیف اُن کی آب حیات ہے جو اردو زبان اور ریختہ شعر کی تاریخ میں پہلی کتاب اور اُردو انشا پردازی کا بہترین کارنامہ ہے۔ عبارت کی بے ساختگی اور برجستگی اس میں شاعرانہ تخیل استعاروں کی دلفریبی کے ساتھ ایسی چیز ہے جس پر غزلوں کے سیکڑوں دیوان قربان کر دینے کے قابل ہیں۔

حضرت مولانا نے گلِ رعنا لکھنے کی ضرورت یہ لکھی ہے کہ کوئی کتاب اپنے فن اور موضوع کی آخری کتاب نہیں قرار دی جا سکتی۔ کسی کے نقش کو نقشِ دوام اور تحقیق کو حرف آخر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ آب حیات اس سے مستثنا نہیں ہے۔ آزاد کا مزاج ایک ادیب کی طرح تخیل پسند تھا۔ ایک مؤرخ کی طرح حقیقت پسند نہیں، وہ کمیاں جو مولانا نے آب حیات میں گنائی ہیں ان میں پہلی یہ ہے کہ بہت سے قابل قدر شعراء کو انھوں نے اپنی کتاب میں جگہ نہیں دی اور بہت سے معمولی شعرا ان کی کتاب میں جگہ پائے ہوئے ہیں یہاں حضرت مولانا نے بہت سے نام گنائے ہیں جو اس کی مثالیں ہیں۔ اس کے علاوہ بڑے شعراء میں بھی یہ تفریق روا رکھی۔ مرثیہ گویانِ اردو کے کام کی دل کھول کر داد دی ہے۔ اور نعت گویوں جیسے محسن کاکوروی کو نظر انداز کیا ہے۔ اُن کے فیصلے داخلی (SUBJECTIVE) تھے دوسری بات یہ کہ آبِ حیات میں بے حد تاریخی غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ نکات الشعراء کے متعلق جو آزاد نے لکھا ہے اس میں کوئی بات صحیح نہ تھی۔ کئی مثالوں میں سب سے اہم یہ ہے آزاد نے لکھا ہے کہ میرؔ نے ولی دکنی کے متعلق لکھا ہے وے شاعریست از شیطان مشہور تر" واقعہ میں میرؔ نے لکھا ہے "از کمال شہرت احتیاج نہ دارد"۔ میرؔ کی بد دماغی کے متعلق جو کچھ لکھا۔ سید انشاء کے آخری زمانہ کا جو حال لکھا وہ سب اُن کے دماغ کی تخلیق تھی۔ واقعہ سے اُس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ تیسری بات یہ کہ ان کے مذہبی جذبات یا ذاتی تعلقات نے ان کے فیصلوں کے غیر جانبداری پر بہت اثر ڈالا ہے۔ حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ کے ساتھ جو بے انصافی انھوں نے کی۔ اور مومن کو انھوں نے جس طرح نظر انداز کیا وہ انتہائی محل نظر ہے۔ اسی طرح مصحفی اور انشاء کے تقابل میں بے حد بے انصافی کی۔ مصنف گلِ رعنا نے کیا بہترین بات لکھی ہے سید انشاء کی ہنگامہ خیزیاں بزم آرائیاں اور بذلہ سنجیاں ان کے ساتھ گئیں۔ اور ان کے کلام کا بیشتر حصہ بھی اپنے ساتھ لے گئیں مصحفی کا کلام باقی ہے اور اس کی آب و تاب بڑھتی جا رہی ہے۔

غالبؔ کے تذکرہ میں انھوں نے بے ضرورت ایسے لطیفے لکھے جن سے ان کے اثنا عشری رجحان اور صحابہ کرام پر طنز کا اظہار ہوتا ہے اس کے مقابلے میں استاد ذوق کا مذہب بیان کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لیا ہے۔

اسی طرح بہادر شاہ ظفر کے سارے دیوانوں کو استاد ذوقؔ کی جھولی میں ڈال دیا ہے۔ اسی طرح نواب الٰہی بخش معروف کا کلام بھی استاد ذوقؔ کا کارنامہ بتایا ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب نے مصنف گلِ رعنا کے متعلق یہ صحیح لکھا ہے۔

جو لوگ مولانا مرحوم سے ذاتی واقفیت رکھتے تھے انھیں ممکن ہے اس کا علم ہو۔ ورنہ عام طور پر لوگ اس سے لاعلم تھے کہ مولانا مرحوم اردو زبان و ادب کا ایسا اچھا ذوق رکھتے تھے ایسا خیال کچھ بے جا بھی نہ تھا، کیوں کہ مولوی صاحبان نے عام طور پر اردو زبان کی طرف سے غفلت برتی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ ادبی ذوق مولانا کو اپنے والد ماجد سے "ورثت" میں ملا ہے جو اردو اور فارسی کے اچھے شاعر تھے اور جن کا حال اور کمال کا نمونہ انھوں نے کتاب کے آخر میں دیا ہے۔

یہ حقیر مضمون نگار اس بات کی تائید کرتا ہے۔ اور لکھتا ہے کہ ہمارے حضرت مولاناؒ کو یہ ادبی ذوق اپنے والد سے ملا ہے تحقیق اور ریسرچ کا علمِ پدر تو انھیں اُن کی وراثت کا جائز حقدار بناتی ہے۔

اب اس شعر پر اپنے مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسن تو بسیار
گلچیں بہارِ تو ز داماں گلہ دارد

لَہوَالحَدِیث

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے "وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِىْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ" ایسا معلوم ہوتا ہے صرف نام لینا رہ گیا۔ وی۔ ڈی او، اور ٹی۔ وی کا، قرآن کیونکہ عربی میں اترا ہے۔ اس میں انگریزی کا لفظ کیسے آتا، یہ بات عقل کے خلاف ہوئی لیکن صاف قرآن کا اعجاز معلوم ہوتا ہے کہ آج سے چودہ سو سال پہلے جو کتاب اتری اس میں ٹی وی اور وی ڈی او کا ذکر ہے۔ اس لئے فرمایا گیا ہے "مَنْ يَّشْتَرِىْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ" لہو الحدیث کے معنیٰ ہیں باتوں کا کھیل۔

یہ وی ڈی او۔ یہ ریکارڈ، سب لہو الحدیث ہے، آج سے چودہ سو برس پہلے اس وقت اللہ کی کتاب نے کہدیا، جب یہ سب چیزیں ایجاد کیا ہوتیں، کسی نے خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا، اور کسی کے تصور میں بھی نہیں آتا تھا۔ اس وقت کہدیا کہ بہت سے لوگ ہیں کہ لہو الحدیث خریدتے ہیں۔

(حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ)

نذرانۂ عقیدت

● ڈاکٹر کیف رضوی

کانپ جاتا ہے قلم روتی ہے میری تحریر — بوالحسن عالی نسب شارح علم التفسیر
جامعہ ندوہ کے ریکٹر تھے بہ حسن تقدیر — عازم خلد بریں ہوگئے باصد توقیر
سارے عالم میں تھے مشہور مفکر بن کر — نظر افروز جو صورت تھی دل آرا تصویر
موجزن ان کے خیالات میں طوفان ادب — حامل نقد نظر ان کے نقوش تحریر
عرش پیما تھی تخیل کی چمن آرائی — کیوں مہ و مہر نہ ہوں فکر کی موجوں میں اسیر
عالم دین تھے معروف، تو بے مثل ادیب — ان کی تحریر حقائق کی مرصّع تفسیر
خوگر علم و عمل پیکر تسلیم و رضا — ہوگئی وسعتِ کونین بھی ان کی جاگیر
طرز تحریر میں اک شان دل آویزی تھی — حسن تاثیر سے کرتے تھے دل کو تسخیر
ان کے لمعات سے آئینہ گیتی پُرنور — ان کے اوصاف سے مسحور صغیر اور کبیر
ناز کرتے ہیں اسی ذات پہ اب علم و ادب — ایک تریاق تھا ان میں سے تو اک تھا اکسیر
ان کے چہرے سے صفات ملکوتی ظاہر — ان کے جلوؤں میں جمال احدی کی تنویر
ہر قدم منزل وحدت کی حدوں تک محدود — ہر نظر زلف شریعت کے کرشموں میں اسیر
عبد و معبود کے رشتے سے بخوبی واقف — نہ فرائض نہ عبادات خدا میں تاخیر

ان کی فرقت کا تصور بھی گراں تھا اے کیفؔ
کیوں نہ ہو ان کی جدائی سے زمانہ دل گیر

لوحِ انور تاریخ وفات

● مولانا محمد عثمان معروفی

۱۹۹۹ء
نحمد الولی الماجد العظیم ونصلی علی النبی الکریم

۱۹۹۹ء
جبیب جہاں ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ ★ بحر مودت ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ
۱۹۹۹ء — ۱۹۹۹ء

پشت پناہ اہل غرباء ● دلدار نیک ذات ● منزل شناس صاحب تصانیف کثیرہ
۱۹۹۹ء — ۱۴۲۰ھ — ۱۹۹۹ء

رحمہ اللہ الواحد العظیم ● برد مضجعہ العلی المعید ● نور مرقدہ الرقیب العظیم
۱۴۲۰ھ — ۱۴۲۰ھ — ۱۹۹۹ء

اعوذ باللہ الہادی الرحمٰن من الشیطٰن الرجیم ● بسم اللہ الباسط المتین الرحمٰن الرحیم
۱۹۹۹ء — ۱۴۲۰ھ

قال الحسیب سقاھم ربھم شرابًا طھورا ● قال العلی الجامع، فی عیشۃ الراضیۃ
۱۴۲۰ھ — ۱۴۲۰ھ

قال المعز الحلیم سلام علیکم ادخلوا الجنۃ ● واللہ الحسیب، مَوْتُ الْعَالِمِ مَوْتُ الْعَالَمِ
۱۴۲۰ھ — ۱۴۲۰ھ

ان اللہ الحق الحکیم یرفع العلم برفع العلماء
۱۴۲۰ھ

قہر خدا دوست ہادی پاک ● بر خاک پاک او عزیزا بر سلامتی بشو
۱۴۲۰ھ — ۱۹۹۹ء

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

بحیثیت ادیب اور ناقد

سلمان علی خاں لکھنوی سابق انفارمیشن آفیسر گورنر اتر پردیش

تاریخ شاہد ہے کہ سرزمین ہند جب اسلام کی نعمت عظمیٰ سے بہرہ مند ہوئی تو لاتعداد علماء و فضلاء اور صوفیاء نے اپنی خداداد صلاحیت اور جولانیٔ طبع سے بندگانِ خدا کو وقتاً فوقتاً قرآن و حدیث، زہد و تقویٰ، خیر و شر اور علم و عمل کے رموز و نکات اور فضائل و برکات سے روشناس کیا اور اس کے ساتھ ہی اپنے ذوق طبع سے شعر و ادب کی دشوار گذار اور سنگلاخ وادی میں بھی قدم رکھا، اور اپنی غیر معمولی شعری و ادبی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر اس کی ایسی آبیاری کی کہ وہ گلزار بن گئی۔ تاریخ ادب اردو کا اگر بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو اس وادیٔ ادب میں علماء کی کیا کیا صورتیں پنہاں نظر آئیں گی کہ اس پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔ دراصل شاہ میران جی، ان کے فرزند شاہ برہان الدین اور ان کے پوتے شاہ امین الدین اعلیٰ سے لے کر مرزا مظہر جانِ جاناں، خواجہ میر دردؔ، امیر احمد امیرؔ، مولانا الطاف حسین حالیؔ، مولوی اسمٰعیل میرٹھی، مولانا شبلی نعمانی، مولانا ظفر علی خاں، مولانا محمد علی جوہرؔ، مولانا ابوالکلام آزادؔ، خواجہ حسن نظامی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا غلام رسول مہرؔ، مولانا امتیاز علی عرشی، مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی جیسے بے شمار اکابرین نے اپنی گراں مایہ ادبی و شعری تخلیقات سے شعر و ادب کے خزینہ میں ایسا بیش بہا اضافہ کیا جس سے نووارد انِ ادب ہمیشہ تحریک حاصل کرتے رہیں گے۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی متنوع اور گوناگوں شخصیت ایک انجمن کا مرتبہ رکھتی ہے۔ جنہوں نے بیک وقت شہرۂ آفاق عالم دین، مایہ ناز مفکر و مبلغ، ممتاز مفسر و محدث، معروف مؤرخ و محقق، مشہور سیرت نگار و سوانح نویس، وسیع القلب درویش و مصلح قوم، مقبول پاسبان ملت و میر کارواں، بلند پایہ مبصر و ناقد اور صاحب طرز انشاء پرداز ادیب کی حیثیت سے جو شہرت و نیک نامی اور سربلندی حاصل کی وہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوئی۔

حضرت مولانا علی میاںؒ کو اردو اور عربی زبان و ادب پر یکساں عبور حاصل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی تحریر و تقریر میں علمیت اور ادبیت کے ساتھ ہی صداقت و طہارت، فضیلت و حکمت، رفعت و وسعت، فصاحت و بلاغت، اور دعوت و عزیمت بدرجہ اتم کارفرما نظر آتی ہے۔ حضرت مولانا نے اپنے علمی، ادبی، تاریخی اور تحقیقی کارناموں سے صرف برصغیر ہند و پاک ہی نہیں بلکہ تمام دنیائے علم و ادب کے اہل ذوق کو اپنی طرف متوجہ کیا اور لوہا منوایا۔ اس کا صرف ایک ہی سبب تھا کہ حضرت مولاناؒ نے خود کو ایک خانہ تک محدود نہیں رکھا بلکہ اپنی وسعت نظری، فکر انگیزی، فراخدلی، انسان دوستی، بلند طبعی اور عالی حوصلگی سے علم و ادب کی تمام تحریکات سے استفادہ کیا اور اپنا ایک الگ، منفرد اور مخصوص نقطۂ نظر پیش کیا جو تمام تر احیائے اسلام اور ملک و ملت کی اصلاح اور فلاح سے عبارت تھا۔ حضرت مولانا کو اردو کے ساتھ ہی عربی ادب پر بھی زبردست ملکہ حاصل تھا۔

حضرت مولانا علی میاںؒ نے زمانہ طالبعلمی میں ہی لکھنا شروع کر دیا تھا۔ یہ ۳۱-۱۹۳۰ء کی بات ہے کہ حضرت مولانا نے اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر عبدالعلیؒ کی ہدایت پر ۱۶ سال کی عمر میں ماہنامہ "توحید" امرتسر میں شائع شدہ مولوی محی الدین منصوری کے مضمون "ہندوستان کا مجاہد اعظم یا مجدد اعظم" کا عربی میں ترجمہ کیا جو نہ صرف مصر کے علامہ سید رشید رضا نے اپنے رسالہ "المنار" میں شائع کیا بلکہ انھوں نے حضرت مولانا کو لکھا کہ "اگر صاحب مقالہ چاہیں تو میں اس کو الگ رسالہ کی شکل میں طبع کرا سکتا ہوں"۔ چنانچہ یہ مضمون بعد میں رسالہ کی شکل میں شائع ہوا۔ حضرت مولانا اپنی اس پہلی تخلیق کے بارے میں خود رقمطراز ہیں:-

> "اس سے بڑھ کر ایک ہندی نو عمر طالب علم کا کیا اعزاز ہو سکتا تھا کہ اس کا رسالہ علامہ سید رشید رضا مصر سے شائع کریں۔ تھوڑے عرصہ میں" ترجمۃ الامام السید احمد بن عرفان الشہید" کے عنوان سے وہ رسالہ چھپ کر آگیا اور میری خوشی کی کوئی حد نہ رہی۔ میری عمر اس وقت سولہ سال کی رہی ہوگی۔ یہ میری پہلی تصنیف ہے جو نہ صرف ہندوستان بلکہ مصر سے شائع ہوئی"۔
>
> (کاروان زندگی اول ص ۱۱۸)

اس طرح حضرت مولاناؒ نے علم و ادب کی دنیا میں جب قدم رکھا تو اپنے غیر معمولی تبحر علمی،

فکر انگیزی، اولوالعزمی اور شرافت نفسی سے مسلسل آگے ہی بڑھتے رہے۔ اور کبھی مڑکر پیچھے نہیں دیکھا اور آپ کا دائرۂ اثر وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ حضرت مولانا کی نثر پختہ اور پراثر ہے۔ جسے پڑھ کر دل میں نغمگی اور شیرینی کا احساس ہوتا ہے اور نثر میں شاعری کا گمان ہوتا ہے چھوٹے چھوٹے یکساں جملوں سے حسنِ بیان میں زبردست رعنائی اور دلکشی پیدا ہو گئی۔ نثر میں شعری حسن کا جہاں تک تعلق ہے، عربی زبان وادب کے مشہور ومعروف مفکر شیخ علی طنطاوی نے حضرت مولانا کی تصنیف "الطریق الی المدینۃ" کے مقدمہ میں جس کا اردو ترجمہ "کاروان مدینہ" کے نام سے شائع ہو چکا ہے، واضح الفاظ میں اعتراف کیا ہے :-

"ادب کی طرف سے میرا اعتماد اٹھنے لگا تھا۔ چونکہ ادیبوں میں وہ آسمانی نغمہ عرصہ سے نظر نہیں آتا جس کی لَے میں شریف رضی (عہد عباسی کا نامور ہاشمی شاعر) کے وقت سے لے کر عبدالرحیم برعی تک شعراء گاتے رہے۔ جب میں نے آپ کی کتاب پڑھی تو یہ کھویا ہوا نغمہ پھر مجھے مل گیا۔ یہ نغمہ مجھے آپ کی اس نثر میں ملا جو حقیقتاً شاعری ہے لیکن بے ردیف اور قافیہ کی شاعری' برادرم ابوالحسن! آپ کا صد ہزار شکریہ کہ آپ نے دوبارہ میرے اندر اپنی ذات اور اپنے ادب پر اعتماد بحال کر دیا۔"

(کاروانِ مدینہ ص۱۱)

حضرت مولانا علی میاںؒ کی اسی تصنیف "کاروان مدینہ" سے ان کی دیدہ زیب اور دلکش نثر کا ایک نمونہ پیش کیا جاتا ہے جس سے ان کی نثر نگاری کی رعنائیت اور نغمیت کا پتہ چلتا ہے۔

"انسانیت کا جسم تر و تازہ تھا مگر دل نڈھال دماغ تھکا ہوا۔ ضمیر بے حس و مردہ، نبض ڈوب رہی تھی، اور آنکھیں پتھرانے والی تھیں۔ ایمان و یقین کی دولت سے عرصہ ہوا انسانیت محروم ہو چکی تھی .... بادشاہ دوسروں کے خون پر پلتے تھے اور بستیاں اجاڑ کر بستے تھے۔ ان کے کتے موج کرتے تھے اور انسان دانہ دانہ کو ترستے۔ زندگی کا معیار اتنا بلند ہو گیا تھا کہ جینا دوبھر تھا۔ جو اس معیار پر پورا نہ اترے وہ جانور سمجھا جاتا تھا۔ دنیا کی اصلاح انسانوں کے بس سے باہر تھی۔ پانی سر سے اونچا ہو گیا تھا۔ معاملہ ایک ملک کی آزادی اور ایک قوم کی ترقی کا نہ تھا۔ معاملہ پوری انسانیت کی موت و زندگی کا تھا۔ سوال کسی ایک خرابی کا نہ تھا۔ انسانیت کا بدن داغ داغ تھا۔ دامن تار تار اصلاح کے لئے جو لوگ آگے بڑھے وہ یہ کہہ کر پیچھے ہٹ گئے۔ ع

تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

فلسفی اور حکیم، شاعر اور ادیب کوئی اس میدان کا مرد نہ نکلا۔ سب اس وبا کے شکار تھے۔ مریض مریض کا علاج کس طرح کرے؟ اس دنیا کے مالک کو اپنے گھر کا یہ نقشہ پسند نہ تھا۔ آخر کار اس نے عرب کی آزاد اور سادہ قوم میں جو فطرت سے قریب تھی۔ ایک پیغمبر بھیجا کہ پیغمبر کے سوا اب اس بگڑی دنیا کو کوئی بنا نہیں سکتا تھا۔ اس پیغمبر کا نام نامی محمد بن عبداللہ ہے"۔

مولانا نے بعثت محمدیؐ سے قبل عرب میں جہل و ظلم کے سبب معاشرت کی جو ابتر اور دگرگوں حالت تھی اس کی جس انداز میں منظر کشی کی ہے، وہ اپنے آپ میں ایک مثال ہے، حضرت مولانا نے اپنی بیدار مغزی اور اعلیٰ بصیرت سے عربی اور اردو ادب میں جہاں ایک طرف انسانی زندگی سے متعلق اہم موضوعات پر اظہار خیال کیا تو دوسری طرف اپنی سحر بیانی سے نثر میں ایک نیا آہنگ، نیا بانکپن اور نکھار پیدا کیا۔ حضرت مولانا کی نثر کی یہی وہ خوبی ہے جس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مشہور و مقبول شامی نژاد عالم دین شیخ محمد المجذوب نے اپنی تصنیف "علماء مفکرون عرفتہم" میں لکھا ہے :-

"شیخ ندوی کی تحریروں کو پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی ادبی تحریر میں ایک سحر ہے، ایک ایسا جادو ہے جو عموماً دوسرے مصنفین کی تحریروں میں نہیں ملتا۔"

حضرت مولانا علی میاںؒ نے زبان وادب کی ترویج و ترقی کے لئے جب جنوری ۱۹۸۵ء میں "رابطہ ادب اسلامی" کے قیام کا اعلان کیا۔ اور اس کے ایک سال بعد جنوری ۱۹۸۶ء میں رابطہ کی پہلی کانفرنس لکھنؤ میں منعقد ہوئی تو اس میں ادب اسلامی کی بنیادیں مضبوط کرنے، ادب اسلامی کے فن تنقید کے ضوابط مرتب کرنے، جدید ادبی فنون یعنی حکایتی اقسام ادب اور ادبی سوانح عمریوں کے بارے میں اسلامی اصول طے کرنے، ادب اسلامی کی تاریخ از سر نو مرتب کرنے اسلامی ادبا کے مثالی نمونے جمع کرنے، ادب اطفال کی تیاری پر توجہ دینے، ادب اسلامی کی حیثیت کو تسلیم کرانے اور دنیا کے اسلامی ادیبوں کے درمیان خوشگوار رابطہ قائم کرنے، بامقصد ادب کی تخلیق کی راہ ہموار کرنے اور اسلامی ادباء کے مادی و معنوی حقوق کا تحفظ اور دفاع کرنے نیز ان کے تخلیقی ادب کی اشاعت کا بندوبست کرنے کے ساتھ ہی رابطہ کا یہ اعلیٰ نصب العین

بھی طے کر دیا کہ رابطہ کی یہ کوشش ہوگی کہ ادب خیر کا ذریعہ اور تعمیر کا وسیلہ بنے اور شر کا ذریعہ اور تخریب کا وسیلہ نہ بنے۔ اسلامی شعر و ادب کے فروغ کے لئے حضرت مولانا نے نہ صرف تمام ادبی تحریکوں کا غائر مطالعہ کیا بلکہ ان کی خامیوں اور کمیوں کی نشاندہی بھی کی۔ کلاسیکی، رومانی، مارکسی، ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت تمام تحریکوں کا مطالعہ کرنے کے بعد حضرت مولانا نے ادب کے بارے میں اپنا حتمی نقطۂ نگاہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

"ادب، ادب ہے خواہ وہ کسی بھی مذہبی انسان کی زبان سے نکلے، کسی پیغمبر کی زبان سے ادا ہو۔ کسی آسمانی صحیفہ میں ہو، اس کی شرط یہ ہے کہ بات اس انداز سے کہی جائے کہ دل پر اثر ہو۔ سمجھنے والا مطمئن ہو کر میں نے بات اچھی طرح کہہ دی، سننے والا اس سے لطف اٹھائے اور اسے قبول کرے۔"

اور یہ تبھی ممکن ہوگا جب زبان میں کشش ہو۔ جاذبیت ہو اور وسعت ہو۔ اس کے ساتھ ہی زبان اتنی آسان، عام فہم اور سلیس ہو کہ قاری آسانی سے سمجھ بھی سکے۔ اور دل کی بات دل میں بیٹھ سکے۔ حضرت مولانا علی میاں نے لندن کے شہر لیڈس میں واقع لیڈس یونیورسٹی میں ۲۶ رجون ۱۹۶۹ء کو منعقدہ طلباء کے ایک جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے مسلم قائدین میں گرمیٔ گفتار اور ایمانی قوت کی کمی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا:۔

"دل کی زبان سے وہ بالکل نا آشنا ہیں، وہ ان (عوام) سے اس زبان میں بات نہیں کر سکے جو سیدھی ان کے دل کی گہرائیوں میں اتر جائے، جوان کے دل کے ساز کو چھیڑ دے۔ جوان کو دیوانہ اور مجنوں بنا دے۔ جوان کو ہتھیلی پر سر رکھ کر میدان میں لے آئے۔ ایمان کی زبان، قرآن کی زبان، صحابہ کی زبان۔ جب تک کوئی شخص کسی کی زبان نہ جانے وہ اس سے کیسے بات کر سکتا ہے، میں اگر یہاں کے انگریزی فضلاء سے بات کرنا چاہوں اور مجھے انگریزی پر قدرت نہ ہو اور وہ میری زبان نہ سمجھتے ہوں تو "زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم" کا منظر ہوگا۔"

(مغرب سے کچھ صاف صاف باتیں ص ۱۴۸)

حضرت مولانا علی میاںؒ صرف تحریر کے ہی نہیں تقریر کے بھی غازی تھے۔ جب وہ تقریر کرتے تھے تو لگتا تھا کہ جیسے الفاظ کا ایک بحر بیکراں دماغ سے نکل کر زبان پر آنے کے لئے بے قرار و بے تاب ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں اپنی بات ایسے پر اثر انداز میں کہہ دیتے تھے کہ وہ لوگوں کو بھلی لگتی تھی۔ اور دلوں میں بیٹھ جاتی تھی۔ حضرت مولانا نے لکھنؤ میں ۲۱ دسمبر ۱۹۶۹ء کو منعقدہ ایک تبلیغی اجتماع میں جو تقریر کی تھی اس کے درج ذیل اقتباس میں سلاست وروانی اور ادبیت کار فرما نظر آتی ہے:۔

"آج غیر مذہبی انسان، غیر مذہبی انسان سے لڑ رہا ہے، آج غرض سے غرض لڑ رہی ہے۔ آج ہوس ہوس سے ٹکرا رہی ہے، آج شیطان سے شیطان ٹکرا رہا ہے، آج مال سے مال ٹکرا رہا ہے، آج اقتدار سے اقتدار لڑ رہا ہے، آج حکومت سے حکومت لڑ رہی ہے، آج پارٹی سے پارٹی لڑ رہی ہے، ہماری لڑائی اغراض کی ہے.... کبھی مخلص مخلص سے نہیں لڑ سکتا، کبھی روحانیت روحانیت سے نہیں لڑ سکتی۔ ہمیشہ جھوٹ جھوٹ سے لڑتا ہے۔ ہمیشہ نفاق نفاق سے لڑتا ہے۔ ہمیشہ باطل باطل سے لڑتا ہے۔ ہمیشہ اغراض اغراض سے لڑتے ہیں۔ سارا فساد دنیا میں اغراض کا ہے...... مذہب کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔"

(مغرب سے صاف صاف باتیں ص ۸۲-۱۸۱)

اور پھر جب کبھی تقریر میں اصلاحی پہلو غالب آجاتا تھا تو حضرت مولانا علی میاں کا لہجہ قدرے درشت ہو جاتا۔ اور خطاب ناصحانہ شکل اختیار کر لیتا تھا۔ مثال کے طور پر ملت کی بے راہ روی اور شریعت سے سرد مہری جب ان سے برداشت نہیں ہوتی تو وہ برجستہ کہہ اٹھتے ہیں:۔

"ارے صاحب! یہ امت مرحومہ، یہ اشرف الامم کس طرح ذلیل اور کیسی خوار ہے۔ ہر جگہ پٹ رہی ہے، اور یہ نہیں دیکھتے کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ آپ اپنی زندگی میں کون سی تبدیلی لائے۔ اتنے دنوں سے وعظ ہو رہے ہیں، تبلیغی جماعت کام کر رہی ہے، ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ نہ شادی بیاہ کے رسم و رواج میں کوئی فرق ہے، بیس برس پہلے اور دس برس پہلے جو طرز زندگی تھا وہی آج بھی ہے، جو نماز کے پابند نہیں وہ نماز کے پابند نہیں، جو پینے پلانے کا عادی تھا وہ پینے پلانے کا عادی ہے، جو مال میں، حقوق العباد میں، معاملات میں دیانتداری کو ضروری نہیں سمجھتا وہ اب بھی ضروری نہیں سمجھتا، جو ہاتھ لگ جائے وہ اپنا مال۔"

(پندرہ روزہ تعمیر حیات ۱۰ راگست ۱۹۹۲ء ص ۱)

ان اقتباسات کا ادبی اور فنی نقطۂ نگاہ سے مطالعہ کیا جائے تو ان میں ادبیت کے ساتھ ساتھ نظم کا رنگ و آہنگ صاف نظر آئے گا۔

"ادب دراصل انسانی زندگی اور تہذیب کا آئینہ دار، ترجمان اور نقاد ہوتا ہے جو انسان میں سماجی اور اخلاقی قدروں کو سمجھنے اور برتنے کا شعور پیدا کرتا ہے، یہ ایک حقیقت ہے کہ زمانہ کے تغیر کے ساتھ ہی ادبی رجحانات اور میلانات میں بھی تبدل رونما ہوتا رہا ہے۔

ایک زمانہ تھا جب ادب برائے ادب یا فن برائے فن کا دور دورہ تھا لیکن رومانی اور جمالیاتی تحریک جب ادباء اور شعراء کو فرسودہ نظر آئی تو ترقی پسند تحریک نے عروج پایا اور اشتراکیت کو اس درجہ تقدم حاصل ہوا کہ مذہبیت کو رجعت پرستی قرار دے کر اسے یکسر مسترد کردینے کی تحریک چل پڑی، اور پھر اس تحریک نے بھی جس کا آغاز ۱۹۳۶ء میں ہوا تھا ۱۹۴۷ء تک پہونچتے پہونچتے دم توڑ دیا۔ حالانکہ ترقی پسند ادیبوں نے رجعت پرستی پر اور ترقی پسندی کے تفاوت کی وضاحت کرتے ہوئے اپنے اعلان نامہ میں یہ دعویٰ کیا تھا کہ "وہ ادب جو ہم کو سست اور بے کار بناتا ہے، رجعت پسند ہے اور وہ ادب، جو تنقید کی قوت پیدا کرتا ہے، جو عقل کی روشنی میں ہمارے رسم ورواج کو جانچتا ہے جو تنظیم اور عمل میں ہماری مدد کرتا ہے، ترقی پسند ہے۔"

(اردو ادب کے رجحانات پر ایک نظر۔ ڈاکٹر عبد العلیم ص۱۹)

یہ وہ تحریک تھی جس کی ہم عصر ادیبوں اور تنقید نگاروں نے کھل کر مخالفت بھی کی تھی۔ حضرت مولانا علی میاں ندویؒ نے بھی اس تحریک کو مسترد کرتے ہوئے اپنے تاثرات کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا:۔

"اس دور میں یہ شرط لگادی گئی کہ جب تک آدمی ترقی پسندی کی بات نہ کرتا ہو، جب تک قدیم چیز کا مزاق نہ اڑاتا ہو، جب تک مذہبی صحیفوں پر کبھی کوئی چھینٹ نہ ڈال دیتا ہو، اس وقت تک وہ ادب نہیں...... میں صاف کہتا ہوں اور دبستانِ ادب کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ ادب کی سب سے پہلی زیارت جو نصیب ہوئی وہ آسمانی صحیفوں میں نصیب ہوئی، ادب تھا کہاں؟ لیکن خدا نے انسانوں کو سمجھانے کے لئے اپنے پیغمبروں کو بھیجا اور ان کو زبان دی اور ان پر معانی کے ساتھ الفاظ وارد کئے تو معلوم ہوا کہ ادب اسے کہتے ہیں۔ پھر قرآن مجید نے آکر تو اس پر ہمیشہ کے لئے مہر لگادی۔"

دراصل قرآن مجید کے علوم ومعارف، رموز ونکات، افہام وتفہیم اور تشریح وتفسیر کوئی آسان کام نہیں ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو جس زبان میں اتارا اسے "عَرَبِیٌّ مُّبِیْنٌ" سے موسوم کیا یعنی "بِلِسَانٍ عَرَبِیٍّ مُّبِیْنٍ" بتایا۔ اس میں اللہ تعالیٰ کا خود ارشاد ہے:

"وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ۔"

(سورہ ابراہیم۔۴)

اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اسی کی قوم کی زبان میں، تاکہ وہ انھیں سمجھا سکے۔

حضرت مولانا علی میاںؒ نے اس آیت کی تشریح وتوضیح کرتے ہوئے فرمایا کہ:۔

"اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ نے صرف قابلِ فہم زبان دے کر انھیں بھیجا بلکہ یہ ہے کہ انھیں فصاحت وبلاغت کے ساتھ بھیجا۔ قرآن میں "لسان" کا مفہوم یہی ہے کہ وہ زبان جس میں بچہ بولتا ہے، غیر قادر الکلام آدمی بھی بات کرلیتا ہے وہ مراد نہیں۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

أنا أعربكم، أنا قريشي واسترضعت في بني سعد بن بكر۔

(سیرت ابن ہشام جلد ۱ ص۱۶۷ بروایت ابن اسحاق)

میں تم میں سب سے زیادہ فصیح ہوں، میں قریشی ہوں اور میں نے بنی سعد بن بکر میں پرورش پائی ہے۔"

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ادب کی قدر وقیمت واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"ان من البيان لسحرًا وان من الشعر لحكمة۔"

(ترمذی وابوداؤد عن ابن عباسؓ)

بعض کلام سحر اور بعض اشعار حکمت ہوتے ہیں۔

اسی طرح حضرت مولاناؒ نے فاسد وسقیم عامیانہ اور تخریبی ادب کے بارے میں قرآن کی روشنی میں یہ حتمی فیصلہ بھی گوش گذار کردیا۔

"قرآن نے اپنے معجزانہ انداز میں فاسد وسقیم اور تخریبی ادب کو "زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا" (ملمع کاری اور فریب) کے بلیغ اور معنیٰ خیز الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ ہم سطحیت کے عہد میں جی رہے ہیں، ہمارا سابقہ زیادہ تر سطحی ادب سے ہے۔ مگر

ہماری اور عصر حاضر کی اور خاص طور سے عالم عربی کی بڑی ضرورت صالح، اور مقصدی ادب ہے، جو قوت و زندگی سے بھرپور ہو، اور جو بلند و آسمانی ہو، اور عالمگیر اسلامی و انسانی پیغام کا حامل و علمبردار ہو۔" (نقوش اقبال ص۳۳۱-۳۳۴)

مقصدی ادب کا جہاں تک تعلق ہے اس کے لئے بلند فکر، ادبی ذوق، حکمت و معنویت، جذبۂ صادق، زود طبع اور عالی حوصلگی کی ضرورت پڑتی ہے اس کے ساتھ ہی تخلیق ادب میں یقین و محبت اور حب صادق بھی لازمی ہے کیونکہ بقول مولانا علی میاںؒ "زندگی اگر محبت و یقین کے جذبہ سے خالی ہے تو پھر وہ زندگی زندگی نہیں بلکہ موت ہے، اور پھر ایسی زندگی کیا؟ جس میں طبیعتیں مردہ و افسردہ ہوں، نظم و نثر کے سرچشمے خشک ہوں اور زندگی کے شعلے بجھ چکے ہوں، ایسی حالت میں یقین کامل اور حب صادق ہی حیات انسانی میں جلا پیدا کرتا ہے اور انسانی زندگی رنگ و نور سے معمور ہو جاتی ہے۔ پھر شستہ، پُرسوز و پُردرد، روح نواز اور جلا بخش کلام سننے میں آتے ہیں۔ خارق عادت شجاعت و قوت دیکھنے میں آتی ہے اور علم و ادب کے نقوش بھی زندۂ جاوید بن جاتے ہیں، یہاں تک کہ یہی محبت اگر پانی، مٹی اور اینٹ، پتھر میں داخل ہو جائے تو اس کو بھی زندہ جاوید بنا دیتی ہے۔ ہمارے سامنے اس کی روشن مثال مسجد قرطبہ، قصر زہرا اور تاج محل ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ محبت و یقین کے بغیر ادب و فن مردہ و افسردہ و ناتمام ہے؟

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

(نقوش اقبال ص۵۹)

یہ ایک حقیقت ہے کہ جو بات صداقت اور حقائق پر مبنی ہوتی ہے اس میں جذب و ایجاب کی تاثیر بھی بدرجۂ اتم موجود ہوتی ہے۔ خواہ وہ کسی ناصح کی نصیحت ہو یا کسی مقرر کی تقریر، کسی مدبر کی تحریر ہو یا کسی داعی کی دعوت، اگر اس میں صداقت اور حقیقت کا عنصر کارفرما رہتا ہے تو وہ ایسا اثر کرتا ہے کہ لوگوں کے دلوں کو موہ کر ان کی دنیا ہی بدل دیتا ہے اور سوء تخریب سے اپنا دامن بچا کر تعمیر کو ہی اپنی زندگی کا مقصد بنا لیتے ہیں۔ اس سلسلہ میں حضرت مولانا علی میاں ندوی نے ادب کے بارے میں اپنا یہ مطمح نظر پیش کیا:۔

"حقیقی اور فطری ادب بن ہی نہیں سکتا جب تک کہ اس کے اندر مذہبی حقائق پر کچھ ایمان نہ ہو، اور دل کے اندر کچھ درد نہ ہو۔ ادب کی بڑی خاصیت اور قوت یہ ہے کہ وہ رجحانات و میلانات اور عمل، طرز فکر، اخلاق اور انقلاب کے محرکات پیدا کرتا ہے، اس لئے وہ بہت مفید بھی ہو سکتا ہے۔ اور بہت مضر بھی، وہ بڑی تعمیری طاقت بھی ہے اور تخریبی قوت بھی، اسی لئے اس کو کسی حال میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس کو تعمیر کے لئے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے، اور تخریب کے لئے بھی، اور دونوں کے مظاہر ہر دور میں دیکھنے میں آ سکتے ہیں۔ وہ معاشرہ کی تخلیق بھی کر سکتا ہے اور حکومتوں کی تعمیر اور تاسیس بھی۔ اس لئے اس کی سخت ضرورت ہے کہ اس کو (کتابۃً اور خطابۃً شعراً و نثراً) صحیح رخ پر لگایا جائے اور اس کے تخریب، انتشارِ خیال اور لذت اندوزی اور نفس پروری کا ذریعہ بننے کے بجائے اسی کو خیر پسندی، اصلاح و تقویٰ، ضبط نفس اور صحیح رہنمائی کا آلہ اور ہتھیار بنایا جائے۔"

حضرت مولانا علی میاں نے ایک بلند پایہ ادیب، ایک ممتاز نقاد، محقق اور مبصر کی حیثیت سے بھی دنیائے ادب میں اپنی ایک مخصوص پہچان بنائی تھی۔ حضرت مولانا نے اپنے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی صاحبؒ کی تصنیف "گل رعنا" کے چھٹے ایڈیشن میں بے حد اہم پیش لفظ لکھ کر جو ادبی کارنامہ انجام دیا ہے وہ قابلِ صد ستائش ہے، یہ پیش لفظ در اصل حضرت مولانا کا تحریر کردہ وہ مضمون ہے جو پہلے شائع ہو چکا تھا۔ اور اس میں مولانا محمد حسین آزاد کی تصنیف "آب حیات" کی ان کوتاہیوں اور اس کے متعدد بیانات، روایات اور حوالوں کی تاریخی و دستاویزی صحت و صداقت ثابت نہ ہونے سے متعلق ایسے تاریخی ثبوت پیش کئے گئے تھے کہ جن کا ریاضی کے نتائج کی طرح انکار ممکن نہیں۔

مولانا محمد حسین آزاد کی ادبی خصوصیات اور سخن شناسی اور لطافتِ ذوق کا اعتراف کرتے ہوئے حضرت مولانا علی میاں نے ان کی بعض کوتاہیوں کی نشاندہی اپنے مقالہ میں درج ذیل الفاظ میں کی ہے:۔

"آبِ حیات میں متعدد تاریخی فروگذاشتیں پائی جاتی ہیں اور بعض ایسے بیانات ہیں جن کی تصدیق ان کتابوں سے نہیں ہوتی جن کا حوالہ دیا گیا ہے اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ آزاد نے ان کے بارے میں سنی سنائی روایات پر یا اپنے حافظہ پر اعتماد کیا اور کتاب کی تصنیف کے وقت اصل مآخذ کی طرف رجوع کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی، یا ان کتابوں کے کسی شوشہ اور نقطہ کو اپنے گہربار قلم اور قوت متخیلہ سے بڑھا چڑھا کر کہیں سے

کہیں پہونچادیا۔ وہ زمانہ کتابوں کی کمیابی
کا تھا اس لئے کوئی حیرت واستعجاب کی
بات نہیں کہ اردو کے بعض بنیادی تذکرے
ان کی نظر سے نہ گذرے ہوں، مثلاً یہ بات
پایۂ ثبوت کو پہونچ گئی ہے کہ میر تقی میر کا
تذکرہ نکات الشعراء ان کی نظر سے نہیں
گذرا' اور اس کے لئے "آب حیات" میں
داخلی شہادتیں موجود ہیں۔ صرف نکات الشعراء
ہی نہیں، اندازہ ہوتا ہے کہ آزاد کی نظر
سے مصحفی کا تذکرہ بھی نہیں گذرا یا کم سے کم
"آب حیات" کی تصنیف کے وقت وہ
پیش نظر نہیں تھا۔

متعدد مقامات پر ان کے مذہبی
جذبات یا ذاتی تعلقات غیر جانبدارانہ
تاریخ نویسی کے تقاضوں پر غالب آگئے
ہیں۔ اس طرح "آب حیات" اپنے مصنف
کے دور تک بھی اردو شاعری کے تمام
عہدوں کے باکمال شعراء کے پورے
تذکروں پر حاوی نہ تھی اور بہت سے
ایسے شعراء واساتذہ نظر انداز ہو گئے جو
نظر انداز ہونے کے قابل نہ تھے۔"
(تفصیل کے لئے دیکھیں "گل رعنا" حکیم سید عبدالحی، چھٹا
ایڈیشن ص ۳ تا ۳۱)

یہ اقتباس اگرچہ قدرے طویل ہے
تاہم اس سے حضرت مولانا علی میاں کی تاریخی،
تحقیقی اور ادبی صلاحیت، اپنے تمام تر محاسن
کے ساتھ ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ حضرت مولانا
نے اپنے اسی مقالہ میں ادبی مزاج اور تاریخی مزاج
کے فرق کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا:۔

"ادبی مزاج اور تاریخی مزاج میں ایک
طرح کا بعد اور ادبی تقاضوں اور تاریخی
تقاضوں میں بعض اوقات تعارض پایا
جاتا ہے، ادب تخیل پسند ہوتا ہے اور
تاریخ حقیقت پسند، ادب اپنی پرواز
کے لئے آزاد اور بے قید فضا چاہتا ہے،
تاریخ اپنے سفر کے لئے ایک محدود اور
نپا تلا راستہ، ادب تشبیہ واستعارہ
اور تخیل سے آب ورنگ پیدا کرتا ہے،
اور تاریخ حوالوں، واقعات اور قدیم
تحریروں کی پابندی سے گراں بار ہوتی
ہے۔" (گل رعنا ص۱)

حضرت مولانا علی میاںؒ کا سب سے
بڑا کارنامہ اقبالیات پر ان کی گراں مایہ عربی تصنیف
"روائع اقبال" ہے جس کا اردو ترجمہ "نقوش اقبال"
کے عنوان سے مشہور ادیب ومحقق مولانا شمس
تبریز خاں نے کیا ہے اور ترجمہ کے فنی محاسن کا
پورا حق ادا کیا ہے۔ حضرت مولانا کی اس تصنیف
سے صرف دنیائے عرب میں ہی نہیں بلکہ برصغیر ہند
وپاک کے ادبی حلقوں میں بھی انھیں زبردست
قدر ومنزلت اور شہرت ونیک نامی حاصل ہوئی۔
علامہ اقبال حضرت مولانا کے سب سے پسندیدہ
شاعر تھے، اور ان سے انسیت اور وارفتگی کا یہ
عالم تھا کہ سولہ سال کی عمر میں ہی اقبال کی نظم
"چاند" کا عربی میں ترجمہ کیا اور جون ۱۹۲۹ء
میں لاہور میں ان سے ملاقات کے دوران انھیں
جب دکھایا تو وہ حیرت زدہ رہ گئے۔ اس کے
بعد ۲۲ر جون ۱۹۳۷ء کو علامہ اقبال سے حضرت
مولانا کی دوسری ملاقات ہوئی اور ان کے افکار
وخیالات کو جاننے کا موقع ملا، جس سے انھیں
محسوس ہوا کہ ان کے اور علامہ اقبال کے خیالات
میں بڑی یکسانیت ہے۔ اس سلسلہ میں موصوف کا
یہ اعتراف قابل ذکر ہے:۔

"میری نشوونما اس عہد میں ہوئی جب
اقبال کا فن شہرت کے بام عروج پر
پہونچ چکا تھا۔ سب سے بڑی چیز جو مجھے
آپ کے فن کی طرف لے گئی وہ بلند حوصلگی،
محبت اور ایمان ہے جس کا بیّن امتزاج ان
کے شعر اور پیغام میں ملتا ہے اور جس کا ان
کے معاصرین میں کہیں پتہ نہیں لگتا۔ میں
بھی اپنی طبیعت اور فطرت میں انہی تینوں
کا دخل پاتا ہوں، میں ہر اس ادب اور
پیغام کی طرف بے اختیارانہ بڑھتا ہوں
جو بلند نظری، عالی حوصلگی اور احیاء اسلام
کی دعوت دیتا اور تسخیر کائنات اور تعمیر انفس
وآفاق کے لئے ابھارتا ہے۔ میری پسند
اور توجہ کا مرکز وہ اس لئے ہیں کہ وہ
بلند نظری، محبت اور ایمان کے شاعر ہیں،
ایک عقیدہ، دعوت اور پیغام رکھتے ہیں
اور مغرب کی مادی تہذیب کے سب سے
بڑے ناقد اور باغی ہیں۔۔ وہ اسلام
کی عظمت رفتہ اور مسلمانوں کے اقبال گذشتہ
کے لئے سب سے زیادہ فکرمند، تنگ نظر
قومیت ووطنیت کے سب سے بڑے
مخالف اور انسانیت واسلامیت کے
عظیم داعی تھے۔"

حضرت مولانا علی میاں علامہ اقبال
کے معترف بھی تھے اور بے باک ناقد بھی تھے۔
تبھی حضرت مولانا نے انتہائی صاف گوئی سے
ان کے بارے میں اپنے ان خیالات کا بھی اظہار
کردیا تھا:۔

"میں اقبال کو کوئی معصوم ومقدس ہستی
اور کوئی دینی پیشوا اور امام مجتہد نہیں
سمجھتا اور نہ میں ان کے کلام سے استناد
اور مدح سرائی میں حد افراط کو پہونچا ہوا
ہوں، جیسا کہ ان کے غالی معتقدین کا
شیوہ ہے۔۔۔۔۔۔ اقبال کے یہاں اسلامی

عقیدہ و فلسفہ کی ایسی تعبیریں بھی ملتی ہیں جن سے اختلاف کرنا مشکل ہے۔ میں بعض پرجوش نوجوانوں کی طرح اس کا بھی قائل نہیں کہ اسلام کو ان سے بہتر کسی نے سمجھا ہی نہیں اور اس کے علوم و حقائق تک ان کے سوا کوئی پہونچا ہی نہیں...... ان کی ناقد شخصیت میں ایسے کمزور پہلو بھی ہیں جو ان کے علم و فن سے میل نہیں کھاتے اور جنہیں دور کرنے کا موقع انھیں نہیں ملا۔"

(نقوش اقبال ص ۴۴-۴۳)

بہر حال روائع اقبال نے جب روح اقبال کا اردو جامہ پہنا تو علامہ اقبال کے فرزند ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا:-

"جناب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی فکرِ اقبال سے متعلق عربی مقالات یعنی "روائع اقبال" کی بیروت و دمشق میں اشاعت کے بارے میں میں نے بہت کچھ سن رکھا تھا۔ اب "نقوش اقبال" کی صورت میں خود مصنف کی نظر ثانی اور رضامندی کے بعد اس کتاب کا اردو ترجمہ میری نظر سے گذرا...... آپ نے فکر اقبال کے مختلف پہلوؤں کو ایسے انداز میں پیش کیا ہے، جیسے انھیں اقبال محسوس کرتے یا چاہتے تھے۔ علامہ کی بڑی خواہش تھی کہ ان کا پیغام عربوں تک پہونچے. مگر عربی زبان میں عربوں کو پیغام اقبال سے روشناس کرانے کا امتیاز ایک ہندی مسلمان یعنی سید صاحب کے حصہ میں مقدر تھا۔"

حضرت مولانا علی میاں کی تصنیف "نقوش اقبال" کی اہمیت و افادیت کا اندازہ اس تصنیف میں شامل ممتاز و معروف ادیب اور ناقد پروفیسر رشید احمد صدیقی کے مقدمہ کے اس اقتباس سے بخوبی ہو جاتا ہے:-

"عربی زبان و ادب، نیز تحریر و تقریر میں موصوف (حضرت مولانا علی میاں) کو جو غیر معمولی درک ہے اور عالم اسلام کے دینی و ثقافتی مسائل پر جیسا عبور ہے اس کے سبب سے موصوف کے فرمودات کو ہندوستان ہی نہیں، باہر کے ممالک اسلامیہ میں جو وزن اور رفعت حاصل ہے، وہ موجودہ ہندوستان کے شاید ہی کسی عالم دین کے حصہ میں آئی ہو۔ اسی بنا پر سید صاحب کو ملت کا سفیر کبیر بننے کا حق پہونچتا ہے۔

میرا خیال ہے، مولانا پہلے عالم دین ہیں جس نے موجودہ صدی کی اردو شاعری کے سب سے بڑے نمائندہ اور عظیم شاعر اقبال کی شاعری اور شخصیت کا مطالعہ غیر معمولی شوق اور بصیرت سے کیا ہے، ورنہ بیشتر علماء ہر جدید کو بالعموم مشتبہ ورنہ بڑی احتیاط سے دیکھنے کی طرف مائل رہے ہیں... سید صاحب کے ایک منفرد اور روشن خیال عالم دین اور شعر و ادب کے مبصر ہونے کی حیثیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ موصوف نے اقبال کی تائید و ترجمانی جس خوبی سے کی ہے اس سے میرے ایک دیرینہ خیال کی تصدیق ہوتی ہے کہ اقبال کا کلام ہمارے لئے اس صدی کا علم کلام ہے جو ایک نامعلوم اور طویل مدت تک تازہ کار رہے گا۔"

(نقوش اقبال ص ۱۶)

حضرت مولانا علی میاں نے "نقوش اقبال" میں فکر اقبال کو کس خوبی اور خوش اسلوبی سے واضح کیا ہے اس تصنیف کے درج ذیل اقتباس سے اس کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے:-

"اقبال اپنی امید کوشی، آرزو مشربی اور رجائیت کے پیش نظر یہ توقع ظاہر کرتے ہیں کہ سیاسی صدمات اور مصائب اور حوادث و آلام نے اگرچہ عالم اسلامی کو گھیر لیا ہے، لیکن اس سے وہ بیدار بھی ہو گیا ہے اور اس میں نئی زندگی اور تازگی کے آثار پیدا ہو چکے ہیں...... یہ آثار ایسے ہیں کہ مسلمانوں کو شکوہِ ترکمانی، ذہنِ ہندی، نطق اعرابی اور ان کی عظمت رفتہ ملنے والی ہے ؎

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفان مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی
عطا مومن کو پھر درگاہ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی، ذہن ہندی، نطق اعرابی

اقبال کہتے ہیں کہ ان کی فطرت سیمابی اور ان کی طبیعت سراپا بے تابی ہے۔ وہ اگر آج اس کروٹ ہیں تو کل بیداری کی بھی کروٹ بدلیں گے ؎

جدا پارے سے ہو سکتی نہیں تقدیر سیمابی

ان کی نگاہ میں سرشک چشم مسلم، صرف آنسو نہیں بلکہ ابر نیساں ہے جس سے دریائے خلیل سے لعل و گہر پیدا اور سیراب ہوتے ہیں۔ مسلمان ان کی نظر میں خدائے لم یزل کا دستِ قدرت اور زبان ہے اور ستارہ بھی اس کے کارواں کی گرد راہ ہیں۔ وہ چونکہ خدا کا آخری پیغام ہے، اس لئے جاوداں اور ازل و ابد پر محیط ہے اور اس کی فطرت،

ممکنات زندگی کی امین اور وہ اشیاء کا پاسبان ہے اسلام اور زندگی ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں اس لئے مسلمانوں کی نشأۃ ثانیہ بھی نوشتۂ تقدیر ہے ؎

ترے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی
نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر ساز فطرت میں نوا کوئی

اقبالؔ مایوس کن مشاہدات اور تجربات کے باوجود ملت اسلامیہ سے کبھی ناامید نہیں ہوئے بلکہ اس کی صلاحیتوں اور اہلیتوں کے پیش نظر یہی کہتے رہے ؎

نہیں ہے ناامید اقبالؔ اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

حضرت مولاناؒ نے علامہ اقبالؔ کے ادبی عقیدہ اور شعری محاسن کی وضاحت کرتے ہوئے آگے لکھا ہے :-

"اقبالؔ کا یہ عقیدہ ہے کہ ادب میں اس وقت تک جان نہیں پڑتی جب تک کہ وہ اپنی زندگی اور توانائی دھڑکتے دل کی گہرائیوں سے نہیں حاصل کرتا اور خون جگر سے سیراب نہیں ہوتا۔ وہ ایک شعر میں اس وسیع مضمون کو ادا کر دیتے ہیں ؎

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر

(نقوش اقبال ص ۵۶)

اسی شعر کے سیاق و سباق میں یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ حضرت مولانا علی میاں ندوی علامہ اقبال کے علاوہ جگر مرادآبادی کے بھی زبردست مداح تھے، اور ان کی شاعری کو فنی اعتبار سے لافانی، بلند اور برتر سمجھتے تھے۔ اس ضمن میں جگرؔ مرادآبادی کے بارے میں حضرت مولانا کے درج ذیل تأثرات کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ حضرت مولانا جگر کو "خاتم المتغزلین" مانتے تھے :-

"اردو میں جدیدیت کی تحریک سے کچھ پہلے جن سربرآوردہ غزل گو شعرا نے اردو غزل کو ایک نیا رنگ و آہنگ بخشا اور تعمیری رخ عطا کیا، ان میں اصغرؔ وفاتیؔ کے بعد مولانا حسرتؔ موہانی، جگر مرادآبادی، شفیقؔ جونپوری اور روشؔ صدیقی بہت ممتاز ہیں۔ مگر خاتم المتغزلین جگرؔ نے غزل کو جو نئی معنویت اور نئی جہت عطا کی، اس کا جواب نہیں۔ انھوں نے غزل کو جس طرح حقیقت و مجاز، زہد و رندی، مستی و ہشیاری، جنون و حکمت اور بے خودی و خودنگری کا آئینہ دار بنایا۔ وہ لافانی حیثیت رکھتا ہے۔

جگرؔ صاحب کے بعد جن لوگوں نے یہ رنگ سخن اپنایا اور اسے ترقی دی، ان میں روشؔ صدیقی، تسکینؔ قریشی، عارفؔ عباسی، فاروقؔ بانسپوری، سید صدیقؔ حسن اور حبیب احمد صدیقی کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ ان شعرا نے غزل کو رفعت و طہارت، پاکیزگی و برگزیدگی، سنجیدگی اور شائستگی کا جامہ پہنایا اور مجاز کے ساتھ حقیقت کے جلوے دکھائے۔ غم جاناں کے پہلو میں غم دوراں کو جگہ دی اور روایتی انداز سے الگ رہ کر نئے حالات و حادثات کی طرف بھی اشارے کئے۔"

(شمیم: شمیمؔ جے پوری۔ مقدمہ از مولانا علی میاںؒ)

جگرؔ مرادآبادی اور تسکین قریشی کے رنگ و آہنگ میں غزل گوئی کو اپنا سرمایۂ افتخار سمجھنے والے شمیمؔ جے پوری کا شعر و ادب میں اپنا ایک مقام ہے۔ حضرت مولانا علی میاں نے شمیمؔ جے پوری کے شعری مجموعہ "شمیم" کے اپنے مقدمہ میں ان کے شعری محاسن کو اجاگر کرتے ہوئے لکھا ؎

"آج کل جگرؔ اور تسکینؔ کے رنگ میں غزل کہنے والوں میں شمیمؔ صاحب کو پہلا مقام دینا ہوگا۔ وہ اب اردو کی شعری روایت کے وارث و امین اور ان محترم شعراء کے جانشین ہیں .... یہ جگرؔ اور جگرؔ اسکول کے شعراء کی شریفانہ شاعرانہ روایت کا تتمہ و ضمیمہ اور اس کی توسیع و تکمیل ہیں۔

شمیم صاحب کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی سادگی و صفائی، روانی و بے تکلفی، شستگی و شگفتگی ہے۔ اس میں عموماً مشکل الفاظ اور دشوار ترکیبوں سے بچا گیا ہے اور آسان عام فہم اور مروجہ شعری پیرایۂ بیان اختیار کیا گیا ...... وہ غزل کی زبان اور اس کے لہجے کے رمز آشنا اور نکتہ شناس ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کے کلام میں نغمگی و شیرینی دلکشی و رعنائی، سلاست و حلاوت ایک متوازن آہنگ اور ایک مترنم کیفیت کا احساس ہوتا ہے، اور ذوق و وجدان لذت یاب ہوتے ہیں۔"

(شمیم: شمیمؔ جے پوری۔ مقدمہ مولانا علی میاں ص ۸)

حضرت مولانا علی میاں ندوی نے غزل اور دیگر اصناف سخن کے مقابلہ میں نعت گوئی کو ہمیشہ ترجیح دی ہے، اور ناقدین سے یہ شکوہ بھی کیا ہے کہ ہمارے تنقید نگاروں نے اس کی طرف بہت کم توجہ دی ہے، جبکہ اس سے کم اہمیت کے اصناف سخن پر بہت کام ہوا۔ ان کو خوب داد دی گئی۔ لیکن اس فن کا حق ادا نہیں کیا گیا۔ حضرت مولانا نے نعت گوئی کو سب سے زیادہ مؤثر

جامع اور اعلیٰ صنفِ سخن قرار دیتے ہوئے یہ دعویٰ کیا ہے:-

"فارسی اور اردو شاعری کا مطالعہ عام ڈگر سے ہٹ کر انصاف اور حقیقت پسندی کے ساتھ کیا جائے تو شاید سب سے زیادہ طاقتور، سب سے زیادہ بھرپور صنفِ سخن "نعت" قرار پائے گی۔ تنوع اور مقدار ومعیار کے اعتبار سے نمایاں اور ممتاز یہ صنفِ سخن اردو اور فارسی کی معروف روایتی ہیئتوں میں سے کسی ایک ہیئت وشکل کی پابند نہیں، بلکہ قصیدہ، مثنوی، مسدس، مخمس، قطعہ، غزل اور شاعری کی جدید ہیئتوں میں بھی قوت وتاثیر اور فنی خوبیوں سے بھرپور نعتیہ نمونوں کی کمی نہیں۔ نعت نگاری کا محرک دراصل محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مقدس اور قوی جذبہ ہوا کرتا ہے۔ اور عشق کی آنچ میں تپ کر دل کی گہرائیوں سے نکلنے والا نالہ "لَے" کا پابند نہیں ہوا کرتا۔ موضوع کے اس تقدس، جذبہ کے خلوص، محبت کی قوت، آتشِ شوق کی آنچ اور شعراء کی قدرتِ کلام اور فنی چابک دستیوں نے اس فن کو بامِ عروج پر پہونچایا۔"

(اردو شاعری میں نعت گوئی۔ شاہ رشاد عثمانی۔ مقدمہ مولانا علی میاں ندویؒ ص۸-۷)

جیسا کہ راقم الحروف نے اس مقالہ کی ابتدا میں قدیم وجدید دور کے بعض ایسے علماء وفضلاء کا ذکر کیا ہے، جو ادیب یا شاعر بھی تھے۔ اس سلسلہ کو کچھ اور آگے بڑھایا جائے تو ہمیں مولانا محمد احمد پھولپوریؒ اور مولانا قاری سید صدیق احمد باندویؒ جیسے مقتدر علماء کے نام نامی اسم گرامی بھی نظر آتے ہیں، جو ممتاز ومنفرد عالم دین ہونے کے ساتھ ہی شاعر بھی تھے، مولانا علی میاںؒ نے سراج الدین سراجؔ، مظہر جان جاناں، خواجہ میر دردؔ، حسرتؔ، فانیؔ، اصغرؔ اور جگرؔ کی صوفیانہ اور عشقیہ شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے مولانا محمد احمد پھولپوریؒ کے مجموعہ کلام "عرفان محبت" کے اپنے مقدمہ میں اضافہ کے طور پر اپنے تأثرات کا ان الفاظ میں اظہار خیال کیا ہے:-

"حضرت (مولانا محمد احمد پھولپوریؒ) کی دو خصوصیتوں سے ضرور واقفیت ہے اور ان کے چشم دید مشاہدہ کا شرف حاصل ہوا۔ ایک انتہائی سادگی و تواضع، شفقت بزرگانہ، بلکہ محبت پدرانہ ومربیانہ دوسرے بلند پایہ عارفانہ کلام اور حضرت جگر مرادآبادی کے اس شعر کا مشاہدہ اور چشم دید نظارہ ؎

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں
فیضان محبت عام سہی، عرفان محبت عام نہیں

حضرت کے یہاں عرفانِ محبت کا ہی نظارہ دیکھا۔ حضرت کے دیوان کا نام بھی کسی عارف نے صحیح طور پر "عرفان محبت" رکھا ہے .... ان کا کلام عشق ومستی سے بھرپور اور معرفت ومحبت کا "شراب طہور" نظر آتا ہے۔ ان کے کلام میں عشق ومحبت کا مضمون اور گرمی ومستی اتنی نظر آتی ہے کہ ان کے دیوان کا نام صحیح معنیٰ میں "عرفان محبت" ہی ہو سکتا ہے .... اردو کے بعض اساتذہ وشعراء کے اشعار نیز ہندی دوہوں پر مولانا کے بعض ترمیمی واصلاحی شعر بھی ہیں، جو لطف سے خالی نہیں۔ غرض اس مجموعہ کلام کو پڑھ کر اچھے اچھے حاضر باشوں کو بھی مولانا ہی کی زبان میں کہنا پڑتا ہے ؎

احمدؔ تجھے نہ جانا نہ سمجھا تمام عمر
گو ساتھ جا رہے ہیں ترے آ رہے ہیں ہم"

(از: مولانا محمد احمد صاحبؒ مشاہدات وتأثرات ــــ مصنف مولانا شمس الحق ندوی ص۱۴ تا ۲۰)

یہ کس قدر حیرت واستعجاب کی بات ہے کہ برصغیر ہند وپاک کے ادبی حلقہ میں حضرت مولانا علی میاں ندوی کو ان کی تصنیف "روائع اقبال" (نقوش اقبال) کے سبب ایک ادیب اور ناقد کی حیثیت سے وہ قدر ومنزلت حاصل نہ ہو سکی، جو مولانا محمد حسین آزاد کو "آبِ حیات"، مولانا الطاف حسین حالیؔ کو "مقدمہ شعر وشاعری" اور مولانا شبلی نعمانی کو "شعر العجم" کے سبب حاصل ہوئی۔ اسی طرح مولانا سید سلیمان ندوی کو بھی ایک ادیب کی حیثیت سے وہ عزت وشہرت نہ ملی جس کے وہ بہر حال مستحق تھے۔ ادیب وناقد علماء کے معاملہ میں یہ ایک ایسی نامناسب بے اعتنائی اور بے توجہی ہے جس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ماہنامہ "نیا دور لکھنؤ" کے فاضل مدیر شاہنواز قریشی نے "نیا دور" کے مارچ ۲۰۰۰ء کے شمارہ میں "اپنی بات" اداریہ میں بالکل درست اور برمحل تجزیہ کیا ہے:-

"نامور علمائے دین کی مذہبی شخصیت کے علاوہ ادبی شخصیت بھی مسلم ہے۔ لیکن ان کی نگارشات کو محض مذہبی نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا ہے، جب کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی تحریروں کا ادبی تجزیہ بھی کیا جائے۔ یوپی اترپردیش اکاڈمی کے ایک سمینار میں ان خیالات کا اظہار کرتے ہوئے عزت مآب جسٹس حیدر عباس رضا صاحب نے کہا تھا:- سید سلیمان ندویؒ نے معرکۃ الآراء کتاب "سیرت النبیؐ" لکھی۔ "سیرت النبیؐ"

کی ادبی حیثیت مسلم ہے لیکن اس جانب کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ جسٹس رضا صاحب نے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی نگارشات کا ادبی تجزیہ کرنے کی ضرورت پر زور دیا" اور کہا کہ جہاں تک حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی کی ادبی اہمیت اور ادبی حسن کا تعلق ہے اس کے سبھی معترف نظر آتے ہیں۔ اردو میں جدید ادب کے سب سے بڑے علمبردار ماہنامہ "شب خون" نے مولانا کی ادبی حیثیت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے۔ وہ اردو کے صاحب طرز نثر نگار بھی تھے، کلاسیکی اردو، فارسی ادب سے ان کی شناسائی صرف چند مشہور ناموں تک محدود نہ تھی۔ "نقوش اقبال" لکھ کر انھوں نے جدید ادب کی تنقید میں بھی ایک مقام حاصل کرلیا تھا۔ اردو شعر و ادب کے ارتقا اور تاریخ دونوں پر مولانا کی گہری نظر تھی۔"

المختصر حضرت مولانا کی ادبی، تحقیقی اور تنقیدی حیثیت مسلم ہے۔ ان کی علمی و دینی خصوصیات کو اجاگر کرنے پر خوب سے خوب تر توجہ دی گئی۔ لیکن افسوس کہ ان کی ادبی و فنی صلاحیت کا تجزیہ کرنے پر جو خاطر خواہ توجہ دی جانا چاہئے تھی نہیں دی گئی۔ ان کی شخصیت اور ادبی خدمات کے موضوع پر بہرحال تحقیقی کام کرنے کا تقاضا شدت سے محسوس کیا جارہا ہے۔

> یہ نکتہ میں نے سیکھا بوالحسن سے
> کہ جاں مرتی نہیں مرگِ بدن سے
> چمک سورج میں کیا باقی رہے گی
> اگر بیزار ہو اپنی کرن سے

عالمِ ربّانی کی یاد میں

کامل چاندپوری

حمدِ خدائے پاک سے کرتے ہیں ابتدا
کرتے ہیں اس کے بعد شہِ دیں کی ہم ثنا
جس وقت لائے اپنے تصور میں اس کو ہم
چلنے سے پہلے رو دیا قرطاس پہ قلم
بائیس ماہ رمضاں مبارک جمعہ کا دن
بعدِ زوال پورا ہوا باصفا کا دن
قرآن پڑھتے پڑھتے وہ خاموش ہوگیا
رحمت کے جا کے سائے میں روپوش ہوگیا
گونجی خبر یہ ہوگیا ہر سمت پُرملال
سید ابوالحسن علی ندویؒ کا انتقال
تاریکیوں میں غرق ہوا پل میں یہ جہاں
صد حیف آج ہوگئی گل شمع ضوفشاں
عرب و عجم کی آج زمیں سوگوار ہے
شمس و قمر اداس فلک اشکبار ہے
تکیہ کی روح رونقِ ندوہ چلا گیا
ہمراہ اپنے لے کے اجالا چلا گیا
حاصل تھا اس کو علم و فراست میں وہ کمال
اس دور میں نظیر نہ جس کی کوئی مثال
علم و ادب میں تھا اسے حاصل جہاں کمال
اس دور میں وہیں تھا مؤرخ بھی بے مثال
ملت کے اتحاد میں کوشاں تھا صبح و شام
انسانیت کا دے گیا دنیا کو وہ پیام
اہلِ زبان اہلِ قلم صاحبِ نظر
دانائے راز راہِ طریقت سے باخبر
مسکیں نواز اور سلاطیں کا ہم نشیں
رفعت میں وہ فلک تھا تواضع میں تھا زمیں
روشن وہ اک چراغ تھا بیتِ بتولؓ کا
حسنی نسب تھا عالی چہیتا رسولؐ کا
شبنم کی طرح نرم تھا اپنوں پہ تھا نثار
باطل کے حق میں رہتا تھا ہر وقت شعلہ بار
موڑا نہ اپنا رخ کسی طاقت کے سامنے
سر خم ہوا نہ اس کا حکومت کے سامنے
جنتی گیا ہے اپنی تصانیف چھوڑ کر
رشتہ خدا سے اس میں گیا ہے وہ جوڑ کر
خدمت میں جاتا مصلحِ امت کی بار بار
آتا تھا اس کے قلبِ حزیں کو جہاں قرار
کرتا تھا دل سے حضرت احمدؒ کا احترام
کرتا تھا آ کے صابری منزل میں وہ قیام
حضرت بھی تکیہ ندوہ کا کرتے رہے سفر
دراصل باہمی یہ محبت کا تھا اثر
اللہ پاک دونوں ہی کا فیض بے بہا
ہم سب کو اپنے فضل و کرم سے کرے عطا
تکیہ کلاں میں دفن وہ ہوتا ہے خوش نصیب
پہلو میں یعنی شاہ علم اللہؒ کے قریب
تکیہ میں اک نمازِ جنازہ پڑھی گئی
حرمین میں بھی دوسری اس کی ادا ہوئی
اپنا بنا کے حضرت رابع کو جانشیں
رخصت ہوا جہاں سے وہ فردوس کا مکیں
اللہ پاک حضرت رابع کا مرتبہ
صبح و مسا بلند کرے دل سے ہے دعا
دریائے فیض آپ کا ہر سمت ہو رواں
سیراب ان کے فیض سے ہوتا رہے جہاں
صبرِ جمیل کر عطا پسماندگان کو
اجرِ عظیم کر عطا اس خاندان کو
خلدِ بریں میں اعلیٰ جگہ اس کو کر عطا
کرے قبول اے خدا کامل کی یہ دعا

مسلم پرسنل لا بورڈ

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے عہد صدارت میں

رضوان احمد ندوی ـــــ دفتر انچارج آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ پٹنہ

مسلم پرسنل لا ملت اسلامیہ کی ریڑھ کی ہڈی (BACK BONE) کی حیثیت اور جسم و روح کا سا تعلق رکھتا ہے، اگر ان قوانین میں تبدیلیاں پیدا کر دی جائیں، یا اس کی تشریح و توضیح میں خود رائی اختیار کی جائے تو ملت کا مزاج، اس کا خاندانی اور معاشرتی نظام بگڑ جائے گا، اور اس کا ملی تشخص اور مذہبی حیثیت کالعدم ہو جائے گی۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جب بھی عالم انسانیت میں انقلابات آئے تو ان انقلابات نے تہذیب و تمدن کی روح میں تبدیلی پیدا کر دی، اور جیسے جیسے حکومتوں میں شخصی رجحان کا غلبہ ہوا، ویسے ویسے سیاسی اقتدار کے لئے ارباب سیاست نے قوموں اور ملتوں کے شخصی قوانین کے دائرے کو محدود کرنا شروع کر دیا، جس سے مسلم پرسنل لا کو خطرہ لاحق ہو گیا اور خاص کر ایسے ممالک جہاں مسلمان اقلیت میں رہتے ہیں، ان کی مذہبی آزادی اور آئینی حقوق و مفادات پر کاری ضرب پڑی، ہندستان کے اندر انگریزوں کے عہد حکومت میں بھی یہی سب کچھ ہوا، ان کے دور اقتدار میں اسلام کے اجتماعی قوانین غیر متحرک ہو کر رہ گئے، اس نے قانون شریعت کو اس کی محدود شکل میں یعنی شریعت اپلی کیشن ایکٹ ۱۹۳۷ء کے ذریعہ مسلم پرسنل لا کے کچھ عائلی قوانین کو تحفظ دیا، جس میں اس نے یہ وضاحت کی کہ نکاح، خلع (طلاق، ایلاء، ظہار، فسخ نکاح) وراثت، نفقہ، مہر، ولایت، حضانت، اوقاف وغیرہ مسائل مسلم پرسنل لا کے تابع ہوں گے اور بس، غالباً اسی لئے اس عہد میں ہندو مسلم معاملات ان کی شریعت اور دھرم شاستر کے مطابق حل کئے جاتے تھے، پھر جب ملک انگریزوں کے قبضہ سے آزاد ہوا تو گرچہ آزاد ہندوستان میں دستور کی دفعہ (۲۵) اور (۲۹) کے ذریعہ مسلم پرسنل لا کو قانونی تحفظ دیا گیا، لیکن دستور میں بعض ایسی دفعات شامل کی گئیں جن سے مسلم پرسنل لا پر ضرب پڑتی تھی یعنی دستور کے رہنما اصول کی (دفعہ ۴۴) میں یہ کہا گیا ہے کہ حکومت کو چاہئے کہ سارے ہندوستان کے لئے ایک مشترک کوڈ نافذ کرے۔ گویا یکساں سول کوڈ (UNIFORM CIVIL CODE) کے نفاذ کی راہ ہموار کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس کے بعد سے ہی مسلم پرسنل لا پر خطرات کے بادل منڈلانے لگے، سیاسی لیڈروں اور حکومت کے بعض ذمہ داروں اور بازیگروں کی طرف سے مسلم پرسنل لا میں ترمیم کا مسئلہ بار بار اٹھایا جانے لگا۔ اور یہ معاملہ اس وقت شدت اختیار کر گیا جب ۱۹۵۶ء میں ہندو کوڈ بل پاس ہوا اور اس وقت کے وزیر قانون مسٹر پاٹسکر (PATASKAR) نے یہ فتنہ کھڑا کیا کہ "ہندو قوانین میں جو اصلاحات کی جا رہی ہیں وہ مستقبل قریب میں ہندوستان کی تمام آبادیوں پر نافذ کی جائیں گی۔"

گویا دستور ہند میں مسلم پرسنل لا کو جو تحفظ دیا گیا تھا اس شوشہ کے ذریعہ اس کو ختم کر کے مسلمانوں کو عام انسانی خواہشات کے تابع بنا دینے کا منصوبہ تیار کیا جانے لگا۔ حالانکہ یہ اس غلط فہمی کا نتیجہ ہے کہ بعض تجدد پسند دانشور مسلمانوں کے پرسنل لا کو دیگر مذاہب کے پرسنل لا کی طرح ایک تھیوری، یا کوئی خاندانی روایات سمجھتے ہیں، انھیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ مسلمانوں کا پرسنل لا دوسرے اقوام و ملل کے پرسنل لا کے مقابلہ میں کوئی اوہام یا روایتی مذہب نہیں ہے، بلکہ اس کے قوانین کی بنیاد وحی والہام پر مبنی ہے۔ قرآن و حدیث اس کا سرچشمہ ہے جو انسانی تہذیب و تمدن کا مصلح ہے اور جو مصلح ہو وہ اصلاح پذیر نہیں ہو سکتا، اسی لئے جسٹس محمود صاحب نے لکھا ہے کہ "مسلم قانون کو دین و مذہب سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔"

بہر حال جب فسطائی ذہنیت نے ملک میں ایسے نازک حالات پیدا کر دیئے تو ہندستان کے باشعور و حساس علماء دین، قوم و ملت کے رہنما، مسلم قانون داں اور اصحاب فکر و نظر نے مسلم پرسنل لا کے تحفظ و بقا کی تحریک چلانی شروع کی، سب سے پہلے مولانا منت اللہ رحمانی کی تحریک پر ملت کے ارباب فضل و کمال اور عمائدین کی ایک نمائندہ مجلس ایشیا کے دینی و مرکزی ادارہ دار العلوم دیوبند میں ہوئی۔ جس میں یہ طے پایا کہ بمبئی میں مسلم پرسنل لا کے نام سے ایک کنونشن بلایا جائے، اور مسئلہ کی نزاکت اور صورتحال کی سنگینی سے عام مسلمانوں کو بھی واقف کرایا جائے۔ چنانچہ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی فعال قیادت میں علماء کرام کا ایک وفد بمبئی پہونچا، جہاں وہ اجلاس کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ پھر ان

بزرگوں کی مساعی جمیلہ کے نتیجہ میں مختلف مکاتب فکر وخیال کے علماء و دانشور، تنظیموں اور اداروں کے نمائندوں کا ایک عظیم الشان اور تاریخ ساز اجلاس ۲۷، ۲۸ دسمبر ۱۹۷۲ء کو بحیرۂ عرب کے ساحل بمبئی میں منعقد ہوا۔ جس میں متعدد قرارداد اور تجاویز پاس ہوئیں پھر اسی کنونشن کے نتیجہ میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام عمل میں آیا۔

اس بورڈ کے قیام سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مسلمان جو عرصہ دراز سے ایک مشترکہ قیادت کے لئے بے چین تھے ان کی حقیقی تسکین اور دل جوئی کے لئے یہ بورڈ ان کے لئے دل کی آواز بن گیا۔ بلکہ صدیوں سے مسلک و مشرب کے جو فاصلے تھے وہ قربت میں بدل گئے، اور ان کے درمیان اتحاد و یک جہتی کی فضا قائم ہوگئی۔ پھر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ ایک تحریک کی شکل میں ظاہر ہوا۔ بعد میں اس کے بنیادی نظام کو مربوط کرنے، دائرہ کار کو مرتب کرنے اور دستور اساسی کو منظور کرنے کے لئے ۷، ۸ اپریل ۱۹۷۳ء میں بورڈ کا دوسرا اجلاس حیدرآباد میں ہوا، جس میں ہر طبقہ کے نمائندوں پر مشتمل ایک سو اکیاون افراد کی ایک مجلس بنائی گئی، اس میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کو صدر اور تحریک کے روح رواں حضرت مولانا سید شاہ منت اللہ رحمانیؒ کو بورڈ کا جنرل سکریٹری منتخب کیا گیا۔ اس کے بعد بورڈ کا یہ کارواں کامیابی کے ساتھ اپنا سفر طے کرتا رہا۔ چاہے وہ قانون تبنیت کا مسئلہ ہو یا جبری نسبندی کا اس نے قابل لحاظ کامیابی حاصل کی۔ بورڈ کا یہ سفر جاری تھا کہ اچانک ۱۷ جولائی ۱۹۸۳ء کو بورڈ کے صدر حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کے انتقال کا حادثۂ جانکاہ پیش آگیا، طاب حیًا وطاب میتًا، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ گیارہ سالہ عہد صدارت نے اپنی بساط لپیٹ لی، اس عظیم سانحہ سے بورڈ کے جنرل سکریٹری حضرت مولانا منت اللہ رحمانی صاحب (المتوفی ۱۹۹۱ء) بہت متأثر ہوئے، چنانچہ انھوں نے ۲۸ دسمبر ۱۹۸۳ء کو بورڈ کا سالانہ اجلاس مدراس میں طلب فرمایا اور اس منصب جلیل کے لئے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے نام کی تجویز پیش کی۔ مجمع عام نے اس نام کی تجویز و تحریک پر اپنی مسرت کا اظہار کیا۔ اور ہر طبقہ و جماعت اور مسلک کے عمائدین اور ارباب بصیرت نے پرزور انداز میں تائید و حمایت کی۔ اس طرح اتفاق رائے سے حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کو بورڈ کا صدر منتخب کر لیا گیا۔ (مگر یاد رہے کہ بورڈ کے تیسرے اجلاس رانچی ۱۵، ۱۶ اکتوبر ۱۹۷۷ء میں حیدرآباد کے بعض ارکان[1] بورڈ نے حضرت قاری صاحبؒ کی موجودگی میں صدر بورڈ کے لئے حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کا نام پیش کیا تھا، اس پر مولانا نے بڑا حکیمانہ جواب دیا تھا کہ— "جب دریا میں طوفان ہو، اور کشتی بھنور میں ہو، تو کشتی کا ملاح نہیں بدلا جاتا"۔) بہرحال پھر بعد کے حالات اور زمانے کے تغیرات سے یہ ثابت ہوگیا کہ مسلمانوں کے عائلی قوانین کے تحفظ، مسلم پرسنل لا پر داخلی اور خارجی حملوں کے سدباب اور بورڈ کی قیادت و سیادت کے لئے جس قائد کی ضرورت تھی اللہ تعالیٰ نے حضرت مولاناؒ کو ان تمام خوبیوں اور صلاحیتوں سے بھرپور نوازا تھا۔ فراست ایمانی، حکمت عملی، جوہر شناسی دوراندیشی و ژرف نگاہی، دقت نظر اور وسعت مطالعہ کے اعتبار سے معاصر علماء میں ممتاز شخصیت کے حامل تھے، وہ وقت کے نازک مسائل کو حکمت و تدبیر کے ساتھ حل کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے تھے۔ اسی زمانے میں بعض سیاسی جماعتوں اور انتہاپسند پارٹیوں کی طرف سے ملک کے جمہوری ڈھانچوں میں تبدیلی کرنے اور یکساں سول کوڈ نافذ کرنے کی تحریک چلائی گئی، مسلمان مایوسی اور احساس کمتری کے شکار ہونے لگے، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے مسلم پرسنل لا بورڈ کا ساتواں اجلاس ۶، ۷ اپریل ۱۹۸۵ء کو شہر کلکتہ میں طلب فرمایا، اور علماء و قائدین کے ایک بڑے مجمع میں اپنے خطبہ صدارت کے اندر پوری جرأت اور پورے اعتماد کے ساتھ بورڈ کے موقف کو صاف صاف لفظوں میں بیان کیا انھوں نے فرمایا کہ:۔

"ہم اس کی بالکل اجازت نہیں دے سکتے کہ ہمارے اوپر کوئی دوسرا نظام معاشرت، نظام تمدن اور عائلی قانون مسلط کیا جائے، ہم اس کو دعوت ارتداد سمجھتے ہیں، اور ہم اس کا اسی طرح مقابلہ کریں گے جیسے دعوت ارتداد کا کرنا چاہئے۔ اور یہ ہمارا شہری، آئینی، جمہوری اور دینی حق ہے، اور ہندوستان کا دستور اور اس جمہوری ملک کا آئین اور مفاد نہ صرف اس کی اجازت دیتا ہے، بلکہ اس کی ہمت افزائی کرتا ہے کہ جمہوریت کی بقاء، اپنے حقوق کے تحفظ اور اظہار خیال کی آزادی، ہر فرقہ اور اقلیت کے سکون و اطمینان میں مضمر ہے"۔ (ماخوذ از خطبۂ صدارت کلکتہ ۱۹۸۵ء)

مسلمان بھلے ہی عمل میں کمزور ہو، لیکن وہ مذہبی قدروں پر یقین رکھتا ہے، اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ ذہنی و فکری ارتداد، عملی و فعلی ارتداد سے بڑھ کر ہے، چنانچہ حضرت مولاناؒ نے مسلمانوں

---

[1] مولانا سلیمان سکندر صاحب وغیرہ۔

کے اس اعتماد ویقین کی بھرپور ترجمانی کی۔ اور اپنے اس عزم وارادہ کا اظہار بورڈ کے مختلف اجلاسوں میں گیا۔ دسویں اجلاس دہلی ۱۹۹۰ء بارہویں اجلاس بورڈ احمد آباد ۱۹۹۵ء اور تیرہویں اجلاس بمبئی ۱۹۹۹ء کے خطبہ صدارت میں مذکورہ بالا جملوں کو دہرایا۔ انھوں نے اپنے خطبہ صدارت میں اسلام کے عائلی قوانین اور مسلم پرسنل لا کی خالص دینی وشرعی حیثیت اور اس کے امتیازی پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے دوٹوک انداز میں کہا کہ ہم قانون شریعت میں کسی قسم کی تبدیلی گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں، مگر جہاں انھوں نے ارباب اقتدار کو اس حقیقت سے آگاہ کیا وہیں بذات خود مسلمانوں کو بھی قانون شریعت پر عمل کرنے کی تاکید کی، انھوں نے کلکتہ کے اجلاس بورڈ کے موقع پر ۵ لاکھ کے مجمع عام میں مسلمانوں کو ان کی دینی غیرت اور ایمانی جوش وجذبہ کو ابھارتے ہوئے فرمایا کہ:۔

"جب ہم اہل حکومت اور برادران وطن سے شکایت کرتے ہیں تو ہمیں آپ سے شکایت کا حق کیوں نہ ہو؟ ان سے شکایت کریں گے اور ان کا دامن پکڑیں گے لیکن آپ کا گریبان پکڑیں گے، اور وہ ہاتھ ہمارا ہاتھ نہیں ہوگا، وہ شریعت کا ہاتھ ہوگا جو آپ کا گریبان پکڑے گا کہ پہلے تم اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھو کہ تم اس قانون پر کتنا چلتے ہو، تم تو اپنے گھروں میں اس قانون کو نہ چلاؤ اور حکومت سے مطالبہ کرو کہ وہ تمہارے قانون کو چلائے" (از تقریر، ۱ر اپریل ۱۹۸۵ء شہید مینار کلکتہ)

جب جب ملک کے اکثریتی فرقوں یا عدالتوں نے مسلم پرسنل لا میں مداخلت اور یونیفارم سول کوڈ کو نافذ کرنے کا ارادہ کیا، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اس چیلنج کا بھرپور جواب دیا۔ ایک دفعہ انھوں نے بورڈ کی مجلس عاملہ میں بہت سخت لہجے میں فرمایا کہ:۔

"ملک کا سیاسی مستقبل نہایت اندیشناک ہے، محض فرائض کا نام دین نہیں ہے، بلکہ شعائر اسلامی اور قوانین کا تحفظ بھی دین کا اہم شعبہ ہے اس لئے ہمارا یہ سفر ابھی جاری رہے گا، ہر دور میں ادارے اور تحریکیں اٹھی ہیں، مسلم پرسنل لا بورڈ بھی ایک تحریک ہے اس لئے ہمارا سفر ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔"

(ماخوذ از رجسٹر کارروائی مجلس عاملہ ۸ رمئی ۱۹۹۱ء لکھنؤ)

بورڈ کے صدر منتخب ہونے کے کچھ عرصہ بعد یعنی ۲۳ راپریل ۱۹۸۵ء میں سپریم کورٹ نے ضابطہ فوجداری کی دفعہ (۱۲۵) کا سہارا لے کر شاہ بانو مقدمہ میں مسلم مطلقہ عورت کو تاحیات یا تا نکاح ثانی شوہر پر نفقہ لازم قرار دینے کا انتہائی جارحانہ فیصلہ دیدیا، یہ فیصلہ قانون شریعت کے بالکل مخالف تھا، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اور جنرل سکریٹری بورڈ مولانا سید منت اللہ رحمانی کی راتوں کی نیند اڑ گئی، قلب ودماغ بے چین ہوگئے۔ اور اس کے خلاف سخت اور مسلسل صدائے احتجاج بلند کیا، بورڈ کے علماء وقائدین نے ان دونوں حضرات کی رفاقت ورہنمائی میں پورے ملک میں منظم تحریک چلائی، مسلمانوں کے اجتماعات میں نفقہ قانون اسلامی کی وضاحت کی اور سپریم کورٹ کے فیصلوں پر اپنے ردعمل کا اظہار کیا، حضرت مولانا نے ۲ رفروری ۱۹۸۶ء کو وزیر اعظم ہند اور حکومت کے دوسرے سیاسی واعلیٰ عہدیداروں سے گفت وشنید کی کبھی انفرادی اور کبھی اجتماعی طور پر برسر اقتدار پارٹی کے ذمہ داروں سے ملاقاتیں کیں۔ اور صورت حال کی نزاکت، اس قانون کی نامعقولیت اور قانون شریعت کی حکمت وانفرادیت سے روشناس کرایا، آخرکار آپ کی مدبرانہ قیادت ورہنمائی اور حضرت مولانا منت اللہ رحمانی کی مذہبی وسیاسی بصیرت اور اقدامی صلاحیت کے نتیجہ میں حکومت نے ۶ رمئی ۱۹۸۶ء میں قانون حقوق مسلم مطلقہ ۱۹۸۶ء پاس کر کے سپریم کورٹ کے فیصلہ کو رد کر دیا، جس کی مثالیں ملک کی آئینی وجمہور زندگی میں کم ملتی ہیں، اس مسئلہ میں کامیابی کی سب سے بڑی وجہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی دانشمندانہ وجراتمندانہ قیادت، مولانا منت اللہ رحمانی کی دور اندیشی، اصابت رائے اور معزز اراکین بورڈ کی بلند حوصلگی، صبر آزما جدوجہد اور قربانیاں ہیں۔

شریعت اسلامی، شعائر دین اور عائلی قوانین پر جب بھی فرقہ پرست طاقتوں نے ناروا حملے کئے حضرت مولاناؒ بحیثیت صدر بورڈ اسلام اور مسلمانوں کی دینی اور تہذیبی اقدار کی حفاظت کے لئے سینہ سپر ہو گئے۔ ۶ ردسمبر ۱۹۹۲ء کا دن آزاد ہندوستان کی تاریخ میں ایک سیاہ ترین دن ہے۔ جس وقت کہ یہاں فرقہ پرست جماعتوں اور انتہا پسند تنظیموں نے مذہبی تعصب اور جوش جنوں میں ہندوستان کی قدیم تاریخی بابری مسجد کو شہید کر دیا، اور بڑے پیمانے پر ملک میں خونی فسادات کرائے۔ فرقہ وارانہ جنون کی آگ میں ملک جل رہا تھا، مسلمان مایوسی، اضطراب اور بے چینی کی کیفیت میں مبتلا تھے، ان کی نگاہیں بورڈ کی طرف اٹھنے لگیں، ایسے مایوس کن حالات میں حضرت مولاناؒ نے مسلمانوں کے قدموں کو جمایا، اور انھیں زندہ ملت کی حیثیت سے رہنے اور حوصلہ وہمت کے ساتھ زندگی گذارنے کی تلقین

کی، پھر ۹ جنوری ۱۹۹۳ء کے اجلاس عاملہ دہلی میں بابری مسجد کی شہادت پر اپنے غم وغصہ کا اظہار کیا، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ انھوں نے ایک تاریخی اور مؤثر تقریر کی تھی جس میں بابری مسجد کی بازیابی کے لئے آخری دم تک جد وجہد کا عزم فرمایا، اور یہی ہوا کہ اس کے بعد ۵ اپریل ۱۹۹۳ء کو بورڈ کے ایک مؤقر وفد کی قیادت کرتے ہوئے وزیر اعظم سے ملاقات کی اور ایک واضح اور مفصل میمورنڈم پیش کیا۔ چنانچہ الہ آباد ہائی کورٹ کی لکھنؤ بنچ پر چل رہے بابری مسجد کی حقیت کے مقدمہ میں بورڈ نے قانونی امداد وتعاون کا فیصلہ کیا۔ جواب تک جاری ہے۔

اس کے ساتھ ہی حضرت مولانا نے بار بار ارباب حکومت کو صاف صاف لفظوں میں کہا کہ:۔

"ہم اس ملک میں اپنے پورے عقائد، دینی شعائر، قانون شریعت اور اپنی پوری مذہبی وتہذیبی خصوصیات کے ساتھ رہیں گے، ہم ان کے کسی ایک نکتہ سے بھی دست بردار ہونے کے لئے تیار نہیں ہیں۔"

(خطبہ صدارت بمبئی ۱۹۹۰ء)

ایک زمانہ میں بابری مسجد کے قضیہ کے تصفیہ کے لئے ہندوؤں کے مذہبی رہنماؤں سے بھی گفتگو کرنے کی بات چلی تھی، اس موقع پر حضرت مولانا نے اپنی ذاتی رائے یہ ظاہر کی تھی کہ حکومت خود مسجد کو آثار قدیمہ کے محکمہ کے تحت لے لے، اور اس کے تحفظ اور فضا کو ہموار ودرست رکھنے لئے ایک کمیٹی مقرر کر دے، جس میں ہندوؤں کی طرف سے جنوب سے دو شنکراچاریہ اور دو مسلمان مذہبی شخصیتوں کو رکھا جائے۔ مگر حکومت نے اس مسئلہ کو سیاسی تناظر میں اس قدر الجھا کر رکھ دیا کہ اس سے اس کی بدنیتی ظاہر ہونے لگی۔ بہر حال، بورڈ کا یہ شروع سے موقف رہا ہے کہ وہ مسجد ہے اور قیامت تک مسجد رہے گی، "ناجائز طور پر مورتیوں کو رکھ دینے اور ظلم وجبر سے پوجا جاری رکھنے سے مسجد کا مسجد ہونا ختم نہیں ہوتا۔

(قرار داد بورڈ ۹ جنوری ۹۳ء)

جب پہلی مرتبہ مرکز میں بی۔جے۔پی کی حکومت بنی، تو اقلیتی فرقوں میں سراسیمگی پیدا ہونے لگی، ان کے دلوں میں مسلم پرسنل لا میں مداخلت کے خطرے پیدا ہو گئے، حضرت مولانا نے جو قائدانہ اور عالمانہ خطاب فرمایا وہ آج بھی ہمارے لئے مشعل راہ ہے، انھوں نے ۲۵ اپریل ۱۹۹۸ء کی مجلس عاملہ میں کہا کہ:۔

"موجودہ حالات میں ہمیں مایوس اور شکستہ دل ہونے کی ضرورت نہیں، اس حقیقت کو ہم پیش نظر رکھیں کہ اسلام اس ملک میں یونہی نہیں آیا، بلکہ تقدیر الٰہی کے ساتھ آیا ہے، بلکہ اس ملک میں اسلام کو بھیجا گیا، اللہ نے اپنی رحمت، تائید اور اپنی نصرت کے ساتھ اسلام کو بھیجا ہے، یہ دین یہاں سے ختم نہیں ہوگا۔"

(ماخوذ از کارروائی رجسٹر مجلس عاملہ بورڈ ۲۵ اپریل ۱۹۹۸ء دہلی)

پھر ایک دفعہ لکھنؤ کی مجلس عاملہ میں بڑے کرب اور تڑپ کے ساتھ فرمایا کہ:۔

"اس وقت ہندوستان میں دعوت اسلامی کو نقصان پہونچانے اور گمراہی کی طرف لے جانے والی طاقتیں بہت سرگرم عمل ہیں، اور ہندوستان کو دوسرا اسپین بنانے کی کوشش ہو رہی ہے، لہٰذا ہمارے ارکان حالات کے اتار چڑھاؤ پر اپنی نگاہ رکھیں۔ اور مایوس نہ ہوں۔"

(ماخوذ از کارروائی مجلس عاملہ بورڈ سوم دسمبر ۱۹۹۶ء لکھنؤ)

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے عہد صدارت میں بورڈ کے طریقۂ کار اور دائرۂ عمل میں بڑی وسعت ہوئی، اصلاح معاشرہ کی تحریک ہندگیر پیمانے پر چلائی گئی، خاص کر ۲۴ نومبر ۱۹۹۵ء سے ۳۰ نومبر ۱۹۹۵ء تک ملک کے بڑے بڑے شہروں "تحفظ شریعت ہفتہ" منایا گیا، جس سے مسلمانوں میں اسلامی بیداری آئی، اسی طرح مسلمانوں کو اپنے عائلی مسائل کے حل کے لئے نظام قضاء کے قیام پر زور دیا، اور اس کے لئے رائے عامہ ہموار کی گئی، اس جد وجہد کے نتیجہ میں ملک کے بڑے اور اہم شہروں میں جیسے جنوبی دہلی، تھانہ (بمبئی) اکولہ، اندور وغیرہ میں دار القضاء کا قیام عمل میں آیا، ایک عرصہ سے ایک ایسے قانون فقہ اسلامی کی تدوین وترتیب کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی جس کے ذریعہ ملک کی عدالتیں اور قانون داں حضرات اس سے استفادہ کر سکیں، چنانچہ حضرت مولانا کی سرپرستی اور حضرت امیر شریعت بہار واڑیسہ مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ کی رہنمائی میں بورڈ کے ممتاز فقہاء کرام کی ایک کمیٹی تشکیل دی گئی، اور تدوین کا کام کیا گیا۔ بحمد اللہ اس وقت وہ مرتب شدہ حالت میں موجود ہے، اس کی طباعت واشاعت کا نظم کیا جا رہا ہے، حضرت مولانا نے اپنا عالمانہ اور فاضلانہ مقدمہ بھی سپرد قلم کر کے اس کمیٹی کے کنوینر کے حوالہ کر دیا ہے۔ مگر افسوس کہ ان کی زندگی نے وفانہ کی اور اس کی طباعت سے پہلے وہ اللہ کو پیارے ہو گئے، دہلی میں مرکزی دفتر کے لئے ایک کشادہ فلیٹ بھی حضرتؒ کے ایماء پر خریدا جا چکا ہے۔

حضرت مولانا علیہ الرحمہ نے سترہ سال تک بورڈ کی قیادت وصدارت کا فریضہ بحسن وخوبی انجام دیا۔ اور اس عرصہ میں برصغیر ہند وپاک

میں اٹھنے والے تمام فتنوں کا پوری پامردی سے مقابلہ کیا۔ انھوں نے ۸ رسال تک مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ کی جنرل سکریٹری شپ کے زمانے میں اور اور ۹ سال تک موجودہ جنرل سکریٹری مولانا سید نظام الدین کے عہد میں مسلم پرسنل لا بورڈ کی صدارت کی ان دونوں بزرگوں کے ساتھ ذہنی وفکری ہم آہنگی اور تعاون سے انھیں بڑی تقویت ملی، اور دنیا نے دیکھ لیا کہ ان کی قیادت سے بورڈ میں جتنا اعتماد و وقار پیدا ہوا، ملک کی تاریخ میں اتنا اعتماد کسی اور جماعت کو حاصل نہیں ہوا، حالیہ دنوں میں بورڈ کا تیرہواں اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا، صدر محترم اپنی شدید علالت اور ضعف و پیرانہ سالی کی وجہ سے اجلاس میں شریک نہیں ہو سکتے تھے۔ اس کے باوجود اجلاس میں اتفاق رائے سے آپ ہی کو بورڈ کا صدر منتخب کیا گیا، بعض ارکان نے بالکل سچ کہا کہ آپ کی ذات اور شخصیت سے بورڈ کا وقار قائم ہے، بورڈ کے اس افتتاحی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے مولانا مجاہد الاسلام صاحب قاسمی قاضی شریعت نے فرمایا تھا کہ :۔

"بورڈ کے موجودہ صدر مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی ذات والا صفات عالم اسلام کے لئے عموماً اور مسلمانانِ ہند کے لئے خصوصاً بہت بڑی نعمت ہے، جو اول دن سے اس کارواں کے سالاروں میں رہے ہیں، اور حضرت قاری صاحبؒ کی وفات کے بعد آپ ہی کی قیادت میں کامیابی کے ساتھ ہم یہ سفر طے کر رہے ہیں، شاہ بانو کیس اور بابری مسجد جیسے اہم مسائل میں ان کی مدبرانہ سرپرستی نے ہمیں صحیح سمت عطا کی، اور اس وقت نہ صرف مسلمانانِ ہند بلکہ عالم اسلام کے لئے وہ ایک بڑی ضرورت تھی۔"

(ماخوذ از خطبۂ افتتاحیہ ص۱۲ تیرہواں اجلاس بورڈ ۲۸، ۲۹، ۳۰ ر اکتوبر ۱۹۹۹ء بمبئی)

حقیقت بھی یہی ہے کہ حضرت مولانا علیہ الرحمہ کی فکری اور حکیمانہ قیادت سے مسلم پرسنل لا بورڈ کو نئے افق اور نئی وسعتیں عطا ہوئیں۔ یہ بورڈ کی ہی خوش قسمتی تھی کہ اس کو ایک ایسا قائد ملا، جس نے تمام مسلک و مشرب اور فکر و خیال کے علما، ودانشوروں کو نظم واتحاد کے ساتھ ایک دھاگے میں پرودئے رکھا، اور ملت اسلامیہ کے دلوں میں اپنا وقار واعتماد قائم رکھا۔ مگر افسوس، صد افسوس کہ ملت اسلامیہ کی عظمت و حرمت پر مر مٹنے کا جذبۂ صادق رکھنے والا یہ مردِ مؤمن ۳۱ ر دسمبر ۱۹۹۹ء مطابق ۲۲ ر رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ کو اس وقت اپنے مالک حقیقی سے جا ملا جبکہ اس صدی کا آخری سورج نصف النہار کو پہونچ چکا تھا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ایک طرف ماہ وسال کے پیمانے سے ایک عہد کا خاتمہ ہو رہا تھا تو دوسری طرف علم وفضل کا چراغ اور فکر ونظر کا ایک عہد اور ایک دور اپنے اختتام کو پہونچ چکا تھا۔ اللہ تعالیٰ حضرت علیہ الرحمہ کی دینی وعلمی، ملی وسماجی خدمات کو قبول فرمائے اور پوری قوم کی طرف سے ان کو جزائے خیر دے۔ اللہ پاک ان کی قبر پر انوار رحمت کی بارش فرمائے اور اخروی نعمتوں سے مالا مال کرے۔ نیز مسلمانوں کی اس اجتماعی تنظیم کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین ؎

وقت فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نور توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

حلوی قطعۂ تاریخ

۱۴۲۰ھ

• مولانا محمد عثمان معروفی

رخصت ہوئے جہاں سے حضرت علی میاں
قرآن پڑھ رہے تھے ہوئے واصلِ جناں
انیس سو سے اوپر چودہ سنہ ولادت
انیس سو سے اوپر ننانوے میں رحلت
بائیس ماہِ رمضاں دن جمعۂ مبارک
چودہ سو بیس ہجری رحلت ہوئی اچانک
عثمان سالِ رحلت کہہ دولتِ سعید
۱۹۹۹ء
خلدِ بریں میں داخل حق منزل حمید
۱۴۲۰ھ
محمد عثمان معروفی کان المعیدلہٗ
۱۴۲۰ھ
بقلم مداح محمد عثمان اعظمی
۱۹۹۹ء

تاریخ وفات

از: — مجیب احمد کرنیل گنجوی

داعی الی اللہ × عالم جلیل × مولانا السید
۲۳۳ — ۲۱۴ — ۱۹۲
ابوالحسن علی میاں × حسنی ندوی × علیہ الرحمۃ
۷۹۴ — ۱۹۸ — ۳۶۸
۱۹۹۹ء

فکر چوں کردم زوال آمد صدا
شو مجیب از سال ہجری باخبر
بست و دو رمضان بود روز جمعہ
شد نہاں خورشید دیں چوں از نظر
اک الف زاید کن و بازش بخواں
شیخ العالم سید والا گہر
۱۰۸۲ ×۱ — ۳۳۷
۱۴۲۰ھ

دینی تحفظ: آپ کو اپنی نسل کے دینی تحفظ اور اسلام سے اس کے ربط و تعلق کا انتظام کرنا ہے اور یہ ذمہ داری ہے غذا، لباس، دوا، علاج، تعلیم اور معاش سے زیادہ ضروری ہے

(مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ)

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ اور دینی تعلیمی کونسل

عظیم قائد عظیم تحریک

ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی سکریٹری دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش

بیسویں صدی کی آخری ساعتیں عالم اسلام ملت اسلامیۂ ہند اور ملک و قوم کے تعلق سے جیسی الم ناکی پر ختم ہوئیں اس کی کیفیت اور رنج و غم کی وہ شدت تاریخ میں کبھی فراموش نہیں کی جاسکتی ہے

مصائب اور بھی تھے پر دل کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہوگیا ہے

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اللہ کے حکم سے سفر آخرت اختیار کیا تو موجودہ حالات کی نزاکت اور مستقبل کی تشویشناک صورت حال میں حساس قلب و نظر نے یہ محسوس کیا کہ دردمندی، دل سوزی اور غیرت و حمیت، جرأت ایمانی اور شان امتیازی کے ساتھ ملت کی چارہ گری اور مسیحائی کی وہ آخری شمع بھی گل ہوگئی جو منارۂ نور کی مانند افراد اور جماعتوں نیز ملک و ملت کے مختلف قافلوں کی رہنمائی کے لئے بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی کی حیثیت رکھتی تھی۔

حضرت مولانا کی سیرت و شخصیت کے جلوۂ صدرنگ میں اقبال داوج کمال، فکر و خیال کے جلال، و جمال اور حیات و خدمات کے نقوش لازوال نمایاں ہیں۔ ان ساری کیفیات میں ان کا نمایاں ترین وصف وہ روشن ضمیری تھی جو معرفت، معنویت، حقیقت، صداقت اور عظمت سے مزین کی گئی تھی۔ ابتدائے عمر میں مشائخ وقت نے اسے محسوس کر لیا تھا اور ان کی نگاہ رمز شناس نے اس جوہر آبدار کو تلاش کر لیا تھا۔ ہماری خوش بختی تھی کہ ہمیں ایسی عظیم شخصیت کے سائے میں زندگی گذارنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ سفر و حضر، خلوت و جلوت میں ہم رکابی اور استفادہ کی توفیق ملی۔ وہی بارگاہ تھی جہاں سے ایمان و یقین کے چشمے ابلتے تھے، ذہنوں کو حرارت فکر میسر آتی تھی، دلوں کے اضطراب کو دور کرنے کے لئے سامان تقویت وہیں سے ملتا تھا۔ اقبالؔ کی زبان میں جس کی آواز فضائے دشت میں بانگ رحیل سمجھی جاتی تھی۔ جس کی خاموشی میں افکار کا ہجوم جس کی گفتار میں گنجینۂ معنی کا طلسم "وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہباں" بھی تھا، ذاتی زندگی میں بوریہ نشینی کی عظمتوں کا امین و پاسباں بھی تھا، یہی وصف تھا جس نے تمام تنظیموں اور تحریکوں میں انھیں وقار و اعتبار بخشا تھا۔

حضرت مولانا کا علمی اور دینی ربط و تعلق بے شمار تنظیموں اور تحریکوں سے تھا لیکن ان میں چند دعوتی تحریکیں ایسی تھیں جو ان کے ذہن و فکر کا حصہ بن گئی تھیں۔ دینی تعلیمی کونسل سے حضرت مولانا کا رشتہ اسی طرح کا تھا اس تنظیم و تحریک نے آزاد ہندوستان میں نوجوان نسل کے اندر دین کو باقی رکھنے کا جو غیر معمولی کارنامہ انجام دیا ہے وہ ملت اسلامیہ کی تاریخ کا روشن ترین باب ہے۔ الحاد و ارتداد کی فضا میں توحید و رسالت اور آخرت کے عقیدہ کو اجاگر کرتے ہوئے پوری ملت کو اس راہ میں ہر قربانی کے لئے تیار کر دینا............ اپنے ملی تشخص کو باقی رکھنے کا فیصلہ کرنا، زبان، تہذیب اور معاشرتی ترجیحات کے ساتھ زندہ رہنے کا عزم کرنا............... باد صرصر کے مقابلہ میں سینہ سپر ہو جانا اور طویل جدوجہد کے بعد ایک پوری نسل کو محفوظ کر دینا دینی تعلیمی کونسل کی شناخت ہے۔ صلہ و ستائش سے بے نیاز اس تحریک نے .... ملک میں پہلی مرتبہ تاریخ سازی کا مرقع پیش کیا ہے۔ حضرت مولانا نے ایک موقع پر فرمایا تھا:-

"جب کبھی ہندوستانی مسلمانوں کی ذہنی و فکری و تعلیمی تاریخ بلکہ ان کی ملی تاریخ دیانتداری کے ساتھ لکھی جائے گی تو اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکے گا کہ اس چالیس سال کی مدت میں دینی تعلیمی کونسل نے کیا فکر دیا، کیا لٹریچر پیدا کیا کس طرح ہندوستانی مسلمانوں کے دینی تعلیمی مقدمہ کو مضبوط دلائل سے ثابت کیا۔"

بچاس برس قبل دینی تعلیمی تحریک کا آغاز قاضی محمد عدیل عباسی مرحوم نے اپنے ضلع بستی میں کیا تھا، ۱۹۵۹ء کی آخری تاریخوں میں (۳۰،۳۱ دسمبر ۱۹۵۹ء) قاضی صاحب مرحوم کی دعوت پر ریاستی دینی تعلیمی کانفرنس کا انعقاد بستی ہی میں ہوا حضرت مولانا علی میاںؒ نے اس کی صدارت فرمائی تھی اور اسی موقع پر دینی تعلیمی کونسل کا قیام عمل میں آیا تو متفقہ طور پر حضرت مولانا اس کے صدر منتخب ہوئے اس وقت سے لے کر تادم آخر وہ صدر کونسل کی حیثیت سے رہنمائی اور سرپرستی فرماتے رہے۔

چالیس برس کی اس مدت میں تحریک

کے لئے ہمہ وقت کی فکرمندی، ہندوستان میں نوجوان نسل کے ایمان وعقیدہ کی حفاظت، اس کی اہمیت اور افادیت پر اظہار خیال، در حالات حاضرہ پر مومنانہ شان سے جرأتمندانہ تنقید وتبصرہ کی ایک تاریخ ہے جو حضرت مولانا علی میاں کے نام نامی سے مزین ہے۔

دینی تعلیمی کونسل نے اپنے قیام سے اب تک مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم پر اپنی توجہ مرکوز رکھی ہے۔ آزاد ہندوستان میں یہ واحد تنظیم ہے جس نے اپنے گردوپیش سے یکسو ہوکر تعلیم کے میدان میں اپنی سرگرمیوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ مشہور مجاہد آزادی اور مجاہد اردو قاضی محمد عدیل عباسی صاحب مرحوم کی دعوت پر اکابرین ملت اور دانشوران گرامی جمع ہوئے تو سب کے سامنے صرف ایک سوال تھا کہ آئندہ اپنی نوجوان نسل کو اس فتنے سے کیسے محفوظ رکھا جائے جو خصوصی طور پر ریاست اتر پردیش میں تعلیم کی راہ سے داخل ہو رہا تھا۔

سرکاری اسکولوں میں جو کچھ پڑھایا جانے لگا وہ مسلمانوں کے لئے تشویشناک تھا۔ قاضی صاحب مرحوم نے بہت پہلے اس کا اندازہ کر لیا تھا اور اپنے ضلع کے مسلمانوں کو یہ پیغام دینا شروع کر دیا تھا کہ وہ اپنے بچوں کی ابتدائی تعلیم کے مکاتب قائم کریں جہاں اردو وقرآن پاک کی تعلیم کے ساتھ عصری مضامین کی تعلیم کا بھی بندوبست کیا جائے۔ انھوں نے اسی عنوان سے مسلمانوں کے ذہنوں کو تیار کیا اور ضلعی سطح پر اس تحریک کو پھیلا دیا۔ یہ بالکل نئے انداز کا کام تھا جس نے سب کو متوجہ کیا اور یہ محسوس کیا جانے لگا کہ آئندہ اسی راہ سے اسلامی تشخص اور اپنی مادری زبان اردو کو بچایا جا سکتا ہے۔

۶ر ستمبر ۵۳ء کو ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندویؒ نے طلبا کو "رسالت" کے موضوع پر خطاب فرمایا۔ بقول قاضی صاحب یہ دونوں تقریریں اس درجہ جامع اور پر اثر تھیں کہ طلبا میں دین سیکھنے اور سمجھنے کا کافی جوش و جذبہ پیدا ہوگیا۔

۹ر دسمبر ۵۳ء کو حضرت مولانا علی میاںؒ نے اسی طرح کے جلسہ میں نماز کی اہمیت اور فضیلت پر نہایت بلیغ تقریر فرمائی۔ طلبا کی سیرت سازی اور ذہنی تربیت کے لئے ایک ایسے دار المطالعہ کی ضرورت بھی محسوس کی گئی جہاں "تفسیر، سیرت، اخلاق اور آداب کی کتابیں ہوں اور نوجوان طلبا ان سے استفادہ کر سکیں۔

"چنانچہ طلباء کے اجتماع کی طرح اس دار المطالعہ کے بنیادی خیال پر بھی مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے اپنی تائید کی مہر ثبت کی اور جس طرح طلبا کی تحریک کو چلانے کے لئے اپنا قیمتی وقت دیا تھا اس کام کے لئے بھی اپنی آمادگی ظاہر کی۔ ۱۰ر دسمبر ۵۳ء کو شیخ کرم حسین صاحب مختار کی کوٹھی میں ایک جلسہ شہر کے پڑھے لکھے لوگوں کا کیا گیا اور جناب مولانا ابو الحسن علی ندوی نے اپنی ایک نہایت درد انگیز تقریر کے ساتھ اس دار المطالعہ کی بنیاد رکھی"۔

مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ اور مولانا محمد منظور نعمانیؒ اپنی علمی، دینی، تصنیفی اور ملکی وقومی مصروفیات کے باوجود ابتدا سے قاضی صاحب مرحوم کی تحریک اور سرگرمیوں سے واقف اور شریک تھے۔ وہ ان دونوں بزرگوں کی رہنمائی اور سرپرستی کے معترف اور قدرداں تھے۔ انھوں نے اپنی تحریر میں اس کا اظہار کیا ہے:۔

"ہم مولانا محمد منظور نعمانیؒ اور مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ کے بھی انتہائی شکرگزار ہیں۔ ان دو بزرگ ہستیوں نے کارکنان انجمن کے دلوں میں کام کی لگن پیدا کی اور ہمیشہ ہماری ہمت افزائی اور رہنمائی کرتے رہے"۔

حضرت مولانا علی میاںؒ نے (کاروان زندگی جلد اول ص ۴۵۹ تا ص ۴۶۲) خود اپنے قلم سے اس تحریک اور تاریخ کو محفوظ کیا ہے۔ اس میں صورت حال کی صحیح عکاسی محرکات اور عوامل کا تجزیہ تحریک کی ضرورت اور اہمیت، ملی تشخص، غیرت وحمیت رکھنے والی مسلم قوم کی ذمہ داریاں، اس کی خیر خواہی اور رہنمائی اور وطن دوستی کے سچے جذبات کی قدردانی مستقبل میں ایک زندہ باوقار اور داعی ملت کی حیثیت سے اس ملک میں مسلمانوں کے وجود وبقا کا انحصار اس پیغام داعلان میں تلاش کر کے نمایاں کیا گیا ہے جو دینی تعلیمی تحریک اور دینی تعلیمی کونسل کے وجود وتاسیس میں پوشیدہ رہا ہے۔

"ہندوستان کے آزاد ہونے کے بعد جہاں تک ملت اسلامیہ ہندیہ کا تعلق ہے اس کے اہم ترین اور موت وحیات کا فیصلہ کرنے والے مسائل میں مسلمانوں کی نئی نسل کا اسلام کے بنیادی عقائد، ایمانیات اور اپنے ملی تشخص اور امتیاز پر برقرار رہنے کا مسئلہ تھا۔

تقسیم کے فوراً بعد ہی بیک ریڈروں میں ہندو دیومالا کی باتیں اور مشرکانہ کہانیاں اور اسباق صاف نظر آنے لگے اور یہ نظر آنے لگا کہ اگر یہ سلسلہ چند سال اور جاری رہا تو ملت ابراہیمی اور امت محمدی کی نئی نسل اسلام کے عقیدۂ توحید خالص سے ناآشنا یا منحرف اور شرک جلی اور کفریہ عقائد کی معتقد یا ان سے متأثر ہو جائے گی۔

اس خطرہ کا واضح طور پر احساس سب سے پہلے قاضی محمد عدیل عباسی صاحب کو ہوا جو ایک ممتاز نیشنلسٹ اور کانگریسی مسلمان تھے۔ اپنی وسیع واقفیت حقیقت پسندانہ ذہن اور اسلامی ضمیر و احساس کی وجہ سے انھوں نے اس خطرہ کو نہ صرف یہ کہ جلد ہی بھانپ لیا بلکہ یہ ان کے ذہن و اعصاب پر ایسا مستولی ہو گیا کہ انھوں نے اپنی پوری توانائی اور اپنی تمام ذہنی صلاحیتیں اس پر مرکوز کر دیں وہ عرصہ تک اپنے ضلع کے حدود ہی میں اس خطرہ کا مقابلہ اور مکاتب و مدارس قائم کرنے کا کام خاموشی سے کرتے رہے۔ وہ اسی دائرہ کے اندر عرصہ تک محدود ہو کر کام کرنا چاہتے تھے لیکن جب مولانا محمد منظور نعمانی راقم سطور اور بعض دوسرے دوستوں کے سامنے وضاحت کے ساتھ یہ مسئلہ آیا تو ہم نے ان سے اصرار کیا کہ وہ اپنے اس دائرہ سے باہر قدم نکالیں اور اس کو کم سے کم صوبائی پیمانہ پر انجام دینے کی کوشش کریں۔

ہماری گفتگوؤں کے بعد وہ اس پر آمادہ ہو گئے اور انھوں ۳۰، ۳۱ر دسمبر ۱۹۵۹ء اور یکم جنوری ۱۹۶۰ء کی تاریخوں میں بستی میں ایک صوبائی دینی تعلیمی کانفرنس بلائی۔"

مولانا محمد منظور نعمانی نے اپنی سوانح حیات تحدیث نعمت میں اس تحریک کے پس منظر اس کے آغاز و قیام اور اپنے ربط و تعلق پر روشنی ڈالی ہے:۔

"۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم کے بعد ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کے لئے جو مسائل پیدا ہوئے ان میں ایک نہایت سنگین مسئلہ یہ بھی تھا کہ ایک طرف تو تعلیم لازمی کی جا رہی تھی دوسری طرف اردو کی تعلیم ختم کردی گئی تھی اور پھر جو کچھ پڑھایا جا رہا تھا اس میں ہندو دیو مالا خوب خوب شامل کی گئی تھی اس صورت حال نے ان تمام مسلمانوں کو بے چین کر دیا تھا جو اس کے نتائج کا اندازہ کر سکتے تھے اللہ تعالیٰ غریق رحمت کرے قاضی محمد عدیل عباسی کو کہ انھوں نے اس خطرناک صورت حال سے نپٹنے کے لئے ایک عملی اسکیم تیار کر کے اپنے ضلع بستی میں اس کے مطابق کام شروع کر دیا۔

مجھے محسوس ہوا ملک کے موجودہ حالات میں یہ ہماری نئی نسل کے دین کی حفاظت کا انتظام ہے اور اللہ کی طرف سے قاضی صاحب کو خاص طور پر اس کام کی توفیق عطا ہوئی ہے۔

میں نے رفیق محترم مولانا علی میاں سے یہ سب ذکر کیا ـــ میرا اور علی میاں کا ان سے اصرار جاری رہا کہ وہ یوپی کی سطح تک کام کو پھیلانے پر بہر حال غور کریں ـــ بالآخر ایک وقت آیا کہ انھوں نے کام کے اس پھیلاؤ کے لئے ہمت کر لی۔ یہ ۱۹۵۹ء کی بات ہے۔ ان کے شہر بستی میں ریاستی سطح کی ایک کانفرنس بلائی گئی اور دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش کا قیام عمل آیا مولانا علی میاں کو کونسل کا صدر منتخب کیا گیا اور قاضی صاحب نے جنرل سکریٹری کی ذمہ داریاں قبول کر لیں۔"

اس تاریخ ساز کانفرنس کا اعلان ہوا تو پورے ملک میں اس کے انعقاد کا زبردست خیر مقدم کیا گیا۔ مسلمانوں کی تمام جماعتوں تنظیموں اور تحریکوں کے سربراہوں کی طرف سے تعاون کا اظہار رہا۔ مسلکی اختلافات سے اوپر اٹھ کر صدق دلی کے ساتھ یہ محسوس کیا گیا کہ آزاد ہندوستان میں دین کی حفاظت اور اس کی آبیاری کا ایک موثر ذریعہ مل گیا ہے۔ کانفرنس کے داعی قاضی محمد عدیل عباسی مرحوم نے لکھا ہے:۔

"صوبائی دینی تعلیمی کانفرنس جو ۳۰، ۳۱ر دسمبر ۱۹۵۹ء کو زیر صدارت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی بستی میں منعقد ہوئی اس نے ایک نیا خیال ایک نیا جذبہ اور ایک نیا حوصلہ ملت اسلامیہ ہند کو دیا جیسے ہی اس کانفرنس کے انعقاد اور اس کے فرائض و مقاصد کا اعلان ہوا تمام ہندوستان کے ہر طبقۂ خیال کے علماء، وزعماء کے دماغوں پر تحریک کا تخیل چھا گیا۔ بلا امتیاز جماعت ہر اہل الرائے اور دانشور کو اس میں مدعو کیا گیا تھا، دیوبند، ندوہ، سہارنپور، بریلی، اعظم گڑھ جامعہ ملیہ اسلامیہ، جمعیۃ العلماء ہند، جماعت اسلامی جماعت اہل حدیث، ریاست کے تمام مسلم اسکول اور کالج۔ الغرض کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جسے دعوت نہ دی گئی ہو اور الحمد للہ کہ سب نے شرکت بھی کی۔"

مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی کو بطور خاص قاضی صاحب نے کانفرنس کا افتتاح کرنے کے لئے مدعو کیا تھا لیکن متعین پروگرام کے باوجود مولانا عین وقت پر اپنی بیماری کے سبب تشریف نہیں لا سکے۔ انھوں نے قاضی صاحب کو ایک طویل گرامی نامہ ارسال فرمایا جس میں ایک جملہ ان کی فکر و دردمندی اور اس تحریک کی اہمیت اور افادیت کا مظہر تھا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ مولانا حفظ الرحمن صاحب کا وہ گرامی نامہ کانفرنس میں پڑھ کر سنایا گیا تھا اور ان کے اس جملہ نے عوام اور خواص سب کو متاثر کیا تھا۔

"کانفرنس کے اعلان نے ہندوستان کے

مسلمانوں کے ضمیر کو بیدار کر دیا ہے۔"
یہ ایک جملہ نہیں بلکہ ایک طویل تاریخ کا خوبصورت عنوان ہے اور اس بات کی علامت ہے کہ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کی مکمل ترین ملی تاریخ جب کبھی سپرد قلم کی جائے گی تو اس میں دینی تعلیمی کونسل کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکے گا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسی موقع پر حضرت مولانا علی میاںؒ کا وہ اقتباس پیش کر دیا جائے جو قاضی صاحب مرحوم کے انتقال پر "قاضی عدیل عباسی کا عظیم کارنامہ" کے عنوان سے "قومی آواز" لکھنؤ کے خصوصی ضمیمہ میں تحریر فرمایا گیا تھا:۔

"اس سے زیادہ ٹھوس، مفید اور تعمیری تحریک اور جد وجہد ادھر ایک طویل عرصہ سے مسلمانانِ ہند کی تاریخ میں وجود میں نہیں آئی۔ واقعہ یہ ہے کہ قاضی صاحب ہی کے اس درد و فکر مندی نے جو ہندوستانی مسلمانوں کی نئی نسل کے بارے میں ان کو بے چین کئے ہوئے تھی بیسیوں علماء و اہل دین کو تڑپایا اور ان کو ان کے گوشۂ عزلت سے باہر لے آئی۔ خود اس ناچیز کا شمار بھی انھیں لوگوں میں ہے اور وہ قاضی صاحب کے اس احسان کو مدت العمر تک نہیں بھول سکتا۔"

مولانا محمد منظور نعمانی نے تحدیث نعمت میں اپنے تعلق اور تأثر کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"اس تحریک میں اپنے حصہ کو میں اللہ کی ایک بڑی نعمت ہی سمجھتا ہوں اور اس کے لئے شکر گذار ہوں، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کام کے موجودہ ذمہ داروں اور کارکنوں کی ہر طرح مدد فرمائے اور یہ نہایت ضروری کام اطمینان بخش پیمانہ پر جاری ہے۔"

بستی کانفرنس میں مولانا ابو اللیث اصلاحی ندوی امیر جماعت اسلامی ہند نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا:۔

"اس کام کے لئے جماعتوں کو اپنے اصولوں میں لچک پیدا کرنی چاہئے۔"

اس کانفرنس میں مولانا سید محمد اسعد مدنی، مولانا محمد میاں، مولانا ابو الوفا شاہجہانپوری، شیخ الحدیث مولانا عبید اللہ رحمانی، مولانا نذیر احمد بنارسی، خطیب الہند مولانا عبد الرؤف جھنڈا نگری، مولانا مفتی عبد القیوم علی گڑھی، مولانا مفتی شاہ سلیم اللہ بنارسی، حیات اللہ انصاری ایڈیٹر قومی آواز بڑے جوش و اعتماد کے ساتھ شریک ہوئے تھے۔ مولانا سید احمد اکبرآبادی صدر سنی دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے کانفرنس کا افتتاح کیا۔ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب گورکھپور تک آ گئے تھے لیکن وہاں شدید بخار کی وجہ سے بستی نہیں آ سکے۔ اس کانفرنس کے کچھ دنوں بعد نوگڑھ ضلع بستی میں ایک کل ہند اہل حدیث کانفرنس ہوئی جس کا افتتاح سفیر سعودی عرب نے کیا تھا۔ مولانا عبد الرؤف جھنڈا نگری نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں دینی تعلیمی کونسل اور اس کی تحریک کا پرجوش خیر مقدم کرتے ہوئے قاضی صاحب کا نام لیا اور اقبال کا یہ شعر پڑھا تھا؎

راہِ خدا کہ عارف ذرا بہ کسے نگفت
در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید

مولانا محمود الحسن صاحب (ناظم دینی تعلیمی کونسل) نے اپنے ایک مضمون میں اس وقت کی فضا اور ماحول کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"جس وقت دینی تعلیمی کونسل نے کام شروع کیا تو اگرچہ آزادی کو دس برس سے زائد گذر چکے تھے لیکن مسلمانوں میں ہر طرف ایسا خوف و ہراس طاری تھا جس کا اندازہ آج کرنا مشکل ہے۔ جبری تعلیم کے قانون کے مفہوم کی اشاعت نے مسلمانوں کو اور بھی سراسیمہ بنا رکھا تھا، سب سے پہلا کام یہ تھا کہ اس خوف و ہراس کو دور کیا جائے، دینی تعلیمی کونسل نے اپنی تجویزوں کانفرنسوں کی تقریروں اور متعدد مطبوعہ کتابچوں کے ذریعہ مسلمانوں کو ہمت دلائی جبری تعلیم کی تشریحات کیں اور آزاد مکاتب قائم کرنے کی پکار دی۔ چنانچہ کونسل کا کام جیسے جیسے آگے بڑھتا گیا خوف و ہراس اور احساس کمتری کی فضا صاف ہوتی گئی۔"

بقول قاضی صاحب:۔

"کانفرنس کے بعد ایک ایسا جوش اور ولولہ پیدا ہوا جو کم دیکھنے میں آیا ہے۔ بہت سے لوگ کہنے لگے کہ ہم تو تھک ہار کر بیٹھ گئے تھے کہ کچھ نہیں ہو سکتا اب کام ملا اس میں گرم جوشی سے لگ جائیں گے۔ کسی نے کہا کہ عوام کے دماغوں پر ایسا اثر ہوا ہے جیسے کہ پیاسے کو پانی مل جائے۔ کچھ علماء نے کہا کہ اس تحریک میں کام کرنا جہاد کا درجہ رکھتا ہے اور کسی نے یہ بتلایا کہ اس تحریک میں حصہ لینا نفلی عبادتوں سے زیادہ باعثِ ثواب ہے۔"

دینی تعلیمی کانفرنس کے انعقاد اور دینی تعلیمی کونسل کے قیام میں اصلاً حضرت مولانا علی میاںؒ اور حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحبؒ کی مخلصانہ کوششوں کا دخل تھا اور انھیں حضرات کے اصرار کی بنا پر مسلمانوں کے سامنے وہ شاہراہِ عمل روشن ہوئی جس نے مستقبل کے مسائل کو آسان کر دیا۔ قافلہ کی ترتیب و تشکیل، سفر کا آغاز اور اس کے لئے جذبہ و شوق میں والہانہ کیفیتوں کا اظہار ہوا۔ سب سے زیادہ پرکشش اعلان یہ تھا کہ کانفرنس کی صدارت عالم اسلام کے نامور خطیب اور عظیم مفکر حضرت

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کریں گے۔ خود مولانا نے کاروانِ زندگی میں تحریر فرمایا ہے۔

"اس پہلی کانفرنس کی صدارت کے لئے قرعۂ فال میرے نام نکلا کونسل کی صدارت کے لئے بھی میرا ہی انتخاب ہوا۔ میں نے عجلت میں سہارنپور اور ہردوئی کے درمیان ٹرین ہی پر خطبہ لکھا جو چھپ گیا۔ یہ کانفرنس اور خطبہ ایک طرح سے اس سفر اور سمت میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور ہندوستانی مسلمانوں کے ملی تشخص اور ان کے بنیادی مسائل کی تاریخ لکھنے والا اس کو نظر انداز نہیں کرسکتا تقسیم ہند کے بعد مشکل سے دو ایک تحریکیں ہوں گی جو دینی تعلیمی کونسل کی تحریک کی طرح ٹھوس بنیادی اور وقت کے اہم ترین مسئلہ پر شروع کی گئی ہوں گی۔

حضرت مولانا علی میاںؒ نے قاضی صاحب کو غیور اور باحمیت مسلمان اور مولانا محمد منظور نعمانی نے انھیں راسخ العقیدہ اور صاحب استقامت مردِ مومن لکھا ہے۔

قاضی محمد عدیل عباسی مرحوم کے ذہن وفکر میں دینی تعلیمی تحریک اور مکاتب کے قیام کا خاکہ اور منصوبہ نمودار ہوا اور جس وقت بے سروسامانی اور غیر یقینی مستقبل کی کیفیت میں انھوں نے اپنے گاؤں میں سب سے پہلے ایک مکتب کی بنیاد رکھی تو اندازہ بھی نہیں تھا کہ یہ ایک بڑی تنظیم و تحریک کا سنگ بنیاد رکھا جارہا ہے۔ اس وقت کسی کو خبر بھی نہیں تھی کہ اس مدھم روشنی سے ہزاروں چراغ روشن ہوں گے اور یہی چراغ فضا اور ماحول کی تاریکیوں کو دور کرنے کا ذریعہ بنے گا۔

مولانا علی میاںؒ اور مولانا منظور نعمانیؒ صاحبؒ کے تقاضے سے مجبور ہوکر قاضی صاحب نے بستی میں کانفرنس کا ارادہ کرلیا تو ایک خواب دیکھا کہ آبائی گاؤں میں اپنے دروازے پر ایک بڑا دینی اجتماع کیا ہے۔ والد محترم کے ہاتھوں سے تعمیر کی گئی مسجد میں ظہر کے وقت ایک کثیر مجمع ہے جس میں حضراتِ صحابہ کرام کی کثیر تعداد بھی موجود ہے۔ یہ احساس غالب تھا کہ اللہ نے اس سرزمین کو منور کردیا اسی درمیان دیکھا کہ وضو سے فارغ ہوکر حضرت علیؓ نے قاضی صاحب سے فرمایا "جلسہ بہت کامیاب رہا"۔

قاضی صاحب نے اس خواب کا ذکر مولانا علی میاں اور مولانا منظور نعمانی صاحب سے کیا تھا لیکن یہ گذارش بھی کی تھی کہ یہ حضرات اپنی کسی تقریر وتحریر میں اس کا اظہار نہ فرمائیں۔ مولانا علی میاںؒ کی آخری علالت کے دوران کسی خاص موقع پر مہمان خانہ میں یہ خواب اور واقعہ میں نے عرض کیا تو حضرت نے فرمایا کہ قاضی صاحب نے ان سے اس کا ذکر کیا تھا۔ حضرت مولانا نے اسی وقت اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے اظہار تشکر کے طور پر فرمایا کہ اللہ نے اس تعلق اور مناسبت سے ابوالحسن علی کو بھی یہ سعادت نصیب فرمائی۔ ایک جملہ اکثر فرماتے تھے اس وقت بھی فرمایا کہ قاضی صاحب اور تمہارے والد مولانا محمود الحسن صاحب کے لئے بلاناغہ میں ایصال ثواب کرتا ہوں۔ یہ میرے معمولات میں شامل ہے اس کا اہتمام میں نے بیت اللہ اور مسجد نبوی میں بھی کیا ہے اللہ نے ان سے بڑا غیر معمولی کام لیا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ حضرت مولاناؒ اس وقت کسی اور کیفیت میں تھے جس کا تاثر چہرے پر نمایاں تھا۔ پھر فرمایا "تم اس کام میں لگے ہو یہ بڑی سعادت کی بات ہے تم تحریک کی بہترین ترجمانی کرتے ہو"۔ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا کے ان دعائیہ کلمات اور تاثرات کو میرے حق میں قبول فرمائے اور مجھے خدمت کے مواقع میسر آتے رہیں۔ میں اپنے رب کے حضور میں سجدہ ریز ہوں کہ خود حضرت مولانا نے مجھے دینی تعلیمی کونسل کی مجلس عاملہ کا رکن اور پھر اس کا سکریٹری نامزد کیا۔ اے اللہ مجھے توفیق عطا فرما کہ میں اپنے حضرت والا کی شفقتوں اور ان کی نگاہِ انتخاب کی لاج رکھ سکوں۔ اے اللہ میرے بزرگوں نے جس دینی تحریک میں اپنی عمریں کھپا دیں مجھے بھی اس میں آخر تک لگے رہنے کی سعادت نصیب فرما، اے اللہ جس گھر اور گاؤں سے اس کا آغاز ہوا وہاں اس کی فکر باقی رہے اور محض اللہ کی عنایت سے جو شانِ امتیازی ان کے حصہ میں آئی ہے اس کی قدر وحفاظت کا جذبہ بیدار رہے اور اس کی سچی توفیق اس گھر کے ہر فرد اور گاؤں کے ہر مسلمان کو ملتی رہے۔

قاضی محمد عدیل عباسی مرحوم کو مطالعہ اور مشاہدہ کے بعد جو راہِ حق نظر آئی تھی اس کا مظاہرہ دینی تعلیمی تحریک اور دینی تعلیمی کونسل کی شکل میں پورے ملک کے سامنے اس وقت ہوا جب انھوں نے حضرت مولانا علی میاںؒ کی صدارت میں اپنے شہر بستی میں وہ ریاستی دینی تعلیمی کانفرنس منعقد کی جسے تمام بزرگانِ ملت اور خود حضرت مولانا علی میاںؒ نے وقت کی سب سے بڑی ضرورت قرار دیا۔ مولانا اکثر فرماتے تھے کہ یہ کام قربِ الٰہی کا ذریعہ ہے۔

بستی کانفرنس کا خطبۂ صدارت جو حضرت مولانا علی میاں نے "عجلت میں سہارنپور اور ہردوئی کے درمیان ٹرین پر لکھا تھا" وہ ایک ایسی تاریخی دستاویز ہے جس کے بغیر آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ مکمل نہیں کہی جاسکتی۔ دینی دعوت وپیغام اس کی ابدیت اور عظمت اس ملک میں مسلمانوں کی حیثیت اور ان کی ذمہ داریاں ان کے سامنے روز پیش آنے والے مسائل کا مثبت ذکر اور ان پر مومنانہ شان سے اظہار خیال، حکومت کی عدم توجہی دستور ہند اور سیکولرزم کے برعکس حکومت کے شعبۂ تعلیم کے غیر اخلاقی اور غیر جمہوری اقدام پر بے لاگ تبصرہ ایک مردِ مومن کی صدائے

حق ایک مجاہد کی شانِ حریت اور جذبۂ جہاد ایک مورخ کی نگاہِ دوررس اور انداز استدلال ایک محب وطن کی لازوال حب الوطنی ایک بیقرار قلب ونظر کا آئینہ جلال وجمال پوری طرح حضرت مولانا علی میاںؒ کے اس پہلے خطبۂ صدارت میں روشن ہے۔ علامہ شبلی اور علامہ سید سلیمان ندویؒ کے ادب وانشا، اور زبان وبیان کے دلکش انداز واسلوب کی جو وراثت ندوۃ العلماء کے حصہ میں آئی اس میں حضرت مولانا نے اپنے منفرد لب ولہجہ اور اندازِ نگارش سے چار چاند لگا دیئے۔ یہ خطبہ اس لحاظ سے بھی ایک ادبی اور علمی شاہ کار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے خزانۂ غیب سے جن بزرگوں پر روحانیت کی بارش کی ہے ان میں ہمارے حضرت کا نام نامی نمایاں ہے لیکن انھوں نے کبھی خاک کی آغوش میں تسبیح ومناجات پر اکتفا نہیں کی بلکہ وسعتِ افلاک میں تکبیر مسلسل کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ میں جن محرکات اور سنجیدہ ترین عوامل کا ذکر ہوگا ان میں یہ خطبۂ صدارت یقیناً سنگ میل قرار دیا جائے گا۔

حضرت مولاناؒ نے اس کے بعد اپنے خطبہ میں اس طرح کے حوالے پیش کئے ہیں جن سے مذکورہ حقائق کی نشاندہی اور درد وکرب کی ترجمانی ہوتی ہے۔ مولانا نے بڑی جرأت اور بلند آہنگی سے اپنے خطبہ میں مسلمان دانشوروں، بزرگوں، صوفیا اور جلیل القدر فاضل باکمال مصنفین اور بلند پایہ محققین کا ذکر کیا جنہوں نے اس وقت کی پوری متمدن دنیا کے ذہن پر اپنی بلندی وانفرادیت کا نقش قائم کر دیا۔ انھیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جن کا خمیر اسی سرزمین سے اٹھا اور جنہوں نے اپنی ساری صلاحیتیں اس ملک کو زرخیز بنانے میں صرف کیں اور پھر اسی سرزمین میں آسودۂ خاک ہیں اور ہم جن کی ہمت وبصیرت سے اپنی زندگی کا چراغ جلا سکتے اور اس کی لو بڑھا سکتے ہیں۔

حضرت مولانا نے طویل خطبہ میں جو کچھ فرمایا اس میں چند بنیادی اور اہم باتیں شاہ سرخیوں کے طور پر اس طرح نظر آتی ہیں:-

- "ہمارا ملک اس وقت ایک عبوری دور سے گذر رہا ہے جس میں جذبات عقل پر، فرقہ پرستی حب الوطنی پر تنگ نظری وسیع النظری پر اور نسلی ولسانی تعصبات انسان دوستی پر غالب ہیں۔
- اپنے ہاتھوں سے اپنی تاریخ کے اوراق کو چاک کیا جارہا ہے۔
- ہندوستان کی تاریخ میں ایک ایسا خلا پیدا کیا جارہا ہے جو صدیوں کو محیط ہے۔
- اس ملک میں مسلمانوں کی حکومت وتہذیب کا ایک دور گذرا ہے جو چھ سات سو برس کی طویل مدت ہے یہ ہندوستان کی تہذیب وترقی کا ایک شاندار دور ہے جس کو ہندوستان کی تاریخ سے خارج کرنا اس ملک کے ساتھ بڑی ناانصافی اور وطن دشمنی ہے۔
- اس ملک کا ضمیر زندہ اور بیدار ہے۔
- شریف النفس اور نیک طینت انسانوں کی اس ملک میں بہت بڑی تعداد ہے اور وہی اس ملک کی قوت وعزت کا سرچشمہ ہیں۔
- ہمیں امید ہے کہ اگر ہم اپنا مطالبہ قوت اور معقولیت کے ساتھ پیش کریں گے اور اس ملک کے دستور کے تحفظ کا مطالبہ کریں گے تو ہمارے ساتھ انصاف کیا جائیگا۔
- ہم سچے محب وطن اور ملک دوست اس وقت تک نہیں ہوسکتے جب تک اس ملک کی ساری اچھی، حسین اور مفید چیزوں پر فخر کرنا، ان کی حفاظت کرنا اور ان کو زندہ رکھنا اپنا فرض نہ سمجھیں۔
- ہم اس وقت کے انتظار میں (جب حکومت کو اپنے فرض کا پورا احساس ہو جائے) نہیں رہ سکتے۔
- قوموں کی زندگی میں چند برس کی مدت بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔
- ہم کو اپنی جدوجہد جاری رکھنی چاہئے۔
- ہم کو حکومت سے بہت واضح وپرزور طریقے پر مطالبہ کرنا چاہئے کہ سرکاری نصاب تعلیم اور نظام تعلیم مکمل طور پر سیکولر ہو اور حکومت اس کے نفاذ میں پورے خلوص وجرأت سے کام لے۔
- دوسرا حصہ وہ ہے جو خود ہم سے متعلق ہے اور اس کے بارے میں ہم خدا اور اس کے بندوں اور اپنی آئندہ نسلوں کے سامنے جواب دہ ہیں۔
- نصاب تعلیم حقیقی معنیٰ میں غیر مذہبی وسیکولر ہو جائے پھر بھی ہمیں اپنے بچوں کی دینی تعلیم اور اخلاقی تربیت کا انتظام کرنا ہوگا۔
- ایک ایسی ملت کو جس کی زندگی کا اتنا بلند معیار ہو ایک ایسے نصاب تعلیم اور نظام تعلیم کے حوالہ نہیں کیا جاسکتا اور زمانہ کے رحم وکرم پر نہیں چھوڑا جاسکتا۔
- اس کے لئے مسلمانوں کو ایسا ہی انتظام کرنا ہوگا جیسے ان کو اپنی نمازوں اور دینی فرائض کی ادائیگی کے لئے معابد ومساجد اور روح وجسم کے رشتے کو برقرار رکھنے کے لئے ضروریات زندگی کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔

- اس کے لئے ان کو مساجد میں وعظ وتلقین، گھروں میں اصلاح و تربیت اور مکتبوں اور مدرسوں میں دینی تعلیم کا انتظام کرنا ہوگا۔
- اس کے لئے ان کو سارے ملک میں صباحی و شبینہ مکاتب کا ایک ایسا جال بچھا دینا ہوگا جس سے کوئی قریہ اور کوئی محلہ محروم نہ رہے۔

قاضی محمد عدیل عباسی کی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے (جن کے نتیجہ میں وہ تاریخی کانفرنس اور اس میں حضرت مولانا کا تاریخی خطبۂ صدارت وجود میں آیا جو ملتِ اسلامیۂ ہندیہ کے علاوہ ہندوستان کے سنجیدہ مخلص صاف ذہن عوام و خواص کے لئے عظیم تحفہ کی حیثیت رکھتا ہے) حضرت مولانا نے تحریر فرمایا:-

"ایک شخص کی کوشش اور مقصد کے عشق نے بیسیوں اداروں کا کام کیا اور ہمیں نئے تجربہ سے آشنا کیا ہے کہ ایک شخص کا عزم اور اس کی حکمتِ عملی کس طرح عمومی چندے سے بے نیاز ہو کر سیکڑوں مدرسوں کو چلا سکتی ہے اور کس طرح چھوٹے چھوٹے...... دیہات اور قصبات اپنے بچوں کی تعلیم میں خود کفیل ہو سکتے ہیں۔"

حضرت مولاناؒ نے خطبہ کے آخر میں جو پیغام مسلمانوں کو دیا ہے وہ اس قابل ہے کہ اسے من وعن پڑھ لیا جائے۔ اس سے ایمان تازہ ہوتا ہے روح میں فرط و انبساط قلب و نظر میں وسعت اور حرکت و عمل کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ مولانا کے اندازِ نظر اور زاویۂ فکر کا ایک خاص وصف یہ تھا کہ سخت ترین حالات میں بھی مایوسی کے بجائے عزم، افسردگی اور اضمحلال کے بجائے ذوق و شوق، احساسِ کمتری کے بجائے جرأت مندانہ طرز عمل کا اظہار ہوتا تھا۔ اکثر ایسے مواقع پر حضرت مولانا کا انداز تحریر و تقریر غیر ضروری جوش و جذبہ کو ابھارنے کے بجائے سنجیدہ دعوتِ فکر کا ترجمان ہوتا تھا، وہ محرمِ رازِ درونِ میخانہ تھے۔ وہ عندلیبِ باغِ حجاز تھے وہ رہ و رسمِ شاہبازی سے پوری طرح باخبر تھے، انھیں ملت کا درد بھی تھا ملک سے بے پناہ جذبۂ محبت بھی وہ مسلمانوں کے غم گسار بھی تھے اور سرزمینِ ہند کے طرفدار بھی اور بیک وقت ملک و ملت کی بہی خواہی، ترقی اور ارتقا کے طلبگار بھی تھے، وہ ملک کی وحدت اور سالمیت کے لئے فکر مند بھی رہتے تھے اور مسلمانوں کے اندر غیرت و حمیت اور خودی و خودداری اور ایثار پسندی کے جلوۂ خوش رنگ کو دیکھنے کے تمنائی بھی تھے۔

حضرت مولانا کا ایک جملہ اپنی گہری معنویت کے اعتبار سے اس کا مستحق ہے کہ اسے جلی حروف میں لکھ کر نمایاں کیا جائے:-

"شرطِ اول عزم اور شرطِ ثانی نظم ہے اور ان دونوں کی موجودگی ہر مشکل کو آسان اور ہر ناممکن کو ممکن بنا سکتی ہے۔"

چالیس برس قبل حضرت مولانا نے دینی تعلیمی کونسل کی صدارت اور قیادت قبول فرمائی تھی۔ اس وقت ملت اسلامیہ کے سامنے جو پیغام دیا گیا تھا وہ دینی اور ملی تحریکات میں سرگرم افراد اور جماعتوں کے لئے ایک منشور کی حیثیت رکھتا ہے:-

"حضرات!

قوموں کے اجتماعی فیصلوں نے دنیا کے نقشے اور قوموں کی تقدیریں بدل دی ہیں۔ آج جس چیز کی ہم کو سب سے زیادہ ضرورت ہے اور جو تمام موانع اور رکاوٹوں پر غالب آسکتی ہے اور جس کے سامنے حالات کو سپر ڈالنی پڑے گی وہ ہمارا یہ فیصلہ ہے کہ ہم اپنے بچوں کی دینی تعلیم کو ہر تعلیم پر مقدم رکھیں گے اور بغیر اس ضروری دینی تعلیم کے جس سے وہ اپنے پیدا کرنے والے کو اپنے پیغمبر کو اور اپنے عقیدہ اور فرائضِ دینی کو پہچان سکیں، خالص رواجی یا معاشی تعلیم دلانا گناہ اور اپنے مذہب سے بغاوت سمجھیں گے۔

اگر ہمارا یہ فیصلہ ہے اور ہم اس میں سچے ہیں تو دنیا کی کوئی طاقت، کوئی ترغیب کوئی مصلحت، کوئی تعزیر ہم کو اس صراطِ مستقیم سے ہٹا نہیں سکتی اور ہماری نسلوں کو اسلام کی نعمت سے محروم نہیں کر سکتی اور اگر ہمارا یہ فیصلہ نہیں تو حکومت کی کوئی رعایت کوئی کوئی استثناء کوئی تحفظ، کوئی انتظام ہم کو اس فساد و الحاد اور اس انحراف و ارتداد سے بچا نہیں سکتا جس کی طرف دنیا تیزی سے بڑھ رہی ہے۔

جو قومیں اپنے بارے میں خود فیصلہ نہ کر سکیں ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتا اور جو قومیں خود فیصلہ کر لیں ان کے فیصلہ کو کوئی بدل نہیں سکتا۔"

دینی تعلیمی کونسل کی عظیم دینی اور ملی تحریک سے متعلق حضرت مولانا کا ...... یہ خطبہ اب نایاب ہے اس کا ایک نسخہ میرے پاس اور ایک نسخہ قاضی محمد عدیل عباسی صاحب کے صاحبزادے قاضی محمد ارشد عباسی صاحب کے پاس بستی میں محفوظ ہے۔ تحریک و تنظیم کی جو فلک بوس عمارت تعمیر ہوئی، اس کی خشتِ اول کے طور پر یہ خطبہ یادگار ہے۔ حضرت مولانا کو آخری ایام میں یہ خطبہ یاد آیا میں نے ان کے سامنے پیش کیا تھا۔ حضرت کی خواہش تھی کہ ان کے خطبات یکجا شائع ہو جائیں۔ یہ ذمہ داری میرے سپرد فرمائی تھی انشاء اللہ دینی تعلیمی کونسل کی طرف سے اس کی تکمیل

ہو گی۔ حضرت اکثر مجھ سے فرماتے تھے کہ قاضی صاحب اور اپنے والد کی سوانح اور دینی تعلیمی کونسل کی خدمات اور تاریخ مرتب کر دو۔ "دینی تعلیمی کونسل کی خدمات" کے عنوان سے میرا ایک مضمون قومی آواز میں شائع ہوا تو مجھے طلب فرمایا اور اپنی پسندیدگی کا اظہار فرمایا میں نے لکھنؤ، علی گڑھ اور سہارنپور کانفرنسوں کی روداد مرتب کی تو حضرت نے اس کا مسودہ دیکھ کر دعا فرمائی اور جب تک وہ چھپ کر نہیں آگئی برابر استفسار کرتے رہے۔ میرے ساتھ شفقت و محبت کا مظاہرہ ایسا تھا جس سے دوسرے حضرات بھی متاثر ہوتے تھے۔ چار برس کی عمر میں حضرت نے میری بسم اللہ کرائی تھی اس وقت سے لے کر آخر تک میں ان کی محبتوں سے مالامال رہا۔ ندوہ کے مہمان خانہ میں ایک موقع پر میں نے پاؤں میں جوتے پہنانے کی کوشش کی تو فرمایا تمہارے ہاتھ قدم کے لئے نہیں قلم کے لئے ہیں۔ چار مہینے گذر گئے خدا گواہ ہے کہ اس مدت میں ایک لمحہ کے لئے بھی میری آنکھوں کے سامنے سے حضرت کا چہرہ اوجھل نہیں ہوا، فکر و تصور میں بسا ہوا، آنکھوں میں سمایا ہوا، اب تک کوشش کے باوجود کچھ لکھنے کے لئے ذہن و دماغ کے منتشر شیرازہ کو یکجا کرنا میرے لئے مشکل رہا۔ آج جب اس ذمہ داری کو کسی طرح ادا کرنا چاہتا ہوں تو دل و نظر کی کیفیت ناقابل بیان ہو رہی ہے۔ دل قابو میں نہیں ہے، آنسوؤں میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے، اللہ کی ذات بڑی ہے وہ چاہے تو اپنے ایک ناقص بندہ کو بھی سعادت سے نواز دے یہ اس کی شانِ کریمی بھی ہے، شانِ رحیمی بھی۔

دینی تعلیمی کونسل کی تاسیس اور خدمات کا تقاضا ہے کہ اس سے زیادہ تفصیل سے واقعات بیان کئے جائیں لیکن یہ مضمون اس کا متحمل نہیں ہے۔ اس وقت میرے پیش نظر صرف حضرت مولانا علی میاںؒ کی ذات گرامی ہے جو گذشتہ چالیس برسوں میں مرکز نگاہ رہی ہے۔ یہ سرگذشت بھی تاریخی حوالوں کے ساتھ تفصیل و توضیح کی طالب ہے مگر میں اس کو مختصراً بیان کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ چند اہم واقعات اور حضرت مولاناؒ کے خطبات سے ضروری اقتباسات پیش کئے جائیں گے جن سے تحریک اور مولاناؒ کے تعلق پر روشنی پڑے گی۔ دینی تعلیمی کونسل کے صدر کی حیثیت سے مولانا کا ایک مقام وہ تھا جس سے خارجی سطح پر لوگ واقف اور عظمتوں کے معترف تھے لیکن حضرت کی ایک حیثیت اس کے سرپرست اور بزرگ خاندان کی تھی جس کی بنا پر داخلی طور پر معاملات کی فکر اور مالیات کی فراہمی بھی اس تعلق میں شامل تھی کونسل کے قیام کے بعد پورے صوبۂ اتر پردیش میں جوش و جذبہ سے بھری ہوئی ایک ایسی فضا نمودار ہوئی جس میں مسلمانوں کا ہر طبقہ بیدار، کام کے لئے آمادہ و تیار اور ہر ضلع میں تحریک و تنظیم کے لئے ماحول خوشگوار نظر آنے لگا۔ مولانا محمود الحسن صاحب جواب تک بستی اور قریب کے اضلاع میں مصروف تھے اب اس کے بعد پوری ریاست میں سرگرم ہو گئے۔ ان کی ڈائری اور کاغذات سے اندازہ ہوتا ہے کہ شب و روز سفر کا ایک سلسلہ تھا، ایک فکر دامنگیر تھی ایک تصور اور تاثر تھا کہ مسلمانوں کی موجودہ نسل ایمان و عقیدہ پر قائم رہے اور اس ملک میں دین کی حفاظت کا قابلِ اطمینان بندوبست ہو جائے۔

ان کی تحریروں میں یہ جذبہ نمایاں ہے:-

"اگر ملک کے اندر ہم کو سرکاری ملازمتوں میں اپنا حق نہیں مل رہا ہے، ہمارے اوپر ذیادی ترقیوں کے دروازے بند کر دیئے گئے ہیں، فرقہ وارانہ فسادات کے ذریعہ نہ صرف ہمارے امن و سکون کو برباد اور ہماری عزتِ نفس کو پامال کر دیا گیا ہے تو ہمارا اس صورتحال کو بدلنے کے لئے فکرمند ہونا بجا ہے لیکن ان سارے مسائل سے بڑا مسئلہ ہمارے لئے اپنی آئندہ نسلوں کے دین و ایمان کا مسئلہ ہے اور اس مسئلہ کے سامنے کسی مسئلے کی کوئی حیثیت نہیں ہے اگر یہ سارے مسائل حل طلب رہ جائیں اور ہمیں موت آجائے تو ان کے لئے اللہ کی بارگاہ میں ہم سے باز پرس نہیں ہو گی لیکن اگر خدا نخواستہ ہمیں اس حال میں موت آگئی کہ ہماری نسلوں کے ایمان کا مسئلہ باقی رہا اور ہم نے اسے حل کرنے کی پوری جد و جہد نہ کی تو ہم اللہ کے سامنے جواب دہ ہوں گے اور ہم کوئی جواب نہ دے سکیں گے۔"

ایک موقع پر رائے بریلی میں تکیہ پہنچا کر معلوم ہوا کہ مولانا علی میاں، قاری رشید الحسن صاحب اور علی میاںؒ کے ایک عزیز کے ساتھ مشاورتی اجتماع میں شرکت کے لئے شہر جانا ہوا۔ ــــــ پہلے علی میاں صاحب نے تفصیل سے مسلمان بچوں کی ابتدائی دینی تعلیم کی عام ترویج و اشاعت اور اس کے لئے مسلمانوں کی ہر طرح کی آمادگی اور تیاری کی ضرورت بیان کی اور پھر میں نے انجمن تعلیمات دین کے قیام کی ضرورت کنونشن کے انتظامات و طریق کار اور جد و جہد کے نقشے پیش کئے اس کے بعد عارضی انجمن تعلیماتِ دین ضلع رائے بریلی کی تشکیل بالاتفاق عمل میں آئی۔"

دینی تعلیمی کونسل کے قیام اور مولانا علی میاںؒ کے صدر منتخب ہونے کے بعد مختلف اضلاع میں انجمن تعلیماتِ دین کی تشکیل اور ضلع کانفرنسوں کا انعقاد عمل میں آیا لیکن رائے بریلی کے مذکورہ بالا جلسے اور انجمن کی تشکیل کی بنیادی اہمیت اس لئے ہے کہ حضرت مولاناؒ کی سرپرستی اور رہنمائی میں یہی پہلی تشکیل تھی جو اتفاقاً رائے بریلی میں عمل میں آئی۔ پوری تحریک کے سلسلے میں رائے بریلی کو یہ خصوصیت حاصل ہوئی۔ وہاں کے مسلمانوں اور

مدارس کے ذمہ داروں کو آج بھی اس کی قدر کرنی چاہئے۔ حضرت مولانا غالباً اسی بنا پر رائے بریلی میں انجمن تعلیمات دین کے قیام و استحکام اور تحریک کے فروغ و ترقی کے لئے ہمیشہ فکرمند رہتے تھے اور اس کا اظہار فرماتے تھے کہ اس مسئلہ میں رائے بریلی کو مثالی ہونا چاہئے۔ حضرت کے اس جذبہ و فکر کو ان کی وصیت سمجھ کر قبول کرنا چاہئے اور رائے بریلی کے مسلمانوں کو فیصلہ کرنا چاہئے کہ وہ اپنے شہر و ضلع میں حضرت کے دست مبارک سے لگائے گئے اس پودے کو خشک نہیں ہونے دیں گے، اس کی آبیاری کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی جس سے حضرت والا کی روح کو شادمانی حاصل ہو گی اور انشاءاللہ رائے بریلی کے مسلمان اس کے ذریعہ اللہ کی رحمت اور برکت سے مالامال ہوں گے۔

والد ماجد مولانا محمود الحسن صاحب نے اپنی کتاب (دینی تعلیمی کونسل، مقاصد، طریقۂ کار، خدمات اور منصوبے) میں حضرت مولانا علی میاںؒ کے پہلے خطبۂ صدارت کے متعلق اپنے تاثر کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے :-

"مولانا موصوف کے خطبۂ صدارت نے مسلمانوں کے سامنے موجودہ حالات میں مسلمان بچوں کے ایمان کے لئے جو خطرات ہیں اور ان کے پیش نظر ان کی دینی تعلیم کے بندوبست کی جو ضرورت اور اہمیت ہے اس کو اس طرح واضح کیا اور اس انداز سے اپیل کی کہ ہر مسلمان قلب بے چین اور اس کا ایمانی جذبہ پوری قوت سے بیدار ہوگیا۔"

ڈائری کے صفحات جو تقریباً پچیس برسوں کی سرگرمیوں کو سمیٹے ہوئے ہیں وہ حضرت مولانا علی میاں کی خدمات اور ان کے ذکر سے مزین ہیں۔ مولانا کی بین الاقوامی شخصیت تھی، عرب و عجم میں شہرت اور مقبولیت حاصل تھی، دینی، علمی اور تصنیفی مصروفیات تھیں لیکن دینی تعلیمی کونسل کا خیال ہر فکر پر غالب نظر آتا تھا۔ چند واقعات کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے جو مولانا محمود الحسن صاحب کی ڈائری میں درج ہیں۔ اس سلسلے میں اگر مولاناؒ کے اسفار کی فہرست مرتب کی جائے تو ایک کتابچہ تیار ہو جائے گا۔ اس مقصد کے لئے کوئی سفر طے ہونا تو بعض وقت ضعف و اضمحلال کے باوجود اس کی تکمیل کی فکر ہوتی اور اندازہ ہوتا کہ اگر سفر نہ ہو سکا تو اس کے تاثر سے طبیعت مزید بوجھل ہوگی۔ اکثر دیکھنے میں آیا کہ اس حالت میں بھی سفر کے بعد انبساط کی کیفیت ظاہر ہوتی تھی، اس طرح کے بے شمار سفروں میں مجھے ہم رکابی کا شرف حاصل ہوا ہے اور میں نے بہ چشم خود اس کا مشاہدہ کیا ہے۔ میرے کرم فرما اور بزرگ مولانا عبداللہ عباس ندوی صاحب نے "میر کارواں" میں تحریر فرمایا ہے :-

"مرحوم قاضی عدیل عباسی کے اخلاص کی قدر ان کی زندگی میں بھی کرتے تھے اور ان کے انتقال کے بعد بھی اس کو یاد رکھتے ہیں۔ مرحوم کے بھانجے ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی کو اس نسبت سے اور ان کی صلاحیتوں کی بنا پر ہمیشہ عزیز رکھتے اور ان کی کسی دعوت یا ان کے توسط سے جو دعوت مولانا کو دی گئی اس کو ان حالات میں بھی قبول کیا جب کہ ان کی صحت پر ضعف اور تعب کا اثر تھا۔"

۲۷ر جنوری ۱۹۶۳ء اتوار ڈائری کا ایک صفحہ

"آج فیض آباد سے درس گاہ جماعت اسلامی مغل پورہ فیض آباد کے صدر مدرس صاحب لکھنؤ آئے، پہلے علی میاں کے پاس گئے اور پھر میرے پاس دفتر آئے۔

جبری تعلیم کے سلسلہ میں جو مقدمہ چل رہا ہے اس پر یہاں کے وکلاء سے مشورہ کرنا تھا۔ مولانا علی میاں نے فون پر کہا کہ مقدمہ کونسل کی طرف سے لڑا جائے اور کوئی کوتاہی نہ ہو۔"

جبری تعلیم کا مسئلہ ہندوستان میں بہت قدیم ہے۔ تقریباً ۷۰ سال قبل ۱۳۵۰ھ میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ نے "قرآن عظیم اور جبریہ تعلیم" کے عنوان سے ایک مبسوط مقالہ سپرد قلم فرمایا تھا جس میں دینی استقامت، ایمانی غیرت و حرارت اور جرأتمندانہ استدلال سے اس مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ ۱۹۲۹ء میں دہلی میں یہ افسوسناک واقعہ پیش آیا تھا کہ میونسپل کمیٹی دہلی اور اس کی تعلیمی کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ :-

۱۔ قرآن مجید حفظ و ناظرہ خواں بچوں کو قرآن مجید کے مکتبوں سے جبراً چھین لیا جائے۔

۲۔ قرآن مجید پڑھنے والے بچوں کے سرپرستوں کے خلاف مقدمات فوجداری قائم کرائے جائیں کہ وہ اپنے بچوں کو قرآن مجید کی تعلیم میں مشغول ہونے کی وجہ سے ابتدائی جبری تعلیم کے اسکولوں میں نہیں بھیج سکے۔

۳۔ کمیٹی نے مدارس قرآنی کے معلموں کو اس مضمون کے نوٹس دیئے کہ وہ ان مدارس کو بند کرکے لڑکوں کو جبری تعلیم کے اسکولوں میں بھیج دیں ورنہ فوجداری کے سپرد کر دیئے جائیں گے۔

۲۷ر ستمبر ۱۹۲۹ء کو انجمن خادم القرآن کا اجلاس حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب صدر جمعیۃ العلماء ہند کی صدارت میں جامع مسجد دہلی میں منعقد ہوا۔ اس میں بزرگان ملت اور علمائے امت کی کثیر تعداد تشریف فرما تھی۔ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ مولانا محمد زکریا صاحبؒ بھی موجود تھے۔ اس موقع پر تفصیلات سے گریز کرتے ہوئے صرف اس تجویز کا اظہار مناسب ہے جو اس جلسۂ عظیم میں منظور کی گئی

تھی اور جو اس دور ابتلا میں مسلمانوں کے لئے باعثِ تقویت ثابت ہوئی تھی۔

"مسلمان قرآن مجید کی تعلیم سے کسی صورت میں بھی دست بردار نہیں ہوسکتے کیونکہ قرآن مجید ہی کی تعلیم اور قرآن مجید ہی کے ساتھ مسلمانوں کا تعلق ہی ان کی دینی نجات اور بقائے مذہب کا کفیل ہے۔

یہ جلسہ میونسپل کمشنروں سے استدعا کرتا ہے کہ معاملہ کی نزاکت کو اچھی طرح سمجھ کر عامۂ مسلمین کے مذہبی جذبات کی صحیح ترجمانی کریں اور قرآن مجید کی تعلیم کو مستثنیٰ کرانے کی پوری کوشش کریں ورنہ مسلمان مجبور ہوں گے کہ وہ مدافعت کا کوئی مؤثر ذریعہ اختیار کریں۔"

تقریباً نصف صدی کے بعد آزاد ہندوستان کی ریاست اترپردیش میں جبری تعلیم کا مسئلہ دوبارہ شدومد سے اٹھایا گیا اور محکمۂ تعلیم کی طرف سے خوف و ہراس کا ماحول بنانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ سوچا گیا تھا کہ مکاتب کے قیام کی جو لہر اٹھی ہے اس کو دبانے کا یہ مؤثر ذریعہ ہوگا اور مسلمان اس قانون سے گھبرا کر اس تحریک سے الگ ہوجائیں گے لیکن دینی تعلیمی کونسل نے جو روح پھونک دی تھی اسے آسانی سے دبانا مشکل تھا۔ مسلمانوں کا طرزِ عمل گھبراہٹ کے باوجود اس وقت یہ تھا ؎

تعزیرِ جرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

قاضی محمد عدیل عباسی مرحوم نے انجمن تعلیماتِ دین ضلع شاہ جہانپور کی تیسری کانفرنس منعقدہ ۲ر جون ۱۹۶۸ء کے خطبۂ صدارت میں اس مسئلہ سے متعلق دو واقعات بیان کئے ہیں:-

● "مین پوری سے ہمارے دفتر میں تار موصول ہوا کہ وارنٹ جاری ہوگیا ہے اور گرفتاری ہونے والی ہے، میں نے فوراً جوابی تار دیا کہ وارنٹ اور گرفتاری کا کوئی قانون نہیں ہے، گھبرائیے مت ناظم صاحب جارہے ہیں"۔ مولانا محمود الحسن صاحب وہاں پہونچے اور حالات درست ہوگئے۔

● گورکھپور میں جب نوٹسیں دی گئیں اور میں طلب کیا گیا تو وہاں پچاسوں آدمی جوش میں بیٹھے ہوئے تھے کہ کیا کیا جائے۔ میں ایجوکیشن کمیٹی کے چیرمین صاحب کے پاس گیا اور ان سے کہا کہ آپ سے درخواست ہے کہ نوٹسیں واپس نہ لیجئے گا مجھے صوبہ کے اندر کہیں مقدمہ لڑنا ہے اور چونکہ میں جنرل سکریٹری ہوں مجھے وقت دینا ہوگا، گورکھپور میں مجھے مقدمہ لڑنے میں سہولت ہے۔ چیرمین صاحب نے بڑی خاطر کی اور کہا کہ آپ مقدمہ کہیں اور لڑیں میں مقدمات واپس لیتا ہوں، بس سکریٹری انجمن تعلیماتِ دین کی مہر لگی ہوئی رپورٹ آجانی چاہئے کہ بچہ مکتب میں پڑھ رہا ہے میں واپس آیا تو دوستوں نے اضطراب انگیز لہجہ میں پوچھا کیا ہوا؟ میں نے جواب میں کہا کہ ؎

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشہ نہ ہوا

ان واقعات کے پیش آنے کے بعد مولانا علی میاںؒ کی فرمائش پر قاضی صاحب مرحوم نے "آزاد اسلامی مکاتب اور جبریہ تعلیم" کے عنوان سے ایک مدلل اور طاقتور کتابچہ تحریر کیا جس کے عام ہونے کے بعد فضا بدل گئی۔ حکومت کو بھی اندازہ ہوگیا کہ مسلمان اس کے آگے سرِ تسلیم خم نہیں کریں گے۔

حضرت مولانا علی میاںؒ دینی تعلیمی کونسل کے نظامِ تعلیم و تربیت کو اپنی ریاست اترپردیش کے علاوہ دوسری ریاستوں میں بھی جاری کرنے کے خواہش مند تھے، وہ چاہتے تھے کہ یہاں جو طریقۂ تعلیم مکاتب کے قیام کی شکل میں سامنے آیا ہے وہ پورے ملک میں پھیل جائے اور کسی گوشہ میں بھی مسلمان دین کی ابتدائی اور ضروری تعلیم سے محروم نہ رہیں۔ ۲۸ر جولائی ۱۹۶۳ء کو مولانا محمود الحسن صاحب کی ڈائری میں درج ہے۔

"آج صبح گونڈہ میں کونسل کے انچارج دفتر مولوی نذیر احمد نوری صاحب نے آکر خط دیا جو بھوپال سے آیا تھا اور بتایا کہ ٹرنک کال بھی آیا ہے۔ مولانا علی میاں صاحب نے فوراً بھوپال طلب کیا ہے تاکہ وہاں ریاستی دینی تعلیمی نظام بنانے کے لئے جو جلسہ ۲۹ر جولائی کو ہورہا ہے اس میں شرکت کروں۔

۲۹ر جولائی ۱۹۶۳ء

آج ½۱۲ بجے دن کو بھوپال پہونچا جھانسی سے مولانا عمران خاں صاحب کا ساتھ ہوگیا تھا جو دہلی سے واپس ہوئے تھے۔

مولانا علی میاں صاحب برہان پور تشریف لے گئے تھے ½۳ بجے دن کو واپس آئے یہاں جلسے کے منتظم حضرات سے ریاستی دینی تعلیمی نظام کے مسئلہ پر بات چیت ہوئی۔ نام مدھیہ پردیش دینی تعلیمی کانفرنس طے ہوا۔

رات میں جلسۂ عام ہوا مولانا علی میاں نے خطاب فرمایا، پھر مجھ سے عرض کرنے کو کہا گیا، اور آخر میں نظام کی تشکیل کی تجویز پاس ہوئی۔ مولانا علی میاں نے بڑی رقت کے ساتھ دعا فرمائی۔"

اسی طرح گجرات، بمبئی اور بہار میں بھی اس تحریک کا تعارف ہوا اور ان جگہوں پر بھی کام کا آغاز و تنظیم کا قیام عمل میں آیا، حضرت مولاناؒ کی عمر اور صحت نے جب تک اجازت دی بلکہ بعض وقت اس کے

بغیر بھی دینی تعلیمی کونسل کے لئے آسان یا مشکل کسی طرح کے سفر میں کبھی تکلف نہیں ہوا۔ حالات کے کیسے کیسے نشیب فراز سامنے آئے، دقتیں، دشواریاں مشکلات، اختلافات کے دور بھی گذرے کبھی خود اپنی صفوں میں بھی انتشار نظر آیا لیکن حضرت کا مزاج تھا وہ اس طرح کے سارے طوفانوں کو اپنے اندر سمیٹ لیا کرتے تھے۔ قلب ونظر کو وسعت کونین کی دولت عطا ہوئی تھی۔ تحمل اور برداشت کی جو آخری حدیں ہوا کرتی ہیں، جہاں تک عام انسانوں کا ذہن پہونچنے سے ہمیشہ قاصر رہتا ہے، ہمارے حضرت اپنی ذاتی زندگی اور تحریک وتنظیم میں ہمیشہ اس مقام پر بھی اطمینان ویکسوئی کے ساتھ تنہا کھڑے نظر آتے تھے۔ یہ وہ مقام بلند تھا جہاں تک کسی دوسرے کے لئے ہم رکابی آسان نہیں تھی۔ اس کا اثر طبیعت پر ذہن وفکر پر اور پورے اعصاب پر نمایاں ہوتا تھا لیکن زبان سے کبھی اس کا اظہار نہیں فرماتے تھے۔ اس طرح کے بے شمار واقعات جو ذاتی اور اجتماعی معاملات سے تعلق رکھتے ہیں میرے علم میں ہیں لیکن انھیں بیان کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔ اس وقت تو صرف ان واقعات وحالات کو ظاہر کرنا مقصود ہے جو دینی تعلیمی کونسل اس کی تحریک اور حضرت مولانا کے تعلق اور فکرمندی سے متعلق ہیں جنہیں پڑھ کر اس اضطراب کا اندازہ ہوتا ہے جو اس راہ میں انھیں بے چین کئے ہوئے تھا اس طرح کے واقعات میں درس عبرت اور بڑی سبق آموزی پنہاں ہے۔ کاروانِ زندگی جلد اول کے ص۱۵۰،۱۵۱ کی عبارت اپنے اندر ایمان واستقامت اور درس وپیغام کی بڑی کیفیات سے آراستہ ہے:

"میں دینی تعلیمی کونسل کی طرف سے مغربی یوپی کے ایک دورہ میں تھا گرمی سخت تھی اور لو چل رہی تھی بسوں کے ذریعہ سفر تھا اور بعض جگہ کئی کئی گھنٹے دوپہر کی گرمی میں ٹھہرنا اور انتظار کرنا پڑا۔ ۲۲ر جون ۱۹۶۵ء کو میرٹھ کا پروگرام تھا شب میں ایک جلسۂ عام میں تقریر کی فراغت پر اپنی قیام گاہ پر آکر سوگیا۔ فجر سے پہلے آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ بائیں آنکھ کی (جس میں آپریشن ہوا تھا) نظر بالکل جاتی رہی۔ طبیعت پر اس کا سخت اثر پڑا"

اس حالت میں بھی میرٹھ سے دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ میں شرکت فرمائی پھر سہارنپور تشریف لائے، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ نے فوراً لکھنؤ جانے کی ہدایت کی، سیتاپور آنکھ کے اسپتال میں داخل ہوئے لیکن وہاں سے واپس آکر مسلم مجلس مشاورت کے سلسلہ میں مصروفیات اس حد تک بڑھیں کہ دوبارہ آنکھ پر حملہ ہوا اور پھر سیتاپور اسپتال میں داخل ہونا پڑا جہاں پانچ آپریشن ہوئے مگر خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

"یہ میری زندگی کے سب سے زیادہ آزمائشی اور ایک طرح سے موت وحیات کی کشمکش کے دن تھے کئی بار شدت تکلیف سے دعا کی کہ اگر اسی حالت کا باقی رہنا مقدر ہے تو ایمان کے ساتھ دنیا سے اٹھا لیجئے۔"

سیتاپور کے اس قیام سے متعلق حضرت مولانا نے ظفر احمد صدیقی صاحب مرحوم کے تعلق کا ذکر کیا ہے:

"سیتاپور کے دونوں مرتبہ قیام کی پوری مدت میں جو بعض اوقات ڈھائی تین مہینے کے قریب بھی ہوئی میرے اور میرے ساتھ ٹھہرنے والوں اور عیادت کے لئے باہر سے آنے والوں کے کھانے کا انتظام کلیۃً بھائی ظفر احمد صاحب صدیقی وکیل سیتاپور نے کیا اور اس کا انحصار اپنے کھیت کے غلہ اور اپنی جائداد کی آمدنی پر رکھا میں کبھی ان سے درخواست کرتا کہ یہ سلسلہ بہت وسیع اور طویل ہے اب ہم کو خود اپنا انتظام کرنے کی اجازت دیجئے تو آبدیدہ ہوجاتے اور کہتے کہ بس یہ بات نہ کہئے اور جو کچھ آپ حکم دیں اس کی تعمیل ہوگی۔"

ظفر احمد صدیقی صاحب کی شخصیت کا اندازہ حضرت مولانا کے اس اقتباس سے کیا جاسکتا ہے:

"دینی تعلیمی کونسل اترپردیش کو ایک لائق ومخلص رہنما اور کارپرداز اور اس کے بانی اور جنرل سکریٹری قاضی محمد عدیل عباسی صاحب کو ایک سرگرم رفیق ومعاون ظفر احمد صدیقی صاحب علیگ ایڈوکیٹ سیتاپور کی شکل میں مل گیا جنھوں نے اگست ۱۹۶۳ء میں بہ حیثیت سکریٹری دینی تعلیمی کونسل اپنا کامیاب پیشہ وکالت ترک کرکے اور سیتاپور سے لکھنؤ منتقل ہوکر اپنی پوری زندگی اور توانائیاں کونسل کے لئے وقف کردیں۔ مسلمانوں کے تعلیمی مسئلہ اور اس سلسلہ میں گورنمنٹ کی تعلیمی پالیسی مختلف اوقات میں اس کے اعلانات اور محکمۂ تعلیم کے افسروں کے طرزِ عمل سے دور دور ان سے زیادہ واقف آدمی کا ملنا مشکل تھا۔ انھوں نے ایک سپاہی اور رضاکار کے انداز میں پوری سادگی بلکہ جفاکشی کے ساتھ دینی تعلیمی کونسل کے غریبانہ دفتر ۹۹ گوئن روڈ لکھنؤ میں قیام اختیار کرلیا اور سب کشتیاں جلاکر ایک ایسے مسئلہ کے آستانہ پر آکر پڑ گئے جو ان کے نزدیک مسلمانوں کی موت وحیات کا مسئلہ تھا۔"

حضرت مولانا کی صحت اور بڑھتے ہوئے ضعف اور مختلف عوارض کو دیکھتے ہوئے ایک موقع پر ظفر صاحب مرحوم نے مولانا سے عرض کیا کہ اب آپ مستقلاً رائے بریلی میں قیام کیجئے۔ لوگ استفادہ کی غرض سے وہیں پہونچیں گے، فرمایا

جی تو میرا ابھی اب یہی چاہتا ہے لیکن سوچتا ہوں قیامت میں پوچھا جائے گا کہ ملت پر وقت پڑا تھا تو تمہیں خانقاہیت سوجھی تھی تو کیا جواب دوں گا۔

اقبالؔ کا شعر زندہ ہوگیا ؎

اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے
عشق کے دردمند کا طرز کلام اور ہے

۱۹۶۲ء میں حکومت اتر پردیش نے اسکولوں میں پوجا پاٹ کا پروگرام شروع کرنے کا اعلان کیا جس کے خلاف ۲۲ جون ۱۹۶۲ء کے ندائے ملت میں قاضی محمد عدیل عباسی مرحوم نے آواز بلند کی :۔

"کارکنانِ دینی تعلیمی تحریک کے لئے ایک مقام آزمائش آگیا ہے اور وہ امتحان گاہ میں کھڑے ہیں۔ ہم ابھی نصاب تعلیم کی اصلاح کے لئے کوشاں تھے کہ ایک نئی آفت اسکولوں میں عملی پوجا پاٹ کے پروگرام کی آرہی ہے۔ ہمیں جولائی سے پہلے پہلے اس سلسلہ میں کوئی بڑا اقدام اٹھانا ہوگا۔"

۲۷ جون ۱۹۶۲ء کو جونپور میں دینی تعلیمی کانفرنس کے موقع پر قاضی صاحب نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہا کہ :۔

"۱۹۵۹ء کے پراسپکٹس کے ملاحظہ سے معلوم ہوا کہ بیسک درجات میں، بچوں سے عملی سبق کے طور پر پوجا کرائی جائے گی اس معاملہ کی جانچ ہو رہی ہے اور اگر ایسا واقعی ہوا تو پھر ہم کو بچوں اور بچوں کے والدین اور سرپرستوں کو تیار کرنا پڑے گا کہ وہ اس سے قطعی اجتناب کریں۔ ہم کسی حالت میں ایک لمحہ کے لئے اسے برداشت نہیں کریں گے ہم اس کے مداوا کے لئے عرض داشتوں اور عدالتوں کے فیصلوں کا بھی انتظار نہ کریں گے، ہم بلا خوفِ نتائج اس پر عمل کرنے سے انکار کردیں گے۔

ساتھیو! جب تک ہم اس طرح کا جذبۂ عمل پیدا نہ کریں گے ہم اس عبوری دور کے طوفان میں غائب ہوجائیں گے اور ہماری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں۔"

یہ خطبہ ۱۳ جولائی ۱۹۶۲ء کو ندائے ملت میں حسب ذیل ادارتی نوٹ کے ساتھ شائع ہوا :۔

"یہ خطبہ ایسے موقع پر دیا گیا ہے جب کہ یوپی کے مسلمان بچوں کی ایمانی بقا کو ایک زبردست چیلنج کا سامنا ہے۔ اس کے مقابلہ کے لئے جس جذبۂ عمل کی ضرورت ہے خطبہ شروع سے آخر تک اس جذبۂ عمل کے لئے ایک پرسوز پکار کی حیثیت رکھتا ہے ہم تمام مسلم اخبارات سے امید کرتے ہیں کہ اس اہم خطبہ کی نمایاں طور پر اشاعت کی جائے گی اور مسلمانوں سے امید کرنے کو جی چاہتا ہے کہ یہ پکار ان کے کانوں سے ٹکرا کر واپس نہیں ہوجائے گی۔"

اسی موقع پر مولانا محمد منظور نعمانی صاحب نے الفرقان میں اس مسئلہ پر وضاحت سے مضمون تحریر فرمایا جو ندائے ملت کی اس اشاعت میں بھی شائع ہوا :۔

"اس مسئلہ کی سنگینی پر ہمیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ کون مسلمان ہے جس کو اس بات کے سمجھنے میں دقت ہوگی کہ اس انداز سے تعلیم پانے والے بچے مردم شماری کے رجسٹر میں تو مسلمان رہ سکتے ہیں لیکن حقیقت میں وہ مسلمان نہیں رہ سکتے۔

قاضی صاحب نے تمام مسلم جماعتوں سے اپیل کی ہے کہ وہ تمام اختلافات کو پس پشت ڈال کر اس سنگین مسئلہ سے نمٹنے کے لئے بلا تاخیر میدان میں آجائیں۔"

۲۰ جولائی ۱۹۶۲ء کے ندائے ملت میں اداریہ کی جگہ پر حضرت مولانا علی میاںؒ کا مضمون "مسلمانانِ یوپی اور حکومت یوپی کے لئے لمحۂ فکریہ" کے عنوان سے شائع ہوا۔ یہ مضمون بہت طویل مدلل اور جرأتِ ایمانی کا مظہر ہے۔ اس میں ایمان و استقامت کی وہ چنگاری ہے جو پلک جھپکتے شعلۂ جوالہ بن کر گردوپیش کو خاکستر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

"ندائے ملت کے ناظرین نے اخبار کی ۲۲ جون ۱۹۶۲ء کی اشاعت میں قاضی محمد عدیل عباسی صاحب کا مضمون پڑھا ہے جس میں پہلی مرتبہ اس نئی صورتِ حال کی اطلاع دی گئی تھی جس سے یوپی کے مسلمان دوچار ہو رہے ہیں یعنی یہ کہ بیسک اسکولوں کے نئے پراسپکٹس کے مطابق تمام درجوں میں اب مذہبی تیوہار جینتیاں اور یوم منائے جائیں گے جن کی حیثیت مذہبی ہے اور جن کا اہم عنصر اور روح پوجا پاٹ اور غیر اللہ کی عبادت و تقدیس ہے جو مسلمان کے لئے قطعی طور پر حرام اور ناجائز ہے اور اس طرح ان کو تعلیم کی منزل پر پہونچنے کے لئے کفر کی منزل سے گذرنا پڑے گا۔

کسی مسلمان کے لئے اس کی مطلقاً گنجائش نہیں کہ وہ کسی اہم سے اہم مقصد یا کسی بڑے سے بڑے دنیاوی فائدہ کے لئے اپنے بچے کو ان تقریبات و رسوم میں شرکت کی اجازت دے یا اس کو گوارہ کرے۔

یہ صورت حال ہمارے لئے ناقابل برداشت ہے اور ہم کو اپنے بچوں کو ان تعلیم گاہوں کے فوائد اور سہولتوں سے محروم رہنا گوارہ ہے لیکن ان کے ایمان، دینی احساسات اور شعور کو خطرہ میں ڈالنا اور مشرکانہ اعمال میں شریک ہونا کسی قیمت پر گوارہ نہیں۔ بس یہ اجتماعی فیصلہ بڑی سے بڑی صورت حال کو تبدیل کرسکتا ہے۔

ہم کو یقین ہے کہ یوپی کا محکمہ تعلیم جو اعلیٰ

تعلیم یافتہ اور تجربہ کار کارکنوں پر مشتمل ہے اور جس کو ہر محکمہ سے زیادہ حقیقت پسند اور عملی ہونا چاہئے بہت جلد اپنی غلطی محسوس کرے گا اور اپنی اس قابل فخر ریاست کو جو علم و تہذیب اور باہمی اتحاد کا مرکز رہی ہے اس تلخ اور غیر ضروری کشمکش میں مبتلا کرنے سے گریز کرے گا۔"

اس مسئلہ پر دینی تعلیمی کونسل نے سنجیدگی کے ساتھ پورے صوبہ میں ایک روح پھونک دی۔ جس کے نتیجہ میں محکمۂ تعلیم کو کلی طور پر اس پراسپکٹس کو منسوخ کرنا پڑا۔ ۲۷؍جولائی ۱۹۶۲ء کے شمارہ میں ندائے ملت کی ایک رپورٹ شائع ہوئی جس میں کہا گیا کہ:

"یوپی کے بیسک اسکولوں کا نیا پراسپکٹس محکمۂ تعلیمات نے واپس لینے کا اعلان کردیا دینی تعلیمی کونسل کی جدوجہد کی یہ کامیابی اس بات کا ثبوت ہے کہ بروقت اور مناسب جدوجہد سے ہر خطرہ کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔

اترپردیش کے مسلمانوں کے تمام مکاتب فکر نے ۳۱؍دسمبر ۱۹۵۹ء کو دینی تعلیمی کونسل کے نام سے جس ادارے کی بنیاد رکھی تھی اس کی مختصر سی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ اترپردیش کے محکمۂ تعلیمات نے ایک نئی اور سخت پریشان کن کارروائی کا ارتکاب کیا اس ادارے کی بیداری اور کارکردگی کی تعریف کی جانی چاہئے کہ اس نے نئے پراسپکٹس کے اجراء سے پہلے ہی اس کا پتہ چلا کر اس کا جائزہ لینے کا کام شروع کردیا۔"

اس اہم ترین مسئلہ پر غور و فکر اور لائحۂ عمل طے کرنے کے لئے دینی تعلیمی کونسل کا اجلاس مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی صدارت میں ۱۲؍جولائی کو طے تھا۔ اسی دن کونسل کا ایک وفد وزیر تعلیم سے ملا اور اسی موقع پر ڈائرکٹر تعلیمات نے وزیر تعلیم کو بتایا کہ پراسپکٹس کی منسوخی کے احکامات جاری کردیئے گئے ہیں۔

اس فیصلہ کا وسیع القلبی کے ساتھ خیر مقدم کرتے ہوئے مولانا علی میاں نے حکومت اترپردیش اور وزیر تعلیم کو توجہ دلائی:۔

"ہم وزیر تعلیم اور محکمۂ تعلیم کی اس حقیقت پسندی کی قدر کرتے ہوئے توقع رکھتے ہیں کہ مسئلہ تعلیم میں جو نزاکتیں ہیں ان کا پورا لحاظ رکھا جائے گا اور آئندہ جو بھی اقدام ہوگا اس میں سیکولرزم اور جمہوریت کے جذبہ کا پورا خیال رکھا جائے گا۔"

حضرت مولانا کی پوری زندگی میں جو وصف سب سے زیادہ نمایاں جو احساس و تاثر سب سے زیادہ حاوی اور جس کا اظہار سب سے زیادہ واضح نظر آتا ہے وہ انسانوں کی فطرتِ صالح پر اعتماد ہے۔ نازک ترین حالات میں بھی اور تیز ہوا کے جھونکوں میں بھی فکر کا یہ چراغ ہمیشہ روشن رہا۔ خدا آگہی کے ساتھ خود آگہی، خدا شناسی کے ساتھ خود شناسی اور اسی سے خودی و خودداری کے چشمے ابلتے ہیں جن کے آبِ مصفا سے انسانیت کی سوکھی حلق میں نمی، اس کے اضمحلال میں مسرت کے نقوش، اس کی نگاہوں میں بلند نظری، ذہنوں میں بلند پروازی پیدا ہوتی ہے۔ سکینت اور کشادگی، اطمینان و یکسوئی، امید و یقین مایوسی میں زندہ و روشن فکری نظریات کا ظہور ہوتا ہے، قدرت نے اپنے خزانہ سے ان خصوصیات اور کیفیات کی بے شمار نعمتیں حضرت مولانا کی ذاتِ گرامی پر بارش کی طرح برسائی تھیں۔ مولانا کے توسط سے ایک عالم اس سے مستفید ہوتا رہا۔ مولانا کا سبق یہی تھا کہ اپنی صلاحیتوں کا استعمال خدا کی قدرت پر بھروسہ کے ساتھ ہو تو اس کے نتائج بڑے روحانی ہوتے ہیں اللہ کی رحمتوں سے مایوس نہیں ہونا چاہئے۔

دنیادی طور پر حضرت مولانا اپنے ملک اور یہاں کے عوام سے بھی کبھی مایوس نہیں ہوئے اور اسی جذبہ کے ساتھ اسی یقین و امید کے ساتھ ہمیشہ دلوں پر دستک دیتے رہے جگاتے رہے، بچاتے رہے بلاتے اور سمجھاتے رہے۔ آواز کی نرمی لہجہ کی شیریں بیانی دردمندی اور دل سوزی نے ہمیشہ فضا و ماحول کو خوشگوار بنانے کی جدوجہد کی کم از کم دینی تعلیمی کونسل کے پلیٹ فارم سے گذشتہ چالیس برسوں کی تاریخ انھیں کارناموں سے بھری ہوئی ہے۔ حکومتوں کی ناانصافیوں اور ستم ظریفیوں پر صدائے احتجاج بلند کرنے کے ساتھ ساتھ خود اپنی ملت کے محاسبہ میں اسے جھنجھوڑنے اور ذمہ داریوں کا احساس دلانے میں بھی کبھی کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی۔ ۳۰؍جون ۱۹۶۴ء کو الٰہ آباد میں صوبائی دینی تعلیمی کانفرنس کے موقع پر خطبۂ صدارت کے چند اقتباس حضرت مولانا کی فکری اساس کو سمجھنے کے لئے ضروری ہیں:۔

"حاضرینِ جلسہ، رفقائے کار و شرکائے سفر! ہم آپ عرصہ کے بعد جمع ہوئے ہیں تاکہ اس پر غور کریں کہ ہندوستان کے جدید تعلیمی نقشہ میں ملتِ اسلامیہ کو اپنے ذہنی اقتصادی اور تہذیبی تسلسل کو باقی رکھنے کا کہاں تک موقع ہے؟ کون سی مشکلات اس راہ میں حائل ہیں ان کو دور کرنے کا کیا طریقہ ہے اس کے لئے مسلمانوں کو کس طرح کی جدوجہد کرنے کی ضرورت ہے اس کے کتنے حصہ کا تعلق حکومت اور سرکاری محکمۂ تعلیم سے ہے اور کتنے حصہ کا تعلق خود اپنے عزم و ارادہ، ایثار و قربانی اور تنظیم و تعاون سے ہے انھیں حقائق و مقاصد نے دینی تعلیمی کونسل کو وجود بخشا اور اسی نقطۂ آغاز سے اس نے اپنا سفر شروع کیا۔

"تاریخ کے قدیم ترین دور سے لے کر ہمارے اس زمانہ تک جس چیز نے علم کی شمع روشن رکھی اور لاکھوں انسانوں نے اپنی بہترین طاقتیں سیکھنے سکھانے اور پڑھنے پڑھانے میں صرف کیں وہ خدا کی یہ نعمت ہے کہ اچھے انسان، انسان سے مایوس نہیں ہوئے۔

تعلیم کا چراغ بے تیل بتی کے جل سکتا ہے بادِ صرصر کے جھونکھوں میں اور طوفان کے تھپیڑوں میں فروزاں رہ سکتا ہے اور تعلیم کی تاریخ بتاتی ہے کہ ہمت والوں اور انسانیت کا درد رکھنے والوں نے برسوں بے تیل بتی کے اپنا چراغ روشن رکھا۔ انھوں نے پیٹ پر پتھر باندھ کر مسلسل فاقے کر کے بغیر کسی عمارت کے درختوں کے نیچے بیٹھ کر جنگلوں اور بیابانوں میں کڑاکے کے جاڑوں کی راتوں میں اور تپتی ہوئی دوپہریوں میں تعلیم دی اور بڑے بڑے عالم مصلح اور معلم پیدا کئے۔

عالمِ انسانی میں کوئی چیز اس سے زیادہ خطرناک اور تشویش انگیز نہیں کہ انسان انسان سے ناامید ہو جائے۔

"صاحبِ اقتدار پارٹی کی یہ اخلاقی کمزوری نہ ہوتی کہ وہ اپنے رائے دہندوں کو کسی حال میں ناراض کرنے اور الیکشن کی کامیابی کو مشکوک بنانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی اور اپنی پارٹی کو برسرِ اقتدار رکھنے کے لئے وہ دنیا کی بڑی سے بڑی بے اصولی اور ناانصافی کا ارتکاب کر سکتی ہے، اگر برسرِ اقتدار پارٹی کی یہ مصیبت نہ ہوتی تو نظامِ تعلیم کو مکمل طریقہ پر سیکولر نامذہبی اور غیر جانبدار بنانے میں ذرا بھی دیر نہ لگتی جو مسلمانوں کے لئے وجہ شکایت ہے۔

"افسوس ہے کہ ہندوستان کی ملتِ اسلامی نے اپنی تاریخ کے اس نازک ترین دور میں ابھی تک اس کا ثبوت نہیں دیا کہ وہ اس خطرے سے آگاہ اور مستقبل کے لئے فکرمند ہے اس کے کارکن ابھی تک جوشِ عمل اور استقلال و استقامت سے خالی اور اس کے سرمایہ دار ایثار و قربانی سے عاری ہیں ——— ہمارا تعلیمی مسئلہ اور ملت کی حفاظت و استحکام کے بہت سے منصوبے وسائل کی کمی کی وجہ سے یا تو شروع نہیں ہو سکے یا تشنہ ناممکل پڑے ہوئے ہیں یہ صورت حال نہایت تشویشناک ہے۔

اگر خدانخواستہ ملت، ملت کی حیثیت سے باقی نہ رہی تو پھر افراد کا وجود محض حیوانی وجود بن کر رہ جائے گا جس پر نہ کسی صاحبِ ضمیر کو مسرت کا موقع ہے اور نہ وہ کسی عزت کی مستحق ہے۔"

حضرات! میں آپ سے اپنی تلخ نوائی کی معافی مانگنے اور اس پر معذرت کرنے کے بجائے اس پر متاسف و نادم ہوں کہ میں اس سے زائد تلخ نوائی کی جرأت نہ کر سکا اور میری قوتِ بیانی نے میرے دردِ دل کا ساتھ نہیں دیا۔ آپ کا شاکی ہوں لیکن خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہوں اپنی کوتاہیوں سے ڈر معلوم ہوتا ہے لیکن اس ملک میں ملتِ اسلامیہ کی تاریخ اس ملک کی موجودہ صورتِ حال اور اسلام کے پیغام کی ابدیت مجھ سے کہتی ہے کہ مسلمانوں کو اس ملک میں رہنا ہے اور اپنا مقدس اور ضروری کام کرنا ہے کہ نہ تو اس کام کا کوئی بدل ہے اور نہ آپ کا ابھی تک قائم مقام پیدا ہوا ہے

مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلماں کہ ہے
اس کی اذانوں سے فاش سرِّ کلیم و خلیل"

دینی تعلیمی کونسل کے صدر کی حیثیت سے مسلسل چالیس برسوں کے طویل تاریخی سفر میں حضرت مولاناؒ کا یہی اندازِ خطاب، یہی لب ولہجہ یہی طرزِ نگارش یہی انداز واسلوب گونجتا رہا ہے۔ اسی آواز نے طوفانوں کو آشکارا بھی کیا، یہی آواز مدافعت کا سہارا بھی بنی اسی آواز نے روح کو تڑپایا بھی، دلوں کو گرمایا بھی۔ یہی آواز جوش و جذبہ کا استعارہ بھی تھی اور اسی آواز نے ملک وملت کے شیرازۂ عملی کو سنوارا بھی، ستم رانوں کو للکارا بھی، اپنی ملت کو نیند سے جھنجھوڑا اور حالات کی نزاکتوں کا احساس دلاتے ہوئے ہر موڑ پر محبت سے پکارا بھی۔ یہی آواز تاریکیوں میں صبحِ فردا کی بشارت بھی تھی، مردِ مومن کی جسارت بھی تھی اور ایمان ویقین کے نغموں سے عبارت بھی تھی۔ آزاد ہندوستان میں یہی ایک آواز تھی جو دل کی گہرائیوں سے نکلتی تھی اور دوسروں کے دلوں کے تار جھنجھنا اٹھتے تھے۔ اس آواز کا اعتبار تھا، وقار تھا، افتخار تھا، اس آواز میں ملت کی بہی خواہی کا درد بھی تھا، ملک کی عظمت کو برقرار رکھنے اور جمہوریت، سیکولرزم اور عدم تشدد کی روایات کی صداقت اور ضرورت کا اعلان بھی تھا، اس آواز میں سچے محبِ وطن کی جھلک نمایاں تھی، اس آواز میں گرمئ گفتار بھی تھی، شانِ کردار بھی، دعائے نیم شبی کی بے قراری بھی تھی، فغانِ صبح گاہی کی زرنگاری بھی۔ نظامِ عالم کے سامنے کسی رعایت اور تکلف کے بغیر جرأت استقامت خودی اور خودداری کی مظہر بھی تھی اور اپنے خالق و مالک کے آگے یہی آواز اپنے

عاجزی، انکساری اور بندگی کے جذبات، رموز و نکات اور سرچشمۂ حیات سے واقف و باخبر بھی تھی اور اس کے حضور میں ہمیشہ سجدہ ریز و سرنگوں بھی۔

آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے بالخصوص پورے ملک اور عالم اسلام کے لئے بالعموم حضرت مولانا علی میاں کی ذات گرامی ایک شجر سایہ دار تھی خوش نصیب تھے وہ لمحات جنہیں ان کے ساتھ گذارنے کی سعادت حاصل ہوئی!

ایک عجیب وغریب بات یہ نظر آتی ہے کہ ایک ایسی شخصیت جس کا کوئی بدل اور نعم البدل نہیں جس کی ذات پر پوری ملت کا اتفاق جس کی نظیر ماضی بعید میں دور دور تک نظر نہیں آتی جس کی ہر بات حرف آخر سمجھی جاتی تھی لیکن دینی تعلیمی کونسل کے سلسلہ میں اپنی پوری مدت صدارت میں ایک لمحہ بھی ایسا نہیں آیا جب اس کا اظہار کیا گیا ہو اور کسی مسئلہ میں اپنی شخصیت کے مقام و مرتبہ اور اپنے عہدۂ صدارت کی عظمت کو اپنے کسی موقف یا منشا کی تائید میں استعمال کیا گیا ہو۔ ہر ہر موڑ پر اس نزاکت کا احساس نمایاں نظر آتا ہے۔ یہ مزاج و طبیعت کی خوبی اور خصوصیت بھی تھی اور عہدہ کو امانت سمجھنے کا ذہنی رجحان بھی تھا۔ ہر موڑ پر مشورہ، ہر قدم پر دوسروں کی رائے کا احترام۔ معاملات و مسائل کی ساری فکرمندی کے باوجود یہ فکر ساری فکروں پر غالب کہ تحریک و تنظیم میں سب کی اہمیت اور سب کا لحاظ ضروری ہوتا ہے۔ بڑوں کے علاوہ چھوٹوں کے ساتھ بھی ہمیشہ شفقت و محبت کے ساتھ یہی سلوک، یہی رویہ، یہی انداز۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ یہ انداز اس شخصیت کا تھا جس کا ایک جلوہ سب کے لئے مقدم تھا، لیکن حضرت مولانا کے طرز زندگی میں دل شکنی کا تصور بھی نہیں تھا دوسروں سے مشورہ اور دوسروں کی رائے کا احترام اسی جذبہ کی بنا پر تھا دینی

تعلیمی کونسل کے سلسلہ میں جو کاغذات محفوظ ہیں ان کے مطالعہ سے اندازہ ہوا کہ حضرت مولانا تنظیم و تحریک کے فروغ و استحکام کی فکر کے علاوہ مالیات کی فراہمی کے لئے بھی فکرمند رہتے تھے۔ پہلے دستور اور ضوابط کی پابندی کا نظام بھی مضبوط تھا۔ جیسا کہ عرض کیا گیا صدر کونسل کی حیثیت سے خود حضرت مولانا بھی ضابطہ کا لحاظ فرماتے تھے۔ قاضی محمد عدیل عباسی مرحوم خود تحریک کے بانی اور جنرل سکریٹری تھے لیکن پوری زندگی انھوں نے ضابطہ کی پاسداری کا خیال رکھا اور کبھی اس کی خلاف ورزی کے سلسلہ میں کسی کو اعتراض کا موقع نہیں ملا۔ بزرگوں کے اسی اخلاص کی بدولت برکت ورحمت کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔

حضرت مولانا کے چند خطوط سید اصغر حسین صاحب ایڈوکیٹ خازن و سکریٹری دینی تعلیمی کونسل اور مولانا محمود الحسن صاحب ناظم کونسل کے نام:۔

محترمی جناب خازن صاحب دینی تعلیمی کونسل!

دینی تعلیمی کونسل کے سلسلہ میں اس وقت فوری طور پر ایک سو انتیس روپئے کی ضرورت ہے، ۹۰ روپئے ٹیلی فون کے لئے جمع کرانے ہیں اور ۳۹ روپئے مولوی نذیر احمد صاحب کی تنخواہ بابت اکتوبر کے باقی رہ گئے ہیں اس کی ادائیگی ضروری ہے۔ اگر کوئی مانع نہ ہو تو محفوظ رقم میں سے یہ رقم ادا کردی جائے۔

والسلام

ابوالحسن علی

۱۵/۱۱/۶۰ء

مکرمی ومحترمی سید صاحب! زید لطفہ،

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

ابھی ابھی یونس سلیم صاحب ایڈوکیٹ حیدرآباد کا خط ملا۔ جن سے رٹ کے بابت مشورہ طلب کیا گیا تھا کہ وہ ۲۶ یا ۲۷ کو دہلی پہونچ رہے ہیں اتفاق سے میں اور مولانا منظور صاحب بھی دہلی جارہے

ہیں، انھوں نے لکھا ہے کہ دہلی میں اس مسئلہ پر بات چیت اور قانون دانوں سے مشورہ ہوجائے گا اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ظفر احمد صاحب بھی دہلی چلیں تاکہ اس مسئلہ کا فیصلہ ہوجائے چونکہ کونسل کے خزانہ میں اس وقت کچھ نہیں ہے اس لئے آپ ان کے کرایہ کہیں سے انتظام کردیں اور علی الحساب ۵۰ روپئے بھجوادیں میں اس رقم کا ذمہ دار ہوں وہ کل ۲۷ کو شب میں روانہ ہورہے ہیں۔

والسلام

ابوالحسن علی

۲۶ نومبر ۶۴ء

جناب خازن صاحب دینی تعلیمی کونسل!

کل مشورہ سے ظفر احمد صاحب کا بمبئی کا سفر تجویز ہوا ہے۔ مرکزی وزارت تعلیم نے جو نئی کمیٹی نصاب و نظام تعلیم پر غور کرنے کے لئے بنائی ہے اس کے سکریٹری بمبئی کے ایک مسلمان داؤد صاحب مقرر ہوئے ہیں ضرورت ہے کہ ان کو اپنا پورا کیس سمجھا دیا جائے اس سلسلہ میں بمبئی کے مخلص احباب سے مدد ملنے کی امید ہے اس بنا پر ظفر صاحب کا سفر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ براہ کرم رقم مذکورہ ایک صد فی الحال کسی مد سے دیدی جائے بعد میں اس کا تصفیہ ہوجائے گا۔

ابوالحسن علی ۲۷/۸/۶۴ء

مکرمی جناب مولانا محمود الحسن صاحب زید لطفہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

مکتوب گرامی ملا۔ رابطہ کا سفر بظاہر ملتوی ہے، اس سال جانے کا خیال ترک کردیا ہے اگر کوئی فوری صورت حال پیش نہ آئی تو بظاہر سفر نہیں ہے میں نے معذرت کا خط بھی لکھ دیا ہے۔

میں دسمبر کا مہینہ رائے بریلی گذارنا چاہتا ہوں بعض نہایت ضروری کاموں کی تکمیل بھی مقصود ہے اور میری صحت کا بھی تقاضہ ہے، اس مہینہ میں کوئی

سفر نہیں کر سکوں گا البتہ اگر عاملہ کا جلسہ اسی مہینہ میں ضروری ہو تو ایک دن کے لئے لکھنؤ آ سکتا ہوں۔
رائے بریلی کی کانفرنس آپ دسمبر میں بھی کر سکتے ہیں اور جنوری کے پہلے ہفتہ کی ابتدائی تاریخوں میں بھی۔

والسلام
خاکسار
ابوالحسن علی
۲ر دسمبر ۷۴ء

مکرمی جناب مولانا محمود الحسن صاحب زید لطفہ
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
مکتوب مورخہ ۱۸ر ستمبر ملا۔ اس سے پہلے والا خط بھی مل گیا تھا۔ جواباً عرض ہے۔
ا۔ سید اصغر حسین صاحب کو لکھ دیا گیا ہے کہ رقم کو جنرل فنڈ میں داخل فرمالیں اور ضروری مصارف واخراجات اس سے ادا کئے جائیں۔
۲۔ شاہ معین الدین صاحب کے ساتھ چلنے کی بہت کم توقع ہے احتیاطاً کل تک اور دیکھ لیجئے ممکن ہے کوئی دوسرے صاحب تیار ہو جائیں۔
۲۲ر اکتوبر تک میں واپس نہ آ سکوں گا واپسی کے بعد فوراً کسی کانفرنس میں شرکت کرنا مشکل ہوگا معلوم نہیں اس وقت صحت وغیرہ کی کیا کیفیت ہو اس لئے واپسی کے بعد ہی تاریخ کا تعین ہو سکتا ہے۔

والسلام
مخلص ابوالحسن علی

حضرت مولانا علی میاںؒ کا ایک اہم ترین مکتوب گرامی:۔

لکھنؤ مکرمی ومحترمی جناب مولانا محمود الحسن صاحب
ناظم دینی تعلیمی کونسل
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ آپ رائے بریلی آئے تو میں تکلیف میں تھا آپ سے ایک ضروری بات نہیں کر سکا۔ حاجی وکیل احمد صاحب جونپوری فارغ ہیں اور وہ اپنا پورا وقت دینی کام اور خدمت کے لئے دینا چاہتے ہیں۔ ان کو تعلیمی کام سے مناسبت بھی ہے، آپ بھی ان سے واقف ہیں، ڈاکٹر صاحب[1] اور ظفر صاحب[2] سے اس سلسلہ میں بات ہوئی ہے آپ سے براہ راست بات کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ کیا آپ کے نزدیک مناسب ہوگا کہ وہ آپ کے اور ظفر صاحب کے معاون کی حیثیت سے کونسل میں کام کریں؟ آپ کی مشغولیت بھی بہت بڑھی ہوئی ہے اور ظفر صاحب کی ذمہ داریاں بھی بڑھتی ہی چلی جارہی ہیں اور صحت کمزور ہوتی جارہی ہے۔ اگر آپ کے نزدیک وکیل صاحب سے آپ دونوں کو مدد مل سکتی ہے اور کونسل کے کام میں اس سے ترقی ہو سکتی ہے تو اس مسئلہ پر غور کر کے مجھے اپنی رائے سے مطلع کیجئے۔ ظفر صاحب اور ڈاکٹر صاحب سے مزید تفصیلات معلوم ہو سکتی ہیں، پھر اس کے بعد قاضی صاحب سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔
میں رائے بریلی جارہا ہوں آپ کے جواب کا انتظار کروں گا۔

والسلام مخلص
ابوالحسن علی
۲۵ر ۵ر ۷۸ء

تحریکوں اور تنظیموں کے داعیوں، ذمہ داروں اور کارکنوں کے لئے حضرت مولانا کا یہ مکتوب ایک سبق ہے۔ صدر کونسل کی حیثیت سے براہ راست تقرر کر دیا جاتا تو ممکن بھی تھا اور کسی کو اعتراض بھی نہ ہوتا لیکن ضابطہ کی خانہ پُری اور اس کی اہمیت کے پیش نظر ایسا نہیں کیا گیا۔ دوسرے بزرگوں نے اس کا لحاظ کیا۔ ظفر احمد صدیقی صاحب اور مولانا محمود الحسن صاحب کی ضروری تحریروں کے بعد قاضی محمد عدیل عباسی مرحوم نے وکیل احمد انصاری صاحب کا تقرر نائب ناظم کی حیثیت سے کر دیا۔ اس تقرر کی اجازت مجلس عاملہ سے پہلے ہی حاصل کی جاچکی تھی۔ پرانے ذخیرہ میں ایک کاغذ ایسا دستیاب ہوا ہے جسے دیکھ کر آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ دفتر دینی تعلیمی کونسل میں روزمرہ کی چند ضروری چیزیں خریدنے کے لئے قاضی محمد عدیل عباسی صاحب مرحوم نے جنرل سکریٹری ہونے کے باوجود ظفر احمد صدیقی صاحب سے درخواست کی ہے اس پر ظفر صاحب مرحوم نے خریدنے کی ہدایت دی ہے اور انچارج دفتر مولوی نذیر احمد نوری صاحب نے تعمیل ہو جانے کی تحریری اطلاع دی ہے، یہ ساری باتیں دیکھنے سے بہت معمولی معلوم ہوتی ہیں لیکن بزرگوں کا انداز وطریقۂ کار یہی تھا اور اسی سے تحریک کی شان قائم تھی۔
دینی تعلیمی کونسل نے پرائمری سطح تک ابتدائی تعلیم کا ایک مربوط نظام تیار کیا ہے۔ اس کا اپنا نصاب تعلیم ہے اپنی کتابیں ہیں۔ دینی تعلیم کے ساتھ عصری علوم اور ان کی تعلیم کا اردو میڈیم میں مکمل کورس مرتب کیا گیا ہے۔ اس تحریک نے دینی اور دنیاوی تعلیم کے دروازے کھلے رکھے ہیں۔ ایک غلط فہمی یہ ہوتی ہے کہ مکاتب میں زیر تعلیم طلبا عصری تعلیم سے محروم رہ جاتے ہیں۔ یہ خلافِ واقعہ ہے۔ کوشش یہ کی جاتی ہے کہ بچے پانچویں درجے تک دین کی بنیادی اور اہم باتیں حاصل کر لیں اردو لکھنا پڑھنا انھیں آجائے، قرآن پاک ختم کر لیں اور یہ بات ان کے ذہن میں بیٹھ جائے کہ وہ مسلمان ہیں اور ان کا ایک ملی تشخص ہے۔ اس کے بعد وہ اعلیٰ تعلیم کے لئے کسی بڑے دینی مدرسہ میں جائیں یا کسی سرکاری یا پرائیویٹ اسکول میں عصری تعلیم حاصل کریں۔ سرسید نے اپنی تعلیمی تحریک کے سلسلے میں بڑی سطح سے بلند آہنگی کے ساتھ ایک

[1] ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی صاحب [2] ظفر احمد صدیقی مرحوم

بات کہی تھی جوان کی فکر اور نقطۂ نظر کی ترجمانی کے لئے آج تک دہرائی جاتی ہے۔

"ہم ایک ایسی قوم بنانا چاہتے ہیں جس کے داہنے ہاتھ میں قرآن، بائیں ہاتھ میں سائنس اور فلسفہ اور اس کی پیشانی پر کلمہ طیبہ کا تاج چمک رہا ہو۔"

دینی تعلیمی کونسل نے سرسید کے اس خیال کو جلا بخشی ہے۔ یہ تصور پایۂ تکمیل تک کیسے پہونچے گا اگر اس کی ابتدا میں اس کا لحاظ نہ رکھا جائے آغاز سفر میں مستقبل کا خاکہ مرتب نہ کیا جائے تو آسودگی میسر نہیں آسکتی ہے۔ اس تحریک میں نظم وضبط، مکاتب کا الحاق، اضلاع میں انجمن تعلیمات دین کا قیام، تنظیم کا استحکام اور ایک باہمی ربط و اتحاد کی ضرورت اسی لئے ہوتی ہے کہ اس سے اجتماعیت کی طاقت اور اس کے فیوض و برکات نمودار ہوتی ہیں، تاریخ نے گذشتہ چالیس برسوں کی جد وجہد کو اپنے سینے میں محفوظ کیا ہے۔ سنجیدہ خاموش اور مثبت انداز فکر اور خدمات کا جو شاندار ریکارڈ ہے اس کے ہر صفحہ وسطر میں حضرت مولانا علی میاں کی شخصیت جلوہ گر ہے۔ اس مدت میں حکومتوں کے فیصلوں اور ان کے بنائے ہوئے نصاب و نظام تعلیم نے جو انقلاب برپا کرنا چاہا اس کی بروقت مدافعت نے طوفانوں کا رخ موڑ دیا اور ملت اسلامیہ بڑے حادثات سے محفوظ رہ گئی ہے مکاتب کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد درجہ ۶ میں داخلہ کی آسانی، کرپلانی کمیٹی کی رپورٹ، باسوال کمیٹی کی رپورٹ ۵۹ء کا خطرناک نصاب تعلیم جس میں پوجا پاٹ کو لازمی کیا گیا تھا۔ ان پہاڑوں کو راہ سے ہٹانے کے لئے دینی تعلیمی کونسل نے تیشۂ فرہاد کا کام کیا ہے۔ جن نازک ادوار سے گذر کر قافلہ یہاں تک پہونچا ہے، ان کی ہمیں خبر بھی نہیں ہے۔ قاضی محمد عدیل عباسی مرحوم جھوم جھوم کر اکثر یہ شعر پڑھتے تھے ۔

آگ ہے اولاد ابراہیم ہے نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

حضرت مولانا اپنی تقریروں اور تحریروں میں اس شعر کو اپنے ذوق وشوق کا ترجمان بناتے تھے ۔

حکیم میری نواؤں کا راز کیا جانے
ورائے عقل ہیں اہل جنوں کی تدبیریں

حکومت کی درسی کتابوں میں مسلمانوں کی دینی غیرت وحمیت اور ان کی اسلامی فکر کے برعکس اسباق کی شمولیت، ان کی بروقت نشاندہی اور ان کے خلاف آئینی اور دستوری جد وجہد اور اس سلسلہ میں کامیاب کوششوں کے مظہر کے طور پر ظفر احمد صدیقی مرحوم اور دوبارہ حبیب اللہ اعظمی صاحب نے دینی تعلیمی کونسل کی طرف سے کتابوں کا جو جائزہ پیش کیا اس کی گونج اسمبلی اور پارلیمنٹ تک سنائی دی اور یہ مسئلہ کسی حد تک حل ہو سکا۔

ایک اہم مسئلہ ۱۹۸۹ء میں منیمم ویجز ایکٹ MINIMUM WAGE کا سامنے آیا جس میں مدارس و مکاتب کے لئے اپنے قیام وجواز کے لئے لائسنس لینے کی پابندی لگائی گئی تھی، جو بعد میں واپس لے لی گئی، دینی تعلیمی کونسل کی طرف سے یکم و۲ جون ۸۹ء کو ندوۃ العلماء میں عربی مدارس و مکاتب کا ایک کل ہند کنونشن منعقد ہوا۔ مولانا منت اللہ رحمانی صاحب نے اس کی صدارت فرمائی تھی۔ جناب سید حامد (سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) نے افتتاح کیا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب حضرت مولانا علی میاںؒ صدر کونسل ہونے کے باوجود مجلس استقبالیہ کے صدر بھی تھے اور اسی حیثیت سے پورے ملک کے سامنے اپنا خطبۂ استقبالیہ پیش کیا تھا۔ اس کنونشن کی اہمیت کے پیش نظر اس کا دعوت نامہ بھی پہلی مرتبہ حضرت مولانا کی طرف سے جاری ہوا تھا۔

کسی تعلیمی مسئلہ پر مسلمانوں کا اتنا بڑا اجتماع کم دیکھنے میں آیا۔ اس دور کے اخبارات سے فضا وماحول اور مسلمانوں کی گرم جوشی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ حضرت مولانا نے فرمایا:۔

"میں آپ کا اس قدیم علمی وتعلیمی شہر لکھنؤ میں مسلمانان شہر، محبان علم اور دینی تعلیمی کونسل کے ارکان، کارکنوں اور داعیوں کی طرف سے پرخلوص طریقہ پر استقبال کرتا ہوں۔ آپ ایک اہم اور نازک ملت اسلامیہ ہندیہ کے علم و دین سے ربط وتعلق اور ملی تشخص کے دوام و بقا یا (خدانخواستہ) زوال و فنا کے ایک فیصلہ کن مرحلہ پر یہاں جمع ہوئے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر ذمہ داران حکومت صحیح معنیٰ میں حقیقت پسند اور محب وطن ہوں تو ان کو ہر ایسی کوشش اور ہر ایسے ادارہ کو نہ صرف باقی رہنے کی اجازت دینی چاہئے، بلکہ اس کی ہمت افزائی اور قدر دانی کرنی چاہئے جو ملک میں علم وخواندگی اور ثقافت وتہذیب کی اشاعت وترقی اور ان کی توسیع میں مدد دے۔

ہم اپنا جمہوری، مذہبی، اخلاقی اور شہری حق سمجھتے ہیں کہ اس کے خلاف آواز بلند کریں کہ ملک کے دستور نے ہر اقلیت اور ہر اکائی کو اس کی اجازت دی ہے کہ وہ اپنی پسند کے مدارس قائم کرے اور اپنی پسند اور صوابدید کے مطابق ان کو چلائے۔ ہم خالص حب الوطنی اور ہندوستان کے لئے اس کو باعث فخر سمجھنے کی بنا پر بھی یہ کہتے ہیں کہ تعلیم وتربیت اور ثقافت وتہذیب

کے پھیلانے میں ایثار و قربانی کی اس روایت کو جو ہندوستان کی قدیم تاریخ کا بھی طرۂ امتیاز رہا ہے، باقی رہنا چاہئے۔

حضرت مولانا علی میاںؒ متفقہ طور پر چالیس برس تک دینی تعلیمی کونسل کے صدر رہے۔ اس قیام کے ابتدائی دنوں میں انتہائی نازک اور تشویشناک دور وہ تھا جب حکومت نے اسکولوں میں پوجا پاٹ کو شامل کر دیا تھا اس کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے دوبارہ اسی طرح کا ایک نازک مرحلہ ۱۹۹۷ء میں پیش آیا جب حکومت اتر پردیش نے نئے عزم و حوصلہ کے ساتھ اسکولوں میں وندے ماترم کو نافذ کیا اور بھارت ماتا کی تصویر پر پھول چڑھانا لازمی قرار دیدیا گیا۔ کلپ یوجنا کے نام سے ایک پوری تعلیمی اسکیم کا خاکہ تیار ہوا اور بڑے تیور کے ساتھ اس کی تعمیل کا جی۔ او بھی ہو گیا۔ یہ اندازہ نہیں تھا کہ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کے سامنے اب پھر یہ مسئلہ اسی خطرناکی اور شدت کے ساتھ آجائے گا۔ اقبالؔ نے کہا تھا ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

دینی تعلیمی کونسل نے حسب روایت قدیم سب سے پہلے اس مسئلہ کو اٹھایا اور پوری طاقت سے اس کی مخالفت کا اعلان کیا گیا۔ اس کی غیر دستوری اور غیر آئینی حیثیت کو نمایاں کیا گیا۔ جنرل سکریٹری کی حیثیت سے ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی صاحب نے مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے علاوہ دوسرے ذمہ دار اداروں کو متوجہ کیا، پوری ریاست اتر پردیش میں اس کے خلاف ایک فضا بنا دی گئی، لیکن طریقۂ کار ہمیشہ کی طرح وہی رہا کہ مطالبہ دستور ہند کی روشنی میں کیا جاتا رہا۔ غیر جذباتی انداز میں سنجیدہ استدلال کا ایک طوفان کھڑا کر دیا گیا۔ دینی تعلیمی کونسل نے اس موضوع پر نہایت اہم اور مفید لٹریچر تیار کیا۔ ۲۶، ۲۷ر اپریل ۱۹۹۸ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے کنیڈی ہال میں دینی تعلیمی کونسل کا ریاستی کنونشن ہوا جس میں حضرت مولانا علی میاںؒ اپنی بیماری کے باوجود تشریف لے گئے اور اپنا خطبۂ صدارت خود پڑھا۔ صدر کونسل کی حیثیت سے یہ حضرت مولانا کا آخری خطبہ ہے جس میں یہ اعلان کیا گیا:۔

" یہ ملک کو ایسی خطرناک منزل کی طرف لیجانے کا اقدام ہے جس کے تصور سے ایک محب وطن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس کی راتوں کی نیند حرام ہو جاتی ہے۔"

اسی سلسلہ میں ایک موقع پر ندوۃ العلماء میں صحافیوں کی ایک بڑی تعداد کے سامنے حضرت مولانا نے ایک جرأت مندانہ اور مومنانہ اعلان کر کے پورے ملک کو چونکا دیا۔ مسلمانوں میں جوش و جذبہ کا اضافہ ہوا، حکومت جو ابھی تک متوجہ نہیں ہو رہی تھی اور اس اسکیم کو نافذ کرنے کا تہیہ کئے ہوئے تھی اچانک اس کے رویہ میں تبدیلی آئی اور فضا کا رنگ درخ یکسر بدل گیا۔ مولانا نے اپنے انٹرویو میں کہا:۔

"اگر یہ صورت حال باقی رہتی ہے اور حکومت وندے ماترم اور پھول چڑھانے کا غیر اسلامی فیصلہ تبدیل نہیں کرتی ہے تو ایسے تمام اسکولوں سے مسلمان اپنے بچوں کو نکال لیں گے، ہمارے لئے تعلیم سے زیادہ عقیدہ اور دین کی حفاظت کا مسئلہ اہم ہے۔"

اس پوری صورت حال کو دینی تعلیمی کونسل نے اپنی رپورٹ (مرتبہ راقم سطور) اور مضامین و مراسلات میں محفوظ کر دیا ہے، اسی درمیان ایک غیر متوقع اور غیر اخلاقی اور غیر شریفانہ حرکت یہ کی گئی کہ حضرت مولانا کی عدم موجودگی میں رائے بریلی میں حضرت کی قیام گاہ پر چھاپہ ڈالا گیا۔ اس واقعہ کی گونج پوری دنیا میں سنائی دی۔ مولانا کا اعلان حق گونج رہا تھا اس میں اس واقعہ کا اضافہ ہوا تو حکومت خود بوکھلا گئی۔ تمام سیاسی جماعتوں کے ساتھ حکمراں جماعت کے ذمہ داران مولانا کی خدمت میں حاضر ہو کر معذرت اور ندامت کا اظہار کرنے لگے اور اسی کیفیت میں چند روز کے اندر حکومت نے وندے ماترم کا حکم اور وہ پوری اسکیم واپس لینے کا اعلان کر دیا۔ مولانا نے اس پر اظہار اطمینان کرتے ہوئے حکومت کا شکریہ بھی ادا کیا اور یہ امید ظاہر کی کہ آئندہ اس طرح کی حرکتوں سے اجتناب کیا جائے گا۔

دینی تعلیمی کونسل کے پلیٹ فارم سے حضرت مولاناؒ کی آخری تقریر

شدید بیماری سے کچھ افاقہ ہوا تو خود دریافت فرماتے تھے کہ جلسہ کب ہوگا، دینی تعلیمی کونسل کا کیا حال ہے ہر لمحہ اس فکرمندی کا اظہار ہوتا رہتا تھا اسی حالت میں ۱۲ر نومبر ۱۹۹۹ء کو ندوۃ العلماء کے سلیمانیہ ہال میں کونسل کا ایک جلسہ خود حضرت مولانا کی صدارت میں منعقد ہوا جسم کمزور، زبان میں ہلکی لکنت، آواز لرزیدہ لیکن انداز بیان میں وہی چمک، وہی شان، وہی پیغام مسلمانوں کو متنبہ کرتے ہوئے فرمایا:۔

"دینی تعلیم ان کے وجود و بقا اور اعتبار و وقار کے لئے ضروری ہے۔ اسلام نے تعلیم کا رشتہ توحید کے ساتھ وابستہ کیا ہے اس لئے ضروری ہے کہ مسلمان خود بھی اس پر قائم رہیں اور آئندہ نسلوں تک اسے منتقل کرنے کی فکر کریں۔ اللہ کی طرف سے مسلمانوں کے وجود و بقا اور ارتقاء کے لئے مشروط فیصلہ ہے، الحمدللہ ہندوستانی مسلمانوں نے سوچ سمجھ کر اس کا فیصلہ کیا

ہے، انھیں فریضہ کی ادائیگی کے طور پر اس کو انجام دینا چاہئے اور دینی تعلیمی کونسل نے اس مدت میں جو کار ہائے نمایاں انجام دئیے ہیں وہ یقیناً اللہ کے یہاں قبول ہوں گے، تمام تنظیموں اور تحریکوں اور مسلم دانشوروں کو اس کی قدر کرنی چاہئے اور اس کے ساتھ تعاون کرنا چاہئے۔

حکومت کی تعلیمی پالیسی کی بنا پر مسلمانوں کے اندر جو اضطراب کی لہر دوڑ گئی تھی صرف مسلمانوں کے باہمی اتحاد و اتفاق اور دینی تعلیمی کونسل کی سنجیدہ اور آئینی حکمت عملی سے ان پر قابو پایا جاسکا۔ اگر ذہن وفکر میں یہ تصور اور تاثر باقی رہا تو مستقبل میں کامیابیوں سے ہمکنار ہوں گے۔"

دینی تعلیمی کونسل سے حضرت مولانا کا روحانی تعلق تھا جس کا ایک مظاہرہ بالکل آخر میں اس وقت ہوا جب دبئی کی طرف سے ایک عظیم الشان ایوارڈ ملا اور اس میں سے ایک لاکھ کی خطیر رقم حضرت مولانا نے دینی تعلیمی کونسل کو بھی ہدیہ کے طور پر عنایت فرمائی۔

۳۱ر دسمبر ۱۹۵۹ء کو حضرت مولاناؒ نے دینی تعلیمی کونسل کی صدارت قبول فرمائی تھی۔ پورے چالیس برسوں تک مربیانہ سرپرستی اور رہنمائی کا طویل سلسلہ جاری رہا اور بالآخر حکمت خداوندی اور مشیت کی کارفرمائی کا ظہور ہوا۔ ۳۱ر دسمبر ۱۹۹۹ء کو علم ومعرفت اور رشد وہدایت کا سورج جمعہ کے روز رمضان کے مہینہ میں روزہ کی حالت اور پوری طرح نماز کی تیاری میں مصروف اور خود اپنی زبان سے مغفرت اور اجر عظیم کی بشارت کی آیت قرآنی (سورہ یٰسین) پڑھتے ہوئے غروب ہوگیا ؎

پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

اللہ نے اپنی رحمت سے تقویت کا سامان پیدا کیا۔ حضرت مولانا محمد رابع ندوی صاحب نے دینی تعلیمی کونسل کی صدارت قبول فرمائی۔ نسبت باقی رہ گئی، ٹوٹے ہوئے دلوں کو سہارا مل گیا۔ نصف صدی میں دار العلوم ندوۃ العلماء کے قابلِ احترام اور بزرگ اساتذہ، نیز طلباء عزیز اور پورے ملک میں پھیلی ہوئی ندوی برادری سے جو مخلصانہ اور مشفقانہ تعلق قائم تھا وہ اب انشاء اللہ مولانا محمد رابع صاحب کے توسط سے قائم رہے گا۔ ہم حضرت مولانا علی میاںؒ کی شخصیت سے محروم ہو گئے، لیکن ان کے حلقہ اور سلسلہ کی سرپرستی ہمیں حاصل رہے گی اور ہم اس سے فیض یاب ہوتے رہیں گے۔ ندوۃ العلماء اور دینی تعلیمی کونسل ہمارے حضرتؒ کے قلب ونظر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان اداروں کو سرسبزی وشادابی نصیب فرمائے۔ دونوں کی رہنمائی اس وقت بھی قدرت کی طرف سے اسی خانوادۂ علمی کے سپرد کی گئی ہے۔

حضرت مولاناؒ نے قاضی محمد عدیل عباسی مرحوم کے انتقال پر اپنے تاثرات کا اظہار جن الفاظ میں کیا تھا وہ اس وقت ان کی ذاتِ گرامی سے محروم ہو جانے کے بعد خراج عقیدت کے طور پر خود حضرت مولانا کے لئے پیش کیا جاسکتا ہے:۔

"دینی تعلیمی کونسل ان کے ہاتھ کا لگایا ہوا پودا ہے جس کی انھوں نے اپنے خونِ جگر سے آبیاری کی اور جس کی افادیت اور اہمیت نہ صرف روز بروز بڑھے گی اور شدت سے محسوس کی جائے گی۔ اب جب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں تو ہمارا اور زیادہ فرض ہے کہ اس کی حفاظت کریں اور اس کو ترقی دینے کی کوشش کریں کہ یہ ان کی عزیز ترین یادگار ہے۔ اس سے ان کی روح کو حقیقی شادمانی ہوگی۔ دوسرے یہ وقت کی سب سے بڑی ضرورت بھی ہے اور اس کے بغیر ہندوستان میں مسلمانوں کا دینی مستقبل اور ان کی آئندہ نسلوں کا ایمان اور اس کے اسلامی عقائد اور اس کی ثقافت وتہذیب سے وابستگی خطرہ میں ہے۔ میری تمام دردمند مسلمانوں سے اپیل ہے کہ وہ دینی تعلیمی کونسل کے کاموں کو آگے بڑھانے کی کوشش کریں، اس کی شاخوں اور ضلعی مرکزوں کو وسیع کرنے اور اس کے قائم کردہ مکاتب کو جس میں لاکھوں بچے زیر تعلیم ہیں مضبوط ومنظم کرنے کی فکر کریں۔"

بیادِ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

● رؤف دانش فیض آبادی

وہ جس کی یاد میں سارے جہاں نے اشک برسایا
وہ جس نے سارے عالم میں امامت کا لقب پایا
خدا کے فضل سے جس نے کلیدِ کعبہ بھی پائی
غلامی مل گئی کعبہ کی یہ اعزاز بھی پایا
وہ علم اللہ کا تکیہ جو رمضاں کے مہینے میں
تلاوت ہوتی رہتی تھی جہاں تھا نور کا سایا
اسی ماہِ مبارک میں یکایک صحن مسجد میں
قرآن پاک کے سایہ میں پیغامِ اجل آیا
یہ اُن کا مرتبہ ہے آج خود دربارِ یزدی میں
کہ اس ماہِ مبارک میں اُنھیں خالق نے بلوایا
وہ فخرِ قوم وہ شیخ حرم ندوہ کا دلدادہ
انھیں اوصاف کو لیکر ہر اک مسئلہ کو سلجھایا
رؤف اب ان حریمِ ناز کے جلوے نہ دیکھوگے
جسے شیخ حرم نے گل بہ داماں ہوکے دکھلایا

ذاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے

حضرت مولانا کی محبت ووارفتگی

پروفیسر محمد اجتبا ندوی سابق صدر شعبہ عربی الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

دیارِ حبیبؐ، شہر آرزو، مرکز تمنا، منبع نور، چشمۂ رحمت، گہوارۂ علم وعرفان، حکمت ودانش، مخزنِ فیوض، اخلاص ووفا، صدق وصفا، محود دعوت و صلاح وفلاح، انقلاب آفریں دار الہجرۃ، اور دلآویز ودلنواز، مردم گر وانسان ساز مدینۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت، اس میں قیام، اس سے محبت، اس سے عشق، اس سے تعلق، اس سے وابستگی وشیفتگی، اس کے محبوبؐ پاک دل پاکباز ومحترم مکین، رہبر انسانیت، پیغمبر اخلاق، خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت وپیغام کے لئے ایثار وقربانی، جاں نثاری وسرفروشی، دل سوزی ودرد وتڑپ، بے قراری وبے چینی، بے آرامی وبے خوابی، اشک ریزی وگریہ وزاری، مخدوم معظم ومربی جلیل حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا نمایاں وصف اور امتیازی شناخت تھی۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ جس نیک سیرت خانوادہ کے چشم وچراغ تھے اس میں تسلسل کے ساتھ پیغام محمدیؐ اور دعوت ابراہیمیؑ کے لئے جذبہ وحوصلہ، جوش ومحبت، اور حضور وسرور کی کیفیت جاری وساری رہی، آنکھ کھولتے ہی سیرت رسولؐ، دعوت نبویؐ اور سنت مطہرہ پر عمل اور اس کا تذکرہ سنا اور دیکھا، اور وہی عشق ومحبت اور جذب ومستی، رگ وپے میں سما گئی، اور ہمہ وقت دل میں نور اور آنکھوں میں سرور اسی ذات گرامی صلی اللہ علیہ وسلم کے انوار وفیوض سے جلوہ گر رہتا تھا، یہی نہیں بلکہ تعلیم وتربیت کا آغاز بھی قرآن مجید کے بعد سیرت نبویؐ ہی سے ہوا، اپنی محسن کتاب "رحمۃ للعالمین" کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"میرے برادر معظم ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب رحمۃ اللہ علیہ (جو میرے والد کی وفات کے بعد اس وقت سے میری تعلیم وتربیت کے ذمہ دار رہے جب میری عمر نو سال کی تھی) اس بات کا خاص خیال رکھتے تھے کہ اس کم سنی اور نوعمری میں کن کتابوں کا مطالعہ میرے لئے مفید ہوگا اور کتابوں کے انتخاب میں توفیق الٰہی برابر ان کا ساتھ دیتی، چنانچہ انھوں نے مجھے ایک کتاب "سیرت خیر البشر" پڑھنے کے لئے دی، ان کی بڑی خواہش تھی کہ میں سیرت کی کتابوں کا زیادہ سے زیادہ مطالعہ کروں، ان کا عقیدہ تھا کہ کردار کی تعمیر، عقیدہ کی پختگی، اخلاق کی بالیدگی، اور ایمان کی تخم ریزی وپرورش کے لئے سیرت سے زیادہ مؤثر کوئی چیز نہیں، اسی لئے شروع ہی سے سیرت کی کتابوں سے مجھے ایک خاص لگاؤ اور ان کے مطالعہ اور حصول کا جذبہ پیدا ہوگیا"

(کاروان مدینہ ص ۲۰-۱۹)

حضرت رحمۃ اللہ علیہ جس کتاب کا احسان کبھی بھول نہ سکے اور جو ان کی سیرت وکردار کے لئے سنگ میل اور روشنی کا مینار ثابت ہوئی وہ مولانا قاضی سلیمان منصور پوریؒ کی کتاب "رحمۃ للعالمین" تھی، فہرست کتب میں اس کا نام دیکھ کر منگانے کا آرڈر دیدیا کم عمری میں رقم اور قیمت پر نظر نہیں جاتی، ڈاکیہ کتاب لے کر تکیہ کلاں آیا تو اس V.P. کے چھڑانے کے لئے پیسے نہیں تھے، والدہ معظمہؒ کو پیشگی اس کا علم نہ تھا، رقم پاس نہ ہونے کی وجہ سے کتاب لینے سے معذرت کردی، کوئی مددگار اور سفارشی بھی نہ تھا، لیکن بچہ کی ایک سفارش کو "ممتا" کبھی رد نہیں کرسکتی اور وہ ہے معصوم آنسوؤں کی سفارش چنانچہ والدہ معظمہ کا دل بھر آیا، انکار آنسوؤں میں ڈھل گیا، کتاب بچہ کے ہاتھ میں تھی، یہی وہ آنسو اور گریہ وبکا تھا جس نے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے والہانہ عشق اور ان کی دعوت وپیغام سے سرشار کردیا، کتاب کیا تھی اور اس کی تاثیر ودلپذیری کیسی تھی مولانا کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

"اب میں نے کتاب پڑھنا شروع کیا، اور کتاب نے میرے دل کو ہلا کر رکھ دیا، لیکن یہ کوئی تند وتیز ناگوار اور پریشان کن تحریک نہ تھی، یہ بہت نرم گداز اور روح پرور وجاں سوز تحریک تھی، میرا دل خوشی سے اس طرح جھوم اٹھا جیسے باد بہاری سے کوئی شاخ گل جھوم اٹھے اور پھولوں کے بوجھ سے لٹک جائے۔"

(کاروان مدینہ ۲۱-۲۰)

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اس کتاب سے اپنی ہم آہنگی اور لطف ولذت اور روحانی کیف ومسرت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"یہ روح کی لذت ہے، کیا بچے روح نہیں رکھتے اور ان کو روحانی لذت کا احساس نہیں ہوتا؟ نہیں، بخدا معصوم بچے بڑوں سے زیادہ لطیف روح کے مالک ہیں اور زیادہ صحیح شعور رکھتے ہیں، خواہ وہ اس کو بیان نہ کرسکیں۔" (ص-۲۱)

اس سرور انگیز اور وجد آفریں کتاب میں سادہ دل اور معصوم بچے نے مکی ومدنی زندگی کے ایمان افروز واقعات پڑھے تو دل محبت وعشق سے لبریز ہوگیا اور جب ہجرت کے موقع پر ناقۂ نبویؐ قبا سے یثرب کی جانب روانہ ہوئی تو شہر کا ہر باشندہ اور ہر فرد اس محبوب مہمان کی میزبانی کا شرف حاصل کرنے کے لئے چشم براہ وفرش راہ بن گیا لیکن یہ عز وشرف حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کو ملنا تھا، مولاناؒ تحریر فرماتے ہیں:

"میں اس عزت پر ابو ایوب انصاریؓ کی مسرت کو پڑھ سکتا تھا جو تقدیر نے ان کے دروازے تک پہونچا دی تھی اور دیکھ سکتا تھا کہ وہ کس مسرت وگرمجوشی کے ساتھ آپ کی ضیافت کررہے ہیں۔

میں نے ایسا محسوس کیا جیسے میرا دل مجھے چھوڑ کر اب ناقۂ نبویؐ کے ساتھ ساتھ ہے اور اسی کی ہم رکابی میں مدینہ پہونچا ہے مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کہ یہ دلکش سماں میں اپنی ان آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں، فاتحین وسلاطین اور تاریخ کے نامور قائدین کے فاتحانہ داخلے جاہ وحشم کے مظاہرے، اور چوب داروں کے نقارے مجھے اس وقت بالکل ہیچ اور ناقابل ذکر معلوم ہونے لگے، کسی انسان سے کسی انسان کی محبت ووفاداری کا یہ منظر میرے دل میں اور میرے حافظہ پر ہمیشہ کے لئے نقش ہوگیا۔" (ص-۲۳)

کتاب "رحمۃ للعالمین" کی اثر آفرینی ہی تھی کہ محبت کے تمام مخفی سوتے ابل پڑے اور وہ معصوم دل محبت کی لذت سے آشنا ہوا جس نے اس بچہ کو ایک عظیم داعی، عالمگیر شخصیت، نامور مفکر، جلیل القدر عالم، ممتاز مصنف، دانشمند مربی اور روحانی وربانی عارف ومصلح بنادیا، جس کی مثال صدیوں میں ملا کرتی ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے واقعات، صحابہ کرامؓ کی گرویدگی، فریفتگی، ایثار وقربانی فدائیت وجاں نثاری، اتباع وفرمانبرداری، دعوت کے فروغ کے لئے منافست اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کا جذبہ وولولہ، اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے جدوجہد اور اس کی راہ میں جان، جان آفریں کے سپرد کردینے کی آرزو، تمنا اور خواہش، کتاب نے ان کی جس مؤثر وسحر انگیز انداز سے تصویر کشی اور پیکر تراشی کی ہے اس نے آئندہ زندگی کو متحرک وفعال بنادیا، جس کی وجہ سے کتاب وصاحب کتاب کے لئے ہمیشہ سراپا شکر وسپاس رہے، فرماتے ہیں:

"اس کتاب اور صاحب کتاب کا میں دل سے شکر گذار ہوں اس لئے کہ اس نے میری محبت کے پرسکون ساز کو چھیڑ دیا اور اس بات کا بھی شکر گذار ہوں کہ اس نے اس ابھرتی ہوئی متحرک اور زندہ وبیدار محبت کا رخ اس شخصیت کی طرف پھیر دیا جس سے زیادہ محبت کا کوئی اور حقدار نہیں، جو اس کائنات میں حسن واحسان اور جمال وکمال کا سب سے بڑا پیکر ہے، اور جس سے زیادہ صورت وسیرت اور کمال ظاہر وباطن کا دلکش انسانی نمونہ خالق ومالک اور قادر مطلق نے کوئی اور نہیں بنایا۔ (صلی اللہ علیہ وسلم)

(کاروان مدینہ ص ۲۵)

آخر میں بڑے درد کے ساتھ فرماتے ہیں اور مجسم احسان بن کر دست بدعا ہیں:

"اس امت کی سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ اس نے دل سے اپنا رشتہ توڑ لیا ہے، اور محبت کی لذت سے محروم ہے، اقبالؒ نے بالکل صحیح کہا ہے:

شبے پیشِ خدا بگریستم زار
مسلماناں چرا زارند وخوارند
ندا آمد نمی دانی کہ ایں قوم
دلے دارند ومحبوبے ندارند

خدا کی سلامتی ہو آپ پر اے سلیمان! مجھے آپ کی کتاب سے دو ایسی نعمتیں حاصل ہوئیں کہ اسلام کے بعد ان سے بڑی کوئی اور نعمت نہیں، ایک محبت کی نعمت، دوسرے اس کے صحیح محل اور مصرف کی نعمت، اور واقعی یہ نعمت کتنی بڑی ہے!!" (ص ۲۶)

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے انھیں دونوں نعمتوں کی پر نور وضیا پاش فضاؤں میں دعوت واصلاح، فکر وتربیت کے میدان میں، رہنمائی وسرپرستی فرمائی اور نبویؐ ورثہ کے بقاء وتحفظ اور اس کے فروغ وارتقار کے لئے بیش بہا کارنامے انجام دیئے، جو رہتی دنیا تک روشنی ورہنمائی کا فریضہ ادا کرتے رہیں گے۔

حضرت رحمہ اللہ کی تقریر وتحریر میں یہی والہانہ محبت اور سوز وعشق کی گرمی نمایاں رہتی تھی، اور ان کی دعوت وپیغام کا محور یہی محبت واتباع سنت تھی، شمائل وسیرت کی کتابیں زیر مطالعہ رہتیں اور قوم وامت اور نئی نسل کو اس جانب متوجہ فرماتے اور اس کی کمی پر افسوس

وحسرت کا اظہار فرماتے، اپنے ایک مضمون میں رقمطراز ہیں:-

"یہ وہ سرچشمۂ محبت ہے، جس سے سب سے زیادہ محروم ہمارا جدید تعلیم یافتہ اور مغرب زدہ طبقہ ہے، اور اس محرومی کا نتیجہ یہ ہے کہ آج اس کی روح سب سے زیادہ بے سرور وکیف ہے اس کے مادیت کی دلفریبیوں کے اندر مقابلہ کی طاقت سب سے کم ہے، وہ ملت کے دوسرے طبقوں سے زیادہ بے اثر وبے وزن ہے، اس کی زندگی سب سے زیادہ مکدر وبے لطف اور اس کی کوششیں سب سے زیادہ بے مقصد اور رائیگاں ہیں۔" (ص ۲۵)

حضرت مولانا رحمہ اللہ نے ان تمام شخصیتوں اور مفکرین وصالحین سے انس وقرب محسوس کیا جنہیں حب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نعمت حاصل ہوئی، جن میں ڈاکٹر محمد اقبال بھی تھے جن کی فکری ہم آہنگی، بلند حوصلگی، محبت وایمان کے باوصف ان کے عشق رسول ﷺ اور ان کے کیف وسرور اور تڑپ ودلسوزی نے بہت زیادہ متاثر بھی کیا اور قریب بھی کیا، اور اسی جذبہ نے (دوسرے تقاضوں کے ساتھ) "نقوش اقبال"، جیسی شاہکار کتاب رقم کرائی جو ادب کا شہ پارہ بھی ہے اور عشق وسرور اور جذب ومستی کا آئینہ بھی، فرماتے ہیں:-

"ڈاکٹر محمد اقبال کی پوری زندگی عشق رسول ﷺ اور یاد مدینہ سے معمور تھی، ان کا زندہ جاوید کلام ان دونوں کے تذکرے سے بھرا ہوا ہے، لیکن آخری ایام میں یہ پیمانۂ عشق اس طرح لبریز ہوا کہ مدینہ کا نام آتے ہی اشک محبت بے ساختہ جاری ہو جاتے۔۔۔، وہ اپنے اس کمزور جسم کے ساتھ یقیناً مدینۃ الرسول میں حاضر نہ ہو سکے لیکن اپنے مشتاق اور بے تاب دل، نیز اپنی قوت تخیل اور زور کلام کے ساتھ انھوں نے حجاز کی وجد انگیز فضاؤں میں بار بار پرواز کی اور ان کا طائر فکر ہمیشہ اسی آشیانہ یا آستانہ پر منڈلاتا رہا۔" (نقوش اقبال ص ۲۴۷)

حضرت مولانا رحمہ اللہ نے بچپن ہی سے مکہ مدینہ، شعائر حرم، مقدس مقامات کے نام سنے، ان سے متعلق جذب وشوق، وہاں پہونچنے اور وہاں کی جاروب کشی اور وہاں ہی پیوند خاک ہو جانے کے جانفزا نغمے سنتے رہے، سن شعور تک یہ فرق نہ کر سکے کہ مکہ اور مدینہ دو الگ الگ محبوب شہروں کے نام ہیں، سیرت وتاریخ کے مطالعہ کے بعد نہ صرف شناخت ہوئی بلکہ ان کی اہمیت اور دنیا کی تاریخ بدلنے اور قوموں کی قسمت وتقدیر بنانے میں ان دونوں مقدس شہروں کے کردار ورول کا علم ہوا، حضرت رحمۃ اللہ علیہ ۱۹۴۷ء سے قبل تک حجاز وعالم عرب کا سفر نہ کر سکے مگر اس کی تاریخ، علم وادب، فلسفہ وفکر، جدید رجحانات اور نئی تبدیلیوں اور حرمین شریفین کے کوائف، ارض وسماء اور گلی کوچوں سے اس طرح واقف ہو چکے تھے کہ گویا وہ وہاں ہی رہے بسے ہوں، لیکن مدینہ منورہ ومکہ مکرمہ سے محبت وانس اور اس کے مکینوں سے والہانہ تعلق ایسا تھا کہ پہلے سفر حج کے موقع پر مدینہ منورہ کی حاضری کے وقت دل بے چین اور قلب بے قرار ہو گیا اور بے اختیار قلم کو ذوق وشوق اور حضور وسرور کے پر لگ گئے، سنئے اور سر دھنئے:-

"نظر اٹھا کر دیکھئے یہ دونوں پہاڑوں کی قطاریں ہیں، کیا عجب ہے کہ ناقۂ نبوی ﷺ اسی راستہ سے گذری ہو، یہ فضا کی دلکشی، یہ ہوا کی دلآویزی اسی وجہ سے ہے:-

ألا ان وادی الجزع اضحی ترابه
من المسك كافورا وأعواده رندا
وما ذاك إلا أن هندا عشية
تمشت وجرت فی جوانبه بردا

لیجئے مسجد آ گئی، اب بئر علی (ذوالحلیفہ) کی باری ہے،

منزل دوست چوں شود نزدیک
آتش شوق تیز تر گردد

درود شریف زبان پر جاری ہے، دل وفور شوق سے امنڈ رہا ہے، عرب ڈرائیور حیران ہے کہ یہ عجمی کیا پڑھتا ہے اور کیوں روتا ہے؟ کبھی عربی میں گنگناتا ہے، کبھی دوسری زبانوں میں شعر پڑھتا ہے، بھینی بھینی ہوا ہے اور ہلکی ہلکی چاندنی، جس قدر طیبہ قریب ہوتا جا رہا ہے، ہوا کی خنکی، پانی کی شیرینی اور ٹھنڈک، لیکن دل کی گرمی بڑھتی جا رہی ہے، سنئے کوئی کہہ رہا ہے ؎

بادِ صبا جو آج بہت مشکبار ہے
شاید ہوا کے رخ پہ کھلی زلف یار ہے

....

وہ ایک بار ادھر سے گئے مگر اب تک
ہوائے رحمت پروردگار آتی ہے

....

عجب کیا گر مرد پروین مرے نخچیر ہو جائیں
کہ بر فتراک صاحب دولتی بستم سر خود را

....

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبار راہ کو بخشا فروغ وادی سینا!

....

خاک یثرب از دو عالم خوشتر است
اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است

....

داغ غلامیت کرد رتبۂ خسرو بلند
میر ولایت شود، بندہ کہ سلطان خرید

....

محمدؐ عربی کابروئے ہر دو سرا ست
کسے کہ خاک درش نیست خاک برسر او

قافلہ مدینہ طیبہ میں داخل ہورہا ہے جبل احد پر نظر پڑتے ہی رفقاء سے مخاطب ہوکر فرماتے ہیں: "بسم اللہ اتریئے، وہ دیکھئے جبل احد نظر آرہا ہے' ذلك جبل يحبنا ونحبه وہ سواد مدینہ کے درخت نظر آئے، کیا یہ وہی درخت ہیں جن کے متعلق شہید ی مرحوم نے کہا تھا:

تمنا ہے درختوں پہ ترے روضہ کے جا بیٹھے
قفس جس وقت ٹوٹے طائر روح مقید کا

وہ گنبد خضرا نظر آیا، دل کو سنبھالئے اور قدم اٹھائیے، یہ لیجئے مدینہ میں داخل ہوئے، مسجد نبویؐ کی دیوار کے نیچے نیچے باب مجیدی سے گذرتے ہوئے باب جبریل پر جاکر رکے، حاضری کے شکرانے میں کچھ صدقہ کیا اور اندر داخل ہوئے، پہلے محراب نبویؐ میں جاکر دوگانہ ادا کیا، گنہگار آنکھوں کو جگر کے پانی سے غسل دیا، وضو کرایا، پھر بارگاہ نبویؐ پر حاضر ہوئے اور صلوٰۃ وسلام پیش کیا۔"

(کاروان مدینہ ۳۴-۳۱)

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی ذات نبویؐ سے محبت، وارفتگی اور والہانہ تعلق، اللہ تعالیٰ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم و ہدایت کے خطوط کے مطابق تھا، توحید الٰہی کو ہمیشہ اور ہر آن پیش نظر رکھا، اور اپنی تمام تصنیفات اور سیرت سے متعلق نگارشات میں اس اصول توحید اور مقام رسالت کو بیان بھی فرمایا اور لحاظ بھی رکھا، اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت مولانا کو جس مقام بلند سے نوازا تھا، اس کی برکت سے انھیں حرمین شریفین کی برابر حاضری نصیب ہوئی، وہ رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے بانی رکن تھے، جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے بھی بانی رکن تھے، اس کے اجتماعات میں تقریباً ہر سال جانا ہوا، مدینہ یونیورسٹی میں وزیٹنگ پروفیسر کے طور سے خطاب فرمایا، مکہ مکرمہ کے سمیناروں اور کانفرنسوں میں بھی شرکت کی، کلید کعبہ کا شرف بھی حاصل کیا، اور اپنے اعزاز وتکریم کے جلسوں میں بھی میر مجلس رہے، مگر رب کعبہ اور سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آداب واحترام اور تعظیم وتکریم میں سنت مطہرہ کا پاس ولحاظ رکھا، ایک بار مکہ مکرمہ کے فضائل بیان کرتے کرتے یکدم سے چونک پڑے اور فرمایا: عالم انسانی پر تو سب سے بڑا احسان مکہ ہی کے مبارک ہونہار فرزند محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے جو بھی ترقی وکامرانی، شادمانی وکامیابی ہے وہ سب ہی تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا فیض ہے:

بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے
وہ سب پود انھیں کی لگائی ہوئی ہے

ہمیشہ ہی زبان مبارک توحید کے نغموں اور نعتیہ نظموں سے تر رہتی تھی، بارہا طواف کعبہ اور روضہ اطہر پر سلام پیش کرتے وقت رفاقت کا شرف حاصل ہوا، ایک بار درود وسلام پیش کرکے محراب نبویؐ سے متصل واپسی ہوئی، ایک شامی بزرگ نے مجھے مخاطب کرکے فرمایا کہ حضرت مولاناؒ جس وقت سلام کے لئے حاضر ہورہے تھے تو میں نے عجب والہانہ انداز اور شوق وذوق دیکھا، مجھے یاد نہیں کہ کسی اور میں یہ کیف وحال محسوس کیا ہو، ۱۹۸۵ء میں میرا قیام مدینہ منورہ میں تھا، اطلاع ملی کہ حضرت رحمہ اللہ ہفتہ عشرہ قیام کے لئے مدینہ طیبہ آرہے ہیں، اس وقت باب السلام کے علاوہ کسی باب کی جانب سے کار مسجد نبویؐ تک نہیں جاسکتی تھی اور باب السلام تک پہونچنے کے لئے اجازت نامہ کی ضرورت تھی، حضرت مولانا کے پیروں کی معذوری کے پیش نظر میں نے اجازت نامہ حاصل کرلیا اور پورے دوران قیام پنجوقتہ نمازمیں بستان نور ولی سے باب السلام لانے لے جانے کی اور ساتھ بیٹھنے کی سعادت حاصل ہوئی، اس دوران مسجد نبوی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جس والہانہ محبت، تعلق، ذوق وشوق، سرور وکیف، رقت وگریہ، دعوت دین، امت مسلمہ اور انسانیت کی ہدایت وفلاح کے لئے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی دعاؤں، آنسوؤں، اور گنگناتے ہوئے الفاظ وکلمات میں درد، تڑپ، تضرع وابتہال، گریہ وزاری دیکھی اور محسوس کی مجھ جیسے بے مایہ وبے بضاعت اور سراپا معاصی کے لئے بیان کرنا ممکن نہیں، حضرت والاؒ عرب وعجم کی تجدد پسندی اور مغرب زدہ نوجوانوں کے حال پر کف افسوس ملتے ہوئے فرماتے تھے کہ یہ دور وعصر محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور ان کے پیغام سے وابستگی کے بغیر ترقی نہیں کرسکتا، اور نہ کوئی تحریک کوئی جماعت حب رسولؐ اور ذات نبویؐ سے تعلق ووارفتگی کے بغیر کامیاب ہی ہوسکتی ہے، خاص طور سے عربوں کی اس محبت اور اپنے اسلامی ورثہ سے بے نیازی پر پرزور الفاظ میں تنبیہ

کرتے اور توجہ دلاتے تھے، ان کی کتاب "نبی رحمت" کا آخری باب " وما ارسلناك الا رحمة للعالمین" چھ پہلوؤں کی شکل میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے احسانات و کارناموں پر مشتمل ہے جس میں آپ نے سیرت کا عطر کشید کیا ہے، اسی طرح "پندرہویں صدی ہجری؛ حقیقت اور تاریخ کے آئینہ میں" کے دس پہلوؤں میں محبت و اخلاص اور دعوت و پیغام کا خلاصہ پیش کر دیا ہے جو امت اور نئی نسل کے لئے مشعل راہ ہے۔

حضرت مولاناؒ نے عالم عربی کی زبوں حالی پر نظر ڈالتے ہوئے اپنی پہلی معرکۃ الآراء "تاریخ ساز کتاب" انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" میں یہ عنوان قائم فرمایا تھا: محمد رسول اللہ عالم عربی کی روح ہیں۔ تحریر فرماتے ہیں :

"ایک مسلمان عالم عربی کو جس نظر سے دیکھتا ہے، اس میں اور ایک یورپین کی نظر میں زمین و آسمان کا فرق ہے، بلکہ خود ایک وطن پرست عرب، عالم عربی کو جس نگاہ سے دیکھتا ہے وہ ایک مسلمان کی نگاہ سے بالکل مختلف ہے، مسلمان عالم عربی کو اس حیثیت سے دیکھتا ہے کہ وہ اسلام کا گہوارہ ہے، انسانیت کی پناہ گاہ ہے، عالمی قیادت کا مرکز ہے، روشنی کا مینار ہے، اس کا عقیدہ ہے کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم عالم عربی کی جان، اس کے عزت و افتخار کا عنوان، اور اس کا سنگ بنیاد ہیں، اگر اس سے محمد رسول اللہ کو جدا کر دیا جائے تو اپنے تمام قوت کے ذخیروں اور دولت کے چشموں کے باوجود اس کی حیثیت ایک بے جان لاشہ اور ایک نقش بے رنگ سے زیادہ نہ ہوگی، محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ذات ہے جن کی وجہ سے عالم عربی عالم وجود میں آیا۔ (ص ۴۳۰) بقول علامہ اقبالؒ ؎

نہیں وجود حدود و ثغور سے اس کا
محمدؐ عربی سے ہے عالم عربی

اس کی ایک مثال اور پیش ہے :

"زمانے کی رُت بدل گئی، انسان کیا بدلا، جہاں بدل گیا، زمین و آسمان بدل گئے، یہ سارا انقلاب اسی پیغمبر کی کوشش اور تعلیم کا نتیجہ ہے، آدمؑ کی اولاد پر آدمؑ کے کسی فرزند کا اتنا احسان نہیں، جیسا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دنیا کے انسانوں پر ہے اگر اس دنیا سے وہ سب لے لیا جائے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو عطا کیا ہے تو انسانی تہذیب ہزاروں برس پیچھے چلی جائے گی اور اس کو اپنی زندگی کی عزیز ترین چیزوں سے محروم ہونا پڑے گا۔"

(کاروان مدینہ ص ۳۰)

سرکار دو عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ شیدائی، ان کے پیغام کا عاشق، ان کی دعوت کا وفا شعار حامل، اور ان کی سنت کا متبع و عامل، جس کی زبان مبارک اس شعر کا ورد کرتی رہتی تھی ؎

صبا یہ جا کے تو کہیو مرے سلام کے بعد
کہ تیرے نام کی رٹ ہے خدا کے نام کے بعد

اب اپنے مولیٰ کے حضور میں حاضر ہو چکا ہے، اور کیا عجب کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنی محبت و عقیدت، اخلاص و وفا، اتباع سنت اور خدمت دین اور درود و سلام کی اپنی سوغات پیش کر چکا ہو۔

اللّٰھم اغفر لہ وارحمہ

ہند کا وہ رہنمائے مہرباں

● جگن ناتھ آزاد

پھر سکونِ محفلِ ہندوستاں کھویا گیا
ایک محبوبِ نگاہِ این و آں کھویا گیا

دندناتی آئی یوں گلزار میں بادِ خزاں
مہر و الفت کا مہکتا گلستاں کھویا گیا

حضرتِ سیّد علی ندویؒ صداقت کا امیں
سایہ دارِ عظمتِ ہندوستاں کھویا گیا

کارواں روحانیت کا جس کے پیچھے تھا رواں
آج وہ اپنا امیرِ کارواں کھویا گیا

وہ کہ جس سے ہندو و مسلم کو یکساں پیار تھا
ہند کا وہ رہنمائے مہرباں کھویا گیا

دیر والو! دیر کا جاتا رہا سچا حبیب
اے حرم والو! حرم کا پاسباں کھویا گیا

جو محبت میں، مروّت میں، مودّت میں رہا
زندگی بھر صدرِ روحِ رواں کھویا گیا

ہوگیا گُم مجلسِ اخلاص تیرا رازدار
محفلِ تقدیس، تیرا رازداں کھویا گیا

گو حقیقت ہے مگر دل کو یقیں آتا نہیں
ظلمتوں میں اک شرارِ جاوداں کھویا گیا

مسئلہ کا حل

اگر اس ملک کے مسلمان یہ فیصلہ کرلیں کہ ان کو اپنی نسلوں کے مستقبل کا تحفظ اور ان کی تعلیم کے مسئلہ کا حل ہر مسئلہ، ہر مفاد، ہر سہولت، ہر عزت، ہر خوشحالی اور ہر کامیابی سے زیادہ عزیز ہے تو یہ مسئلہ ایک دن میں حل ہو سکتا ہے۔

(حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ)

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ اور عصری مسائل

تحریر: مولانا سید محمد واضح رشید ندوی صدر شعبہ عربی دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ — ترجمہ: خالد فیصل ندوی

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمہ اللہ کی زندگی کو محققین نے حضرت کی زندگی میں ان کے اعزاز میں منعقد استقبالی اور تعارفی جلسوں میں ان کی کتابوں کے رسم اجراء اور ان کے تعارف کے دوران، اور ان کی وفات حسرت آیات کے بعد تعزیتی جلسوں میں پیش کردہ مقالات اور تقاریر کے دوران، حضرت کی تعلیم و تربیت، ان کی علمی قابلیت و لیاقت، ان کی فکر سازی کے عوامل و محرکات، جماعتوں تحریکوں اور علمی اداروں میں ان کی شمولیت و شرکت، مختلف علمی و عالمی اداروں کی طرف سے انعامات سے ان کی سرفرازی، اور ان کی اور ان کی کتابوں کی مقبولیت و افادیت جیسے بیش بہا اوصاف کی روشنی میں پیش کیا ہے، بلاشبہ یہ صفات و کمالات کسی بھی شخصیت کی سیرت و ترجمانی کے بنیادی عناصر ہیں، اور یہی تفصیلات سیرت نگاروں اور محققین کا عام طور پر مرجع و مرکز رہتی ہیں اور یہی طریقہ کسی بھی ہمہ گیر و ہمہ جہت شخصیت کی سیرت نگاری و ترجمانی کا معروف و مشہور طریقہ ہے۔

حضرت مولانا رحمہ اللہ کے محبین نے مذکورہ طریقہ پر ہی حضرت کے سلسلہ میں اپنے مقالات اور مضامین میں خامہ فرسائی کی ہے، چنانچہ قاری کو ان سارے مقالات و مضامین میں یکسانیت اور بعض جگہ تکرار کا احساس ہوتا ہے، حضرت کے بعض متعلقین اور بعض سیرت نگاروں نے حضرت کی شخصیت اور ان کی خصوصیات و امتیازات کے اسباب و عوامل کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے، اور حضرت کی سارے عالم میں غیر معمولی مقبولیت اور وسیع اور متنوع علمی خدمات اور مختلف تحریکات میں شمولیت، اور امتیازی کردار ادا کرنے اور ان میں کامیابی حاصل کرنے کے اسباب تلاش کرنے کی کوشش کی ہے، یہ بات اس لئے بھی اہمیت کی حامل ہے کہ حضرتؒ کا زمانہ بڑے بڑے داعیوں، غیر معمولی صلاحیت کے حامل قائدوں، جید و جلیل القدر علماء اور مفکرین سے خالی نہ تھا، بلکہ یہ عہد ایسی بلند پایہ شخصیات سے معمور تھا، جنہوں نے تاریخ ساز کارنامے انجام دیئے اور اس عصر پر گہرے نقوش چھوڑے۔

حقیقت میں تعلیم و تربیت، معاصرین کے ساتھ سلوک اور زندگی کے مختلف مراحل، اور معاشرہ کے مختلف افراد اور جماعتوں کے ساتھ مناسب رویہ، زندگی کے کسی بھی شعبہ کی عظیم شخصیات کے لئے کامیابی اور ناکامی کا اہم عنصر ہے اور یہی چیزیں محققین کے نزدیک موضوع بحث اور مرکز تحقیق ہوتی ہیں۔

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ بعض انسانوں میں بہت سی ایسی خداداد صلاحیتیں ہوتی ہیں جو انسانوں کو علمی قابلیت کے حصول اور ایسے نظریات و تصورات کے انتخاب پر آمادہ کرتی ہیں، جو اس کے علمی معیار سے بلند اور اس کے معاصرین کی پہونچ سے بالاتر ہوتے ہیں، نیز یہی نظریات و تصورات اپنے حاملین کو سچی عظمت اور قبول عام کا درجہ عطا کرتے ہیں۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اس ماحول کی تصویر کشی کی ہے، جس میں انھوں نے آنکھ کھولی، پروان چڑھے اور تحصیل علم میں ہمہ تن مصروف رہے، اس کا تذکرہ اپنی کتاب "کاروان زندگی" میں بڑے اہتمام کے ساتھ فرمایا ہے، نیز ان شخصیات کا ذکر جمیل بھی کیا ہے، جن سے حضرت نے استفادہ کیا، یا جن سے ملاقات ہوئی، اور ان سے تبادلۂ خیال کیا، اور ان تحریکوں اور جماعتوں کا بھی ذکر کیا ہے، جن سے آپ وابستہ ہوئے، لیکن بعد میں ان سے علاحدگی اختیار کر لی، یا ان سے جزوی وابستگی رکھی، حضرت مولانا رحمہ اللہ کی شخصیت و سیرت کا سنجیدہ قاری ان کے کمالات اور ان کی شخصیت سازی کے حقیقی اسباب و عناصر کا متلاشی ان کی اس امتیازی خصوصیت کا ادراک کر سکتا ہے، جس کی وجہ سے حضرت کی شخصیت اپنے تمام معاصرین میں ایک ممتاز و منفرد مقام رکھتی ہے، اور اسے یہ یقین کامل ہو جائے گا کہ وہ حقیقی و مرکزی صفت، جو حضرت مولانا رحمہ اللہ کی زندگی کے تمام مراحل میں بہت نمایاں ہے، وہ حضرت رحمہ اللہ کا تمام معاملات اور مشکلات میں فراست ایمانی سے کام لینا ہے، یہ فراست ایمانی بسا اوقات حضرت مولانا رحمہ اللہ کو ایسے خیالات و نظریات کے اختیار کرنے پر آمادہ کرتی تھی، جو ان کی نرم طبیعت کے مخالف اور دوسرے قائدین کے تصور کے برعکس ہوتے تھے، یہ حقیقت تسلیم شدہ ہے

کہ ان میں نرم مزاجی وکشادہ قلبی، حلم وبردباری، دوسروں کا پاس ولحاظ، تواضع وانکساری، اور اپنے بڑوں کی رائے کا احترام حد سے زیادہ موجود تھا، لیکن انسانیت اور امت مسلمہ کو درپیش مسائل اور آزمائش کے وقت وہ اپنے موقف پر بالکل غیر لچکدار رویہ اختیار فرماتے اور اس کے سلسلہ میں شمشیر براں بن جاتے کہ دوسرے مفکرین کے نظریات نہ ان کو متزلزل کرتے اور نہ ہی ان کی ہمت پست کرتے چنانچہ بغیر کسی ادنیٰ سی مدافعت کے وہ اپنی رائے پر قائم رہتے اس قسم کے واقعات ان کی حیات مستعار میں بارہا پیش آئے، عام قائدین اور دانشوروں نے ابتدائی مرحلہ میں ان کی بعض آرا سے شدید اختلاف کیا، اور ان کی پرزور مخالفت اور ان کے موقف کی تردید کی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی سیرت کا طالب علم، ان کے بے لچک رویہ اور ان کی بے مثال جرأت واستقامت کا اعتراف کرے گا، حضرت مولانا رحمہ اللہ بادشاہوں اور سربراہان حکومت کے سامنے اپنے موقف ونظریہ سے نہ ہندوستان میں، اور نہ ہی بیرون ہند ذرا بھی پیچھے ہٹے، انھوں نے جس بات کو حق سمجھا اس کو حق ہی کہتے رہے اور اسی پر ثابت قدم رہے، کچھ عرصہ کے بعد ان کی رائے کی تصویب کی گئی، اور حالات نے اس کی صداقت کی توثیق کی، پہلی مثال مصطفیٰ کمال اتاترک سے متعلق ہے، حضرت مولانا رحمہ اللہ نے ترکی سے واپسی کے بعد یہ موقف اختیار فرمایا کہ مصطفیٰ کمال، غازئ اسلام کے بجائے انگریزوں کا آلۂ کار، اسلام کا دشمن اور مسلمانوں کا سخت مخالف شخص تھا، اس دور کے علما اور مسلمان قائدین نے اس کو اسلام کا غازی اور انگریزی استعمار سے نبرد آزمائی کا ہیرو قرار دیا تھا، اور حضرتؒ کی رائے پر ان علما وقائدین نے سخت برافروختگی کا اظہار کیا، اور بعض قریبی حلقوں کے علما نے پرچوں میں حضرت کے مطبوعہ مقالات پر سخت تنقید کی، لیکن حضرت مولاناؒ اپنی رائے پر آخری وقت تک قائم رہے، اپنے موقف میں کوئی تبدیلی آنے نہیں دی، بعد میں یہ بات ثابت ہوگئی کہ حضرتؒ کا موقف ہی درست تھا، معاہدہ "لوزان" کی افشا سے لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں، حضرت مولانا کی مصطفیٰ کمال کے بارے میں رائے اور اس کے دلائل، حضرت کی معرکۃ الآرا تصنیف "مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش" اور ان کی خود نوشت سوانح حیات "کاروان زندگی" میں محفوظ ہے، بعد میں مصطفیٰ کمال کے بارے میں کئی تحقیقی کتابیں شائع ہوئیں، جن میں ان کے آلۂ کار ثابت ہونے کی تفصیلات ہیں۔

تقسیم ہند کے بعد بعض لیڈروں نے ہندوستانی تہذیب کے اختیار کرنے اور ہندوستانی سورماؤں کی تقدیس وتعظیم کا آوازہ بلند کیا اور اس سے مسلمانوں میں اسلامی اسپرٹ کی بیخ کنی اور اسلامی تہذیب وتمدن سے دوری وبے اعتنائی کا خطرہ پیدا ہوگیا، تو حضرت مولانا رحمہ اللہ نے اس کا ادراک کیا، خصوصاً تقسیم ہند کے بعد اس کی خطرناکی کا زیادہ احساس فرمایا، کیونکہ تقسیم ہند کی وجہ سے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد پاکستان منتقل ہوچکی تھی، فرقہ وارانہ فسادات نے مسلمانوں کے حوصلے پست کردیئے تھے، دوسری طرف ارتداد کی ایک لہر اٹھ رہی تھی، ہندوستان کے بعض علاقوں میں "شدھی تحریک" کا زور تھا چنانچہ حضرت مولانا رحمہ اللہ اس خطرۂ عظیم سے نبرد آزمائی کے لئے پوری قوت کے ساتھ آگے بڑھے، اور اس تحریک کے لیڈروں پرشوتم داس ٹنڈن اور سمپورنانند کے نام خطوط لکھے، اور مسلمانوں کے تشخص کے استحکام وبقا، اتباع شریعت کی ترغیب، اور مسلمانوں کے مذہبی مقامات کی حفاظت کے لئے پمفلٹس اور کتابچے تحریر کئے۔

حضرت مولانا رحمہ اللہ نے آزادئ ہند کے بعد فکری کجی، اخلاقی بگاڑ، زوال انسانیت اور عروج، مادیت کا مقابلہ حکمت وفراست اور دوربینی سے کیا اور بڑے مؤثر انداز سے مسلمانوں اور برادران وطن کو مخاطب کیا، اور منفی تبدیلیوں کی پرزور مذمت کی، یہاں ان کی تقریر کے بعض جملے نقل کئے جارہے ہیں انھوں نے پراچین تہذیب وتمدن کے احیا کی دعوت پر سخت نکیر کرتے ہوئے فرمایا کہ:-

"آج ہر جگہ اور ہر قوم میں پرانی تہذیب وتمدن کے احیا کا رجحان عام ہورہا ہے بعض لوگ دو ہزار سال قبل کی تہذیب کو زندہ کرنے کی کوشش کررہے ہیں تو کچھ دیگر لوگ چار ہزار برس قبل مسیح کی تہذیب کی واپسی کی سعی لاحاصل کررہے ہیں، یہ نعرہ بڑے شد ومد کے ساتھ ان ملکوں میں بلند کیا جارہا ہے، جہاں استعماری قوتوں سے حال ہی میں آزادی ملی ہے، اسی طرح آج قومی اور نسلی عصبیتوں کا زور ہے، اور اس منفی عصبیت کے بیماروں کا خیال خام یہ ہے کہ ان کی تہذیب اور ان کی نسل، دوسروں سے افضل وبرتر ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ حضرت مولانا رحمہ اللہ وطنی، لسانی اور تہذیبی نعرے بازیوں کے سخت مخالف اور ناقد تھے، اس رجحان کو انسانیت

کے لئے خطرۂ عظیم تصور کرتے تھے، خواہ یہ نعرہ کسی اسلامی ملک یا کسی غیر اسلامی ملک میں بلند کیا جائے، کیونکہ یہ نعرہ نوع انسانی کے مختلف طبقات کے درمیان عداوت کی خلیج حائل کرنے والا تھا، جب یہ نعرہ اسلامی ملکوں میں بلند کیا گیا تو حضرت مولانا رحمہ اللہ نے پوری شدت کے ساتھ اس کی مذمت کی اور اس کے تدارک کے لئے سینہ سپر ہوگئے، اس کی تردید میں کتابچے، پمفلٹس اور کتابیں تصنیف فرمائیں، جلسوں اور اجتماعات میں موثر تقریریں کیں، نسلی، تہذیبی اور لسانی عصبیتوں کے خطرہ سے دنیا کو آگاہ فرمایا، انسان کئی خانوں اور گروہوں میں منقسم تھے اور خون کی ارزانی ہی ارزانی تھی لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان کی بدولت انسان آپس میں محبت کرنے والے بھائی بن گئے۔

زبان و ثقافت کی بنیاد پر تقسیم و تفریق، قومی مسائل و مشکلات کا حل باور کیا جاتا ہے لیکن حضرت مولانا رحمہ اللہ اس کو انسانیت اور قومیت کے لئے خطرہ تصور کرتے تھے، قومیت کی دعوت، عرب ملکوں میں بغاوتوں اور انقلابات کے بعد عام ہوئی، اس دعوت کے علمبردار یورپی ملکوں کے تعلیم یافتہ مسیحی عرب نوجوان تھے ان لیڈروں میں میشیل عفلق سب سے زیادہ پیش پیش تھے، یہ دعوت، مصر، شام اور عراق میں خوب پھلی پھولی تو حضرت مولانا رحمہ اللہ نے ایک پمفلٹ "عالم عربی کے لئے سب سے بڑا خطرہ" کے عنوان سے تحریر فرمایا جس میں قومیت عربیہ کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ:۔

"غیر مسلم مفکرین نے اس فلسفۂ قومیت کو جس چابک دستی اور ذہانت سے مرتب کیا ہے، اور اس میں جس طرح علمی (سائنٹفک) انداز فکر پیدا کیا گیا، اور اس میں ایک عرب تعلیم یافتہ نوجوان کے لئے (جو احساس برتری کے نشہ سے سرشار ہے) جو کشش پائی جاتی ہے، اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباسات سے ہوگا جو میشیل عفلق کی کتاب "فی سبیل البعث" سے اخذ کئے گئے ہیں، جس کو اس تحریک و دعوت کا صحیفہ کہنا صحیح ہوگا۔

"اسلام کو فتحیاب اور غالب ہونے میں جو اتنی تاخیر ہوئی، وہ دراصل اس وجہ سے تھی کہ عرب اپنی ذاتی کوشش اور جد و جہد اور دنیا کے باہمی تجربات کی روشنی میں محرومی و موفوری کی بہت سی آزمائشوں اور امید و بیم کی کشاکش سے نکال کر حقیقت تک پہونچ جائیں، یعنی ایمان خود ان کے اندر سے پیدا ہو، جس کی بنیاد ذاتی تجربہ ہو، اور وہ زندگی کی گہرائیوں سے وابستہ حقیقی ایمان بن سکے، اس لحاظ سے اسلام ایک عربی تحریک تھا اور اس کے معنیٰ عربیت کی تجدید و تکمیل۔ اس لئے "وہ معنیٰ جس کو اس اہم ترقی اور تغیر کے اس اہم تاریخی دور میں اسلام واضح کر رہا ہے یہ ہے کہ ساری قوتیں عربوں کی طاقت بڑھانے اور ان کو ترقی دینے پر صرف کی جائیں اور ساری قوتیں عرب قومیت کے دائرہ کے اندر محصور ہوں۔"

حضرت مولانا رحمہ اللہ اس حقیقت کی مزید وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ صدر صدام حسین کا تعلق شروع سے مشہور قوم پرست عرب تحریک "البعث العربی" سے رہا ہے، جس کے صدر شامی عیسائی پروفیسر میشیل عفلق تھے، جنہوں نے زندگی کے آخری دن احترام و اعتماد کے ساتھ عراق ہی میں گذارے، موت سے پہلے ان کے اسلام قبول کرنے کی روایت غالباً سیاسی مصلحت سے مشہور کی گئی (ورنہ وہ لیکن ان کو نصرانیت کی خدمت کا تصدیق نامہ دے چکا تھا) بقول ایک عرب فاضل کے کہ "وہ انتقال کے بعد مسلمان ہوئے"۔

اس تحریک کا آغاز ۱۹۴۳ء سے ہوا اور ۱۹۴۷ء میں وہ ارتقاء اور عروج کے مرحلہ پر پہونچی، اس تحریک کا بنیادی مقصد اور فلسفہ یہ ہے کہ "عرب بذات خود ایک وحدت (اکائی) ہیں، ان کے درمیان جو دینی، اعتقادی، ثقافتی اور سیاسی امتیازات ہیں، وہ سب مصنوعی اور عارضی ہیں، جو عرب احساس قومیت کی بیداری کے بعد خود بخود زائل ہو جائیں گے، اس تحریک و جماعت کا نعرہ اور دستور العمل ہے کہ عرب ایک مستقل واحد امت ہیں جو ایک دائمی پیغام رکھتے ہیں۔"

یہ تحریک عربوں کو ماقبل اسلام دور (جاہلیت عربیہ) کی طرف لے جانا چاہتی ہے، جب نہ ان کے پاس نیا دین آیا تھا اور نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت وہ آخری پیغام ربانی اور اس کی شریعت سے روشناس ہوئے تھے، یہ تحریک دور جاہلیت کے سورماؤں کو اپنا ہیرو سمجھتی ہے، جن کا عربی کی جاہلی شاعری اور تاریخ میں عظمت کے ساتھ نام آیا ہے، اور وہ ان پر فخر کرنے اور ان کے نام کو زندہ رکھنے کی تلقین کرتی ہے، اس کے ارکان نے اسلام سے مستغنی ہو کر اپنی زندگی کے لئے ایک نیا اصول اور فلسفۂ حیات وضع کیا ہے جو آزاد قومیت عربیہ اور سیاسی و مادی اغراض سے میل کھاتا ہے، چنانچہ حضرت مولانا رحمہ اللہ شام جیسے شاندار اسلامی تاریخ رکھنے والے ملک میں "بعث پارٹی" کی حکومت کے زیر سایہ بعثی فلسفہ کے اثرات و واقعات کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"بے تکلف مسجدیں گرائی گئیں، اہل دین اور اہل علم کو ملک چھوڑ کر باہر جانا پڑا، اور

اسلام پسند تحریکوں اور جماعتوں پر پابندی عائد کی گئی، نیز عراقی حملہ کے بعد کویت میں بھی اس پارٹی کے آثار نمایاں ہونے لگے ہیں اور اسی کا خطرہ ہر اس ملک میں ہے، جو خدا نخواستہ اس کے زیر اقتدار ہو جائے"۔

حضرت مولانا اس تحریک پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:-

"ان سب قومی تحریکوں کے مقابلہ میں کسی عرب قوم کی قوم پرستی کی تحریک زیادہ خطرناک اور زیادہ سنگین نتائج کی حامل اس لئے ہے کہ وہ ان کو قدیم جاہلیت کے احترام اور اپنے آباء و اجداد کی تعظیم و تکریم کی طرف لے جا سکتی ہے، یا کم سے کم اس کی نفرت اور حقارت کو کم کر سکتی ہے، جس کو قرآن مجید نے کفر کے ایک معیاری دور کے طور پر پیش کیا ہے اور جس کی قباحت اور اس کے ساتھ نفرت کو مختلف طریقوں سے ابھارا ہے"۔

حضرت مولانا رحمہ اللہ نے قومیت عربیہ کے فتنہ کو، اس کے آثار نمایاں ہونے سے پہلے ہی، محض اپنی ایمانی فراست کے ذریعہ محسوس کر لیا، اور اس کو عالم عربی کے لئے سب سے بڑا خطرہ سمجھا، کیونکہ قومیت انسان کو تقسیم کرتی ہے، عصبیتوں کو جنم دیتی ہے اور مختلف طبقات اور گروہوں کے درمیان عداوت و دشمنی کا بیج بوتی ہے اور تقسیم در تقسیم کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ چل پڑتا ہے، چنانچہ ادھر ماضی قریب میں دنیا میں قومیت کی بنیاد پر کئی سلطنتیں وجود میں آئیں، فی الواقع یہ تحریک تمام انسانیت کے لئے خطرناک ہے، یورپ میں گرجا کے غلبہ والی جابرانہ حکومت اور جاگیردارانہ نظام کے خلاف رد عمل کی صورت میں اس رجحان کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

دین و اخلاق کے متوازی نظریہ قومیت کے خطرہ کے خلاف حضرت مولانا رحمہ اللہ کا یہ مذکورہ موقف ابتداء ہی میں خطرہ کا احساس و ادراک کر لینے کی صلاحیت کا ثبوت ہے، ابتدائی مرحلہ میں دیگر علماء اور زعماء اور مفکرین اس خطرہ کو نہ بھانپ سکے اور نہ ہی حضرت کے موقف کی تائید کر سکے لیکن جب پانی سر سے اونچا ہو گیا، اور حالات بد سے بدتر ہو گئے، نظریۂ قومیت کے برے آثار ظاہر ہونے لگے، دنیا نے اس الحادی نظریہ کی تباہیاں اور بربادیاں بچشم خود دیکھ لیں، اور نظریۂ قومیت کے زیر اثر ممالک میں عرصہ دراز کے بعد اس کے خلاف آوازیں اٹھنے لگیں تب علماء قائدین اور مفکرین نے، حضرت مولانا رحمہ اللہ کے موقف کی تائید کی، ان کی دور بینی کے قائل ہوئے اور اس تحریک کے خلاف حضرت کے اقدام کو سراہا اور داد تحسین پیش کی۔

حضرت مولانا رحمہ اللہ نے، اپنی ایمانی فراست کی بدولت صدر صدام حسین، جمال عبدالناصر اور کمال اتاترک کے خلاف، اپنے نظریہ و موقف کی طرح ہی کرنل معمر قذافی کی حکمرانی کے خلاف بھی رائے قائم کی لیکن اس مرتبہ بھی مسلم زعماء اور اہل فکر کرنل قذافی کی نام نہاد اصلاحات کی مسموم (زہریلی) لہروں کو محسوس نہ کر سکے، اور ان لوگوں نے اس کو سامراج کا دشمن، اسلام کا ہیرو اور اسلام اور مسلمانوں کا نجات دہندہ تصور کیا، لیکن وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ عوام و خواص کی رائے تبدیل ہوتی گئی اور بالآخر یہ لوگ حضرت مولانا رحمہ اللہ کے موقف کی درستگی، اور ان کی فراست ایمانی کے قائل ہوئے، حضرت مولاناؒ تحریر فرماتے ہیں:-

"حقیقت یہ ہے کہ کرنل معمر قذافی کی فکر میں انقلابیت کا شروع سے غلبہ رہا، انھوں نے جو اقدامات کئے وہ انقلاب کی روح سے متاثر تھے، جمال عبدالناصر کے انتقال کے بعد سے خاص طور پر ان کو عالم عربی میں خلا محسوس ہوا، جس کو پر کرنے کے لئے انھوں نے صرف اپنے کو اہل پایا اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے وہ برابر کوشاں رہے، نیز اس نے ابتداء ہی سے یہ اندازہ لگا لیا کہ یہ عہد اسلام کی نشأۃ ثانیہ کا عہد ہے، اس لئے اس شروع سے اپنے کو اس نشأۃ ثانیہ کا قائد تصور کر لیا، لیکن انقلابی ذہن، تربیت و تعلیم کی کمی، مغربی افکار کے اثر سے، جن کے سایہ میں ان کی پرورش ہوئی تھی، لیبیا کی دولت اور اس کی سیاسی، جغرافیائی اور اقتصادی اہمیت کے باعث اور حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی کی وجہ سے اس نے یہ تصور قائم کر لیا کہ وہ اسلام جو کتاب و سنت سے ماخوذ ہے، اس انقلابی عہد کا ساتھ نہیں دے سکتا، اس لئے اس نے اسلام کو اپنے انقلابی ذہن کے سانچہ میں ڈھالنے کی کوشش کی تاکہ اس سے وہ ایسے اسلام کا ایڈیشن تیار کرلے، جو اس عہد کے پورے مغربی نظام کے ساتھ چل سکتا ہو"۔

اسی طرح سے مغربی تمدن کے سلسلہ میں حضرت مولانا رحمہ اللہ کا موقف منفرد اور جداگانہ تھا، ان کا موقف دیگر علماء کرام اور مفکرین عظام کے نظریہ سے یکسر مختلف تھا، حضرت مولانا رحمہ اللہ کا موقف بحث و تحقیق کا موقف تھا، اس کی تفصیل یہ ہے کہ مغربی تمدن کی ہر قابل قبول چیز کو قبول کر لیا جائے جو اسلامی ممالک اور معاشرہ کے لئے مفید اور اس کے عقیدہ و نظریہ سے ہم آہنگ ہو لیکن اسلام کی روح اور اس کی تعلیمات کی منافی چیز سے

قطعی کنارہ کشی اختیار کی جائے، حضرت مولانا رحمہ اللہ نے مغربی تہذیب کے سلسلہ میں میانہ روی کی دعوت دی ہے چنانچہ حضرت رحمہ اللہ اپنی شہرہ آفاق تصنیف "مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش" میں مغربی تہذیب پر محققانہ نظر ڈالنے اور اس کے نتائج پر گفتگو کرنے کے بعد رقم طراز ہیں:۔

"اسلامی شخصیت اور ملت مسلمہ کے وجود کے لئے مغربی تمدن کے خطرناک ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ زندگی کی سہولتوں سے استفادہ اور مغرب کی دریافت کردہ سائنس اور ٹکنالوجی، ایجادات و تفریح و سہولت کے وسائل کو مطلق حرام کہہ دیا جائے، اور یہ دروازہ بالکل بند کردیا جائے، اسلام ہمیشہ سے وسیع ذہن کا مالک اور ہر صالح اور مفید شئے سے استفادہ کرنے کے سلسلہ میں فراخدل اور کشادہ چشم رہا ہے اور رہے گا، لیکن اس معاملہ میں مغربی تمدن کا مفہوم آلات و ایجادات اور زندگی کے مفید تجربات سے استفادہ سے زیادہ وسیع معنوں پر مشتمل ہے اور وہ افکار و اقدار اور مفاہیم و مطالب بھی اس میں شامل ہیں، جن پر مغربی تہذیب کی بنیاد ہے، پوری زندگی کو مغربی رنگ اور تمدنی منصوبہ بندی کا تابع کرنا اسی طرز حیات کو اپنانا، جو اسلامی معیار طہارت و نظافت اور اعتدال و میانہ روی کی روح سے بے گانہ ہے، آداب شریعت اور سنت نبوی پر عمل کی راہ میں بھی رکاوٹ بن جاتا ہے، اور اسلامی زندگی سے بھی بہت دور کردیتا ہے۔"

حضرت مولانا رحمہ اللہ بعض واقعات اور مسائل کے سلسلہ میں بہت ہی واضح اور سخت موقف اختیار فرمایا کرتے تھے کہ اس کی شدت اور اہمیت کا اندازہ ان کے ان قریبی لوگوں کو بھی نہیں ہو پاتا تھا، جو ان کے افکار و خیالات اور تصورات کے ہم خیال اور ان کے پروردہ تھے، ان سبھوں کا خیال ہوتا تھا کہ معتدل موقف اور مسئلہ میں غور وفکر اور انتظار و مہلت ہی مناسب اور بہتر ہے، سخت موقف، ان کے اور ان کے ماتحت چلنے والے اداروں کے مصالح کے ناموافق اور منفی نتائج کا پیش خیمہ ثابت ہوگا، چنانچہ "وندے ماترم" کے سلسلہ میں ان کا موقف، ان کے شدید تر موقفوں میں سے ایک ہے، جب موجودہ حکومت نے بت پرستانہ گیت اور سرسوتی کے مجسمہ کے سامنے سرنگوں ہونے پر اصرار کیا تو حضرت مولانا رحمہ اللہ نے سرکاری اسکولوں سے مسلمان بچوں کے نکال لینے کی ہدایت جاری فرمائی۔

بعض لیڈروں نے اس مسئلہ پہلے۔ ان کے سخت موقف پر دھمکی آمیز بیانات جاری کئے اور بعضوں نے توان کو "غدار وطن" قرار دے کر ان کی جلا وطنی کا مطالبہ کرڈالا، نیز بعض شدت پسند عناصر نے ان کے پتلے نذر آتش کئے اور رات کی تاریکی میں ان کی رہائش گاہ پر شب خون مارا، دوسری طرف بعض مسلم لیڈران نے اس معاملہ کی اہمیت کو کم کرنے کی اپنی سی کوشش کی اور اس معاملہ کو معمولی اور بے ضرر ثابت کرنے کے لئے اپنے بیانات جاری کئے، لیکن حضرت مولانا رحمہ اللہ کے پائے ثبات میں ذرہ برابر بھی جنبش نہ ہوئی بلکہ اپنے موقف سے ایک انچ بھی تنازل نہ فرمایا حالانکہ حضرت مولانا رحمہ اللہ ان دنوں شدید مرض کی وجہ سے بہت ہی نحیف اور کمزور ہوگئے تھے، گفتگو میں دشواری محسوس کرتے تھے، لیکن صحافیوں کے سامنے اپنے موقف کو پوری قوت و طاقت کے ساتھ واضح کیا اور دوٹوک انداز میں فرمایا کہ مسلمان اس معاملہ کو ہرگز ہرگز قبول نہیں کریں گے، بالآخر حضرت مولانا کو اس معاملہ میں بڑی کامیابی ملی اور حکومت نے اپنے رویہ میں تبدیلی کرلی، وزیر اعظم نے وضاحت کی اور وزیر داخلہ نے پارلیمنٹ میں صراحت کی کہ یہ قانون اجباری نہیں ہے، نیز صوبائی وزیر تعلیم برخاست کردیئے گئے آخرکار صوبائی حکومت نے اس حکم کو واپس لے لیا۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت مولانا نے اپنی ایمانی فراست سے اس بات کا صحیح و برمحل اندازہ کرلیا تھا کہ اگر اس معاملہ میں نرمی برتی گئی تو مسلمانوں کی اگلی نسل بت پرستانہ عقائد و خیالات کی حامل ہوگی اور ہندوستان میں اس طرح اندلس کی تاریخ دہرائی جائے گی، اس کامیابی پر مسلمانوں کے اندر اپنے دین اسلام، اور اس کی تعلیمات و احکام کے سلسلہ میں خود اعتمادی پیدا ہوئی، اور پوری دنیا میں حضرت مولانا کا وقار دوبالا ہوگیا اور ان کی دور بینی اور دور اندیشی کے چرچے ہوئے۔

اس قسم کے تعلیمی خطروں سے مسلمانوں کی حفاظت کے مقصد سے حضرت مولانا رحمہ اللہ نے دینی تعلیمی کونسل کی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیا اور عرصہ دراز تک اس کے روح رواں رہے، اپنی عمر کے اخیر میں اس بات پر بہت ہی زیادہ زور دیا کرتے تھے کہ چھوٹے چھوٹے گاؤں دیہات اور قصبوں میں مکاتب کا جال پھیلایا جائے بلاشبہ یہ مکاتب بڑے بڑے مدارس و جامعات سے زیادہ مفید اور مؤثر ثابت ہوں گے۔

تحریک "پیام انسانیت" کا قیام، حضرت رحمہ اللہ کی ایمانی فراست کا جیتا جاگتا ثبوت ہے، حالانکہ بعض مسلم قائدین نے اپنے اس خدشہ کا اظہار کیا کہ یہ تحریک وحدت ادیان کا اسٹیج ثابت

ہوسکتی ہے اور اسلام کی دعوت کے عمل وحرکت میں رکاوٹ پیدا کرسکتی ہے، لیکن یہ حقیقت اب تسلیم شدہ ہے کہ یہ تحریک، انسانی سلوک وکردار کی اصلاح اور تمام ادیان کے متفق علیہ امور ومعاملات میں اخلاقی اقدار وقیم کی پاسداری کا بہترین اسٹیج ثابت ہوتی ہے، نیز یہ تحریک، مادیت، حب مال، حب جاہ اور مصلحت کوشی کی دلدادہ سوسائٹی کی اصلاحی ضرورت اور موجودہ زمانہ کی پکار ہے، یہی وجہ ہے کہ اس تحریک نے سارے ادیان وملل کی طرف سے داد تحسین حاصل کی ہے، ان انسانی اغراض ومقاصد کے علاوہ یہ تحریک مسلم اور غیر مسلم کے درمیان حائل خلیج کو پاٹنے میں بڑی سودمند ثابت ہوئی ہے، نیز ایک دوسرے کے ساتھ مل بیٹھنے کا موقع فراہم کرتی ہے تاکہ اسلام اور مسلمانوں کے مخالف ودشمن تحریکات نے ان کے سلسلہ میں جو شکوک وشبہات جنم دیئے ہیں، اس کا قلع قمع کیا جاسکے، نیز یہ تحریک اسلام کی صاف ستھری تاریخ پیش کرنے کا اور اسلامی تعلیمات کی صحیح تصویرکشی کرنے کا بہترین ذریعہ ثابت ہوئی، فی الواقع مستشرقین اور ان کے چالاک تلامذہ نے اسلامی تاریخ کو مسخ کرکے پیش کیا ہے اور یوں اسلام اور مسلمانوں کو پوری دنیا میں بدنام کرنے کے لئے تاریخ نویسی کو اپنا آلہ بنایا ہے، لیکن اس تحریک کو اس سلسلہ میں بڑی کامیابیاں حاصل ہوئیں چنانچہ بعض غیر مسلم قائدین اور دانشوروں نے اس حقیقت کا برملا اظہار کیا کہ اس تحریک سے پہلے یہ لوگ اس سے بالکل ناواقف تھے کہ مسلمانوں کے دل بھی انسانیت اور وطن کا درد ومحبت رکھتے ہیں، ان کو تو صرف یہی معلوم تھا کہ مسلمان صرف تیر وتبر اور شمشیر وخنجر کے رسیا ہیں۔

حضرت مولانا رحمہ اللہ نے اس تحریک کے ایک اہم اجتماع کو خطاب فرمایا تھا، ہم نیچے اس تقریر کا اہم اقتباس نقل کررہے ہیں:۔

"۔ کسی بھی معاشرہ کا بگاڑ اور اخلاقی اصول سے نظر اندازی، حرص وطمع بڑھی ہوئی مال کی محبت، ظلم وزیادتی، ناجائز قبضہ اور برائیوں کا اثر اس میں ملوث افراد ہی تک محدود نہیں رہتا، بلکہ اس کے اثرات پورے معاشرہ میں پھیل جاتے ہیں، اور ہر وہ معاشرہ جو ان جرائم پیشہ افراد کو نظرانداز کرتا ہے وہ خود ان جرائم میں مبتلا ہوجاتا ہے، ہمیں تاریخ میں بہت سی ایسی تہذیبیں اور ثقافتیں نظر آتی ہیں، جو عرصہ دراز تک ترقی کے بام عروج پر متمکن تھیں، لیکن جب اس میں اخلاقی انتشار عام ہوا، حرص وہوس اور مال کی بڑھی ہوئی محبت نے غلبہ پایا، انسانی ناموس وعزت کو پامال کیا جانے لگا، اور لوگ اپنی نفسانی خواہشات اور ذاتی اغراض کو پورا کرنے میں لگ گئے، دین ومذہب کی تعلیمات اور اخلاقی قدروں کو پس پشت ڈال دیا گیا، اور ان کی تحقیر وتضحیک کا معاملہ شروع ہوگیا، تو یہ ترقی یافتہ تہذیبیں برباد اور نیست ونابود ہوگئیں، مثلاً روم ٹھیک اس وقت اپنی برائیوں کی آگ میں جل رہا تھا، جب وہاں کے فلاسفہ، ادباء وشعراء اپنی بحث ونظر، تحقیق وتخلیق میں ہمہ تن مصروف ومنہمک تھے، اور نئی نئی تحقیقات، انکشافات وایجادات اور علمی کارناموں کا انبار لگا کر معاشرہ کو مسحور ومبہوت کررہے تھے، لیکن چونکہ اندر سے معاشرہ کو گھن لگ چکا تھا، بگاڑ اور فساد گھروں سے نکل کر بازاروں اور سڑکوں تک پھیل چکا تھا، چھوٹے بڑے ہر طرح کے گھرانے اس میں ملوث تھے، مختلف طبقات آپس میں برسرپیکار تھے، ہر شخص بربادی، ظلم وزیادتی کے دہانہ پر کھڑا تھا انہیں وجوہات کی بنا پر جب آتشیں آندھی چلی تو اپنی فتوحات، تعمیرات، تہذیب اور معیار معیشت میں غیر معمولی ترقی کے باوجود (جو ضرب المثل کی حد تک پہونچ گئی تھی) رومن امپائر اس سے بچ نہ سکا اور نہ اس کا دفاع ہی کرسکا۔"

یہ حقیقت ہے کہ اس تحریک نے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان حائل خلیج کو پاٹنے اور ان کے مابین میل ملاپ پیدا کرنے کا اپنا مقصد اصلی پورا کرلیا اور ایک ہی پلیٹ فارم پر ان کے مخالف ومعاند لوگ جمع ہوئے اور ان لوگوں نے حضرت مولانا رحمہ اللہ کی گفتگو، تقریر اور تحریر سننے اور پڑھنے کے بعد اس بات کا اعتراف کیا کہ یہ تحریک واقعۃً اس زمانہ کی ضرورت وپکار ہے، نیز مسلمانوں کے سلسلہ میں ان کا تصور تبدیل ہوا، اور مسلمانوں کے مسائل کے سلسلہ میں ان کے موقف ورویہ میں تبدیلی بھی آئی بلکہ بعض لوگوں نے مسلمانوں کے مسائل کو حل کرنے کے لئے اپنی خدمات پیش کیں اور مسلمانوں کی حمایت اور مدافعت کرنے والے بن گئے، نیز یہ لوگ فرقہ وارانہ فسادات کے علاقوں کا دورہ کرنے اور ریلیف اور ہنگامی امداد کے کاموں میں شریک وپیش پیش رہے، یہ حقیقت بھی قابل ذکر ہے کہ تحریک "پیام انسانیت" کے اجتماعات بعض جگہوں پر فتنوں کی سرکوبی اور مسلمانوں کے خلاف پائی جانے والی عصبیتوں کی بیخ کنی میں بڑے ممد ومعاون ثابت ہوئی ہیں۔

تحریک پیام انسانیت کے اغراض ومقاصد سے ناآشنائی اور اس تحریک کے کارکنان واحباب

کی نیتوں اور اخلاص سے عدم واقفیت کی بنا پر دعوت اسلامی کے بعض سرگرم فعال اور مخلص علمائے کرام نے اس تحریک میں پرجوش شرکت نہیں کی اور بعضوں نے تو اس تحریک کے سلسلہ میں حضرت مولانا رحمہ اللہ سے گفتگو بھی کی لیکن حضرت نے اس سلسلہ کی اپنی جدوجہد، آخری عمر تک، برابر جاری رکھی، اور اس تحریک کے کارکنان کی ہمت افزائی فرماتے رہے اور ان کی مساعی جمیلہ میں برابر ان کا ساتھ دیتے رہے اور اس کے تمام مؤقر اجتماعات میں شرکت فرماتے رہے۔

یہ حقیقت بھی روز روشن کی طرح بالکل ظاہر و باہر ہے کہ حضرت مولانا رحمہ اللہ مسلمانوں کے سامنے اپنی تقریر، تحریر اور گفتگو کے دوران اس بات پر زور دیتے رہے کہ مسلمانان ہند اپنے وطن کی تعمیر و ترقی کے کاموں میں بھرپور حصہ لیں، اور اپنی سوسائٹی سے پسماندگی اور پستی، کشمکش و معرکہ آرائی اور جہالت و نادانی کے اسباب و عوامل کا خاتمہ کریں اور مسلمانان ہند کی مساعی جمیلہ اس ملک کے لئے باعث خیر و برکت ثابت ہوں، ان کی تقریر کا مرکزی موضوع قرآن مجید کی یہ آیت کریمہ "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَكُمْ فُرْقَانًا" ہوا کرتا تھا، حضرت مولانا رحمہ اللہ فرقان کی یہ تشریح فرماتے کہ مسلمانوں کی زندگی، غیروں کے مقابلہ میں زندگی کے تمام شعبہ جات میں ممتاز و نمایاں ہو، اور صدق و صفا، امانت و دیانت اخلاص و للّٰہیت، جدوجہد، مواساۃ و غمخواری، مساوات و برابری اور ایثار و قربانی سے متصف رہے تاکہ مسلمانان ہند ان صفات و امتیازات کی بدولت، برادران وطن کی محبت و الفت اور اعتماد کے حق دار بن سکیں وہ ان کو باعث برکت سمجھیں، اس ملک کے لئے ان کو وبال اور مصیبت نہ تصور کریں۔

زہے وہ سرزمیں وہ شاہ علم اللہؒ کا تکیہ

● صوفی عبدالرب صاحب

خوشا وہ بقعۂ نور اولیاء اللہؒ کا تکیہ
زہے وہ سرزمیں وہ شاہ علم اللہؒ کا تکیہ

وہ تکیہ ہے کواکب اور مہر و ماہ کا تکیہ
وہ قبرستان ہے مردانِ حق آگاہ کا تکیہ

دہاں زیر زمیں انوار کے صدہا خزینے ہیں
وہاں مسجد سے تا دریا بڑے پُر نور زینے ہیں

معطر ذکر حق سے جس کی صدیوں سے فضائیں ہیں
مہکتی جس کی انفاس معنبر سے ہوائیں ہیں

مقابر سے جہاں مسموع اب تک وہ صدائیں ہیں
کہ جن میں کچھ تلاوت کچھ انابت کچھ دعائیں ہیں

سراپا نور ہے یہ خانوادہ علم و عرفاں کا
اسی سے سلسلہ ہے سید احمدؒ شیر یزداں کا

زیانِ ملتِ اسلامیہ ہے انتقال ان کا
نہ بھولے گا بھلائے زندگی بھر کیف و حال ان کا

بدن سے روح یوں نکلی چمن سے جیسے بو نکلے
نہیں عارف کے منہ سے جس طرح لاتقنطوا نکلے

ذرا سی آئی ہچکی، یا کلی چٹکی، مہک نکلی
بدن سے روح نکلی، برق کوندی یا چمک نکلی،

ادھر شوق لقا سے مست ہو کر دم نکلتا تھا
ادھر جام مئے ذکر و دعا کا دور چلتا تھا

ادھر گہوارۂ رحمت میں طفل جاں مچلتا تھا
ادھر فوارۂ پاس نفس پیہم ابلتا تھا۔

سہانی رات گہری نیند میں جب ڈوب جاتی ہے
فضائے مسجد تکیہ کی مستی رنگ لاتی ہے

ہوا جب جاگ کر یا حق کا نغمہ گنگناتی ہے
تو اس قبہ سے پیہم ذکر کی آواز آتی ہے

صدائے ذکر ہے مسموع کوئی راز ہے ہمدم
یہاں ہر قبر میں زندہ شہید ناز ہے ہمدم

حضرت مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی زندگی کے یہ چند ایسے پہلو ہیں، جن میں موصوف دوسرے داعیوں، عالموں اور مفکروں سے ممتاز و منفرد ہیں، نیز حضرتؒ کے یہ خیالات و نظریات، ان کی ایمانی فراست، مسائل کی تہہ تک بلا تاخیر پہونچ جانے کی صلاحیت، اور حرکت و عمل کے اسباب و نتائج کے صحیح ادراک و احساس کے مرہون منت ہیں، ان کی دور بینی و دروں بینی کا نتیجہ ہیں، بلاشبہ ان آراء و نظریات کی اہمیت و افادیت حضرت مولانا کے دیگر علمی و عملی کارناموں سے کسی طرح بھی کم نہیں ہے۔

یہ حضرت مولانا مرحوم کی فراست و ذہانت، ان کی دور اندیشی، جرأت ایمانی بے نفسی و خداترسی اور اخلاص و للّٰہیت کی چند جھلکیاں ہیں، یوں تو ان کی مثالی زندگی اس قسم کے سبق آموز واقعات سے پر ہیں، انھوں نے غور و فکر کا اپنا ایک الگ راستہ اپنایا، اور جہاد زندگانی میں یقین محکم، عمل پیہم اور بے لوث محبت کے ذریعہ دل و دماغ کے دونوں جہاں مسخر کر لئے تھے۔

بدلا ہوا ہے رنگ گلوں کا ترے بغیر
کچھ خاک سی اڑی ہوئی سارے چمن میں ہے

حضرت مولانا علی میاں صاحب ندویؒ کی زندگی کے دو اہم پہلو

اتحادِ ملت اور اصلاحِ امت

ڈاکٹر ہارون رشید صدیقی

حضرت مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ذات جامع صفات اور جامع کمالات تھی حضرت کی رحلت کے بعد اخبارات، مجلات اور رسائل وغیرہ میں جتنا آپ پر لکھا گیا کم ہی کسی عالم دین پر اتنا لکھا گیا ہوگا، بہت لکھا گیا اور خوب لکھا گیا اور یہاں کی ہر مشہور ومقبول زبان میں لکھا گیا، اسی طرح آپ کی یاد میں مختلف عناوین سے جلسے بھی ریکارڈ تعداد میں ہوئے، حرمین شریفین اور دیگر دور دراز ملکوں میں آپ کی غائبانہ نماز جنازہ کا پڑھا جانا بھی آپ کی بے پناہ عالمی مقبولیت کی علامت ہے۔

جتنا آپ پر لکھا گیا ہے اس سب کا پڑھ لینا بھی آسان کام نہیں ہے، لہٰذا جن مضامین پر میں نظر ڈال سکا ہوں ان کی روشنی میں کہتا ہوں کہ اکثر لکھنے والوں نے آپ کے محاسن وفضائل کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے، اور تقریباً آپ کی ہر صفت پر کافی روشنی ڈالی ہے، تمام مضامین کے بارے میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ ع

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر یست

بے شک حضرت پر بہت کچھ لکھا گیا اور ابھی لکھا جائے گا، کئی لوگ تو آپ کی زندگی ہی میں آپ کے کسی ادبی پہلو پر کام کرکے ڈاکٹر بن گئے اور کتنے لوگ آئندہ آپ کو عنوان بنا کر ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں حاصل کریں گے، ان سطور میں حضرت مولانا کے "اتحاد ملت اور اصلاح امت" پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے جو حضرت مولانا کا مشن تھا۔

حضرت مولانا کی قربت، خصوصی وعمومی مجلسوں میں شرکت، تقریروں میں حاضری، مطبوعہ محاضرات، تالیفات اور تصنیفات کے مطالعہ کی روشنی میں عرض کر رہا ہوں کہ "اتحاد ملت اور اصلاح امت" حضرت مولانا کا مشن تھا۔ اس مضمون میں میں جو کچھ لکھ رہا ہوں وہ حضرت کی کسی تحریر یا تقریر ہی سے ماخوذ ہے۔

اس عالم میں جماعتوں میں اتحاد کا اور میدان عمل میں مختلف وحدتوں اور یونٹوں کی متعدد بنیادیں ہیں، کہیں اشتراکیت کی آواز ہے، کہیں قومیت کی پکار ہے، کہیں لسانیت کا رشتہ ہے کہیں مخصوص ثقافت ہے تو کہیں جاہلی حمیت ہے، حضرت مولانا نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں ایک ایک کا جائزہ لیا ہے، اور سب کی کمزوریاں اور خرابیاں بیان فرمائی ہیں لیے

حقیقت یہ ہے کہ لفظ وحدت میں ایک قسم کی مقناطیسیت ہے لیکن کتنی وحدتیں ہیں جن کی زندگی ہی دوسری وحدتوں کی موت ہے، یہ وہی وحدتیں ہیں جو وحدتوں سے ٹکراتی اور ایک دوسری کی تباہی کا سبب بنتی ہیں، لہٰذا محض وحدت کوئی معنویت نہیں رکھتی، جو وحدت حقیقی وفطری بنیادوں پر قائم ہے، وہی مضبوط وپائدار ہے، وہی بامقصد ہے، اسلام نے جس وحدت کا تصور دیا ہے وہ حقیقی ہے، ہمارے مولانا اسی وحدت کے داعی اور اسی اتحاد کے مبلغ تھے، وہ تحریر فرماتے ہیں کہ حجۃ الوداع کے موقع پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان ربکم واحد وان اباکم واحد "اے انسانو! تمہارا رب بھی ایک ہے اور تمہارا اَب یعنی باپ بھی ایک ہے، وحدت رب اور وحدت اب، لہٰذا انسان متحد ہوں اپنے ایک رب کے تعلق سے، انسان متحد ہوں اپنے جدامجد یعنی ایک باپ آدم علیہ السلام کے رشتہ سے، اس وحدت اُب میں انسانیت کے سارے تقاضے اور حقوق موجود ہیں، جن کے پاس ولحاظ میں انسان متحد ہوں، وحدت رب میں عظمت حق، اور اطاعت حق پوری طرح کارفرما ہے جس کے لحاظ میں انسان متحد ہوں، مگر یاد رہے ہدایت ربانی کے بغیر وحدت ربانی کا حصول ناممکن ہے۔" وما اٰتاکم الرسول فخذوہ ومانھاکم عنہ فانتھوا" پر عمل پیرا ہونے ہی سے وحدت ربانی کا وجود ہوگا، وحدت ربانی کا دوسرا نام وحدت عقیدۂ اسلامی ہے، وحدت عقیدہ اسلامی میں وحدت انسانی بھی بے کم وکاست موجود ہے نفس وحدت اب میں تو صرف باپ کا رشتہ تھا، وحدت ربانی کی عملی شرح جب ہوئی تو "اُنصر اَخاک ظالماً اَومظلوماً" کا حکم آگیا اور یہ بھی تعلیم دی گئی کہ جو اپنے لئے پسند کرو وہی اپنے بھائی کے لئے پسند کرو، سارے بھائیوں کو جسم کے اعضاء کی طرح جانو، جس طرح جسم کے کسی عضو میں تکلیف پیدا ہوتی ہے تو سارا جسم درد محسوس کرتا ہے، اسی طرح ایک بھائی کو تکلیف ہو تو سارے بھائی تڑپ اٹھیں۔

حضرت مولانا کا اتحاد ملت کو مقصد زندگی بنا لینے کا یہی وہ جذبہ تھا کہ وہ علالت کی حالت میں بھی

مغرب ومشرق کے دورے کرتے رہے اور اصلاح امت کی یہی وہ فکر تھی جس سے وہ مسلمانانِ عالم کو آواز دیتے رہے، آپ کی یہ آوازیں آج بھی "دریائے کابل سے دریائے یرموک تک"، "مغرب سے کچھ صاف صاف باتیں"، "نئی دنیا امریکہ میں صاف صاف باتیں"، "تحفۂ مشرق"، "شرق اوسط کی ڈائری"، "مغرب اقصیٰ مراکش میں"، "اسمعی یا مصر اسمعی یا ایران"، "نفحات الایمان بین صنعاء وعمان" جیسی کتابوں سے سنی جاسکتی ہیں۔

یوں تو جس پر جس چیز کا غلبہ ہو جاتا ہے اس کو ہر چیز میں وہی چیز نظر آتی ہے، چنانچہ مجھے تو حضرت مولانا کی ہر تحریر اور ہر تصنیف میں یہ بات نظر آتی ہے کہ اتحاد ملت اور اصلاح امت مولانا کی زندگی کا مقصد تھا، ہم نے متعدد اہل علم حضرات سے تبادلۂ خیال کیا تو ان کو بھی اپنی رائے سے متفق پایا۔

حضرت مولانا اتحاد ملت کے لئے بے چین اور اصلاح امت کے لئے بے قرار رہتے تھے، حضرت مولانا اتحاد ملت، اسلامی بنیادوں پر چاہتے تھے، وہ باطل سے سودا کر کے نام نہاد اتحاد ملت سے بے زار تھے، وہ اصلاح امت سنت نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر چاہتے تھے، بقول شخصے وہ عقیدہ اسلامی میں فولاد کی صلابت رکھتے تھے، جب کہ اتحاد ملت کے لئے آپ کے اخلاق میں ریشم سے زیادہ نرمی و ملائمیت تھی، کتاب وسنت پر جمے رہنا آپ کی زندگی کا امتیاز رہا، بیان توحید میں جب شرک کا ذکر آتا تو آپ کی پُر جلال آواز میں بجلی کی کڑک محسوس ہوتی، سامعین پر سناٹا چھا جاتا، بدعت سے آپ کو سخت نفرت تھی، عملاً تو اجتناب تھا ہی قولاً بھی سخت نکیر فرماتے، شرک کا ظلم عظیم ہونا تو اہل قبلہ کو بالاتفاق تسلیم ہے قرآن پاک کا صاف اعلان ہے" اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ" ہر بدعت کا گمراہی ہونا تو امت میں مشہور ومعروف ہے کہ فرمان رسول ہے" کل بدعة ضلالة" لیکن جن فروعی اختلافی مسائل کی بحث سے امت میں افتراق پیدا ہو، یا جن مباحات کی بحث میں فرائض کا نقصان ہو رہا ہو، ایسے مسائل میں پڑنا حضرت مولانا کو سخت ناگوار تھا، اس بات کے ثبوت میں، میں حضرت مولانا کی ایک تقریر کی تلخیص پیش کر رہا ہوں، یہ تقریر علماء وطلباء کے سامنے کی گئی تھی جس میں دانشور طبقہ کے لوگ بھی تھے جو "دعوت فکر وعمل" میں چھپ گئی ہے۔ فرمایا:۔

" ائمہ مساجد، خطباء اور علماء حضرات اپنی ذمہ داریاں سمجھیں، اور ملک میں انتشار بڑھانے والے اختلافی مسائل چھیڑنے کے بجائے معاشرہ کی اصلاح پر توجہ فرمائیں، اس سے ملک کی بھی خدمت ہوگی اور عالم اسلام کی بھی، اس وقت صورت حال یہ ہے کہ مغربی تہذیب فاتحانہ پیش قدمی کر رہی ہے، جو صرف ثقافت ہی نہیں تمدن وسیاست میں بھی انقلاب چاہتی ہے وہ شرافت کا معیار بدل کر سیادت میں بھی تبدیلی لانا چاہتی ہے، وہ اسلامی بنیادوں کو ہلا دینے کی کوشش کر رہی ہے، وہ اس ملک کی چولیں ہلا رہی ہے، اسلامی معاشرت تبدیل ہو رہی ہے، اسلامی تمدن دم توڑ رہا ہے، مسلمان ذہنی وفکری ارتداد کے شکار ہو رہے ہیں اس حال میں ہمارے یہاں علم غیب کی بحثیں چل رہی ہیں، بشریت رسول پر مناقشے ہو رہے ہیں، توقع نہ تھی کہ اس نازک دور میں جب کہ ہمارے سروں پر خطرہ کی تلوار لٹک رہی ہے کوئی اس طرح کی بحثیں چھیڑے گا لیکن اس دنیا میں سب کچھ ممکن ہے، ہو سکتا ہے ہم اپنی توانائی وطاقت، فراست وذہانت ان فروعی ونزاعی بحثوں میں ضائع کر رہے ہوں اور اسی آن مغربیت ہمارے ملک وملت پر غلبہ حاصل کر رہی ہو، آپ تو مشاعر اسلام کو بچانے کی کوشش کریں جب یہ بچ جائے گی تو ان مسائل کی بحث کا موقع ہوگا، یہ بحثیں مدرسہ کے اندر کی ہیں یا صرف علماء کی مجلسوں کی ہیں سڑکوں اور چوراہوں کی نہیں، جلسۂ عام کی نہیں، اختلافات ہمیشہ سے رہے ہیں صرف نماز کے اندر درجنوں اختلافات ہیں، لیکن کبھی ان سے انتشار نہیں پیدا ہوا، اگر انتشار ہوا تو اسی وقت ہوا جب یہ مسائل عوام کے سامنے لائے گئے اور عوام کے حوالہ کر دیئے گئے، پھر تو عوام ایک دوسرے سے جڑنے کے بجائے بچھڑنے لگے، یہ بحثیں جب تک مدرسوں میں رہیں، علمی مجلسوں میں رہیں ان سے فائدہ ہوا، علم وذہانت میں اضافہ ہوا، اور یہ تو زندہ انسان اور زندہ جماعت کی خصوصیت ہے کہ وہ غور کرے اور سمجھنے کی کوشش کرے، اس پر کوئی پہرے نہیں بٹھا سکتا، لیکن اگر یہ بحثیں عوام میں آجائیں گی، ان سے سیاسی مقاصد حاصل کئے جائیں گے، جماعتی مقاصد حاصل کئے جائیں گے، ان سے اپنی بڑائی اور ذاتی مفادات کی حفاظت کا کام لیا جائے گا، تو پھر یہ مضر ہی نہیں مہلک بن جائیں گی، یہ فقہی مسئلے، خالص علمی مسئلے، کلامی مسئلے ان کو اپنے کتب خانوں میں رکھئے، مدرسوں میں رکھئے، علمی حلقوں میں رکھئے مگر عوام میں

نہ لائیے کہ اس سے انتشار و افتراق پیدا ہوگا جو آپ کے مقصد کے خلاف ہے

تو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے فصل کردن آمدی

ایک موقع پر برصغیر میں کچھ لوگوں نے امت میں انتشار پیدا کرنا شروع کیا، عامۃ المسلمین کے سامنے وہ علمی بحثیں شروع کیں جنہیں عوام الناس تو کیا سمجھتے خود بحثیں چلانے والے انھیں کما حقہ نہیں سمجھ پا رہے تھے، البتہ ان بحثوں کے نتیجہ میں ایک صوم وصلاۃ کا پابند مسلمان، دوسرے صوم وصلاۃ کے پابند مسلمان کو اسلام سے خارج سمجھنے لگا، دل پھٹنے لگے، اتحاد ٹوٹنے لگا، دشمنوں کو انتقام کے مواقع ملنے لگے، ایسی صورتحال دیکھ کر حضرت مولانا بے چین ہو گئے آپ نے ایک کتابچہ عربی اردو میں طبع کروا کر تقسیم کروایا جس کا خلاصہ اس طرح ہے:

"اس وقت مسلمان جن خطرات میں گھرے، جن مسائل میں الجھے، جن چیلنجوں سے نبرد آزما، اور تاریخ کے جس نازک ترین موڑ سے گزر رہے ہیں وہ ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دیتے، کہ وہ اپنی طاقت وتوانائی ان فروعی مسائل میں صرف کریں، جو بحث وتحقیق کے مراحل سے گزر چکے ہیں اور صدیوں سے ان پر عمل ہوتا چلا آرہا ہے، یا کسی فقہی مسلک کی کسی ایسے مسئلہ کی وجہ سے مخالفت کریں جو کوئی بنیادی اہمیت نہیں رکھتا، اس سے امت کی کوئی خدمت نہیں ہوتی، اس لئے ضرورت ہے کہ اپنی توانائی صرف تعمیری کاموں میں صرف کی جائے اور اپنی کوشش کا محور اخلاقی بگاڑ، مشرکانہ عقائد، جاہلی رسم ورواج اور غیر اسلامی بود وباش کی اصلاح کو بنایا جائے۔

توحید اور شریعت اسلامی پر عمل کرنے والوں اور محرمات سے بچنے والوں کو صرف فقہی اختلاف کی بنیاد پر جو ہمیشہ قائم رہا ہدف تنقید بنانا "بے مقصد جہاد اور بغیر دشمن کے جنگ" کے مرادف ہے"۔

اکثریتی فرقہ کے ارادوں اور عزائم سے جو شخص بھی واقف ہے وہ بخوبی اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ اس ہندوستان کو جس پر مسلمانوں نے آٹھ سو سال حکمرانی کی اور تہذیبی، ثقافتی، انتظامی اور اقتصادی حیثیت سے اس کو بام عروج پر پہونچایا وہ اس کی اسلامی تاریخ کو مسخ کرکے مسلمانوں کے تشخص کو ختم کرنا چاہتے ہیں، مسلمانوں کی فکری، ثقافتی، اجتماعی، تہذیبی اور لسانی، پھر اس کے بعد دینی واقتصادی نسل کشی کی کوشش کا سلسلہ جاری ہے، اور اس کی علامتیں نصاب تعلیم میں تبدیلی، ہندی کی جبری تعلیم، پرسنل لا میں مداخلت، یکساں سول کوڈ کے نفاذ پر اصرار، اردو زبان کی بیخ کنی، انگریزی وہندی اخبارات میں شائع ہونے والے مضامین، فرقہ وارانہ جماعتوں کے قائدین حتیٰ کہ بعض وزراء کے بیانات واعلانات اور ان کی پیش کردہ تجاویز، اور ان کی تیار کی ہوئی اسکیموں کی شکل میں ظاہر ہونے لگی ہیں، تو ایسے نازک وقت میں آپس میں دست وگریباں ہونا ایک بڑی ناعاقبت اندیشی اور کوتاہ نظری ہے۔

اتحاد ملت کے سلسلے سے سب سے بڑا کارنامہ آپ کا آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے پلیٹ فارم پر ہندوستانی مسلمانوں کو جمع کرنا ہے، اگرچہ اس بورڈ کے قیام کا سہرا کسی ایک فرد کے سر پر نہیں باندھا جا سکتا، یہ کارگزاری منتخب علماء کی ایک جماعت کی ہے، لیکن اس جماعت میں سرفہرست مولانا علی میاں صاحب کا نام لیا جا سکتا ہے۔ بورڈ کی تشکیل ۲۸ اپریل ۱۹۷۲ء میں ہوئی، اس کے محرک مولانا منت اللہ صاحب رحمانی امیر امارت شرعیہ اڑیسہ وبہار اور اس کے پہلے صدر دارالعلوم دیوبند کے مہتمم جناب مولانا قاری محمد طیب صاحب رح ہوئے اور تاحیات اس کے صدر رہے، ۱۹۷۷ء میں ان کی علالت کے سبب بعض ممبران نے تجویز پیش کی کہ حضرت مولانا علی میاں صاحب رح کو بورڈ کا صدر چن لیا جائے، اس وقت مولانا رح نے ایک تاریخی جملہ کہہ کر لوگوں کو خاموش کر دیا۔ فرمایا: "طوفان کی حالت میں کشتی نہیں بدلے جاتے" چنانچہ حضرت قاری صاحب تاحیات صدر رہے۔ مولانا کا یہ جملہ جہاں اپنی صداقت وحقیقت کے اعتبار سے آب زر سے لکھنے کے قابل ہے وہیں اتحاد ملت کے سلسلہ میں بھی اپنی مثال آپ ہے۔

۱۷ جولائی ۱۹۸۳ء کو جب جناب قاری صاحب رح کا انتقال ہوگیا تو حضرت مولانا علی میاں صاحب بالاتفاق صدر منتخب ہوئے اور اپنے آخری وقت ۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ء تک صدر رہے۔ ان دونوں طویل مدت صدارتوں کے دور میں اتحاد ملت کے جو مظاہر دیکھے گئے وہ اس سے پہلے ہندوستان میں صرف تحریک خلافت ہی کے دور میں نظر آئے تھے۔ ۱۹۸۵ء میں کلکتہ میں بورڈ کے اجلاس میں پانچ لاکھ کا مجمع تھا، شاہ بانو کیس کی مخالفت میں بورڈ کی اپیل پر مسلمانان ہند نے جس اتحاد کا ثبوت دیا وہ ایک ریکارڈ ہے، حضرت مولانا خود کاروان زندگی جلد سوم میں فرماتے ہیں:-

"اس سلسلہ میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے وزیر اعظم کے نام بڑی تعداد میں احتجاجی تار بھیجے، مساجد میں مسلمانوں کو صورت حال سے آگاہ کرنے اور ملک کے چپہ چپہ پر عمومی جلسے کرنے کی ہدایت واپیل

کی، ہندوستان کی ملت اسلامیہ نے اس کا ایسا اثر لیا اور اس کی تعمیل کی کہ جس کی نظیر تحریک خلافت کے بعد کسی دوسرے ملی مسئلہ کے سلسلہ میں نظر نہیں آتی، لاکھوں کی تعداد میں ملک کے گوشہ گوشہ شہروں، قصبات اور دیہاتوں سے تار دیئے گئے، مساجد میں تقریریں اور دعائیں ہوئیں، ملک میں پورب سے لے کر پچھم تک اور اتر سے لے کر دکھن تک عظیم الشان جلسے ہوئے، جن میں لاکھ ڈیڑھ لاکھ کی تعداد میں مسلمانوں کا جمع ہو جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں رہی۔"

آگے تحریر فرماتے ہیں:۔

"علاوہ کثرت تعداد کے یہ پہلو بھی قابل لحاظ ہے کہ مسلمان فرقوں، مکاتب خیال اور مختلف مسلم تنظیموں کی ایسی نمائندگی کم دیکھنے میں آئی، مسلم لیگ، جمعیۃ العلماء ہند، جماعت اسلامی ہند، تعمیر ملت، اتحاد المسلمین اور مسلم مجلس کے علاوہ فرقۂ اثنا عشری میں سے جناب کلب عابد صاحب مجتہد نائب صدر بورڈ، جناب شبیر بھائی نورالدین (بوہرہ جماعت) جناب یوسف حاتم مچھالہ صاحب ایڈوکیٹ (بوہرہ جماعت) پرنس انجم قدر صاحب صدر آل انڈیا شیعہ کانفرنس، جناب مولانا محمد اسعد مدنی صاحب صدر جمعیۃ العلماء ہند، جناب مولانا سید مظفر حسین صاحب کچھوچھوی عالمہ کے جلسوں میں شریک ہوتے اور عمومی جلسوں میں خطاب فرماتے۔"

اس بے مثال اتحاد میں عورتیں بھی مردوں کے دوش بدوش تھیں، کاروان زندگی حصہ سوم میں بوٹ کلب ہاؤس دہلی میں خواتین کے ایک جلسہ کے بارے میں یوں لکھا ہے:۔

"دہلی بوٹ کلب ہاؤس کے میدان میں ۱۰/اپریل ۱۹۸۶ء کو مسلم خواتین کا ایک عظیم الشان تاریخی جلسہ بیگم عابدہ احمد، ایم۔ پی کے زیر صدارت منعقد ہوا، یہ جلسہ شاہ بانو کیس میں سپریم کورٹ کے فیصلہ کے خلاف بطور احتجاج کیا گیا تھا، جلسہ میں خواتین نے یک زبان ہو کر حکومت ہند سے اپیل کی کہ وہ سپریم کورٹ کے اس غیر شرعی فیصلہ کو منسوخ کر دے۔

اس جلسہ کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس میں عام خواتین کے دوش بدوش نئی روشنی کی مسلم تعلیم یافتہ خواتین بڑی تعداد میں نہ صرف یہ کہ شریک تھیں بلکہ کارکردگی میں نمایاں حصہ لے رہی تھیں، جلسہ گاہ کا وسیع پنڈال خواتین سے کھچاکھچ بھرا تھا، دینی جذبہ اور ملی حمیت سے سرشار عورتوں کو موسم کی شدت اور گرمی کی مطلق پرواہ نہ تھی، جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ نعرۂ تکبیر کی صداؤں سے فضا گونج رہی تھی۔"

غرض کہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر کی حیثیت سے حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کی قیادت میں شاہ بانو کیس، یکساں سول کوڈ اور وندے ماترم جیسے کیسوں میں مسلمانان ہند نے جس اتحاد و اتفاق کا مظاہرہ کیا اور حکومت کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کیا اس کی نظیر نہیں ملتی۔

اصلاح امت کے سلسلہ میں آپ نے کیا کوششیں کیں کتنے لوگوں کی اصلاح ہوئی، کتنے لوگ آپ کی سعی و کوشش اور توجہ سے اللہ والے بن گئے، شرکیات سے دور اور بدعات سے مجتنب ہوئے اس کا احاطہ آسان کام نہیں، اتحاد و اتفاق پیدا کرنے میں کبھی بڑی نزاکت پیدا ہو جاتی ہے، جس سے میل کرنا ہے وہ کسی ایسے منکر میں مبتلا ہے کہ اس پر نکیر کی جائے تو میل کھٹائی میں پڑ جائے، اس سلسلہ میں حضرت مولانا کا اصول یہ رہا کہ جس نے حضرت کی طرف ہاتھ بڑھایا آپ نے خندہ پیشانی کے ساتھ اس کا ہاتھ ہاتھ میں لے لیا، محبت و اخوت کی گفتگو سے نوازا، کبھی ایسا بھی ہوا کہ پہل حضرت مولانا کی جانب سے ہوئی جب کہ معلوم تھا کہ ملنے والا منکرات میں مبتلا ہے، آپ نے ملتے ہی ناگوار جملوں سے اس کو مایوس نہیں کیا بلکہ "اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ" پر عمل کرتے ہوئے اپنے اخلاق سے اس کو متاثر کیا، ٹھنڈا پانی پلایا، اپنے دسترخوان پر بٹھایا، اس کی کوئی ضرورت ہوئی اس کو پورا کیا، لیکن جب عمومی خطاب کا موقع آیا، عمومی تحریر کا موقع آیا تو حق ادا کر دیا۔ اس سلسلہ میں آپ کی تحریروں کے بعض اقتباسات پیش خدمت ہیں فرمایا:۔

"یہ حقیقت خواہ کتنی ہی تلخ، ناخوشگوار اور بہت سے لوگوں کے لئے نامانوس ہو، مگر یہ حقیقت ہے کہ ہم مسلمانوں میں کچھ مشرکانہ عقائد و اعمال پائے جاتے ہیں اور شرک جلی کے وجود کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا، اس کے اعتراف کے لئے تھوڑی سی قرآن فہمی اور کسی قدر اخلاقی جرأت کی ضرورت ہے اگر شرک کی کوئی حقیقت ہے اور وہ عنقا کی طرح کوئی خیالی و فرضی پرندہ نہیں، اور اگر قوموں اور ملتوں کے لئے ایک ہی میزان عدل اور ایک ہی پیمانۂ انصاف ہے تو اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بہت سے مسلمان اس ذہنی گمراہی اور بے راہ روی میں مبتلا ہو گئے ہیں جس کو قرآن میں صاف صاف شرک کہا گیا ہے۔

(بعض مزاروں اور تعزیوں پر اس کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے)۔

آگے فرماتے ہیں:۔

"اس سلسلہ میں علما، وواعظین وواقفین حال کا جو فرض ہے وہ محتاج بیان نہیں اور اس فرض کے "فرض کفایہ" کے درجہ میں بھی باقی نہ رہنے سے جس عمومی باز پرس اور مواخذہ کا خطرہ ہے وہ اہل نظر سے مخفی نہیں۔" (از مطبوعہ فولڈر اصلاح معاشرہ کمیٹی ندوۃ العلماء)۔

مسرفانہ تقریبات کے سلسلہ میں ایک تقریر میں فرمایا جو اب تحریر میں محفوظ ہے:۔

"شریعت کی روح، دین کے مزاج اور انسانی واخلاقی نقطہ نظر سے کسی طرح اس کا جواز نہیں نکل سکتا کہ جب ہزاروں لاکھوں افراد کی زندگی کی بنیادی ضرورتیں پوری نہ ہورہی ہوں، لاکھوں آدمیوں کو قوت لایموت حاصل نہ ہورہی ہو اور وہ جسم وجان کا رشتہ بھی قائم نہ رکھ سکتے ہوں، ملت کے لاکھوں بچے فیس اور کتابوں اور ضروری مصارف کے نہ ہونے کی وجہ سے تعلیم سے محروم ہوں، ہزاروں ادارے جو ملت کے لئے روح کا حکم رکھتے ہیں اور بیسیوں منصوبے جن کی تکمیل کے بغیر اس ملت کا وجود مشکوک اور اس کا مستقبل تاریک ہے موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا ہوں، اہل ثروت تجار، ذی حیثیت لوگ اپنے اولاد کی شادیوں، خوشی کی تقریبوں اور رسوم کی تکمیل میں پانی کی طرح روپیہ بہائیں۔

زمانہ کے بہت سے تغیرات وانقلابات اور علم وترقی کے باوجود اب تک مسرفانہ اور شاہانہ شادیوں اور تقریبوں کا رواج بند نہیں ہوا، البتہ بعض جگہ انھوں نے جدید طرز اختیار کرلیا ہے اور سیاسی مصالح ومقاصد بھی کہیں کہیں ان سے وابستہ ہوگئے ہیں، آج بھی ہماری بہت سی برادریوں، تجارت پیشہ حلقوں اور عمائدین شہر میں تقریبات پر جو ایک انسانی ضرورت اور دینی فریضہ تھا دل کھول کر اور جان پر کھیل کر روپیہ خرچ کرنے کا رواج ہے ان میں سے بہت سے حضرات اپنی دوسری عملی زندگی میں دیندار اور صاحب خیر بھی ہیں مگر انھوں نے اس شعبہ کو دین سے بالکل غیر متعلق سمجھ رکھا ہے اور اس میں اچھے اچھے لوگ اس آیت کا مصداق ہیں۔

" أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهُ هَوَاهُ

(الفرقان: ۴۳)

(آپ نے اس شخص کی حالت دیکھی جس نے اپنا خدا اپنی خواہش نفسانی کو بنا رکھا ہے)"۔

جہیز کے سلسلہ میں ایک جگہ فرماتے ہیں:۔

"اس سلسلہ کی سب سے زیادہ قابل ملامت ونفرت اور غضب الٰہی بلکہ عذاب الٰہی کو دعوت دینے والی چیز لڑکی والوں سے زیادہ سے زیادہ جہیز کا مطالبہ اور فرمائشوں کی وہ فہرست ہے جو لڑکے یا لڑکے والوں کی طرف سے پیش کی جاتی ہے اور اس کو رشتہ کی شرط قرار دیا جاتا ہے۔"

نونہالان امت کی تعلیم وتربیت کا اہتمام بھی اصلاح امت کا اہم ترین شعبہ ہے بلکہ اس کی حیثیت ریڑھ کی ہڈی جیسی ہے جس کے بغیر اصلاح کے سارے منصوبے ناکام رہیں گے، اس خدمت میں بھی آپ کا مقام امتیازی رہا، دوران تعلیم ہی سے اس سے وابستہ ہوگئے، پہلے کامیاب مدرس اور پھر اپنے برادر اکبر جناب ڈاکٹر حکیم سید عبد العلی حسنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد جون ۱۹۶۱ء میں ندوۃ العلماء کے ناظم ہوئے، اور زندگی کے آخری وقت ۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ء تک ناظم رہے، آپ کے دور نظامت میں ندوۃ العلماء اور اس کے دار العلوم نے جو ترقی کی وہ ایک ریکارڈ ہے، آج ندوۃ العلماء اور دار العلوم ندوۃ العلماء کو عالم میں جو مقام حاصل ہے وہ اہل علم حضرات کو معلوم ہے۔

ظاہر ہے دار العلوم ندوۃ العلماء یا دار العلوم دیوبند جیسے اداروں میں ملت اسلامیہ ہندیہ کے سبھی بچوں کی نہ تو گنجائش اور نہ ہر ایک کے لئے اعلیٰ دینی تعلیم کی ضرورت لیکن "ضروریات دین" کی تعلیم ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے چاہے وہ مرد ہو یا عورت، جسے حکمت ومحنت سے ابتدائی درجات میں پورا کیا جاسکتا ہے، اس کے لئے ملک کے ابتدائی دینی مدارس کی سخت ضرورت تھی، اس سلسلہ میں قوم کے ایک مخلص وفعال رہنما جناب قاضی عدیل عباسی صاحب نے ۱۹۵۹ء میں ایک تحریک چلائی، دینی تعلیمی کونسل وجود میں آئی، ہمارے حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ روز اول سے اس دینی تعلیم کے قافلہ کے ساتھ رہے بلکہ صدارت کا منصب سنبھالا، اس کونسل نے اتر پردیش کے ہر ضلع میں انجمن تعلیمات دین قائم کی اور دینی مکاتب کا ایک جال بچھا کر بچوں کی دینی تعلیم میں ایک انقلاب برپا کردیا، ملک کے دوسرے صوبوں نے بھی اس طرز کو اپنایا اور بچوں کی دینی تعلیم کا نظم کیا، حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ اس کونسل کے بھی تاحیات صدر رہے۔ اور اس کے ہر اہم جلسہ میں درد وسوز سے بھرا ہوا خطبۂ صدارت پیش کیا اور دل ودماغ کو جھنجھوڑ دینے والی تقریریں فرمائیں جس سے کونسل کے حوصلے بھی بلند ہوئے اور عوام میں بیداری پیدا ہوئی۔

حضرت مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ملت کو بیدار کرنے اور ایمان ویقین کی دعوت کو گھر گھر پہونچانے کی ایک مخصوص تحریک چلائی جو "تبلیغی جماعت" کے نام سے مشہور ہے۔ حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ اس دعوت سے شروع ہی سے وابستہ رہے، حضرت مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ کام کیا، آپ خود حصہ لیتے اور اپنے متعلقین کو حصہ لینے کی ترغیب و دعوت دیتے، الحمد للہ اب یہ دعوت، عالمی دعوت ہو چکی ہے، یہ کام بھی اصلاح امت کا ایک اہم ترین شعبہ ہے۔

اسکول، کالج، یونیورسٹی، مدرسہ، دارالعلوم اور جامعہ وغیرہ کی تعلیم میں ایک نصاب کی تکمیل کرائی جاتی ہے، جامعات اور یونیورسٹیز میں اگر کوئی تحقیقی کام بھی ہوتا ہے تو ایک محدود اور متعین دائرہ میں، لہٰذا فکری رہنمائی، قلبی اصلاح، قوم و ملت کے لئے دردمندی اور جگر سوزی جیسی باتوں کے لئے کسی تجربہ کار رہنما کی رہنمائی اور حکیم دانا کی حکمت کی ضرورت ہوتی ہے، اس سلسلہ میں بھی آپ کی کارگزاریاں امتیازی حیثیت رکھتی ہیں کتنے اللہ کے بندوں نے آپ کی صحبت میں تزکیۂ نفس اور اصلاح قلب کی منزلیں طے کیں اور کتنے ذی علم حضرات نے آپ کی مفید ترین تالیفات جیسے "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر"، "ہندوستانی مسلمان"، "تاریخ دعوت و عزیمت"، "کاروان زندگی"، "پرانے چراغ" "دستور حیات" وغیرہ اور آپ کے کتابچہ جات پڑھ کر اپنی دنیا بدل دی۔ قصص النبیین اور القراءۃ الراشدہ نے تو بقول مولانا عبد الماجد دریابادیؒ کے بچوں میں علم کلام کا کام انجام دیا۔

غرض کہ حضرت مولانا نے اتحاد ملت کی کوششوں میں اپنی زندگی کھپا دی اور اصلاح امت کی مساعی میں اپنی صلاحیتیں لگا دیں، الحمد للہ نتیجہ بھی بہت حد تک بہتر ہی رہا، حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ سے متعلق یہ موضوع ایک تحقیقی رسالہ (THESIS) کا محتاج ہے جس پر کوئی ضرور قلم اٹھائے گا، میں تو انھیں سطروں پر اکتفا کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا کے درجات بلند فرمائے اور اس دنیا سے جانے کے بعد مجھے بھی حضرت کے جوار میں جگہ عطا فرمائے۔

---

۱ دعوت فکر و عمل ص ۳۴

۲ مسند احمد

ملت کے اتحاد کا دیتا رہا سبق
کرتا نہ تھا پسند کبھی باہمی نفاق

سراپا نکہتِ اسلام بودہ

• مجیب احمد صدیقی مجیب کرنیل گنجوی

چہ خوب آں ساقیٔ گلفام بودہ — مئے حُبّ نبیؐ در جام بودہ
علیؒ اَم بوالحسن آں آلِ سبطینؓ — شمیم گلشنِ اسلام بودہ
مفکّر ہم مؤرخ ہم مفسّر — کثیر العلم آں علّام بودہ
منوّر کرد عالَمؔ راعُلُوَمَشؔ — ضیائے روم و مصر و شام بودہ
ز فضلِ رب شدہ مخدومِ عالم — ولیکن خادمِ اسلام بودہ
اُو در علم و عمل مہرِ جہانتاب — کہ از وے رونقِ اسلام بودہ
حیات آمد پئے اسلام قلمش — پئے اعدائے دیں صمصام بودہ
ہمہ سعیٔ و عمل بُد از پئے دیں — حریفِ گردشِ ایّام بودہ
علیؒ نامش و اولادِ علیؓ ہم — سراپا نکہتِ اسلام بودہ
از انڈونیشیا تا ملکِ افرنگ — ہمہ سعیٔ اش پئے اسلام بودہ
کلیدِ کعبہ زیبِ دستِ پاکش — بُرا بش در حرم اکرام بودہ
دلاں می یافتند آرام از وے — چہ خوب آں روئے دلآرام بودہ
شُنیدم آنکہ از دارِ فنا رفت — کہ فخرِ عالمِ اسلام بودہ
نتادم در بُکا از قلبِ پُر خوں — بہ چشمِ اشکِ لالہ فام بودہ
یکم دسی دسمبر روزِ جمعہ — چوں صبحِ زندگی را شام بودہ

دِلم پُرسید از من سالِ وصلش
بگفتم ضَیغَمِ اسلام بُودَہ

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

ایک جامع اور متوازن شخصیت

سید جعفر مسعود حسنی ندوی مدیر تحریر بانگ درا لکھنؤ

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ عوام کے دلوں کی دھڑکن تھے تو خواص کی عزت وآبرو، وہ دونوں کے تھے اور دونوں ان کے اپنے، دونوں نے اپنے اس محبوب کی جدائی پر جہاں خون کے آنسو بہائے وہیں عقیدت کے پھول بھی برسائے۔

عوامی سطح پر تعزیتی جلسوں کا سلسلہ تھما تو علم وتحقیق کے متوالوں نے اپنی انجمن سجائی، محنت ان کو بھی کچھ زیادہ نہیں کرنی پڑی، ایک موتی تلاش کرتے، دس موتی ان کی گود میں آگرتے۔ خود بھی موتیوں سے مالا مال ہوئے اور آبدار موتیوں کا تحفہ دے کر اپنے سامعین کے لئے بھی روشنی کا سامان کر گئے۔

اس کے بعد باری آئی اخبار ورسائل اور ان کے خصوصی شماروں کی، عوام کا تو کہنا ہی کیا صاف دل، صاف طبیعت، نہ دل میں کھوٹ نہ طبیعت میں کدورت، عقیدت تھی، عقیدت کا اظہار کیا۔ خوبیاں دیکھیں، دل سے سراہا، کارناموں پر نظر پڑی تو صدق دل سے اعتراف کیا۔

خواص نے بھی فراخدلی کا مظاہرہ کیا اور گروہی عصبیت، مسلکی منافرت اور نظریاتی کشمکش سے بالاتر ہو کر حضرت مولانا کی خدمات کو سراہتے ہوئے ان کی وفات کو عالم اسلام کے لئے ایسا حادثہ قرار دیا جو صدیوں میں ایک ہی آدھ بار پیش آتا ہے۔

عقیدت کے اظہار، خدمات کے اعتراف اور قدر کے ان جذبات واحساسات کے ساتھ ساتھ بعض مضامین میں، ایک مخصوص طرز فکر رکھنے اور ایک خاص نقطۂ نظر سے دیکھنے کی وجہ سے اور سلبی ذہن رکھنے کی وجہ سے جو اس دور کے طرز تحقیق کی ایک خصوصیت بھی ہے، ایسے تبصرے بھی شامل ہو گئے جن سے حضرت مولانا کے بعض اقدامات اور نظریات کے بارے میں ذہنوں میں سوالات اور شبہات پیدا ہو سکتے ہیں۔ بعض تذکرہ نگاروں کو حضرت مولانا کی زندگی کا پورا مطالعہ کرنے اور ان کی شخصیت کے بنیادی عناصر کو قریب سے دیکھنے اور پرکھنے کا موقع بھی نہیں ملا، یا انھوں نے صرف ایک زاویہ سے حضرت مولانا کی زندگی کو دیکھنے اور ایک ہی زاویہ سے ان کی شخصیت کا تعارف کرانے کی کوشش کی۔ حالانکہ حضرت مولانا کی اصل خصوصیت جامعیت اور توازن ہے۔ جیساکہ پروفیسر خورشید احمد نائب امیر جماعت اسلامی پاکستان نے اپنے تاثراتی مضمون میں اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

"میں جب بیسویں صدی کی اسلامی فکر کی قوس وقزح پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے ان کا فکر واسلوب ایک ایسا گلدستہ معلوم ہوتا ہے جس میں اس دور کے کئی اہم مفکرین اور داعیوں کے متفرق پہلوؤں کا اجتماع نظر آتا ہے، ان کے یہاں علامہ اقبال کا سوز وگداز، مولانا مودودیؒ کی عقلیت اور تصور دین کی جامعیت، علامہ شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی کا ذوق تاریخ اور مولانا اشرف علی تھانویؒ مولانا محمد الیاسؒ، مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ، مولانا محمد زکریاؒ کی روحانیت کا امتزاج نظر آتا ہے۔ علی میاںؒ کے یہاں یہ سب ایک دوسرے کے ناقض نہیں، ایک دوسرے کی تکمیل کرنے والے ہیں اور یہی وہ نکتہ ہے جسے ناقدین علم وفن نے نظر انداز کر دیا ہے۔

ان کا اصل میدان تاریخ اور دعوت ہے، سیرت اور انسان سازی ہے، روح کی بیماری اور امت کی ترقی کے لئے اسلاف کے نمونہ کا احیاء ہے، ان کے یہاں خانقاہ

> ان کا اصل میدان تاریخ اور دعوت ہے، سیرت اور انسان سازی ہے، روح کی بیماری اور امت کی ترقی کے لئے اسلاف کے نمونہ کا احیاء ہے، ان کے یہاں خانقاہ اور جہاد، تزکیہ اور انقلاب دونوں دھارے ساتھ ساتھ رواں نظر آتے ہیں، کبھی وہ ایک کو نمایاں کرتے ہیں اور کبھی دوسرے کو۔"
> (پروفیسر خورشید احمد)

اور جہاد، تزکیہ اور انقلاب دونوں دھارے ساتھ ساتھ رواں نظر آتے ہیں، کبھی وہ ... کو نمایاں کرتے ہیں اور کبھی دوسرے کو۔"

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ جہاں ایک طرف علم و فضل، زہد و ورع، فقر و استغنا، اور حکمت و دانائی کی بیش بہا دولت سے مالا مال تھے وہیں دوسری طرف ان کی رگوں میں امام المجاہدین سید احمد شہید کا خون بھی اپنی پوری حرارت اور قوت کے ساتھ دوڑ رہا تھا۔ اگرچہ آپ کو کبھی تیر چلانے، تلوار اٹھانے اور نیزہ مارنے کی ضرورت پیش نہیں آئی لیکن لادینیت، اباحیت، مغربیت، قومی عصبیت، نسلی عصبیت، لسانی عصبیت اور جاہلی عصبیت کے خلاف آپ نے قلم و کاغذ، علم و فکر اور تقریر و تحریر سے وہ کام لیا جو سید احمد شہید اور ان کے رفقا نے تیغ و سناں سے لیا تھا، حضرت مولانا جذبہ جہاد کے نہ صرف یہ کہ داعی تھے بلکہ میدانِ جہاد کے ایک جانباز سپاہی تھے اور جہاد کی افضل ترین راہ پر گامزن تھے۔ مصر کے صدر جمال عبدالناصر ہوں، یا انور السادات، ذوالفقار علی بھٹو ہوں یا آیت اللہ خمینی، اندرا گاندھی ہوں یا راجیو گاندھی، صدام حسین ہوں یا فہد بن عبدالعزیز۔

مسئلہ نسبندی کا ہو یا نفقہ مطلقہ کا، عرب قومیت کا ہو یا کویت پر عراق کی یلغار کا، وندے ماترم کا ہو یا خاک وطن کی تقدیس کا، یکساں سول کوڈ کا ہو یا چار شادیوں پر پابندی کا، قومی دھارے میں شمولیت کا ہو یا اسلامی تشخص سے دست برداری کا۔ ہر موقع پر قارئین یہ محسوس کر سکتے ہیں کہ حضرت مولانا اپنی تحریروں اور تقریروں کے پس منظر میں صرف ایک عالم دین ہی نہیں، ایک مفسر اور مؤرخ ہی نہیں، ایک داعی اور ایک مصلح ہی نہیں بلکہ ایک جانباز سپاہی، اولوالعزم مجاہد اور عزیمت و استقامت کا کوہ گراں دکھائی دیتے ہیں۔ وہ جہاں ایک طرف طاغوتی طاقتوں، جابر حکومتوں اور مغرور و خودسر حکمرانوں کو للکارتے نظر آتے ہیں وہیں دوسری طرف اسلامی تحریکوں، مسلم تنظیموں اور دعوتی حلقوں کی غلط روش، غلط رجحان اور غلط طریقہ فکر پر پوری جرأت و بے باکی کے ساتھ نکیر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ نہ انھیں حکومت وقت کا ڈر حق گوئی سے باز رکھتا ہے اور نہ ہی اپنے عوام کی ناراضگی ان کی زبان پکڑتی ہے، جہاد کا اتنا وسیع میدان جو حضرت مولانا کے حصہ میں آیا، اور جہاد کے اتنے کثیر مواقع جو حضرت مولانا کو ملتے رہے اور اس کے جو نتائج برآمد ہوئے وہ کم ہی کسی کے حصہ میں آئے ہوں گے۔

حضرت مولانا کے نزدیک جہاد صرف تیغ و سناں کے استعمال کا نام نہیں، تیغ و سناں کا وقت متعین اور اس کا دائرہ مقرر ہے اور اس کے اپنے کچھ اصول و ضوابط ہیں۔ جہاد اپنے اندر بڑی عمومیت رکھتا ہے۔ اس کا میدان بڑا وسیع اور اس کی شکلیں مختلف ہیں، اور وقت، حالات اور ماحول کے اعتبار سے وہ شکلیں بدلتی رہتی ہیں۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی سیاسی میدان کے آدمی نہ تھے اور نہ ان کے یہاں سیاسی چالوں، سیاسی حربوں اور سیاسی ہتھکنڈوں کی کوئی اہمیت و وقعت تھی۔ وہ خلوص کو کامیابی کی کنجی سمجھتے تھے اور ایمانی فراست کو کامیابی کی ضمانت، چنانچہ انھوں نے ایک مرتبہ سابق کانگریسی وزیر اعظم پی، وی، نرسمہا راؤ کو ان کی سیاسی قلابازیوں پر متنبہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ "نرسمہا راؤ جی! سب سے بڑی سیاست خلوص کی سیاست ہے"۔ اٹل بہاری باجپئی سے ایک ملاقات کے دوران صراحت کے ساتھ فرمایا کہ "اٹل جی! خدا کے یہاں سیاست نہیں چلتی خلوص چلتا ہے، خلوص کے ساتھ کام کیجئے کامیابی قدم چومے گی۔ ترقی کی راہیں کھلیں گی۔ اور فتح و کامرانی آپ کے قدم سے قدم ملا کر چلے گی۔"

حضرت مولانا خلوص کی طاقت کو سمجھتے تھے۔ مومن تھے، فراست ایمانی کی دولت سے مالا مال تھے، آنے والے خطرہ کو پہلے سے ہی بھانپ لیا کرتے تھے اور خلوص کی طاقت پر یقین، خدا کی ذات پر اعتماد اور دعاؤں کی اثر انگیزی پر بھروسہ کرتے ہوئے میدانِ عمل میں نکل آتے تھے اور کامیابی کے مراحل اس طرح طے کرتے جاتے تھے کہ بڑے سے بڑا سیاسی مدبر بھی ششدر رہ جاتا تھا اور خلوص کے ہاتھوں سیاست کی شکست تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔

بعض کا خیال ہے کہ حضرت مولانا نے دعوت اسلامی کے سلسلہ میں کچھ زیادہ ہی احتیاط اور نرم روی سے کام لیا اور اس سلسلہ میں جو جارحانہ رخ اختیار کرنا چاہئے تھا وہ نہیں کیا۔

> "نرسمہا راؤ جی! سب سے بڑی سیاست خلوص کی سیاست ہے" یا "اٹل بہاری باجپئی سے ایک ملاقات کے دوران صراحت کے ساتھ فرمایا کہ "اٹل جی! خدا کے یہاں سیاست نہیں چلتی۔"

اسطرح کا تصور کرنے والے وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہندوستان کے حالات کا شاید کبھی جائزہ نہیں لیا اور اس حقیقت کو فراموش کردیا کہ ہندوستان میں دین کی اشاعت جارحانہ انداز سے نہیں بلکہ فقیرانہ انداز سے ہوئی ہے۔ صوفیائے کرام کی پاکیزہ و پُراثر اور دل آویز شخصیتوں نے نمونہ بن کر دلوں کو موہ لیا اور اپنے طرزِ عمل، طور طریق، محبت و شفقت، ہمدردی و غمگساری اور ایثار و قربانی سے اسلام کا ایسا اعلیٰ نمونہ پیش کیا کہ ہزاروں نہیں لاکھوں کو اسلام کی عظمت کا معترف ہونا پڑا۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ، حضرت نظام الدین اولیاؒ اور امیر المومنین سید احمد شہیدؒ کی انفرادی کوششوں کے نتیجہ میں اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد سامنے رکھئے اور پھر اس کا موازنہ اس تعداد سے کیجئے جو اسلامی تحریکوں کی اجتماعی کوشش سے اسلام کی طرف مائل ہوئی ہے تو صورتحال واضح ہو کر سامنے آجائے گی۔

حضرت مولانا نے مسلکی، نظریاتی اور گروہی اختلافات سے بلند ہو کر ہندوستان کی صورت حال کا مشاہدہ کیا، زندگی کی لازوال قدروں کو ہمیشہ اپنی نگاہوں کے سامنے رکھا اور ایک ایسے ملک میں جو مختلف مذہبوں، مختلف تہذیبوں، مختلف ثقافتوں اور مختلف قوموں کی آماجگاہ ہونے کی وجہ سے دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں ایک جداگانہ حیثیت رکھتا ہے، جینے کا سلیقہ اور رہنے کے آداب بتائے۔

.... آپ کا کہنا تھا کہ اس ملک میں دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ مخالفانہ نہیں مصالحانہ زندگی گزارنے کی کوشش کی جانی چاہئے اور اس انداز سے کی جانی چاہئے کہ یہ مصالحت و مفاہمت ہمارے عقائد پر اثر انداز نہ ہو، تاکہ ایک دوسرے کے قریب آنے، ایک دوسرے کے مذہب کو سمجھنے اور ایک دوسرے کی خصوصیات سے واقف ہونے کا موقع مل سکے۔ اور یہ روش دعوت میں حائل نہیں بلکہ مفید ثابت ہوگی اور اسلام کی اشاعت کے لئے فضا کو ہموار کرے گی۔

حضرت مولانا کا خیال تھا کہ غیر مسلم اکثریت کے افراد کو متوجہ کرنے اور ان کے ذہن و ضمیر تک پہونچنے کا صرف ایک راستہ ہے اور وہ یہ کہ زندگی کے مشترک مسائل کا تذکرہ کیا جائے، انسانیت اور اخلاق کی باتیں کی جائیں اور انسان کو درپیش مسائل و مشکلات کے حل کی نشاندہی کی جائے۔ اور یہی وہ طریقہ ہے جو ان کو اسلام کا مطالعہ کرنے، مسلمانوں کو سمجھنے اور ان کو ان کا صحیح مقام دینے پر آمادہ کرسکتا ہے۔

حضرت مولانا کا یہ خیال کتنا حقیقت کے قریب تھا اور حضرت مولانا اپنے مقصد میں کس حد تک کامیاب تھے۔ اس کا اندازہ ان دو واقعات سے لگایا جاسکتا ہے۔

۱۔ گوہاٹی یونیورسٹی (آسام) میں انگریزی کے پروفیسر ڈاکٹر تاراچرن رستوگی بس پر ایک سفر کررہے تھے، راستے میں سموسے خریدے، کاغذ کے جس لفافے میں وہ سموسے تھے حسن اتفاق وہ پیام انسانیت کا حلف نامہ تھا جو شاید ردّی میں بکنے کی وجہ سے تھیلی کی شکل اختیار کرچکا تھا رستوگی صاحب نے وہ حلف نامہ پڑھا اور اس سے متاثر ہوئے اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کو خط لکھ کر اپنے تاثر کا اظہار کیا۔

حضرت مولانا نے ان کے جذبات کی قدر کرتے ہوئے پیام انسانیت کی اپنی تقریروں کا ایک مجموعہ (ہندی میں) ان کو ارسال کردیا۔ ان تقاریر سے وہ مزید متاثر ہوئے اور خاموشی کے ساتھ حضرت مولانا سے ملنے کے لئے ندوہ آگئے۔ دوچار دن حضرت مولانا کے ساتھ ایک اجنبی مہمان کی حیثیت سے رہے، حضرت مولانا کو قریب سے دیکھا، سمجھا اور پرکھا اور آسام روانہ ہوگئے۔ آسام پہونچ کر انھوں نے حضرت مولانا کو لکھا:

"آپ کی تقریروں سے میں اسلام کے ان پہلوؤں سے واقف ہوا جواب تک میری نگاہوں سے اوجھل تھے، پھر میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان پہلوؤں کو عملی شکل میں دیکھا اور تحریروں سے زیادہ آپ کی زندگی سے متاثر ہوا۔ اور اب میرے پاس اسلام قبول کرنے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں۔"

اس کے بعد تاراچرن رستوگی نہ صرف یہ کہ خود

> خواجہ معین الدین چشتیؒ، شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ، حضرت نظام الدین اولیاؒ اور امیر المومنین سید احمد شہیدؒ کی انفرادی کوششوں کے نتیجہ میں اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد سامنے رکھئے اور پھر اس کا موازنہ اس تعداد سے کیجئے ..... جو اسلامی تحریکوں کی اجتماعی کوشش سے اسلام کی طرف مائل ہوئے ہے تو صورت حال واضح ہو کر سامنے آجائے گی۔

مسلمان ہوئے بلکہ ان کی بیوی، لڑکا اور بہو بھی مسلمان ہو گئے۔

یہاں ان کے ساتھ پیش آئے ایک حادثہ کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا جس سے ہم مسلمانوں کے دعوتی جذبہ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ابھی چند سال قبل مکان کی چھت گر جانے کی وجہ سے رستوگی صاحب کے لڑکے اور بہو کا انتقال ہوگیا، تدفین کے لئے جب انھوں نے قبرستان میں جگہ لینی چاہی تو وہاں کے مسلمانوں نے ان کو جگہ دینے سے انکار کر دیا۔ بالآخر ان کو اپنے لڑکے اور بہو کو گھر کے آنگن میں دفن کرنا پڑا۔

۲۔ صوبہ بہار کے ایک شہر سیوان میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی تقریر کر کے ابھی بیٹھ ہی رہے تھے کہ ایک سن رسیدہ ہندو اسٹیج پر WONDERFUL W- ONDERFUL کے الفاظ کہتے ہوئے آگے بڑھے اور مائک پر آ کر کہا کہ میں نے اپنی زندگی میں دو تقریریں سنی ہیں جن سے سب سے زیادہ متاثر ہوا ہوں، ایک مسٹر C.R. DASS کی تقریر اور ایک آج مولانا صاحب کی اور میں صاف کہتا ہوں کہ محمد صاحب خدا کے سچے پیغمبر ہیں۔ مولانا صاحب آپ صرف مسلمانوں ہی کے نہیں ہم بھی آپ پر اپنا حق سمجھتے ہیں۔

حضرت مولانا کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ افہام و تفہیم کے ہی راستے سے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی جائے اور ایسی صورت حال ہرگز پیدا ہونے دی جائے جس سے یہاں کے اکثریتی فرقہ کے جذبات بھڑکنے کا اندیشہ ہو اور ان کے حریف

آپ کی تقریروں سے میں اسلام کے ان پہلوؤں سے واقف ہوا جو اب تک میری نگاہوں سے اوجھل تھے، پھر میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان پہلوؤں کو عملی شکل میں دیکھا اور تحریروں سے زیادہ آپ کی زندگی سے متاثر ہوا۔ اور اب میرے پاس اسلام قبول کرنے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں۔ اس کے بعد تاراچرن رستوگی نہ صرف یہ کہ خود مسلمان ہوئے بلکہ ان کی بیوی، لڑکا اور بہو بھی مسلمان ہو گئے۔

بن کر سامنے آجانے کا خطرہ ہو، کیونکہ ایسی صورتحال پیدا ہو جانے پر مسلمانوں کو دو حریفوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ایک حکومت، دوسرے اکثریتی فرقہ، اول ان دونوں سے بیک وقت مقابلہ کرنا مسلمانوں کے لئے آسان نہ ہوگا۔ چنانچہ جذباتی تقریروں، اشتعال انگیز نعروں اور گرم اور بھڑکیلے بیانات سے بچنا چاہئے اور عوام کو سڑکوں پر لے آنے اور بھیڑ اکٹھا کرنے سے احتراز کرنا چاہئے، کیونکہ اس طرح کی تقاریر اور نعرے اور ہزاروں اور لاکھوں مسلمانوں کا اجتماع عام ہندو کے ذہن میں اندیشے پیدا کرنے لگتا ہے اور مسلمانوں کے سلسلہ میں ان کی حساسیت بڑھ جاتی ہے اور مسئلہ بجائے بننے کے بگڑ جاتا ہے۔ جیسا کہ ماضی کے واقعات سے اندازہ ہوتا ہے۔

آج سے تقریباً ۲۲ سال قبل ۱۹۷۸ء میں آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ اور کل ہند مسلم مجلس مشاورت کے اراکین کے استقبالیہ جلسے میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے جو تقریر فرمائی تھی اور اس میں جس موقف کو اختیار کرنے کی تلقین کی تھی، ۲۲ سال گزر جانے کے بعد

افراد کو خیرات دی جاتی ہے۔ میں قوم کے لئے، ملت کے لئے آپ سے خیرات مانگتا ہوں کہ آپ دس برس کی مہلت دے دیجئے، تاکہ ہمارے غیر مسلم بھائی اور ملک کی اکثریت کا ذہنی توازن نارمل ہو جائے، ان میں معقول بات سننے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔

بھی اسی موقف کو اپنانے پر زور دیتے رہے۔ آج زمانہ اس موقف کی افادیت تسلیم کرے یا نہ کرے، آئندہ دس بیس سال میں اس موقف کی افادیت محسوس کرتے ہوئے اس کو ضرور اپنانا پڑے گا، لیکن شاید وقت.......

حضرت مولانا نے اس تقریر میں قائدین ملت سے بڑے دردمندانہ انداز میں اور خلوص کے ساتھ فرمایا تھا کہ "مسلمان کی یہ کمزوری ہے کہ وہ ایک نعرہ میں دیوانہ ہو جاتا ہے، اپنا توازن کھو بیٹھتا ہے، وہ نعرہ کیوں لگایا جائے جس سے مسلمان پر جنون کا دورہ پڑے اور وہ اپنا توازن کھو بیٹھے۔ نعروں کا زمانہ گیا، میں صفائی کے ساتھ کہتا ہوں کہ آپ تعمیری کام کرنے والوں کو دس برس کی مہلت دے دیجئے اور قوم کو اشتعال، جذباتیت اور سیاسی ہنگامہ آرائی کے دھارے میں نہ بہائیے، افراد کو خیرات دی جاتی ہے۔ میں قوم کے لئے، ملت کے لئے آپ سے خیرات مانگتا ہوں کہ آپ دس برس کی مہلت دے دیجئے، تاکہ ہمارے غیر مسلم بھائی اور ملک کی اکثریت کا ذہنی توازن نارمل ہو جائے، ان میں معقول بات سننے کی صلاحیت پیدا ہو جائے اور مسلمانوں کا ذہن بھی طوفانی دریا کی مانند نہ ہو جائے کہ جس میں ہمارے ادارے بہہ جائیں

اور صدیوں کا اثاثہ ملیامیٹ ہو جائے۔"

حضرت مولانا کا مزاج تحریکی تھا اور یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ کسی نہ کسی تحریک سے وابستہ رہے۔ جماعت اسلامی میں شمولیت اختیار کی، لیکن بعض ناگزیر اسباب کی بنا پر اس سے کنارہ کش ہو گئے، تبلیغی جماعت سے وابستہ ہوئے اور عرب دنیا میں اس کے تعارف کا ذریعہ بنے، مسلم مشاورت کی داغ بیل ڈالنے میں نمایاں کردار ادا کیا، دینی تعلیمی کونسل کی بنیاد ڈالی اور اس کے پیغام کو عام کرنے کے لئے گاؤں گاؤں اور شہر شہر دورے کئے، مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر منتخب ہوئے اور اپنی حکمت عملی سے اس کو وہ وقار بخشا کہ حکومت بھی اس کے آگے جھکنے پر مجبور ہوئی اور وہ اعتبار دیا کہ ہر حلقہ اور ہر طبقہ کا مسلمان اس کے فیصلہ کو اپنا فیصلہ قرار دینے لگا، تحریک ندوۃ العلماء کے لئے تو گویا آپ کی ساری صلاحیتیں اور ساری توانائیاں وقف تھیں اور شاید ہی آپ کی زندگی میں کوئی لمحہ ایسا آیا ہو کہ آپ کا دل تحریک ندوۃ العلماء سے غافل ہوا ہو۔ تحریک پیام انسانیت ان مذکورہ بالا تحریکات سے مختلف ایک تحریک تھی جو حضرت مولانا کی بصیرت اور فراست کا ایک کھلا ثبوت تھی۔ اور ہندوستان جیسے کثیر المذاہب ملک میں دوسری تمام تحریکات سے زیادہ مفید ثابت ہو سکتی تھی، لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ ہندوستان کی وہ واحد تحریک تھی جس کی افادیت تو سب کو تسلیم تھی لیکن اس کے مشن کو عام کرنے ، اس کے پروگرام کو آگے بڑھانے اور اس کو منظم اور مربوط شکل میں سامنے لانے سے کسی کو دلچسپی نہ تھی۔ اس لحاظ سے یہ ہندوستان کی سب سے مظلوم تحریک کہی جا سکتی ہے جو حضرت مولانا کی حیات تک مظلوم ہی رہی۔ اور سوائے ان چند حقیقی انسانوں کے جن کے پاس پرنم آنکھ، دردمند دل، اور محبت کا سرمایہ تھا، کوئی بھی اخلاص، سنجیدگی اور مستقل مزاجی کے ساتھ اس کام کے لئے آگے نہیں آیا۔

حضرت مولانا تحریکی مزاج رکھتے تھے اور زبانی نہیں عملی طور پر تحریکات سے وابستہ رہتے تھے، لیکن ان تحریکات کو مقصد نہیں مقصد کے حصول کا ذریعہ سمجھتے تھے اور تخریبی نہیں تعمیری خطوط پر ان کی راہ متعین کرتے تھے۔ وہ تحریک میں جمود کے قائل نہیں تھے۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ وہ صورتحال کی تبدیلی دیکھ کر طریقہ کار کی تبدیلی کی دعوت دیا کرتے تھے۔

حضرت مولانا تحریکات کی ضرورت محسوس کرتے تھے اور اس کی افادیت تسلیم کرتے تھے لیکن اسی وقت تک جب تک وہ تحریکات مقصد کو پورا کرتی ہوں، لیکن اگر ان تحریکات کی وجہ سے مقصد پر آنچ آنے لگتی اور تعمیر کے بجائے تخریب کا پہلو سامنے آنے لگتا تو ان تحریکات سے کنارہ کشی اختیار کرنے میں ذرا بھی تامل سے کام نہیں لیتے تھے۔

حضرت مولانا کا خیال تھا کہ جس طرح تحریک کا ایک مزاج ہوتا ہے اسی طرح ملک کا بھی اپنا ایک مزاج ہوتا ہے اور وہ تحریک جس میں اس ملک کے مزاج کی رعایت نہ ہو زیادہ مؤثر اور کارگر نہیں ہو سکتی، بلکہ بسا اوقات مفید ثابت ہونے کے بجائے مضر اور مہلک ثابت ہوتی ہے۔ لہٰذا کسی تحریک کو چلانے سے پہلے اس ملک کے حالات، ماحول اور سوچ و فکر کا جائزہ لینا اور اس کی رعایت کرتے ہوئے اس تحریک کے خد و خال تیار کرنا ضروری ہے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی "ایک ملت" کے تصور پر پختہ ایمان رکھتے تھے، فرقہ واریت اور گروہی عصبیت کو وہ اجتماعیت اور وحدت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ قرار دیتے تھے۔ اسلام کے آفاقی اور ہمہ گیر پیغام کو وہ مسلکی اور جماعتی دائروں میں مقید کرنے کے خلاف ہمیشہ آواز اٹھاتے رہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اسلام کے فروغ کے لئے قائم کردہ جماعتیں اور تنظیمیں اگر ملت کے اجتماعی مفاد سے ٹکرانے لگیں تو ان جماعتوں، تحریکوں اور تنظیموں کو حرف غلط کی طرح مٹا دینا چاہئے۔

وہ کہتے ہیں:-

"ایک قربانی آپ کو اس ملک میں یہ دینی ہے کہ ملت کے مفاد کو اپنے مفاد پر، جماعت کے مفاد پر، برادریوں کے مفاد پر اور یہاں تک کہ عرض کرتا ہوں کہ ملت کی ضرورت کا جو عنوان اور راستہ ہم نے تجویز کیا ہے اس پر بھی آپ ملت کے مفاد کو مقدم رکھیں۔ اس لئے کہ جماعتیں ملت کے لئے ہیں، ملت جماعتوں کے لئے نہیں۔ مولانا محمد یوسف صاحب..

باقی ص۲۵ پر

مولانا محمد یوسف صاحب امیر جماعت اسلامی ہند یہاں بیٹھے ہوئے ہیں، میں نے ہندوستان میں مسلم مجلس مشاورت کے پلیٹ فارم پر بھی یہ بات کہی تھی، اس وقت بھی اس پر ایمان رکھتا تھا اور اب بھی ایمان رکھتا ہوں کہ اگر ملت کے مفاد کا تقاضا ہو کہ حرف غلط کی طرح جماعتوں کو مٹا دیا جائے تو میرے اخلاص کا تقاضا ہوگا کہ سب سے پہلے میں اسے قبول کر دوں۔

یگانۂ روزگار، میر کاروانِ اربابِ علم و دانش حضرت مولانا
سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نوراللہ مرقدہ کی وفات پر

تأثراتِ قلبی

عرفی گنج مرادآبادی

شدت غم آج مجھ کو اس طرح تڑپا گئی
زندگی حسن و جمالِ زیست سے اکتا گئی

اضطرابِ دل کو دیوانہ بنا دیتی خرد
وہ تو یہ کہئے جنوں کی معرفت کام آگئی

آدمی کو فطرتاً رہتا ہے یوں تو پاس مرگ
پھر بھی کتنا جاں گسل، جاں سوز ہے احساس مرگ

برف کے مانند گھل جاتے ہیں انسانوں کے جسم
"شعلہ زا" ہوتی ہے کتنی گرمیٔ انفاسِ مرگ

علم ہے لیکن انھیں جو بھی ہیں دانائے حیات!
"موت" تو ہے درحقیقت خود بھی شیدائے حیات

عقل کے زندانیوں کو یہ نہ ہو شاید خبر!
"موت" تو ہے غازۂ رخسارِ لیلائے حیات

"موت" خوفِ مرگ ہے! ذوقِ شہادت زندگی
"موت" "دنیا کی ہوس! فقر و قناعت زندگی

موت کو خود مرحمت کرکے حیاتِ جاوداں
اس کے زیرِ سایہ کرتی ہے عبادت "زندگی"

زندگی کی شمع جلتی ہے حرم کے طاق میں
زندگی کا جشن ہے قرآن کے اوراق میں"

زندگی کے نور سے روشن ہے ساری کائنات
زندگی کے دل کی دھڑکن! سینۂ آفاق میں

اور "تو" اس عہد میں ہے زندگی کا ترجمان
"موت" تیرے پاس آئے اس میں یہ طاقت کہاں

ہاں! وہ جب بھی آئے گی لے کر پیامِ وصلِ دوست
تو یقیناً آئے گی بن کر حیاتِ جاوداں!

اے "علیؓ" تو ہے حقیقی وارث خیبر شکن!
تو ہے "باب العلم" اپنے عہد کا اے بوالحسنؒ

عصر حاضر میں نہیں ہے کوئی بھی ثانی ترا!
معترف ہیں اس حقیقت کے سبھی اربابِ فن

کتنا محکم اپنے خالق پر ہے تیرا اعتماد
حق کی خاطر عمر بھر کرتا رہا ہے تو جہاد

تیری شخصیت نہیں ہوگی کبھی مرگ آشنا
"موت" خود کہتی ہے تیری زندگی سے زندہ باد

"موت" کا پڑنے نہ دے گی تجھ پہ سایہ زندگی
ہے تری فرقت کے پس منظر کا جلوہ زندگی

تیرے جوئے عشق کی موجوں میں رقصاں ہے حیات
تیرے بحرِ علم کا ہے قطرہ قطرہ زندگی!!

تیرا حسنِ گفتگو! تفسیرِ قرآنِ مجید!
"طالبِ حق" "سن کے کہتے ہیں جسے "ھل من مزید"

"نازشِ نطقِ غزالیؒ" تیرا اندازِ خطاب
"تیری حق گوئی" مثالِ سید احمد شہیدؒ

ہو مبارک تجھ کو اے پیغمبرِ فصلِ بہار!
سر پہ تیرے ضوفشاں ہے پرچمِ عز و وقار!

اس علم پر یہ لکھا ہے جس کے تو سایہ میں ہے
"لافتیٰ الا علیؓ، لا سیف الا ذوالفقار

زندگی پر موت عرفی فتح پا سکتی نہیں
موت شمعِ علم پھونکوں سے بجھا سکتی نہیں

وقف کرتے ہیں جو راہِ حق میں اپنی زندگی
موت ان اللہ کے پیاروں کو آ سکتی نہیں

اے عالمِ جلیل و مفکر علی میاں

مجیب الغفار اسعد اعظمی

اے عالمِ جلیل و مفکر علی میاں
تیرے غمِ وفات سے تاریک ہے جہاں

لاریب تیری ذات تھی عالم میں مغتنم
سارے جہاں کا درد تھا دل میں ترے بہم

تو ہند میں تھا ملتِ بیضا کا پاسباں
علم و ادب میں کوئی نہ تھا تجھ سا نکتہ داں

حیّ علی الفلاح تھا تیرا نفس نفس
اے کاش اور جیتا تو دنیا میں سو برس

سب مدرسے وفات سے تیری ہیں دردمند
روتے رہیں گے مدتوں ندوہ و دیوبند

تیرا وجود مدرسہ و خانقاہ تھا
باطل سے جنگ کے لئے تو خود سپاہ تھا

آفاق میں تھی ذات تری ایسی ارجمند
سارے جہاں میں مسلم ہندی تھا سربلند

مسلم پہ جب بھی ڈالی کسی نے غلط نگاہ
بروقت تیری سمت سے ہوتا تھا انتباہ

انسانیت سے سچ ہے بہت تجھ کو پیار تھا
اس کے پیمبروں میں بھی تیرا شمار تھا

حق گوئی تیری شان تھی تیرا شعار تھا
تیرا وجود رحمت پروردگار تھا

تیرے فراق سے مری آنکھیں ہیں اشکبار
پائیں گے آہ! تجھ سا کہاں کوئی غمگسار

ہم ہوگئے یتیم ترے انتقال سے
منہ کو کلیجہ آئے ہے فکر مآل سے

اسعد کی یہ دعا ہے بدرگاہ ذوالجلال
وہ تیری مغفرت کرے محشر میں بال بال

حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ

کی شخصیت

تعلیم و مطالعہ اور تصنیفات کے آئینے میں

مولانا نذرالحفیظ ندوی ازہری۔ استاذ ادب دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

جس طرح اشعار اور کتابوں کے انتخاب سے پسند کرنے والے کی سیرت و کردار، ذوق و نفسیات اور عقلی سطح کا اندازہ ہوتا ہے اسی طرح کسی مصنف کی علمی و فکری اور تحقیقی کاوشوں کے علمی و دعوتی فوائد کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ اس کی علمی و ادبی ترقی و استعداد میں کن کتابوں اور شخصیتوں نے بنیادی کردار ادا کیا ہے، اسلیے کہ زیر مطالعہ کتابوں کی نوعیت، معیار، مطالعہ کی کیفیت، استفادہ کی صلاحیت، نیز ان موضوعات سے ذوق و مناسبت کا عکس تصنیفات پر لازمی طور سے پڑتا ہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی سیرت کی تشکیل و تعمیر، کردار کی پختگی، علمی و ادبی استعداد کی نشو و نما اور بنیادی علوم میں ملکہ و رسوخ میں جہاں خاندانی خصوصیات اور گھریلو ماحول نے فیصلہ کن رول ادا کیا وہیں مشفق مربیوں نے حکیمانہ تربیت اور مناسب وقت پر مناسب کتابوں کے مطالعہ کی رہنمائی نے آگے کی طرف قدم بڑھانے میں مدد دی، اس طرح خوب سے خوب تر اور زیبا سے زیباتر کی طرف مولانا کا سفر آخر تک جاری رہا۔ یہ تربیت ہی کا اثر تھا کہ بجز قرآن مجید کے کسی ایک کتاب سے (خواہ وہ کتنے ہی شاندار اور پُر جلال علمی اصطلاحات میں ہو) ان کی سیری نہیں ہوئی۔ مولانا کی جہد مسلسل کا اندازہ ان کے اس پسندیدہ شعر سے کیا جاسکتا ہے جو وہ اکثر گنگنایا کرتے تھے۔

نشانِ منزلِ جاناں ملے ملے نہ ملے
مزے کی چیز ہے یہ ذوقِ جستجو میرا

یا یہ شعر:

جز ذوقِ طلب، جز شوقِ سفر، کچھ اور ہمیں منظور نہیں
اے عشق بتا اب کیا ہوگا کہتے ہیں کہ منزل دور نہیں

یہ ذوق جستجو اور جہد مسلسل ان کی زندگی کا رفیق رہا۔ اِدھر والذین جاھدوا فینا پر عمل اُدھر لنھدینھم سبلنا کی بشارت، یہی اندازہ ان کی روحانی ترقی کے بارے میں کیا جا سکتا ہے۔[۱]

مولانا نے جس کتاب کو پڑھا (اور عام طور پر وہ اپنے موضوع پر منتخب ہوا کرتی تھی) اس کو پوری طرح ہضم کر لیا۔ مثالی کتابوں کی تقلید اور نقل میں سیکڑوں صفحات لکھ ڈالے پھر جب تصنیف و تالیف کی طرف متوجہ ہوئے تو اس ذوق جستجو اور طلب کی بدولت ایک مقالہ یا چند صفحات کا مضمون یا ایک خیال پوری کتاب کی صورت اختیار کر جاتا۔ لیکن بحث و تحقیق کا معیار، زبان کی شیرینی اور شگفتگی، الفاظ کے انتخاب میں ٹمپریچر کی سطح کسی طرح بھی متاثر نہ ہوتی اس میں جہاں نزہۃ الخواطر کے بار بار مطالعہ کو دخل تھا وہیں مایہ ناز استاذ شیخ خلیل عرب اور ہلالی جیسے نادرۂ روزگار اساتذہ کے ہاتھوں ادبی ذوق کے پروان چڑھنے کا بھی حصہ ہے۔ مولانا حیدر حسن خاں جیسے محدث جلیل کے طرز تحقیق سے مولانا نے اپنے تصنیفی کاموں میں فائدہ اٹھایا۔ فرماتے تھے کہ جس کو داعی اور مصنف بننا ہو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ کچھ عرصہ تک تدریس کا مشغلہ اختیار کرے، اس سے علمی استعداد میں پختگی، مطالعہ میں وسعت اور محنت کی عادت ہوتی ہے اور کلموا الناس علی قدر عقولھم کا تجربہ ہوتا ہے جو دعوتی کام کے لئے ضروری ہے۔

مولانا نے اپنے جلیل القدر استاذ مولانا حیدر حسن خاں کے طرز تدریس و تحقیق کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک بڑی بنیادی بات کی طرف اشارہ کیا ہے: "بعض اوقات مسائل کی تحقیق کے سلسلہ میں قرآن و حدیث کے ایسے الفاظ آجاتے تھے جن کا مفہوم متعین کرنے میں اہل زبان مختلف الخیال ہیں۔ ایسے مواقع پر علمائے معانی و بیان اور ائمہ لغت کی اہم تصانیف کھلتیں، کلام عرب سے استشہاد ہوتا، الفاظ کی حیثیت اور مختلف زمانوں میں ان کے استعمال کی تاریخ پر نظر ڈالی جاتی اور بڑی کد و کاوش کے بعد رائے قائم کی جاتی"[۲]

مولانا کے فکر کی تشکیل میں سیرت نبوی، تاریخ و تذکرے، سوانح حیات اور ادبی کتابوں نے بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ فتوح الشام کے منظوم ترجمہ صمصام الاسلام اور مسدس حالی نے دینی ثقافت کے پودے

کو علمی وجذباتی طور پر بالیدگی عطا کی اور عام معلومات و استعداد میں اضافہ ہوا، منفی طور پر مولانا کے دل میں عیسائیوں کے خلاف ایک ایسا حریفانہ جذبہ اور عناد پیدا ہوا جس پر کسی ملک کے مقامی حالات و مسائل کبھی غالب نہ آسکے۔ قاضی سلیمان منصور پوری کی وجد آفریں کتاب رحمۃ للعالمین نے اس محبت (محبت رسول) سے آشنا کیا جس کے بغیر یہ زندگی خاک اور سارا عالم خس و خاشاک ہے۔ آگے چل کر مولانا سید سلیمان ندوی کی کتاب خطبات مدراس نے مولانا کو سب سے زیادہ متاثر کیا اور حدیث و سیرت کے نئے نئے پہلو سامنے آئے اور اس عہد انقلاب میں اہل علم اور تعلیم یافتہ غیر مسلموں کے سامنے حدیث و سیرت پیش کرنے کی راہ معلوم ہوئی[۳]

عربی کی عبارت صحیح پڑھنے اور صرف ونحو کے ضروری مسائل کے جزو دماغ بن جانے میں مولانا سید طلحہ حسنی کا خاص درجہ تھا، ان سے جہاں اور بہت سے علمی فوائد حاصل ہوئے وہیں ذہنی تربیت ہوئی اور تاریخی شعور بیدار ہوا۔ ثقافت میں تنوع اور وسعت پیدا ہوئی[۴]

دوسرا بنیادی فائدہ ان کی صحبت سے یہ ہوا کہ سلف کی عظمت، متقدمین کے مراتب سے واقفیت اور ائمہ اہل سنت و محدثین کی محبت و عقیدت پیدا ہوئی، تفاسیر و احادیث اور سیر و تراجم کی کتابوں کی اہمیت علمی و فنی خصوصیت اور فرق مراتب معلوم ہوئے[۵]

مولانا نے سب سے پہلے عربی زبان سیکھی اس کے بعد ان ادبا کی کتابوں کو ہضم اور ان کے رنگ میں لکھنے کی کوشش کی جو صاحب طرز ادیب اور مستقل مکتب فکر رکھتے تھے۔ ابن المقفع، جاحظ، عبد القاہر جرجانی، بحتری، متنبی کے علاوہ حماسہ، نہج البلاغہ (حصہ مکاتیب) کو مثالی سمجھ کر ان سے بھرپور استفادہ کیا۔

ہلالی صاحب کے ذریعہ عربی زبان و ادب کے بہت سے مبادی و بدیہیات اور زبان کی تعلیم کے بہت سے حقائق و اصول سے براہ راست واقفیت ہوئی۔ ان سے سلف جیسی احتیاط، علمی تورّع، اہل لغت جیسا اتقان، علمائے نحو جیسی پختگی اور اہل زبان جیسی شیریں نوائی و خوش گفتاری سیکھی، ان کی صحبت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ادب خیالات کے اظہار کا بلند اور فنی اور ترقی یافتہ ذریعہ ہے جو تمدن و تخیل کی ترقی سے پیدا ہوتا ہے اور اس کی قبل از وقت تعلیم ضیاع وقت ہے۔ دوسری حقیقت یہ معلوم ہوئی کہ زبان کو بغیر ترجمہ کی مدد کے پڑھانا چاہیے۔ حریری، متنبی اور حماسہ عربی ادب کی اعلیٰ کتابیں ہیں جنھیں زبان کی تعلیم کے بعد عربی ادب کی تکمیل کرنیوالے فضلا کو پڑھنا چاہیے[۶]

دینی عناصر کی تخم ریزی بچپن میں ہو چکی تھی، گھر کے دینی ماحول نے ان کو پروان چڑھایا آغاز شباب میں اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر سید عبد العلی حسنی، پھوپھا سید طلحہ حسنی اور اپنے استاذ شیخ خلیل عرب کی رہنمائی و نگرانی میں جن کتابوں کا مطالعہ اور ان کے اثرات قبول کئے ان میں سورۂ زمر کے ذریعہ توحید کا درس تھا جس کو شیخ خلیل عرب نے بڑے ذوق و شوق سے پڑھایا اور دل و دماغ میں توحید خالص کا نقش، نقش دوام بن گیا، کتاب التوحید کا باب بھی انھوں نے بڑے جوش و جذبے سے پڑھایا۔

ابو النصر مروزی کی موثر و طاقتور کتاب قیام اللیل ابن القیم کی زاد المعاد، الجواب الکافی، ابن تیمیہ، کی تفسیر سورۃ النور جیسی کتابوں نے نوجوانی میں بہترین نگراں و اتالیق اور اخلاقی محتسب و ناصح کا کام کیا۔

خواجہ نظام الدین اولیاء کے ملفوظات فوائد الفواد، شاہ غلام علی کی درّ المعارف، مجدد الف ثانی اور شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے مکتوبات کے مطالعہ سے مولانا کے قلب نے گرمی اور نرمی محسوس کی۔ درد و محبت، سوز و گداز سے بھرے ہوئے واقعات اور درد و محبت میں ڈوبے ہوئے اشعار اور فقرے دل پر نقش ہوئے۔ امام غزالی کی احیاء العلوم کے مطالعہ نے دل پر بجلی کا سا اثر کیا۔ مگر یہ مطالعہ جاری نہ رہ سکا۔ اس میں ڈاکٹر عبد العلی صاحب کی بصیرت کو دخل تھا۔ جن کے نزدیک اس کے مطالعہ کے شغف سے بعض غیر معتدل رجحانات کے پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ اس حکیمانہ تربیت کا اثر تھا کہ فلسفہ، تصوف و اخلاق کے نکات و مباحث نے جو متاخرین صوفیا کی کتابوں میں بکثرت ملتے ہیں، مولانا کو کبھی متاثر نہیں کیا۔ وہ افراط و تفریط سے الگ اعتدال کی راہ پر ہمیشہ گامزن رہے[۷]

مجدد الف ثانی اور شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے مکتوبات کے مطالعہ سے علم کلام کا ایک نیا عالم سامنے آیا۔ مکتوبات مجددی کے آخر میں سنت و بدعت کے بارے میں مجددانہ کلمات و تحقیقات سے مولانا کو بڑا شرح صدر اور انکے ایمان و یقین میں اضافہ ہوا۔ نیز دور اکبری و جہاں گیری میں دین کی نصرت و حمایت کے سلسلہ میں مکتوبات نے دینی حمیت و غیرت کو بیدار کیا۔ اور دین کی حرارت پیدا کی[۸] اسی طرح شاہ ولی اللہ دہلوی کی بے نظیر کتاب حجۃ اللہ البالغہ اور ازالۃ الخفا کے بالاستیعاب مطالعہ سے شاہ صاحب کی باریک بینی

کا اثر قائم ہوا۔ علمی و اصولی مباحث اور متکلمانہ و فلسفہ آمیز کتابوں کے سمجھنے کی استعداد پیدا ہوئی الفوز الکبیر کے مطالعہ نے ذہن کی بہت سی گرہیں کھول دیں۔ شاہ صاحب کی شخصیت اور تحقیقات سے مولانا جتنے متفق اور متاثر ہوئے اس کی بنا پر انھوں نے اپنی فکری اور علمی نسبت شاہ صاحب ہی کی طرف کی ہے، اسلئے کہ انھیں ہم پورے تعلیمی و فکری نسب اور شجرہ کو مولانا ختم سمجھتے تھے۔

مولانا نے درسی اور متداول اور بعض غیر متداول ضخیم تفسیریں لفظ بہ لفظ دیکھیں لیکن ان کو اصل فائدہ متن قرآن کے سادہ اور بار بار پڑھنے سے ہوا۔ نیز قرآن مجید سے بہرہ ور ہونے کے لئے مولانا کی نگاہ میں دو چیزیں سب سے زیادہ مفید ثابت ہوتی ہیں

ایک علوم نبوت اور مزاج نبوت سے مناسبت رکھنے والے ایسے اشخاص کی صحبت و معاشرت اور جن کی زندگی کان خلقہ القرآن کا پر تو ہو۔

دوسری چیز یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام جن راستوں پر چلے ان پر چلنے سے قرآن مجید کھلتا ہے[9] مولانا کے نزدیک ہر وہ چیز جو علوم نبوت کے چشمہ سے نہ آئی ہو، مشتبہ اور الفاظ کا طلسم معلوم ہوتا ہے، تسکین صرف وحی و نبوت کے راستہ سے آئے ہوئے علم سے ہوتی ہے، جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا تک پہونچایا اور، جو وحی کی زبان میں قرآن مجید اور عربی زبان میں حدیث میں محفوظ ہے۔

حضرت سید احمد شہید کے ملفوظات کے مجموعے صراط مستقیم کے مطالعہ کا یہ فیض ہوا کہ علوم نبوت سے وحشت اور اجنبیت جو وضعی و صناعی علوم و تصنیفات سے پیدا ہوتی ہے۔ دور ہوئی اور اس کی تمیز ہوئی کہ علمی اصطلاحات اور زمانہ کی زبان کے بغیر بھی علوم و حقائق ادا کیے جاسکتے ہیں اور کتابوں کے۔ اس کے علاوہ اور بھی راستے ہیں جن سے وہ علوم آتے ہیں جو کتابوں کے صفحات میں مقید نہیں کیے جاسکتے ہیں، ایسا بھی ممکن ہے کہ مغز ہو چھلکے نہ ہوں، معانی ہوں زیادہ الفاظ نہ ہوں، متن ہو حواشی نہ ہوں۔

نصاب و نظام تعلیم و تربیت کے متعلق اصلاحی و تجدیدی خیالات کا تخم مولانا کے دماغ پر شیخ خلیل عرب اور شیخ ہلالی کی مجالس میں پڑا۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ماحول اور لٹریچر نے اس کا نشو ونما کیا۔ ندوۃ العلماء کا تخیل اور دین و دنیا کی باہم آمیزی اور علماء اور اہل دین کی قیادت کی ضرورت و اہمیت کا احساس مولانا حبیب الرحمن شروانی کے اس خطبۂ صدارت سے وضاحت و قوت کے ساتھ مولانا کو ہوا۔ جو ندوۃ العلماء کے اجلاس ۱۹۲۴ء میں پڑھا گیا۔ پھر مزید مطالعہ سے مولانا کا یقین اور اطمینان بڑھتا گیا۔ یہ دونوں چیزیں ان کے علمی عقائد اور نظریات کا جزو بن گئیں[10]

مغربی تہذیب و نظام سے مولانا کو نفرت اصل میں ان کے بڑے بھائی ڈاکٹر عبد العلی اور پھوپھا سید طلحہ حسنی کی صحبتوں اور مجلسوں سے پیدا ہوئی۔ اس نفرت کو جو زیادہ تر قلبی تھا مولانا دریابادی کے رسالہ سچ اور صدق کے پرچوں نے مستحکم اور دماغی بنا دیا، لیکن مغربی تہذیب کی تاریخ کو سمجھنے اور لادینیت و مادیت کے ارتقار کی اس منزل کی توجیہ میں ڈریپر کی کتاب معرکۂ مذہب و سائنس اور لیکی کی تاریخ اخلاق یورپ نے بڑی مدد دی۔ ان دونوں کتابوں سے بڑا مواد ملا، جن سے اپنے مضامین اور استدلال میں مولانا نے بڑا کام لیا۔ اسی طرح مغربی تہذیب کے مزاج اور اس کے حقیقی نقائص اسلامی تہذیب سے اس کے بنیادی اور اصولی تضاد اور دونوں کے اتحاد کے عدم امکان کے متعلق سب سے زیادہ واضح اور پر مغز چیز محمد اسد کی کتاب اسلام ایٹ دی کراس روڈ کے مطالعہ سے معلوم ہوئی[11]

درس و تدریس کا دور

طالب علمی کے مرحلے کے بعد ہی تدریس و تعلیم سے وابستگی ہوگئی۔ اس دور میں علمی ترقی کے ساتھ روحانی تزکیہ کے مراحل سے گذرے[12] جو مضامین زیر تدریس تھے ان میں تفسیر، حدیث اور ادب و تاریخ کے مضامین تھے۔ مولانا نے اپنے فطری مزاج اور طبعی خصوصیات کی بنا پر لگے بندھے طریقہ پر تعلیم دینے کے بجائے ایسا طریقہ اختیار کیا جس میں قدم قدم پر سخت محنت و جانفشانی اور پتہ ماری کرنی پڑتی تھی۔ قرآنی مضامین کی تیاری میں گذشتہ اقوام کی تاریخ عقائد، تہذیب، ان کے اخلاقی امراض انسانی سوسائٹی پر ان کے اثرات اور قرآن کی روشنی میں قوموں کے عروج و زوال کا گہرا مطالعہ کیا۔ اس میں گبن کی تاریخ زوال روما اور دوسرے مغربی مورخین کی کتابوں کا براہ راست مطالعہ کیا۔ سورۂ کہف سے شغف اور عشق نے مغربی مادیت اور اس کے پورے نظام فکر کو سمجھنے میں نہ صرف شاہ کلید عطا کی، بلکہ اس سورہ کی روح اور اسپرٹ نے مغربی کوکھ سے جنم لینے والے فتنوں، لادینی تحریکات اور اس کے علمبرداروں کی فکری سازشوں کو بے نقاب کرنے اور ان کا مقابلہ کرنے کے لیے مولانا کو تیار بھی کیا۔

۱۹۳۴ء سے ۱۹۳۹ء تک کا یہ دور مولانا کی زندگی میں سخت ترین علمی تیاری اور شدید ترین محنت و یکسوئی کا ہے۔ اس

مدت میں مولانا نے طلبہ پر غیر معمولی محنت کی اور انکے سامنے کلیجہ نکال کر رکھ دیا، لیکن اپنے مخصوص مزاج (خوب سے خوب تر کی تلاش اور ذوق جستجو) کی بنا پر یہ فضا بھی شاہین صفت مولانا علی میاں کو تنگ دکھائی دینے لگی۔ انھیں محسوس ہوا کہ طلبہ پر جتنی محنت کی جاتی ہے اس کے تناسب سے نتائج سامنے نہیں آرہے ہیں، اس لیے کہ تعمیر سے زیادہ تخریبی عناصر طلبہ کی آنکھوں اور کانوں کے راستے دل و دماغ میں بہت تیزی سے جگہ بنا لیتے ہیں، دوسرا احساس یہ بھی تھا کہ صالح تحریک و دعوت اور طلبہ کی صحیح خارجی مشغولیت کے بغیر پند و موعظت اور تعلیمی و تربیتی کوششیں نقش بر آب ثابت ہوتی ہیں۔ ان دو احساسات کے علاوہ جو اندرونی عملی تجربوں پر مبنی تھے۔ ہندوستان کی فضا سیاسی تحریکوں (مسلم لیگ۔ خاکسار اور کانگرس) کی بنا پر پورے برصغیر میں ایک نئے ہمہ گیر انقلاب کے آثار کھلی آنکھوں نظر آنے لگے تھے، جو تہذیب و اخلاقیات، عقائد مذہبی تصورات و اقدار اور تمدن و معاشرت سب پر اثر انداز ہونے والا تھا، بلکہ ان سب کا نیا سانچہ تیار کرنے والا تھا۔

وسیع مطالعہ اور فکر و عمل کے میدان میں

۱۹۳۷ء سے مولانا کا مطالعہ بھی تفسیر و حدیث اور تاریخ و ادب کے دائرے سے باہر نکل آیا تھا۔ انھوں نے اس عرصہ میں ڈاکٹر احمد امین، امیر شکیب ارسلان، عبد الرحمان کواکبی کی تصنیفات کے علاوہ عالم عربی کے رسائل خصوصًا الفتح کے ولولہ انگیز مضامین پڑھے جنھوں نے فکر و نظر میں وسعت پیدا کی اور ہندوستان سے نکل کر عالم اسلام اور اس کے مسائل و تحریکات سے دلچسپی لینے کا سامان پیدا کیا۔ اسی کے ساتھ مولانا نے ہندوستان کی جنگ آزادی اور سیاسی تحریکات کا مطالعہ شروع شروع کر دیا اس سلسلہ میں مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کے رسالہ ترجمان القرآن، مولانا آزاد کے الہلال کے ولولہ انگیز مضامین علامہ اقبال کی حیات بخش شاعری اور مولانا محمد علی جوہر کی پرجوش تقریروں کو پڑھا۔ تحریک خلافت اور سب سے بڑھ کر مغرب کی اسلام دشمنی اور اسلام کے خلاف مغربی طاقتوں کی صف آرائی نے مسلمانوں میں اپنی ذات و ملت کا شعور پیدا کر دیا تھا جس کو اقبال خودی سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ ملی و اجتماعی سطح پر ابھر رہی تھی، ان تحریروں اور حالات نے مولانا کے ذہن کی ساکن فضا پر ایک تموج پیدا کر دیا اور ان کی فطرت کی بعض خوابیدہ صلاحیتوں کے بیدار ہونے میں مدد دی۔

ہندوستانی مسلمان اس وقت "دعوت و اقدام" اور قوت و شوکت" کا پیغام سننے کے لیے بیتاب تھے ان میں ہر ایسی تحریر سے متاثر ہونے کی صلاحیت پیدا ہو گئی تھی جو بلند سطح سے ان کو خطاب کرے ان کے ملی وجود کو غذا پہونچا ہے۔ مغربی تہذیب اور ہندوستان کی قومیت متحدہ میں تحلیل ہو جانے کی دعوت پر ضرب لگائے۔ مسلمانوں کو ان کے قائدانہ مقام سے آگاہ کرے۔ اور ثابت کرے کہ اسلام میں ابھی زندگی کے مسائل کا حل اور انسانیت کے تمام مصائب کا علاج ہے۔

ان حالات میں اردو میں سیرت سید احمد شہید شائع ہوئی جس نے برصغیر کے ایک بڑے خلا کو پُر کیا تھا۔ کتاب نے بہت سے غیرت مند اور حساس انسانوں کو بے چین و مضطرب کر دیا۔ اس سلسلہ میں مولانا کے پاس جو تاثراتی خطوط آئے۔ انھوں نے ان کو محدود تدریسی ماحول سے نکال کر وسیع دعوتی میدان میں لا کھڑا کیا۔ اپنے ہم خیال دوستوں کے ساتھ مولانا نے دینی و دعوتی مراکز کا دورہ کیا، ان شخصیات سے بھی ملے جو دعوتی سرگرمیوں میں مصروف تھے مولانا محمد الیاس کے نفس گرم نے ایمان و احتساب کی ایسی روح پھونک دی جو مولانا کی زندگی میں نئے موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ مولانا عبد القادر رائے پوری کی حقیقت پسندی، فنائیت روشن ضمیری، سیاسی فہم و فراست، روشن دماغی دینی و دنیوی جامعیت، کریمانہ اخلاق اور بزرگانہ شفقت نے خاص طور سے متاثر کیا۔ انھوں نے مولانا کی علمی و ادبی صلاحیتوں اور اصل جوہر کو پہچانا، ان کی قدر و حوصلہ افزائی کی، اور ترغیب دی کہ وہ ان خداداد صلاحیتوں کو جدید تعلیم یافتہ طبقہ کا اسلام کی قیادت پر از سر نو اعتماد بحال کرنے کے لیے استعمال کریں۔ اس وقت کا یہی تجدیدی کام ہے اور یہی روحانی ترقی کا زینہ ہے۔

پہلا دعوتی رسالہ

۱۹۴۲ء میں ہندوستان چھوڑ و تحریک کی قیادت کانگرس کر رہی تھی، یہاں کے برادرِ وطن اس سلسلہ میں قربانیاں دے رہے تھے مسلمان محض تماشائی بنے ہوئے تھے، حالانکہ ہندوستان کی سلطنت انگریزوں نے مسلمانوں سے چھینی تھی۔ وہی انگریزوں کی آمد سے پہلے اس ملک میں قائدانہ مقام رکھتے تھے۔ انھیں کو برطانوی اقتدار اور غلبہ سے اس وقت سب سے بڑا خطرہ لاحق تھا۔ انھیں

مغربی طاقتوں نے خلافت عثمانیہ کا خاتمہ کیا تھا۔ اور تمام عرب سلطنتوں کو اپنا غلام و دست نگر بنا لیا تھا۔ اس لیے ان کے اصل حریف و رقیب مسلمان تھے اور انھیں کو اصل میدان میں آنا تھا، اور قائدانہ کردار ادا کرنا چاہیئے تھا، کہ قومیں اور ملتیں دلیری و جاں بازی، قربانی و خطر پسندی اور قائدانہ کردار ادا کرنے ہی سے عزت و سرفرازی حاصل کرتی ہیں۔

اس صورت حال کو سامنے رکھ کر مولانا نے دعوتان تتنافستان (دو حریف اور نبرد آزما دعوتیں) کے نام سے عربی میں ایک مضمون نئے انداز اور اچھوتے اسلوب میں لکھا۔ اس میں مولانا نے ادبی دائرہ سے نکل کر حالات حاضرہ اور مسلمانوں کے تعلق سے لکھا اور جس میں پہلی مرتبہ دعوتی روح اور اسلامی فکر نمایاں ہوا تھا۔ اس مقالہ میں مولانا نے جاہلیت اور اسلام کے فرق کو واضح کرنے کے بعد ثابت کیا کہ اس دور میں یورپ مشرق میں جاہلیت کا علمبردار رہے اس کے مقابلہ میں مسلمان اسلام کے حامل و امین اور داعی و نقیب ہیں، اس لئے چاہیئے تو یہ تھا کہ مغربی طاقتوں اور خاص طور پر برطانیہ کے مقابلے میں مسلمان بھی میدان میں آئیں کہ مغربی و برطانوی اقتدار سے سب سے زیادہ انھیں کو نقصان پہونچا ہے۔ اور ایک معین و مثبت دین رکھنے کی وجہ سے آئندہ بھی انھیں کو سب سے بڑا خطرہ لاحق ہے لیکن افسوس ہے کہ صورتحال اس کے برعکس ہے اور وہ اس جنگ آزادی میں خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں۔

اس رسالہ کے بعد مولانا کے قلم کا رخ عربی میں دعوتی مضامین و رسائل لکھنے اور عربوں کو مخاطب بنانے کی طرف ہو گیا۔

ہم طرز جنوں اور ہی ایجاد کریں گے

مولانا کی تعلیم و تربیت جس انداز میں ہوئی تھی، ان کی سیرت سازی اور ذہنی تشکیل جس طرز پر ہوئی تھی اس کو ہم توفیق الٰہی سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں (جیسا کہ خود مولانا بھی اکثر فرماتے تھے) ظاہری طور پر اس میں نصاب کی جدت اور ہر فن کو الگ الگ اس کے ماہرین سے حاصل کرنے اور مناسب وقت پر صحیح علمی ادبی اور دینی رہنمائی مطالعہ کی کتابوں کے انتخاب اور ان سے استفادہ کی صلاحیت اور دوسروں تک دین پہونچانے کی حرص، اور اپنی دعوت کو پیش کرنے میں حسن ترتیب اور حسن بیان کی رعایت کو دخل ہے۔ چنانچہ مولانا نے جتنے رسائل، مضامین اور کتابیں لکھیں ان سب میں دعوت کی طاقت، دینی جذبے کا اظہار اور زور قلم، زبان کی حلاوت و سلاست پائی جاتی ہے۔ عربی اور اردو کی تحریروں میں انھوں نے خود اپنی روش نکالی، کسی کی تقلید اور پیروی انھوں نے نہیں کی[۱۳] ان کے تمام مضامین اور کتابوں میں خود اعتمادی، جوش دروں اور حرارت ایمانی کے ساتھ استدلال کی قوت، قلم کی متانت اور زبان کی حلاوت بھی ہے داعی کی بلند سطح کا خیال ہمیشہ اور ہر جگہ انھوں نے رکھا ہے۔

تصنیفات کے اسباب و محرکات

مولانا کی تحریروں، تقریروں اور گفتگو سے جو بنیادی تاثر ہوتا ہے وہ یہ کہ ان سب تصنیفات اور تقریروں کا سرچشمہ کثرت عبادت و انابت و دعا، قرآن مجید میں عمیق تدبر، سیرت نبوی کا عاشقانہ مطالعہ اور مخلصانہ تتبع اور اجتہاد اور ہدایت ربانی، ہے۔ نہ کہ محض ذہانت، مطالعہ، وسعت علم اور کسی خاص فلسفہ اور تحریک یا صورت حال کے ردعمل میں یہ کتابیں وجود میں آئی ہیں۔

مولانا کی تصنیفات کے پس منظر اور محرکات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام کتابوں، رسائل اور تقریروں کا محرک اندرونی داعیہ اور جذبہ تھا۔ یعنی وقت کے دینی تقاضوں کی تکمیل اس میں رضائے الٰہی کے حصول کا جذبہ، اسی لئے وہ سب سے پہلے نیت کا استحضار و تجدید کرتے۔ استخارے کی نمازوں اور دعاؤں کا خاص اہتمام فرماتے۔ پھر جب شرح صدر ہو جاتا تو اپنا سارا وقت اور اپنی تمام تر صلاحیتیں اسی کے لیے وقف کر دیتے، سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے اسی موضوع میں سانس لیتے، اسی مضمون کا خیال دل و دماغ اور تمام اعصاب پر چھا جاتا۔ اس کے علاوہ کسی اور موضوع پر سوچنا مشکل ہو جاتا۔

مطالعہ اور تصنیف کی کیفیت

مولانا شروع ہی سے مطالعہ کے حریص تھے، فرماتے تھے کہ خاندانی کتب خانہ کے بار بار الٹنے پلٹنے سے مطالعہ کا ذوق بڑھا، والد صاحب کی کتاب یاد ایام، گل رعنا اتنی بار پڑھی کہ حفظ ہو گئی۔ رحمۃ للعالمین جب ہاتھ آئی تو بڑے استغراق اور پورے انہماک کے ساتھ کتاب پڑھی، اور اس میں ایسا ڈوب گیا کہ کسی اور چیز کا ہوش نہیں رہا۔ والدہ صاحبہ کھانا کھلانے بیٹھتیں تو لالٹین کی روشنی میں کھانا کھاتے ہوئے کتاب بھی پڑھتا جاتا تھا۔ بس ٹرین اور ہوائی جہاز میں بھی یہ مطالعہ جاری رہتا، بعض کتابوں مثلاً فجر الاسلام کو دیکھنے سے معلوم ہوا کہ رائے بریلی کے ڈاک خانہ میں رجسٹری کے انتظار میں ختم کی۔ مطالعہ کا یہ انہماک اردو، عربی اور انگریزی کتابوں سے فائدہ اٹھانے میں بڑا معاون تھا۔ السیرۃ النبویہ کی تالیف کے

کے وقت اپنے ایک خادم کو قاہرہ خط لکھا کہ ہم نے ۱۹۴۷ء میں مکہ معظمہ کے دوران قیام اسرائیل ولفنسون کی کتاب تاریخ الیہود فی بلاد العرب کا مطالعہ کیا تھا، دار الکتب المصریہ سے یہ کتاب نکال کر فلاں صفحہ سے فلاں صفحہ تک نقل کر کے بھیجدو۔[14]

یہی کیفیت تصنیف کے وقت دل و دماغ پر طاری ہو جایا کرتی تھی جیسا کہ اپنی مایۂ ناز کتاب ارکان اربعہ کی تالیف کے اسباب و محرکات بیان کرنے کے بعد کاروان زندگی میں تحریر فرماتے ہیں:

سیتاپور کے زمانہ قیام ۱۹۶۵ء[15] کے دن ایک طرح موت و حیات کی کشمکش کے دن تھے تصنیف و تالیف کا مشغلہ تو الگ، میں اپنے عزیز رفیقوں سے پوچھتا تھا کیا وہ دن پھر آئیں گے کہ میں معمول کے مطابق دن گذاروں گا آزادی سے چلوں پھروں گا، اور دوستوں عزیزوں کی مجلس میں شرکت کروں گا۔ لیکن اس امید و بیم کی حالت میں بھی شدت سے اس کا تقاضہ پیدا ہوا کہ یہاں سے چھٹی پاتے ہی اسلام کے عملی ارکان اربعہ پر مکمل کتاب تصنیف کرنے کی کوشش کروں، یہ خیال قلب و ذہن پر ایسا غالب ہوا کہ اس کو ہسپتال کا بیمار و سوگوار ماحول اور آنکھ کی بار بار کی تکلیف بھی ہٹا نہ سکی[16] کتاب کی تالیف کے محرکات کا ذکر کر کے تحریر فرماتے ہیں

۱۹/۲۰ فروری ۱۹۶۶ء کو اسپتال سے واپسی ہوئی تھی، کچھ دن ضروری آرام اور ایک دو سفر کے بعد ۸/ اپریل ۱۹۶۶ء ۱۶/ ذی الحجہ ۱۳۸۵ھ) سے اللہ کا نام لے کر اس کام کا آغاز کر دیا گیا۔ گرمیاں شروع ہو چکی تھیں اور آنکھ کی کیفیت کے لحاظ سے گرمی میں زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی[17] میں نے حضرت شاہ علم اللہ اور سید احمد شہید کی بابرکت مسجد میں جانب مغرب عقبی حصہ میں بیٹھ کر لکھوانے کا کام شروع کیا۔ عزیزی مولوی نثار الحق ندوی لکھتے تھے، میں بولتا تھا، کتاب کو اصلاً عربی میں لکھنا تھا۔

طرز تصنیف و تحقیق

اپنے طرز تصنیف کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔ پہلے میں نے مواد جمع کیا۔ مثلاً نماز کے لئے پہلے ایک بار پورے قرآن مجید پر نظر ڈالی[18] متعین آیات نوٹ کرائیں۔ حدیث کے لیے جمع الفوائد و مجمع الزوائد کے ان ابواب پر نظر ڈالی جو ان ارکان کے فضائل، مقاصد و فوائد کے متعلق تھیں۔ اور ان کو نوٹ کیا، پھر خصوصیت کے ساتھ امام غزالی حافظ ابن قیم، اور شاہ ولی اللہ نے اپنی تالیفات احیاء العلوم، زاد المعاد اور حجۃ اللہ البالغہ وغیرہ میں اس پر جو کچھ لکھا ہے اور جو خاص نکتے ان کی تحریروں میں آئے ہیں ان کو قلمبند کیا۔ پھر ان کو سامنے رکھ کر لکھوانا شروع کیا۔ گرمی کی شدت شروع ہونے تک[19] یہ سلسلہ جاری رہتا ذہن و دماغ پر کتاب کا موضوع اس طرح طاری ہو گیا کہ دوسرے اوقات میں بھی وہ ساتھ نہیں چھوڑتا تھا۔ یہ عرصہ سے میری زندگی کی ہر اہم تصنیف کا خاصہ بن گیا ہے اس کے خلاف کرنا عام حالات میں اب ممکن نہیں رہا ہے۔ یہ ایک طرح کا تصنیفی اعتکاف ہوتا ہے جس سے نکلنا اس وقت ہوتا ہے جب کتاب کی حد ہے تھمت ہلال عید بن کر نمودار ہوتی ہے (کاروان زندگی ج دوم ص[18])

بینائی کی اس کمزوری کے باوجود نزہۃ الخواطر جلد ہشتم اور الھند فی العہد الاسلامی کی تکمیل فرمائی۔ جو بڑا پتہ ماری اور بقول مولانا کے ہفت خواں سر کرنے کے برابر تھا۔ صورت یہ تھی کہ نزہۃ الخواطر جلد ہشتم کی تالیف کے درمیان ہی والد ماجد کا انتقال ہو گیا۔ جگہ جگہ خلا تھے۔ بہت سی شخصیتیں زندہ تھیں۔ جو بعد میں مشہور ہوئیں۔ مصنف نے ان کے ابتدائی حالات لکھ کر چھوڑ دیے تھے۔ اس سے زیادہ دشواری مولانا یہ محسوس کر رہے تھے کہ "والد مرحوم کے قلم سے قلم ملانا سخت دشوار معلوم ہوتا تھا کہ ان کی تحریر میں ایسا ایجاز، سلاست اور حلاوت اور ایک دقیق النظر مصنف و ناقد کا احساس ذمہ داری اور مؤرخانہ فرض شناسی پائی جاتی ہے کہ میں ان کے طرز پر دو سطریں لکھنا بھی مشکل سمجھتا تھا۔ میں ان تراجم و سوانح کی تکمیل کے سلسلہ میں چند سطریں لکھنے کے مقابلہ میں کسی کے متعلق پورا مضمون لکھ دینا آسان سمجھتا تھا کہ اس میں قلم آزاد ہوتا ہے۔ پھر ان ناقص معلومات کو جمع کرنا اور سنین وفات معلوم کرنا خود ایک ہفت خواں سر کرنا تھا۔ ادھر اپنی حالت یہ تھی کہ براہ راست مطالعہ کرنے سے قاصر تھا۔ (ج ۲ ص ۲۳)

اس سے زیادہ دشواری والد ماجد کی دوسری کتاب الہند فی العہد الاسلامی کی تکمیل میں پیش آئی، اس لیے کہ اس پر کئی بار دیمک نے حملہ کر کے کتاب کو زبردست نقصان پہونچا دیا تھا لیکن یہ ہفت خواں بھی گیس جلا کر راتوں کو اور سفروں کے درمیان طے کیا گیا۔

اس کتاب الھند فی العہد الاسلامی کے مقدمہ کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں.....

مضمون گرفت میں نہیں آرہا تھا اور یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کہانی کو کہاں سے شروع کیا جائے کہ اچانک مضمون ذہن میں آگیا۔ ابھی چند سطریں لکھوائی تھیں، عزیزی مولوی نذر الحفیظ ندوی لکھ رہے تھے کہ زخمی آنکھ میں ٹیسن ہوا۔

ایسا درد ہوا کہ میں دوا ڈلوا کر لیٹنے پر مجبور ہوا میں نے لکھوانا بند کر دیا۔ مگر دماغ نے کام کرنا بند نہیں کیا۔ ذہن میں مقدمہ کا مضمون مچل رہا تھا اور ضد کر رہا تھا کہ اس کو اسی وقت حوالۂ قرطاس کیا جائے۔ لیکن لکھوانے کا وقت گذر گیا تھا دوسرے دن کا انتظار کرنا ضروری تھا۔ مجھے وہ تکلیف ابھی تک یاد ہے کہ ذہن کی چکی چل گئی تھی مگر اس سے کام لینے کا موقع نہ تھا۔ اس کی قیمت اعصاب کو ادا کرنی پڑی۔ میں نے کھیتوں میں ٹہل کر دماغ کو سکون پہونچانے کی کوشش کی۔ جوں توں کر کے دن کٹا۔ رات گذری، اگلے دن اس مضمون کو مکمل کیا۔[۲۰]

جب صحت اچھی تھی، تو خود ہی لکھتے تھے، اس وقت بھی لکھنے میں یہی کیفیت ہوتی تھی، مثلاً قصص النبیین کے بعض حصے اور اردو اور عربی کے بعض مضامین و رسالے ٹرینوں پر، تھرڈ کلاس ڈبے میں، کبھی ٹرین کے دروازے کے پاس کبھی بس اسٹینڈ پر بس کے انتظار میں، ہوائی جہاز پر مضامین لکھے۔ اور اس انہماک سے لکھا جیسے مطالعہ و تصنیف میں انہماک ہوتا تھا۔

جوانی کے دور میں جو مطالعہ کیا تھا اس نے بنیاد کا کام دیا۔ نئی تصنیفات و تحقیقات اہم علمی و تحقیقی رسائل برابر دیکھتے رہتے۔ عالم عربی اور یورپ کے سفروں میں نئی کتابوں اور وہاں کے علمی مراکز اور لائبریریوں سے استفادہ فرماتے انگریزی کے اہم انسائیکلو پیڈیا کا بالاستیعاب مطالعہ کر چکے تھے۔ اپنی کتابوں میں علمی حوالوں کا اہتمام کرتے، صفحات، جلد، اڈیشن اور سن طباعت حتیٰ کہ اگر کسی سے کوئی نکتہ یا خیال لیتے تو اس کا بھی حوالہ دیتے۔ ترمیم و اضافہ برابر کرتے رہتے۔ تبصروں اور تنقید کا خیر مقدم کرتے۔ علمی مشوروں کو کشادہ قلبی سے قبول کرتے۔ ترمیم کو بنوا کر پھر دیکھتے۔ انڈکس (اشاریہ) مرتب کرنے کا بڑا اہتمام تھا۔ الفاظ کے صحیح املا کا غیر معمولی خیال فرماتے، ہمیشہ اول درجہ کے ماخذ اور جدید ترین اڈیشن کا حوالہ دیتے، تحریر میں وقف، کاما، سوالیہ نشان اور قوسین کا اہتمام کرتے۔

معنوی محاسن

مولانا اپنے کو قرآن کا طالب علم کہتے تھے، چنانچہ ان کی تمام تحریریں اس کے اسلوب میں لکھی گئی ہیں۔ یعنی اثبات مفصل اور نفی مجمل، علمی اور اصولی انداز میں۔[۲۱]

مثلاً اس بات کو غلط ثابت کرنا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ میں اصلاح و تجدید اور انقلاب حال کی کوشش مسلسل اور غیر منقطع طور پر نہیں پائی جاتی، بلکہ اس میں بڑے طویل طویل خلاء ہیں جو صدیوں پر پھیلے ہوئے ہیں۔ کئی کئی سو برسوں کے بعد کچھ شخصیتیں ابھرتی رہی ہیں۔ جنھوں نے حالات سے کش مکش کی اور جو فکری اور عملی لحاظ سے کوئی ممتاز مقام رکھتی ہیں ورنہ عام طور پر متوسط درجہ کے لوگ نظر آتے ہیں۔ فکری اور عملی حیثیت سے عہد انحطاط کی عام سطح سے بلند نہیں تھے اور جن کے علمی اور عملی کارناموں میں کوئی جدت اور ندرت نہیں پائی جاتی۔ صرف گنی چنی شخصیتیں (جنکی تعداد ۷، ۸ سے زیادہ نہیں) اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں۔

مولانا نے اس خیال کو سرسری نظر سے نہیں دیکھا بلکہ اس کے سنگین نتائج پر نظر کی کہ اگر یہ خیال جدید تعلیم یافتہ کے دل و دماغ میں بیٹھ جاتا ہے تو اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ اسلام کے اندر ہر دور میں انسانوں کی قیادت کی صلاحیت نہیں، اور وہ ایک ایسا درخت ہے جس نے زیادہ پھل نہیں دیئے۔ مولانا نے اس منفی خیال کی تردید کے لیے نہ تو کسی کی ذات کو نشانہ بنایا اور نہ ہی تحقیر و تنقیص کا اسلوب اختیار کیا، بلکہ اس خیال کو غلط ثابت کرنے کے لئے انھوں نے اسلام کی تیرہ سو برس کی تاریخ میں اصلاح و انقلاب حال کی کوششوں کے تسلسل کو مستند تاریخ کے حوالوں سے ثابت کیا اور ان ممتاز شخصیتوں اور تحریکوں کی نشاندہی کی جنھوں نے اپنے اپنے وقت میں اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق دین کے احیا اور تجدید اور اسلام اور مسلمانوں کے کام میں حصہ لیا۔ مولانا نے اس سلسلے میں مندرجہ ذیل امور کا لحاظ رکھا ہے۔

۱۔ کسی دعوت یا شخصیت کے حالات و مقاصد معلوم کرنے کے لیے عموماً خود اس کی تصنیفات، تحریروں اور اقوال سے مدد لی۔ اگر اس میں خلا رہ گیا تو اس کے رفقا، و تلامذہ اور معاصرین کی تصنیفات و بیانات کو ترجیح دی، آخری صورت میں مستند ماخذ پر اعتماد کیا۔

۲۔ شخصیتوں کی سیرت اور تذکرہ میں ان کے گرد و پیش اس زمانہ کی علمی و فکری سطح اور کام کے میدان کی وسعتوں کو بھی سامنے لانے کی کوشش کی ہے تاکہ ان شخصیتوں کی صحیح عظمت اور ان کی کامیابی کی مقدار کا تعین ہو سکے اور اس دور اور ماحول کی کامیابی کے امکانات کا صحیح اندازہ کر کے ان کو تاریخ میں صحیح مقام دیا جا سکے۔ کسی شخصیت کو اس کے ماحول سے نکال کر اپنے ماحول میں لا کر اپنے زمانہ کے پیمانوں اور تقاضوں اور اپنے ذاتی تقاضوں اور خواہشات کے معیار سے جانچنا پھر اس معیار کے لحاظ سے اس کی کوتاہیوں اور فروگذاشتوں کو نمایاں کرنا ظاہری نگاہ میں ایک بڑا تنقیدی کارنامہ معلوم ہوتا ہے۔ ہر عظیم سے عظیم شخص دوسرے زمانے اور ماحول کے لحاظ سے اور مورخ کے رجحانات اور خیالات کے پیمانہ سے سخت

ناکام ثابت کی جاسکتی ہے اور نہ صرف اسلامی تاریخ بلکہ انسانی تاریخ کی بھی کوئی شخصیت کامل اور معیاری قرار نہیں دی جاسکتی۔

۳۔ کسی صاحب دعوت یا مصنف اور مفکر کی کتابوں کے زیادہ سے زیادہ مختلف اقتباسات دیئے ہیں تاکہ قارئین مختلف شخصیتوں کے بارے میں محسوس کرسکیں کہ ان کو اطمینان کے ساتھ دید وشنید کا موقع ملا ہے اور کچھ دیر ان کی صحبتوں میں گذارا ہے۔

۴۔ تاریخی شخصیتوں کے صرف علمی کمالات تحقیقات اور تصنیفات کے اقتباسات پر اکتفا نہ کرکے ان کی زندگی کے باطنی پہلو، تعلق مع اللہ اور اخلاقی خصوصیات کو بھی نمایاں کیا ہے کہ یہ متقدمین اہل دعوت اور اہل فکر کی مشترک خصوصیت ہے کہ وہ اپنے علمی کمالات اور علمی انہماک کے ساتھ عبادت وانابت الی اللہ کا ذوق خاص رکھتے تھے اور ان کی کامیابی ومقبولیت میں اس کو خاص دخل ہے۔

۵۔ کسی شخصیت کے تعارف کے سلسلہ میں صرف اس کے فضائل وکمالات بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اگر اس کے منصف ومحتاط معاصرین یا صاحب نظر متاخرین نے اس پر یا اس کی تصنیفات وافکار پر تنقید کی ہے تو اس کا بھی تذکرہ کردیا ہے اور اگر اس کا جواب دیاگیا ہے اور اس کی طرف سے دفاع کیاگیا ہے تو اس کو بھی پیش کردیا ہے۔ لیکن تاریخ کو ناقدانہ تالیف ثابت کرنے کے لیے ضرورت تنقید نقل کرنے کا اہتمام نہیں کیا ہے۔

اس طرح مولانا نے اس کثرت سے مثالیں دی ہیں کہ آدمی کہاں تک ان کی تردید کرے گا اس طرح اس کام کی تکمیل سے نہ صرف اصلاح ودعوت کی تاریخ مرتب ہوگئی، بلکہ ضمناً مسلمانوں کی فکری وعلمی انحطاط اور ارتقا کی تاریخ بھی وجود میں آگئی۔

عالم اسلام پر مغرب کے تسلط سے انسانی دنیا کا جو عمومی خسارہ ہوا خاص طور سے مسلمانوں کا جدید تعلیم یافتہ جس طرح اس شک آفریں تہذیب سے متاثر ہوکر، ذہنی، تہذیبی اور اعتقادی ارتداد میں مبتلا ہوا اس کی وسعت وجہاں گیری اتنی بڑھی کہ خود دین اسلام کے بنیادی عقائد پر دبیز پردہ ڈالا جانے لگا اور اسلامی تاریخ سے لے کر قرآن وحدیث، سیرت نبوی، عقائد وعبادات کی تفہیم وتشریح میں بڑی بے باکی وبے تکلفی سے عصر حاضر کے فلسفوں، اقتصادی وسیاسی مکاتب خیال اور ان کی محدود اصطلاحات وتعبیرات کا سہارا لیا جانے لگا، اسکی وجہ سے اس کا قوی اندیشہ پیدا ہوگیا کہ اس مخصوص طرز فکر سے متاثر ہونے والے کہیں خدا نخواستہ دین کے ان بنیادی ارکان کی اصل حقیقت واصل طاقت ہی سے محروم نہ ہوجائیں، اور ان مقاصد ہی سے ہاتھ نہ دھو بیٹھیں جن کے لیے ان ارکان کی تشریع عمل میں آئی ہے۔ جدید مادی اور عصری تغیر کے دائرۂ اثر میں آکر ایمان اور احتساب کا مفہوم بھی ہمارے ذہنوں اور دلوں سے نکل جائے اور مادی طرز فکر، عبادت اور اخلاق کی روح پر غالب آجائے۔ یہی انداز فکر سیرت نبوی کو پیش کرنے میں اختیار کیا جانے لگا۔ بعض لوگوں نے سماجی وسیاسی مصلحین کے طرز پر آنحضرت کی سیرت پیش کرنے کی کوشش کی۔ کچھ حضور کی تصویر پیش کرنے کے بجائے شعوری یا لاشعوری طور پر خود اپنی تصویر کھینچ دی۔ بعض نے سیرت نبوی کو صرف عربوں کی محدود جاہلیت کے روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی اور یہ دکھایا کہ چودہ سو سال پہلے اسلام نے اچھا کام کیا تھا، اس نے لڑکیوں کو زندہ درگور ہونے سے بچالیا۔ بت پرستی ختم کردی۔ لیکن آج جدید سائنس اور ٹکنالوجی کا دور ہے، آج کے تقاضے دوسرے ہیں، بعض سیرت نگاروں نے انسائیکلو پیڈیائی انداز میں سیرت لکھی۔ مولانا نے اسلامی عبادات جیسے اہم موضوع پر قلم اٹھایا تو فکر اسلامی کی تجدید کا کارنامہ انجام دیا۔ پہلی بار تقابلی مطالعہ دوسرے مذاہب کے نظام عبادت کا کیا۔ ایسے معروضی انداز میں کہ پڑھنے والا بغیر کسی تلقین اور زور زبردستی کے کتاب کی مرکزی روح سے ہم آہنگ ہوتا چلا جاتا ہے۔ انھوں نے اچھوتے اسلوب میں سیرت نبوی کو جب پیش کیا تو اسطرح کہ پوری دنیا پر نبوت محمدی کی عظمت اور تاثیر اور تمام انسانوں پر اس کے اثرات واحسانات کی جھلک آجائے۔ سیرت نبوی کے واقعات واقدامات کو کثرت سے پیش کرکے ان سے وہ تعلیمی وتربیتی نتائج نکالے ہیں جن کی روشنی میں انسانی معاشرہ کے بگاڑ کو دور کیا جاسکتا ہے اور بلا تکلف ارکان اربعہ اور نبی رحمت کو غیر مسلموں کو دیا جاسکتا ہے۔ مولانا نے ادب تاریخ، تذکرے، علم کلام، عبادات، معاملات، سیرت وسوانح پر جتنی تحریرا ور تقریریں کی ہیں ان کے بنیادی مقاصد مندرجہ ذیل ہیں۔

جدید تعلیم یافتہ طبقہ کا اعتماد اسلام کی قیادت اور اس کی تعلیمات کی ابدی صداقتوں پر از سر نو بحال ہو۔

غیر مسلم اسلام سے مانوس اور مسلمانوں سے قریب ہوں۔

مسلمانوں کے اندر جو معاشرتی خرابیاں عقائد واخلاق کی خرابیاں ہیں وہ دور ہوں اور مادہ پرستی

اور مغربی تہذیب وتمدن پر فریفتگی کم بلکہ ختم ہوکر اسلامی معاشرہ کی خوبیاں پیدا ہوں. قرآن سے ذاتی تعلق پیدا ہو، سیرت نبوی سے شغف ہو، سنت سے محبت وتعلق ہو، توحید خالص کا عقیدہ راسخ ہو جائے. اسلامی عبادات سے زندہ تعلق ہو، اور انکے اثرات انفرادی واجتماعی زندگی پر نمایاں۔ اسلاف کرام، ائمہ مجتہدین، مجددین اور حقانی وربانی علماء کی داعیانہ کوششوں کی قدر اور شکر کا احساس ہو.

مسلمان جہاں بھی رہیں شان امتیازی سے رہیں۔ اپنے تشخص کی حفاظت کریں اور غیر اسلامی اثرات سے اپنے کو محفوظ کریں۔

۱؎ جیسا کہ خود ان کی عبارت سے اندازہ ہوتا ہے جو انھوں نے اپنی مایہ ناز کتاب ارکان اربعہ میں لکھی ہے "نماز کوئی ایسا ذہنی سانچہ یا چوب خشک کی طرح کوئی جامد اور محدود چیز نہیں جس میں سب یکساں ہوں اور ہر نمازی ایک سطح پر رہنے کے لیے مجبور اور اس سے آگے بڑھنے سے قاصر ہو، وہ درا صل ایک بہت بڑا اور وسیع وعریض میدان ہے جہاں نمازی ایک حال سے دوسرے حال تک اور عروج سے کمال تک اور کمال سے ان منزلوں تک پہنچتا ہے جو اس کے تصور وخیال سے بھی ماورا ہیں. اس میں لوگوں کا مرتبہ ومقام ایک دوسرے سے بہت مختلف اور جدا ہے۔ اور سب کی سطح الگ ہے۔ غفلت اور جہالت والی نماز استحضار وتفقہ والی نماز کا مقابلہ کیسے کرسکتی ہے. پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ آج کی نماز کل والی نماز سے یا چندماہ اور چند سال پیشتر والی نماز سے مشابہ ہو اور نمازی ہمیشہ ایک ہی معیار کی نماز پڑھتا رہے (ص۱۱۹)

۲؎ لیکن بہت سے مصنفین (جو لکھے زیادہ پڑھے کم ہوتے ہیں) اپنی تصنیفات کو شاندار الفاظ اور پر جلال علمی اصطلاحات کا پلندہ بنادیتے ہیں، اور ذاتی پسند وترجیح کو پوری امت بلکہ اجماع کے خلاف مسلط کرنا چاہتے ہیں اسکے لیے دور از کار تاویلات کا سہارا اور بسا اوقات صدیوں کی اسلامی تاریخ پر (جس کا انھوں نے گہرائی سے مطالعہ نہیں کیا) پانی پھیر دیتے ہیں۔

۳؎ مثالوں کے لیے ملاحظہ ہو۔ کاروان مدینہ نبی رحمت، دور الحدیث فی تکوین النساخ الاسلامی، سیرت نبوی دعاؤں کے آئینے میں۔

۴؎ عالم عرب کے چوٹی کے ادیب وناقد شیخ علی الطنطاوی، ممتاز عالم ڈاکٹر قرضاوی نے مولانا کے محاسن وکمالات میں ان کے تاریخی حس اور شعور کی پختگی اور ثقافت کے تنوع اور وسعت کی خاص طور سے داد دی ہے۔

۵؎ مثالوں کے لیے ملاحظہ ہو۔ تاریخ دعوت وعزیمت۔

۶؎ مولانا کی تمام تصنیفات میں سلف جیسی احتیاط علمی تورع۔ اہل لغت جیسا اتقان، علمائے نحو جیسی پختگی اور اہل زبان جیسی شیرینی موجود ہے۔

۷؎ فرماتے تھے کہ اعتدال کی راہ پر چلنا سب سے مشکل کام ہے۔ اس لیے کہ اس میں جلد شہرت اور مقبولیت حاصل نہیں ہوتی، نفس کو بھی تسکین نہیں ہوتی۔ گرم اور تیز گفتگو، خون کا بحر احمر جاری کرنے اور سروں کا قطب مینار قائم کرنے جیسی تعبیرات کی لوگ خوب داد دیتے ہیں۔ لیکن کثرت استعمال سے ان کی گرمی بہت جلد ختم ہو جاتی ہے اور انکے منفی اثرات ناقابل تلافی ہوتے ہیں۔

۸؎ حضرت مجدد الف ثانی کی عبقریت اور ان کے اسلوب دعوت کے مولانا بڑے قائل تھے۔ فرماتے تھے کہ آج کل کے عہد میں یہی اسلوب دعوت مناسب اور نتائج کے اعتبار سے مضمون ہے چنانچہ مسلم وغیر مسلم سربراہان حکومت اور امراء ووزراء کو جو خطوط لکھے اور ان سے ملاقاتوں میں جو باتیں کیں ان سب میں اسی مجددی کردار واسلوب کی جھلکیاں پائی جاتی ہیں۔

۹؎ اس کے لیے ملاحظہ ہو: مطالعہ قرآن کے اصول ومبادی، قرآنی افادات۔ ارکان اربعہ. معرکہ ایمان ومادیت. دعوت وتبلیغ کے معجزانہ اسلوب، کے فکر انگیز مباحث ومضامین وغیرہ

۱۰؎ نحو التربیۃ الاسلامیۃ الحرۃ میں مولانا نے تمام مسلم حکومتوں کو دعوت دی ہے کہ وہ عقائد کے تزلزل۔ ذہنی انتشار، اخلاقی وناروکی، نہ ختم ہونے والی ذہنی کش مکش، حکومتوں اور عوام کے درمیان مسلسل نبرد آزمائی سے اگر نکلنا چاہتی ہیں تو انھیں مغربی ملکوں سے درآمد کیے ہوئے نظام تعلیم وتربیت کے بجائے آزاد اسلامی نظام تعلیم وتربیت کو اختیار کرنا ہوگا۔

۱۱؎ ان کے علاوہ گبن کی کتاب زوال روما۔ ہوفڈنگ کی تاریخ فلسفۂ جدید اور سی ایم جوڈ کی کتاب پڑھی۔

۱۲؎ مولانا احمد علی لاہوری سے بیعت کی اور انکی نگرانی میں روحانی مدارج طے کیے۔ مولانا عبد القادر رائے پوری رحؒ نے چاروں سلسلوں میں اجازت دی۔ مولانا کا ذہنی سانچہ چونکہ پہلے سے بنا ہوا تھا اس لیے ان کو کسی ذہنی ہجرت کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

۱۳؎ اخوان کی تحریک کے متعلق لٹریچر ۱۹۴۷ء کے بعد آئے۔

۱۴؎ جو کتاب ۱۹۴۷ء میں پڑھی تھی اس کی تمام تفصیلات ان کو یاد تھیں اور ۱۹۷۸ء میں

اس سے فائدہ اٹھایا۔ انگریزی زبان کی تحصیل میں زبردست انہماک پر والدہ صاحبہ نے متنبہ بھی فرمایا۔ لیکن اس کا بنیادی فائدہ یہ ہوا کہ انگریزی کے بنیادی مآخذ پر نظر پڑگئی۔ مجموعی طور پر انگریزی کے جن مآخذ کا مولانا نے اپنی کتابوں میں حوالہ دیا ہے ان کی تعداد دو سو کے قریب ہے۔

۱۵ؔ آنکھ کے علاج کے سلسلے میں کئی ماہ ہسپتال میں قیام رہا تھا۔

۱۶ؔ دائیں آنکھ میں آپریشن کی خرابی سے تکلیف رہا کرتی تھی۔ اکثر ایسا ٹینشن ہوجایا کرتا کہ ساری رات جاگ کر گزارتے۔ اس حال میں بھی تیمارداروں سے تراویح میں قرآن شریف سنا کرتے، دن میں اردو عربی کتابیں سنا کرتے چند ماہ کے قیام میں آٹھ ہزار سے زائد صفحات کو پڑھوا کر سنا۔

۱۷ؔ ۲۲ جون ۱۹۶۶ء کو دینی تعلیمی کونسل کے زیر اہتمام میرٹھ میں ایک جلسہ تھا بسوں کے ذریعہ کئی جگہ سخت لو اور گرمی میں سفر ہوا۔ کئی کئی گھنٹے بس کے انتظار میں شدید گرمی میں وقت گزارنا پڑا۔ ۲۲ جون کی شب میں ایک جلسۂ عام سے خطاب کرکے آرام کیا۔ صبح اٹھے تو معلوم ہوا کہ آنکھ کی روشنی جاتی رہی۔ اناللہ (کاروانِ زندگی حصہ اول ص ۵۱۲)

۱۸ؔ اکیس پارہ تک ترتیب سے یاد کرکے کئی بار تراویح سنا چکے تھے۔ ۲۶ تا ۳۰ بھی یاد تھے جب تک صحت نے ساتھ دیا حفظ کیے ہوئے پارے روزانہ کسی کو سناتے تھے۔

۱۹ؔ اس زمانہ میں تکیہ پر بجلی نہیں آئی تھی۔

۲۰ؔ یہ واقعہ تکیہ پر پیش آیا۔ ان دنوں کھیتوں میں گندم کی فصل لگی ہوئی تھی۔ یہ مقدمہ ۲۳ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

۲۱ؔ امام ابن تیمیہ کے حوالے سے یہ بات فرماتے تھے۔ چند سال قبل ایک صاحب نے زر کثیر صرف کرکے اپنے ایک شاگرد سے عربی میں ایک ضخیم کتاب حضرت مولانا کے خلاف لکھوائی۔ پھر بڑے اہتمام سے ایک قاصد کے ذریعہ وہ کتاب بھیجی، جب وہ کتاب مولانا کو دی گئی تو کتاب دیکھ کر فرمایا کہ اگر آپ ہمارے خلاف دس مزید جلدیں اس طرح کی لکھ دیں گے جب بھی آپ کو اس کا جواب نہیں ملے گا۔ پھر امام ابن تیمیہ کا حوالہ دیا کہ اصل چیز مثبت اور تعمیری کام ہے۔ حضرت مولانا کا اپنے بارے میں ہمیشہ یہی معاملہ رہا اپنے خلاف کسی تنقید کا تذکرہ تک نہیں کرتے تھے۔ اگر کوئی ناقد کا نام لیتا تو اس کو بھی روک دیتے۔ اگر کوئی جواب دینے کا ارادہ کرتا تو اس کو بھی منع فرمادیتے۔

تاریخ وفات

قمر سنبھلی

جنابِ شیخ ندویؒ دارِ فانی سے ہوئے رخصت
سفینہ آہ ملت کا ہوا ہے آج بے ساحل
قمر کے غم سے بوجھل ذہن کو تاریخ کی تھی فکر
ندایہ غیب سے آئی "مجدّدِ خلد میں داخل"
۱۴۲۰ھ
اک سرپرست محسنِ ملت کو کھو کے آج
ہے ان کے غم میں عالمِ اسلام نوحہ خواں
سالِ وفات ملتا ہے یوں بھی کبھی قمر
ٹکراتی ہیں صدائیں سماعت سے ناگہاں
اہلِ جناں پکار اٹھے "روزہ" کے ساتھ ہیں
۲۱۸
"داخل ہوئے بہشت میں جس دم علی میاںؒ"

۲۱۸ + ۱۷۸۱ = ۱۹۹۹ء

● ● ● ●

نازشِ قوم ووطن

محمد امین بھیلونی

زینتِ ارض وطن جاتا رہا — پاسبانِ علم وفن جاتا رہا
کانپتا ہے دل، لرزتا ہے قلم — کیسے لکھوں بوالحسن جاتا رہا
جس کے دم سے محفلیں تھیں تابناک — اف! جہاں سے وہ رتن جاتا رہا
قوم کی حرماں نصیبی آہ آہ! — مردِ جانبازِ وطن جاتا رہا
مندمل کرتا رہا جو زخمِ قوم — وہ مسیحائے زمن جاتا رہا
قصرِ باطل میں جلاکر شمعِ حق — دہر سے باطل شکن جاتا رہا
فخر اب کس پر کریں اہلِ جہاں — شیر دل، شیریں سخن جاتا رہا
تھا دل وجاں سے فدا جس پر جہاں — اُف! وہ محبوبِ زمن جاتا رہا
اہلِ محفل کو رُلاکر زار زار — آہ! میرا انجمن جاتا رہا
کیوں نہ روئے اشکِ خوں چشمِ بشر — نازشِ قوم ووطن جاتا رہا

چل بسا دنیا سے انسانِ عظیم
ہوگیا ملت کا نقصانِ عظیم

مشاہدات و تأثرات

تبرّکاتِ ماجدی

مُفسّرِ قرآن حضرت مولانا عبدالماجد دریا بادی رحمۃ اللہ علیہ

کا

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں ارشادِ گرامیؒ

علی میاں مرحوم نہیں — ، ماشاء اللہ زندہ سلامت ہیں اور خدا کرے خدمت دین وملت کیلئے مدتوں اس خاکدان کو زندہ و سرسبز رکھیں۔ سِن میں مجھ سے کہیں چھوٹے ہیں لیکن علم وفضل میں سنجیدگی، فکر میں اخلاص میں اخلاق وتقویٰ میں، عبادت میں، ریاضت میں، خشیت و طاعت میں میرے بڑوں میں شامل ہونے کے قابل، رائے بریلی کے سید زادے خاندان کے اور لوگوں سے بھی واقف ہوں۔ باپ اور بھائی کا کیا کہنا' دونوں نورٌ علیٰ نور۔ پاک صاف، طاہر مطہر مٹی (جو تیمم کے قابل ہو) سے بنے ہوئے دوسرے اعزہ بھی اپنی جگہ قابلِ قدر اور قابل فخر ان تاروں کے جھرمٹ میں آفتاب۔ ندوہ اور دیوبند ماشاء اللہ دونوں کے اکابر سے علم دین حاصل کیا اور اپنے خاندان کے بزرگوں سے اور (انہی میں مائیں اور دادیاں بھی شامل ہیں) اخلاق و روحانیت کا سبق لیا۔ ذکاوت و فطانت کے پتلے پہلے سے تھے' چندے آفتاب چندے ماہتاب بن کر رہے، انگریزی بھی بقدر ضرورت تحصیل کرلی اور عربی ادب وانشاء میں تو ہندوستان اور عالمِ اسلام میں نام پیدا کردیا ہے، خود اردو شعر وادب کا اعلیٰ مذاق رکھے ہوئے، شامی ومصری صحافت پر بھی سیر حاصل نظر کرلی، تقریر و حکایت میں ملکہ روانیٔ تحریر سے بھی زیادہ، میری طرح کاہل وجامد نہیں۔ ندوہ جیسے بڑے دارالعلوم کا انتظام بھی کرتے ہیں اور سارے ہندوستان کا دورہ الگ، ابھی یہاں، ابھی وہاں اور مقالات وتصانیف ہیں کہ ساتھ ہی ساتھ کھٹا کھٹ نکلی چلی آرہی ہیں اردو اور عربی کے علاوہ انگریزی میں بھی بلکہ ترکی میں بھی کسی حد تک، زندگی قابلِ داد بھی، قابلِ رشک بھی، خود مجھے اپنے معاملہ میں "بخل" یا تواضع بے جا کی شکایت البتہ ہے ایک بار نہیں شاید دو ایک بار، اور اشارۃً وکنایۃً نہیں، منھ پھوڑ کر پوچھا۔ حضرت! شاندار مصطلحات تصوف کا مفہوم کچھ تو ہم نیاز مندوں پر کھولئے اور "تنازل ستہ" کے چہرے سے نقاب ذرا سا سرکایئے، توجہ باطل سے قلب کو گرمایئے" کچھ جواب نہ ملا، تجاہل سا کرکے ٹال گئے۔ ایسا تجاہل جو دانستہ تغافل سے کم نہیں، اتنے کام مختلف قسم کے اپنے سرے رکھے ہیں کہ کوئی ان کی مفصل فہرست ہی بنالے تو یہی ایک کمال ہے۔

مختصر یہ کہ سیاسیات ملی اور کلام، تاریخ امت اور سوانح، اکابر، اسرار شریعت پر تو خاص کام کرچکے ہیں۔

میں اپنے وصیت نامہ میں لکھے جاتا ہوں کہ میرے وقت موعود کے آجانے پر پہلے تلاش انہی کی کی جائے اور اگر یہ مل جائیں تو نماز جنازہ پڑھانے کے لئے حق دار نمبر اول یہی ہیں۔

دنیا انہیں مولانا ابوالحسن علی ندوی کہہ کر پکارتی ہے۔ ہم لوگوں کی زبان پر خالی "علی میاں" ہیں، عزیزوں سے بڑھ کر عزیز۔

حضرت مولانا کا ندوۃ العلماء سے تعلق

مولانا عبداللہ عباس ندوی

یکم اگست ۱۹۳۴ء سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ایک مدرس کی حیثیت سے کام شروع کیا اور ۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ء کو آپ کی وفات ہوئی، اس طرح مکمل ۶۵ سال آپ ندوہ سے متعلق اور ندوہ آپ سے وابستہ رہا، اس عرصہ میں آپ نے ایک استاذ کی حیثیت سے تعلیم وتدریس کی خدمت انجام دی، نائب معتمد تعلیم کے فرائض انجام دیئے، معتمد تعلیم کا منصب سنبھالا ۔۔۔ ناظم کی حیثیت سے پوری مجلس ندوۃ العلماء کی ذمہ داریاں اٹھائیں، اور زندگی کے آخری سانس تک آپ اس کے ناظم رہے۔ ابتداء میں آپ کا تعارف ندوۃ العلماء کے ایک تعلیم یافتہ اور ندوی الفکر عالم دین، مفسر اور ادیب کی حیثیت سے ہوا، لیکن بعد میں وہ زمانہ بھی دنیا نے دیکھا کہ ندوہ آپ کے ذریعہ پہچانا جانے لگا، اور عالم اسلام کے علمی نقشہ پر ندوہ ابھر کر لوگوں کی نگاہوں کا مرکز بنا۔ اور آپ کے دم سے جو نورانی فضا اور دینی ماحول بنا تھا اس کی چاندنی سے آج بھی ندوہ کا ذرہ ذرہ تاباں اور اس ابر کرم سے یہاں کا پتہ پتہ شاداب ہے۔۔۔۔ "شاداب تر بادا"۔

آپ نے ندوہ میں تدریسی خدمت اس وقت سے شروع کی جب مولانا عبدالرحمٰن کاشغری ندوی دارالعلوم سے جدا ہو کر مدرسہ عالیہ کلکتہ کی خدمت پر مامور ہوئے۔ مولانا کاشغری تفسیر وادب کی کتابیں پڑھایا کرتے تھے، یہی کتابیں حضرت مولانا کے سپرد کی گئیں، اور یہ خدا ساز بات تھی۔ یہی دو موضوع آپ کے اختصاصی مضمون تھے۔ تفسیر آپ نے ندوہ کے علاوہ حضرت مولانا احمد علی لاہوری سے پڑھی تھی، لیکن زمانہ تدریس میں آپ کو پورے تفسیری سرمایہ کو لفظاً لفظاً پڑھنا پڑا۔ تفسیر کبیر امام رازی، کشاف للزمخشری روح المعانی للآلوسی کے علاوہ متاخرین میں حافظ ابن کثیر سے لے کر معاصر مفسرین کی تحریری خدمات کی ورق گردانی کرنا پڑی، لیکن خاندانی ذوق نے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے انداز تفسیر کو سب پر غالب رکھا، یہاں تک کہ آپ کے مرشد واستاذ حضرت لاہوری کا ذوق وانداز تفسیر یعنی نظام ربط آیات اور سورتوں کی معنوی ترتیب اور ہر سورہ کا ایک مستقل عنوان قائم کرنا اور اس کو مرکزی مضمون قرار دینا حضرت مولانا کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہوا۔ اگرچہ اس فن کو حضرت مولانا نے وقت کے سب سے بڑے صاحب فن (مولانا لاہوریؒ) سے حاصل کیا تھا اور ان کے تمام درسی شرائط اور جزئیات کو اس طرح پورا کیا تھا کہ وہ حضرت لاہوری کے ان تمام شاگردوں میں ممتاز تھے۔ جو آپ کے شریک درس رہے تھے۔ (تفصیلات کاروان زندگی (ج ۱) اور میر کارواں دونوں میں موجود ہیں۔)

جہاں تک ادب کی تدریس کا تعلق ہے ہندوستان میں اسلامی ادب کی پرورش آپ کے گھرانہ میں ہوئی، دادا صاحب مؤرخ ومصنف، والد اردو ادب کے مستند مؤرخ، والدہ مناجات والہیات کی شاعرہ، بہن بہنوئی حدیث نبوی کے ادبی گوشوں پر روشنی ڈالنے والے خود آپ کے استاذ مولانا خلیل عرب دین وادب کے عاشق، شیخ تقی الدین ہلالی عرب دنیا میں صف اول کے صاحب قلم اور ادیب، لہٰذا یہ کہنا کہ ادب آپ کے خمیر میں داخل تھا اور قرآن کریم کی تفسیر وتلاوت نے زبان شناسی کو مزاج وافتاد کا جزء بنا دیا تھا، کوئی مبالغہ نہیں ہے۔

جب آپ نے تدریس شروع کی اس وقت آپ کی عمر ۲۰ سال سے دو چار مہینے آگے ہوگی، لیکن تفسیر وادب کے دونوں میدانوں میں بزرگ سال، کہنہ مشق اور تجربہ کار مربی ومدرس کی طرح نمایاں ہوئے۔ اگرچہ تدریس کی مدت بہت طویل نہیں ہے، حضرت مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ سے روحانی وابستگی کے بعد آپ دعوت وتبلیغ میں منہمک ہوگئے اور نو سال تدریسی خدمت کے بعد پہلے تو ایک سال کی چھٹی لی، پھر ۱۹۴۵ء میں استعفیٰ دے دیا لیکن اس نو سال کی مدت میں اللہ تعالیٰ نے آپ سے وہ کام لئے جو کوئی اگر نوّے سال کی مدت میں انجام دیتا تو بھی نیک نام اور کامیاب کہا جاتا۔

اس عرصہ میں آپ نے مختارات لکھی، قصص النبیین کے چار حصے مرتب فرمائے، پانچواں حصہ جو سیرت نبوی میں ہے وہ بعد میں اضافہ فرمایا۔ القراءۃ الراشدۃ کا سلسلہ تین جلدوں میں مکمل کیا، اس طرح آپ نے نثر عربی کا پورا نصاب تیار کر دیا "مختارات" کی تالیف ۔۔۔ عربی نصاب تعلیم میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کے

اندر ایک انفرادیت ہے اس لئے ضرورت ہے کہ اس کو کسی قدر وضاحت سے پیش کیا جائے۔

عربی نثر کے ادبی حیثیت سے ممتاز ٹکڑوں کا مجموعہ جو ادب آموزی کے لئے منتخب کرکے یکجا کیا گیا ہو۔ اس کو "مختارات" کا نام دیا گیا ہے، اس طرح کے مجموعات ہر زبان میں تیار ہوئے ہیں اور عرب ممالک میں تو ماہرین فن کی ایک کمیٹی تقریباً ہر سال ایسے مجموعے نکالتی رہتی ہے، یوں بھی عربی مزاج انتخاب واختیار کو پسند کرتا ہے، مختارات البارودی حماسۃ ابی تمام، حماسۃ البحتری، مجموعۃ من النظم والنثر، المطالعۃ العربیۃ۔ اور اس طرح کی درجنوں کتابیں ہماری لائبریریوں میں دستیاب ہیں، لہٰذا صرف ادبی ٹکڑوں کا یکجا کر دینا کوئی بے مثال کام نہیں ہے۔

یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ عربی نثری انتخاب میں لوگوں نے دینی عنصر کا لحاظ نہیں رکھا ہے، واقعہ یہ ہے کہ سعودی عرب تو سعودی عرب ہے جو حرمین شریفین کا امین ہے، مصر اور یمن میں جو نثری انتخاب کے مجموعات شائع ہوئے ہیں، ان میں قرآن کریم کی آیات، احادیث شریفہ کے اقتباس دیئے جاتے ہیں، مملکت سعودیہ عربیہ میں تو کئی رکوع قرآن شریف کے اور متعدد احادیث نیز حکمت ودانائی کے اقوال نقل کئے جاتے ہیں۔ اور حکومت کی تعلیمی سیاست بھی یہی ہے کہ دین سے طلبہ کو مانوس رکھا جائے۔

لہٰذا یہ کہنا کہ مختارات کی قدر اس لئے ہوئی کہ اس میں اسلامی فکر غالب ہے کلیتہً صحیح نہیں ہے۔ ایک طرف یہ حقیقت ہے جو اوپر کی سطروں میں بیان کی گئی، دوسری طرف یہ واقعہ ہے کہ ان ماہرین فن نے جنہوں نے خود اس طرح کے مختارات مرتب کئے ہیں انھوں نے مختارات کو اہمیت دی کہ ثانویہ کے مطالعہ کے لئے اس کو منتخب کیا، مصر وشام میں اہل علم وادب نے اس کی قدردانی کی۔

بات صرف یہ ہے کہ جن لوگوں نے ادبی مقطوعات کا انتخاب کیا ان کے پیش نظر زبان کے ساتھ دین واخلاق کا سبق بھی دینا تھا، انھوں نے صرف ان مقطوعات کو چنا جن پر "ادب" کی مہر لگی تھی، اور جن کے لکھنے والے ادیب کہے جاتے تھے جیسے نثر میں المبرد، علی القالی، عبد الحمید الکاتب، القاضی الفاضل، جاحظ، حریری بدیع الزماں اور ان کے معاصرین واتباع، لیکن کسی نے یہ نہیں دیکھا کہ قرآن وحدیث سے زیادہ کوئی عبارت ادب عالیہ کا نمونہ نہیں ہوسکتی احادیث میں بھی چند حکمت وایجاز کے نمونے جوامع الکلم ہی نہیں بلکہ طول طویل روایتیں بھی ادب عالیہ کے نمونے ہیں، مثلاً ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور صحابی رسول حضرت کعب بن مالک کی بیان کردہ داستانیں بھی اعلیٰ ادبی مقام رکھتی ہیں۔ اور در اصل زبان ان ہی حضرات کی گفتگوؤں، بیانات اور تقریروں سے مرتب ہوئی ہے، صرف ونحو کے قواعد انہی کی بولی سے مرتب کئے گئے ہیں، اسی طرح خلفائے راشدین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، عمر فاروق رضؓ، عثمان غنیؓ، علی مرتضیٰ رضؓ کی تقریریں بھی ادبیت وجامعیت کا نمونہ ہیں۔ جن سے زبان آموزی کا کام لیا جا سکتا ہے۔ مصنف نے دوسرے درجہ پر ان مقطوعات کو بھی لیا ہے جو ادب کے نام سے مشہور ہیں، اور جن کے اسالیب بیان کو جاننا ایک طالب علم کے لئے ضروری ہے۔

ایک ادبی کتاب پر تبصرہ کرنے اور رائے دینے کا حق ایک ادیب ہی کو پہونچتا ہے، مختارات کو عربی زبان کا مستند ومعروف صاحب قلم جس کی نظر میں قدیم وجدید ادبی سرمایہ موجود ہے جس نے رطب ویابس سب پڑھا اور پڑھایا ہے، کیا کہتا ہے اس نے کس نظر سے مختارات کو دیکھا، میری مراد علامہ سید علی طنطاوی سے ہے جو تسلیم شدہ ناقد اور صاحب اسلوب ادیب ہیں، انھوں نے لکھا ہے:

"اگر کسی ادیب کے ذوق کا اندازہ اس کی پسند سے کیا جا سکتا ہے تو ہمارے قارئین کے علم میں یہ بات لانا کافی ہوگا کہ ابھی تھوڑے عرصہ کی بات ہے کہ ادبی منتخبات کے متعدد مجموعوں کا ہم لوگوں نے جائزہ لیا تاکہ ان میں سے کسی ایک مجموعہ کا شام (سوریہ) کے مدارس شرعیہ کے ثانوی درجات کے لئے انتخاب کریں، اس کمیٹی کے تمام افراد نے ان مجموعات کی چھان بین شروع کی اور واضح رہے کہ اس کمیٹی کے تمام ہی افراد ادباء ہیں، تلاش وجستجو اور بحث وتفتیش کے بعد ہم سب نے متفقہ طور پر ان تمام منتخبات میں سے ایک مجموعہ منتخب نثر عربی کا پسند کیا وہ ہے "مختارات مرتبہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی"۔

بہت دنوں سے میری آرزو تھی کہ ہم لوگ (یعنی اساتذۂ ادب عربی) اپنے شاگردوں کو اس تنگ وتاریک قیدخانہ سے نجات دلائیں جس میں ہم نے ان کو بند رکھا ہے، ان کو آزاد فضا میں سانس لینے کا موقع دیں، ان کو دن کی روشنی دکھائیں، ہم اپنے منتخب مضامین میں جاحظ کے مقطوعہ "وصف الکتاب" سے ان کو نکالیں جس میں ایک معنیٰ کے متعدد ہم معنیٰ الفاظ (مرادفات) کے سوا کچھ نہیں رکھا ہے، ان کو ابن العمید کے لفظی کرتب اور الصاحب (ابن العباد) کے کیچڑوں اور القاضی الفاضل کے گھروندوں سے

نکالیں، جن کو پڑھ کر طلبہ ادب سے متنفر ہو جاتے ہیں، اور ہم ادب سے ان کو مانوس کرنے کے بجائے بیزار کرتے ہیں، ہم نے بارہا کہا کہ ابوحیان التوحیدی جاحظ سے زیادہ تحریر پر قدرت رکھتا ہے، اگرچہ جاحظ کے پاس سنی سنائی باتوں کا زیادہ ذخیرہ ہے، اور علمی طور پر فائق ہے۔ اسی طرح حسن بصری ان دونوں سے زیادہ بلیغ تھے، اور ابن السماک حسن بصریؒ سے بھی زیادہ بلیغ تھے۔(۱)

امام غزالی نے جو الاحیا، (احیاء علوم الدین) میں اور ابن خلدون نے مقدمہ میں جو کچھ لکھ دیا ہے ابن جوزی نے (صید الخاطر) میں جو لکھا ہے ابن ہشام نے جو سیرت میں لکھا ہے، امام شافعی نے جو الأم (کتاب الأم) میں لکھا ہے اور سرخسی نے "مبسوط" میں جو لکھا ہے (یعنی جو زبان استعمال کی ہے اور خوب صورت پیرایہ بیان اختیار کیا ہے) وہ طالب علم کو ادب سکھانے کے لئے کہیں زیادہ بہتر اور اولیٰ ہے بہ نسبت ابن عباد کی حماقتوں کے مطالعہ سے اور حریری اور ابن اثیر کے تعمیر کردہ لفظی گھروندوں سے۔

میں نے اس موضوع پر بارہا لکھا ہے لیکن کوئی اس کی طرف متوجہ نہیں ہوا، نتیجہ یہ کہ میں ادب کی تعلیم سے مایوس ہو گیا تھا مگر مولانا ابوالحسن علی ندوی کی کتاب مجھے مل گئی تو دیکھا کہ انھوں نے ادبی کتابوں کو چھانا اور پھٹکا ہے، اس کے خس و خاشاک کو الگ کیا ہے اور اس کے اندر سے زر خالص نکال کر اپنی کتاب میں محفوظ کر دیا ہے۔"

یہ کتاب ۱۹۳۹ء میں لکھی گئی تھی، راقم نے مؤلف ہی سے یہ کتاب سبقاً سبقاً اس وقت پڑھی جب یہ قلمی تھی، پھر ۱۹۴۱ء میں پہلی بار طبع ہو کر آئی، ٹائپ کی سہولت تو نہ تھی، مگر جن صاحب نے کتابت کی انھوں نے ٹائپ کے حروف سے اپنے حروف ملا دیئے تھے، یہ کتاب ندوہ کے درجہ پنجم میں داخل تھی، دوسرے مدارس کی "جلالت شان" بھلا کیوں اس کتاب کی طرف متوجہ ہوتی، جو ایک نوجوان کی لکھی ہوئی تھی، اور وہ بھی ندوہ سے، مدرسائی عصبیت جس کا مزاج یہ ہے "ترا بنا أحسن من تیجانهم" میرے یہاں کی خاک ان کے زر و جواہر سے اور مرصع تاج سے بہتر ہے، ہاں پنجاب یونیورسٹی نے اور اس کے بعد دوسری یونیورسٹیز نے اپنے نصاب میں اس کو جگہ دی، اس کتاب کا عروج اس وقت ہوا جب یہ کتاب چھپ کر عرب ممالک میں گئی وہاں کے دانشوروں، جن کو حقیقی معنوں میں دانشور کہا جا سکتا ہے، سید علی طنطاوی، ڈاکٹر احمد الشرباصی (استاذ جامعہ ازہر) اور اسی قد و قامت کے ماہرین ادب اہل زبان نے اس کو دیکھا، جیسا کہ سید علی طنطاوی کی تقریظ سے معلوم ہوا کہ کسی ایک فرد نے نہیں، بلکہ ادبا، اہل قلم، اور اہل زبان کی لجنۃ (کمیٹی) نے جانچ کر تمام منتخبات پر اس کو ترجیح دی۔

اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن جب کویت سے ۱۴۰۶ء میں شائع ہوا تو اس پر مولانا نے ایک مبسوط مقدمہ لکھا، جس میں تفصیل کے ساتھ پورے ادبی سرمایہ کا محاکمہ کیا ہے اور احادیث نبویہ کی ادبی خصوصیات پر سیر حاصل گفتگو کی ہے کاروان زندگی میں اس کی طباعت کے مراحل کا ذکر ہے۔

مختارات نے ایک سنگ میل کا درجہ حاصل کیا ہے، یہی بنیاد بنا ہے، ادب اسلامی کی تحریک کا کہ ادب صرف نظم و نثر کے ان مجموعات میں محصور نہیں ہے جن پر ادب کا ٹھپہ لگا ہے، یا جو ادب کے نام پر لکھی گئی ہیں، ادب کا نمونہ وہ تحریریں نہیں ہیں جن کے لکھنے والے ایک بات کو بیان کرنے کے لئے سیدھے سمت قلم نہیں ہلاتے بلکہ ترچھے اور آڑے کھینچا کرتے ہیں، وہ قلم جو امرؤ القیس کے گھوڑے کی طرح۔ مکر مفر مقبل مدبر معاً (۲) چلتا ہو یا جس میں غریب الفاظ اور نامانوس محاورات کا بے جا اور بلا وجہ استعمال طالب علم کے سر سے اس طرح گذرتا ہو کہ

کجلمود صخر حطه السیل من عل (۳)

ادب اپنے مقصد کو بھرپور مقتضائے حال کے مطابق اچھے الفاظ، طبعی و بے ساختہ ترکیبوں سے ادا ہونے والی بات کو کہتے ہیں، قرآن کریم اور احادیث نبویہ سے بڑھ کر ادب کہیں نہیں مل سکتا۔

ادب اسلامی کی عالمی تحریک کا سنگ بنیاد اسی کتاب نے رکھا اور الجزائر مراکش سے لے کر خلیج تک ادبا، علماء نے آکر اس کو خراج تحسین ادا کیا

مختارات کے بعد مولانا نے "القراءۃ الراشدۃ" اور "قصص النبیین" لکھی، تصنیف کے اسباب اور اس کی فنی خصوصیات پر مولانا نے اگرچہ بہت تواضع اور احتیاط کے ساتھ جو تحریر فرمایا ہے اس کو یہاں نقل کرتا ہوں۔

"مجھے کئی سال درجہ میں اور درجہ کے باہر مصر کی وزارت تعلیم کی مرتب کردہ ریڈروں کے سلسلہ القراءۃ الرشیدۃ کے اول، دوم سوم حصوں کے پڑھانے کا اتفاق ہوا۔ کتاب زبان کی صحت، اصول تعلیم، بچوں کی نفسیات و سن و سال اور معلومات عامہ کے لحاظ سے ہر طرح کامیاب ہے دینی روح اور اخلاقی تعلیمات سے بھی خالی نہیں، لیکن وہ اصلاً مصر کے بچوں (جن میں ایک تعداد عیسائی اور قبطی بچوں کی بھی ہوتی ہے) کے لئے ترتیب دی گئی ہے۔ پھر اس پر قدرۃً اور ضرورۃً مقامی اور ملکی چھاپ بھی ہے بکثرت اسباق قاہرہ کے گرد و نواح کے

مقامات، آثار قدیمہ، مصری شخصیتوں سے متعلق ہیں، مثلاً مقامات میں "جزیرۃ الروضۃ، الأھرام، القناطیر الخیریۃ" حواریین مصر والاسکندریۃ، مقامی تہواروں اور جشنوں میں سے "عید وفاء النیل" شخصیتوں میں سے محمد علی پاشا پر مستقل مضمون ہے، سب سے بڑھ کر یہ کہ مصر کا قومی ترانہ بھی موجود ہے، جس میں مصر کی عظمت کے گیت گائے گئے ہیں، اور اس کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں، مدارس عربیہ کے مسلمان ہندوستانی بچوں کے لئے اس ترانے کو گانے میں کیا معنویت اور کشش ہوسکتی ہے؟ اسی طرح "عید وفاء النیل" جس میں مصر کے عیسائی بڑی دلچسپی لیتے ہیں، ہندوستان کے حالات سے کیا مطابقت رکھتی ہے؟

رفتہ رفتہ یہ خیال دل میں گدگدی لینے لگا کہ کیوں نہ اس کی جگہ لینے کے لئے عربی ریڈروں کا ایک نیا سلسلہ مرتب کیا جائے، بھائی صاحب کی موجودگی، سید صاحب کی شفقت اور اس وقت کے مہتمم دار العلوم مولانا عمران خاں صاحب کے منصب اہتمام میں ہونے کی وجہ سے اس کا پورا اطمینان تھا کہ اگر یہ سلسلہ مرتب ہوگیا تو اس کے داخل نصاب ہونے میں کوئی دقت نہ ہوگی، چنانچہ بنام خدا کام شروع کردیا، غالباً ۱۹۴۲ء کے آس پاس اس کا سلسلہ شروع ہوا اور دو سال کے عرصہ میں اس کے تینوں حصے مرتب ہوگئے، کتاب میں اس کا التزام کیا گیا کہ حتی الامکان کوئی سبق دینی موعظت سے خالی نہ ہو، اور آخر میں اس کا کوئی اخلاقی و دینی نتیجہ نکلتا ہو یا کسی دینی تعلیم یا آداب کی طرف رہبری ہوتی ہو لیکن اس طرح کہ طالب علم کو محسوس نہ ہو کہ کوئی چیز اوپر سے یا باہر سے لائی جارہی ہے، یا اس کو کوئی خارجی انجکشن دیا جارہا ہے، نمونہ کے طور پر حصہ دوم میں "کسرۃ من الخبز" (روٹی کا ایک ٹکڑا) "تاریخ القمیص" (کرتے کی کہانی) "ماذا تحب ان تکون" (تم کیا بننا چاہتے ہو؟) "کن أحد السبعۃ" (سات میں سے ایک ہو!) ملاحظہ فرمایا جائے۔ معلومات عامہ میں سے "العین" الاسد، الجمل، القاطرۃ، جسم النبات، الباخرۃ" وغیرہ کے اسباق۔ تاریخی واقعات میں سے "الحنین الی الشہادۃ" رسالۃ الی رسول اللہ، فی بیت أبی أیوب الانصاری" وغیرہ کے اسباق شخصیتوں میں سے "الخلیفۃ عمر بن عبد العزیز، الامام مالک، السلطان محمود الکجراتی، شیر شاہ السوری، السلطان مظفر حلیم، اورنگ زیب عالمگیر اور علماء اسلام میں سے امام غزالی، ابن تیمیہ، ملا نظام الدین فرنگی محلی، اور حضرت شاہ عبد العزیز صاحب کو لیا گیا، تعلیم گاہوں میں سے جامع ازہر، دار العلوم دیوبند، مظاہر العلوم اور ندوہ کو لیا گیا۔ پھر ایک طرف قطب مینار کی زبان سے "المنارۃ تتحدث" کے عنوان سے ہندوستان کے اسلامی عہد کی تاریخ دلچسپ انداز میں سنائی گئی ہے۔ جس میں ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا نچوڑ اور سیکڑوں صفحات کا خلاصہ آگیا ہے، "من النجوم إلی الارض" کے عنوان سے تاریخ اسلام کی وہ جھلکیاں دکھائی گئی ہیں، جو ایک ستارہ کی بلندی سے دیکھنے والے کو نظر آتی ہیں، یہ سلسلہ لیتھو میں چھپنے کے بعد پہلے دار العلوم ندوۃ العلماء میں پھر ان مدارس میں جنہوں نے اس کا نصاب اختیار کیا ہے داخل ہوگیا، اور پاکستان میں بھی چھپ کر وہاں کے مدارس میں مقبول ہوا۔

لیکن مصنف اپنی جس خدمت اور توفیق الٰہی پر سب سے زیادہ خدا کا شکر ادا کرتا ہے، اور اپنے لئے اس کو ذریعہ مغفرت اور ذخیرۂ آخرت تصور کرسکتا ہے، وہ "قصص النبیین" کا مقبول سلسلہ ہے، اوپر گذر چکا ہے کہ دار العلوم میں کامل کیلانی کی کتاب "حکایات للأطفال" کا سلسلہ داخل تھا۔ اور وہ اس وقت تمام ممالک عربیہ میں حد درجہ مقبول ہورہا تھا۔ مجھے اس کے پڑھانے سے بھی واسطہ پڑا، مجھے بھی اس کا خالص سیکولر (SECULER) ہونا، جانوروں کے قصوں اور تصاویر کی بھرمار جبھتی تھی، لیکن مخدوم و محترم مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی نے (جن کی دینی غیرت اور حساسیت طبقۂ علماء کے لئے باعث غیرت تھی) خاص طور پر اس پر متوجہ فرمایا۔ انھوں نے میرے نام ایک مکتوب میں جو ۴ جون ۱۹۴۲ء کا لکھا ہوا ہے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:۔

"حال میں ندوہ کی ایک ابتدائی درسی کتاب محض اتفاق سے نظر پڑ گئی۔ بڑا ہی دل دکھا، تصویروں کی وہ بھرمار کہ شاید عبارت بھی اتنی نہ ہو سرورق سے لے کر آخر تک جاندار مخلوق کی تصاویر سے رنگین، اللہ و رسول کا شروع سے آخر تک نام نہیں، لغو قصے، قدیم جن و پری کے طرز کے حیرت ہوگئی کہ یہ کتاب اور سید صاحب اور ڈاکٹر صاحب کے

زمانے میں؟ خط دونوں صاحبوں کو لکھ دیا

"جو کفر از کعبہ برخیزد" مصری کتابیں تعلیمی نقطۂ نظر سے بھی ہرگز ندوی طلبا کے لئے مفید نہیں ہو سکتیں۔"

یہ کام جو غالباً ۱۳۶۳ھ-۱۳۶۴ھ کے درمیان شروع ہوا اور اس کا سلسلہ سفر و حضر میں ریل پر، کسی سڑک کے کنارے سواری کے انتظار میں لاہور، سوہادہ (۴) اور نظام الدین کے قیام میں نقل و حرکت اور انتشار کی حالت میں بھی جاری رہا، خدا کی توفیق سے مکمل ہوا۔ اس کو شروع کرنے کے بعد ایسا ہوا کہ خدا نے اس کو میرے لئے ایسا آسان کر دیا ہے کہ قلم برداشتہ بلا تکلف اس طرح لکھتا تھا جیسے باتیں کر رہا ہوں، اس میں تین باتوں کا التزام کیا گیا۔

۱۔ الفاظ کا ذخیرہ (VOCABULARY) کم سے کم ہو لیکن اعادہ اور تکرار سے اس کو ذہن میں نقش کر دیا جائے۔

۲۔ یہ کتاب قرآن کی زبان میں لکھی جائے، اور آیاتِ قرآنی جگہ جگہ نگینہ کی طرح جڑ دی جائیں،

۳۔ اسلام کے بنیادی عقائد (توحید، رسالت، معاد) کی تلقین و تعلیم ضمناً ہو جائے۔

۴۔ قصوں کو پھیلا کر لکھا جائے، اور ان میں ایسی راہنمائی کا سامان ہو کہ بچوں کے دلوں میں کفر و شرک کی نفرت، ایمان و توحید کی محبت اور انبیاء علیہم السلام کی عظمت راسخ ہو جائے۔ اور یہ سب غیر شعوری طریقہ پر۔

اس نکتہ پر کہ اس میں بچوں کے لئے عقائد کو درست کرنے اور ان کے ذہن کو بنانے کا سامان ہے، سب سے پہلے مولانا عبد الماجد دریا بادیؒ کی نظر گئی انھوں نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا۔ "اس کتاب کے ذریعہ بچوں کا علم کلام تیار ہو گیا۔" مولانا مسعود عالم صاحب مرحوم نے اپنے مقدمہ میں لکھا کہ "اس کتاب میں زبان اور دین کو اس طرح ایک دوسرے سے پیوست کر دیا ہے، جیسے گوشت اور ناخن۔" مولانا عبد الماجد صاحب نے اس کتاب کی ایسی قدر دانی کی کہ ان کا یہ تقاضا اور اصرار ہوا کہ میں سارے کام چھوڑ کر اس سلسلہ کو مکمل کر دوں، لیکن کتاب کے تیسرے حصے پر جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مخصوص ہے یہ سلسلہ رک گیا۔ معلوم ہوا کہ مولانا نے اپنی صاحبزادیوں کو باقاعدہ یہ کتاب پڑھائی۔

کتاب کا دوسرا ایڈیشن جب مصر میں چھپا تو میری خواہش ہوئی، سید قطب بھی اس پر مقدمہ لکھیں....انھوں نے مقدمہ لکھا اور اس میں دل کھول کر کتاب کی داد دی انھوں نے یہاں تک لکھا کہ!

"میں نے کثرت سے وہ کتابیں پڑھی ہیں، جو بچوں کے لئے لکھی گئی ہیں، اور جن میں انبیاء کرام کے حکایات و قصص بھی شامل ہیں، خود اس سلسلۂ کتب کی ترتیب میں میں نے شرکت کی ہے، جو "القصص الدینی للأطفال" کے نام سے مصر میں مرتب ہوا اور جس کے لئے مواد قرآن مجید سے اخذ کیا گیا تھا۔ لیکن میں تکلف اور خوشامد کے بغیر اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ "قصص النبیین للأطفال" کے مصنف کا کام (جس کا ایک نمونہ حضرت موسیٰ کے قصہ میں نظر آتا ہے) ہمارے وضع کئے ہوئے سلسلہ سے زیادہ کامیاب اور مکمل ہے۔ اس لئے کہ اس میں ایسی لطیف راہنمائیاں، قصہ کے مقاصد پر روشنی ڈالنے والی تشریحات اور بین السطور میں ایسے اشارات آ گئے ہیں، جو بیش قیمت ایمانی حقائق کی نقاب کشائی کرتے ہیں۔" (۵)

یہ کتاب مصر کے بعد بیروت کے مشہور... مرکز اشاعت "مؤسسة الرسالة" کی طرف سے ہزاروں کی تعداد میں شائع ہوئی اور سعودی عرب کے بہت سے ابتدائی مدارس کے نصاب درس میں داخل ہو گئی۔ ہندوستان اور پاکستان کے بہت سے مدارس اور اسکولوں اور کالجوں کے عربی کے نصاب میں بھی داخل ہو گئی۔ اگر مصنف کو اپنی کسی کتاب کے داخل نصاب نہ ہونے پر استعجاب اور دوستانہ شکوہ ہو سکتا ہے تو اس کتاب پر کہ وہ ادب آموزی اور دینی تلقین کا بیک وقت کام کرتی ہے، لیکن جماعتی اور مدرسی عصبیت بڑے بڑے حقائق پر پردہ ڈال دیتی ہے، تجربہ سے معلوم ہوا کہ اس بارے میں جدید تعلیمی ادارے اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ زیادہ فراخ دل اور وسیع النظر واقع ہوا ہے۔

باوجود مولانا عبد الماجد صاحب جیسے بزرگ کے تقاضے اور کتاب کے قدر دانوں کی خواہش و فرمائش کے تقریباً تیس پینتیس سال کی مدت گذر گئی اور تیسرے حصے کے بعد چوتھے حصہ کے لکھنے اور بقیہ اولوالعزم پیغمبروں کے حالات بالخصوص خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ (جس کی عربی میں بچوں کے ذخیرۂ کتب میں سخت کمی محسوس کی جاتی تھی) سعادت نہیں ہوئی کہ اچانک ۱۳۹۵ھ / ۱۹۷۵ء کے رمضان میں اس کا جوش اٹھا اور میں نے ان چند پیغمبروں پر (اللہ کا درود و سلام ہو ان پر) لکھنا شروع کیا جو حضرت موسیٰ کے بعد مبعوث ہوئے، شروع میں مجھے بچوں کی زبان کی اس سطح پر اترنے میں کسی قدر دشواری محسوس ہوئی۔ جو "قصص النبیین للأطفال" کے لئے اختیار کی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہ زبان لکھنا بھول گیا ہوں، مگر تھوڑی کوشش کے

بعد قلم میں روانی پیدا ہو گئی، اور چوتھے حصے کی تالیف کی توفیق ہو گئی جس کو حضرت شعیب سے شروع کر کے حضرت عیسیٰ پر مکمل کر دیا گیا۔ اب صرف مسک الختام کی باری تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی بھی توفیق دے دی اور ذی القعدہ ۱۳۹۶ھ اکتوبر ۱۹۷۶ء میں سیرت خاتم النبیین پر اس سلسلہ کا حسن خاتمہ ہوا۔ اور وہ دونوں حصے بھی "مؤسسۃ الرسالۃ" (بیروت) میں چھپ کر مقبول عام وخاص ہوئے۔ اس اجمال کی تفصیل و توسیع میری کتاب "السیرۃ النبویۃ" سے ہو گئی جو حال میں دار الشروق جدہ کی طرف سے چھپ کر سعودی عرب اور بعض دوسرے ممالک کے کلیات اور جامعات کے نصاب میں داخل ہو گئی ہے اور حال میں اس کا چوتھا ایڈیشن بڑی آب وتاب سے شائع ہوا ہے۔ دراصل قصص النبیین کے سلسلہ کی یہی چھوٹی کتاب اس بڑی کتاب کا محرک اور باعث بنی۔

صفحات بالا سے معلوم ہو چکا ہے کہ میری تدریسی زندگی کا آغاز درس قرآن سے ہوا ۱۹۳۲ء کے بعد سے دار العلوم کے اہم اسباق قرآن میرے ذمہ ہوئے تھے اسی دوران میں (غالباً ۱۹۳۹-۴۰ء کے درمیان) مجھے احساس ہوا کہ طلباء مطالعۂ قرآن اور اس سے صحیح استفادہ کرنے کے بہت سے مقدمات اور اصول ومبادی سے ناآشنا ہوتے ہیں، اور اس ناواقفیت کی وجہ سے وہ صحیح طور پر مطالب وتعلیمات قرآنی، قرآن کے پیغام اور اس کی روح اور اس کے اعجاز سے بیگانہ رہتے ہیں، یا ان کی واقفیت ابتدائی اور عامیانہ ہوتی ہے، اپنے عملی تجربہ اور کئی سال تک درس قرآن کی خدمت انجام دینے کے بعد طبیعت پر اس کا تقاضہ پیدا ہوا کہ میں ادب کے تفسیری درجوں کے طلباء کے لئے کچھ ایسے مضامین تیار کروں جو تدبر فی القرآن کے لئے معاون اور اس کی عظمت واعجاز کے سمجھنے میں مددگار ثابت ہوں۔ چنانچہ ۳۸-۱۹۳۹ء میں ایک سلسلۂ مضامین لکھوانا شروع کیا جس کے حسب ذیل عنوانات تھے۔

۱۔ قرآن کا تعارف خود قرآن کی زبان سے۔ ۲۔ قرآن شریف سے استفادہ کے شرائط اور اس کے موانع۔ ۳۔ اعجاز القرآن۔ ۴۔ قرآن مجید کا مرکزی مضمون۔ ۵۔ قرآن مجید کی پیشگوئیاں، خاص طور پر غلبۂ روم کی پیشگوئی۔ ۶۔ بنیادی عقائد توحید، رسالت، معاد اور ارکان اربعہ پر بھی لکھوانا شروع کیا لیکن وہ نامکمل رہا۔ (۹)

طلباء یہ مضامین لکھ لیتے تھے، بعد میں رسالہ الندوہ میں جو ۱۹۴۲ء سے جاری ہو گیا تھا۔ وہ بالاقساط شائع ہوئے اور پسند کئے گئے، عرصہ تک ان مضامین کو جمع کرنے اور شائع کرنے کی طرف سے توجہ نہیں ہوئی۔ ان کا مجموعہ (جس میں بعض غیر مطبوعہ مضامین بھی تھے) گم شدہ سمجھ لیا گیا۔ اچانک ۱۹۸۱ء میں عزیز گرامی مولوی سید محمد طاہر مددگار ناظم ندوۃ العلماء کے یہاں جو دار العلوم کے طالب علم رہ چکے تھے، اس کا مسودہ مل گیا میں نے اس پر نظر ثانی کی اور چند اہم مضامین "قرآن مجید اور قدیم آسمانی صحیفے علم وتاریخ کے میزان میں"، "تلاوت وتدبر قرآن کے چند نمونے" ایک تجربہ ایک مشورہ کا اضافہ کیا اور اس کو نور چشم مولوی سید محمد حمزہ ندوی فرزند خواہر زادۂ عزیز مولوی سید محمد ثانی مرحوم نے مجھ سے لے کر "مطالعۂ قرآن کے اصول ومبادی" کے نام سے مکتبۂ اسلام ۳۷ر گوئن روڈ کی طرف سے شائع کر دیا۔ اس کتاب میں دوسرے مضامین کے علاوہ غلبۂ روم کی پیشگوئی اور جن ناقابل قیاس حالات میں اس کا تحقق ہوا، کے موضوع پر اتنا مواد جمع کر دیا گیا ہے، جو ابھی تک کسی اور کتاب میں نظر سے نہیں گذرا، یہ کتاب قرآن مجید سے اشتغال رکھنے والوں کے لئے چشم کشا اور بصیرت افروز بن گئی اور مدارس عربیہ میں داخل نصاب کرنے کے قابل ہے۔

۱۹۴۹ء میں جمعیۃ علماء ہند کا سالانہ اجلاس حضرت مولانا مدنی قدس سرہ کی صدارت میں لکھنؤ میں منعقد ہوا، حضرت ڈاکٹر سید عبد العلی رحمۃ اللہ علیہ حضرت مدنی کے تعلق سے اس اجلاس کے صدر استقبالیہ تھے اس موقع پر حضرت مولانا نے عربی نصاب تعلیم کے مختلف ادوار کو جدولوں (چارٹس) کی شکل میں مرتب فرمایا۔ اور ہندوستان کی پوری علمی تاریخ ان نقشوں میں آگئی ایک فہرست ان علماء کی تھی جو حدیث نبوی میں رسوخ رکھتے تھے اور محدث کی حیثیت سے معروف ہوئے اسی طرح ہندوستان کے نامور مدرسین، فقہاء، علماء منطق وفلسفہ، علماء علم ہیئت وافلاک سبھوں کے اسماء مع تاریخ وفات لکھے اور ان کی مشہور کتابوں یا قصائد کے عنوان کے ساتھ مرتب فرمائی تھی، نصاب تعلیم کس زمانہ میں کیا رہا اور معیار فضیلت کس طرح بدلتا رہا۔

ان میں ہندوستان کے متعدد نقشے بھی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کن مقامات پر مشہور مدرسے تھے، خانقاہیں تھیں، یہ علمی نمائش دار العلوم کے عباسیہ ہال میں آویزاں کی گئی اور کانفرنس کے شرکاء میں جو اصحاب علم تھے، انھوں نے آکر دیکھا، حضرت مولاناؒ کا ایک اہم علمی کارنامہ ہے۔ (آئندہ صفحات میں ان نقشوں کو نقل کیا جا رہا ہے)۔

۱۹۴۸ء میں نائب معتمد تعلیم مقرر ہوئے، اس وقت آپ کی شہرت ملک میں پھیل چکی تھی، اور جیسا کہ اوپر گذرا، اسی زمانہ میں "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" کا اردو ترجمہ شائع ہوا پھر اصل عربی زبان میں قاہرہ کے "لجنۃ التالیف والترجمہ

والنشر" سے شائع ہوا۔ حضرت سید صاحب (علامہ سید سلیمان ندویؒ) کی وفات کے بعد ۱۹۵۴ء میں آپ کو معتمد تعلیم منتخب کیا گیا، آپ کی تالیفات کا سلسلہ جاری رہا، دارالعلوم کے اساتذہ کی تربیت، ان کے درجوں میں جاکر اسباق کو دیکھنا ان سے مشورے اور رائیں حاصل کرکے نصاب میں حسب ضرورت تبدیلیاں ہوتی رہیں، اسی زمانہ میں آپ حجاز کے دوسرے سفر سے واپس تشریف لائے، اور آپ کے عزیز ترین معتمد علیہ مولانا معین اللہ صاحب ندوری مرحوم نے شعبۂ تعمیر وترقی کا کام اپنے ہاتھ میں لیا، اور مولانا کے سفر وحضر میں شریک رہنے لگے۔ مولانا معین اللہ صاحب کو اللہ تعالیٰ نے بہت سی صلاحیتیں دی تھیں، حضرت مولانا کے ـــ ناظم منتخب ہونے کے بعد آئینی طور پر تو نہیں مگر عملاً ندوہ کی انتظامی خدمت موصوف نے سنبھال لی، عمارتوں کی تعمیر، مسجد میں پنکھوں کا نظم، سڑکوں کی تعمیر، اساتذہ کے لئے کوارٹرس بنانا، بجلی کے مستحکم پول بنانا، یہ سب مولانا معین اللہ صاحب کے کارنامے ہیں، حضرت مولانا کے ـــ ناظم ہونے کے بعد مالی اور انتظامی خدمت کا کام مولانا معین اللہ صاحب نے اپنے ذمہ لیا اور بحسن وخوبی انجام دیا، حضرت مولانا کی مقبولیت عند اللہ اور عند الناس سے ندوہ کو فیض پہونچانے کا کام انہی کا حصہ تھا، حضرت ڈاکٹر سید عبد العلی رحمۃ اللہ علیہ پر جب سے امراض کے حملے شروع ہوئے اس وقت سے عملاً نظامت حضرت مولاناؒ کے ذمہ تھی، اور آپ کی ہدایت کی روشنی میں مولانا معین اللہ صاحبؒ ان کے قوت بازو اور معتمد علیہ تھے۔ طلبہ کی تعداد بڑھنا شروع ہوئی، رحمانیہ ہاسٹل بنا، سلیمانیہ دار الاقامہ تعمیر ہوا، شبلی دار الاقامہ کے متصل مین منزلہ دار الاقامہ بنا، پھر رفتہ رفتہ تمام عمارتیں بننے لگیں، اور دیکھتے دیکھتے ندوہ کے در و بام میں زندگی کے نئے آثار نمایاں ہو گئے۔

حضرت مولانا کے دور نظامت میں ندوہ

ایک مدرسہ کے نام سے تو یقیناً پورے ملک میں مشہور تھا اور اپنی فکر کے لحاظ سے نمایاں تھا مگر طلبہ کی تعداد بہت کم تھی، اس لئے کہ غیر مستطیع طلبہ کے لئے وظائف کا انتظام نہیں تھا اور پورے ملک کا دورہ کرکے چندے وصول کرنے والے سفراء نہیں تھے، حیدرآباد اور بعض ریاستوں کی معمولی امداد سے مدرسہ کے اخراجات چلتے تھے، اور یہ معلوم ہے کہ مدارس میں مستطیع بہت کم اور غیر مستطیع زیادہ ہوتے ہیں، کھاتے پیتے گھرانوں کے لڑکے اسکولوں اور کالجوں کا رخ کرتے ہیں، اور عام طور پر "باقی ہے ملتِ بیضا غریبوں کے دم سے" ان کے لئے گنجائش یہاں کم تھی۔ میری طالب علمی کے زمانہ (۱۹۴۲ء تا ۱۹۴۴ء) میں ۳۵ طلبہ کا وظیفہ تھا اور سو طالب علم اپنے کھانے کا خرچ خود ادا کرتے تھے، اس سے ایک فائدہ تو تھا کہ طلبہ میں ذہنی طور پر اونچ نیچ نہیں تھی اور کسی کو معلوم نہیں تھا کہ مستطیع کون ہے اور غیر مستطیع کون۔ دعوت دین کے لئے جو جرأتمندانہ احساس ہونا چاہئے وہ موجود تھا۔ مگر طلبہ کی اتنی مختصر تعداد مختلف قسم کی بدگمانی پیدا کرتی تھی۔ بعض حلقوں سے یہ آواز اٹھائی گئی کہ قوم نے ندوہ کے نصاب کو قبول نہیں کیا۔ اور قدیم درس نظامی جو اسلامی تاریخ کے عہد انحطاط میں مرتب کیا گیا تھا، وہی مطلوب ومقبول ہے۔ حالانکہ حقیقت صرف اتنی تھی کہ ندوہ کا دارالعلوم ابتداء سے اپنے ایک خاص نہج پر چلتا رہا، اور طلبہ کی تعداد صرف اس لئے کم تھی کہ عوامی چندہ حاصل کرنے کے لئے کوئی نقشۂ عمل نہیں تھا۔ نیز ایسی شخصیت جو دینی اور علمی اعتبار سے خاص وعام میں مقبول ہو نہیں تھی۔ اور جو تھے جن کے بارے میں پورے اعتماد کے ساتھ کہا جاسکتا ہے وہ فن کے منتخب ترین علماء میں تھے۔ جیسے حضرت مولانا حیدر حسن خاںؒ مولانا شبلی فقیہ، مولانا محمد ناظم ندوی، مولانا عبد السلام قدوائی سب اپنے اپنے فن کے یگانۂ روزگار افراد تھے۔ لیکن عوام سے ان کا واسطہ نہیں تھا۔ حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کو قدیم وجدید دونوں طبقوں کا اعتماد حاصل تھا۔ وہ صحیح معنوں میں ندوی فکر کا نمونہ تھے۔ بانیانِ ندوہ نے جس صلاحیت کے افراد تیار کرنے کا منصوبہ بنایا تھا، حضرت مولانا اسی کے داعی تھے۔ اور ندویت پر بغیر کسی بال برابر فرق کے علامہ سید سلیمان ندویؒ کی طرح نئی نسل کے داعی اور راہنما تھے، مولانا معین اللہ صاحبؒ مرحوم نے آپ کے نفوذ اور علمی وروحانی اثرات سے فائدہ اٹھا کر جب لوگوں کو دین کے لئے ندوہ کی طرف متوجہ کیا تو جوق در جوق طلبہ آنے لگے، اور ندوہ کی صلح آمیز فکر عام ہوئی، اور لوگوں نے اس کی دینی اہمیت کا اعتراف کیا۔ اور اس کے دینی مقام کی عظمت کو سمجھا، جس کو سمجھانے کی ندوہ کی طرف سے کبھی کوشش نہیں کی گئی تھی، اور اس کے خلاف غلط پروپگنڈے بھی کئے گئے تھے، جن کی تفصیل کا موقع نہیں ہے۔

بہرحال حضرت مولانا کے عہد نظامت میں ندوہ اپنی فکری اور علمی بنیاد پر قائم رہتے ہوئے عالم اسلام میں پوری طرح مقبول ہوا اور خود اس ملک کے اندر اہل انصاف اور صاحب ضمیر مسلمانوں نے خراج عقیدت پیش کیا۔ بعض لوگوں نے جو ناواقف ہیں اور ندوہ کی اصل فکر سے واقف نہیں تھے انھوں نے کچھ غلط باتیں بھی مشہور کرنا شروع کر دیں مثلاً یہ کہ ندوہ دیوبند کے طرز پر ڈھالا جارہا ہے، حالانکہ ایک دن کے لئے بھی ندوہ نے کسی دوسرے مدرسہ کا نصاب تعلیم

یا طرز تعلیم اختیار نہیں کیا۔ اور نہ کسی غیر ندوی مکتب فکر کی پیروی کی۔ گذشتہ برسوں میں ندوہ کو ایک "عربک کالج" مشہور کرنے کی کوشش شروع کی گئی تھی۔ جب اس تصور کو مٹایا گیا تو لوگوں نے دوسرے کنارہ پر اپنی مخالفت کا موقف اختیار کیا۔

حضرت مولانا کو اللہ تعالیٰ نے جو جامعیت اور عالم اسلام میں مقبولیت عطا فرمائی تھی آپ نے ندوی فکر کو صحیح معنوں میں متعارف کرایا۔ بلاشبہ حضرت مولانا نے بزرگان دین کی روحانیت سے ندوہ کو فیض پہونچایا اور ان کی دعاؤں کے اثرات ناقابل انکار ہیں، لیکن صرف روحانیت، خدا ترسی خوف آخرت کی روح پیدا کرنے کی کوشش کی جس میں ایک حد تک کمی یا تشنگی تھی، لیکن جہاں تک فکری اور علمی استقلال کا تعلق ہے اور ندوہ کے بنیادی مقصد کا تعلق ہے اور نصاب تعلیم میں تبدیلی و ترقی کا تعلق ہے اس میں ایک حرف کی بھی تبدیلی نہیں ہوئی، بلکہ دوسرے اداروں نے کسی نہ کسی شکل میں ندوہ کے نصاب سے قریب آنے کی کوشش کی، یا نام بدل کر اسی ڈھانچہ کو اپنانے کی سعی کی۔ خلاصہ یہ کہ معترضین جو پہلے کے تھے یا جو بعد میں آئے دونوں کی باتیں حقیقت سے مختلف تھیں، صحیح بات وہ نقطۂ اعتدال اور توسط ہے جس کو حضرت مولانا نے اپنے دور نظامت میں پوری قوت کے ساتھ متعارف کرایا، پھیلایا اور بڑھایا اور دینی خدمات کا جو سلسلہ آپ کی ذات سے شروع ہوا وہ ایک صدقۂ جاریہ ہے جس کا اجر ان شاء اللہ آپ کو ملتا رہے گا۔ حضرت مولانا اس حقیقت کو اپنی خود نوشت سوانح "کاروان زندگی" کے پہلے حصہ میں ذکر فرما چکے ہیں، مناسب ہوگا کہ یہ پوری تقریر یہاں نقل کر دی جائے۔

"دین و عقائد کے معاملہ میں ندوۃ العلماء کے مسلک کی بنیاد دین خالص پر ہے، جو ہر قسم کی آمیزش اور آلائش سے پاک، تاویل اور تحریف سے بلند، ملاوٹ اور تخریب کی دسترس سے دور، اور ہر اعتبار سے مکمل اور محفوظ ہے۔

دین کے فہم اور اس کی تشریح اور تعبیر میں اس کی بنیاد اسلام کے اولین اور صاف و شفاف سرچشموں سے استفادہ اور اس کی اصل کی طرف رجوع پر ہے۔

اعمال و اخلاق کے شعبہ میں دین کے جوہر و مغز کو اختیار کرنے، اس پر مضبوطی سے قائم رہنے، احکام شرعیہ پر عمل حقیقت دین اور روح دین سے زیادہ قربت اور تقویٰ و صلاح باطن پر ہے۔

تصور تاریخ میں اس کی بنیاد اس پر ہے کہ اسلام کے ظہور اور عروج کا دور اول سب سے بہتر اور قابل احترام دور، اور وہ نسل جس نے آغوش نبوت اور درسگاہ رسالت میں تربیت پائی، اور قرآن و ایمان کے مدرسہ سے تیار ہو کر نکلی، سب سے زیادہ مثالی اور قابل تقلید نسل ہے، اور ہماری سعادت و نجات اور فلاح و کامرانی اس بات پر منحصر ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ اس سے استفادہ کریں، اور اس کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کریں۔

نظریۂ علم و فلسفۂ تعلیم میں اس کی اساس اس پر ہے کہ علم بذات خود ایک اکائی ہے، جو قدیم و جدید، اور مشرق و مغرب کے خانوں میں تقسیم نہیں کی جا سکتی اگر اس کی کوئی تقسیم ممکن ہے، تو وہ تقسیم صحیح اور غلط، مفید اور مضر، اور ذرائع اور مقاصد کے اعتبار سے ہوگی، استفادہ اور افادہ اور ترک و قبول کے شعبہ میں اس کا عمل اس حکیمانہ نبوی تعلیم پر ہے کہ "حکمت مومن کا گمشدہ مال ہے، جہاں بھی وہ اس کو پائے وہ اس کا سب سے مستحق ہے"، نیز قدیم حکیمانہ اصول "خذ ما صفا ودع ما کدر" پر (یعنی جو صاف و نظیف ہو اس کو لے لو، اور جو آلودہ و کثیف ہو اس کو چھوڑ دو۔)

اسلام کے دفاع اور عصر حاضر کی لادینی قوتوں کے مقابلہ میں اس کی اساس اس ارشاد ربانی پر ہے:۔

وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ۔ (سورۃ الانفال۔ ۶۰)

ان کے مقابلہ کے لئے جتنی قوت تم سے ممکن ہو سکے تیار کرو۔

دعوت الی اللہ، اسلام کے محاسن و فضائل کی تشریح، اور ذہن و عقل کو اس کی حقانیت و صداقت پر مطمئن کرنے میں اس کا عمل اس حکیمانہ وصیت پر ہے کہ:۔

"کلموا الناس علیٰ قدر عقولہم أتریدون أن یکذب اللہ ورسولہ"

لوگوں سے ان کی عقلوں کا خیال رکھتے ہوئے گفتگو کرو، کیا تم چاہتے ہو کہ خدا اور رسول کو جھٹلا دیا جائے؟

عقائد و اصول میں وہ جمہور اہل سنت کے مسلک کی پابندی، اور سلف کے آراء و تحقیقات کے دائرہ میں محدود رہنا ضروری سمجھتا ہے، فروعی و فقہی مسائل کے بارے میں اس کا مسلک و اصول یہ ہے کہ حتی الامکان اختلافی مسائل کو چھیڑنے اور ہر ایسے طرز عمل سے احتراز کیا جائے جس سے باہمی منافرت

بڑھے اور امت کا شیرازہ منتشر ہو، سلف صالحین سے حسن ظن رکھا جائے، اور ان کے لئے عذر تلاش کیا جائے، اسلام کی مصلحت اجتماعی کو ہر مصلحت پر ترجیح دی جائے۔

مختصراً یہ کہ وہ حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ (م ۱۱۷۶ھ) کے علمی و فکری اور کلامی و فقہی مدرسۂ فکر سے زیادہ قریب اور ہم آہنگ ہے، اس لحاظ سے ندوۃ العلماء ایک محدود تعلیمی مرکز سے زیادہ ایک جامع اور کثیر المقاصد دبستان فکر اور مکتب خیال ہے۔"

اس تحریک کے ساتھ جو ندوۃ العلماء کے دینی مسلک، اس کے نظریۂ علم و تاریخ اور طریق فکر سے متعلق ہے، اپنی ہی ایک تحریر کے اقتباس کا اضافہ کیا جاتا ہے جس سے اس ثقافت کی وسعت و تنوع کا اندازہ ہوتا ہے، جو بانیان ندوۃ العلماء کا شعار اور اس کے فضلاء کے لئے باعث افتخار ہے، یہ اقتباس راقم کے اس مقدمہ سے ماخوذ ہے جو نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی (جو ندوۃ العلماء کے بانیوں اور فکری رہنماؤں میں سے تھے) کی سوانح حیات مرتبہ مولوی شمس تبریز خاں کے لئے لکھا گیا تھا، مسلمانوں نے ہندوستان میں پہونچ کر جس اسلامی ہندی تہذیب و ثقافت کو وجود بخشا تھا، اس کا تعارف کراتے ہوئے مقدمہ نگار نے لکھا تھا:-

"اس تہذیب و ثقافت میں شکوہ بھی ہے، اور تواضع بھی، جلادت بھی ہے اور مروت بھی، گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی، صلابت بھی ہے اور رقت بھی، استقامت بھی ہے اور رواداری بھی، اس کی قلمرو میں علوم شریعت و حکمت بھی ہیں، اور ادب و شاعری بھی، فقر و درویشی بھی ہے، اور نفاست و ذوق لطیف بھی، اس کی دلچسپی کے میدان قلعے بھی ہیں، اور کتب خانے بھی، مدرسے بھی ہیں، اور خانقاہیں بھی، تحقیق و تصنیف کے حلقے بھی ہیں، اور مشاعرے بھی، اس میں ثقاہت بھی ہے، اور ظرافت بھی، سخت جانی بھی ہے اور سبک روحی بھی، اس کے اظہار خیال اور اظہار کمال کا ذریعہ عربی بھی ہے، اور فارسی بھی، اردو بھی ہے، اور ہندی بھی۔"

۱؎ مشہور اصحاب قلم ادبا رفن کی کتابیں صدیوں سے پڑھائی جا رہی ہیں، ان کے متعلق یہ آراء شاید ان لوگوں کے لئے نامانوس معلوم ہوں گی، جو روایتی طور پر تقلیدی ادب کے شناسا ہیں، لیکن یہ حقیقت ہے جس کی صداقت جاننے کے لئے کافی مطالعہ اور وسعت نظر اور صحت ذوق کی ضرورت ہے۔

۲؎ شاعر گھوڑے کی تعریف کرتا ہے کہ دیر حملہ کرتا ہے، بھاگتا ہے ایک ہی ساتھ آگے بھی بڑھتا ہے، اور پیچھے بھی مڑتا ہے۔

۳؎ ایک پتھر کی چٹان ہے جسے سیلاب نے اوپر سے گرادیا ہے۔

۴؎ سوہادہ ریاست پونچھ (کشمیر) میں بالائے کوہ، سادات کی ایک بستی ہے جہاں عزیز گرامی مولوی سید مظفر شاہ ندوی استاد دار العلوم کی دعوت پر ۱۳۴۶ھ میں جانا ہوا تھا اور حصہ سوم کا بڑا حصہ وہاں لکھا گیا۔

۵؎ مقدمہ قصص النبیین جزء ثالث مطبوعہ دار الکتاب العربی مصر ۱۳۷۲ھ۔

۶؎ وصیت حضرت علی کرم اللہ وجہہ۔

(بقیہ)

ایسا کہاں سے لاؤں

نقل کرتے ہوئے دعاگو ہیں :-

"میں سمجھتا ہوں اس فقر کی دولت کو نہ صرف مولانا نے اپنا سرمایہ حیات سمجھا بلکہ ان کا خانوادہ بھی اسی شاہراہ پر چل رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس حیثیت کو عزت و وقار کے ساتھ ہمیشہ قائم رکھے اور کبر و غرور سے محفوظ رکھے۔"

مولانا اکثر بڑے والہانہ انداز میں یہ اشعار گنگناتے ہوئے سنے جاتے تھے :

اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاج ملوک
اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا دارا و جم
دل کی آزادی شہنشاہی شکم سامان موت
فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم

مولانا کی مثالی زندگی کا ہر لمحہ اس بات کا جیتا جاگتا ثبوت ہے کہ انھوں نے اسیری شکم کے مقابلہ میں فقر کی دولت بیدار کو اپنا کر دل آزاد کی شہنشاہی حاصل کرلی تھی۔

۳۱ر دسمبر ۱۹۹۹ء کے بعد سے ساری اسلامی دنیا زبان حال سے کہہ رہی ہے :

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

شاعر مشرق کے الفاظ میں ذرا سی ترمیم کے ساتھ ہر زبان پر یہ دعا ہے اور ہر دل سے صدائے آمین آرہی ہے :

آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

زمانہ کا دامن :- زمانہ کا دامن پھیلتا اور سمٹتا رہتا ہے آج ہمیں پہلے سے کہیں زیادہ محنت تیاری اور سرمایۂ علم کی ضرورت ہے۔

(حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ)

بے مایہ ملت کی ایک مایۂ گرانمایہ سے محرومی

جناب مولانا محمد سالم قاسمی (مہتمم دار العلوم (وقف) دیوبند)

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ صرف ایک عظیم شخصیت نہیں بلکہ بیسویں صدی کے نصف آخر کی تقریباً تمام تاریخ ساز شخصیات کی خصوصیات کو حق تعالیٰ نے ان کی ذات گرامی میں جمع فرمادیا تھا۔ اس لئے ان کی ذات گرامی کی دید اور ان کے کمالات سے مستفید خوش بخت طبقات اگر یہ فرمائیں کہ ہم نے عالم اسلام کے ہر دائرۂ فکر کی زہد و تقویٰ کے ساتھ اور معنویت و روحانیت کی حامل علمی، فکری، تربیتی، تعلیمی، تبلیغی، تصنیفی، تاریخی، ادبی، اداری، انتظامی، اجتماعی، سیاسی اور اخلاقی تمام عہد آفریں شخصیات کو دیکھا ہی نہیں، بلکہ برتا بھی ہے تو ان کا یہ قول اہل فکر و نظر کی ہر کسوٹی پر اتنا کھرا اترے گا کہ اس میں کج فکری سے کھوٹ نکالنے کے شائقین انشاء اللہ کبھی کامیابی کا منہ نہیں دیکھ پائیں گے۔ اس لئے گذری ہوئی محسن ملت شخصیات پر ان کی موجودگی ملت کے لئے نہ صرف صبر و استقامت کا ذریعہ ہی بنی بلکہ ہمت و حوصلہ کی افزونی کا عظیم سبب بھی ثابت ہوئی۔

حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کی عظمت و برگزیدگی پر یہ ایک ناقابل شکست حتمی دلیل ہے کہ بانی اور تاحیات سابق صدر مسلم پرسنل لا بورڈ، حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب (سابق مہتمم دار العلوم دیوبند) کی جامع الکمالات بین الاقوامی شخصیت کے بعد دینی مستقبل ملت کی محافظ ملک گیر تنظیم آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی صدارت کے لئے حضرت مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ مکمل اتحاد فکر کے ساتھ ملت کے ہر مکتبہ فکر کے اہل فکر و نظر کا ایک لمحہ کی تاخیر کے بغیر انتخاب فرمالینا بذات خود حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کی عظمت و برگزیدگی پر شاہد عدل ہے۔

حضرت مولانا کا علمی مقام

حضرت مولانا علی میاں علیہ الرحمہ فن تاریخ میں ایک معتبر و مستند مقام رکھنے کے باوجود علوم دینیہ میں فن تفسیر قرآن کریم، فن حدیث میں خاص طور سے متبحرانہ علمی حیثیت کے بھی حامل تھے خاص طور سے فن تفسیر میں فطری مناسبت کی بناء پر عصر رواں کے غیر معمولی تمدنی اور تہذیبی ارتقاء اور سائنس کی حیرت ناک پیش رفت پر قرآن و حدیث سے تائیدی یا تردیدی نکات آفرینی کو مولانا کے دینی ذوق کی عظمتوں پر شاہد عدل بنا کر پیش کیا جاسکتا ہے اس کی بے شمار مثالوں میں سے صرف یہ ایک مثال ہی کافی ہے کہ حضرت مولاناؒ نے عصر حاضر کی اہم ترین اور غیر معمولی .... ایجادات کہ جن کا تصور بھی سو سال پہلے تک انسانی دماغوں میں نہیں تھا چہ جائیکہ چودہ سو سال پہلے ہوتا۔ لیکن حضرت مولانا اپنے غیر معمولی ذوق عربیت سے قرآن کریم کی آیت کریمہ:

"وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ"

اور کوئی انسان ایسا بھی ہے کہ جو اللہ سے غافل کرنے والی باتیں خریدتا ہے تاکہ اللہ کی راہ سے بے سمجھے دوسروں کو گمراہ کردے۔

يَشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ (باتیں خریدنے) کے لفظ سے ویڈیو اور ٹی۔ وی پر جو دل لگتا استشہاد فرمایا ہے وہ سو فیصد ان پر منطبق ہے۔ کیونکہ یہ دونوں چیزیں غافل کرنے والی بھی ہیں اور "باتیں" بھی ہیں اور لہوالحدیث کی انطباقی وسعتوں سے حضرت مولانا کی طرح عربیت کا ذوق سلیم و وسیع رکھنے والے ہی اس عجیب و غریب ہدایت آمیز نکتہ آفرینی سے حظ اندوز ہوسکتے ہیں۔ کیونکہ یہاں لفظ کھیل استعمال نہیں فرمایا گیا جس میں ویڈیو اور ٹی۔ وی داخل نہ ہوتے بلکہ باتوں کا کھیل فرمایا گیا ہے جو ہدایت پسند ذوق دینی کے حاملین کے نزدیک بلا خوف تردید ویڈیو اور ٹی۔ وی پر منطبق ہوجاتا ہے۔

فن تاریخ میں مولانا کا بنیادی امتیاز

انسان کی فطری رفتار ارتقاء تدریجی ہے اس لئے عام طور پر بعد میں آنے والی نسل کے لئے پچھلی نسلوں کی تاریخ ایک تہذیبی، تمدنی، معاشرتی، اجتماعی اور سیاسی درس کی حیثیت رکھتی ہے اسی درس سے اس کو ان دوائر حیات میں ترقی کی راہیں نظر آتی ہیں یہی وہ لفظ فکر ہے جو قومی پیمانے پر تاریخ کو ایک اہم .... مقام عطا کرتا ہے۔

اسلام نے تاریخ کے اس عمومی اور

متعارف موضوع سے آگے بڑھ کر تاریخ کو مؤثر سرچشمہ قوت و تربیت قرار دے کر دعوت و تبلیغ کے خادم ہونے کا وہ موضوع دیا کہ جو انسانی قلب و دماغ کو انسانیت کاملہ کی راہنمائی عطا کرتا ہے۔

عام طور پر مسلم مؤرخین نے "دعوت و تبلیغ" کے انسانی قلب و دماغ کو متأثر و مطمئن کرنے کی عظیم صلاحیت کی روشنی میں تاریخ لکھنے کے بجائے مسلم اقتدار کی جغرافیائی توسیع اور جنگوں میں مسلم فوجوں کے بسا اوقات ناقابل یقین اور انتہائی مبالغہ آمیز واقعات کو اپنا موضوع تاریخ نویسی بنایا ہے جس کے بارے میں حسن ظن سے اگر کام لیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ مسلم فوجوں میں جوش و خروش کے ساتھ ہمت و حوصلہ کو بڑھانا ان کا مقصد تھا، نیز دور قدیم کے لحاظ سے یہ بھی بعید از قیاس نہیں ہے کہ اس مبالغہ آمیزی کا مقصد ارباب اقتدار کو خوش کر کے انعام و اکرام حاصل کرنا ہو، ان دونوں مقاصد کی صحت و سقم سے صرف نظر کرتے ہوئے یہ کہنا قطعاً مبالغہ نہیں ہوگا کہ اس طرز تاریخ نویسی سے نہ صرف یہ کہ اسلام کی تاریخ ہی مرتب نہیں ہوئی بلکہ خود نفس تاریخ اسلام کو اس سے زبردست یہ نقصان پہونچا ہے کہ مخالفین کی نگاہوں میں اس تاریخ نے بذات خود اسلام کو محل تنقید بنادیا۔

اس کے برخلاف حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ نے تاریخ اسلام کا صحیح اور حقیقی موضوع اس مخلصانہ دعوت و تبلیغ کو قرار دیا جس سے خاص طور پر فطری تعلیمات اسلام کی اغیار پر غیر معمولی اور حیرت انگیز تأثر پذیری اور نیک دل مسلم حکمرانوں کی اسلامی تعلیمات کے تحت انسانیت نوازی، سچے تاجروں اور پر اخلاص محنت کشوں کے دیانت و امانت پر مشتمل واقعات کے ذریعہ اقوام عالم تک اسلام کی مؤثر پیغام رسانی متوقع ہوتی ہے، اس طرز پر حضرت موصوف نے تاریخ اسلام کی قرار واقعی اور برمحل خدمت انجام دے کر مستقبل کے مؤرخین کے لئے ایک قابل تقلید نمونہ قائم فرمایا۔ اسی بنیاد پر اس اہم تاریخی موضوع پر مولانا کے مقالات و خطبات کے علاوہ پانچ جلدوں میں شاہکار تصنیف "تاریخ دعوت و عزیمت" نے تاریخ اسلام کے حقیقت شناس مؤرخین، اہل علم وفضل سے زبردست خراج تحسین اسی لئے حاصل کیا ہے کہ بصیرت مند اور فقیہ النفس ارباب علم نے درج ذیل جن تین بنیادی اصولوں کو اسلام سے نابلد قوموں اور ملکوں تک اسلام کی پیغام رسانی کے لئے اپنایا ہے وہ تینوں بنیادیں حضرت مولاناؒ کی اس عظیم تصنیف میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

۱۔ اول یہ کہ بلا امتیاز مذہب و ملت انسانیت کے احترام کو "وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ الخ" کی عمومی ہدایت قرآنی کے تحت ہر ہر مرحلہ پر ملحوظ رکھا ہے جس کے نتیجہ میں کسی ادنیٰ مخالفانہ شعور کے بغیر غیر مسلم قاری بھی پیغام رسانی کے اخلاص پر یقین کے ساتھ اس پیغام کا مدبرانہ مطالعہ کرتا ہے جس کی پُر تاثیری سے انکار ممکن نہیں۔

۲۔ دوسرے پڑوسی کے حقوق کو اسلام نے مسلم و غیر مسلم کے فرق کے بغیر "لازال جبرئیل یوصینی بالجار حتیٰ ظننت انه سیورثه" (جبرئیل امین ہمیشہ سے پڑوسی کے حقوق کی ادائگی پر اتنا مامور کرتے تھے کہ مجھے یہ گمان ہونے لگا کہ شاید پڑوسی کو میراث میں شریک بنادیا جائے گا۔) کی وقیع و عظیم تعبیریں پیش فرماکر دنیا کے ہر ملک میں غیر مسلم پڑوسی اقوام کے لئے اسلام کی اخلاقی وسعتوں کو اس مختصر و جامع اور وقیع و عظیم تعبیر میں سمودیا ہے بس اصحاب دعوت و عزیمت کی زندگی کے سراپا اخلاص، احوال و واقعات کی صورت میں اسلام کی یہ عملی وسعت و ہمہ گیری خاص طور پر غیر مسلموں کے لئے عظیم تحفۂ ہدایت بن جاتی ہے۔ حضرت مولانا نے اس کو اپنی تحریر میں ملحوظ رکھ کر صحیح معنیٰ میں تاریخ دعوت و عزیمت کا حق ادا فرمایا ہے۔

۳۔ تیسرے یہ کہ اسلامی معاشرتی رہنمائی کے تحت بلا امتیاز دین و مذہب عمومی پیمانے پر اخلاقی روابط کے قیام کے ذریعہ اسلام کے امن و صلح کے جمہوری مزاج پر انسان دوستی کا وہ مؤثر ترین عملی نمونہ پیش کرنا کہ جس کی انسانیت نوازی کسی دلیل کی محتاج نہیں ہے۔

حضرت مولانا نے اصحاب دعوت و عزیمت کے ذکر جمیل کے ذیل میں اسلام کے اس انسان دوستی کے جمہوری مزاج کو بڑی جامعیت کے ساتھ پیش فرماکر آج کے ارباب دعوت و عزیمت کو ایک ناقابل فراموش وہ رہنمائی عطا فرمائی ہے کہ کسی نئے تجربے کے بغیر انہی اسلامی رہنما اصولوں کو اپنانا ان شاء اللہ کامیابی کی ضمانت ثابت ہوگا۔

ان اصول موضوعہ کو حضرت ربعی بن عامرؓ کے اس سبق آموز مختصر واقعہ کی روشنی میں دیکھئے تو اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت مولاناؒ نے اس کی تفصیل کو اپنا محور فکر و عمل قرار دیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت ربعی بن عامرؓ سے رستم ایرانی نے سوال کیا تھا کہ " ماالذی جاء بکم ؟" (تم کس غرض سے (ہمارے پاس) آئے ہو ؟) رستم نے یہ سوال اس یقین پر کیا تھا کہ حضرت ربعی بن عامرؓ یہ ہی کہیں گے کہ ہم غربت و افلاس سے تباہ حال ہیں اس لئے تم اپنے مال و دولت میں سے کچھ حصہ ہمیں بھی دو اور رستم کا خیال تھا کہ اس جواب پر ان کو کچھ مال و دولت میں سے حصہ دیدیا جائے گا تو ان کے جہاد سے بھی نجات مل جائے گی اور یہ سب ممنون و شکر گذار ہو کر واپس چلے جائیں گے۔

لیکن حضرت ربعی بن عامرؓ نے رستم کو جو جواب دیا، وہ جواب اسلام کی وہ مکمل اور جامع ترین ترجمانی ہے کہ اگر اس کو یہ کہا جائے کہ اس سے زیادہ اعلیٰ اور کامل ترین جواب کوئی ہو ہی نہیں سکتا تو یہ قطعاً مبالغہ نہیں ہوگا، حضرت ربعیؓ نے فرمایا:۔

"اللہ ابتعثنا لنخرج من شاء من عبادۃ العباد الیٰ عبادۃ اللہ ومن ضیق الدنیا الیٰ سعۃ الآخرۃ ومن جور الادیان الیٰ عدل الاسلام۔"

ہمیں اللہ تعالیٰ نے اس لئے بھیجا ہے کہ جو بندوں کی غلامی سے نکل کر اللہ کی غلامی میں آنا چاہے (تو اسے ہم اللہ کی غلامی کا وہ راستہ بتائیں کہ جس پر ہزاروں آزادیاں قربان ہو سکتی ہیں) اور جو دنیا کی تنگیوں سے نکل کر آخرت کی وسعتوں کی طرف آنا چاہے اور جو دنیا کے ظلموں سے بچنا چاہے اسے اسلام کے عدل وانصاف کی راہ دکھانے کے لئے آئے ہیں۔

یعنی ہم تم پر رحم کھا کر آئے ہیں کہ تم دنیا کے پنجرے میں گرفتار ہو جو تمہیں دیدیا جاتا ہے تو کھا لیتے ہو، تم اپنے کاموں اور ضرورتوں میں اپنے غلاموں کے غلام ہو ہم تمہیں دنیا کی تنگیوں سے نکال کر آخرت کی وسعتوں میں لانے کے لئے آئے ہیں، ہم تمہیں غلامی سے نجات دلا کر آزادی سے ہمکنار کرنے کے لئے آئے ہیں بالفاظ دیگر ہم تم سے کچھ مانگنے نہیں آئے بلکہ تمہیں کچھ دینے کے لئے آئے ہیں۔ اس سراپا اخلاص جواب کی عظمت واہمیت نے کبر وغرور کا سر جھکا دیا اور رستم دم بخود رہنے پر مجبور ہوگیا۔

یہی وہ دعوت وعزیمت ہے کہ کل عالم انسانی کی اہم ترین ضرورت ہے اور عالم انسانی کو اس کا مخاطب اسلام کے سوا کوئی بنانے والا نہیں ہے۔

انسانیت کو باعظمت بنانے والے اسی خطاب مقدس کی مؤثر ترجمانی حضرت مولانا زندگی بھر کرتے رہے۔

مولانا کی زندگی کا اخلاقی رخ

علم اپنی عظمت کے باوجود اپنے کو پرتاثیر بنانے میں مکارم اخلاق کا ضرورت مند ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں "انما بعثت معلماً" (میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں) "اوتیت علم الاولین والآخرین" (مجھے اگلے اور پچھلے (انبیاء) کے علوم عطا فرمائے گئے ہیں) فرما کر اپنے علم عظیم کو ظاہر فرمایا ہے وہیں اپنے کمال اخلاق کی رفعتوں کو "بعثت لاتمم مکارم الاخلاق" (میں اعلیٰ اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہوں) کو اسی اہتمام سے ظاہر فرمایا کہ جس اہتمام سے علم کا اظہار فرمایا ہے جس سے علم کے ساتھ اخلاق کی عظمت اور مقصدیت بھی آشکار ہو جاتی ہے پس علم اور اخلاق نبوت کی وہ دو وراثتیں ہیں کہ جن میں ایک کی تکمیل دوسرے کے بغیر نہیں ہوتی۔

حضرت مولانا مرحوم جہاں علم وسیع کے مالک تھے وہیں اخلاق رفیع سے بھی اللہ نے آپ کو حصہ وافر عطا فرمایا تھا اس لئے ہر وارد وصادر اپنے ساتھ حضرت مولانا کے اخلاقی تعامل کو دیکھ کر یہ سمجھنے پر مجبور ہوتا تھا کہ حضرت موصوف کو مجھ سے وہ خصوصی تعلق وارتباط ہے کہ جو کسی دوسرے کو نصیب نہیں، اسی بلندیٔ اخلاق نے حضرت موصوف کے علم کو عظیم مقبولیت وپرتاثیری بخش دی تھی۔

راقم الحروف بھی اپنے ساتھ حضرت مولانا کے خصوصی اور غیر معمولی تعلق وتعامل کی بنیاد پر انہی اہل یقین میں سے ہے جس پر احقر کی ہر موقع پر حاضری وملاقات میں حضرت کے ضعف پیری کے تحت کھڑے ہو کر معانقہ سے روکنے کی کوشش کو حضرت یہ فرما کر رد فرماتے کہ تمہارے ساتھ ناقابل انکار اور محسن ملت نسبت قاسمی قائم ہے اس کا احترام کھڑے ہونے اور معانقے کا متقاضی ہے اسے نہ کرکے میں اپنے ضمیر کی ملامت سے دوچار ہونا مطلق گوارہ نہیں کرتا۔

پھر اس عظیم اخلاق مندانہ تعامل کو ہر مرتبہ یہ تین باتیں ارشاد فرما کر مدلل فرماتے، پہلی یہ کہ میں بلاناغہ ہر روز حضرت الامام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس اللہ سرہ کے لئے ایصال ثواب کرتا ہوں، دوسری یہ کہ میرے والد ماجد نے علماء امت کی مکمل ومستند تاریخ پر مشتمل معرکۃ الآراء تصنیف "نزہۃ الخواطر" میں اپنی فراست ایمانی وعلمی سے ہر عالم کے لئے ان کی شان کے مناسب القاب تحریر فرمائے ہیں۔ لیکن "الامام" کا لقب حضرت الامام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی (بانی دارالعلوم دیوبند) کے لئے بطور خاص استعمال فرمایا ہے۔

تیسری یہ کہ آپ کے دادا صاحب حضرت مولانا محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ اہتمام دارالعلوم میں میرے والد ماجد حضرت مولانا حکیم عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ دیوبند تشریف لے گئے اور اسٹیشن کے قریب کسی عام سرائے میں قیام فرمایا اس کی اطلاع جب آپ کے دادا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو ہوئی تو کچھ اساتذہ کے ساتھ بذات خود اس سرائے میں تشریف لے گئے اور حضرت والد صاحب سے فرمایا کہ حضرت آپ ہم سب کے مخدوم ہیں یہاں قیام کے کیا معنیٰ ہیں غریب خانہ آپ کا گھر ہے۔ دارالعلوم دیوبند آپ کی جگہ ہے، آپ کی تشریف آوری ہمارے لئے باعث راحت وسعادت ہے۔ یہ فرما کر غیر معمولی احترام کے ساتھ حضرت مولانا محمد احمد صاحب، حضرت والد صاحب کو اپنے مکان پر لے گئے اور غیر معمولی محبت واحترام کے ساتھ حضرت مہتمم صاحب

اور تمام اساتذہ کرام وغیرہم نے میزبانی فرمائی، یہ فرماکر حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ راقم الحروف سے فرماتے کہ ہمارا آپ کے محترم گھرانے سے مجانہ و معتقدانہ تعلق نہایت با احترام و قدیم اور تاریخی ہے جس سے کسی وقت اور کسی حال میں بھی صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔

مولانا کی عظیم مثالی امتیازی صلاحیت

جس طرح دار العلوم دیوبند کو شیخ الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دور میمون میں ان کی مخلصانہ انتظامی صلاحیتوں نے ہندوستان گیر بنایا اور حکیم الاسلام حضرت اقدس مولانا محمد طیب صاحب کے دور مسعود میں ان کی عظیم صلاحیتوں نے دار العلوم دیوبند کو بلا شرکت غیرے بین الاقوامی بنایا ٹھیک اسی طرح حضرت مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد حضرت مولانا حکیم عبد الحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ناظم ندوۃ العلماء نے دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کو ملک کے ارباب علم میں متعارف کرایا، حضرت والا کے برادر بزرگوار حضرت مولانا ڈاکٹر عبد العلی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مبارک دور میں ملک کے بیشتر علمی حلقوں اور اداروں میں دار العلوم ندوۃ العلماء ایک باوقار درسگاہ کے طور پر پہچانا گیا۔ اور خود حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کے زمانۂ مسعود میں دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، ان کی اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں سے نہ صرف بین الاقوامی سطح پر غیر معمولی عظمت کے ساتھ متعارف ہی ہوا بلکہ عالم عرب اور دیگر ممالک کی مؤقر یونیورسٹیز نے دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کو علمی اور دینی اہمیت کے ساتھ تسلیم کر کے اس کی عظمتوں کو غیر معمولی بنادیا۔ ذٰلك فضل الله يؤتيه من يشاء۔ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کو یہ بین الاقوامی امتیاز بلا شرکت غیرے حضرت مولانا علی میاںؒ ہی کی ذات گرامی سے حاصل ہوا۔ حق تعالیٰ اس کی اس فضیلت و امتیاز کو ہمیشہ کے لئے برقراری عطا فرمائے۔ آمین۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کی صدارت

ملت اسلامیہ ہندیہ کی تاریخ میں تمام مسلم مکاتب فکر کی بے اولین و مؤقر تنظیم "آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ" کے عنوان سے حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہ (سابق مہتمم دار العلوم دیوبند) نے برفاقت وتعاون امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ صاحب رحمانی رحمۃ اللہ علیہ پوری ملت اسلامیہ ہندیہ کی مکمل تائید کے ساتھ تحفظ شریعت اسلامیہ کے لئے قائم فرمائی۔ اور شریک بورڈ تمام مکاتب فکر کے ادنیٰ اختلاف کے بغیر حضرت حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہ .... تاحیات اس کے صدر رہے اور اس کی ورکنگ کمیٹی میں فعال و مؤثر رکن کی حیثیت سے حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ روز اول سے پورے انہماک کے ساتھ شریک رہے۔

جولائی ۱۹۸۳ء میں حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد حسب روایت سابق شریک بورڈ تمام مکاتب فکر کے ادنیٰ اختلاف کے بغیر محبوب ملت مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ مسلم پرسنل لاء بورڈ کے صدر قرار دیئے گئے اور ان کی متفق علیہ اور مسلّم شخصیت کی موجودگی میں کسی دوسری شخصیت کی جانب کسی التفات کا چونکہ کوئی سوال وامکان ہی نہیں تھا اس لئے تاحیات بورڈ کی صدارت کے مقام عظمت پر فائز رہے اس سترہ سالہ دور صدارت میں ملک میں فرقہ پرست پارٹیوں نے اسلام اور ملت اسلام کے برخلاف نت نئے فتنے اٹھائے، حتیٰ کہ خود حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی اور آپ کے مؤقر ادارے دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کو بھی غیر قانونی اور غیر اخلاقی حملوں کا ہدف بنانے میں کمی نہیں کی۔ لیکن حق تعالیٰ کی عطا فرمودہ ایمانی فراست وقوت سے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے پوری ملت اسلامیہ کو وہ ہمت و حوصلہ مرحمت فرمایا کہ تمام فتنے نہ صرف اپنی موت آپ مرہی گئے بلکہ یقین ہے کہ اسلام و مسلم دشمنی کے اس دور میں ان بزرگوں کی دعاؤں اور عطا فرمودہ ایمانی قوت سے ان شاء اللہ الاسلام يعلو ولا يعلىٰ (اسلام غالبیت کے لئے آیا ہے مغلوبیت کے لئے نہیں) نبوی فرمان کے مطابق اسلام بھی زندہ و تابندہ رہے گا اور ملت اسلام بھی عزت کے ساتھ باقی رہے گی۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے دور مسعود میں آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کی آواز پوری دنیائے اسلام کے کانوں تک صرف پہونچی ہی نہیں بلکہ خود ان کے اپنے مسائل کے حل کے لئے باعث ہمت و حوصلہ ثابت ہوئی۔

حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مفکر اسلامؒ کے سراپا خیر زمانوں میں الحمد للہ آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کسی خلاف واختلاف سے دوچار نہیں ہوا، توقع ہے کہ ان ہر دو بزرگوں کے سنجیدہ جانشین..... قیادت کو ان شاء اللہ آئندہ اور ہمیشہ ملحوظ رکھ کر ان کی قیادت کو خراج تحسین پیش کیا جاتا رہے گا۔

حضرت مولاناؒ کا ادبی ذوق

حق تعالیٰ نے حضرت مولانا علی میاںؒ کو جس طرح بے شمار کمالات کے ساتھ "سخن دلپذیر" سے نوازا تھا اسی طرح اللہ نے انھیں "دل سخن پذیر" سے بھی حصہ وافر عطا فرمایا تھا، تحریر وتقریر میں

ادبی سخن پذیری مولانا کا ایک ایسا خصوصی امتیاز تھا کہ جو سامعین و مخاطبین کو مسحور بنائے رکھتا تھا پھر یہ امتیاز اپنی مادری زبان اردو ہی میں انھیں حاصل نہیں تھا بلکہ عربی زبان میں بھی وہ اہل زبان کی طرح

اسی امتیاز کے مالک تھے۔

اسی ادبی ذوقی لطافت کو حضرت مولانا اپنی عربی تصانیف کے ناموں میں خاص طور پر ملحوظ رکھ کر ان میں وہ عجیب وغریب دلکشی اور جاذبیت پیدا فرمادیتے تھے کہ کتاب کا نام دیکھ کر یا سن کر عربی مذاق ادب رکھنے والے عرب وغیر عرب کتاب کے مطالعے کے لئے بے چینی سے پر شوق بن جاتے تھے۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں مانعین زکوٰۃ کا فتنہ اسلامی مسلمہ معتقدات کے برخلاف ایک عظیم الحادی فتنہ بن کر ظاہر ہوا۔ لیکن صدیق اکبرؓ نے اول لمحہ میں اس کے برخلاف جدال وقتال کے عزم صمیم کے ساتھ بروقت عمل سے ہمیشہ کے لئے اس فتنۂ عظیم کو خاک بسر بنا کر رکھ دیا جبکہ فاروق اعظمؓ کو بھی اس کے برخلاف جدال وقتال کے بارے میں شرح صدر کچھ وقفے کے بعد ہوا۔

عصر رواں میں یورپ کا الحادی فتنہ، تمدنی رنگ میں خاص طور پر دولتمند عالم عرب کی نئی مسلم نسل کو غیر معمولی طور پر مرعوب ومتاثر کر رہا ہے۔ عالم عرب میں اس جدید تمدنی فتنہ الحاد کی گہرائی وگیرائی کو مفکر اسلامؒ کے فکر عمیق وسلیم نے پہچان کر اس کی جانب وہ اصلاحی قدم ایک ایسے تحریری خطاب کے ذریعہ فرمایا کہ جس کے جاذب ودلکش عربی عنوان "ردة ولا أبا بكر لها" میں نہ صرف اس فتنہ کی پوری تاریخ ہی کو سمودیا بلکہ نئی نسل کے تربیت کنندگان کو تڑپا کر رکھ دیا اور عالم عرب میں حضرت مولانا کے اس مقالہ کے لاتعداد ایڈیشن شائع ہوئے اور شائع ہو رہے ہیں جس کی اثر پذیری سے بیشمار افراد اس تمدنی الحاد سے بچ کر ہدایت یاب ہوئے۔

حضرت مولاناؒ کا اجتماعی پرداز

عصر رواں میں وسائل نقل وحمل اور ذرائع علم وخبر اچھے اور برے کے امتیاز بغیر ہر قسم کے معتقدات، افکار اور نظریات کو عالمگیر اشاعت کی وہ سہولتیں مہیا کر رہی ہیں کہ ماضی میں جن کو ایک مخصوص دائرے سے باہر کوئی جانتا بھی نہیں تھا ان افکار ونظریات کو جب ان وسائل اشاعت سے پھیلنے کا وسیع میدان ملا تو جہاں محدود تعداد میں ان میں اچھے اور اعلیٰ نظریات کو علمی اور فکری معیار پر رکھ کر قبول کرنے والے میسر آئے وہیں فاسد افکار وخیالات کو صحت وسقم کے معیاروں کو نہ جاننے والے بے علم یا کم علم طبقات کا وسیع وعظیم حلقہ ان کی مبتذل خواہشات کی تکمیل کرنے والا اور ان فاسد وغیر مدلل افکار وخیالات کو بدل وجان قبول کرنے والا بھی مل گیا۔

یہ دونوں طبقات چونکہ ملت کا جزو تھے اس لئے ان سے کسی بھی اعتبار سے جہاں صرف نظر کرنا ممکن نہیں تھا وہیں ان افکار فاسدہ کو بعینہٖ قبول کرلینا بھی ممکن نہیں تھا اس متضاد ملی ماحول میں جن دو اجزاء سے مرکب فراست ایمانی کی ضرورت ہوتی ہے اسی صاحب فراست ایمانی کو منصب قیادت راس آتا ہے۔ قائد کو اولین طبقے کی ہمنوائی وتائید صرف علمی وسعت اور دلائل وبراہین کی قوت پر میسر آتی ہے۔ بخلاف ثانی الذکر کے کہ اس کی زبان بندی کا راستہ صرف قائد کی بلند اخلاقی میں پوشیدہ ہوتا ہے۔

وسعت علم اور اخلاقی بلندی کے ہر دو اوصاف جمیلہ سے حق تعالیٰ نے حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کو حصہ وافر عطا فرما کر نوازا تھا۔

ان کی علمی وسعتوں سے عرب وعجم کے اہل علم کی تاثر پذیری آج الحمدللہ کسی دلیل کی محتاج نہیں ہے جس پر مستقبل کی لامحدود مدت تک ان کی تصانیف سے ارباب علم کا استفادہ شاہد عدل رہے گا۔

حضرت مولانا نے اپنے دینی معتقدات، علمی حقائق ونکات اور فکری نظریات سے شدید ترین اختلاف رکھنے والوں کو اپنی بلندیٔ اخلاق سے، اپنائیت کا وہ احساس وشعور عطا کیا کہ انھوں نے بھی حضرت مولانا کو کبھی ہدف اختلاف بنانے کی جرأت نہیں کی۔ اسی علمی اور اخلاقی ہمہ گیری نے قیادت ملت کے اس منصب قبولیت ومقبولیت پر فائز فرمایا کہ جس کی عصر رواں میں ملت ضرورت مند تھی، اور ضرورت مند ہے۔

حضرت مولانا نے اپنے ان ہی علمی اور اخلاقی امتیازات وخصوصیات کی بدولت دین میں مبالغہ کرنے والے حاملین علم قدیم کو اور تمدن میں حد سے تجاوز کرنے والے متجددین کو بر صغیر میں نہیں بلکہ عالمی سطح پر اس راہ اعتدال سے قریب فرمایا کہ جو اسلام کا بلا شرکت غیرے طرۂ امتیاز ہے۔

حضرت مولانا کی پاکیزہ زندگی کا یہ وہ باب ہے کہ جس پر مستقبل کے مصنفین، مؤلفین اور مؤرخین ہمیشہ انشاء اللہ قلم اٹھاتے رہیں گے۔ لیکن اسے ناقابل اختتام راہنما داستان علمی پر جہاں ان کے قلم اعتراف عجز کے ساتھ رکنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

اس کی ترجمانی احقر راقم الحروف نے والد ماجد حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر دو شعروں میں کی تھی اسی حقیقت کا نقش ثانی ومکمل حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی ہے۔ اس لئے اسم گرامی کے فرق کے ساتھ میں اسی ترجمانی پر اپنے ان کلمات کو ختم کرتا ہوں ؎

رہبر منزل نما و رہبر منزل نگر
بوالحسن دانشور و دیوانۂ فرزانہ گر
نوری خاکی اساس و خاکی نوری نہاد
خواجۂ بندہ نواز و بندۂ یزداں شناس

حق تعالیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمات وحسنات اور طاعات وعبادات کو شرف قبول عطا فرما کر مغفرت کاملہ کے ساتھ اعلیٰ علیین میں مقام کریم عطا فرمائے۔

مفکر اسلام (رحمۃ اللہ علیہ)
اپنی شخصیت کے آئینے میں

مولانا سید الرحمٰن الاعظمی الندوی (مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء)

مثالی انسان کی تعمیر میں اسلام کا کردار

یہ ایک ناقابل انکار تاریخی حقیقت ہے کہ انسانی تاریخ کے کسی دور میں بھی مذہب اسلام کی طرح کوئی ایسا جامع نظریۂ حیات اور معتدل نظام زندگی وجود پذیر نہیں ہوا جس نے اپنی تمام تر توجہات کامل انسان کی سیرت سازی اور اسے اخلاق کریمانہ کا مجسم پیکر بنانے پر مرکوز کیا ہو، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر سب سے پہلی جو وحی نازل ہوئی اس میں خداوند تعالیٰ کے بابرکت نام سے حصول علم کی تلقین وترغیب ہے، اسی لئے اسلام نے ہر چیز سے پہلے انسان کی توجہ اس علم کی طرف مبذول کرائی، تاکہ وہ اپنے مرتبہ ومقام سے باخبر ہوکر آسمانی ہدایات کی روشنی میں اپنا سفر طے کرے، اور اپنی زندگی کا حقیقی ہدف متعین کرسکے، اللہ تعالیٰ نے خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دنیا میں آخری نظام حیات دے کر مبعوث فرمایا، یہ نظام اپنی آفاقیت وجامعیت کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے، فطرت انسانی کے تمام تقاضوں کی تکمیل، اور انسانی زندگی کے جملہ مسائل کا بہترین حل اس میں موجود ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

"فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ، ذٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ، وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ"۔

اللہ کی دی ہوئی قابلیت کا اتباع کرو جس پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے اللہ تعالیٰ کی اس پیدا کی ہوئی چیز کو جس پر اس نے تمام آدمیوں کو پیدا کیا ہے بدلنا نہ چاہئے پس سیدھا دین یہی ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ (ترجمہ مولانا تھانویؒ)

تاریخ انسانی کا عظیم انقلاب

اسلام کی آمد سے تاریخ انسانیت میں ایسا عظیم الشان انقلاب رونما ہوا جس نے لوگوں کو خواہشات نفسانی کے کج راستوں سے ہٹا کر صراط مستقیم پر ڈال دیا، اور اس کے نتیجہ میں ایک ایسا صالح معاشرہ وجود میں آیا جس میں ایمان ویقین، سچائی وراست بازی، تقویٰ وطہارت اور کردار وعمل کے دلچسپ ودلکش مظاہر کی کارفرمائی تھی، وہ معاشرہ ایسے پاک طینت افراد پر مشتمل تھا جو بجا طور پر انسانیت کے لئے بہترین نمونہ تھے، ان کی اس افضلیت وبرتری کی وجہ یہ تھی کہ ان کی ساخت وپرداخت شریعت اسلامیہ کی ہدایات کی روشنی میں کی گئی تھی اور یہ حقیقت ہے کہ اسلامی تربیت کی کرشمہ سازی اپنا جمال وجلال دکھائے بغیر نہیں رہتی، بلکہ اس کے زیر سایہ ایسے انسانوں کی سیرت کی تعمیر ہوتی ہے جو مستقبل میں امامت وقیادت کے منصب پر فائز ہوتے ہیں، وہ زندگی کے کسی موڑ پر بھی اعتدال ومیانہ روی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے، وہ غلو وتقدیس سے پاک اور حق تلفی وناانصافی سے کوسوں دور ہوتے ہیں، اخلاص وتعلق مع اللہ ان کی زندگی کا نمایاں جوہر اور حقیقی مقصد ہوتا ہے:۔

سنہ ۱۴۱۹ھ کی سب سے بڑی اسلامی شخصیت

عالم اسلام کے لئے یہ ایک بہت ہی خوش آئند موقع تھا، جب حکومت دبئی نے عالمی جائزۃ القرآن کے جشن کے موقع پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کو سنہ ۱۴۱۹ھ کی عظیم اسلامی شخصیت قرار دیا اور آپ کو ایک وقیع ایوارڈ سے نوازا اور مشرق ومغرب کے تمام اسلامی حلقوں نے اس اقدام کا زبردست خیر مقدم کیا۔

اسلامی امتیازات وکمالات کا تاج زریں

یہاں یہ حقیقت بھی نظروں کے سامنے ہونی چاہئے کہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نور اللہ مرقدہ کو اللہ تعالیٰ نے ایمان ویقین اور علم وحکمت کے جس گنجینۂ گرانمایہ سے نوازا تھا اور امتیازات وکمالات کا جو تاج زریں آپ کے سر پر رکھا تھا اس کی موجودگی میں پورے عالم اسلام میں آپ کو چھوڑ کر کوئی دوسرا شخص اس اعزاز کا اہل بھی نہ تھا، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو ذرا بھی مبالغہ نہ ہوگا کہ آپ کی ایمان افروز مثالی شخصیت اس ایوارڈ سے بالاتر تھی چنانچہ آپ نے اس موقع پر جب آپ کو اس اعزاز سے نوازا گیا بھرے مجمع میں اس عظیم قیمتی ایوارڈ کو دینی تعلیم کے حق میں تقسیم کرنے کا اعلان کردیا، یہ دراصل آپ کی مثالی شخصیت کا سب سے بڑا ثبوت تھا جو آج کی انسانی دنیا میں مفقود ہے۔

دنیا کے بارے میں آپ کا موقف

حضرت مولانا کا یہ خیال تھا کہ یہ دنیا دار الاسباب

ہے، اس میں اصل مقصد تک رسائی حاصل کرنے کے لئے وسائل وذرائع اختیار کئے جاتے ہیں، اور ایک فرد مسلم آخرت کی فوز وفلاح کے لئے دنیاوی وسائل سے استفادہ کرتا ہے، چنانچہ آپ مرد مؤمن کے اصل مقصد کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"مومن کا دنیاوی موقف وہ ہے جس کی توضیح زبان نبوت نے بڑے اچھے ڈھنگ سے فرمائی ہے، اور ایسی لطافت، نزاکت اور دقیق تعیین کے ساتھ اس کو بیان فرمایا ہے کہ اس کے سامنے زبان وبیان اور لطافت وباریکی کے تمام طرز اداہیچ نظر آتے ہیں فرمایا" ان الدنیا خلقت لکم وانکم خلقتم للآخرۃ "(دنیا وآخرت کی تمام چیزیں تمہارے لئے مسخر کی گئی ہیں اور تم لوگ آخرت کے لئے پیدا کئے گئے ہو۔)

لہٰذا ایک مسلمان دنیا وآخرت کو اس نظر سے دیکھتا ہے کہ دنیا اور اس کے سارے وسائل وذرائع کی حیثیت محض ایک وسیلہ کی ہے، مقصد وغایت اور حقیقی مطمح نظر تو بس آخرت کی زندگی ہے لہٰذا اسے مقصد کے حصول کے لئے اس مادی دنیا کے تمام وسائل سے حتی الامکان استفادہ کرنا چاہئے ایک دوسری حدیث میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کی حقیقت کو یوں آشکارا کیا ہے" مالی وللدنیا، وما أنا والدنیا إنما أنا کراکب استظل تحت شجرۃ ثم راح وترکھا" (مجھ کو دنیا سے کیا لینا دینا میرا تعلق تو اس سے بس اتنا ہے جتنا ایک مسافر سوار کا کسی سایہ دار درخت سے ہوتا ہے کہ وہ اس کے نیچے سایہ حاصل کرتا ہے پھر اٹھ کر چل دیتا ہے")۔

کتاب وسنت کا نظریۂ حیات

مذکورہ بالا قرآنی نظریہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ اور آپ کی تعلیمات وارشادات احساسات ورجحانات، اوراد واذکار، ادعیہ ومناجات اور خلوت وجلوت کی زندگی میں مکمل طور پر ظاہر ہوا، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آغوش تربیت میں پرورش پانے والے صحابہ کرامؓ اور اس امت کے مومنین صالحین کی زندگیوں میں بھی یہ وصف پورے آب وتاب کے ساتھ پایا گیا، حتی کہ وہ ان کی زندگی کا جزء لاینفک بن گیا اور اس نے ثابت شدہ تاریخی حقائق کا درجہ اختیار کر لیا جس میں بحث ومباحثہ اور کسی کلام کی کوئی ضرورت نہیں،

اسلامی شخصیت اور اسلامی تہذیب

بلاشبہ اسلامی شخصیت کی تعمیر وترقی سے اسلامی تہذیب کا عظیم محل تعمیر ہوتا ہے اور اسی کے ذریعہ خاکی صفت ظلوم وجہول انسان ملکوت اعلیٰ کی صف میں جا کھڑا ہوتا ہے، اور بسا اوقات ملأ اعلیٰ سے بھی بازی لے جاتا ہے کیونکہ اس کی زندگی ایسے عظیم اخلاق وکردار سے عبارت ہوتی ہے جو اسے مطلوب مسلمان اور مثالی مؤمن کا درجہ عطا کرتے ہیں، حضرت مولانا نور اللہ مرقدہ اس عظیم پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں:

" یقیناً اسلامی شخصیت کی حفاظت اور دنیا میں امت اسلامیہ کے مرکز وقبلہ کی صیانت اور اسلام کے پیغام ومشن سے واقفیت اور اس کی اہمیت وافادیت پر یقین اور حیات بعد الممات پر مکمل اعتماد، اور زندگی کے اخلاقی وروحانی پہلوؤں پر تاکید ہی دراصل دو تہذیبوں کے درمیان خط فاصل کا نشان لگاتی ہے ایک تہذیب تو وہ ہے جس سے اسلام مکمل اتفاق کرتا ہے، اور اس کو پروان چڑھانے کی ذمہ داری اپنے کاندھوں پر ڈالتا ہے اور اس میں اسلامی شخصیت اور اختراعات وایجادات کا ظہور ہوتا ہے، دوسری تہذیب وہ ہے جس سے اسلام اپنی مکمل برأت کا اعلان کرتا ہے، کیونکہ وہ مسلمانوں کے حق میں خسارہ ونقصان کا باعث ہے اور اس میں غلامی وبندگی کی کارفرمائی ہے اور اس کی اتباع وتقلید، بندروں اور طوطوں کی تقلید سے کم نہیں"۔

حضرت مولاناؒ کا منفرد نقطۂ نظر

اس کرۂ ارضی اور اس پر بسنے والے انسانوں کے متعلق حضرت مولاناؒ کا نظریہ نہایت منفرد تھا، آپ کی شہرۂ آفاق تصنیف (ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین) (انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر) نے فکر ونظر کی دنیا میں عظیم انقلاب برپا کیا اور اسلامی ادباء ومفکرین کو سوچنے کا ایک نیا طرز عطا کیا، جہاں تک میرا خیال ہے کہ اس کتاب کے منصۂ شہود پر آنے سے قبل ادباء ومفکرین کا زاویۂ فکر یہ نہیں تھا کہ مسلمانوں کے انحطاط سے شرق وغرب شمال وجنوب ہر خطہ میں عالم انسانیت کو عظیم خسارہ اور ناقابل تلافی نقصانات سے دوچار ہونا پڑا، لیکن حضرت مولاناؒ نے بڑی بیدار مغزی، کامل اعتماد ویقین اور مسکت دلائل وبراہین سے اپنے موقف کی وضاحت کی، چنانچہ اس کتاب کے مقدمے میں معروف مصری فاضل عظیم مفکر وادیب ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ رقمطراز ہیں:-

"اس کتاب میں جو خیر وطاقت ہے اور ہمارے مسائل ومشکلات کا جو بہترین حل ہے بخدا میری دانست میں قدیم وجدید کسی کتاب میں نہیں ہے اس کا مصنف

اسلامی روح سے سرشار اور اپنے مقصد میں انتہائی مخلص ہے اس نے اپنی تمام طاقتوں کو دعوت الی اللہ کے لئے وقف کر دیا ہے۔"

اس موقع سے معروف صاحب علم وقلم عظیم اسلامی اسکالر، مشہور مفکر و داعی سید قطب کی تحریر بھی ملاحظہ فرمانے کے قابل ہے جو انھوں نے اس کتاب کے مقدمہ میں سپرد قرطاس فرمائی تھی، لکھتے ہیں:

"اس کتاب کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نے اسلام کے اصول و کلیات کو ان کے وسیع دائرہ کے اندر اور اسلام کی صحیح روح کے مطابق سمجھا ہے، اس بنا پر نہ صرف یہ کہ یہ کتاب دینی و اجتماعی تحقیق علمی کا نمونہ ہے بلکہ اس کا بھی نمونہ ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے تاریخ کو کس انداز سے مرتب کرنا چاہئے۔"

امت اسلامیہ کے فرزند ارجمند

حضرت مولانا نور اللہ مرقدہٗ اپنی ذات سے ایک انجمن، امت اسلامیہ کے عظیم و ہونہار فرزند ارجمند، اور عالم انسانیت کے لئے بہترین نمونہ اور ایک مثالی انسان تھے، آپ کی اسلامی شخصیت کے تعارف کے لئے کسی دلیل و برہان کی ضرورت نہیں، بلکہ اس کے لئے یہی کافی ہے کہ آپ کی جملہ تصنیفات سے جن کی تعداد تقریباً دو سو سے زائد ہے پورا عالم باخبر ہے، حتیٰ کہ مسلم نوجوانوں کے اندر ان کتابوں کو جمع کرنے اور ان سے خالص اسلامی فکر کی غذا حاصل کرنے میں مقابلہ اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کا جذبہ پایا جارہا ہے، کیونکہ ان میں اسلامی فکر کا ایسا خلاصہ و نچوڑ پیش کیا گیا ہے جس کا تعلق زندگی کے ہر شعبہ اور ہر محاذ سے ہے ان میں ایسی طاقت و صلاحیت ہے جو اسلام اور اس کے نظام پر لوگوں کا اعتماد بحال کر سکتی ہے، اور مسلمانوں کے دلوں میں اسلام کی عظمت رفتہ اور اس کے سطوت و غلبہ کی بازیابی کے لئے ایمان و یقین کی چنگاری روشن کر سکتی ہے اور انھیں عالمی قیادت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں سنبھالنے اور عالم انسانیت کو جدید جاہلیتوں، خود ساختہ نظریات حیات اور مادی تہذیبوں کے جہنم سے نکالنے پر آمادہ کر سکتی ہے، مولانا مرحوم کی اسلامی شخصیت کو آپ کی روشن فکر، کائنات کے متعلق آپ کے بے مثال نظریۂ حیات اور مادی تہذیبوں کے متعلق آپ کی وسیع معلومات کے آئینہ میں دیکھا جا سکتا ہے، اس بنا پر مولانا بجا طور پر اس بات کے سب سے زیادہ حق دار تھے کہ آپ کی محبت میں اکرام و تعظیم اور ادب و احترام کے گلہائے عقیدت پیش کئے جاتے رہیں۔

آپ کا وجود ابر رحمت تھا

مفکر اسلام حضرت مولانا نور اللہ مرقدہ عالم اسلام کے لئے کسی ابر رحمت سے کم نہ تھے، آپ کا وجود مسلمانوں کے لئے بڑے خیر و برکت کا باعث تھا، آپ ان کے لئے سرچشمۂ ہدایت اور ایک مشفق مربی کا درجہ رکھتے تھے، امت مسلمہ کے مسائل و مشکلات سے بخوبی واقف تھے اس لئے ان میں دلچسپی لے کر ان کا بہترین حل پیش کرتے تھے اطراف عالم کے مسلمان آپ سے دعوت و تبلیغ کے میدان میں حکمت و موعظت کا سبق سیکھتے تھے، حالات چاہے جیسے بھی ہوں ہمیشہ اسلامی موقف پر جمے رہنے کی تلقین فرماتے تھے۔

اصل مقصد دعوت الی اللہ اور اس کے لئے عالم کی سیاحت

الغرض آپ ہر ممکن طریقے سے اپنی ذمہ داریوں کو نبھانے میں سرگرم عمل تھے، آپ کے لئے اگر ایک طرف تالیف و تصنیف کی بے پناہ مشغولیت تھی تو دوسری طرف اسفار و ملاقات کا لامتناہی سلسلہ تھا، اعلاء کلمۃ اللہ آپ کی زندگی کا حقیقی ہدف اور اصل نصب العین تھا، چنانچہ آپ نے امت مسلمہ کی عظمت رفتہ کی بحالی، اسلامی تہذیب و تمدن کا پرچم پورے عالم میں لہرانے، دشمنان اسلام کے اعتراضات کا کافی و شافی جواب دینے، ان کے ناپاک عزائم اور ان کی سازشوں کا پردہ چاک کرنے کے لئے مصر و فلسطین کی خاک چھانی، امریکہ و یوروپ کے شہروں اور وہاں کے تعلیم و تہذیب کے مراکز کی سیر کی، اسپین کے شکستہ در و دیوار کی عبرتناک داستانیں سنا کر مسلمانوں کی حمیت دینی اور ان کی غیرت کو للکارا، خلافت عثمانیہ کے زوال کے اسباب بیان کر کے ان کے ذہن و دماغ کو جھنجھوڑا، کتب تاریخ کے اوراق پارینہ کو کھنگھالا اور اسلامی تہذیب کے ایک ایک پہلو کو روشن و بے غبار ثابت کر کے دم لیا۔

اس کا ثمرہ پورے عالم اسلام میں اسلامی بیداری کی شکل میں نمودار ہوا، مگر افسوس کہ آپ ایسے نازک وقت میں راہیٔ دار بقا ہوئے جب کہ امت کو آپ جیسے قائد و مجاہد کی اشد ضرورت تھی، آج عالم اسلام کو عموماً اور امت اسلامیہ ہندیہ کو خصوصاً مسائل و مشکلات کے ایک سیل رواں کا سامنا ہے، عربی مثل میں ذرا تغیر کے ساتھ کہنا کتنا بجا معلوم ہوتا ہے " قضایا ولا ابا حسن لہا"

آپ کا وصف امتیازی

مولانا مرحوم کا ایک امتیازی وصف یہ تھا کہ دنیا کے احوال و کوائف پر آپ گہری نظر رکھتے تھے، اسلام دشمن تنظیموں اور یہودی لابی کی زبردست سازشوں اور ان کی عظیم تیاریوں سے مکمل آگاہی

رکھتے تھے چنانچہ آپ امت مسلمہ کے ہر طبقہ کو اس خطرہ سے آگاہ کرتے تھے اور اس کے مقابلہ کے لئے انھیں بھرپور تیاریوں کی دعوت دیتے تھے، آپ نے امت مسلمہ کے ہر ہر طبقہ میں جہد مسلسل، سعی پیہم، عزم محکم، غیرت وحمیت اور اخلاص وللہیت کی روح پھونک دی، اور اس طرح مسلسل لگن وتڑپ کے ساتھ اپنے فریضہ کی انجام دہی میں مشغول رہے۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا شمار امت کے عظیم داعیوں، اور اسلام کے ہونہار فرزندوں اور لائق سپوتوں میں ہوتا ہے، آپ اپنے آفاقی فکر، عالمگیر نظریہ اور اعتدال پسندانہ موقف کی وجہ سے علم وعمل، فکر ونظر، اور عقیدہ وایمان کے جلیل منصب پر فائز تھے، اخلاص وللہیت، زہد واستغنار اور تعلق مع اللہ جیسے اعلیٰ اوصاف نے آپ کی زندگی میں مزید حسن ونکھار پیدا کر دیا تھا، اس لئے چشم فلک نے دیکھا کہ خدائے رحمان ورحیم نے آپ کو خلائق کے درمیان عام مقبولیت سے نوازا، اور ایک مثالی مؤمن اور آئیڈیل مسلم کا تاج آپ کے سر پر رکھا" ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ "۔ اقبال مرحوم نے سچ کہا تھا ؎

پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گرد راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

آپ کے کارناموں کا اعتراف

حضرت مولانا مرحوم کی جلیل القدر خدمات اور عظیم الشان کارناموں کو بہت سے اصحاب علم وارباب علم وقلم نے سراہا، اور انھیں اپنا موضوع سخن بنایا، لیکن سچ یہ ہے کہ مستقبل میں بھی پورا عالم آپ کی ان خدمات کا اعتراف کرتا رہے گا، سعودی عرب کے سابق وزیر اطلاعات جناب ڈاکٹر محمد عبدہ یمانی نے اپنے تعزیتی مضمون میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"شیخ ندویؒ کی پوری زندگی پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً ۸۰ سال کا طویل عرصہ آپ نے جہد مسلسل، سعی پیہم اور عالم اسلام ودیگر ممالک کے اسفار وسیاحت میں گذار دیا، حکمت وموعظت اور بصیرت کے ساتھ لوگوں تک اللہ عز وجل کا پیغام پہونچاتے رہے، خیر خواہی ونصیحت کے جذبہ سے سرشار ہو کر لوگوں کو اپنے مفید مشوروں سے نوازتے رہے اور علمار اسلام سے ہمیشہ تبادلۂ خیالات کرتے رہے، مشرق ومغرب، شمال وجنوب کے تمام مسلمانوں کے مسائل میں دلچسپی لے کر ان کا تعاون کرنا اسلامی، وعربی ممالک کی زیارت کر کے مسلمانوں کے احوال وکوائف کا سنجیدگی سے جائزہ لیتے رہنا اور انھیں اتحاد واتفاق کی دعوت دینا الفت ومحبت کا سبق پڑھانا آپ کی امتیازی خصوصیات سے گہرا تعلق رکھتا ہے، نیز ارباب حل وعقد سے ملاقاتیں کر کے انھیں قرآنی ہدایات کی طرف برابر متوجہ کرتے رہنا ایک عظیم وصف تھا جس کی نظیر عصر حاضر کے داعیوں اور علمار میں نہیں ملتی، یہ بلند درجات اور یہ اوصاف آپ کو محض آپ کے اخلاص وللہیت کی بنا پر حاصل ہوئے ؎

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار ورسن کہاں"۔

پیام انسانیت دعوت اسلامی کا ایک اہم پہلو

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ایمانی بصیرت اور روشن ضمیری سے اہل وطن کو اسلام سے قریب لانے اور ان تک اسلام کا پیغام پہونچانے کے لئے "پیام انسانیت" کے نام سے ایک دعوتی تحریک کی بنیاد ۱۹۵۵ء میں ڈالی تھی، اور اس کے حلقے کو حکمت وتدبر کے ساتھ برابر وسیع فرماتے رہے، ملک کے مختلف بڑے شہروں اور مرکزی مقامات پر اس کے جلسے کئے جاتے تھے اور اس میں غیر مسلم دانشوروں، اور تعلیم یافتہ طبقے کو خاص طور سے دعوت دی جاتی تھی اور عام جلسے کے علاوہ ان حضرات کی ایک خصوصی نشست بھی رکھی جاتی تھی جس کو حضرت مولانا خود خطاب فرماتے تھے اور دعوت کی حکمت کو پیش نظر رکھ کر ان کو بغیر کسی صراحت کے اسلام کی اعلیٰ اخلاقیات کی طرف متوجہ فرماتے تھے جس کا بے حد گہرا اثر پورے مجمع پر پڑتا تھا اور لوگ حضرت والا کی وطن دوستی، اور خدمت خلق اور انسانیت کے احترام کا جذبہ، جو ان کے اندر موجزن تھا، اس کا لوہا ماننے پر مجبور ہوتے تھے۔

ان کا خیال تھا کہ ہمارے ملک بلکہ تمام ممالک کے جملہ مسائل ومشکلات کا حل اسی بات میں مضمر ہے کہ ہم انسانیت کے اعلیٰ مقام کے سمجھنے کی کوشش کریں، اور انسان کی خدمت کے لئے اپنے دل میں زیادہ سے زیادہ گنجائش پیدا کریں اور عصبیت خواہ وہ کسی نوعیت کی ہو اس سے پرہیز کریں، مقصد یہ ہے کہ معاشرہ کے اندر اخلاقی حِس بیدار ہو اور اخلاقیات کی حکمرانی زندگی کے ہر شعبہ پر قائم ہو، یہی در اصل حل ہے ان تمام مسائل ومشکلات کا جس سے آج کی انسانی سوسائٹی دوچار ہے، اسی سے دلوں کے اندر جرائم سے نفرت پیدا ہو سکتی ہے اور کرپشن (CORRUPTION) جو تمام شعبہ ہائے زندگی کے اندر پیدا ہو گیا ہے اس کی بیخ کنی ہو سکتی ہے۔

الحمد للہ حضرت مولاناؒ کی یہ تحریک قائم ہے اور مخلصین کے ہاتھوں اس کا کام جاری ہے اور مستقبل میں انشاء اللہ تعالیٰ یہ تحریک

دعوت و اصلاح کے میدان میں ایک عظیم کردار ادا کرے گی اور اس کی افادیت کا اندازہ صحیح طور پر کیا جاسکے گا۔

اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے بے چینی

رہا یہ کہ مفکر اسلام رحمۃ اللہ علیہ کتنے علمی ادبی اور دعوتی اداروں کے بانی اور روح رواں تھے تو اس کے بیان کے لئے ایک دفتر نہیں بلکہ بہت سی ضخیم جلدیں درکار ہوں گی، اور حضرت مولانا کے اعلیٰ فکری اور دعوتی مقام کو واضح کرنے کی گنجائش پیدا ہو سکے گی۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ ہمہ گیریت اور جامعیت، یہ بصیرت و فراست، اور حکمت و قابلیت، یہ روشن ضمیری اور رسوخ ایمانی اور علمی، یہ توفیق عمل اور دل سوزی، اور اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لئے بے چینی اور تڑپ، اور عام مقبولیت اور پذیرائی، محض اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جو کسی انسان کے بس کا کام نہیں ہے ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

انسانیت

انسانیت کی ذات اس کائنات میں گوہر مقصود اور بیت الغزل کی حیثیت رکھتی ہے اور خلاق عالم کی نشانیوں میں سے سب سے بڑی نشانی ہے جسے اس نے بہترین صورت، مکمل سیرت اور عمدہ ترین ساخت عطا کی ہے۔

(حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ)

حضرت مولانا کی شہرہ آفاق کتاب
ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمين
(انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر)
کے
ناشرین اور ایڈیشن ایک نظر میں

نمبر شمار	ناشر کا نام	شہر	تعداد ایڈیشن	سنہ اشاعت
۱	لجنة التاليف والترجمة والنشر	القاهرة	ایک ایڈیشن	۱۹۵۰ء
۲	جماعة الازهر للتاليف والنشر	القاهرة	دوسرا ایڈیشن کل آٹھ ایڈیشن	۱۹۵۱ء ۱۹۵۱-۱۹۵۸ء
۳	مكتبة دار العروبة	القاهرة	کل سات ایڈیشن	۱۹۵۹ تا ۱۹۸۴ء
۴	مكتبة دار الكتاب العربي	القاهرة.بيروت	کل دس ایڈیشن	۱۹۵۱ تا ۱۹۸۴ء
۵	دار القلم	الكويت	کل چودہ ایڈیشن	۱۹۷۳ تا ۱۹۹۴ء
۶	دار المعارف	القاهرة	کل سات ایڈیشن	۱۹۶۹ تا ۱۹۸۸ء
۷	مكتبة نزار المصطفىٰ الباز	الرياض	ایک ایڈیشن	۱۹۹۷ء
۸	مطابع علي بن علي	الدوحة (قطر)	کل دس ایڈیشن	۱۹۶۵ تا ۱۹۷۴ء
۹	دار الجيل	بيروت	دو ایڈیشن	۱۹۹۰ تا ۱۹۹۴ء
۱۰	مكتبة السنة للدار السلفية (پاکٹ سائز)	القاهرة	تین ایڈیشن	۱۹۹۰-تا ۱۹۹۵ء
۱۱	مكتبة دار الإيمان	المنصورة (مصر)	ایک ایڈیشن	۱۹۹۵ء
۱۲	مجلس نشریات اسلام	کراچی	دو ایڈیشن	۱۹۸۵ تا ۱۹۹۴ء
۱۳	مجلس تحقیقات و نشریات اسلام	لکھنؤ	ایک ایڈیشن	۱۹۹۴ء
۱۴	دار القلم (لصاحبها محمد علي دولة)	دمشق - جده	ایک ایڈیشن	۱۹۹۹ء
۱۵	دار ابن كثير	دمشق - بيروت	ایک ایڈیشن	۱۹۹۹ء (کل ۷۹ ایڈیشن)

اصل عربی زبان کے علاوہ مندرجہ ذیل زبانوں میں کتاب پڑھی جا رہی ہے۔ اردو: لکھنؤ، کراچی، ترکی: استنبول، فارسی: قم، (ایران) ملیشین: کوالالمپور و جاکرتا، بنگالی: ڈھاکہ، انگلش: لکھنؤ، فرنچ: پیرس، روسی: ماسکو اردو میں دس، ترکی میں گیارہ اور ملیشین زبان میں آٹھ ایڈیشن نکلے ہیں۔

مدرسہ کا اصول: خدا کا شکر ہے کہ ہوا کے رُخ پر چلنا مدرسہ کا اصول نہیں۔ اگر مدرسہ کا یہ اصول ہوتا تو وہ کب کے انگریزی کے، عربی کے کالج بن چکے ہوتے، لیکن جو اس وقت چند گنے چنے مدرسے باقی ہیں وہ اس بات کا ثبوت دیتے ہیں کہ مدرسوں نے ہوا کے رُخ پر چلنے کو قبول نہیں کیا۔

(حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ)

سرمایۂ ملت کے پاسباں

مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہیدؒ

۲۲ رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ مطابق ۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ء بروز جمعہ عین نماز جمعہ کے وقت، روزہ کی حالت میں اور سورۂ یٰسین کی تلاوت کرتے ہوئے، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے صدرنشین، رابطہ عالم اسلامی کے تاسیسی رکن، مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند کے رکن، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کے صدر، مجلس انتظامی ومجلس عاملہ دارالمصنفین اعظم گڈھ کے سربراہ، عربی اکیڈمی دمشق کے رکن، مجلس شوریٰ مدینہ یونیورسٹی کے رکن، مجلس عاملہ مؤتمر عالمی اسلامی بیروت کے رکن، آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے صدر، رابطۃ الادب الاسلامی العالمیۃ کے صدر، مجلس انتظامی اسلامک سینٹر جنیوا کے رکن، اور وزیٹنگ پروفیسر مدینہ یونیورسٹی، آکسفورڈ سینٹر فار اسلامک اسٹڈیز آکسفورڈ یونیورسٹی کے صدر، عربی اردو میں بیسیوں کتابوں کے مصنف، عربیت کے امام، عالم اسلام کی عظیم علمی وروحانی شخصیت اور عظیم مفکر واسکالر، اقلیم علم کے تاجدار اور سرمایۂ ملت کے پاسبان حضرت اقدس مولانا سید ابوالحسن علی ندوی قدس سرہ رحلت فرماگئے اور عازم آخرت ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان للہ ما أخذ ولہ ما اعطی وکل عندہ باجل مسمی۔

راقم الحروف نے کئی سال قبل "میرے حضرت بنوریؒ کی چند حسین یادیں" کے عنوان سے ماہنامہ "اقرأ ڈائجسٹ" کے لئے لکھا تھا:

"حق تعالیٰ شانہ کے جو بے پایاں انعامات واحسانات اس ناکارہ کے شامل حال ہیں ان میں سے ایک عظیم انعام یہ ہے کہ اپنے مقبول ومحبوب بندوں کی محبت قلب میں ودیعت فرمائی اور ان سے ربط وتعلق نصیب فرمایا فالحمد للہ ولہ الشکر۔ ہمارے حضرت عارف باللہ ڈاکٹر عبدالحی عارفی نوراللہ مرقدہٗ یہ شعر کثرت سے پڑھا کرتے تھے:

گرچہ از نیکاں نیم لیکن بہ نیکاں بستہ ام
در ریاض آفرینش رشتۂ گلدستہ ام

چار بزرگوں کے ساتھ اس ناکارہ کو بچپن ہی سے عشق کی حد تک عقیدت ومحبت تھی:

حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہ، حضرت امام التبلیغ مولانا محمد یوسف الدہلوی نوراللہ مرقدہ، حضرت مولانا سید یوسف بنوری نوراللہ مرقدہ اور حضرت سلطان القلم مولانا مناظر احسن گیلانی نوراللہ مرقدہ۔"

(شخصیات وتاثرات ص ۱۳۲،۱۳۳)

مگر ہوش سنبھالنے کے بعد ان اکابر کے علاوہ پانچویں بزرگ، جن کے کمالات، علوم ومعارف فضل واحسان، ورع وتقویٰ، دعوت وعزیمت، حق گوئی وبے باکی، ملت اسلامیہ کی سربلندی کے لئے گھلنے اور پگھلنے سے میں زیادہ متاثر ہوا، جن کی خدمات پر بے حد رشک آیا اور جن سے غائبانہ عقیدت، محبت میں بدل گئی وہ حضرت اقدس مولانا سید ابوالحسن علی ندوی قدس سرہ کی جامع صفات اور ہمہ گیر شخصیت تھی۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی المعروف بہ علی میاں قدس سرہ کے کس کس گوشۂ حیات اور کمالات زندگی کو احاطۂ تحریر میں لایا جائے؟ اسے کس طرح شروع کیا جائے؟ اور کہاں سے شروع کیا جائے؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا، زبان وقلم اور الفاظ وحروف ساتھ نہیں دے رہے ہیں۔ حضرت مرحوم کی وفات کا سانحہ جہاں ہندو پاک کے مسلمانوں کے لئے ناقابل تلافی نقصان ہے۔ وہاں عرب وعجم اور شرق وغرب اور دنیائے اسلام کے مسلمان، اس صدمہ سے دوچار ہیں، حضرت مولانا علی میاں کی وفات سے ایک طرف اگر ان کے پسماندگان اور متعلقین غم زدہ ہیں، تو دوسری طرف ان کی وفات سے حجاز مقدس اور حرمین کے اکابر علماء اور ارباب اقتدار بھی اس صدمۂ جانکاہ کو سہارنے کی ہمت نہیں پاتے، چنانچہ شیخ محمد بن عبداللہ السبیل صدر شئون حرمین شریفین اور مسجد حرام کے خطیب وامام، اس سانحہ پر اپنے تعزیتی مکتوب میں لکھتے ہیں:۔

"محترم علماء کرام، گرامی قدر ذمہ داران ندوۃ العلماء اور ملت اسلامیہ ہند!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

شدید قلبی رنج واندوہ اور غم کے ساتھ عالم جلیل اور داعی عظیم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی وفات کی خبر ملی، اللہ تعالیٰ اس عظیم صدمہ کو جھیلنے کی سکت آپ اور ہم سب کو عطا فرمائے اور آپ تمام پسماندگان کو بیش از بیش اجر سے نوازے اور اس خسارے کی تلافی فرمائے، ہم آپ سے تعزیت کرتے وقت خود بھی تعزیت کے مستحق ہیں، بلکہ ساری

امت اسلامیہ سے تعزیت کی جانی چاہئے۔ حضرت مولانا کا سانحۂ وفات ایک زبردست حادثہ ہے اور شدید آزمائش ہے جس سے تمام مسلمانان عالم اس وقت دوچار ہیں۔ اس لئے کہ مولانا مرحوم نے دعوت الی اللہ اور جہاد فی سبیل اللہ کے لئے اپنی زبان و قلم اور جسم و جان کو وقف کر دیا تھا اور اس میدان میں ان کے کارنامے ناقابلِ فراموش ہیں، اللہ تعالیٰ ہمیں، آپ کو اور تمام برادران اسلام کو اس صدمہ جانکاہ کو سہارنے کی طاقت عطا کرے اور عالم اسلام کی اس محرومی کی تلافی فرمائے۔

ہم اس موقع پر آپ کو یہ اطلاع بھی دینا چاہیں گے کہ خادم الحرمین الشریفین فہد بن عبدالعزیز فرماں روائے مملکت سعودی عرب نے حرم کی ومدنی دونوں جگہ ۲۶ رمضان ۱۴۲۰ھ بروز دوشنبہ بعد نماز عشاء (یعنی ستائیسویں شب) حضرت مرحوم کے لئے غائبانہ نماز جنازہ ادا کرنے کا حکم صادر فرمایا ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ علامہ مرحوم کو اپنی رحمتوں سے ڈھانپ لے اور انھیں اپنے نیکوکار بندوں میں شامل فرمائے اور انھیں ابرار و اتقیاء، شہداء و صالحین کے ساتھ اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

آپ کا بھائی

محمد بن عبداللہ السبیل

صدر امور حرمین شریفین۔

امام و خطیب مسجد حرام، مکہ مکرمہ

(پندرہ روزہ تعمیر حیات لکھنؤ ۱۶ر رمضان تا ۳ر شوال ۱۴۲۰ھ)

حضرت مولانا علی میاں قدس سرہ تکیہ کلاں رائے بریلی انڈیا میں مشہور علمی شخصیت حضرت مولانا عبدالحی، صاحب نزہۃ الخواطر کے گھر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے گھر رائے بریلی میں اپنے والد ماجد اور بڑے بھائی جناب ڈاکٹر سید عبدالعلی سابق ناظم ندوۃ العلماء سے حاصل کی۔ اس کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور دارالعلوم دیوبند سے تکمیل ہوئی۔ قرآن کریم کی تفسیر امام الاولیاء حضرت مولانا احمد علی لاہوری قدس سرہ سے پڑھی، حضرت لاہوریؒ سے ہی بیعت ہو کر مجاز بیعت قرار دیئے گئے، بعد میں آپ نے قطب الاقطاب حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہ سے اصلاحی تعلق قائم فرمایا اور ان سے بھی خلافت و اجازت کی خلعت سے سرفراز ہوئے۔ علوم عالیہ و آلیہ کی تکمیل کے ساتھ آپ نے فن ادب عربی میں رسوخ حاصل کیا، برصغیر اور عالم اسلام کی ممتاز شخصیت جناب پروفیسر خلیل عرب سے آپ نے عربی پڑھی، اور اس میں اتنا کمال حاصل کیا کہ دنیائے عرب آپ کی فصاحت و بلاغت کا لوہا مانتی تھی۔ آپ کی تصانیف برصغیر پاک و ہند سے زیادہ بلاد عرب میں محبوب و مقبول تھیں۔ بقول ایک عرب دانشور کے کہ:

"اگر اس دور میں جاہلی شعراء اور ائمہ لغت عربی ہوتے تو وہ آپ کو سجدہ کرتے۔"

آپ عوام و خواص اور عرب و عجم کے امام اور محبوب تھے۔ آپ کی خدمات جلیلہ کے عوض سعودی عرب کی جانب سے آپ کو شاہ فیصل ایوارڈ دیا گیا، برونائی کے بادشاہ نے عالم اسلام کی عظیم شخصیت اور خدمات عالیہ کے عوض آپ کو اپنے ملک کا سب سے بڑا ایوارڈ دیا، اسی طرح دبئی حکومت کی طرف سے بھی سب سے بڑے ایوارڈ کا مستحق قرار دیا گیا، مگر ایوارڈوں سے حاصل ہونے والی لاکھوں ڈالر کی رقم حضرت مرحوم نے مجاہدین افغانستان اور دینی مدارس کو عطیہ کر دی۔

لیکن جہاں تک حضرت مرحوم کی ذات، ان کی اولوالعزمی اور مرتبہ و مقام کا تعلق ہے، وہ دنیا کے بڑے سے بڑے انعام اور ایوارڈ سے بالاتر تھے۔ جن دنوں سعودی حکومت نے حضرت اقدس کو ان کی خدمات کے اعتراف میں شاہ فیصل ایوارڈ دیا تھا، انھیں دنوں راقم الحروف نے ماہنامہ "بینات"، میں حضرت کی شخصیت سے متعلق جن تأثرات کا اظہار کیا تھا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسے یہاں نقل کر دیا جائے:۔

"سعودی حکومت کی جانب سے امسال "شاہ فیصل ایوارڈ" عالم اسلام کے مایہ ناز مفکر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی کو دیا گیا۔ سعودی حکومت کی طرف سے معارف پروری کا یہ اظہار لائق تحسین ہے اور اسلامی حکومتوں کے لئے لائق تقلید بھی۔ جہاں تک مولانا کی ذات گرامی کا تعلق ہے ان کی شخصیت دنیا کے کسی بڑے سے بڑے انعام سے بالاتر ہے۔ وہ اس قافلہ کے نمائندہ ہیں جو "اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ" کے فلسفے پر یقین رکھتا ہے اور جس کے نزدیک پوری دنیا مچھر کے پر کے برابر بھی قیمت نہیں رکھتی۔ اس لئے ہمارے نزدیک "شاہ فیصل ایوارڈ" سے حضرت کی عزت و وقار میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ بلکہ یہ اس ایوارڈ کے لئے باعث صد ناز ش ہے کہ مولانا نے اسے قبول فرما لیا۔

حق تعالیٰ شانہٗ نے حضرت مولانا کو محض اپنی عنایت و محبت سے، جن فطری خصائص و کمالات، جن ملکات حمیدہ

اور جذبات صالحہ، جس سوز وگداز اور دردِ دل، جس قلب صافی اور نفسِ مطمئنہ سے نوازا ہے اور ان کے سینۂ بے کینہ میں اسلام اور عالمِ اسلام کی سربلندی اور اصلاحِ امت کے لئے گھلنے اور پگھلنے کی جو دولت ودیعت فرمائی ہے اور پھر ان کی زبان وقلم سے اسلام کی پیغام رسانی کا جو کام لیا ہے اس کا اصل صلہ، اور بے حد و بے پایاں صلہ ان کو خدا تعالیٰ کے سوا کون دے سکتا ہے؟ اور وہ آخرت کے سوا کہاں مل سکتا ہے؟ تاہم "ثم یوضع لہ القبول فی الارض" کے مطابق دنیا میں جو مقبولیت و محبوبیت انھیں اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہے وہ اسی موہبت کا ایک ثمرہ ہے۔ حضرت مولانا نے مشرق و مغرب اور عرب و عجم میں مسلسل اسلام کی دعوت کا صور پھونکا ہے۔ اور وہ پوری انسانیت کو اسلام کے خوان پر جمع ہونے کی دعوت دے رہے ہیں۔ وہ ہمیں کبھی امریکہ و لندن پہونچ کر "مغرب سے صاف صاف باتیں" کرتے نظر آتے ہیں۔ کبھی قاہرہ میں "اسمعی یا مصر" کی اذان دیتے ہیں۔ اور کبھی اسمعوھا منی صریحۃ ایہا العرب" کے ذریعہ معدنِ اسلام (عرب) کے نمائندوں کے متقداؤں کو بیدار کرتے ہیں۔ کبھی انھیں "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" کی کہانی سناتے ہیں۔ کبھی انھیں "جس کا ایک رخ وجد آفریں ہے تو دوسرا خون افشاں" کبھی ان کے سامنے "تاریخ دعوت و عزیمت" کھول کر رکھتے ہیں۔ کبھی انھیں "اسلامیت و مغربیت کی کشمکش" کے ہولناک پہلوؤں سے آگاہ کرتے ہیں۔ کبھی انھیں آج کے نظریاتی قافلوں سے ہٹ کر "کاروانِ مدینہ" میں شامل ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ الغرض مولانا کی دعوت شرق و غرب، عرب و عجم اور افریقہ والیشیاء کی حد بندیوں سے بالاتر ہے، وہ پوری انسانیت کو، سسکتی بلکتی انسانیت کو، مادی زخموں سے چور چور انسانیت کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن سے وابستگی کی دعوت دیتے ہیں۔ سعودی حکومت اور دیگر اسلامی ممالک کی طرف سے مولانا موصوف کی دینی خدمات کی قدر دانی کا صحیح طریقہ یہ ہے وہ اس دعوت کو اپنائیں جو مولانا مدظلہ کی طرف سے مسلسل پیش کی جا رہی ہے، اور جس کے لئے ان کی پوری زندگی وقف ہے۔"

(شخصیات و تاثرات ص ۴۴۱، ۴۴۲)

حضرت مولانا علی میاں قدس سرہٗ کا اس ہیچمدان کے ساتھ نہایت مشفقانہ تعلق تھا، وہ اپنے چھوٹوں کے ساتھ ان کی حیثیت سے بڑھ کر اعزاز و اکرام کا معاملہ فرماتے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی حیات پر آپ کی عربی تصنیف "المرتضیٰ" شائع ہوئی، اپنے دستخطوں کے ساتھ جناب مولانا قاری سید رشید الحسن صاحب زید مجدہم کی وساطت سے ناکارہ کو بھجوائی اور فرمائش کی کہ اس پر بینات میں تبصرہ کیا جائے۔ راقم الحروف نے اس کو اول سے آخر تک مطالعہ کیا اور حضرت اقدس کو عریضہ لکھا کہ: اس کی تعریف میں کچھ کہنا "مادحِ خورشید مداحِ خود است" کا مصداق ہوگا، ماشاء اللہ کتاب میں بہت ہی اہم معلومات جمع ہو گئی ہیں اور نہایت الجھے ہوئے مضامین کو بہت ہی عمدہ اور سلجھے ہوئے انداز میں پیش فرمانا آنجناب ہی کے لائق تھا۔"

اس کے علاوہ غالباً طالب علمانہ اشکالات بھی پیش کئے، اس پر حضرت مرحوم نے اس ناکارہ کی جس طرح حوصلہ افزائی فرمائی، وہ میری سوچ و فکر سے کہیں زیادہ اونچی تھی، چنانچہ حضرت مرحوم نے اس خط کی رسید بھیجتے ہوئے لکھا:

"رائے بریلی

فاضل گرامی و محب سامی جناب مولانا محمد یوسف صاحب زیدت معالیکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ، گرامی نامہ مؤرخہ ۱۲ر جمادی الآخر کو، مجھے ایک طویل سفر کی وجہ سے تاخیر سے ملا، پڑھ کر بڑی مسرت ہوئی، یہ کتاب کی پہلی رسید ہی نہیں سند بھی ہے، میں آپ کی پسندیدگی کو قبولیت کی ایک علامت سمجھتا ہوں، دوسرا ایڈیشن پریس جا رہا ہے اس میں اہم تصحیحات اور بعض ترمیمات کر دی گئی ہیں جن سے توازن و اعتدال میں اضافہ ہو گیا ہے، ان شاء اللہ طباعت کے بعد کتاب ارسالِ خدمت کی جائے گی۔ بینات میں تعارف کا اشتیاق رہے گا، ڈاکٹر زاہد علی صاحب کی کتاب "ہمارا اسماعیلی مذہب اور اس کا طریقہ کار" نا قابلِ شائع کر کے آپ نے ایک اہم خدمت انجام دی ہے کتاب پہونچ گئی۔ میں نے "تاریخ دعوت و عزیمت" کے پہلے حصہ میں اس سے مدد لی تھی، اور اس کے اقتباسات پیش کئے تھے۔ کارڈ لکھنے کی معافی چاہتا ہوں اس لئے کہ اس کے جلد پہونچنے کی امید ہوتی ہے۔ والسلام

مخلص

ابوالحسن علی

۲۲ر فروری ۱۹۹۹ء"

حضرت کی وفات سے امت ایک عظیم رہبر

(باقی صفحہ ۳۱۸ پر)

ربانی امت

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نور اللہ مرقدہٗ

تحریر: علامہ ڈاکٹر یوسف القرضاوی ——— ترجمہ: مطیع الرحمن عوف ندوی

علمائے اسلام میں بڑی عظیم ہستیوں نے امسال داغ مفارقت دیا، اور رمضان المبارک کے اخیر عشرہ اور سب سے افضل دن جمعہ کے روز شمسی تاریخ کے آخری مہینہ میں جب کہ اکثر لوگوں کے نزدیک دوسرا ہزارہ ختم ہو رہا تھا، باوضو، نماز جمعہ سے قبل اسی کی تیاری کے انتظار میں اور حسب معمول سورۂ کہف کی تلاوت کرتے ہوئے عالم اسلام کی عظیم شخصیت، داعی الی اللہ و ربانی امت، علامہ دوراں، عربی النسل، حسنی النسب، ہندی نژاد شیخ الامت داعی الی الخیر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نور اللہ مرقدہ نے بھی اس جہان فانی کو الوداع کہا، ان کی شخصیت محتاج تعارف نہیں، اور نہ ہی ان چند صفحات پر ان کی زندگی کے کارناموں اور نقوش کو شمار کیا جا سکتا ہے۔

مشیت خداوندی سے بڑے بڑے اہل علم و فضل اور اصحاب افتاء اس سال ہم سے رخصت ہو گئے جن میں علامۃ الجزیرہ شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز، ادیب دانشور شیخ علی طنطاوی، عظیم فقیہ علامہ مصطفےٰ الزرقاء، اور محدث کبیر علامہ محمد ناصر الدین البانی جیسے اہم علماء یکے بعد دیگرے جدا ہوتے گئے پھر اس کاروان علم و فضل اور اس سنہری کڑی کا خاتمہ امام جلیل شیخ ابوالحسن علی ندوی پر ہوا۔

آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

میں نے ان شخصیات کی خصوصیات، اور ان کے شاندار نقوش کو امت تک پہونچانے کی کوشش کی، قطر کے ٹیلی ویژن پروگراموں، انٹر نیٹ اور دیگر مواصلاتی ذرائع اخبارات و رسائل کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم نے یہ فرض ادا کیا، یہ ہم پر ان کا حق تھا، اور نوجوان نسل کے لئے ضروری بھی تھا کہ وہ ان اکابر کی قدر و منزلت کو پہچانیں، اور انھوں نے اپنے دین و وطن کے لئے زندگی بھر جو قربانیاں پیش کی ہیں ان سے واقف ہو سکیں۔

اس کے پیش نظر ہم نے شیخ ندوی کی زندگی کے بارے میں جو کچھ اس سے قبل لکھا ہے ہم چند اقتباسات کے ساتھ اس موقع پر کچھ کہنا چاہیں گے۔

ہم اس امام ربانی، اسلامی، قرآنی اور محمدی شخصیت کے بارے میں اپنا درد دل کیوں نہ سنائیں، جبکہ وہ میرے بھائی، شیخ اور محبوب تھے۔

میں نے انھیں ربانی کہا، کیونکہ سلف کا اس پر اتفاق ہے کہ جو صاحب علم ہو، باعمل ہو، اسی کے ساتھ وہ لوگوں کو تعلیم بھی دیتا ہو تو وہ ربانی ہے۔ اور جو علم رکھتا ہے لیکن اس پر عمل نہیں کرتا وہ ربانی نہیں ہے، وہ علم بے مصرف و بے فائدہ ہے، جس سے حضورؐ نے پناہ مانگی ہے، اور فرمایا "اللھم انی اعوذ بك من علم لا ینفع و من قلب لا یخشع"۔ اور جس نے علم کے ساتھ ساتھ اس پر عمل تو کیا لیکن دوسرے کو اس کی تعلیم نہیں دی، اور اس کی جانب لوگوں کو بلایا نہیں، وہ بھی ربانی ہونے کا مستحق نہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، وَلٰكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ۔ اور جس نے اپنے علم پر عمل بھی کیا اور اس کی جانب دوسروں کی رہنمائی بھی کی، درحقیقت وہی ربانی ہے (وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِمَّنْ دَعَا إِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَقَالَ إِنَّنِي مِنَ الْمُسْلِمِينَ)۔

ربانیہ کا لفظ شیخ ابوالحسن نے تزکیہ و تصوف کی تعبیر و ادائیگی کے لئے استعمال کیا ہے۔ قرآن نے جسے تزکیہ کہا ہے، اور اس کو حضورؐ کے مشن اور احسان کا اہم شعبہ قرار دیا ہے جسے حضورؐ نے اس طرح بیان کیا ہے" ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراك" انھوں نے اپنی قیمتی کتاب "ربانیۃ لا رہبانیۃ" (اس کتاب کا اردو ترجمہ "تزکیہ و احسان" کے نام سے شائع ہوا ہے) میں اس لفظ کا استعمال کیا ہے جس سے انھوں نے خالصۃ لوجہ اللہ تصوف و سلوک مراد لیا ہے، جو تمام بدعات و خرافات اور عقائد و سلوک کے غلو سے پاک ہو۔

اس طرح انھیں" اسلامی" کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اسلام ہی ان کا گوشت پوست تھا، اور وہی ان کا اوڑھنا بچھونا، وہی اول و اعلیٰ اور مبتدا و منتہا تھا، اسی کے لئے وہ جیتے تھے اور اسی کے لئے مرنے کا حوصلہ رکھتے تھے، اور خدا ہی سے مدد چاہتے تھے اور اسی سے لو لگاتے تھے، غصہ بھی اس کے لئے ہوتے اور محبت بھی اس کی خاطر کرتے تھے تصنیف و تالیف کا کام بھی اسی دین کے غلبہ کے لئے کرتے تھے اور درس و محاضرہ کا مشغلہ بھی اسی کی خاطر اپناتے تھے، قیام و سفر کی

صحبت جھیلتے تھے، اور اسی کے لئے صلہ رحمی وقطع تعلق کرتے تھے، یہی ان کا رات دن کا مشغلہ اور زادِ سفر تھا۔ سچ یہ ہے کہ وہ اسلام ہی کے لئے جیتے تھے، اسی کے لئے تڑپتے اور مرتے تھے، اور اسلام ہی ان کی رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے تھا۔

جو چیز ان کے ذہن و دماغ میں سمائی رہتی تھی اور جس سے انھیں عشق تھا وہ اسلام ہی تھا، اس کا پیغام، اس کی تہذیب، اس کا عروج و بیداری، امت مسلمہ کے مسائل، معاندین اسلام کے حملے، یہی سب ان کی فکریں تھیں، اور ان سب سے زیادہ اہتمام تھا خارجی حملوں کے پیش نظر داخلی محاذ کی تقویت کا، یعنی فرد کی تربیت، اس لئے کہ یہ معاشرے کے اندر اس کی حیثیت بنیادی اینٹ کی ہے، یعنی نفس کی اصلاح و تربیت، اور اپنے اندر تغیر و تبدیلی، کیونکہ اسی سے قوموں کا عروج و زوال وابستہ ہے۔ إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ۔

میں نے مرد قرآنی اس لئے کہا کیونکہ قرآن مجید ہی ان کا اصل سرچشمہ تھا، اسی سے وہ مدد لیتے اور اسی کے عشق میں ڈوبے ہوئے تھے اس کی تلاوت کرتے، اور لطف اندوز ہوتے تھے، اس کی آغوش میں پناہ لیتے اور چلتے تھے، آیات کی تلاوت اور ان پر غور و فکر کرتے، اور اس کے لعل و جواہر ڈھونڈتے تھے، اس کے باریک معانی اور مفاہیم کو وہ اپنے محاضرات، کتابوں اور رسالوں میں ایک مفکرانہ و مدبرانہ فہم، اور ایک بے چین و متأثر دل کے ساتھ پیش کیا کرتے تھے، جس نے بھی ان کے محاضرات سنے یا کتابیں پڑھیں اس نے اس کا بارہا مشاہدہ کیا ہوگا اس طرح وہ صحیح معنوں میں ایک مرد قرآنی تھے۔

ان کے محمدی کہنے سے مراد صرف یہ نہیں ہے کہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسل اور ہاشمی حسنی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے، نہ جانے کتنے حسنی و حسینی ہیں جن کے کردار ان کے نسب کو مشتبہ کرتے ہیں، ومن بطأ به عمله لم يسرع به نسبه۔ جس کا عمل کوتاہ ہو نسب اس کو ایڑ نہیں لگا سکتا، میرا مطلب صاف صاف یہ ہے کہ انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے تمام طور وطریق، سلوک زندگی، اور طرز حیات میں اسوہ اور نمونہ بنایا تھا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہی کو اپنے لئے چراغ راہ اور روشنی کا مینار بنایا تھا، خواہ وہ زہد و تقوی، عبادت و ریاضت ہو یا زندگی کے جھمیلوں اور اس کی زیب و آسائش سے کنارہ کشی کا معاملہ، وہ اس دور میں بھی سلف کی زندگی گذارتے تھے، اور آج کل جس طرح لوگ مال و متاع، عیش و عشرت، اور زینت و آسائش کے دلدادہ ہوتے ہیں اس کا اہتمام کرتے ہیں وہ اس سے کوسوں دور تھے، انھیں دیکھ کر سلمان فارسیؓ اور ابو درداءؓ کا گمان گذرتا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ان کی گفتگو محض ایک محقق اور اسکالر کی گفتگو نہیں ہوتی تھی بلکہ ایک عاشق زار اور محب صادق کے دل سے نکلی ہوئی صدا ہوتی تھی، وہ محمد بن عبد اللہ کی نادر و ممتاز شخصیت سے عشق کرتے تھے، اس کی جھلک ان کی کتاب "السيرة النبوية" ہی نہیں بلکہ تمام کتابوں، محاضروں، اور گفتگو میں نمایاں طور پر ملتی ہے، اور یہ عشق و محبت اور وارفتگی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم زندگی سے سچی واقفیت اور ان کی سیرت کے جذب کرنے کی وجہ سے تھی، اور وہ ان کمالات و فضائل سے پورا فائدہ اٹھاتے تھے جن کو اللہ تعالی نے محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم میں جمع کر دیا ہے۔

علامہ کا پڑھا لکھا ہر معتقد اس بات سے بخوبی واقف ہے کہ وہ ایک عالمگیر شخصیت کے مالک تھے اگرچہ وہ ہندنژاد تھے اور ان کی پرورش و پرداخت یہیں ہوئی تھی لیکن وہ بین الاقوامی نقطۂ نظر کے حامل اور آفاقی مقاصد کے علمبردار تھے، وہ عالمی تحریکوں اور سرگرمیوں سے وابستہ تھے اگرچہ وہ خاص طور سے ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل و مشکلات میں شریک ہوتے اور اس کا غایت درجہ اہتمام کرتے تھے جیسا کہ عائلی قوانین کے سلسلے میں حکومت ہند کی جانب سے یکساں سول کوڈ کے نفاذ پر ان کا سخت رد عمل سامنے آیا لیکن ان کی یہ سرگرمیاں صرف برصغیر تک محدود نہیں تھیں بلکہ وہ سارے جہاں میں پھیلی ہوئی تھیں اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ عالم عربی میں شیخ کی شہرت ہندوستان سے کم نہ تھی، ہم ان کو اکثر اکیڈمیوں اور اداروں میں بحیثیت رکن شریک پاتے ہیں، جیسا کہ وہ رابطۂ عالم اسلامی کے رکن اساسی اور "المجلس العالمي الأعلى للمساجد"، مجلس المجمع الفقهي، المجمع الملكي لبحوث الحضارة الإسلامية (اردن) المجمع العلمي (دمشق) کے ممبر تھے، انھوں نے ہی آکسفورڈ یونیورسٹی میں اسلامک سینٹر کے قیام کے لئے تگ و دو کی تاکہ یہ سینٹر خالص مغربی یونیورسٹی میں اسلامی فکر کی اشاعت کا مرکز بنے، قیام سے لے کر آخر تک وہ اس کے چیئرمین رہے، اسی طرح انھوں نے اسلامی ادب کے لئے ایک عالمی منبر کی حیثیت سے رابطہ الادب الاسلامی کے قیام میں پیش قدمی کی اور اس کے بھی وہ تاحین حیات صدر رہے۔

جس نے شیخ کے محاضرات کو سنا اور

ان کے رسائل کو پڑھا ہے اور ان کے مخاطبین سے واقف ہے اس کے لئے ان کے عالمگیر ہونے کی تشریح کی ضرورت نہیں ان کے ان محاضرات میں "عربوں سے کچھ باتیں"، "مغرب سے صاف صاف باتیں" اور اسی طرح ان کی "اسمعیات" ہیں جنہیں محاضرات و رسائل کی شکل میں شیخ نے ایک مشفق داعی اور رہنما کی حیثیت سے بعض ملکوں میں پیش کیا مثلاً "اسمعی یا مصر اسمعی یا زہرۃ الصحراء (کویت) اسمعی یا ایران وغیرہ وغیرہ۔

میں نے انھیں بھائی اس لئے کہا کیوں کہ ہم دونوں کو اسلام کی اخوت ایک دوسرے سے مربوط کئے ہوئے ہے، جو ابنائے اسلام میں چھوٹے بڑے کو آپس میں مربوط کرتی ہے (انما المؤمنون اخوۃ) "المسلم أخ المسلم" اور "اخوۃ العلم" علم اور اہل علم کے درمیان ایک رشتہ ہے اسی طرح اخوۃ الدعوۃ ہے یعنی کار دعوت داعیوں کے درمیان رابطہ کی ایک چیز ہے، خواہ باہم جغرافیائی اعتبار سے ان میں کتنی ہی مسافت ہو، اسی طرح اخوۃ المحنۃ ہے، یعنی امت کی آزمائش میں برادرانہ شرکت، جس میں غفلت، علماء کے درمیان اختلافات اور دشمن کے حملوں کی تاب نہ رکھنا، حکمرانوں کا بگاڑ، عوام کی غفلت وغیرہ۔

میں نے ان سے بعض کتابیں پڑھی ہیں اور فائدہ اٹھایا ہے اور اپنی اکثر کتابوں میں ان کے حوالے دیئے ہیں اس طرح وہ میرے استاذ اور شیخ بھی ہوتے ہیں، ان کی ہر کتاب کا ایک الگ لطف ہے ان کی ایک متعین فکر ہے جو ہر جگہ نظر آتی ہے، معاصر داعیوں اور مفکروں میں کوئی نہیں نظر آتا جس نے شیخ کی کتابوں سے استفادہ نہ کیا ہو اور ان سے اقتباسات نہ لئے ہوں جیسے شہید محمد قطب داعئ اسلام شیخ محمد الغزالی، اسلامی ادیب وانشا پرداز شیخ علی طنطاوی وغیرہ۔

شیخ نے جب ۱۳۷۰ھ مطابق ۱۹۵۱ء میں مصر کا سفر کیا تو میں نے ان سے باقاعدہ استفادہ کیا اور ان کی شاگردی اختیار کی، اسی طرح بعد کی ملاقاتوں میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا سچ یہ ہے کہ شیخ اپنے حرکت و عمل، سکون و خاموشی اور گفتگو و مذاکرہ میں ایک آئیڈیل اور نمونہ کے انسان تھے۔

مجھے یاد ہے کہ جب انھوں نے تیس سال قبل قطر کا سفر کیا اور وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مالی وسائل کی کمی کی وجہ سے پریشان تھے، ان کے بعض دوستوں نے اہم شیوخ اور تاجروں سے ملاقات کی رائے دی کہ ہم ان سے ملیں، ان کے سامنے دارالعلوم کے مسائل رکھیں اور ان سے تعاون طلب کریں، تو انھوں نے فرمایا کہ ہم ہرگز ایسا نہیں کر سکتے، ہم نے پوچھا کیوں؟ تو انھوں نے فرمایا کہ یہ لوگ مریض ہیں ان کا مرض دنیا کی محبت ہے اور ہم ان کے معالج ہیں، آخر طبیب اپنے مریض کے آگے ہاتھ پھیلا کر کیسے ان کا علاج کر سکتا ہے، کیا وہ ان سے دنیا کی کوئی چیز مانگ کر ان کا علاج کرے گا۔ ہم نے ان سے کہا کہ آپ اپنے لئے تھوڑی مانگ رہے ہیں بلکہ آپ تو دارالعلوم اور اس کے اساتذہ وطلبہ کے لئے تعاون کے خواہاں ہیں، تاکہ وہ ادارہ اسی طرح علم کی روشنی پھیلانے میں گامزن رہے، اس پر انھوں نے فرمایا کہ یہ لوگ اس کا فرق نہیں کرتے، اور وہ ہمیشہ آپ ہی کو طالب اور دست سوال دراز کرنے والا سمجھتے رہیں گے۔

ایک بار ہم نے رمضان میں ان سے کہا کہ آپ آخری عشرہ تک ہمارے پاس ٹھہریئے ہم آپ کے ساتھ تعاون کا کام انجام دیں گے تو انھوں نے کہا کہ آخری عشرہ میں ہمارا ایک خاص معمول ہے جس کو ہم کسی بھی طرح سے چھوڑنا پسند نہیں کرتے، ہم اس موقع کو اپنے اور اپنے خدا کے لئے فارغ کر لیتے ہیں۔

اس سے ہمیں بخوبی معلوم ہو گیا کہ شیخ کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک خاص معاملہ ہے جس سے ان کو کوئی بھی سرگرمی باز نہیں رکھ سکتی، چنانچہ ہم نے اپنے اس ارادہ کو ترک کر دیا، ہم نے اس میں ان کی تقلید کی کوشش کی لیکن ناکام رہے، ہر چیز اسی کے لئے آسان ہوتی ہے جس کے لئے وہ بنائی گئی ہو۔

میں نے انھیں اپنا محبوب کہا، حقیقتاً مجھے ان سے محبت ہے اور امید ہے کہ یہ محبت خالص اللہ تعالیٰ کے لئے ہوگی میں نے ان سے ان کے اخلاص وللّٰہیت، یقین و توکل، کرب اور بیکلی، غیرت و حمیت، اعتدال و تواضع، اور ان کی فکر کی پاکیزگی، حسد اور کینہ سے دل کی صفائی، شرک و بت پرستی، بدعات و خرافات سے عقائد و عبادات کی سلامتی کی وجہ سے محبت کی، ان کی زبان طعن و تشنیع اور مداہنت سے پاک صاف تھی میں نے اہم مسائل میں ان کی مشغولیت، حقیقت پسندی، اثبات و تعمیر اور معیار و سطح کی بلندی و گہرائی کی وجہ سے ان سے محبت کی، میں نے ان سے ان کے پاکیزہ اخلاق، نرم روی، ان کی زندگی کے طور و طریق، مزاج کی شگفتگی و نرمی کی وجہ سے محبت کی۔ اور میں ان کی محبت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی قربت کا امیدوار ہوں اور مجھے توقع ہے کہ میرا حشر ان ہی کے ساتھ ہوگا۔ (مع الذين أنعم الله عليهم من النبيين الى آخر الآية)۔

بالکل ایسے ہی جیسے کسی شاعر نے کہا ہے:

أحب الصالحين ولست منهم
عسى ان انال بهم شفاعة

داکرہ من بضاعتہ المعاصی
وان کنا سواءً فی البضاعۃ

میں کوئی تنہا ہی شیخ کا عاشق نہیں ہوں بلکہ جو بھی ان سے واقف ہے اور ان کو قریب سے دیکھا یا پڑھا ہے اس نے ان سے محبت کی پھر اس کی قربت جس قدر بڑھتی گئی، محبت بھی بڑھتی گئی۔

علماء کے سلسلہ میں بہت سے لوگ اختلافات رکھتے ہیں لیکن شیخ ابوالحسن پر سب کا اتفاق ہے چاہے وہ ان کے ہم مشرب وہم مسلک ہوں یا نہ ہوں، ان کی جامعیت میں سب ایک ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کو جو خصوصیات وامتیازات عطا فرمائے ہیں بہت کم کسی میں ملیں گے (واللہ یختص برحمتہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم)۔

میں شیخ ابوالحسن کو چالیس سال سے جانتا ہوں جب انھوں نے ۱۳۷۰ھ مطابق ۱۹۵۱ء میں اپنے مختلف ممالک کے سفر میں پہلی بار مصر کا سفر کیا اس وقت میں کلیۃ اصول الدین میں طالب علم تھا اور تحریک اخوان المسلمین کا سرگرم کارکن، اور جامع ازہر کے اخوانی طلبہ کا ذمہ دار بھی، اس وقت میں المحلۃ الکبریٰ کی ایک مسجد میں خطیب بھی تھا۔

اور میں استاذ محترم احمد امین کی سربراہی میں قائم ادارہ لجنۃ التالیف والترجمۃ والنشر سے شائع شدہ کتاب ماذا خسر العالم .... کو پڑھ چکا تھا مجھ کو کتاب بہت پسند آئی میں نے اپنے بعض دوستوں سے اسے پڑھنے کے لئے بھی کہا جب کہ میں مصنف کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا اس کتاب پر استاذ احمد امین کا مقدمہ تھا لیکن وہ پھیکا تھا درحقیقت انھوں نے اس کا حق نہیں ادا کیا۔

لیکن یہ کتاب اسلامی نقطۂ نگاہ سے تاریخ اسلامی اور عالمی تاریخ کی نئی نئی راہیں کھولنے والی تھی، اور اس کتاب میں ایک مصلح ومجدد، داعی ومؤرخ کی دوراندیشی اور باریک بینی کارفرما تھی، جو تاریخ پر خاصی دسترس رکھتا ہو اور تاریخ کو اپنے مقاصد اور پیغام کے لئے کس طرح استعمال کرنا چاہئے اسے خوب پتہ ہو۔ اپنی اسی انفرادیت وامتیاز کی وجہ سے یہ کتاب مجھے بے حد پسند آئی۔

اس کتاب کی تصنیف میں مصنف کی انگریزی زبان سے واقفیت، تجزیاتی شعور، تہذیبی دعوتی اور اصلاحی وجدان نے بڑا تعاون کیا اور اپنی مخصوص صلاحیتوں کی وجہ سے ہی وہ اپنی ممتاز کتاب میں فکر ونظر کے نئے نئے دریچے کھول سکے۔

مصر میں ہندوستانی اساتذہ نے مجھ سے پوچھا کہ کیا آپ استاذ ابوالحسن الندوی کو جانتے ہیں میں نے برجستہ کہا کہ "ماذا خسر العالم" کے مصنف؟ ان لوگوں نے کہا کہ ہاں! میں نے کہا وہ کیسے ہیں؟ انھوں نے بتایا کہ وہ آج قاہرہ آرہے ہیں، میں نے ان سے شیخ ابوالحسن کی تشریف آوری پر اطلاع اور ملاقات کی آرزو ظاہر کی کہ ہم اس موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتے۔ چند دنوں کے بعد شیخ اپنے دو دوستوں اور ندوی بھائیوں کے ساتھ تشریف لائے جن میں ایک شیخ معین الندوی تھے، دوسرے کا نام یاد نہیں رہا۔

شیخ "موسکی" کی تنگ وتاریک گلیوں میں ایک بہت ہی معمولی حجرہ میں ٹھہرے اس لئے کہ وہ نہ تو ہوٹل میں ٹھہر سکتے تھے اور نہ ہی وہ باوجود قدرت کے اس کو پسند کرتے تھے وہ تو سعودی عرب میں رابطہ کے جلسوں میں ان ہوٹلوں کو چھوڑ دیا کرتے تھے جن میں مہمانوں کو ٹھہرایا جاتا تھا جبکہ وہ فرسٹ کلاس کے ہوٹل ہوا کرتے تھے اور وہ اپنے بعض دوستوں کے پاس ٹھہر جایا کرتے تھے اسی طرح وہ اھل ثروت اور مالداروں کے پاس بحیثیت مہمان قیام کو قبول نہیں کرتے تھے چاہے وہ ان کے مال میں شبہ کی وجہ سے ہو یا ان کے گراں بار ہونے کے خدشے سے، جب شیخ نے مصر کا سفر کیا تو وہ جوان تھے ان کی سیاہ داڑھی، روشن چہرہ، بلند عزم وہمت، ایمانی روح اور بھڑکنے والی غیرت وحمیت، ان کا امتیاز تھی ان کے اندر جوانوں کا جوش اور بوڑھوں کی حکمت و دانائی بھری ہوئی تھی، وہ مثبت عالمی فکر اور بیک وقت باغیرت اور مومن دل سے آراستہ و پیراستہ تھے۔

میں اپنے رفیق اور دوست اور بھائی محمد الامر داش مرادؒ کے ساتھ شیخ کی رہائشگاہ پر ملاقات کے لئے گیا اور ہم نے ان کو اپنے گھر واقع شبرا میں دعوت دی تاکہ وہاں ازہر کے بعض اخوانی نوجوان جو دعوت کے کام میں سرگرم عمل تھے ملاقات کرائیں۔ ہم نے ان کو ایک خاص موقع پر دعوت دی جس میں اخوانی نوجوان رات میں تعلیم وتعلم اور عبادت وریاضت کے لئے جمع ہوتے تھے شیخ ہم سے معلومات حاصل کرنے کے زیادہ خواہش مند تھے، وہ ہم سے حسن البنا شہیدؒ کی زندگی ان کے کلام، ان کے طرز حیات اور مختلف امور میں ان کے طریقۂ کار کے بارے میں دریافت کرتے رہے، حسن البناء واقعتاً ایک امام ربانی تھے وہ اسلامی حکومت کا مطالبہ کرنے والے محض ایک لیڈر نہیں تھے بلکہ وہ ان سب سے پہلے ایک مربی تھے اور مسلمانوں کی نئی نسل کی ایسی تربیت کرنا چاہتے تھے جن کا اسلام پر کلی ایمان واعتماد ہو، جو اس

کی تعلیمات پر کاربند ہوں اور اس کے راستہ میں دعوت وجہاد کے لئے ہمہ وقت تیار رہیں۔

ہماری ان سے کئی ملاقاتیں رہیں اور ہم اسلام کے نوجوان داعی ہمارے ساتھی احمد العسال اور بھائی امرداش وغیرہ شریک کار تھے، مصر میں شیخ ابوالحسنؒ کا زمانہ بہت ہی مبارک اور فائدہ مند گذرا کوئی بھی دن محاضرہ یا کسی خاص درس یا کسی خاص ملاقات سے خالی نہیں جاتا تھا۔ انھوں نے دارالشبان المسلمین میں "المسلمون علی مفترق الطرق" (مسلمان دوراہے پر) کے عنوان سے ایک محاضرہ پیش کیا اور دارالعلوم کالج میں محمد اقبال شاعر الاسلامی فی الہند (ہندوستان کے اسلامی شاعر علامہ اقبال) کے عنوان سے لکچر دیا، اس موضوع سے شیخ کو خاص مناسبت اور دلچسپی رہی، بیشمار اشعار یاد تھے اور روائع اقبال (نقوش اقبال) کے نام سے ایک کتاب بھی تصنیف کی۔

شیخ نے قاہرہ میں بہت سے عالموں، داعیوں اور مفکروں سے ملاقاتیں کیں اور انھوں نے وہاں سے واپسی کے بعد "مذکرات سائح فی الشرق العربی (مشرق اوسط کی ڈائری) میں ان تمام شخصیات سے ملاقات اور گفتگو کو جمع کر دیا، وہاں انھوں نے مشہور ادیب وناقد سید قطب شہیدؒ سے ملاقات کی، سید قطبؒ مولانا سے بہت متاثر ہوئے اور ان کی کتاب "ماذا خسر العالم" کے لئے ایک دوسرا مقدمہ تحریر کیا، جس میں کتاب اور صاحب کتاب کا پورا پورا حق ادا کر دیا، وہاں انھوں نے شیخ محمد الغزالی سے کئی بار ملاقات کی اور وہ ان کے بعض دعوتی اسفار میں شریک بھی رہے دونوں نے ایک دوسرے کو بہت پسند کیا، شیخ نے اپنی ڈائری میں اس کا تذکرہ کیا ہے، مجھ کو یاد ہے کہ شیخ ندوی اپنے بعض دعوتی واسلامی لٹریچر کو اپنے ساتھ لے گئے تھے ان تمام رسالوں میں بہت بڑے جوش وجذبہ کے ساتھ، بلند افکار اور صاف ستھری باتیں ادبی چاشنی اور وجدان کے ساتھ اور روحانی احساس اور گہرائی کے ساتھ پیش کی گئی تھیں۔

مجھے یاد ہے کہ شیخ غزالی نے ان رسالوں کو پڑھا اس میں دو رسالے ایک "من العالم الی جزیرۃ العرب" اور دوسرا "من جزیرۃ العرب الی العالم" تھا، ان دونوں رسالوں میں شیخ نے یہ لکھا تھا کہ آج اس وقت دنیا جزیرۃ العرب سے ہدایت اور دین حق کی کتنی محتاج ومنتظر ہے اور جزیرۃ العرب نے اس سے پہلے دنیا کو کیا عطا کیا ہے۔

ہم نے شیخ کے رسالوں میں ایک نئی زبان اور ایک تازہ روح پائی اس سے ہمارے ذہن ودماغ کے دریچے کھلے، پہلے ہم ان تمام چیزوں سے صرف نظر کئے ہوئے تھے شیخ کے رسالوں ہی نے رستم کے دربار میں ربعی ابن عامر کے موقف کی طرف اور ان کے بلیغ کلمات کی طرف ہم کو متوجہ کیا جس میں انھوں نے چند جملہ میں اسلام کے فلسفہ کو پیش کر دیا ہے اور بہت ہی خوشگوار ایجاز اور فصیح وبلیغ اسلوب کے ساتھ اپنے مقاصد کو اجاگر کیا ہے ان اللہ ابتعثنا لنخرج الناس..... شیخ ابوالحسن الندویؒ میرے علم کے مطابق وہ پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے اس قیمتی موقف اور ان کلمات سے ہم کو باخبر کیا اس کے بعد دیگر مصنفین نے ان کو نقل کیا اور یہ اقتباس پوری دنیا میں رائج ہو گیا۔

شیخ نے ہمارے استاد بہی الخولی سے ملاقات کی استاد البہی ان سے بہت متأثر ہوئے اور اپنے رسالہ میں اس تأثر کا اظہار کیا، اسی طرح شیخ نے صالح العشماوی اور دوسرے اخوانی قائدین سے ملاقاتیں کیں، ان کے ساتھ بیٹھے گفتگو کی، اور اس کے بعد اپنے ایک رسالہ میں اس کو نشر کیا، جس کا عنوان تھا" أریدأن أتحدث الی الاخوان" انھوں نے علامہ ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ سے بھی ملاقات کی جنہوں نے آپ کی کتاب " ماذا خسر العالم" پر مقدمہ لکھا ہے۔

نیز انھوں نے داعی وادیب شیخ احمد الشرباصی سے بھی ملاقات کی جنہوں نے ماذا خسر کے شروع میں مصنف کتاب کی زندگی سے متعلق ایک انٹرویو شائع کیا ہے، اس میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ ان کو مصر میں سب سے تعجب خیز چیز کیا نظر آئی؟ انھوں نے جواب دیا کہ سب سے عجیب چیز مجھے علماء کی بے ریشی نظر آئی، جس نے اپنی زندگی دوطن میں کسی عالم کو بے ریش نہ دیکھا ہو اس کے لئے یہ بڑی تعجب خیز بات ہے ہمارے نزدیک یہ انگریزوں کا طرز وشعار ہے، یا پھر جو لوگ بے دین ہوتے ہیں ان کا، لیکن یہ علماء کا عام شعار بن جانا، عجیب معلوم ہوتا ہے، یہ بھی عجیب بات ہے کہ بعض لوگ ازہر کی قدیم روایات کو واپس لانا چاہتے ہیں، اور وہ دوبارہ عمامہ پہننے کو لازم قرار دینے کے موڈ میں ہیں، یہ خالص تقلید ہے، انھیں داڑھی کی طرف توجہ کرنی چاہئے، جو ایک اسلامی شعار وسنت رسولؐ ہے۔

شیخ نے اتنے طویل وعریض شہر قاہرہ ہی تک اپنی سرگرمیوں کو محدود نہیں رکھا، بلکہ وہ دوسرے علاقوں میں بھی تشریف لے گئے، وہاں لوگوں نے ان کی تقریریں سنیں اور عام مسلمانوں نے ملاقاتیں کیں۔

انہی شہروں میں المحلۃ الکبریٰ بھی ہے، جس کی ایک مسجد میں میں خطبہ دیا کرتا تھا، وہاں

ڈاکٹر محمد سعید صدر الجمعیۃ الشرعیہ نے انھیں مدعو کیا تھا، وہ دانتوں کے ایک ماہر ڈاکٹر ہیں اور اپنی پوری زندگی احیاء سنت کے لئے وقف کئے ہوئے ہیں۔ شیخ سمجھ گئے کہ ان کے اور اخوان کے درمیان کچھ نا اتفاقی ہے، کیونکہ ڈاکٹر صاحب شیخ سے اخوان کے نوجوانوں کی شکایت کرتے تھے کہ وہ ان کی طرح داڑھی نہیں رکھتے، مونچھ نہیں ترشواتے، ترک عمامہ کے عادی ہیں، اور نماز میں خشوع وخضوع کا خیال نہیں کرتے، شیخ نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ اخوان کی دعوت عام دعوت ہے، اس کا مشن یہ ہے کہ عام لوگ اسلام کے بنیادی اصولوں پر جمع ہو جائیں۔ اس کے بعد ان کی خاص آداب کی بتدریج تربیت ہوتی رہے، اس لئے امت کے اندر دو طرح کے نہج کا موجود ہونا ضروری ہے، ایک اخوان کا عام منہج وطریقہ، اور دوسرا خاص نہج، جیسا کہ جمعیۃ کا ہے، ڈاکٹر صاحب کو شیخ کی بات سمجھ میں آئی اور انھوں نے ان کے ساتھ مجھے بھی کھانے پر مدعو کیا۔

لیکن جلد ہی بات آئی گئی ہو گئی، اور جب وہ شیخ کے ساتھ مقام "تبردہ" گئے اور میں نے کچھ بات کی تو ڈاکٹر سعید صاحب غصہ ہو گئے، میں کچھ بھی نہ سمجھ سکا کہ وہ کیوں غصہ ہوئے؟ لیکن شیخ نے بڑی حکمت کے ساتھ معاملہ کو نمٹا دیا اور لوگوں نے مسجد میں قیام لیل کے ساتھ رات گذاری، اور شیخ کی دعوت پر بہت سے لوگ اس میں حاضر ہوئے۔

مصر کا یہ سفر ان سے میری پہلی ملاقات و تعارف کا ذریعہ بنا، اس کے بعد یہ ربط دن بدن بڑھتا گیا، اور ایک لمحہ ایسا بھی آیا جب شیخ کی خیریت واحوال کا یہ سلسلہ بند ہو گیا۔ اور یہ انقلاب جولائی کے بعد ہوا جب اخوان پر پابندی عائد کر دی گئی، اور ہم لوگوں کو جیل کی سلاخوں میں ڈال دیا گیا۔ اور مصر پر تیسرے بیرونی حملے کی وجہ سے حکومت کو ہم سے مدد لینے پر مجبور ہونا پڑا، اور شیخ ندوی اور علامہ مودودی کو مصری بغاوت اور جمال عبدالناصر کے مخالفین کے دشمنوں میں شمار کیا گیا، اسی وجہ سے جب الازہر میں مجمع البحوث الاسلامیہ کے قیام کا قانون پاس ہوا جس میں عالم اسلام کے بڑے بڑے علماء کو شامل کیا جانا تھا تو اس میں ان دونوں حضرات کے نام کو شامل نہیں کیا گیا، جب کہ یہ لوگ اس کے خاص نمائندے اور مستحقین تھے، اور دونوں علمی اور عالمی حیثیت ومقام کے حامل تھے۔

اس کے بعد کچھ ایسے حالات ہوئے کہ شیخ کے سفر مصر (۱۹۵۱ء) کے دس سال بعد مجھے قطر جانا پڑا، اور دوحہ آنے کے تقریباً چھ سات ماہ بعد شیخ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا، یہ ملاقات پچھلی یادوں اور تعلقات کی تجدید تھی، جس کا ہم اس سے پہلے ذکر کر چکے ہیں۔

اس کے بعد شیخ کی کتابوں اور رسائل ومحاضرات کے ذریعہ میں ان سے وابستہ رہا، اسی طرح "البعث الاسلامی" جو ہندوستان میں اسلامی دعوت کا ترجمان تھا اور شیخ کے دو شریف النفس اور داعی شاگرد استاذ محمد الحسنی مرحوم اور الاستاذ سعید الاعظمی (بارک اللہ فی عمرہ ونفعہ) نکالتے تھے، اس رسالہ سے ہم شیخ کے مضامین، محاضروں یا اسی طرح مفید چیزوں سے مستفید ہوتے تھے جن سے ان کا کوئی بھی شمارہ خالی نہ جاتا تھا۔

اس دوران شیخ کی جو اہم کتابیں شائع ہوئیں وہ یہ ہیں:

رجال الفکر والدعوۃ فی الاسلام (تاریخ دعوت وعزیمت) جلد اول، یہ کتاب اپنے موضوع پر منفرد شمار کی جاتی ہے۔

یہ کتاب اصلاً ایسے محاضرات پر مشتمل ہے جس میں ہر دور کے مجدد دین اسلام کا تذکرہ ہے اور جنہیں شیخ نے دمشق کے کلیۃ اللغۃ کے طلبہ کے سامنے اس کے ذمہ دار داعی و فقیہ ڈاکٹر مصطفی السباعی کی دعوت پر پیش کیا تھا۔

شیخ ندوی نے یہ ایک بہت عمدہ چیز تیار کی، اور اس میں اسلامی تاریخ اور اس کے مختلف ادوار سے شیخ کو گہری واقفیت کا پتہ چلتا ہے، پھر مجدد دین اسلام کے کارناموں امت کے اندر اس کے اثرات، اور ہر مجدد کے آنے کا ایک خاص وقت کہ جب اس کی سخت ضرورت تھی کہ ان کی خصوصیات ایسی تھیں کہ اس ضرورت کو وہی پورا کر سکتے تھے، شیخ کو ان تمام امور پر خاص درک حاصل تھا۔

اس جلد کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا، اور ان میں شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ، حضرت مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ دہلوی، امام احمد بن عرفان الشہید، اور امیر المومنین حضرت علی (المرتضیٰ) وغیرہ کی سوانح شامل ہے، اس دوران جو بعض دوسری کتابیں منظر عام پر آئیں ان میں "الصراع بین الفکرۃ الاسلامیۃ والفکرۃ الغربیۃ" (اسلامیت ومغربیت کی کشمکش) اس میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ مغربی فکر کس طرح مسلمانوں کے اندر داخل ہوئی، اور اس نے اسلامی فکر کو پیچھے کر دیا، جب کہ وہ ان ممالک کی پروردہ اور مستحق عنایت تھی، اور اس میں واضح کیا کہ کس طرح اسلامی فکر کے اثرات رفتہ رفتہ ختم ختم ہوتے گئے پھر اللہ تعالیٰ نے اسلامی فکر کے مجددوں کو بھیجا جنہوں نے اس کو زندہ کیا اور

اس کا اصل مقام دلایا۔

انھیں تصنیفات میں "الارکان الاربعہ" بھی ہے، جس میں عبادات کے موضوع پر بحث کی گئی ہے، دل اور عقل کو بیک وقت خطاب کرنے والے ایک مفکر ادیب و داعی کی زبان سے ارکان اسلام پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے

انھیں میں ایک کتاب "ربانیۃ لا رہبانیۃ" ہے، جس میں اسلام کے روحانی پہلو پر گفتگو ہے، حلول اور وحدۃ الوجود، اور دیگر غالی صوفیاء کے طریق نہیں بلکہ کتاب وسنت کے پیرو ایک مسلمان کی طرح گفتگو کی گئی ہے، جو عارف باللہ ہو اور روحانی تجربات سے بہرہ ور ہو۔ اس کتاب نے امت کے لئے لعل وگوہر کا ایک خزینہ بکھیر دیا ہے، اور اس میں کانوں کو مانوس اور بشارت دینے والی اصطلاحات ومضامین کا استعمال کیا گیا ہے۔

اس کے بعد بھی شیخ کی بیشتر کتابیں منظر شہود پر آئیں جنہیں ہر مقام پر قبول عام حاصل ہوا۔

میں لکھنؤ کی اپنی اس ملاقات کو نہیں بھلا سکتا جو دار العلوم ندوۃ العلماء میں شیخ سے ہوئی، اس وقت شیخ نے ندوہ کے قیام کے پچاسی سالہ جشن پر مجھے دعوت دی تھی، اور شیخ کی دعوت کو بے شمار علماء نے قبول کیا تھا، اور مختلف ملکوں سے لوگ تشریف لائے تھے جن میں شیخ عبد الحلیم محمود شیخ الجامع الازہر بھی تھے جن کو شیخ نے اس جشن کا صدر بنایا تھا، ان کے ساتھ ڈاکٹر احمد حسین الازہری وزیر اوقاف مصر بھی اس وقت موجود تھے، اور امارات کے چیف جسٹس شیخ احمد عبد العزیز المبارک، حکومت قطر میں تربیت کے وزیر شیخ عبد اللہ ابراہیم الانصاری، حکومت شارقہ میں امور دینیہ کے صدر شیخ عبد العلی المحمود، اور شیخ عبد المعز عبد الستار، مدیر توجیہ العلوم الشرعیہ، اور سعودی عرب اور خلیجی ممالک کے بہت سے علماء شریک تھے۔

ندوۃ العلماء کی آغوش میں ہمارے یہ ایام بہت ہی خوشگوار گذر رہے تھے، اور یہ جشن بہت ہی شاندار ویادگار تھا، اس میں ہزاروں ہزار کی تعداد میں مسلمان اور ہندو شریک ہوئے اور مہمانوں نے شیخ ندوی کے اعزاز واکرام کے سایہ میں یہاں کے خوشگوار لمحات گذارے، یہاں تک کہ برادرم محمد المہدی البدری کو یہ کہنا پڑا کہ شیخ نے ہماری ضیافت میں کوئی کسر نہ چھوڑی اور ہر طرح سے آرام پہونچانے اور بے پناہ اکرام میں نظیر قائم کر دی۔

اس جشن میں فوٹو گرافر تصویر کھینچنے آئے تو شیخ نے کہا کہ اگرچہ ہم تصویر کے خلاف ہیں، لیکن آج اپنے ان عرب مہمانوں کے اکرام میں ہم اس کی اجازت دیتے ہیں جو تصویر میں کوئی حرج نہیں سمجھتے۔

شیخ نے ایک بار مجھ سے فرمایا تھا کہ آپ کی گفتگو وبیان میں ایک روح ہے، اور ایک خاص حرارت پائی جاتی ہے اور اس کا ترجمہ نہیں کیا جاسکتا، اس لئے کہ مترجم افکار ومعانی کو نقل کرتا ہے وہ بات کی روح اور اس کی حرارت کی ترجمانی نہیں کرسکتا، یا پھر آپ کی طرح قادر الکلام اور حرارت وروح رکھنے والا ہو۔

لیکن دار المصنفین اعظم گڑھ میں مجھے ایسا مترجم ہاتھ لگ گیا، یعنی شیخ کے خاندان کے ایک شیریں گفتار اور جادو بیان نوجوان مولانا سلمان ندوی، انھوں نے "مستشرقین پر سمینار" میں میری تقریر کا ترجمہ کیا، تو شیخ نے اس پر کہا کہ الحمد للہ، سلمان نے بیک وقت روح اور معنیٰ دونوں کی ترجمانی کی ہے۔

ہم نے ندوۃ العلماء اور اس کے دار العلوم کو بہت قریب سے دیکھا ہے، جس کے دیکھنے سے قبل ہمارے ذہن ودماغ آشنا اور مشتاق دیدار تھے، "والاذن تعشق قبل العین أحیانا" چنانچہ جب ہم نے اس کو اپنی نگاہوں سے دیکھا اور وہاں چند ساعتیں گذاریں تو اس کو اس سے بہتر پایا جیسا سنا تھا، اور ہم قدیم شاعر کے اشعار گنگنانے پر مجبور ہوئے۔

كانت محادثة الركبان تخبرنا
عن جعفر بن رباح اطيب الخبر
حتى التقينا، فلا والله ماسمعت
اذنى باحسن مما قد رأى بصري!

گذرنے والے قافلے مجھے جعفر بن رباح کے سلسلہ میں بہت اچھی اچھی باتیں بتایا کرتے تھے۔ اور جب ان سے ملاقات ہوئی تو خدا کی قسم میری نگاہوں نے ان کے بارے میں جو کچھ سنا تھا ان کو اس سے بہتر پایا۔

دار العلوم ندوۃ العلماء ایسی جگہ ہے جہاں آکر شعراء وادباء بے ساختہ نغمہ سنج ہو جاتے ہیں، اور علماء اور داعی جس کی تعریف وتحسین میں رطب اللسان نظر آتے ہیں، علامہ علی طنطاوی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ کاش میں بچپن کی عمر میں دوبارہ پہونچ جاتا اور اس ادارہ میں تعلیم حاصل کرتا، یہاں کے اساتذہ کی شاگردی وصحبت کے لطف لیتا، اور طلبہ کا رفیق بنتا، یہاں کی چہار دیواری میں سانس لیتا اور یہاں سے علم وایمان کی دولت حاصل کرتا۔ انھوں نے مزید کہا کہ ندوۃ العلماء نے قدیم نافع اور جدید صالح سے استفادہ کو اپنا شعار بنایا ہے، اور مستحکم ایمان اور وسیع علم کے درمیان ہم آہنگی اس کا خاص مقصد ہے، نیز اپنے عزائم ومقاصد پر پامردی وثبات، اور اس کے وسائل وذرائع، آلات کی فراہمی، قدیم

ورثہ سے مفید چیزوں کو اپنانا، غیر ضروری چیزوں کو چھوڑنا اس کا خاص امتیاز ہے۔

عالم اسلام میں بھی بنیادی نظام تعلیم میں اصل دشواری یہ تھی کہ وہ دو متضاد بنیادوں پر قائم تھا، اس میں بھی ایک قدیم ورثہ کی نمائندگی کرنے والا اور جدید چیزوں سے صرف نظر کرنے والا گروہ تھا، دوسرا جدید چیزوں کو اس کے رجحانات، معارف اور مادی و کیمونل نظریات کے ساتھ اس کو من وعن قبول کرنے والا تھا، وہ قدیم اقدار و روایات اور عقائد ومسلمات کا صاف منکر تھا، ان میں یہ قدیم طبقہ اس بات کا قائل تھا کہ قدماء نے جو کچھ چھوڑا ہے اس سے بہتر لانے کا امکان نہیں ہے، اس لئے نہ تو اجتہاد کی ضرورت ہے، اور نہ ہی ادب میں نئے گوشے تلاش کرنے کی، اور نئی نئی ایجادات و اختراعات میں سر کھپانے کی، اور نہ ہی دین و زندگی میں کسی تجدد کی ضرورت ہے ان کے بالمقابل تجدید پسند طبقہ تھا، جس کی خواہش تھی کہ ہر چیز کو بدل کر رکھ دیا جائے انھیں کے بارے میں اقبال نے کہا تھا کہ تم کعبہ کو تو نیا نہیں کر سکتے، اور ان کے بارے میں رافعی نے کہا کہ وہ بیک وقت دین و زبان اور چاند سورج سب کچھ بدل ڈالنے کے آرزومند ہیں۔

اس موقع پر ندوۃ العلماء ہی کا یہ سب سے بڑا کارنامہ، اور سب سے اہم قدم تھا جس نے دونوں انتہاؤں کے مابین انسجام و ہم آہنگی اور رابطہ کا کام انجام دیا، اور ہر ایک کو دوسرے سے فائدہ اٹھانے کی جانب ابھارا۔ اس طرح ندوۃ العلماء کی کوششوں سے قدیم وجدید طبقہ کے مابین کشمکش کا خاتمہ ہوا، اور بنیاد پرستی و تجدد پسندی کا قلع قمع ہوا، جیسا کہ آج کہا جاتا ہے کہ اس نے امتزاج و ہم آہنگی اور اعتدال و توازن کے شعار کو بلند کیا۔

یہ ندوۃ العلماء کی خوش نصیبی رہی ہے کہ اس کو روز اول سے مردان کار ملتے رہے، جنہوں نے اس کے مشن اور کاز کو پائیداری و مضبوطی عطا کی، وہ علم وفکر کے میدان میں کوہ ہمالہ جیسے طویل القامت تھے، دین و اخلاق، عزیمت و دعوت میں سرو کی طرح بلند قد والے تھے، اس سنہری کڑی میں علامہ شبلیؒ، علامہ سید سلیمان ندویؒ، علامہ عبدالحی حسنیؒ جیسے گوہر نایاب رہے اور سب کے سب علم و فکر کی بلند و بالا چوٹیوں کی طرح تھے۔

ان تمام اہم ہستیوں نے اپنے اساتذہ سے کسب فیض کیا، ان کی روح کو اپنے اندر جاگزیں کیا، اور ان کے اخلاق و کردار سے خود کو بنایا سنوارا اور انہیں کے طریقے پر زندگی بسر کی، اس لئے اللہ تعالی نے ان کے ذریعہ ندوۃ العلماء میں ایک ممتاز ایمانی و علمی ماحول و فضا کو قائم کر دیا اس جیسا خوشگوار ماحول کہیں دوسرے ادارہ میں نہیں ملتا، اور یہاں کی طرح معلم کی بات سننے والا، اس سے محبت کرنے والا، اور اس کے پیغام پر یقین رکھنے والا کسی دوسری جگہ نہیں ملتا۔

دوسرے اداروں اور یونیورسٹیوں میں بڑا اچھا نہج و نظام موجود ہے، لیکن اچھے اساتذہ فراہم نہیں، اور اگر آپ ان کے اندر علمی پہلو تابناک و روشن پالیں تو دیکھیں گے کہ ان کا دل مردہ ہے اور ایمانی و فکری ناحیہ سے ان کی زندگی بے روح و بے کیف ہے۔ ان میں جمود و تعطل کارفرما نظر آئے گا۔

اس کو ہم نے قطر میں خوب خوب دیکھا، ہم نے علوم شرعیہ میں موضوع اور اس کے متعلقات کو دیکھتے ہوئے بہتر سے بہتر کتابیں لکھیں، لیکن طلبہ کی جانب اس کی حرارت اور روح کے ساتھ ان کو منتقل کرنے والے اساتذہ نہ ملے، بلکہ بعض تو ایسے اساتذہ ہیں جو زندہ دلوں کو مردہ کر رہے ہیں اور اس کی حرارت ایمانی پر اس طرح برف ڈال دیتے ہیں جو اس کی حرارت کو ختم کر کے راکھ کے ڈھیر میں بدل دیتی ہے۔

اس کے بعد تین بار ندوہ جانے کی سعادت نصیب ہوئی، ایک بار "المستشرقون والاسلام" کے موضوع پر سیمینار میں شیخ کی دعوت پر، جو دار المصنفین اعظم گڈھ میں ہوا، میرے ساتھ برادران مکرم ڈاکٹر عبد العظیم الدیب اور ڈاکٹر علی المحمدی تھے، شیخ اور ان کے دوستوں نے مجھے اس تین روزہ سیمینار کی صدارت سونپی، اس موقع پر محدث ہند علامہ شیخ حبیب الرحمن الاعظمی کی ملاقات سے شرف یاب ہوا، اور جب ہم لکھنؤ واپس ہوئے تو ان کا بہت بہت تذکرہ رہا۔

دوسری بار دو ہفتہ کے لئے شیخ کی دعوت پر ندوۃ العلماء جانا ہوا، جس میں مجھے دار العلوم اور المعہد العالی للدعوۃ والفکر الاسلامی کے طلبہ کے سامنے محاضرے دینے تھے، اس وقت مجھے اس علمی و ایمانی فضا میں زندگی گذارنے کا ایک زریں موقع ہاتھ لگا، جہاں لوگ محض خدا کے واسطے اور اسی کے ساتھ، اور اسی کے سہارے جیتے ہیں، اور علم و ایمان اور دعوت و اصلاح کے ماحول میں سانس لیتے ہیں۔

میری حرماں نصیبی کہ اس وقت شیخ ندوی ہندوستان سے باہر اپنے ایک مبارک سفر پر تھے، اپنی واپسی پر دیوبند کے صد سالہ جشن میں شریک ہوتے ہوئے میری ان سے ملاقات ہوئی، شیخ نے مجھ سے کہا: مجھے میرے رفقاء نے بتایا کہ آپ نے وہاں لوگوں کے دلوں پر جادو کر دیا ہے، اور ان پر اپنا سکہ جما دیا ہے، میں نے کہا کہ یہ ان حضرات کی محبت ہے جسے میں فضل خداوندی سمجھتا ہوں۔

تیسری مرتبہ عرصہ تین سال قبل شیخ

نے دارالعلوم میں اساتذہ وطلبہ کے سامنے محاضرے کے لئے مجھے دعوت دی، میں نے ندوہ کی آغوش میں کئی دن گذارے جنہیں اپنی عمر کے سب سے حسین دن سمجھتا ہوں، اس وقت میں نے علوم شرعیہ کے اصول پر کئی محاضرے دیئے، اور اللہ تعالیٰ کی اس توفیق پر اس کی حمد بیان کرتا ہوں، اور پھر شیخ کے وہاں موجود ہونے اور میرے محاضروں میں ان کی شرکت نے میرے عزم و حوصلہ کو جلا بخشی۔

شیخ سے مختلف موقعوں پر ملاقاتیں ہوتی رہیں، جامعہ قطر کے قیام کے وقت ۱۹۷۷ء کے آس پاس قطر میں ان سے ملاقات ہوئی وہاں انھوں نے "دور الجامعة في تكوين الأجيال"، "نئی نسلوں کی تعمیر میں جامعہ کا کردار"، کے عنوان سے محاضرہ دیا، اسی طرح ۱۴۰۱ھ کے اوائل میں قطر میں منعقد سیرت عالمی کانفرنس میں ان سے ملاقات کی سعادت ملی، یہ کانفرنس پندرہویں صدی ہجری کے استقبال کے لئے ایک جشن کے طور پر کی جارہی تھی اسی طرح الجزائر کے "ملتقى الفكر الاسلامي" میں بھی ہماری ان سے ملاقات ہوئی۔ اور مجلس المجمع الفقهی کے زیر انتظام رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ میں ہماری ان سے اکثر وبیشتر ملاقات ہوا کرتی تھی جس میں بحیثیت رکن میں شریک ہوا کرتا تھا۔

اسی طرح آکسفورڈ اسلامک سینٹر بھی ہم لوگوں کی ملاقات کا سبب بنا کرتا تھا، ہمیشہ ہمیش ہمارے دل اور روح شیخ جلیل سے خالص اور اسلام کی خاطر محبت کے سایہ میں ملتے رہیں گے، یہ اسلام جس سے خدا نے ہم کو سرفراز کیا، اور اس کے پیغام کا علمبردار بنایا اور اس کی دعوت کو پھیلانے اور امت کے مسائل میں حصہ لینے کی توفیق بخشی۔

میں ندوۃ العلماء کے اساتذہ وطلبہ خاص کر شیخ کے بھانجے عالم جلیل شیخ محمد رابع حسنی ندوی سے تعزیت کرتا ہوں، اسی طرح تمام باشندگان ہندوستان سے اس علامۂ ہند اور اس کی سب سے بڑی دولت کے گم ہوجانے پر تعزیت کرتا ہوں۔ اس طرح میری تعزیت ساری روئے زمین پر بسنے والی انسانیت سے ہے جس نے ایسے داعی اور امام کو رخصت کردیا سارے زمانے کے لئے جس کا ثانی ونظیر ملنا مشکل ہے، ہم خدا کے سامنے دست بدعا ہیں کہ وہ ہم لوگوں کو اس رنج والم پر صبر عطا فرمائے، اور ان کا بہترین جانشیں نصیب فرمائے، اور شیخ ندوی کی رحمت ومغفرت فرمائے، اور ان کی خدمات کو ان کا بہتر صلہ عطا فرمائے۔

عرفان وعلم کا مہرِ کامل نہیں رہا

پروفیسر سید طفیل احمد مدنی

فضل وکمالِ عشق کا حاصل نہیں رہا
عرفان وعلم کا مہرِ کامل نہیں رہا

ملت کے غم سے جو کبھی غافل نہیں رہا
صد حیف اب وہ مومنِ کامل نہیں رہا

وہ جس کے معترف تھے سبھی اہلِ معرفت
وہ شیخِ وقت و عارفِ کامل نہیں رہا

وہ بوالحسنؒ علی وہی ہمنامِ مرتضیٰ
اب کاروانِ زیست میں شامل نہیں رہا

انسانیت کا درس دیا جس نے عمر بھر
وہ عندلیبِ باغِ مزمل نہیں رہا

سیرت نگارِ سید کونین و مرتضیٰ
وہ ماہرِ علوم و مسائل نہیں رہا

درویشِ باوقار وخوش اوقات وخوش کلام
افسوس اب وہ ذاکر و شاغل نہیں رہا

وہ پاسبانِ عظمتِ سادات قطبیہ
وہ میر کاروانِ دلائل نہیں رہا

ٹھکرادیا تھا جس نے ہر اعزازِ دنیوی
وہ بے نیازِ دولتِ زائل نہیں رہا

جس کو کلیدِ کعبہ ملی تھی بحکم رب
وہ خوش نصیب سید عادل نہیں رہا

اسلام کا مفکرِ ذیشان ومحترم
اب صدرِ بزم و رونقِ محفل نہیں رہا

بس بہ لب یوں رب سے ملا نفس مطمئن
کوئی حجاب بیچ میں حائل نہیں رہا

اللہ اس کی قبر کو بھر اپنے نور سے
جو تیری یاد سے کبھی غافل نہیں رہا

اک پھول کے نہ ہونے سے خاموش ہیں سبھی
گلشن میں اب وہ شور عنادل نہیں رہا

بے نور چشم نرگس بیمار کیوں نہ ہو
وہ دیدہ ور وہ جوہر قابل نہیں رہا

ندوہ اداس ہے کہ گیا شیخ معتبر
تکیہ کو غم ہے صاحب منزل نہیں رہا

صدیق "واحمد" و "وصی" پہلے ہی جاچکے
اب یہ دلی فائق و کامل نہیں رہا

ملت کا فرد فرد کرے کیوں نہ تعزیت
اک جامعِ کمال و فضائل نہیں رہا

روتا ہے اک زمانہ اسے کیوں نہ روؤں میں
وہ میرا شیخ و مرشدِ کامل نہیں رہا

سوچا سنِ وفات تو ہاتف نے دی صدا
اب آہ ایک عالم و فاضل نہیں رہا

۱۴۲۰ھ

اب حالِ دل سناؤ گے جاکر کسے طفیل
وہ تاجدارِ مملکت دل نہیں رہا

توصیف کیا بیاں کریں ان کے کمال کی

مولانا محمد تقی عثمانی

اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا ایسی بنائی ہے کہ اس میں غم و خوشی اور راحت و تکلیف دونوں چیزیں ساتھ ساتھ چلتی ہیں، نہ یہاں خوشی خالص ہے نہ غم خالص، اس لئے یہاں غموں اور صدموں کا پیش آنا کوئی اچنبھے کی بات ہے نہ کوئی غیر معمولی چیز، لیکن بعض صدمے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا اثر پوری امت پر پڑتا ہے اور ان کے عالمگیر اثرات کی وجہ سے ان کا زخم مندمل ہونا آسان نہیں ہوتا۔

(رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ میں) ایک ایسا ہی عظیم صدمہ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحبؒ کی وفات کا پیش آیا، جس نے ہر اس شخص کو ہلا کر رکھ دیا، جو حضرت مولانا کی شخصیت اور ان کی خدمات سے واقف ہے،

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی قدس سرہٗ ہمارے دور کی ان عظیم شخصیات میں سے تھے جن کے محض تصوّر سے دل کو ڈھارس اور روح کو یہ اطمینان نصیب ہوتا تھا کہ قحط الرجال کے اس زمانے میں بفضل تعالیٰ ان کا سائۂ رحمت پوری اُمّت کے لئے ایک سائباں کی حیثیت رکھتا ہے علم وفضل کے شناوروں کی تعداد اب بھی شاید اتنی کم نہ ہو، عبادت و زہد کے پیکر بھی اتنے نایاب نہیں لیکن ایسی شخصیات جو علم وفضل، سلامت فکر، ورع و تقویٰ اور اعتدال و توازن کی خصوصیات جمع کر لینے کے ساتھ ساتھ امت کی فکر میں گھلتی ہوں اور جن کے دل درد مند میں عالم اسلام کے ہر گوشے کیلئے یکساں تڑپ موجود ہو، خال خال ہی پیدا ہوتی ہیں اور ان کی وفات کا خلا پُر ہونا بہت مشکل ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا کو ان خصوصیات سے نوازا تھا۔ اور اب ان صفات کا جامع دور دور کوئی نظر نہیں آتا۔

حضرت مولاناؒ اصلاً دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے تعلیم و تربیت یافتہ تھے۔ لیکن اس کے بعد انہیں اللہ تعالیٰ نے دارالعلوم دیوبند سے بھی اکتساب فیض کی توفیق عطا فرمائی تھی اور اس طرح ان کی ذات میں برصغیر کے ان دونوں عظیم اداروں کے محاسن جمع فرما دیئے تھے پھر علم ظاہر کے اس مجمع البحرین کو اللہ تعالیٰ نے علم باطن کا بھی حصہ وافر عطا فرمایا۔ انہوں نے حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ کی خدمت سے فیض حاصل کیا۔ اور طریقت کے میدان میں بھی حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کے خلیفہ مجاز کی حیثیت سے آپ کا فیض دور دور تک پھیلا۔

آپ کی اردو اور عربی تصانیف اتنی ایمان افروز، فکر انگیز اور معلومات آفریں ہیں کہ وہ دل کو ایمان و یقین سے سرشار کرنے کے علاوہ دین کا صحیح مزاج و مذاق انسان پر واضح کرتی ہیں اور اسے افراط و تفریط سے ہٹا کر اعتدال کے اس جادۂ مستقیم پر لے آتی ہیں جو ہمارے دین کا طرۂ امتیاز ہے' ان کی تحریروں میں علم و فکر کی فراوانی کے ساتھ بلا کا سوز و گداز ہے جو انسان کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتا۔ خاص طور پر مغربی افکار کی یورش نے ہمارے دور میں جو فکری گمراہیاں پیدا کی ہیں۔ اور عالم اسلام کے مختلف حصوں میں جو فتنے جگائے ہیں ان پر حضرت مولاناؒ کی بڑی وسیع و عمیق نظر تھی اور انھوں نے اپنی تقریر و تحریر کے ذریعہ ان فتنوں کی تشخیص اور ان کے علاج کی نشاندہی اتنی سلامت فکر کے ساتھ اتنے دلنشین انداز میں فرمائی ہے کہ عہد حاضر کے مؤلفین میں شاید ہی کوئی دوسرا ان کی ہمسری کر سکے۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں عربی زبان کی تحریر و تقریر پر وہ قدرت عطا فرمائی تھی، جو بہت سے عرب اہل قلم کیلئے بھی باعث رشک تھی اس منفرد صلاحیت سے انھوں نے خدمتِ اسلام کا وہ عظیم الشان کام لیا جو عربی زبان و ادب کے معاصر ماہرین میں سے شاید کسی نے نہ لیا ہو۔ ان کی فصیح و بلیغ عربی تحریروں نے عربوں کو دین کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا۔ اور مغرب کی فکری یلغار سے سہمے ہوئے عرب ممالک میں دین کا پیغام اتنی خود اعتمادی' اتنے یقین اور اتنے پر جوش انداز میں پہونچایا کہ آج بے شمار عرب مسلمان اپنی اسلامی بیداری کو ان تحریروں کا مرہون منت سمجھتے ہیں ان کی تحریر و تقریر میں جو اخلاص، دردمندی اور دلسوزی کوٹ

کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ ان کی سخت سے سخت بات کو بھی مخاطب کیلئے قابل قبول بنا دیتی تھی۔ اس کا نتیجہ تھا کہ عربوں پر کھری کھری تنقید کے باوجود عرب ممالک میں ان کی مقبولیت کسی بھی غیر عرب کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی عرب ملکوں کے مقتدر حلقوں سے بھی ان کے مراسم تھے اور وہ ان مراسم کو خدمت دین کیلئے استعمال فرماتے تھے اور ان کی بدولت بہت سے منکرات کا سدباب ہوا۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے بارے میں اگر میں یہ کہوں تو مبالغہ نہیں ہوگا کہ حضرت مولاناؒ کی قیادت نے اس ادارے کو نئی زندگی بخشی۔ یہ ادارہ درحقیقت حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ نے مسلمانوں کی اہم دینی ضرورت کا احساس کرتے ہوئے قائم فرمایا تھا اور اس کا مقصد یہ تھا کہ یہاں سے ایسے اہل علم پیدا ہوں جو دینی علوم سے آراستہ ہونے کے ساتھ ساتھ عصری علوم سے بھی اتنی واقفیت رکھتے ہوں جو ان کی دعوت کو معاصر تعلیم یافتہ حضرات میں زیادہ موثر بنا سکے۔ یہ ایک عظیم الشان مقصد تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ اس ادارے پر تاریخ وادب اتنا غالب آتا گیا کہ اس کی دینی چھاپ ماند پڑنے لگی۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کو دوبارہ اپنے اصل مقصد کی طرف اس حکمت و بصیرت کے ساتھ لوٹایا۔ کہ اس کی نمایاں خصوصیات بھی برقرار رہیں اور اس کے ساتھ اس میں ٹھیٹھ اسلامی علوم کا معیار بھی پہلے سے کہیں زیادہ بلند ہوا۔ اس کی مجموعی فضا پر تدین تقویٰ اور انابت الی اللہ کا رنگ بھی نمایاں ہو۔ اور تاریخ وادب کو دین کی دعوت اور مقاصد شریعت کا خادم بنا کر اس طرح استعمال کیا گیا کہ یہ ادارہ دعوت و خدمت دین کا ایک اہم مرکز بن گیا، جس کی خدمات سے پورے عالم اسلام نے استفادہ کیا۔ حضرت مولاناؒ نے اپنی انتھک جدوجہد سے اس ادارے میں اپنے ہم رنگ علماء کی ایک بڑی کھیپ تیار فرمائی جو بفضل تعالیٰ حضرت مولانا کے انداز فکر و عمل کی امین ہے اور انہی کے طرز و انداز پر دین کے مختلف شعبوں میں گرانقدر خدمات انجام دے رہی ہے۔

یوں تو حضرت مولاناؒ کی تمام ہی تصانیف ہمارے ادب کا بہترین سرمایہ ہیں لیکن "تاریخ دعوت وعزیمت" اور "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" اور "عالم اسلام میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش" یہ تین کتابیں ایسی ہیں کہ راقم الحروف نے ان سے خاص طور پر بہت استفادہ کیا اور ان کے ذریعے بہت سی زندگیوں میں فکری اور عملی انقلاب رونما ہوا۔ اس کے علاوہ ان کے بہت سے چھوٹے چھوٹے مقالے جو الگ کتابچوں کی شکل میں ہیں بلا کی تاثیر رکھتے ہیں خاص طور پر "اسمعوها مني صريحة ايها العرب" اور "من غار حراء" "ترشيد الصحوة الاسلامية" اور آخر میں وہ مقالے ہیں جنہوں نے دلوں کو جھنجھوڑ کر انہیں فکر و عمل کی سیدھی راہ دکھائی۔

عصری ضرورتوں کا احساس ہمارے دور میں بہت سے علماء، رہنماؤں اور اہل قلم کو ہوا۔ اور انہوں نے اخلاص کے ساتھ دین کی عصری حاجتوں کی تکمیل میں اپنی توانائیاں صرف کیں لیکن بسا اوقات عصری حاجتوں کی فکر نے ان کو دین کی سکہ بند اور ٹھیٹھ تعبیر سے ڈگمگا کر ایسی راہ اختیار کرنے پر آمادہ کر دیا جو جمہور امت اور سلف صالحین کے جادہ مستقیم سے ہٹی ہوئی تھی لیکن حضرت مولانا علی میاں قدس سرہٗ کا معاملہ ان سے کہیں مختلف تھا۔ اس دور کا کوئی بھی حقیقت پسند انسان اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ وہ امت مسلمہ کی عصری ضروریات کا مکمل احساس و ادراک رکھتے تھے۔ لیکن ان ضروریات کی تکمیل انہوں نے ہمیشہ جمہور امت کے مسلمہ عقائد و نظریات کے دائرے میں رہتے ہوئے کی اور کسی قسم کی مرعوبیت اور معذرت خواہی کی پرچھائیں بھی ان کی تحریروں پر نہیں پڑ سکی۔

جب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب مرحوم نے جماعت اسلامی کی بنیاد ڈالی تو وقت کی ایک اہم ضرورت سمجھ کر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے بھی ان کا ساتھ دیا، لیکن جب ان کے طرز فکر و عمل سے اختلاف سامنے آیا تو حضرت مولاناؒ ان سے الگ تو ہو گئے، لیکن جماعت اسلامی اور مولانا مودودی صاحبؒ کی مخالفت کو اپنا ہدف نہیں بنایا، بلکہ مغربی افکار کی تردید میں انھوں نے جو قابل قدر کام کیا تھا اس کی تعریف و توصیف میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا لیکن ان کے طرز فکر و عمل پر ______ مولاناؒ نے "اسلام کی سیاسی تعبیر" جس انداز سے سپرد قلم فرمائی وہ انہی کا حق تھا۔ اس کتاب کے ذریعے انھوں نے مولانا مودودیؒ اور ان کے طرز فکر کے حامل دوسرے اہل علم سے اپنے اختلاف کو انتہائی متانت کے ساتھ مدلل اور مستحکم انداز میں بیان فرما کر ان بنیادی نکات کی نشاندہی فرمائی جن میں ان حضرات کی سوچ قرآن و سنت کے جادۂ اعتدال سے ہٹ گئی تھی۔

حضرت مولاناؒ کی پوری زندگی ایک جہد

مسلسل سے عبارت تھی دنیا کے کسی بھی خطے میں مسلمانوں کی کوئی تکلیف یا خرابی ان کے دل میں کانٹا بن کر چبھ جاتی تھی اور وہ مقدور بھر اس کے ازالے کے لئے بے چین ہوجاتے تھے ان کی خود نوشت سوانح حیات "کاروانِ زندگی" کے نام سے سات جلدوں میں شائع ہوئی ہے اور جس کے مطالعے سے ان کی ہمہ جہتی خدمات کا تھوڑا بہت اندازہ ہوسکتا ہے۔ بلکہ مجھے تو اس بات پر حیرت ہے کہ اتنی مصروف زندگی میں انھوں نے اپنی یہ سوانح کس طرح تالیف فرمائی جس میں ان کی سرگرمیوں کی تفصیلات اتنی جزرسی کے ساتھ بیان ہوئی ہیں۔ سچ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی سے کام لیتے ہیں تو اس کے اوقات میں بھی برکت عطا فرمادیتے ہیں۔ اس سوانح کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ محض واقعات زندگی کی داستان نہیں بلکہ اس میں قدم قدم پر قاری کیلئے فکر و بصیرت کے نئے پہلو اجاگر ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انھیں جن ہمہ جہتی خدمات کیلئے چنا تھا۔ ان کے پیش نظر وہ کسی ایک ملک کی نہیں پورے عالم اسلام کی شخصیت تھی۔ میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ کے سامنے جب بھی حضرت مولاناؒ کا ذکر آتا تو اکثر وہ فرمایا کرتے تھے وہ "موفق من اللہ" ہیں اور جوں جوں حضرت مولاناؒ کی خدمات سامنے آتی گئیں حضرت والد صاحب قدس سرہٗ کے اس جملے کی حقانیت واضح ہوتی گئی۔ لیکن ان ہمہ جہتی خدمات اور عالمگیر مقبولیت کے باوجود حضرت مولاناؒ تواضع کے پیکر تھے ان کے کسی انداز و ادا میں عجب و پندار کا کوئی شائبہ نہیں تھا، قبول حق کے لئے ان کا ذہن ہمیشہ کھلا ہوا تھا، وہ اپنے چھوٹوں سے بھی ایسا معاملہ فرماتے تھے جیسے ان سے استفادہ کر رہے ہوں مجھ ناچیز کے ساتھ حضرت مولاناؒ کی شفقت و محبت اور عنایات کا جو معاملہ تھا اسے تعبیر کرنے کے لئے الفاظ ملنے مشکل ہیں۔ اگرچہ پاکستان اور ہندوستان کی بنا کے بعد مجھے حضرت مولانا سے شرف ملاقات اور حضرت کی صحبت سے مستفید ہونے کے مواقع کم ملے۔ لیکن الحمدللہ خط و کتابت کے ذریعہ ان سے تعلق قائم رہا۔ میں نے اپنے بہت سے ذاتی اور اجتماعی مسائل میں حضرت مولاناؒ سے رہنمائی طلب کی اور انھوں نے ہمیشہ بڑی شفقت و محبت کے ساتھ اپنے ارشادات سے نوازا۔ میں ایسے مواقع کی تلاش میں رہتا تھا۔ جب حضرت مولاناؒ کی زیارت و ملاقات کا شرف حاصل ہو، میرا یہ اشتیاق سو فیصد فطری تھا کہ میرے لئے ان کی حیثیت ایک رہنما کی تھی میں اس بات کا حاجتمند تھا۔ کہ ان کی صحبت جتنی ہو سکے میسر آئے لیکن یہ حضرت مولاناؒ کی شفقت کی انتہا تھی کہ وہ بھی محض اپنے الطاف کریمانہ کی بنا پر مجھے اس سعادت سے بہرور کرنے کی کوشش فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ مجمع الفقہ الاسلامی ہند کا اجلاس بنگلور میں ہونا تھا۔ احقر نے حاضری کا فی الجملہ وعدہ کر لیا تھا۔ حضرت مولانا کا گرامی نامہ آیا کہ میں نے تم سے ملنے کی خاطر اس سفر کا ارادہ کیا ہے بعد میں اتفاق سے مجھے ایسی مجبوری پیش آگئی کہ میں وہاں نہ پہنچ سکا اور اس وقت ان کی زیارت سے محروم رہا میں اپنی نادانی سے یہ سمجھا تھا کہ حضرت نے احقر کی خاطر داری کیلئے مذکورہ بالا فقرہ لکھ دیا ہوگا۔ لیکن بعد میں انھوں نے اپنے خطوط میں جس طرح اس پر افسوس کا اظہار فرمایا۔ اور صرف خطوط ہی میں نہیں اپنی خود نوشت سوانح میں بھی اس واقعے کا جس طرح ذکر فرمایا ہے وہ احقر کو غرق ندامت کرنے کیلئے کافی ہے۔

امسال دارالعلوم کراچی کی طرف سے شوال کے آخر میں فضلائے دارالعلوم کی دستار بندی کے لئے سالہا سال کے بعد ایک جلسہ منعقد کرنے کا خیال ہے۔ مقصد یہ تھا کہ اس موقع پر اکابر علماء کا ایک اجتماع بھی ہو جائے اس موقع پر جن اکابر علماء کو دعوت دینے کا خیال تھا۔ ان میں حضرت مولانا کا اسم گرامی سرفہرست تھا۔ چنانچہ احقر نے جمعرات ۲۱ رمضان المبارک کو ندوۃ العلماء میں فون کیا معلوم ہوا کہ حضرت رائے بریلی تشریف فرما ہیں وہاں فون کیا گیا تو حضرت اس وقت فون کے پاس نہیں تھے، فاضل گرامی جناب مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب سے بات ہوئی انھوں نے بتایا کہ الحمدللہ حضرت کی صحت بہتر ہے فالج کا جو اثر پچھلے دنوں ہوا تھا بفضل تعالیٰ وہ اب زائل ہو چکا ہے اور حضرت کمزوری کے باوجود روزے بھی رکھ رہے ہیں یہ سن کر الحمدللہ بہت اطمینان ہوا۔ جناب مولانا رابع صاحب نے میرا پیغام حضرت تک پہنچانے کا وعدہ کیا اور فرمایا کہ آپ سے حضرت کو جو محبت ہے اس کے پیش نظر وہ اس دعوت کو ضرور اہمیت دیں گے۔ تاہم میں نے اس سے وہ مناسب وقت معلوم کیا جس میں ان سے براہ راست بات ہوسکے۔ مولانا نے فرمایا کہ صبح دس بجے کے قریب حضرت فون کے پاس ہوتے ہیں۔ میں نے ارادہ کیا کہ انشاءاللہ ہفتے کی صبح کو حضرت سے ہمکلامی کا شرف حاصل کروں گا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا جمعہ کی رات کو میرے بھتیجے عزیز خلیل اشرف عثمانی صاحب سلمہ نے فون پر بتایا کہ ریڈیو ٹیلیویژن سے حضرت کی وفات کی خبر نشر ہو چکی ہے۔ دل پر بجلی سی گری مگر اللہ تعالیٰ کے فیصلہ پر سر تسلیم خم کئے بغیر چارہ نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے پاس بلانے کیلئے رمضان کا مبارک مہینہ جمعہ کا مقدس دن

(باقی صہ ۲۳۹ پر)

"وہ کس کا دل ہوں کہ دو عالم سے لگایا ہے مجھے"

مولانا ضیاء الدین اصلاحی ۔ مدیر "معارف" اعظم گڈھ ۔

افسوس اور سخت افسوس ہے کہ محفلِ دوشیں کا وہ چراغِ سحر جو پچھلے برس ہی سے ضعف و مرض کے جھونکوں سے جھلملا جھلملا کر سنبھل جاتا تھا بالآخر ہمیشہ کے لئے بجھ گیا۔ یعنی اس دور کے بہت مقبول و مقدس بزرگ، دنیائے اسلام کے محبوب و محترم عالم، عرب و عجم کی سرمایۂ افتخار و نازش ذات، شرق و غرب کی مؤقر و مکرم ہستی، ہر فرقہ و مذہب کے معتمد شخص انسانیت کے پیامبر اور علمبردار، مسلمانوں کے راہبر و رہنما، دین و مذہب کے عاشق و شیدائی، اسلام کے داعی و نقیب، ایمان و یقین کے حامل و مبلغ، عزیمت و جہاد کے پیکر، خانۂ کعبہ کے کلید بردار، ہندوستان میں سرمایۂ ملت کے نگہبان، ندوۃ العلماء کے ناظم، دار المصنفین کے روح رواں، مسلم پرسنل لاء بورڈ اور دینی تعلیمی کونسل کے صدر، رابطۂ عالم اسلامی اور مدینہ یونیورسٹی کے تاسیسی رکن، رابطۂ ادب اسلامی کے بانی و صدر، اسلامی سینٹر آکسفورڈ یونیورسٹی کے چیرمین اور ہند و بیرونِ ہند کے مختلف اداروں اور انجمنوں کے سربراہ اور سرپرست حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے ۲۲ رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ / ۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ء کو اس سرائے فانی کو الوداع کہا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اور اپنے لاکھوں عقیدت مندوں، قدردانوں، رفیقوں اور عزیزوں کو غم زدہ اور سوگوار چھوڑ کر زبانِ حال سے یہ کہتے ہوئے موت کی آغوش میں چلے گئے۔

اضاعونی وای فتی اضاعوا
لیوم کریھۃ وسداد ثغر

بیسویں صدی کے اختتام سے ایک برس پہلے جب شمسی سال کے ختم ہونے میں ایک دن رہ گیا تھا تو یہ الم ناک اور دل دوز خبر بجلی بن کر گری:

نعی الرکب اوفی حین آبت رکابھم
لعمری لقد جاؤا البشرنا وجعوا
نعوا باسق الافعال لایخلفونہ
تکاد الجبال الصم منہ تصدع

عین نصف النہار کے وقت وہ آفتاب عالم تاب غروب ہوگیا جس سے ہندوستان اور پوری دنیائے اسلام منور تھی، اس وجود مقدس کا خاتمہ ہوگیا جس کے ذکرِ جمیل سے مسجدیں، خانقاہیں، مدارس، جدید تعلیم گاہیں، یونیورسٹیاں اور سیاست و حکومت کے ایوان پُرشور رہتے تھے، وہ برگزیدہ ہستی معدوم ہوگئی جس کے ایک ہاتھ میں جامِ شریعت اور دوسرے میں سندانِ عشق تھا، وہ میر کارواں رخصت ہوا جس کا شغل ذکر کے ساتھ فکر اور جس کا معمول تسبیح و مناجات کی طرح دستِ افلاک میں تکبیر مسلسل تھا۔ وہ نہ ملت کے جوانوں کی طرح نخچیر زمانہ تھا اور نہ پیرانِ کہن سال کی طرح بیگانۂ ایام۔ یہی وہ چراغ تھا جس سے علم و عرفان اور شریعت و طریقت کی بزم روشن تھی، اس کے فیض سے ایمان کی بادِ بہار چل رہی تھی، معرفت و یقین کی دوکان آراستہ تھی، دریائے علم رواں اور دوائے دل ارزاں تھی، اس کی ذات لکھنؤ اور رائے بریلی میں فضل و کمال، محبت و معرفت، یقین و نگاہ اور رشد و ہدایت کی شمع فروزاں تھی، اس کی ہستی سیرت و خلق محمدیؐ، شاہ علم اللہؒ کے زہد و ریاضت، سید احمد شہیدؒ کے جہد و جہاد اور مولانا عبدالحئیؒ کے علم و دانش کا مجموعہ تھی اور اس کی ذات میں اسلاف اور اپنے بزرگ اجداد کی بہت سی روایات و خصوصیات اکٹھا ہوگئی تھیں، ارشاد و ہدایت، وعظ و نصیحت، درس و تدریس، تلاش و مطالعہ، تحریر و تصنیف اور دین و ملت کی راہ میں جاں فروشانہ جذبہ اور مجاہدانہ اخلاص۔

ولیس علی اللہ بمستنکر
ان یجمع العالم فی واحد

---

۲۲ رمضان المبارک کو جمعہ کی نماز پڑھ کر بعض اعیانِ شہر کے ساتھ اپنی رہائش گاہ کے سامنے صحن میں بیٹھا تھا کہ شہر کے ایک صاحب کے فون سے اس حادثۂ فاجعہ کی اطلاع ملی تصدیق اور تدفین کا وقت معلوم کرنے کے لئے لکھنؤ اور رائے بریلی فون کرایا مگر پتہ نہیں چلا، خبر پھیلی تو دار المصنفین کے احاطہ کے لوگ، شبلی کالج کے اساتذہ اور شہر کے بعض حضرات میری قیام گاہ پر جمع ہوگئے، ڈاکٹر مسیح الرحمن لکچرر شبلی کالج نے لکھنؤ میں اپنے بڑے بھائی مولانا سعید الرحمن اعظمی کے یہاں فون کرایا تو خبر کی تصدیق ہوگئی اور ساڑھے چار بجے میں ان کے اور اپنے رفقاء، عزیزوں اور ڈاکٹر سلمان سلطان رکن مجلس انتظامی دار المصنفین کے ساتھ روانہ ہوا، مگر تکیہ سے

۳ کلومیٹر پہلے ہی گاڑی روک دی گئی، ہم لوگ پیدل چل پڑے، راستے میں آدمی ہی آدمی تھے، کچھ تو نماز جنازہ اور تدفین میں شریک ہوکر واپس آرہے تھے اور کچھ بے تابانہ تدفین میں شریک ہونے جارہے تھے، ہم لوگوں کو جنازے کی سعادت سے محروم رہ جانے پر بڑا قلق ہوا، دو تین گھنٹے گزار کر بمشکل مولانا کے خواہر زادگان مولانا سید محمد رابع اور مولانا سید محمد واضح سے ملاقات کرکے ۸ بجے صبح اعظم گڈھ واپس اس حال میں آئے۔

اذا مادعوت الصبر بعدک والبکا
اجاب البکا طوعا ولم یجب الصبر

کئی روز تک گم صم رہا، کسی کام میں جی نہیں لگتا تھا، قلم اٹھانے کا یارانہ تھا، جیص بیص میں دن بیت گئے، ہفتے گزر گئے، جنوری کے آخری عشرے میں مولانا مستقیم احسن نے بمبئی سے فون کیا "ابھی تک معارف نہیں پہونچا، مولانا پر مضمون کا شدید انتظار ہے۔" حکیم محمد مختار اصلاحی اور پروفیسر خورشید نعمانی ردولوی اور دوسرے قدردانان معارف کی طرف سے بھی ماتمی تحریر کے لئے بیقراری ظاہر کی گئی۔

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دِوانہ مرگیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

اس پیہم تقاضے اور شدید اصرار نے قلم اٹھانے پر مجبور کیا مگر اسی اثنا میں اعظم گڈھ میں فساد کی آگ بھڑک اٹھی جس کی زد سے دار المصنفین بھی محفوظ نہیں رہا، نگاہوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ کا منظر تھا مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی وفات نہ تنہا ان کے عزیزوں اور نیازمندوں کا حادثہ ہے اور نہ دار المصنفین اور ندوۃ العلماء کی دنیا ویران ہوئی ہے، بے شمار اداے، تنظیمیں اور انجمنیں بے رونق ہوگئی ہیں، امت مرحومہ کا سرمایۂ اعتماد جاتا رہا، عالم اسلام کا سہارا ختم ہوگیا، تباہ وخستہ حال ہندوستان کا غم خوار چلا گیا، آہ وہ پُر درد آواز خاموش ہوگئی جو نصف صدی تک ہندوستان اور دنیائے اسلام کے ہر سانحہ پر صدائے صور بن کر بلند ہوتی تھی، واحسرتا! وہ بے قرار دل ساکت ہوگیا جو مسلمانوں کی ہر مصیبت پر تڑپتا اور تڑپاتا تھا، واأسفا! وہ اشک آلود آنکھیں بند ہوگئیں جو دین وملت کے ہر غم میں خوں بار رہتی تھیں، ہائے اس پُر جوش سینہ کا تلاطم ختم ہوگیا جو آلام ومصائب کے پہاڑوں کو خس وخاشاک کی طرح بہائے جاتا تھا، ہم کس کس چیز کا ماتم کریں اور کس کس کے لئے روئیں، وہ ایک فرد نہیں ایک قوم، ایک شخص نہیں ایک ملت اور تنہا نہیں مجموعۂ صفات وکمالات تھا۔

دما کان قیس هلکه هلک داحد
دلکنه بنیان قوم تهدما

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا پدری سلسلہ حضرت امام حسنؓ پر اور مادری سلسلہ حضرت امام حسینؓ پر منتہی ہوتا ہے۔ حضرت امام حسنؓ کے صاحبزادے حسن مثنیٰ سے امام حسینؓ کی چھوٹی دختر فاطمہ صغریٰ منسوب تھیں، اس لئے ان کے خاندان کو حسنی حسینی کہا جاتا ہے، اس خاندان کے پہلے بزرگ جو مدینہ منورہ سے ہندوستان تشریف لائے وہ امیر قطب الدین محمد المدنیؒ تھے جو شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے بھانجے اور جلیل القدر ولی تھے، انھوں نے کڑا مانک پور اور اس کے نواح کو نور اسلام سے منور کیا، کڑا میں ان کی اولاد تقریباً ایک صدی تک عزت اور نیک نامی کی زندگی بسر کرتی رہی، جب اس خانوادے کے ایک بزرگ میر سید قطب الدین محمد ثانی کو جالس کا قاضی مقرر کیا گیا تو وہ وہاں منتقل ہوگئے، ان کے بیٹے سید علاء الدین نصیرآباد کے قاضی ہوکر وہاں جا بسے۔ ان کے ایک پوتے قاضی سید احمدؒ تھے جن کے فرزند سید محمد معظم کے دو نامور فرزند تھے، سید محمد فضیل اور سید محمد اسحق۔ اول الذکر حضرت سید آدم بنوریؒ کے جلیل القدر خلیفہ اور ممتاز عارف باللہ حضرت شاہ علم اللہؒ کے والد بزرگوار تھے جن کی پانچویں پشت میں مردِ حق آگاہ اور مجاہد کبیر حضرت سید احمد شہیدؒ پیدا ہوئے۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ موخرالذکر کی نسل سے تھے جن کی نوائے حق اور نالۂ درد سے عرب وعجم گونج رہا ہے؎

سالہا گوشِ جہاں زمزمہ زا خواہد شد
زیں نواہا کہ دریں گنبد گردوں زدہ ام

خاندان قطبی کی دونوں شاخوں میں اتنے اولیا، علماء اور مشائخ پیدا ہوئے کہ کم خاندانوں میں ہوئے ہوں گے، مولانا علی میاںؒ کے جد امجد مولوی حکیم سید فخر الدین خیالیؒ علمی وباطنی کمالات سے مالامال تھے، فارسی، اردو خاص کر بھاشا کے اچھے اور صاحب دیوان شاعر تھے، ان کی اکثر تصنیفات تلف ہوگئیں لیکن جو محفوظ رہ گئیں وہ بھی کم نہیں "مہر جہاں تاب" بڑی عجیب اور اہم ہے جس کے حصہ اول کا تیسرا دفتر عربی، فارسی، اردو اور بھاشا کے شاعروں کا تذکرہ ہونے کی بنا پر اردو کے ناقدوں اور محققوں کا بھی مرکز توجہ ہے، ان کے فرزند اور مولانا علی میاںؒ کے پدر بزرگوار مولانا حکیم سید عبدالحیؒ سابق ناظم ندوۃ العلماء نے عربی میں "نزہۃ الخواطر" اور "الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند" اور اردو میں "گل رعنا" یادگار چھوڑیں جو ہمیشہ حوالے اور مرجع کا کام دیں گی۔ مولانا علی میاں کا ننہال بھی علمائے کبار

اور اولیائے عظام سے معمور تھا۔

این سلسلہ از طلائے ناب است
این خانہ تمام آفتاب است

سید محمد فضیل کے فرزند حضرت شاہ علم اللہؒ حرمین شریفین کے مستقل قیام کے ارادے سے نصیر آباد سے روانہ ہوئے اور رائے بریلی میں جہاں آباد پہونچے تو ایک بزرگ مجذوب کے کہنے سے ارادہ تبدیل کر دیا اور جنگل میں دریائے سئی کے کنارے مٹی اور پھوس کا ایک مکان اور مٹی ہی کی مسجد تعمیر کر کے طرحِ اقامت ڈال دی، قریب کے ایک گاؤں لوہانی پور کے زمیندار دولت خاں نے بخنہ دس بیگھا زمین نذر کی۔ جو آگے چل کر دائرۂ شاہ علم اللہؒ یا تکیہ کے نام سے موسوم ہوئی۔ شاہ علم اللہؒ کے بنی اعمام نصیر آباد ہی میں سکونت پذیر رہے، جب یہاں کے مولانا سید عبد العلی نصیر آبادیؒ کی شادی مولانا سید محمد ظاہر کی جو حضرت شاہ علم اللہؒ کی پانچویں پشت میں تھے دو صاحبزادیوں سے یکے بعد دیگرے ہوئی تو وہ نصیر آباد سے ترک سکونت کر کے دائرہ شاہ علم اللہؒ رائے بریلی منتقل ہوئے، اسی مقتدر خاندان میں آگے چل کر مولانا علی میاںؒ کی ولادت ہوئی اور دائرہ شاہ علم اللہؒ یا تکیہ ان کا مولد و منشا بنا۔

بلاد بها حل الشباب تمائمی
واول ارض مس جلدی ترابها

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی تسمیہ خوانی تکیہ رائے بریلی میں ہوئی اور مکتبی تعلیم امین آباد لکھنؤ کے محلہ بازار جھاؤ لال کی مسجد نوازی کے مکتب میں پائی، یہ محلہ اب محمد علی لین کہلاتا ہے، یہاں ان کے والد کا مکان اور مطب تھا۔ ابھی وہ نو دس سال ہی کے تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا اس لئے اس کو چھوڑ کر تکیہ آنا پڑا مگر جلد ہی انکے بڑے بھائی ڈاکٹر سید عبد العلیؒ سابق ناظم ندوۃ العلماء نے بھی اسی محلہ میں اپنا مطب شروع کیا تو ان کو بھی لکھنؤ بلا لیا اور بڑی شفقت اور دل سوزی سے ان کی سرپرستی اور تربیت کی۔ مولانا کو اردو کا اچھا ذوق اور شعر فہمی کی صلاحیت یہیں پیدا ہوئی، انھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے فاضل ادب اور فاضل حدیث کے امتحانات دیئے اپنے پھوپھا مولانا سید محمد طلحہؒ پروفیسر اورینٹل کالج لاہور سے صرف و نحو کی مشق کی، دار العلوم ندوۃ العلماء سے استفادے کا آغاز ہوا مولانا شبلی جیراجپوری سے فقہ اور مولانا حیدر حسن خاں سے حدیث کی کتابیں پڑھیں، ۲۹ء میں لاہور کا سفر کیا، مولانا سید محمد طلحہ کے ہمراہ علامہ اقبال اور دوسرے ناموروں سے ملاقات کا شرف حاصل کیا، اگلے برسوں میں پھر جا کر مولانا احمد علیؒ سے مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے طرز تفسیر و فکر کے مطابق قرآن مجید اور حجۃ اللہ البالغہ کا درس لیا، اس طرز میں اس سے پہلے ان کے خواجہ تاش خواجہ عبد الحی فاروقیؒ استاذ تفسیر جامعہ ملیہ اسلامیہ سے بھی اپنے گھر پر قرآن شریف کی بعض سورتیں پڑھ چکے تھے، ۳۲ء میں مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے درسِ حدیث میں شرکت کے لئے دیوبند تشریف لے گئے، ان سے بعض قرآنی مشکلات میں رہنمائی کے بھی طالب ہوئے۔

برصغیر میں مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ عربی کے سب سے ممتاز انشا پرداز اور مصنف تھے۔ ان کی تعلیم کا آغاز ۱۹۲۴ء میں لکھنؤ یونیورسٹی کے پروفیسر مولانا خلیل عرب کے گھر پر ہوا اور عربی بولنے اور لکھنے کی مشق بھی یہیں ہوئی، طلبہ کے لئے عربی بولنا لازمی تھا، اردو بولنے پر جرمانہ ہوتا تھا۔ اسی زمانے میں عربی اخباروں اور رسالوں کے مطالعہ کا چسکہ لگا جو ان کے بڑے بھائی اور مربی ڈاکٹر سید عبد العلیؒ کے یہاں آتے تھے، دار العلوم ندوۃ العلماء میں ان کے مطالعہ کا مزید موقع ملا، مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کی دوستی اور رفاقت سے اس ذوق میں جلا پیدا ہوئی، مولانا کے مضامین مصر کے رسالوں میں چھپنے لگے، ستمبر ۳۰ء میں علامہ تقی الدین ہلالی مراکشی ندوہ میں ادبِ عربی کے اعلیٰ استاذ ہو کر آئے تو یہاں عربی ادب کے نئے دور کا آغاز ہوا، ان سے مولانا علی میاں نے بھی فائدہ اٹھایا، مولانا سید سلیمان ندوی اور ہلالی صاحب کی نگرانی اور مولانا مسعود عالم ندوی کی ادارت میں مئی ۳۲ء میں الضیاء کا اجرا ہوا، جس کے مولانا مستقل مضمون نگار تھے، یہ رسالہ تین سال بعد بند ہو گیا، اس کے تخم سے "البعث الاسلامی" اور "الرائد" نکلے جن کے مولانا سرپرست اور نگراں تھے، عربی تحریر و تقریر سے ان کا شغف مدۃ العمر قائم رہا، ۱۹۵۶ء میں وہ دمشق یونیورسٹی کے وزیٹر پروفیسر ہوئے۔ یہاں کی المجمع العلمی کے رکن بھی تھے۔ عربی میں ان کے مضامین و کتب اتنی کثیر تعداد میں ہیں کہ ان کا شمار مشکل ہے، اپنی اس خصوصیت کی بنا پر وہ عرب ملکوں کے ہر پروگرام میں مدعو ہوتے تھے اور وہاں کے اکثر اداروں اور انجمنوں کے ممبر بھی تھے، ان سے زیادہ کسی ہندوستانی نے عرب ملکوں کا سفر نہیں کیا، ان کی اردو کتابوں کے عربی ترجمے بھی شائع ہوئے، وہ عرب ملکوں کے موجودہ فضلاء اور اہل قلم سے کسی اعتبار سے کم پایہ نہ تھے، اپنی اسی شہرت و مقبولیت اور دینی عظمت و وجاہت کی بنا پر کلیدِ کعبہ ان کے حوالے کی گئی تھی دکفیٰ به فخراً۔

مولانا علی میاں نے بیس۲۰ سال کی عمر حصول تعلیم میں گزاری، ۳۴ء میں ندوۃ العلماء میں تفسیر وادب کے استاد مقرر ہوئے، درس تیاری، محنت اور مطالعہ کے بعد دیتے تھے، اس ضمن میں ندوہ کی سفارت، اس کے تعارف اور اس کے مقاصد کی اشاعت کے لئے سفر بھی کیا، ۳۹ء میں مولانا سید سلیمان ندوی کی نگرانی اور ان کی اور مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی کی ادارت میں "الندوہ" پھر جاری ہوا اور فروری ۴۲ء میں بند ہوگیا، دعوتی ذوق کی بنا پر بعد میں بھی صحافت سے دلچسپی رہی، ۴۸ء میں مولانا عبدالسلام قدوائی کے اشتراک سے پندرہ روزہ اخبار "تعمیر" نکالا اور اس کے لئے متعدد فکرانگیز مضامین لکھے، ہفتہ وار ندائے ملت کے اجراء میں بھی ان کی مساعی شامل تھیں، ان کی سرپرستی میں پندرہ روزہ "تعمیر حیات" شائع ہوا جو اب بھی جاری ہے۔ ان کو اپنے تدریسی دور میں عربی زبان وادب کے نصاب کی اصلاح کا خیال ہوا، اس کے لئے مختارات، القراءۃ الراشدۃ اور قصص النبیین وغیرہ خود لکھیں اور اپنے عزیزوں اور شاگردوں سے متعدد ریڈریں لکھوائیں، ان کو کورس کی کتابوں کی ترتیب کا خاص سلیقہ تھا، ۳۸ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات کے لئے بی۔ اے کلاس کی ایک کتاب تیار کی جس کا معاوضہ ۵۰۰ روپیہ ملا اور مولانا سید سلیمان ندویؒ نے مبارکباد بھی دی۔ انھوں نے دارالعلوم کے طلبہ میں دینی روح پھونکی اور ندوہ کے مقاصد سے دلچسپی پیدا کی۔ دوسرے دینی مدارس سے اس کا ربط بڑھایا، تبلیغ و دعوت دین کے کام سے مولانا کو زیادہ مناسبت تھی، اس میں انہماک بڑھا تو تدریس سے ضابطہ کا تعلق ختم کرلیا، لیکن ندوۃ العلماء سے ان کا خاندانی وموروثی تعلق تھا، اس کی محبت ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی اور یہی آئندہ ان کا اوڑھنا بچھونا ہوگیا، ۴۸ء کے وسط میں اس کی مجلس انتظامی کے رکن منتخب ہوئے اور جنوری ۴۹ء میں انھیں نائب معتمد بنایا گیا اور مولانا سید سلیمان ندوی کے انتقال کے بعد ۵۴ء میں معتمد ہوئے، ۶۱ء میں اپنے بھائی ومربی کی وفات کے بعد ناظم ندوۃ العلماء بنائے گئے، ان کے زمانے میں ندوہ کو عالمگیر شہرت ومقبولیت نصیب ہوئی، علمی، تعلیمی، دینی اور روحانی حیثیت سے ترقی ہوئی، عمارتوں میں بکثرت اضافے اور توسیع ہوئی، گوناگوں شعبے اور دفاتر قائم ہوئے، مالی حیثیت سے مستحکم ہوا، مختلف شہروں میں اس کی شاخیں قائم ہوئیں، پچاسی ۸۵ سالہ جشن منایا گیا، بین الاقوامی سیمینار ہوئے، جلسے اجتماعات اور تقریبات آئے دن کا معمول ہوگئے ہیں، غرض انھوں نے ندوۃ العلماء کے چپہ چپہ پر اپنے لازوال نقوش چھوڑے ہیں۔

لعمرك ما واری التراب فعالہ
ولکن ما واری ثیابا واعظما

ہندوستان اور عالم اسلام کے بے شمار اداروں سے ان کا تعلق تھا، ہر ادارہ ان سے اپنی نسبت کو باعث فخر سمجھتا تھا، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی سے ان کو گہرا اور مخلصانہ لگاؤ تھا، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا مسعود علی ندوی سے عقیدت مندانہ تعلق کی بنا پر وہ اس کے کاموں میں پیش پیش رہتے اور پوری دلچسپی لیتے، اس کی ترقی وکامیابی سے خوش ہوتے، وہ اور ان کے بڑے بھائی اس کی مختلف مجالس کے رکن تھے، مولانا عبدالماجد دریابادی کے انتقال کے بعد ان کو مجلس عاملہ کا صدر بنایا گیا،...... ڈاکٹر سید محمود اور مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کے انتقال کے بعد وہی اس کے روح رواں تھے، بڑی پابندی سے دارالمصنفین کے جلسوں میں تشریف لاتے، اس کے جشن طلائی اور اسلام ومستشرقین پر بین الاقوامی سیمینار کو کامیاب بنانے میں انھوں نے پوری سرگرمی دکھائی، یہاں سے ان کے والد بزرگوار کی کتاب "گل رعنا" اور "الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند" کا اردو ترجمہ شائع ہوا، خود ان کی کتاب "تاریخ دعوت وعزیمت" کے شروع کے دونوں حصوں کا پہلا ایڈیشن یہیں سے نکلا۔ معارف پابندی سے پڑھتے، کسی مہینے میں تاخیر ہوتی تو شکایت کرتے، ابھی جلد ہی ان سے پوچھا گیا کہ آپ کا پسندیدہ رسالہ کون ہے تو جواب دیا معارف۔ دارالمصنفین کو مالی فائدہ بھی پہونچاتے۔ یوپی کے سابق وزیراعلا مسٹر بہوگنا نے ندوۃ العلماء کو ایک لاکھ روپئے دیئے اسے دارالمصنفین کی طرف منتقل کرادیا، مولانا سید سلیمان ندوی کی "سیرۃ النبیؐ" حصہ ہفتم کا مقدمہ انھوں نے لکھا تھا، یہ کتاب جنرل ضیاالحق مرحوم کو بہت پسند آئی اور انھوں نے مولانا کو ایک لاکھ روپئے نذر کرنا چاہا تو فرمایا میں اس کا مستحق نہیں، دارالمصنفین اور سید صاحب کی بیگم ہیں، چنانچہ نصف نصف رقم دونوں کو ملی، حال ہی میں ابوظبی اور برونائی کی حکومتوں سے ان کو خطیر رقم ملی، اسے انھوں نے مدارس میں تقسیم کردیا، اس موقع پر بھی دارالمصنفین کا خیال رکھا۔ ان کی سفارش سے اسے رابطہ عالم اسلامی سے ایک اچھی رقم سالانہ ملتی تھی، مگر عرصے سے وہ بند ہوگئی۔

تقریر وتحریر کا ملکہ خداداد تھا، اردو اور عربی دونوں کے ممتاز خطیب اور نامور مصنف تھے، ان کے معاصرین میں ان سے زیادہ شاید ہی کسی نے تقریریں کی ہوں اور تحریری ذخیرہ چھوڑا ہو، ان کا طغرائے امتیاز یہ بھی تھا کہ انھوں نے اپنے اس جوہر کا صحیح استعمال کیا، ان کی ہر تقریر وتحریر

کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ اور اسلام کی سربلندی ہوتا، ان کی طبیعت کا سوز اور دل کی دردمندی تقریروں اور تحریروں کو اس قدر موثر بنا دیتی تھی کہ ان کو سننے اور پڑھنے والے پر رقت طاری ہو جاتی تھی، تقریر و بیان پر معجزانہ قدرت کی وجہ سے ۴۳ء میں جب مولانا عبدالسلام قدوائی نے ادارۂ تعلیمات اسلام قائم کیا اور اس کے زیر اہتمام ان پر قرآن مجید اور حدیث شریف کے درس کی ذمہ داری ڈالی تو اس میں لکھنؤ کے تعلیم یافتہ طبقہ، اعلی عہدیداروں اور دیندار مسلمانوں کا بڑا مجمع ہونے لگا، اس خصوصیت کی بنا پر نوعمری ہی میں وہ بڑے بڑے جلسوں میں تقریر کے لئے بلائے جاتے اور ندوہ کے نمائندے ہوکر اہم علمی اجتماعات میں مقالے پڑھنے کے لئے مدعو کئے جاتے، ۳۶ء میں علی گڑھ میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی جبلی میں شرکت کی اور ۳۸ء میں اس کے پٹنہ کے اجلاس میں شریک ہوئے، ۴۴ء میں جامعہ ملیہ کے شعبۂ اسلامیات کی دعوت پر "مذہب و تمدن" کے عنوان سے مقالہ پڑھا، جو بعد میں کتابی صورت میں چھپا، ادب و انشا سے فطری دلچسپی تھی، اس کا بانکپن ان کی ہر تقریر و تحریر میں نظر آتا، کبرسنی کے باوجود ان کے زور و اثر اور حسن بیان میں کوئی فرق نہیں آیا۔ "سیرت سید احمد شہیدؒ"، "مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان پہونچا"، "ارکان اربعہ"، "نبی رحمت"، "المرتضیٰ" اور "تاریخ دعوت و عزیمت" وغیرہ سے اگر ان کی تلاش و تحقیق، کد و کاوش، محنت و دیدہ ریزی، دقت آفرینی اور نکتہ سنجی کا پتہ چلتا ہے تو دوسری تصانیف سے فکر و خیال کی بلندی، رعنائی بیان، زور قلم، تازگی، آمد، روانی اور بے ساختگی کا اندازہ ہوتا ہے، ان کی تمام تصنیفات کو حسن قبول حاصل ہوا ادھر اردو میں لکھی گئیں ان کے عربی اور جو عربی کے اردو ترجمے ہوئے، اکثر کے انگریزی اور دوسری زبانوں میں بھی ترجمے ہوئے۔ ان کی عظیم الشان دینی و دعوتی خدمات اور گوناگوں تصنیفات کی وجہ سے ۸۰ء کا فیصل ایوارڈ ملا، یہ اور اس کے بعد کے ایوارڈ سے ملنے والی ساری رقم اسلام کے مفاد اور دینی خدمات کے میدان میں صرف کر دی اور اپنے لئے ایک حبہ بھی نہ رکھا۔

نہ تخت و تاج میں، نے لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مرد قلندر کی بارگاہ میں ہے

مولانا شروع سے محب وطن اور تحریک آزادی کے حامی تھے، انگریزوں سے نفرت کے جراثیم موروثی تھے، ۸ برس کی عمر میں وہ تحریک خلافت کا جوش و خروش اور پھر ۳۰ مارچ ۲۴ء کا وہ منحوس دن دیکھ چکے تھے جب انگریزوں کی سازش سے کمال اتاترک نے بیک جنبش لب اس کا خاتمہ کر دیا تھا، دیوبند کے قیام اور حضرت مدنیؒ کی صحبت نے اس رنگ کو اور چوکھا کر دیا تھا، اپنے تجربہ و مطالعہ سے ایک انگریز ہی کیا سارے یورپ کے الحادی و مادی نظریات کو وہ اسلام اور مسلمانوں کے لئے سم قاتل سمجھتے تھے، عملی سیاست سے کنارہ کش رہنے کے باوجود ان کا اور ان کے گھرانے کا رجحان جمعیۃ العلماء اور مجلس احرار کی طرف تھا، ۴۲ء میں کانگریس نے "ہندوستان چھوڑو" کی تجویز منظور کی تو ان علماء کے طرز عمل کو پسند کیا جو جنگ آزادی اور استخلاص وطن کی تحریک میں شریک تھے، مگر آزادی کے بعد جب حکومت کے کارپردازوں کا رنگ بدلا اور مسلمان احساس کمتری اور مایوسی کا شکار ہونے لگے تو وہ جارحیت کے سامنے سپر انداز نہیں ہوئے، ۴۸ء میں ان کی دعوت پر ندوۃ العلماء میں ایک ملی اجتماع ہوا جس میں نشان راہ اور لائحۂ عمل تجویز ہوا، یورپ کی سیاسی و تہذیبی تاخت، عقائدی ارتداد اور فکری و اخلاقی انتشار کا مقابلہ کرنے کے لئے مجلس تحقیقات و نشریات اسلام قائم کیا، مشرکانہ عقائد اور دیومالائی تصورات کے انسداد کے لئے دینی تعلیمی کونسل کی رہنمائی کی، مسلمانوں میں نئی دینی، فکری اور جرأت مندانہ قیادت کے خلا کو پر کرنے کے لئے ندائے ملت جاری کیا، ۶۴ء میں کلکتہ، جمشید پور اور راورکیلا کے ہولناک فسادات کی سنگینی دیکھ کر ان کو خیال ہوا کہ تمام تعلیمی و تعمیری کاموں سے پہلے اس مسئلے کی طرف توجہ کرنے اور اس کو مؤثر بنانے کے لئے اکثریتی فرقہ کے جاں باز اور سرفروش قائدین کو بھی اس میں شامل کرنے کی ضرورت ہے، اسی غرض سے مولانا محمد منظور نعمانیؒ کی معیت میں ونوبا بھادے اور جے پرکاش نرائن سے ملے، ڈاکٹر سید محمود کی قیادت میں ندوۃ العلماء میں مسلم مجلس مشاورت قائم ہوئی تو اس میں سرگرم حصہ لیا، ملک کو زوال اور اخلاقی بحران سے نکالنے اور ہندو مسلم خلیج پاٹنے کے لئے "پیام انسانیت" کی تحریک چلائی، عائلی قوانین کے تحفظ کے لئے "مسلم پرسنل لا بورڈ" کی سربراہی کی۔ بابری مسجد کے انہدام پر خون کے آنسو بہائے۔ غرض ان کا بے قرار اور دردمند دل ہر نازک موڑ پر برادران وطن کو درس حقیقت اور مسلمانوں کو شجاعت و عدالت کا سبق پڑھا کر اس کی تلقین کرتا رہا کہ ع

معمار حرم باز بہ تعمیر جہاں خیز

مولانا ایک داعی و مصلح تھے، دعوت و عزیمت اور دینی غیرت و حمیت ان کی امتیازی شان تھی، ان کا گھرانا عقائد و مسلک میں حضرت سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسمعیل شہیدؒ کا سختی سے پیرو اور ولی اللّٰہی فکر کا حامل تھا، ان کا محلہ بازار جھاؤلال بھی صحیح العقیدہ لوگوں سے آباد تھا، وہ شعائر اللہ کی توہین، دین و اخلاق اور انسانیت کی پامالی کو

برداشت نہیں کر سکتے تھے، اسلام کی سربلندی، اصلاح و دعوت اور دین کی تبلیغ و اشاعت میں ہمیشہ منہمک رہے، ۱۹۳۵ء میں ۲۱ برس کی عمر ہی میں ایک موقع پر ڈاکٹر امبیڈکر کو اسلام کی دعوت دینے کے لئے بمبئی کا سفر کیا، وہ عمر بھر مسلمانوں کو مادی تمدن کے دریا کے خلاف تیرنے اور اس کا دھارا موڑنے اور اپنے باطل افکار وخیالات اور غلط رسوم وعادات کی قربانی دینے کے لئے آمادہ کرتے رہے، ندوۃ العلماء میں معلمی کے زمانے میں ان کے ذوق ورجحان میں تبدیلی آئی، اب ان کی پرواز مدرسہ کی چہار دیواری تک محدود نہیں رہنا چاہتی تھی اور وہ کسی صالح تحریک و دعوت سے وابستہ ہونے کے لئے فکر مند رہتے، اس زمانے میں وہ مولانا مودودی کے مضامین سے بہت متاثر ہوئے اور چند برس تک حلقۂ لکھنؤ کی جماعت اسلامی کے ذمہ دار بھی رہے۔ پھر مولانا محمد الیاسؒ کی دینی دعوت سے ان کا ربط وتعلق بڑھا اور عرصہ تک اس میں مشغولیت اور سرگرمی رہی، وہ اپنی اصلاح وتربیت اور تزکیۂ نفس سے بھی غافل نہ تھے، اس کے لئے مشائخ واولیاء کی خدمت میں برابر حاضری دیتے، مولانا عبد القادر رائے پوریؒ سے بیعت ہوئے، ان کی سوانح اور مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ کا تذکرہ لکھا، چند بار مولانا تھانویؒ سے بھی ملے، مولانا مدنیؒ سے برابر تعلق رکھتے۔ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ سے اکثر ملتے، مولانا شاہ وصی اللہؒ، مولانا محمد احمد پرتاب گڈھیؒ اور حضرت شاہ یعقوب مجددیؒ کی خدمت میں بھی باریاب ہوتے، موخر الذکر کے ملفوظات مرتب کر کے شائع کیا، سیرت وکردار، اخلاق وعادات اور اوصاف ومحامد میں اسلاف اور اپنے اجداد کا نمونہ اور اقبال کے مرد مومن کا آئینہ تھے، ان کی کوئی جسمانی یادگار نہ تھی، شادی ۱۹۳۴ء میں ہوگئی تھی، اپنے برادرزادہ وخواہرزادگان کو اپنی اولاد سے زیادہ مانتے تھے، معنوی اولاد اور نیازمندوں کی تعداد حد وشمار سے باہر ہے. جن کے غم واندوہ کا کون اندازہ کرسکتا ہے... تدمع العین و یحزن القلب ولانقول الا مایرضی ربنا وانا بفراقك لمحزونون۔ اللّٰھم صب علیہ شأبیب رحمتك واغفر لہ برحمتك یاارحم الراحمین۔

بیادِ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندویؒ

● محمد نفیس حسن دہلوی

"زباں پہ بارے الٰہا یہ کس کا نام آیا ۔۔۔ کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کیلئے"
وہ جس کے نام کی شہرت تمام عالم میں ۔۔۔ ابوالحسن علی ندوی ہیں ہر زماں کیلئے
حجاز و یثرب و یورپ کی بزم کی رونق ۔۔۔ یہ کہکشانِ محبت کہاں کہاں کیلئے
دیارِ ہند میں رہ کر تھا رشک دوعالم ۔۔۔ ترا قیام زمیں پہ تھا آسماں کیلئے
ہر ایک تیرے لبِ حق پرست کا شیدا ۔۔۔ تری زبان تھی گویا ہر اک زباں کیلئے
جہاں کسی کو نہ ہوتی تھی جنبشِ لب تک ۔۔۔ وہاں زبان وقلم تھے یہ ترجماں کیلئے
چمن میں پھول تھے لیکن مہک نہ تھی کافی ۔۔۔ ترا وجود تھا خوشبوئے گلستاں کیلئے
چمن کی نذر ہوئی متقل متاعِ حیات ۔۔۔ رکھا نہ تنکا کوئی اپنے آشیاں کیلئے
کسے خبر ہے کہ کیوں شمع دل پگھلتی تھی ۔۔۔ فغانِ نیم شبی تھی غمِ جہاں کیلئے
یہی پیام تھا انسانیت کا ہو پرچار ۔۔۔ یہی تھی بادِ صبا ملک میں اماں کیلئے
جہانِ ظلم کی خاطر مشاورت کا قیام ۔۔۔ تڑپتا دل تھا یہ مظلوم کی فغاں کیلئے
نظر تھی عائلی قانون کی حفاظت پر ۔۔۔ یہی جہاد تھا اس دیں کے پاسباں کیلئے
ہر ایک اہلِ سیاست ترے اشارے کا ۔۔۔ ہمیشہ منتظر حرفِ خوش بیاں کیلئے
رہِ سلوک میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی ۔۔۔ یہ حسنِ ظن رہا خود اپنے بدگماں کیلئے
اٹھائی جس نے بھی انگلی وہ گر گیا خود ہی ۔۔۔ یہ سب تماشے تھے بس حق کے امتحاں کیلئے
تری حیات کی خوشبو سے آشکار ہوا ۔۔۔ بہار آئی تھی تہذیبِ گلستاں کیلئے
عزیز واقربا بوبکر و رابع و واضح ۔۔۔ یہ لب کشا رہیں تکمیلِ داستاں کیلئے
اسی خیال سے لکھی ہے خود نوشت اپنی ۔۔۔ کوئی بڑھا نہ دے کچھ زیبِ داستاں کیلئے
رضائے حق کی بشارت تھی آخری لمحہ ۔۔۔ پیامِ زیست ہوئی مرگ علی میاں کیلئے
نفیسؔ دی ہے خدا نے یہ نظم کی توفیق ۔۔۔ مرے قلم میں تھی جرأت کہاں بیاں کیلئے

"نگہ بلند سخن دلنواز جاں پُر سوز
یہی تھا رختِ سفر میر کارواں کے لئے"

صدی کی شخصیت

مولانا وحید الدین خاں

عالم اسلام کی معروف شخصیت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا ۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ء کو انتقال ہوگیا۔ مولانا موصوف ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی شخصیت گویا سو سالہ دور کا احاطہ کئے ہوئے تھی۔ تاریخ میں وہ اس دور کی علامت کے طور پر دیکھے جائیں گے۔ ان کو بلاشبہ صدی کی شخصیت (MAN OF THE CENTURY) کہا جاسکتا ہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی بیک وقت مختلف اور متنوع خصوصیات کے مالک تھے۔ وہ ایک ممتاز عالم تھے۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) کو ان کے زمانہ میں غیر معمولی ترقی حاصل ہوئی۔ انھوں نے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ اور اسی طرح دوسرے بہت سے اداروں کی کامیاب قیادت کی۔ بیسوی صدی میں اٹھنے والی تقریباً تمام بڑی بڑی اسلامی تحریکوں سے ان کا براہ راست یا بالواسطہ تعلق تھا۔ وہ ہر حلقہ اور ہر گروہ میں یکساں طور پر عزت و اعتماد کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کو بلا اختلاف ایک بین الاقوامی شخصیت کہا جاسکتا ہے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک فرد اپنی قوم میں نمائندہ قوم کی حیثیت حاصل کر لیتا ہے۔ مولانا موصوف کو یہی حیثیت حاصل تھی۔ ایسا شخص کسی قوم کے لئے بے حد قیمتی ہے۔ اپنی اس حیثیت کی بنا پر وہ پوری قوم کے لئے شیرازۂ اتحاد بن جاتا ہے۔ وہ اپنی قوم اور دوسری قوموں کے درمیان عملاً رابطہ کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ وہ تمام لوگوں کے لئے مرجع قوم بن جاتا ہے۔ یعنی ایک ایسا شخص جس سے پوری قوم کے معاملہ میں رجوع کیا جاسکے وغیرہ۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی ذات میں یہ تمام حیثیتیں بہ تمام و کمال جمع ہوگئی تھیں۔ مولانا محمد منظور نعمانیؒ نے ایک بار مولانا موصوف کو "رجل موهوب" کہا تھا۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے لئے یہ خطاب لفظ بلفظ درست ہے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا کارنامۂ حیات تقریباً پوری صدی پر پھیلا ہوا ہے۔ وہ اپنی ذات میں ایک متحرک صدی تھے۔ صدی کی آخری تاریخ کو یہ متحرک شخصیت خاموش ہوگئی۔ وہ انسانوں سے ہوکر اپنے رب سے جاملی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے اندر بیک وقت مختلف اور متنوع خصوصیات موجود تھیں۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے کہا تھا کہ یورپ میں جو کام اکادمی کرتی ہے، وہ ہمارے یہاں "ایک آدمی" کرتا ہے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اس قول کا ایک زندہ نمونہ تھے۔ وہ ایک فرد تھے مگر انھوں نے کئی اداروں کے برابر کام کیا۔

مولانا موصوف نے ایک طرف دارالعلوم ندوۃ العلماء جیسے ادارہ کے ذریعہ مسلمانوں کو علم دین سے بہرہ ور کرنے کی کوشش کی اور دوسری طرف مؤسسہ مطالعات وتحقیقات اسلامی لگزمبرگ جیسے اداروں کے ذریعہ لوگوں کے لئے عصری معرفت کا سامان کیا۔ ایک طرف انھوں نے اپنی موثر تقریروں کے ذریعہ مسلمانوں میں علمی جوش کو ابھارا اور دوسری طرف انھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ انھیں گہرے علمی شعور سے آشنا کیا۔

ایک طرف انھوں نے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے ذریعہ مسلمانوں کے ملی تحفظ کا انتظام کیا تو دوسری طرف "پیام انسانیت" کی تحریک کے ذریعہ انھیں داعی کے مقام پر کھڑا کرنے کی کوشش کی۔ ایک طرف انھوں نے "ردۃ ولا ابابکر لہا" جیسی کتابوں کے ذریعہ مسلمانوں میں دفاع اسلام کا جذبہ ابھارا اور دوسری طرف "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" جیسی کتابوں کے ذریعہ مسلمانوں کو اپنی تعمیر نو کی طرف متوجہ کیا۔ ایک طرف انھوں نے رابطہ العالم الاسلامی کے اہم رکن کی حیثیت سے عالمی مسلم اتحاد کی کوشش کی اور دوسری طرف رابطۂ ادب اسلامی کے صدر کی حیثیت سے مسلمانوں کے اندر علم و ادب کے حصول کا شوق ابھارا۔ ایک طرف انھوں نے مدارس دینیہ کے قیام کے ذریعہ قدیم علوم کو زندہ کیا اور دوسری طرف آکسفورڈ یونیورسٹی کے اسلامک سنٹر کے صدر کی حیثیت سے مسلمانوں کے اندر جدید علوم کے ماہر پیدا کرنے کی کوشش کی۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ذات بہت سی اعلیٰ قدروں کا نمونہ بن گئی تھی۔ انھیں میں سے ایک چیز وہ ہے جس کی بابت کہا گیا ہے کہ ـــ دنیا سے بے نیاز ہو جاؤ، دنیا خود تمہاری طرف دوڑ کر آئے گی۔ مولانا موصوف دنیا کی چیزوں سے بے نیاز ہوگئے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا نے خود اپنے آپ کو ان کے حوالے کر دیا۔

ایک بار ایک عرب سلطان ندوۃ العلماء (لکھنؤ) آئے۔ ان کے استقبالیہ میں جو جلسہ ہوا اس میں تقریر کرتے ہوئے مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے ایک عرب بزرگ کا قول نقل کرتے ہوئے فرمایا تھا: نعم الامیر علی باب الفقیر وبئس الفقیر علی باب الامیر۔ مولانا موصوف ساری زندگی اہل دنیا سے بے نیاز رہے مگر اہل دنیا نے خود اپنی ساری متاع ان کے سامنے پیش کردی.

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا گیا۔ ان کو بڑے بڑے ایوارڈ دئیے گئے، مثلاً کنگ فیصل ایوارڈ اسی طرح برونائی اور عرب امارات کے خصوصی ایوارڈ وغیرہ.

مولانا موصوف کی ذات اس حقیقت کی ایک عملی مثال تھی کہ مال، عہدہ، عزت سب انسان کے تابع ہیں نہ کہ انسان ان چیزوں کے تابع ہے. انسان اگر اپنی انسانیت کو بلند کرلے تو بقیہ تمام چیزیں اپنے آپ اس کو حاصل ہو جائیں گی، بغیر اس کے کہ اس نے ان چیزوں کے لئے براہ راست جد و جہد کی ہو۔

ایک شاعر نے کسی کے بارے میں کہا تھا: "وہ اپنی ذات میں اک انجمن ہیں"۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے بارے میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ وہ اپنی ذات میں ایک عالم تھے۔ ان کی موت بلاشبہ موت العالِم موت العالَم کی مصداق ہے۔ تاہم قابلِ اطمینان بات یہ ہے کہ مولانا موصوف نے اپنے پیچھے اپنے شاگردوں کی عظیم تعداد چھوڑی ہے۔ یقین ہے کہ مولانا موصوف کے بعد ان کے تربیت فیض یافتہ یہ حضرات اس عربی شعر کا مصداق ثابت ہوں گے: إذا مات منا سید قام سید (جب ہمارا ایک سردار وفات پاتا ہے تو دوسرا سردار کھڑا ہو جاتا ہے)۔

وہ ایک لفظ منوّر مُفکّرِ اسلام

● تسنیم فاروقی لکھنؤ

ان آٹھ حرفوں کے اندر ہزار معنیٰ ہیں — ہزار رنگ ہیں بھی بے شمار معنیٰ ہیں
یہ محض لفظ نہیں ہے خطابِ اعلا ہے — یہ صرف قول نہیں ہے عمل کا طغرا ہے
وہ والقلم کا مفسّر وہ شارحِ اقراء — وہ دیندار مکرّم و مصلحِ دنیا
وہ آدمیّت و انسانیت کا پرچم دار — سپاہ دعوت وحدت کا قافلہ سالار
وہ بدرِ عصر تھا ملّت کی آگہی کے لئے — ہیں سوگوار سبھی بوالحسن علیؒ کے لئے
معاشرہ ہو کہ دینِ مبین ہو کہ ادب — سب اس کی پاک نگاری میں غرب ہو کہ عرب
وہ رشدِ خاص جو ندوہ کے جسم و جاں میں ہے — امیرؔ اس کا مری حسرتِ بیان میں ہے
یہ علم راز جہاں سے نجوم چمکے ہیں — دھنی قلم کے وقارِ علوم چمکے ہیں
وہ جن کے علم پہ ہندوستان فخر کرے — زمین ناز کرے آسمان فخر کرے
اگرچہ سب کی کتابوں کا ذکر کٹھن جائے — تو کائنات پہ اک سائبان بن جائے
جو روح کو سبق ایماں کا یاد ہوتا ہے — تو یوں ہی فکر و عمل سے جہاد ہوتا ہے
جہاد والوں کو مرحوم، لوگ کہتے ہیں — وہ جدّ و جہد کے شانوں پہ زندہ رہتے ہیں
وہ لَا اِلٰہ کا داعی محرّک اعظم — بس ایک درد کہ اسلام کا بڑھے دم خم
وہ ایک ساجد و عابد وہ پیکرِ ایثار — وہ ایک دور، وہ مقصد، وہ علم کا مینار
وہ دین مصطفویؐ کا مجاہدِ عرفاں — وہ مجتہد وہ مُبلّغ وہ ہادیٔ دوراں
یہ مدعا تھا نہ اب گھر جلیں نہ باغ جلیں — صداقتوں کے لئے کچھ دل و دماغ جلیں
جو ملحدین ہیں چاہے وہ داغ داغ جلیں — فصیلِ دہر پہ حق کے لئے چراغ جلیں
زمینِ ہند سے وہ ایسا رہنما اٹھّا — کہ جس سے دفترِ آفاق جگمگا اٹھّا
یہ قصد تھا کہ چمن لالہ زار ہو جائے — یہ سعی تھی کہ وطن خوشگوار ہو جائے
چمن تو نکہتِ ایثار سے مہکتا ہے — ہمیشہ ثمرۂ نورِ عمل چمکتا ہے
علی میاںؒ کی حضوری میں محفلیں وہ کہاں — وہ مسکراتی صفیں اور شفقتیں وہ کہاں
وہ نرم لہجہ وہ لطفِ خطابِ عام کہاں — وہ رنگِ فجر کہاں وہ سکونِ شام کہاں
تمام ایسے کیا زہد و اتقا کا سفر — ہو جیسے عرش کی جانب کسی دعا کا سفر
امینِ شرع و فقہ خاکسار ہو کے گیا — صدی کی کاہکشاں پر سوار ہو کے گیا

وہ رب کی راہ میں سورج تھا زندگی کے لئے
صدی کا آخری دن تھا نئی صدی کے لئے

مولانا کا عالمی ایوارڈ کی مناسبت سے

دبی کا سفر

مولانا تقی الدین ندوی مظاہری سابق استاذ حدیث جامعۃ العین

مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں نور اللہ مرقدہ کے حادثۂ وفات پر اہل علم و علماء و فضلاء کرام کے کثرت سے مقالات شائع ہو رہے ہیں اور ان کے عظیم الشان کارناموں کو بیان کیا جارہا ہے، نیز آئندہ بہت کچھ لکھا جائے گا۔

اس ناچیز کا حضرت والا سے تعلق نصف صدی پہلے سے قائم ہوا تھا اور زندگی کے اخیر لمحہ تک الحمد للہ قائم رہا، بلکہ حضرت مربی و سرپرست تھے، حضرت نے اس ناچیز کی چھ عربی اور تین اردو مؤلفات پر مقدمے تحریر فرمائے ہیں، اس شفقت و محبت کا تقاضا ہے کہ اس طویل عرصہ میں حضرت والا کو جو کچھ دیکھا اور جو کچھ ان سے سنا اس کو قلمبند کر دیا جائے، اس لئے "حضرت کی یادیں اور باتیں" کے عنوان پر مفصل مقالہ آرہا ہے، البتہ اس جزء کو جو دبی کے سفر سے تعلق رکھتا ہے، اس مقالہ میں حضرت والا کے دبی کے سفر کا دیکھا ہوا حال ہے "شنیدہ کے بود مانند دیدہ" حکومت دبی دو سال سے رمضان المبارک میں مختلف اسلامی ممالک سے حفاظ قرآن کا انتخاب کر کے ۲۱ رمضان کو دعوت دے کر بلاتی ہے، اور علماء و قرّاء کی نگرانی میں حفظ قرآن کا عالمی مقابلہ کرایا جاتا ہے اور کامیاب ہونے والوں کو بڑے بڑے انعامات سے نوازا جاتا ہے، اور ان کے علاوہ باہر سے شریک ہونے والے مہمانوں کی بھی تکریم کی جاتی ہے اس موقع پر عالم اسلامی کی کسی شخصیت کا انتخاب کر کے عالمی جائزہ (ایوارڈ) سے نوازا جاتا ہے، یہ ایوارڈ دبی کے ولی عہد اور امارات حکومت کے ڈیفنس منسٹر شیخ محمد بن راشد آل مکتوم اپنے ہاتھ سے عطا فرماتے ہیں، وہ خود اس میں شریک ہوتے ہیں۔

اس کے لئے شیخ محمد بن راشد نے دبی میں ایک کمیٹی قائم کی ہے، اس کمیٹی کی یہ ذمہ داری ہے کہ جامع ازہر سے لے کر العین یونیورسٹی تک تمام عربی و اسلامی یونیورسٹیوں اور مراکز سے رابطہ پیدا کر کے ان کی رائے طلب کرے، اسی قاعدہ کے تحت گذشتہ سال جب یونیورسٹیوں اور مراکز سے اس کمیٹی نے رائے طلب کی تو اجماعی فیصلہ ان سب کا یہ آیا کہ اس وقت عالم اسلامی کی علمی و دینی شخصیت شیخ ابو الحسن علی ندوی کی ہے اور وہی اس جائزہ (انعام) کے مستحق ہیں، اور اس کی اطلاع جب لکھنؤ حضرت مولانا کو دی گئی تو آپ نے اپنی صحت اور ماہ مبارک کے اہتمام و دیگر وجوہ سے سفر سے معذرت فرما دی اور کسی طرح سفر پر تیار نظر نہیں آرہے تھے، چونکہ امارات کے متعدد اسفار کے لئے یہ ناچیز ہی واسطہ تھا اس لئے صدر کمیٹی نے اور ان کے ساتھیوں نے باصرار مجھ سے کہا کہ آپ کسی طرح شیخ کو راضی کر لیں، اس لئے کہ شیخ کے نام کا اعلان ہو چکا ہے، ہمارے لئے شیخ کے نہ آنے پر بہت توہین کی بات ہے اور دینی حلقہ پر ایک مایوسی کا اثر ظاہر ہوگا، چنانچہ اس ناچیز نے حضرت کے معتمد علیہ و جانشین مولانا سید محمد رابع صاحب ندوی سے اور مولانا سعید الرحمن اعظمی سے فون پر گفتگو کی، دونوں کی طرف سے جواب آیا کہ حضرت کا سفر ناممکن ہے، لیکن مولانا محمد رابع صاحب نے یہ فرمایا کہ آپ ماموں جی سے براہ راست بات کریں ہم لوگ بھی تعاون کریں گے، اس ناچیز کا حضرت مولانا سے عرصہ سے ٹیلیفون ہی کے ذریعہ سے رابطہ قائم رہتا تھا اور خیر و عافیت معلوم کرتا تھا۔ اسی اصول کے مطابق حضرت والا کو فون کیا، اور صورت حال سے مطلع کیا کہ کمیٹی کا شدید اصرار ہے اور سفر کے بہت سے فوائد بیان کئے کہ حضرت کی کتابوں کے پڑھنے کا رواج ہوگا، ہندوستانی علماء کا وقار بلند ہوگا۔ ندوۃ العلماء کا بیش از بیش تعارف ہوگا، اور ہم لوگوں کے لئے بھی یہاں کام کا میدان زیادہ وسیع ہو جائے گا۔ حضرت نے فرمایا کہ انشراح نہیں ہو رہا ہے، اس ناچیز نے عرض کیا کہ حضرت فون ہی پر ایک قصہ سنانا چاہتا ہوں جو جناب والا سے تقریباً چالیس سال پہلے سنا تھا، وہ یہ کہ جناب نے خصوصی مشورہ کے لئے سہارنپور سے حضرت شیخ الحدیث نور اللہ مرقدہ کو رائے پور حضرت اقدس رائے پوری کی خدمت میں جانے پر آمادہ کیا تھا، سفر کے لئے ایک تانگا لایا گیا، اس زمانے میں کاروں کا رواج نہیں ہوا تھا۔ حضرت شیخ مع اپنے خدام کے اور جناب والا مع اپنے خادم کے تانگے پر سوار ہوئے گھوڑا بہت اچھا تھا مگر جب تانگے والے نے گھوڑے کو چابک رسید کی تو گھوڑے نے دائیں طرف رخ موڑ لیا پھر گھوڑے کو اس نے سیدھا

کیا اور چابک رسید کی تو گھوڑے نے بائیں طرف رخ پھیر لیا، کسی طرح آگے کی طرف بڑھنے کے لئے تیار ہی نہیں ہو رہا تھا، یہ تماشہ بہت دیر تک کرتا رہا، اخیر میں شیخ نے فرمایا کہ علی میاں (غایت محبت سے حضرت شیخ مولانا کو اسی لقب سے پکارتے تھے) چلو میں نے نیت کر لی ہے، اس کے بعد تانگے والے نے چابک بھری تو گھوڑا رائے پور جا کر رکا حالانکہ سہارنپور سے رائے پور کا اچھا خاصا فاصلہ ہے، اس ناچیز نے عرض کیا اگر جناب ارادہ فرمالیں تو اسی طرح یہ سفر آسان ہو جائے گا، اس پر حضرت بہت کھل کھلا کر ہنسے اور فرمایا مولوی تقی الدین صاحب ضرور آؤں گا مگر مجھے عربوں سے خطاب کا موقع دیا جائے مجھے ان سے کچھ کہنا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت اس کا موقع تو ضرور دیا جائے گا، اس پر موافقت فرمائی، مولانا محمد رابع صاحب نے کمیٹی کو موافقت کا تار بھیج دیا، یہاں پر ٹی۔ وی ریڈیو اخبارات سب نے کھل کر اعلان کیا اور حضرت کے حالات بیان کئے جانے لگے کہ اچانک ۱۰ رمضان المبارک کے بعد حضرت کی طبیعت خراب ہو گئی اور روزہ رکھنا مشکل ہو گیا، کمزوری بہت آگئی تھی، مولانا محمد رابع صاحب نے پھر کمیٹی کو معذرت کا تار بھیج دیا کہ شیخ کا سفر نہیں ہو سکے گا، یہ خبر کمیٹی پر ایک حادثہ بن کر گری، کمیٹی کے صدر جناب ابراہیم محمد ابو ملحہ جو دبی کے اٹارنی جنرل بھی ہیں ہم سے لمبی گفتگو کی اور یہ بتایا کہ کل تراویح کے بعد شیخ محمد بن راشد کی مجلس میں بہت سے علماء مدعو تھے جن کی گفتگو کا موضوع شیخ ابوالحسن علی ندوی تھے، ان میں ڈاکٹر یوسف قرضاوی نے اس مجلس میں شیخ کے اوصاف بیان کئے اور یہ فرمایا کہ شیخ کو دیکھ کر صحابہؓ کرام کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اس لئے شیخ کے نہ آنے کا دینی حلقہ پر اور ہم پر بہت شدید اثر پڑے گا، اس ناچیز نے عرض کیا کہ مجھے چند دن کا موقع دیں مگر کمیٹی والے روزانہ ٹیلی فون کر کے میرا سر کھائے جا رہے تھے، ایک مرتبہ ڈیڑھ بجے رات میں فون آیا اور اصرار تھا کہ ہم سب آپ کو لے کر لکھنؤ چلیں گے میں نے ان سے عرض کیا کہ صبر کریں انشاء اللہ شیخ آئیں گے میں بات کروں گا، چند دن کے بعد یہ معلوم ہوا کہ حضرت کی طبیعت اچھی ہو رہی ہے، روزے بھی رکھ رہے ہیں، تراویح بھی پڑھ رہے ہیں، اور اندر گھر میں بھی تشریف لے گئے، میں نے فون سے معلوم کیا کہ مولانا رابع صاحب کہاں ہیں، معلوم ہوا کہ ندوہ میں تشریف رکھتے ہیں، میں نے فون سے رابطہ قائم کیا، دوسری لائن پر ابراہیم محمد ابو ملحہ مجھ سے بات کر رہے تھے، میں نے مولانا محمد رابع صاحب سے کہا کہ بہت نازک مسئلہ ہے دبی والے اسپیشل جہاز بھیجنے کے لئے تیار ہیں پورا وفد ساتھ جائے گا، ڈاکٹر بھی ساتھ ہوں گے، مولانا رابع صاحب نے فرمایا کہ ماموں جی کا موڈ اب سفر کا نہیں ہے، اور اس کا بدلنا بہت مشکل ہے اور یہ فرمایا کہ آپ ہی ہماری طرف سے معذرت کر دیں، میں نے کہا ابراہیم محمد ابو ملحہ فون پر ہیں، بڑی مشکل سے مولانا بات کرنے پر تیار ہوئے ان کی گفتگو کے بعد مولانا محمد رابع صاحب نے کہا کہ اپنی ساری گفتگو فیکس سے بھیجئے یہ لے کر میں ماموں جی کے پاس رائے بریلی جاؤں گا، فیصلہ کا انتظار کریں، بہر حال مولانا محمد رابع صاحب کی مساعی سے حضرت تیار ہو گئے معاملہ بڑا نازک تھا، اس لئے کہ صحت بڑی کمزور تھی معتکفین سے آئے ہوئے تھے بہر حال حضرت مولانا کی طرف سے یہ تار آیا کہ ہم چند گھنٹے کے لئے جمعرات کو دبی آئیں گے اور جمعہ کو لکھنؤ واپسی ہو جائے گی۔ پھر کمیٹی نے اس ناچیز سے رجوع کیا کہ بتائیے کہ جہاز جمعرات ہی کو جائے جس دن جلسہ ہو رہا ہے یا ایک دن پہلے جائے، جاڑے کا موسم ہے اور آسمان پر کہر ہے اگر جمعرات کو وقت پر جہاز نہ آسکا تو ہمارے لئے بڑی مشکل پیدا ہو جائے گی، عالم اسلامی کے بڑے بڑے علماء اور یہاں کے بہت سے وزراء اور شیخ محمد اس میں شریک ہوں گے، میں نے عرض کیا کہ میں کچھ دیر کے بعد آپ کو پکا جواب دے سکوں گا، رائے بریلی میں نے فون کیا تو مولانا واضح صاحب ملے، میں نے ان سے عرض کیا کہ حضرت سے جا کر درخواست کریں کہ اگر آسمان پر کہرا ہوا تو جمعرات کو نہیں پہونچ سکیں گے، حضرت نے میری رائے سے موافقت فرمائی چنانچہ یہ خصوصی جہاز بدھ کو ساڑھے تین بجے لکھنؤ پہونچا اور حضرت کو اور رفقاء سفر (مولانا محمد رابع صاحب ندوی، مولانا سلمان ندوی مولوی عبداللہ حسنی، بھائی عبدالرزاق اور بھائی عثمان حیدرآبادی) کو لے کر یہ جہاز افطار کے وقت دبی کے خصوصی ایرپورٹ پر پہونچا، جہاں حضرت کا استقبال کیا گیا، استقبال کرنے والوں میں کمیٹی کے ذمہ داران اور جناب عبداللہ غریر و مولانا سعید الاعظمی ندوی اور یہ ناچیز اور دیگر حضرات تھے، افطار اور مغرب کی نماز جناب عبداللہ غریر کے مکان پر ہوئی۔ وہاں تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد حضرت فندق البستان میں تشریف لائے جہاں قیام کرنا تھا۔ ہوٹل میں سکورٹی لگا دی گئی تھی کہ لوگ حضرت کو تنگ نہ کریں جمعہ کی رات کو جو دبی کی تاریخ سے اکیس رمضان کی شب تھی عشا کے بعد دبی کے خصوصی بڑے ہال میں جلسہ شروع ہوا جس میں امراء و حکام و علماء و خواص شریک تھے، ہال کھچا کھچ بھرا تھا۔ ولی عہد خود بھی

تشریف رکھتے تھے کئی مقررین نے حضرت کی زندگی کے کارنامے پر لمبی لمبی تقریریں کیں۔ اور حضرت مع خدام کے ہال سے متصل ایک کمرے میں بیٹھے انتظار کر رہے تھے کہ وقت پر حضرت تشریف لائیں گے، ہم لوگ بیٹھے انتظار ہی کر رہے تھے کہ ابوظبی سے نائب وزیر اعظم شیخ سلطان بن زاید آل نہیان کا اس ناچیز کے پاس فون آیا کہ میں اس وقت والد صاحب یعنی شیخ زاید بن آل نہیان کی مجلس میں ہوں، شیخ والد صاحب سے ملنے کب آئیں گے، چونکہ اس ناچیز نے ملاقات کا پروگرام پہلے سے طے کرالیا تھا، لیکن حضرت کی طبیعت کی کمزوری سے خاموشی اختیار کر لی تھی، میں نے عرض کیا کہ شیخ تو حاضر ہونا چاہتے ہیں والد صاحب اور آپ کی ملاقات کے لئے آنا چاہتے ہیں مگر صحت سے مجبور ہیں اگر جناب کل تراویح کے بعد تشریف لائیں تو بیحد خوشی ہوگی اور شیخ بہت دعائیں دیں گے، یہ کہہ کر میں نے ٹیلی فون حضرت کو بڑھا دیا اور حضرت مولانا نے سلام کے بعد اپنی معذوری بیان کی اور دعا دی۔ بہرحال حضرت جلسہ گاہ میں داخل ہوئے۔ ایوارڈ کا ولی عہد دبی نے اعلان کیا' اس کے بعد حضرت نے بہت مختصر تاریخی تقریر کی جو تعمیر حیات اور اخبارات میں آچکی ہے اور اس تکریم کا شکریہ ادا کرتے ہوئے یہ اعلان فرمایا کہ یہ رقم دینی مراکز کے لئے وقف ہے تو اس پر بہت تالیاں بجیں اور عربوں کو خطاب کرتے ہوئے یہ بتایا کہ میری پیدائش ہندوستان کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ہوئی ہے میرے والدین کی کوشش سے اللہ تعالیٰ نے مجھ کو یہ مقام دیا کہ آج آپ میری تکریم کر رہے ہیں جس پر میں آپ حضرات کا ممنون ہوں مگر ایک پیغام اپنے ساتھ لایا ہوں وہ علامہ اقبال کا ایک شعر ہے اس کا ترجمہ کیا ہے

نہیں وجود حدود و ثغور سے اس کا
محمدؐ عربی سے ہے عالم عربی

جس میں یہ پیغام تھا کہ عالم عربی کی روح محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے یہ سننا تھا کہ پورے مجمع پر آہ و بکا کا عالم طاری ہوگیا،" تالیوں سے ہال گونج رہا تھا۔ نکلتے وقت مصافحہ کا ہجوم تھا۔ بڑی مشکل سے نکالا گیا دوسرے دن صبح کو واپسی کا پروگرام تھا مگر حضرت کا اصرار یہ تھا کہ میں ہندوستانی مسلمانوں سے مل کر جاؤں گا، آپ نے مجھ پر پہرا بیٹھا رکھا ہے۔ اور مشورہ کے بعد مسجد عزیز میں نماز جمعہ اور حضرت کا بیان طے کیا گیا' اور جمعہ کو ہوٹل میں لوگ کثرت سے حضرت سے ملنے آئے جن میں بعض بڑے بڑے تجار اور ذمہ داران تھے۔ حضرت کے ایک ہی فقرے سے بعضوں پر گریہ طاری ہوگیا۔ بہرحال جمعہ کی نماز مسجد عزیز میں پڑھی گئی اور عزیزی مولوی سلمان ندوی نے ولولہ انگیز جمعہ کا خطبہ دیا اور حضرت کی ۲۰ منٹ کی تقریر ہوئی۔ جس میں تبلیغی جماعت اور تبلیغی کام کی اہمیت و ضرورت کو بیان کیا اور اس میں شرکت کی دعوت دی، واپسی میں حضرت نے مجھ سے فرمایا کہ مولوی تقی صاحب مجھ سے کون سا گناہ ہوا تھا کہ رمضان شریف میں مجھ کو یہاں بلایا گیا' میں نے عرض کیا کہ حضرت آپ کی تقریر سے عرب وعجم دونوں کو فائدہ ہوا' اور کتنے لوگ روئے اس پر انشراح ہوگیا۔ اسی دن عصر کے بعد مجھ کو بلایا کہ مولوی سعید کہہ رہے ہیں کہ شارقہ جانا ضروری ہے مجھ کو وہاں لے چلئے۔ جمعہ کے دن کوئی صورت اتصال کی نہ تھی لیکن حضرت ہی کی برکت تھی کہ حاکم شارقہ ڈاکٹر سلطان بن محمد القاسمی جس مجلس میں افطار کرتے تھے اس مجلس تک میرا فون پہونچ گیا کہ اس ناچیز نے پیغام پہونچایا کہ شیخ بات کرنا چاہتے ہیں۔ افطار کے بعد حاکم شارقہ نے مجھے فون کیا' میں نے عرض کیا کہ شیخ تو آپ کو یاد کر رہے ہیں اور آپ سے ملنا بھی چاہتے ہیں۔ مگر اپنی صحت سے معذور ہیں، انھوں نے فرمایا کہ لا، لاتأتی بالشیخ نحن نأتی الیہ۔ نو بجے کا وقت طے ہوا چنانچہ ان کے آنے سے پہلے پورا ہوٹل خالی کرا دیا گیا اور پولیس کے انتظام میں آگیا تھا، ہم چند خدام اور کمیٹی کے لوگ رہ گئے تھے چنانچہ بڑھ کر ہم نے شیخ کا استقبال کیا اور حضرت کے پاس بیٹھ کر آدھے گھنٹے کے بعد واپس گئے اس کے بعد ابوظبی سے فون آیا کہ شیخ سلطان ابن زاید آرہے ہیں۔ ٹی وی، ریڈیو والے سب اکٹھا ہو گئے ہم نے بڑھ کر استقبال کیا انھوں نے سلام و مصافحہ کے بعد حضرت مولانا کو اپنے والد صاحب کا سلام پہونچایا' اور ۲۰ منٹ کے بعد واپس ہو گئے، اور دوسرے دن ۲۲ رمضان المبارک بروز شنبہ صبح لکھنؤ واپسی ہوئی اور وہ نورانی مجلس، وہ صحبتیں وہ ماحول جو رمضان المبارک میں دبی میں پیدا ہو گیا تھا خاص طور سے فندق البستان میں دیکھنے والوں کو تا زندگی یاد رہے گا۔ افسوس صد افسوس کہ یہ رمضان المبارک جس میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہونے کی سعادت نصیب ہوئی اور چار دن رہنے کا موقع ملا، وہ انوار و برکات کی بارش ہو رہی تھی کہ حضرت رائے پوریؒ کی یاد تازہ ہو جائے، اس موقع پر فرمایا کہ امسال انعام کس کو ملے گا' میں نے عرض کیا بادشاہ کو اور حضرت کو تو بادشاہوں سے پہلے انعام مل چکا ہے، حضرت اس پر ہنسے کیونکہ یہ انعام اس سال شیخ زاید بن سلطان آل نہیان کو دیا گیا لیکن افسوس صد افسوس کہ واپسی کے بعد مکہ مکرمہ میں یوم جمعہ ۲۲ رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ مطابق ۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ء کو یہ اطلاع ملی کہ حضرت ہم سب کو روتا بلکتا چھوڑ کر رخصت ہو گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو حضرت کے بتائے ہوئے طریقے پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے ان کی قبر پرانوار کی بارش نازل فرمائے۔ آمین

آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

(بقیہ) حضرت مولانا مشائخ کی ......

بااصرار مقدمات لکھا یا کرتے حالانکہ اس وقت دیگر علمائے کبار اور مشائخ عظام بھی موجود ہوتے تھے۔ حضرت شیخ نے ایک مرتبہ تحریر فرمایا کہ بلاتصنع اور بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں کہ آپ کے تعلق کو اپنے لیے وسیلۂ نجات سمجھتا ہوں بہر حال تمام اکابرین آپ سے والہانہ مخلصانہ، عاشقانہ محبت وانسیت کا معاملہ فرماتے اور بڑی قدر ومنزلت اور عزت و احترام کی نگاہوں سے دیکھتے تھے جس کو بجا طور پر محبوب العلماء کہنا آپ ہی کا حق ہے، ایسا عظیم حادثۂ فاجعہ اور عالم اسلام کے لئے خلا ہونے کے بعد بھی حضرت رح کی تمام تحریکات اور ندوہ اپنے تشخص و مشن کے ساتھ قائم ہے جس میں اکابر کے خلوص حضرت رح کی انتھک محنت، لگن، تڑپ اساتذہ کارکنان کا حسنِ عمل اور سچے جانشین مولانا محمد رابع حسنی کی فراست علمی دوراندیشی علم نوازی سنجیدگی کا کلیدی کردار ہے جس کے باعث ندوہ اپنی روایات اور اکابر کے نقوش قدم پر منازل ترقی کی طرف بہت تیزی کے ساتھ رواں دواں ہے۔ حق تعالیٰ حضرت رح مولانا کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ندوہ کو سدا بہار رکھے اور تمام مکروہات سے حفاظت فرمائے، آمین

وہ دیدہ ور وہ مدبر، مجددِ دوراں

حفیظ محمود بلند شہری

زمیں پہ علم وعمل کے وہ آسماں نہ رہے — جو ہم پہ سایہ فگن تھے وہ سائباں نہ رہے
وہ حق شناس وہ حق گو وہ حق بیاں نہ رہے — وہ شیخِ وقت وہ علامۂ زماں نہ رہے
ہزار حیف کہ سالارِ کارواں نہ رہے — ہمارے حضرت والا علی میاںؒ نہ رہے

وہ دیدہ ور وہ مدبر، مجددِ دوراں — وہ اپنے وقت کا نباض وہ حکیم زماں
تمام ملتِ اسلامیہ کا دل اور جاں — وفات جس کی ہے ملت پہ غم کا کوہِ گراں
الٰہی صبر عطا کر گھڑی ہے یہ غم کی — کہ موت عالم دیں کی ہے موت عالم کی

اک ایسا پھول جو مہکا تمام دنیا میں — اک ایسا ابر جو برسا تمام دنیا میں
وہ ماہتاب جو چمکا تمام دنیا میں — وہ مہر جس کا اجالا تمام دنیا میں
وہ جس کا نور اندھیروں پہ ضرب کاری ہے — وہ چھپ گیا ہے مگر اس کا فیض جاری ہے

وطن میں اپنے بعنوان پیامِ انسانی — خدا کے بندوں کو دیتے تھے درسِ وحدانی
تڑپ تھی دل میں کہ ہو مشکلوں میں آسانی — نشاط عام ہو خوشیوں کی ہو فراوانی
ہمارے ملک کا ہر فرد شاد ہو جائے — وہ چاہتے تھے یہاں اتحاد ہو جائے

ادیب ایسا کہ جس پر زبان فخر کرے — مقرر ایسا کہ جس پر بیان فخر کرے
وہ جس کے نظم پہ ندوہ کی شان فخر کرے — بجا ہے اس پہ جو ہندوستان فخر کرے
وہ چرخِ عالمِ اسلام کا مہِ کامل — کہ جس کے فیض سے روشن ہوئے دماغ و دل

وہ خوش خیال، وہ خوش خو، وہ خوش زبان و کلام — عظیم داعیٔ دیں وہ مفکر اسلام
تمام دنیا کو دیتا پھرا جو حق کا پیام — وہ جس نے رد کئے باطل عقائد و اوہام
جو لب کشا کبھی ہوتا وہ داعیٔ اسلام — تو ہوتے کفر کے ایوان لرزہ براندام

یقین رکھتے تھے کامل خدا کی قوت پر — کہ مشکلوں میں بھی قائم رہے صداقت پر
نظر رکھی نہ کبھی جاہ ومال ودولت پر — ہزاروں عظمتیں قربان ان کی عظمت پر
بلند ہو کے بھی ظاہر میں پست رہتے تھے — وہ شاہ جو کہ فقیری میں مست رہتے تھے

تھی معرفت کی وہ مے دل کے آبگینے میں — سرور جس کا چھلکتا تھا ہر قرینے میں
خدا رسول صلعم کی الفت بھری تھی سینے میں — حرم میں مکہ پہونچتے کبھی مدینے میں
ہیں ان کی خوبیوں سے کم یہ میری تعبیریں — ان کا اصل تعارف ہیں ان کی تحریریں

عجم سے تا بہ عرب ترجمانِ دینِ حنیف — وہی کہ جن سے لرزتے تھے دینِ حق کے حریف
خدا کے فضل سے یہ بھی ہے ان کی اک تعریف — کہ ان کو سونپی گئی تھی کلیدِ کعبہ شریف

حفیظ میری دعا ہے قرار ان کو ملے
جوارِ رحمتِ پروردگار ان کو ملے

مرشد روحانی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا

نظریۂ تزکیہ و سلوک

مولانا عبدالکریم پاریکھ (ناگپور)

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین و رحمۃ للعالمین۔

عالم ربانی حقانی مصلح امت حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کے بے شمار گوشے ہیں۔ دینی، علمی، فکری، تعلیمی، تربیتی، تصنیفی و تالیفی اسی میں "تزکیہ و سلوک" بھی ایک اہم گوشہ ہے۔

اللہ نے اپنے بندوں کی اصلاح کے لئے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک برابر انبیاء و مرسلین کو مبعوث فرمایا تاکہ یہ مقدس گروہ تعلیم و تربیت، تزکیہ و طہارت، حکمت و دانائی کی باتیں لوگوں کو سکھانے کا فریضہ انجام دیتا رہے۔ جب انسانیت علم و قلم کے چوراہے پر آ کھڑی ہوئی تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین، رحمۃ للعالمین بنا کر مبعوث فرمایا گیا۔ اور قرآن مجید نامی آسمانی "ہدایت نامہ" آپؐ پر نازل کیا گیا۔ اس طرح رہتی دنیا تک کے انسانوں کے لئے "ہدایت" کے دروازے کھول دیئے گئے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

"نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ۝ عَلَىٰ قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ ۝"
(۲۶۔ الشعراء آیت ۱۹۳۔۱۹۴)

اس کو امانت دار فرشتہ لے کر اترا ہے (یعنی اس نے) تمہارے دل پر (القاء) کیا ہے تاکہ (لوگوں کو) نصیحت کرتے رہو۔

قلب کی اصلاح

"قرآن مجید" حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پر اتار کر اللہ تعالیٰ نے انسانی زندگی کے جملہ معاملات کو وحی کی روشنی سے منور فرما دیا۔ انسانیت کے عقل و دماغ اور قلب کی اصلاح کے راستے کھول دیئے۔ ۱۳ سالہ مکی زندگی اور ۱۰ سالہ مدنی زندگی کل ۲۳ سال میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کتاب اللہ کی نورانی کرنوں سے انسانیت کو منور کر دیا۔ دین اسلام اپنی اصلی چوکھٹ پر قائم ہو گیا۔ نبیؐ نے مکمل طور پر منصب نبوت کا حق ادا کر دیا۔ اور "خیر امت" کے نام سے آخری امت کی تشکیل جدید ہوئی "خلافت علی منہاج النبوۃ" کا قیام عمل میں آیا۔ اور ملکوں ملکوں میں ایمان کی نہریں جاری ہو گئیں۔

تختِ سلطنت

دین و ایمان کی بنیاد پر سلطنتوں اور حکومتوں کا قیام بھی ہوتا رہا۔ چونکہ دنیا دارالامتحان ہے لہٰذا حق و باطل کی کشمکش اور ایمان و نفاق کا کھنچاؤ و تناؤ کا تسلسل بھی جاری رہا۔ ادھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کے مقابلے میں شیطان بھی اپنے قدیم و جدید ہتھیاروں سے لیس ہو کر امت پر اپنا زور آزماتا رہتا ہے۔ نیز تختِ سلطنت پر جو لوگ بیٹھے بقول قرآن مجید "مِنْهُمْ مُهْتَدٍ وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ فَاسِقُونَ" حکمرانوں کا ایک طبقہ ہدایت یافتہ ہوا جو دین اور ایمان کا خادم بنا رہا اور حکومت و سلطنت کے وسائل و اسباب کا استعمال دعوت دین میں ہوتا رہا۔ لیکن دوسرا طبقہ فاسقوں فاجروں کا بھی رہا جو حکومت و سلطنت جیسی نعمت پر قابض ہوا اور عیش و عشرت میں یادگاریں قائم کرنے اور آپسی مارکاٹ کرنے میں اپنا وقت صرف کرتا رہا۔ اس امت میں جیسے ہی یہ صورت حال پیدا ہوئی تو علماء امت مبلغین و مصلحین کے بڑے بڑے افراد الحمد للہ دعوت و اصلاح کے میدان میں آ کھڑے ہوئے اور اپنے اپنے طور پر انسانوں کے قلوب کی اصلاح اور ان کے نفوس کے تزکیہ کے لئے ہر زمانے میں متحرک رہے جبکہ سرمایہ کے لحاظ سے ان کے پاس کوئی طاقت نہیں تھی۔

سلسلۂ بیعت

ناساعد اور سخت حالات کا بھی ان کو سامنا کرنا پڑا پھر بھی ہر زمانے میں ان پاکباز نفوس نے دعوت دین، اصلاح حال اور تزکیۂ نفس کا اہم فریضہ انجام دیا۔ اس کے لئے ان حضرات نے سنت نبوی کا وہ اسلوب اختیار کیا جو مکی دور کا تھا۔ جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو ان کے رب کی طرف بلانے کا کام انجام دیا۔

"اُدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۝"
(النحل آیت ۱۲۵)

(اے پیغمبرؐ) لوگوں کو دانش اور نیک

نصیحت سے اپنے پروردگار کے رستے کی طرف بلاؤ، اور بہت ہی اچھے طریقے سے ان سے مناظرہ کرو۔

سنیاس یا رُہبانیت نہیں

حکمت اور دانائی اور تزکیہ وسلوک پر نہایت خوبی سے یہ کام کرنے والے نفوس قدسیہ مرشد، صوفی اور پیر وغیرہ کے نام سے مشہور ہوئے لیکن یہ لوگ سنیاسی، رہبان یا تارک الدنیا درویش نہیں تھے بلکہ دعوتِ دین میں سنت کے طرز پر راہِ سلوک طے کرنے اور کرانے والے تھے، حکومت سلطنت تو ان کے پاس تھی نہیں کہ وہ اپنا بادشاہی حکم چلا سکتے، اس لئے انھوں نے اس راہ سلوک کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ میں سلسلۂ بیعت کو اختیار کیا ان کے پاس حکومت کی طاقت نہیں تھی سادہ اور موٹا لباس اور کم سے کم ضروریاتِ زندگی کے سبب یہ حضرات صوفیاء کہے جانے لگے اسی وجہ سے لفظ تصوف بھی ان کے نام کے ساتھ جاری ہوا۔

مرشدنا حضرت مولانا علی میاںؒ نے زندگی سادہ گذاری اوسط درجے کا رہن سہن، لباس ہیں، وضع قطع میں کوئی بناوٹ نہیں۔ عام آدمیوں سے ملے تو کیا، وزراء، اعلیٰ افسران اور بادشاہ تک بھی ملاقات کو آئے تو کبھی بھی آپ نے تصنع یا خود نمائی سے کام نہیں لیا۔ نیز اپنے متعلقین سے بھی کبھی سختی سے پیش نہیں آئے بلکہ ہمیشہ لطف وکرم کا معاملہ کرتے تھے۔

اللہ کی ایک رحمت

سالک کی غلطی پر نہایت حکیمانہ انداز سے ایسی تربیت فرماتے کہ سننے والا اپنی غلطی کو درست کرنے میں لگ جاتا۔ آپؒ نے کھنچاؤ، تناؤ، غیظ وغضب سے پرہیز کیا۔ حضرتؒ کا یہ وصف بیسویں صدی کے عوام وخواص سیاست دانوں بادشاہوں اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے اللہ کی ایک رحمت بن گیا۔ لیکن حضرت مولاناؒ نے کبھی بھی صوفی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔

دو طریقے ظاہر ہوئے

سلطنتیں حکومتیں لڑکھڑاتی رہیں، کرسی نشینوں میں فسق ونفاق بھی آنے لگے، اس امت کی تشکیل دعوتِ دین وایمان کی بنیاد پر ہوئی ہے جب تک خلافت علی منہاج النبوۃ کا دور رہا اس وقت تک دعوت الی اللہ اور سلطنت وحکومت کے امور ایک ساتھ انجام پاتے رہے لیکن اس کے بعد دو طریقے ظاہر ہوئے ایک سلطنت کا اور ایک بلا اقتدار دعوت الی اللہ کا، یعنی لوگوں کو اللہ کی طرف بلانے اور انسانوں کی دینی تربیت اور اصلاح کے کام کے لئے ہزار ہا ہزار لوگ کھڑے ہوگئے۔ اقتدار پر فائض لوگ صحیح رخ پر چلیں سبحان اللہ، نہ چلیں استغفر اللہ، مگر علماء صلحاء اور صوفیاء کرام قلوب کی اصلاح کا کام برابر کرتے رہے۔ سرمایہ کے لحاظ سے بھی کوئی طاقت ان کے پاس نہیں تھی، ان کے پاس تو قول وعمل کی صداقت تھی۔ "وَجَاءَ بِقَلْبٍ مُّنِيبٍ" (اور رجوع لانے والا دل لے کر آیا)، کے تحت انھوں نے تزکیۂ نفوس اور تطہیر قلوب کا کام انجام دیا۔ اور دعوت الی اللہ کی راہ ہموار کرنے میں لگے رہے۔ بیعت اور ارشاد اور سلوک کے ذریعہ آدمی کو صراط مستقیم پر چلنا آسان ہو جاتا ہے۔ جس کے سبب بندہ رضائے الٰہی کا مستحق بن جاتا ہے۔ ذیل میں ہم قرآن مجید سے وہ آیات نقل کرتے ہیں جو بیعت وارشاد کے مضمون پر مشتمل ہیں۔

بیعت کے ذریعہ دعوت کا طریقہ

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَاءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ يُبَايِعْنَكَ عَلَىٰ أَن لَّا يُشْرِكْنَ بِاللَّهِ شَيْئًا وَلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِينَ وَلَا يَقْتُلْنَ أَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَأْتِينَ بِبُهْتَانٍ يَفْتَرِينَهُ بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِينَكَ فِي مَعْرُوفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ○

(الممتحنہ آیت ۱۲)

اے پیغمبر! جب تمہارے پاس مومن عورتیں اس بات پر بیعت کرنے کو آئیں کہ خدا کے ساتھ نہ تو شرک کریں گی اور نہ بدکاری کریں گی۔ اور نہ اپنی اولاد کو قتل کریں گی اور نہ اپنے ہاتھ پاؤں میں کوئی بہتان باندھ لائیں گی اور نہ نیک کاموں میں تمہاری نافرمانی کریں گی۔ تو ان سے بیعت لے لو۔ اور ان کے لئے خدا سے بخشش مانگو۔ بیشک خدا بخشنے والا مہربان ہے۔)

تزکیہ وسلوک کی مبارک کڑی

مرد تو مرد خواتین کو بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سلسلۂ بیعت میں شریک کیا تاکہ ایمان والے معاشرہ میں اللہ کی توحید عام ہو، شرک، بدعات، خرافات، چوری، بدکاری، زناکاری، قتل، بہتان، جھوٹ، غیبت، چغل خوری وغیرہ گناہوں سے انسانوں کو بچایا جائے۔ ایسے لوگوں کے لئے نبی کی طرف سے استغفار کا تحفہ بھی وارد ہوا ہے۔ تزکیہ وسلوک کی اس مبارک کڑی میں جن نفوس قدسیہ کے نام بہت مشہور ومعروف ہیں۔ ان میں ایک نام نامی مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ ان کے دستِ مبارک پر اس امت کے لاکھوں لوگ سلسلۂ بیعت میں منسلک ہوئے اور الحمد للہ انھیں فیض بھی پہنچا ہے کسی کام کو کرنے کے لئے جب مختلف لوگ اٹھتے ہیں تو طریقۂ کار

میں کچھ نہ کچھ اختلاف ہوتا ہی ہے یہ قدرتی بات
ہے ۔اور کچھ اختلافی مسائل بھی اٹھ کھڑے ہوتے
ہیں لہٰذا طریقۂ کار کے اختلاف و مسائل میں
بہت زیادہ بحث و تکرار نہ کرتے ہوئے اصلاحِ قلب
اور نفس کا تزکیہ جو اس سلسلہ کا اہم فائدہ ہے
اسی کی طرف توجہ فرمائی ۔

حضرت مولاناؒ نے سلسلۂ بیعت وارشاد
اور راہ سلوک میں اختلافی مسائل سے ہٹ کر
کتاب وسنت کی روشنی میں بیسویں صدی میں
کارخیر کو ایسی حکمت عملی دانش مندی اور دانائی
سے چلایا کہ جس کے سبب الحمدللہ ثم الحمدللہ حضرتؒ
کی تربیت سے لاکھوں لاکھ لوگ راہ حق کو پالینے
میں کامیاب ہوگئے ۔ اور اس طریقۂ کار پر ناک
بھوں چڑھانے والے بھی حضرت مرشدنا کے
ہاتھ پر الحمدللہ بیعت ہوگئے ۔

مروجہ پیری مریدی

بعض کم علم اور نادان لوگوں نے سلسلۂ بیعت
کا مذاق بھی اڑایا ہے، اس کی ایک وجہ تو یہ ہے
کہ کتاب وسنت پر ان کی گہری نگاہ نہیں ہے اور دوسری
وجہ یہ ہے کہ بعض پیشہ ور اور مال وجاہ کے حریص
لوگ اس سلسلہ میں داخل ہوگئے اور اصلاحات
کے بجائے خرابیاں اور بداعتقادیاں پیدا ہوگئیں،
جتھے اور مسلک بن گئے اور اس ٹولی بازی اور
مسلک کی لڑائی نے دین وشریعت کی جگہ لے لی۔
مگر ہمارے اکابر نے تزکیہ وسلوک کے بارے
میں جو نظریہ اور طریقۂ کار پیش کیا ہے۔ وہ عین
کتاب وسنت کے منشاء کے مطابق ہے اور خلق کثیر
کو اس سے نفع پہونچا ہے۔

بعض اہل علم اور مخلص لوگ بھی سلسلۂ بیعت
کا نام پیری مریدی رکھ کر اس پر لعن طعن کرتے
ہیں اور اعتراض بھی کرتے ہیں۔ چونکہ اصلاحِ
امت کا یہ طریقہ نبوی طریقہ تھا اس لئے اسے
مٹایا نہیں جاسکتا۔ ہمارے اس دور میں مرشد محترم
حضرت اقدس مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ
نے بیعت کے طریقہ میں ایسا طرز اختیار کیا جس کی
سنتِ نبویؐ سے مماثلت تھی۔ مولانا علی میاں صاحبؒ
کا طریقۂ بیعت موجودہ کاروباری پیری مریدی
کا کبھی نہیں رہا۔ بلکہ عین سنت قائمہ کے دائرے
کے اندر راہ سلوک میں تزکیہ نفس اور تربیت کا رہا۔

قرآن مجید اور سنت نبویؐ

حضرت اقدس مولانا علی میاں صاحبؒ
سلسلۂ بیعت میں حضرت مولانا شاہ عبدالقادر
رائے پوریؒ اور حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ
سے منسلک تھے اور ان کے علاوہ بہت سی اہم
شخصیات سے روحانی اور علمی فیوض آپ نے حاصل
کئے تھے جس کے سبب آپ کے سینے میں بے شمار
لوگوں کے فیوض کا عطر یکجا ہوگیا تھا۔ میں نے بھی
دیکھا ہے اور آپ بھی میری بات کی تصدیق
کریں گے کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے کے کثیر افراد نے
سلسلۂ بیعت میں حضرت مولانا علی صاحبؒ سے
منسلک ہوکر کسبِ فیض کیا۔ میرے نزدیک اس
کا سب سے بڑا کریڈٹ قرآن مجید اور سنت نبویؐ
کو ہے۔ آپ کی صحبت وتربیت میں جو بھی رہا اللہ
تعالیٰ نے اس کی ظاہری باطنی روحانی کیفیات کو
بلندی پر پہونچا دیا اور ان کی زندگی کے تمام معاملات
شریعت کے سانچے میں ڈھل گئے۔

نظریۂ تزکیہ وسلوک

اس وقت ایسے مؤقر اور جیدہ نیز صاحب علم
وفکر مجمع کے سامنے "تزکیہ وسلوک" کے نظریے پر
بحث نہ کرتے ہوئے حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ
کے طرز اصلاح وتربیت کی وضاحت اور اس کا تذکرہ
مقصود ہے، آپؐ سے جو بھی قریب ہوا وہ "فَبِمَا
رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ" کے تحت حضورؐ والا
کی محبت ومؤدت، ترحم اور نرمی کا اسیر ہوا تعلیم
نبویؐ کی جو نورانی کرنیں آپؐ کی ذات میں موجود
تھیں اس کا عکس ہر ایک نے اپنی طلب اور استعداد
کے مطابق اخذ کیا اور جو شخص بھی بیعت کے سلسلے
میں حضرت مولانا علی میاںؒ سے جڑا وہ دنیا اور
آخرت کے اعتبار سے کچھ نہ کچھ بن گیا سلسلۂ بیعت
بہت اہم اور بڑی بھاری نعمت ہے ارشاد الٰہی ہے؛

" اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ
اللّٰهَ یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ فَمَنْ
نَّكَثَ فَاِنَّمَا یَنْكُثُ عَلٰی نَفْسِهٖ وَمَنْ
اَوْفٰی بِمَا عٰهَدَ عَلَیْهُ اللّٰهَ
فَسَیُؤْتِیْهِ اَجْرًا عَظِیْمًا" (الفتح آیت ۱۰)

جو لوگ تم سے بیعت کرتے ہیں وہ خدا
سے بیعت کرتے ہیں۔ خدا کا ہاتھ ان کے
ہاتھوں پر ہے پھر جو عہد کو توڑے تو
عہد توڑنے کا نقصان اسی کو ہے اور جو
اس بات کو جس کا اس نے خدا سے
عہد کیا ہے پورا کرے تو وہ اسے عنقریب
اجر عظیم دے گا۔

دل کا اندھاپن

اس آیت کے متن اور ترجمہ پر نظر ڈالنے
کے بعد یہ کہنے میں کیا حرج واقع ہوگا کہ سلسلۂ بیعت
کا تعلق وثبوت قرآن سے ہے اور یہ ایک اہم عنوان قرآنی
ہے۔ انسانوں کے قلب کی صفائی وتطہیر کے لئے
بہترین تحفۂ ربانی ہے۔ کیا خوب ارشاد فرمایا رب
تعالیٰ نے ۔

"فَاِنَّهَا لَا تَعْمَی الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَی
الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ۔
(سورۂ حج آیت ۔۴۶)

بات یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ جو سینوں میں ہیں (وہ) اندھے ہوتے ہیں۔

تربیت نفس کا کورس

معلوم ہوا کہ دل کا اندھا پن پوری زندگی تباہ کرکے رکھ دیتا ہے۔ دل کی اصلاح کے لئے تربیتِ نفس کا وہ کورس جسے کتاب و سنت کے آئینے میں حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ نے پورے اخلاص اور محبتِ الٰہی کے تحت اختیار فرمایا وہ ہم جیسے عاصیوں کے لئے ایک نعمتِ ربانی ہے۔ دلوں کی اصلاح کے لئے دل والوں کے ساتھ رہنا اٹھنا بیٹھنا بہت مفید ہے۔ اور منشاءِ الٰہی کے مطابق ہے۔ ذیل کی آیت ملاحظہ فرمائیں۔

"وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ تُرِيدُ زِينَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَن ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَكَانَ أَمْرُهُ فُرُطًا"

(الکہف آیت ۲۸)

اور جو لوگ صبح و شام اپنے پروردگار کو پکارتے ہیں اور اس کی خوشنودی کے طالب ہیں ان کے ساتھ صبر کرتے رہو اور تمہاری نگاہیں ان میں سے (گذر کر اور طرف) نہ دوڑیں کہ تم آرائش زندگانی دنیا کے خواستگار ہو جاؤ اور جس شخص کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور وہ اپنی خواہش کی پیروی کرتا ہے اور اس کا کام حد سے بڑھ گیا ہے اس کا کہنا نہ ماننا۔

آیت سے معلوم ہوا کہ ایمان والے کو چاہئے کہ ہمیشہ نیک بخت لوگوں کی صحبت میں رہے برے لوگوں کے پاس جانا بھی پڑے تو نصیحت کرکے سرک جائے ان کی محفل میں جی لگا کر نہ بیٹھے اور بدکاروں کی محفل میں رنگ رلیاں اور دنیا کی زینت و رونق دیکھ کر اللہ کے ذکر سے غافل نہ ہو ورنہ پھسل جانے کا ڈر ہے بری صحبت کا اثر پڑتا ہے۔ اس لئے ہر طرح اس سے پرہیز کرے مگر نصیحت کرنے کے لئے اجازت ہے۔

صالح بندوں کی صحبت کا اثر

سورہ کہف کی آیت ۶۰ سے ۸۲ تک ۲۳ آیات میں حضرت موسیٰ اور حضرت خضر کی ملاقات کا جو بیان آیا ہے اس میں بھی بیعت و ارشاد کے تعلق سے بیشتر مضامین مل سکتے ہیں۔ اس مضمون میں ہم صرف اتنا لینا چاہیں گے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ملاقات حضرت خضر سے ہوئی تو حضرت موسیٰ نے کہا۔

"هَلْ أَتَّبِعُكَ عَلَىٰ أَن تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا" (الکہف آیت ۶۶)

جو علم (خدا کی طرف سے) آپ کو سکھایا گیا ہے آپ اس میں سے مجھے کچھ بھلائی کی باتیں سکھائیں تو میں آپ کے ساتھ رہوں۔

ان آیات بینات سے معلوم ہوتا ہے کہ علم و تزکیہ کے لئے کسی کی اتباع کرنا اس کے ساتھ رہنا ضروری اور مفید ہے اور تزکیہ قلوب و تطہیر نفس کے لئے اللہ کے صالح بندوں کی صحبت میں کچھ دن رہنا چاہئے۔ مبارک ہیں وہ لوگ جنہوں نے حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کے دست مبارک پر بیعت کی۔ مولانا علی میاں صاحبؒ نے مسترشدین کی تربیت و تعلیم اس طرح فرمائی کہ کہیں بھی ریا و نمود اور دکھاوا کا شائبہ نہ رہا۔

حرام سے اجتناب

بس اللہ کے گناہگار بندوں کو اللہ غفور رحیم کی بارگاہ میں توبہ کراتے اور بہت لمبے چوڑے وظائف بھی نہ بتاتے۔ متوسلین کی مشکلات کا بھی خیال رکھتے تاکہ ہر طبقہ کے لوگ اپنی طلب و استعداد کے مطابق اپنے قلب و دماغ اور فکر و نظر کی اصلاح کروانے میں کامیاب ہوسکیں۔

لاکھوں لاکھ لوگوں کے قلوب کی اصلاح کرنا، اعمال صالحہ کی پابندی اور محرمات اور منہیات سے اجتناب کرنے کی طرف متوجہ کرنا، اللہ کی محبت و ملاقات کا شوق دلانا، دنیا کے مال و متاع سے کچھ پرے رہ کر استغنا کی زندگی گذارنا ہمارے اس دور میں آسان کام نہ تھا۔

لیکن حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ نے تزکیہ و احسان کی اس راہ کو اس دور کے لوگوں کے لئے آسان کرنے میں کامیابی حاصل کی۔

بیعت والے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ

تزکیہ و سلوک میں بیعت کا تذکرہ اس مضمون میں قرآن مجید کی آیتوں کے حوالے سے ہم نے پیش کر دیا ہے۔ سلسلۂ بیعت میں دور اول کے افراد کا ہاتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک میں پہونچ کر اہل ایمان کے فوز و فلاح کا ذریعہ بن گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک میں بیعت کو قرآن مجید میں ان الفاظ سے ذکر کیا گیا ہے۔ "يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ" (جس نے نبیؐ کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیا اس پر اللہ کا ہاتھ ہے۔)

نیز قرآن مجید میں یہ ارشاد بھی موجود ہے۔

"فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ وَذٰلِكَ هُوَالْفَوْزُ الْعَظِيْمُ" (التوبہ آیت ١١١)
تو جو سودا تم نے اس سے کیا ہے اس سے خوش رہو اور یہی بڑی کامیابی ہے۔

سچی بیعت پر اللہ راضی

اوپر درج شدہ آیت میں اللہ کی رضامندی کی بشارت موجود ہے۔ گو وہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے لئے ہے مگر سلسلہ بیعت میں داخل ہونے والے ہر دور کے لوگ، خاص و عام اللہ کی رضا اور بشارت کے مستحق ہو سکتے ہیں۔ ایک اور جگہ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے۔
"لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ" (الفتح آیت ١٨)
(اے پیغمبر) جب مومن تم سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے تو خدا ان سے خوش ہوا اور جو (صدق و خلوص) ان کے دلوں میں تھا وہ اس نے معلوم کر لیا تو اس پر تسلی نازل فرمائی۔

بیعت میں خواتین کے لئے ایک سہولت

بیعت لینے والے اور بیعت کرنے والے ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیتے ہیں۔ سلام ہو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر کہ مردوں کی بیعت تو دست مبارک میں ہاتھ لے کر قبول فرمائی۔ لیکن کسی خاتون کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بیعت نہیں کی بلکہ کسی پیالے میں پانی ڈال کر اپنا دستِ مبارک پانی بھرے پیالے میں داخل فرما دیتے اور پھر خواتین تک یہ پانی بھرا پیالہ پہونچا دیا جاتا، وہ بھی اس میں ہاتھ ڈال کر بیعت اور توبہ کے الفاظ دہرا کر بیعت ہو جاتیں۔ اسی احتیاط اور نبوی طریقہ پر مصلح امت حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ بھی عمل پیرا رہے۔ اور بیعت کے وقت کبھی کسی خاتون کے ہاتھ کو ہاتھ میں لے کر بیعت نہیں فرماتے بلکہ چادر کا ایک سرا آپ پکڑ لیتے اور دوسرا سرا بیعت ہونے والی خاتون پکڑ لیتی۔ زیادہ مجمع ہونے پر چادریں ایک دوسرے سے جوڑ کر دراز کر دی جاتیں۔ خواتین کے لئے بڑی سہولت ہوتی اور الحمد للہ پردے اور حجاب کا شرعی تقاضہ بھی پورا ہوتا۔

بیعت میں صحابہؓ کا طریقہ

صحابہ کرامؓ اور سلف صالحین کا بیعت ہونے کا یہی طریقہ رہا ہے۔ اس نبوی طرز کے علاوہ جو لوگ بیعت کا طریقہ اختیار کرتے ہیں وہ معتبر اور بابرکت نہیں ہے۔ اس سے احتراز کرنا لازم ہے۔
ہر زمانے کے وہ جعلی پیر و فقیر جو بنا و ٹی مذہبیت چلا کر عوام کو اپنے سامنے سجدہ کراتے ہیں، نذرانے وصول کرتے ہیں اور بخشش کے پروانے بانٹتے ہیں اور مخلوق کو گناہ پر دلیر کرتے ہیں ان کے سبب طریقہ سلوک کی بدنامی ہوتی ہے۔
حضرت مرشدنا علی میاں صاحبؒ نے اپنے قلم اور زبان سے مشرکانہ اور غیر سنت والے طریقۂ کار کی زندگی بھر سختی سے مذمت فرمائی اور سنت رسولؐ کو ہمیشہ اپنے طریقۂ کار میں اولیت پر قائم رکھا۔
بس۔ یہ طریقۂ سلوک بیسویں صدی میں حضرت مولانا علی میاںؒ کا تزکیہ اور سلوک کا نظریہ ہے۔ جو کتاب و سنت سے ہر طرح ثابت ہے۔

حضرت مولانا علی میاں ندویؒ

مشائخ کی نظر میں

مولانا عبد اللہ مغیثی۔ مہتمم جامعہ اسلامیہ گلزار حسینیہ اجراڑہ، میرٹھ

ہمہ جہت و ہمہ گیر، صاحب کردار شخصیت سینکڑوں سالوں میں نمودار ہوتی ہے۔ بیسویں صدی کی ایک ایسی عظیم شخصیت ایک خطۂ مجاہدین میں پیدا ہوئی جس کو دنیا مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی کے نام سے جانتی ہے، صدیوں سے جو گھرانہ اپنے زہد و تقویٰ، قناعت پسندی، اخلاص و للّٰہیت اور جہاد اسلامی کے جذبہ سے معمور تھا جو اسلام کی عظمت و سربلندی کے لئے کفن بردوش اور جان ہتھیلی پر رکھ کر باطل طاقتوں سے برسرِ پیکار رہا اور اسلامی ہند کی تاریخ میں اپنا ایک پُروقار مقام بنایا اور دین کی عظمت کے لئے میدانِ جہاد میں جان دے دی یہاں تک کہ اپنی قبر کا نشان بھی نہیں بننے دیا۔ حضرت مولانا علی میاںؒ اسی گھرانے کے فرد فرید اور اسی سنہری زنجیر کی ایک اہم کڑی تھے، حضرت مولاناؒ دعوت و عزیمت کے امام توحید و سنت اور منہج سلف صالح کے علمبردار، داعی الی اللہ عارف باللہ، صاحب طرز انشا، پردازادیب، اسلاف ذی شان کے کامیاب سوانح نگار تھے، اور مسلمانانِ ہند کی ذہنی فکری تحریکوں کے روح رواں دنیا دی شان و شوکت عہدہ و منصب کو ٹھکرا دینے والا اسلام اور اسلامی اقدار کے تحفظ و بقا کے لئے قلندرانہ عزم و ثبات کا آہنی مجسمہ، پاکبازوں کی روح پرور مجلسوں کا صدر نشیں عالمی پیمانہ پر اسلامی عظمت و وقار مسلمانوں کی عزت و سربلندی کا داعی صاحب فضل و کمال نابغۂ روزگار تھے، آپ کی علمی، دینی، مذہبی، فکری، تحقیقی، قومی اور انسانی خدمات گذشتہ ایک صدی پر محیط ہیں ان خدمات کو نہ صرف ہندوستان میں ہمیشہ قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا بلکہ عالم اسلام اور بین الاقوامی برادری نے بھی ان کا اعتراف کیا۔ حضرت مولاناؒ کی رگ و پے میں سید احمد شہیدؒ کا خون رواں دواں تھا جنھوں نے تیرھویں صدی ہجری میں دین خالص اور خلافت راشدہ کے طرز پر حکومت شرعیہ کی تشکیل اور دین حق کی سربلندی کے لئے اپنی تحریک کے ذریعہ جانی مالی قربانی کا جذبہ بیدار کیا۔ مولانا نے اپنی تحریک پیام انسانیت کے ذریعہ باشندگان ملک کو انسانی عظمت اور انسانی رشتوں کے تقدس سے روشناس کرایا رواداری اور مساوات کے جذبہ کو فروغ دینے میں اہم تاریخی رول ادا کیا۔ حضرتؒ کی علمی عظمت فکری بصیرت سیاسی تدبر، جذبہ حب الوطنی، قومی و ملی درد کے احساس اور انسانیت کے لیے انکے دردمند دل نے ان کی مقبولیت کو قومی و بین الاقوامی سطح پر عام کر دیا۔

حضرت مولاناؒ کی زندگی کا ہر پہلو مکمل اور اکمل ہے لیکن ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ان کو تمام اکابرین کے یہاں عزت و احترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا یہ آپ ہی کی خصوصیت تھی اور تمام اکابرین آپ کی تبحر علمی، ہمہ دانی زیرکی علمی گیرائی و گہرائی کے قائل تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت مولاناؒ اکابر کی صحبت سے اپنے مزاج و ذوق کے ساتھ صبغۃ اللہ کا رنگ اپنے رگ ریشے میں پیوست کر لیتے اور پھر اس کو فراخ دلی اور فیاضی سے مخلوق خدا پر بکھیر دیتے جس کی وجہ سے علم و عمل اور اخلاص کی پہچان بن گئے۔ اور اکابر کی مجالس میں آپ کے علمی کارناموں اور ملی سرگرمیوں کے تذکرے ہونے لگے حضرت تھانوی کی محتاط و معتدل شخصیت سے ادنیٰ واقفیت رکھنے والا بھی بخوبی جانتا ہے کہ حضرت کے یہاں محض رسمی طور پر یا تکلفًا القاب اور اعزاز و اعتراف کا رواج نہ تھا اور القاب و خطابات کا بیجا استعمال نہیں فرماتے تھے ان کا اپنی عمر کے آخری دور میں جبکہ ان کا تجربہ و مشاہدہ اور فراست پوری طرح مکمل تھی، ایک انیس سالہ نوجوان (علی میاں) عالم کو جمع الکمالات لکھنا بہت بڑا اعزاز اور بڑی باوقار سند ہے اور بجائے خود حضرت تھانوی کی کمال فراست کی دلیل ہے کہ وہ شیخ ابوالحسن جس کے حسن جہاں آرا کی دنیا اس کی تابانیوں کے ظہور اور نورانی شعاعوں کے خارجی وجود کے بعد معترف ہوئی اس صاحب فراست شخصیت نے اس کی ضوفشانی سے قبل ہی اس کی نورانی پیشانی میں حقیقت کا مشاہدہ فرما لیا تھا۔ حضرت شاہ عبد القادر رائے پوریؒ کو تو آپ کی ذات سے محبت و انسیت کے ساتھ ناز و افتخار کا بھی تعلق تھا۔ مولانا منظور نعمانیؒ رقمطراز ہیں کہ حضرت رائے پوریؒ کے یہاں محبوبیت کا جو مقام ان کو حاصل ہوا وہ اس ناچیز کے لیے موجب مسرت ہونے کے باوجود ہمیشہ رشک و غبطہ کا باعث بھی بنا رہا جب لاہور کے ایک عالمی

اجلاس میں قادیانیت سے متعلق عربی کتاب کی ضرورت محسوس کی گئی تو حضرت رائے پوریؒ نے بڑے اعتماد و افتخار کے ساتھ مولانا کا نام لے کر فرمایا (کہ وہ آئیں گے تو ہم چھٹ جائیں گے) کہ یہ کام کر کے جاؤ) حضرت مولاناؒ حضرت رائے پوریؒ کے نام اپنے خطوط کے شروع میں سیدی و مرشدی لکھا کرتے تھے تو حضرت رائے پوریؒ نے بھی فرط محبت میں اپنے گرامی نامہ میں مولانا کو یوں ہی تحریر فرمایا سیدی و مولائی۔

۱۳۸۰ھ کے رمضان میں خانقاہ رائے پور میں ہندوستان کے کم و بیش تمام ہی مشائخ علماء صلحا اور مخلصین کا ہجوم تھا بعد نماز عصر حضرت رائے پوریؒ معمول کے مطابق چھپر میں پلنگ پر جلوہ افروز تھے دوسرا پلنگ حضرت شیخ الحدیثؒ اور مولانا علی میاںؒ کے لئے بچھایا جاتا، غالباً ۱۴ر رمضان کا واقعہ ہے، ہم خدام حضرت کا بدن دبا رہے تھے اکثر و بیشتر یہ خدمت احقر کو بھی میسر ہوتی تھی اس کی وجہ حضرت سے ہمارا گھریلو تعلق اور پورا خاندان اور عزیز و اقارب کا والہانہ، عاشقانہ مخلصانہ روابط مزید برآں حضرت کی بے پناہ شفقتیں ہمارے گھر پر رہیں اس بنا پر ناچیز نے حضرتؒ سے سوال کیا کہ حضرت، حضرت شیخ الحدیث کا تو پلنگ پر بیٹھنا ضعف و نقاہت پیرانہ سالی اور رسم عصری سے سمجھ میں آتا ہے مگر مولانا علی میاں کا پلنگ پر بیٹھنا سمجھ میں نہیں آتا اس پر حضرت نے برجستہ ارشاد فرمایا تم نہیں جانتے علی میاں مجدد الف ثانیؒ کی حق گوئی شاہ ولی اللہؒ کی فکر و نظر سید احمد شہیدؒ کے جذبہ جہاد کا عکس جمیل، حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے جہادی حکمت عملی کا نمونہ سید سلیمان ندویؒ، شبلی نعمانیؒ کے افکار اور تاریخ کا عظیم مرقع، مولانا محمد الیاسؒ شیخ الاسلامؒ شیخ الحدیثؒ کی دینی علمی دعاؤں کا ثمرہ ہیں، او نادان یاد رکھ وہ خواجہ معین الدین چشتیؒ سے لے کر تمام اکابرین کے وارث حق کے ترجمان اور میری آنکھوں کا تارہ ہیں۔"

تبلیغی جماعت کے لئے آپ کی بے لوث خدمات نہ صرف مسلم ہیں بلکہ مولانا محمد الیاسؒ نے حضرت کو جماعت کی روح قرار دیا ہے اور ارشاد فرمایا کہ آں محترم کی توجہات عالیہ سے تبلیغ کو جس قدر نفع پہونچا ہے اب تک لگنے والوں میں کسی سے نہیں پہونچا، اللہ تعالیٰ آپ کے مخصوص توجہات کو اس طرف اور زائد سے زائد مبذول فرمائے، آپ کی تشریف آوری کا انتظار ہے۔ توجہات عالیہ اور دعوات صالحہ کا امید وار ہوں۔ مولانا محمد الیاسؒ کے دل میں، حضرت مولانا کی محبت عزت اور انسیت بجا طور پر جاں گزیں تھی۔ ۱۴۱۹ھ کے رمضان میں ہم تمام خدام تکیہ کلاں رائے بریلی میں عشا بعد کی مجلس میں موجود تھے حضرت کے چہرے سے فرحت و انبساط، اور مسرت کے اثرات ہویدا ہوئے اور فرمانے لگے کہ ایک مرتبہ مولانا محمد الیاسؒ ندوہ تشریف لائے، ندوہ کے احوال و کوائف ملاحظہ فرمانے کے بعد فرحت و محبت اور جذب و انبساط کی خاص کیفیت میں ارشاد فرمایا۔ علی میاں ندوہ کی کسی ایسی عمارت پر لے کر چلو۔ جہاں سے پورا ندوہ نظر آجائے چنانچہ دار العلوم کی مرکزی عمارت کی چھت پر چڑھ کر ندوہ کو چاروں طرف سے دیکھتے رہے اور فرمایا کچھ مانگو، کوئی ضرورت ہو تو بتاؤ۔ اس وقت حضرتؒ کے ساتھ ولی کے کئی بڑے تاجر تھے کیونکہ وہ زمانہ ندوہ کے افلاس تنگ دستی اور مفلوک الحالی کا تھا۔ اساتذہ کی تنخواہ دینا بھی دار العلوم کے لئے مشکل ہو رہا ہے۔ ہم اس وقت حضرتؒ سے اسکے لیے کچھ عرض کرتے تو کوئی بڑی بات ان کے لیے نہیں تھی۔ لیکن توفیق خداوندی نے ساتھ دیا اور عرض کیا کہ حضرت جس نظر سے آپ مظاہر علوم کو دیکھتے ہیں وہی نظر کرم ندوہ پر بھی فرمائیں، بے ساختہ دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور فرمایا اے اللہ تو ندوہ کو عرب و عجم کے لیے درسگاہ علمی کے ساتھ عمل کا بھی نمونہ بنا دے الحمد للہ! آج انہیں دعاؤں کا ثمرہ ہے کہ ندوہ چہار دانگ عالم میں اپنی ٹھوس خدمات کے باعث ملک و بیرون ملک میں با اعتماد مقام حاصل کر چکا ہے۔

الحمد للہ ایسا ہی حسین منظر ہم خدام نے بھی دیکھا ہے ۱۹۹۲ء میں جہاں حضرت نے اجرا اڑہ میں علی میاں ٹیکنیکل کا سنگ بنیاد رکھا اس وقت حضرتؒ جامعہ کی قطعہ آراضی کی جانب قطب شمال دست مبارک میں اینٹ لے کر کھڑے ہوئے تھے ہم خدام نے عرض کیا کہ حضرت یہ وسیع و عریض قطعہ آراضی آپ کی دعاؤں کی ضرورت محسوس کر رہا ہے، تو حضرتؒ نے اس کے لئے خصوصی دعا فرمائی، آج اسی کا نتیجہ ہے کہ قلیل مدت میں اس قطعۂ آراضی کا زمین و آسمان بدلا نظر آرہا ہے اور تمام عالی شان و پرشکوہ عمارتیں اپنی شان و شوکت کے ساتھ عوام و خواص کی دید کا منظر بنی ہوئی ہیں۔

حضرت شیخ الحدیثؒ کی محبت و انسیت یا باہمی اعتماد و احترام تو اس سے بخوبی عیاں ہے کہ اپنی عربی تصنیفات پر حضرت مولانا سے ہی

(باقی صـ ۱۶۰ پر)

ہمارے حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ

پروفیسر محمد یونس نگرامی

اخلاص، سچائی، حلم و درگزر، متانت، دل جوئی، دوسروں کے احساسات کا احترام، زبان کی سچائی، دل کی پاکی، عمل کی قوت، عفت و پاکبازی، عفو و درگذر، احسان و بردباری، تواضع و خاکساری، زہد و استغناء، عبادت و ریاضت جیسے بہت سے الفاظ ایسے ہیں جو آج کل بکثرت استعمال کئے جارہے ہیں لیکن وہ اپنی معنویت اور مطالبات سے محروم ہوتے جارہے ہیں۔

حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ نے نہ صرف یہ کہ ان الفاظ کی لغوی و عرفی حیثیت برقرار رکھی بلکہ ان کو نئی رفعتوں اور بلندیوں تک پہنچایا بھی۔

راقم سطور ۱۹۶۲ء میں جب مدینہ یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھا، حضرت مولانا بحیثیت وزیٹنگ پروفیسر تشریف لائے تھے۔ میں، مزمل حسین صدیقی، سراج الرحمٰن اندوری، مظفر الحق ندوی اور تقی الدین فردوسی عارضی طور پر بستان نوردلی منتقل ہوگئے تھے جہاں حضرت مولاناؒ کا قیام تھا وہیں میں نے حضرت کو بہت قریب سے دیکھا، تہجد کا اہتمام، مسجد نبوی میں حاضری کا ذوق و شوق، ذات نبوی سے والہانہ تعلق و شیفتگی اور اس ایمانی جذبہ کی فراوانی...... جس کو صرف محسوس کیا جاسکتا ہے دائرۂ تحریر میں قید نہیں کیا جاسکتا ہے حضرت مولانا کی جو کیفیت، حمیت دینی، ایمانی غیرت کے جو ایمان افروز مناظر مدینہ طیبہ میں دیکھے تھے اس میں پچھلے ۳۰-۳۵ برسوں میں اضافہ ہی پایا، سنن ونوافل کی کثرت تھی، عبادت و ریاضت ہر دن بڑھ رہی تھی، تلاوت قرآن پاک کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ان کے نزدیک اسلام ہر لحاظ سے .... دنیا کی امامت اور ہدایت کا آخری سرچشمہ تھا۔ جس کے کسی بھی حصہ سے وہ دستبردار ہونے کے لئے تیار نہ تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین و شریعت میں کوئی بھی قطع و برید ان کے حاشیہ خیال سے بھی دور تھی توحید جو اسلامی شریعت کا بنیادی پتھر ہے اور جس پر اسلام کی پوری عمارت کھڑی ہے اس پر مفاہمت و مساومت کا سوال نہ تھا وہ ان بنیادی مسائل پر ایسا موقف اختیار کرتے تھے کہ جس سے پہاڑوں کے دل دہل جاتے تھے۔ تو دوسری طرف اخلاق و مروت اور دوسروں کے ساتھ تعامل میں ریشم کی نرمی و ملائمیت تھی۔

ہمارے حضرتؒ جب لکھنؤ میں ہوتے تو میں نے یہ معمول بنالیا تھا کہ دن میں ایک مرتبہ ان کی خدمت میں حاضری ضرور ہوجائے خود ہمارے حضرتؒ کو بھی احقر کا انتظار رہتا تھا اگر کبھی ایک دن کا ناغہ ہوجاتا تو جب دوسرے دن پہونچتا تو فرماتے کہ کوئی سفید موٹر ادھر آتی تو میرا دل یہ چاہتا تھا کہ خدا کرے یونس ہوں۔

اکثر فرماتے کہ تمہارے نام کے مادہ میں انس شامل ہے، تمہارے آجانے سے بڑی خوشی ہوتی اور انس پیدا ہوتا ہے۔ اللہ اکبر کہاں عالم اسلام کی اتنی عظیم المرتبت شخصیت اور اس ناچیز کے ساتھ تعلق و محبت کا یہ عالم۔

میں اکثر دن میں دس گیارہ بجے یونیورسٹی جاتے وقت حضرت کی خدمت میں ندوہ حاضر ہوتا، اس وقت مولانا یا خطوط کے جوابات لکھواتے یا کوئی ضروری مضمون یا کتاب املا کراتے تھے میں حاضر ہوتا اور کہتا کہ صرف سلام کرنے حاضر ہوا ہوں میں جانتا ہوں کہ آپ کا یہ وقت بہت مشغولیت کا ہے۔ فرماتے نہیں تمہارے لئے کوئی وقت کی قید نہیں ہے جب چاہو آجاؤ، کبھی اصرار سے چائے بلواتے، اسی رمضان سے پہلے ایک دن بھائی عبدالرزاق صاحب سے سیب کٹوایا اور فرمایا کہ تمہارے ساتھ ہم بھی کھالیں گے۔

اکثر و بیشتر اسی وقت میں دیکھا کہ ہمارے حضرت تلاوت فرمارہے ہیں اور بیّن طور پر محسوس ہوتا تھا کہ قرآن مجید کی ایک ایک آیت و لفظ ان کے جسم و جان میں پیوست ہورہی ہے اور جہاں جہاں اللہ کی قدرت کاملہ کا ذکر ہوتا تھا تو ان کے جسم پر ارتعاش کی کیفیت پیدا ہوجاتی تھی، طبیعت یہی چاہتی تھی قرآن مجید پڑھتے رہیں اور کوئی سنتا رہے۔

پچھلے ۳۰-۳۵ برسوں میں میں اپنے حضرتؒ سے بہت قریب رہا، سفر و حضر، خصوصی مجلسوں اور تنہائی میں بھی حضرتؒ کے پاس بیٹھنے کی سعادت نصیب ہوئی، میں اگر قسم کھاؤں تو حانث نہیں ہوں گا کہ اس پورے عرصہ میں کسی بھی شخص کا ایسا تذکرہ جو اس کو ناگوار ہو حضرت کی زبان سے نہیں سننے میں آیا، مجلس میں کسی تیسرے شخص

کا تذکرہ آنے ہی نہیں پاتا تھا اگر کبھی کوئی شخص کسی کا تذکرہ کرتا بھی تو آپؒ فرماتے کوئی دوسری بات کیجئے اور فوراً ہی بات کا رخ دوسرے موضوع کی طرف موڑ دیتے تھے۔

میں جب بھی رائے بریلی حاضر ہوتا تو ہمارے حضرتؒ پر خوشی وانبساط طاری ہوتا اور اپنی خوشی کا اظہار فرماتے اور کوشش فرماتے کہ کھڑے ہوکر معانقہ فرمائیں اور استقبال کریں میں کہتا کہ حضرتؒ! آپ اتنی زحمت اٹھاتے ہیں اس سے مجھ کو تکلیف ہوتی ہے اس پر دعاؤں کی وہ بارش ہوتی کہ طبیعت یہی چاہتی کہ حضرتؒ یونہی دعا فرماتے رہیں، ڈرائیور کے بارے میں دریافت فرماتے کہ اس نے کھانا کھالیا ہے یا نہیں اور جب تک خود مطمئن نہ ہوجاتے برابر استفسار فرماتے رہتے، مجھ سے فرماتے کہ اکیلے نہ آیا کرو کسی کو ساتھ لے لیا کرو سفر میں اچھا رہتا ہے۔

ہمارے حضرت سے ملنے وزیراعظم، وزیر اعلیٰ، گورنر اور دیگر اہم شخصیات برابر ندوہ یا رائے بریلی جاتی رہتی تھیں حضرتؒ ان کی تکریم میں کوئی فرق نہ لاتے اور اسلامی اخلاق کا پورا مظاہرہ فرماتے لیکن تواضع وانکساری کا یہ عالم تھا کہ کبھی بھی زبان پر ان بڑی شخصیات کی آمد اور ان کی نیازمندی کا تذکرہ بھی نہ آتا ان کا دل تو اللہ کی عظمت وکبریائی سے معمور تھا اب کسی اور کا گذر وہاں کیسے ممکن تھا ایک آدھ بار یہ ضرور فرمایا کہ فلاں صاحب آئے تھے تم بھی ہوتے تو اچھا تھا۔

واقعات، تجربات ومطالعہ کی روشنی میں وہ اس نتیجہ پر پہونچے تھے کہ اسلامی عقائد وشریعت اسلامی کی حفاظت کے لئے اب یہ ضروری ہوگیا ہے کہ ہر ہر قریہ وگاؤں میں مکتب واسلامی مدارس کا جال پھیل جائے تاکہ آئندہ نسل کے ایمان ویقین کی حفاظت کو یقینی بنادیا جائے اس مسئلہ کی فکرمندی اتنی تھی کہ میں نے دور افتادہ قصبات وگاؤں میں دینی بیداری کے پروگرام رکھے اور حضرتؒ کو دعوت دی، ہمارے حضرت نے بغیر کسی توقف اور مزید معلومات کے فوراً ہی رضامندی کا ظاہر فرمائی اور تشریف لے گئے۔ رکن پور ضلع رائے بریلی کے ایک جلسہ کے لئے جب میں ان سے وقت لینے گیا تو حضرتؒ نے ارشاد فرمایا کہ تم ایسے پروگرام طے کرلیا کرو اور ہم کو بتلادیا کرو، دین کی حفاظت کے لئے ایسی محبت ودلسوزی، عمر ومرض کی اس حالت میں، یہ ہمارے حضرتؒ ہی کا حصہ تھا۔ لکھنؤ سے سلطان پور تک تقریباً دو سو کیلو میٹر کے رقبہ پر پھیلے ہوئے دیہات وقصبات اور پورے علمائے نگرام کی دینی، دعوتی وتبلیغی سرگرمیوں کے مرکز رہے ہیں، حضرتؒ اس بات سے واقف تھے اور "پرانے چراغ" کے کسی حصہ میں تذکرہ بھی فرمایا ہے، اسی حقیقت کے مدنظر برابر تاکید فرماتے کہ ان علاقوں سے تمہارا رابطہ رہنا چاہئے اور اس ورثہ کو ضائع نہ ہونے دیا جائے جو صدیوں کی محنتوں کا ثمرہ ہے۔ اکثر فرماتے کہ تم سے فرد خاندان کا تعلق ہے، دوسرا تعلق ان دونوں خاندانوں کا یہ بھی ہے جو کتاب وسنت کے احیاء اشاعت دین اور عقیدہ توحید کی دعوت پر مبنی ہے اور یہ تعلق ایسا ہے جس پر زمانہ کے گرم وسرد کا کوئی اثر نہیں پڑتا ہے۔

بارہا ایسا ہوا کہ حضرتؒ رائے بریلی سے لکھنؤ تشریف لائے اور اسی دن ملاقات ہوگئی تو فرماتے کہ جب نگوہاں سے گذر رہے تھے تو وہ سڑک جو نگرام جاتی ہے نظر آئی تو تم بہت یاد آئے۔

نگرام سے تعلق برقرار رکھنے کی تاکید فرماتے یہ انھیں کی فکرمندی کا نتیجہ تھا نگرام کی مسجد کی توسیع کا کام شروع ہوا اور مدرسہ معدن العلوم کا احیاء ہوا، حضرت خود نگرام تشریف لے گئے اور دن بھر قیام فرمایا اس موقع پر عربی مدارس کی اہمیت پر جس دل سوزی اور قوت کے ساتھ گفتگو فرمائی وہ چشم کشا کی حیثیت رکھتی ہے۔ دنیا کی بے ثباتی اور ایمان سے بھرپور زندگی کا ایسا نقشہ پیش فرمایا جو قرآنی ہدایات کا خلاصہ ہے اور جس کا ہر ہر لفظ نور اور پاکیزگی میں ڈوبا ہوا ہے۔

حضرتؒ پر توحید کا غلبہ بہت تھا، شرک جلی یا خفی برداشت کرنے کو تیار نہیں تھے، گفتگو، مجلسوں اور تقریروں میں بڑی ہی قوت کے ساتھ توحید کی دعوت دیتے، بیعت کرتے وقت توحید کی تلقین فرماتے اور ہر طرح کے شرک سے اجتناب کا پختہ وعدہ لیتے، انداز اتنا سادہ اور دل نشین ہوتا کہ "از دل خیزد بر دل ریزد" والی بات ہوتی۔

اسلامی دعوت وتبلیغ کے سلسلہ میں حضرتؒ کا پختہ یقین تھا کہ اس باب میں حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا طریقہ واسلوب سب سے مؤثر اور کامیاب طریقہ ہے وہ اس نتیجہ پر اپنے وسیع مطالعہ، تحریکات کے انجام، تجربات اقوام وملل کے جائزہ وتحلیل کے بعد پہونچے تھے اور عمر بھر اسی طریقہ پر کاربند رہے۔

ندوہ سے شائع ہونے والے عربی پندرہ روزہ "الرائد" میں گزشتہ بیس برسوں سے "نافذة علی الہند" کے عنوان سے کالم لکھ رہا ہوں جس میں

استاذ گرامی مولانا محمد واضح رشید ندوی کی ہمت افزائی، اصرار اور قدر دانی کا بہت دخل ہے، ہمارے حضرتؒ بھی گاہے بہ گاہے اس کالم کی تعریف و توصیف فرماتے اور ایسے بلند کلمات فرمانے کہ لکھنے کا جذبہ اور شوق وذوق اور بڑھ جاتا، میری دو کتابوں "نئی عرب دنیا" اور "ہندوستان میں عربی علوم وفنون کے ممتاز علماء اور ان کی علمی خدمات" پر میری فرمائش پر مقدمہ حضرت مولاناؒ نے تحریر فرمایا جس میں مصنف کی محنت اور پھیلی ہوئی معلومات کو یکجا کر دینے پر مصنف کی ستائش فرمائی ہے جو اس ناچیز کے لئے سب سے بڑی سند ہے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے کہیں لکھا ہے کہ شریف اور باعظمت انسان کی پہچان یہ ہے کہ جو شخص بھی اس سے ملنے جائے تو اپنے کو وہ معزز و مکرم محسوس کرے۔ حضرت مولانا سے ملنے والا ہر شخص اپنے کو معزز و مکرم محسوس کرتا وہ سمجھتا تھا کہ اس کا احترام ہوا ہے پذیرائی ہوئی ہے اور اس کی بھی اپنی کوئی اہمیت ہے۔

ہمارے حضرت سخن دلنواز تھے، بلند نگاہ تھے اور جاں پرسوز تھے۔ اقبال نے یہی تین صفات میر کارواں بننے کے لئے ضروری قرار دی ہیں

حضرتؒ کے ساتھ رہنے، دیکھنے، سننے کا ایک لمبا وقفہ ملا لیکن میں نے کبھی بھی کوئی ایسا تذکرہ حضرت کی زبان سے نہیں سنا جس سے مال ومتاع کی رغبت کا احساس ہوتا۔

رائے بریلی اور ندوہ میں برابر ضرورت مندوں کا ہجوم رہتا، حضرت ہر شخص کی ضرورت پوری فرماتے اور انتہائی خندہ پیشانی کے ساتھ، ناگواری یا تلخی کا کہیں شائبہ بھی نہ ہوتا۔ "ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء" کی ہمارے حضرت حقیقی تصویر اور سچی تعبیر تھے ــــ لطیف مزاح و ظرافت میں بھی حضرت کو بھرپور حصہ ملا تھا، ایسے جملے اور واقعات سناتے جس سے

وہ رشکِ صد بہار گلستاں چلا گیا

● عاتکہ ہاشم معلمہ خدیجۃ الکبریٰ للبنات لکھنؤ

اک مرد حق شناس مسلماں چلا گیا ــ عالم سے ایک صاحبِ ایماں چلا گیا
علم وادب کے پھول کھلاتا تھا چار سو ــ وہ رشک صد بہار گلستاں چلا گیا
صدق وصفا کے نور سے روشن تھی جس کی بزم ــ ایسا ولی وہ شمع فروزاں چلا گیا
فردِ علی وہ ہو کے بھی تھا ایک انجمن ــ دنیائے علم وفن کا شبستاں چلا گیا
عربی ادب کا شاہ تھا دارالعلوم میں ــ ندوہ اداس ہے کہ وہ سلطاں چلا گیا
اب تشنگانِ علم کی کیسے بجھے گی پیاس ــ فنِ ادب کا بحر دبستاں چلا گیا
کردار اور فکر وعمل کا تھا وہ دھنی ــ رشد وہدیٰ کا صاحب عرفاں چلا گیا
رکھتا تھا عالموں میں وہ اک شانِ امتیاز ــ اِک بے مثال عالم ذیشاں چلا گیا
عالِم کی موت گویا اس عالَم کی موت ہے ــ ملت کا مایۂ ناز نگہباں چلا گیا
گلشن میں روشنی اک اس کے وجود سے ــ علم وادب کا نیّر تاباں چلا گیا
تصنیف کا امام قلم کا وہ شہسوار ــ فہم و خرد کا مہر درخشاں چلا گیا
خاموش عندلیب ہیں پژمردہ پھول ہیں ــ یہ کون آہ جانِ بہاراں چلا گیا
وہ سادگی وہ شان تواضع باِیں کمال ــ انسانیت ملول ہے انساں چلا گیا

ملک و وطن کا تاج تھا ملت کا پاسباں
افسوس ایک فاضلِ ذی شان چلا گیا

لطف صحبت دو بالا ہو جاتا۔ ایک مرتبہ حضرت کو شام کی چائے پیش کی گئی آپ نے پانی بھی طلب فرمایا۔ پانی آنے میں کچھ تاخیر ہوئی تو بس اتنا فرمایا چائے ٹھنڈی ہو جائے گی اور پانی گرم ہو جائے گا۔

ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ کسی غیر ملک کے گورنر بسیار خوری کے عادی تھے اور اس وجہ سے بیمار بھی ہو جاتے تھے۔ ایک رات کسی سرکاری ضیافت میں گورنر صاحب نے حسب عادت معمول سے زیادہ عشائیہ تناول فرمایا۔ عملہ نے اس خیال سے کہ رات میں کوئی تکلیف نہ ہو طبی انتظامات کا پورا بندوبست کر لیا۔ اسی رات میں گورنر صاحب نے ملازم کو بلانے کے لئے گھنٹی بجائی پورا عملہ مع ڈاکٹر کے گورنر صاحب کی خواب گاہ کی طرف بڑھا کہ شائد متوقع حادثہ پیش آگیا۔ لیکن جب ملازم خاص اندر گیا تو فرمایا کہ بھوک لگ رہی ہے کچھ کھانے کو لے آؤ۔

چھپ گئے وہ سازِ ہستی چھیڑ کر
اب تو بس آواز ہی آواز ہے

پیامِ انسانیت

"مِرا نورِ بصیرت عام کر دے"

● مولانا محمد رضوان القاسمی

مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی فکر کا دائرہ محدود نہیں رہا اور نہ ہی انھوں نے اپنی زندگی کو کسی ایک خانہ میں مقید کیا تھا۔ ان کی زندگی کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ان کی فکر میں تنوع اور عملی زندگی میں ہمہ رنگی رہی ہے قوم اور ملک وملت کے لئے جو چیز مفید، بہتر اور نفع بخش ان کی نظر میں رہی وہ اس پر سوچتے رہے۔ بولتے رہے، لکھتے رہے ان کی سوچ، آواز اور تحریر میں اخلاص اور درد ہے۔ گہرائی اور گیرائی ہے، طاقت اور قوت ہے، انفرادیت اور امتیاز ہے۔ ایک مفکر، داعی اور مصلح کی حیثیت سے مولانا نے اپنے لئے کام کے جو میدان خصوصیت کے ساتھ منتخب کئے تھے، ان میں "پیام انسانیت" بھی ہے، اگرچہ اپنی ایک تقریر کے ذریعہ ۱۹۵۴ء ہی میں اس تحریک کی بنیاد ڈال دی تھی۔ لیکن عملی طور پر اس کا آغاز ۱۹۷۴ء سے کیا جس کا سلسلہ کسی نہ کسی طرح ان کی آخری زندگی تک جاری رہا۔ اس کے لئے حضرت مولانا نے مولانا اسحٰق جلیس ندوی، مولانا عبدالکریم پاریکھ، امین چشتی اور دیگر رفقاء کے ساتھ مل کر ملک کے مختلف شہروں میں مخلوط جلسے کئے جس میں ملک کے ہر طبقہ کے لوگ شریک ہوئے اور مولانا کی اس آواز پر لبیک کہا، بعض جلسوں میں تو ایسا بھی ہوا کہ پڑھے لکھے غیر مسلم حضرات روتے اور کہتے کہ یہ باتیں تو ہم سے آج تک کسی رہنما اور لیڈر نے کہی ہی نہیں۔ مولانا کو اپنی اس تحریک سے والہانہ لگاؤ رہا اور ان کا یہ یقین رہا کہ ہندوستان کے باشندے (بلا امتیاز مذہب وملت) اگر اس تحریک کی معنویت کو سمجھ لیں اور اس کے پیغام پر توجہ دیں تو عصبیت کی ساری دیواریں منہدم ہو جائیں گی اور انسان ہونے کے ناطے ایک دوسرے کے درد، مشکل اور مصیبت کو ان کے لئے سمجھنا آسان ہو جائے گا ہندوستانی سماج میں جو مختلف قسم کی ناہمواریاں پائی جاتی ہیں ان کا علاج مولانا نے "پیامِ انسانیت" تجویز فرمایا تھا۔ اس موضوع (پیامِ انسانیت) پر مولانا کی جو تقریریں اور تحریریں ہیں وہ "از دل خیزد بر دل ریزد" (دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے) کی مصداق ہیں، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی یہ ساری تقریریں اور تحریریں "الہامی" ہیں یعنی کہی اور لکھی نہیں گئی ہیں بلکہ کہلائی اور لکھائی گئی ہیں مولانا کا کام تو اس الہامی کام کی داغ بیل کا تھا، وہ کر چکے۔ اس سلسلہ کو باقی رکھنا اور قوت و طاقت کے ساتھ آگے لے چلنا یہ ان لوگوں کا کام ہے جو مولانا سے خصوصی مودت، محبّت اور نسبت رکھتے ہیں۔

مولانا تحریک پیام انسانیت کے ذریعہ کیا پیام دینا چاہتے تھے۔ اس کا اندازہ درج ذیل اقتباسات سے ہوگا۔ مولانا نے ۵۵-۱۹۵۴ء کے ایک تفصیلی مضمون میں تحریر فرمایا تھا۔

"عالم انسانی کی ایک اہم ضرورت یہ ہے کہ اغراض وتعصبات، قوم پرستی اور سیاسی مقاصد سے بالکل آزاد و بے تعلق ہو کر عام انسانوں کے سامنے وہ حقیقتیں رکھی جائیں جن پر انسانیت کی نجات اور سلامتی موقوف ہے اور جن کو نظر انداز کر کے ہمارا یہ پورا تمدن اور پوری انسانی سوسائٹی اس وقت سخت خطرے سے دوچار اور موت و زیست کی کشمکش میں گرفتار ہے، یہ حقیقتیں اپنے اپنے زمانے میں پیغمبروں نے بیان کی تھیں اور ان کے لئے سخت جدوجہد کی تھی۔ یہ حقیقتیں اب بھی زندہ ہیں لیکن سیاسی تحریکوں، مادی تنظیموں اور قومی خودغرضیوں نے گرد وغبار کا ایسا طوفان کھڑا کر دیا ہے کہ یہ روشن حقیقتیں ان کے اوٹ میں اوجھل ہو گئی ہیں لیکن انسانی ضمیر ابھی مردہ، اور انسانی ذہن ابھی مفلوج ومعطل نہیں ہوا ہے۔ اگر پوری بے غرضی پورے یقین اور پورے خلوص کے ساتھ ان حقیقتوں کو عام فہم زبان اور دلنشیں انداز میں بیان کیا جائے تو یہ انسانی ضمیر و ذہن اپنا کام کرنے لگتا ہے اور بڑی گرمجوشی سے ان حقیقتوں کا استقبال کرتا ہے اور بعض وقت تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان تقریروں میں اس کے دل کی ترجمانی اور اس کے درد کا مداوی ہے۔"

(تحریک پیام انسانیت، صفحہ ۱۴،۱۳)

مولانا ملکی اور عالمی حالات پر گہری نظر ڈالنے کے بعد فرماتے ہیں:۔

"آج خدا پرستی اور انسانیت دوستی کی تحریک کی ضرورت ہے آج اس کے لئے ایک

زبردست مہم (CAMPAIGN) کی ضرورت ہے، ایک زلزلے کی ضرورت ہے، خدا پرستی کی آندھی کی ضرورت ہے، جو بڑی بڑی خود غرضیوں کے پہاڑوں کو ہلادے، خواہشات کے ٹیلوں کو اڑادے، شہر شہر، گاؤں گاؤں یہ کہتا ہے کہ حیوانی زندگی باقی رکھنے کے لائق نہیں، مادہ پرستی کا درخت کھوکھلا ہوچکا ہے۔ نفس پرستی کا درخت جو دنیا پر چھایا ہوا ہے، جڑیں چھوڑ چکا ہے۔ انسانو! اپنی قدر پہچانو، زندہ حقیقتوں سے اپنی قسمت باندھو، اللہ کی زبردست طاقت سے جڑجاؤ۔" (پیام انسانیت، صفحہ ۸۶)

مولانا جب انسانی آبادی اور بستی پر نگاہ ڈالتے ہیں تو انھیں نظر آتا ہے کہ یہاں فرائض و حقوق کی ادائیگی میں عام طور پر کوتاہی پائی جاتی ہے۔ اور اسی کوتاہی نے باہمی آویزش اور کشمکش کی صورت پیدا کردی ہے، آج کے انسان کا ذہن اتنا استحصالی بن گیا ہے کہ اس کی نظر اپنے جیسے انسان کی "مجبوری" پر نہیں بلکہ "تجوری" پر ہوتی ہے۔ اپنی ایک تقریر میں انھوں نے فرمایا تھا۔

"خدا کی بستی کو دکان سمجھ لیا گیا، ہر ایک دوسرے سے گاہک سمجھ کر معاملہ کرتا ہے، یہ تاجرانہ ذہنیت تباہ کن ہے، آج سب طرف لینا ہی لینا عام ہے، کہیں استاد شاگردوں کی کشمکش کہیں مزدوروں اور کارخانہ داروں میں چپقلش، یہ سب کیوں؟ یہ سب اسی تاجرانہ ذہنیت کا نتیجہ ہے، پیغمبر کہتے ہیں کہ سب کے ایک دوسرے پر حقوق ہیں اور سب کے ذمہ فرائض ہیں، فرائض ادا کرنے میں مستعد ہوں، اور حقوق حاصل کرنے میں فراخ دل، ہم یہی کہتے ہیں کہ آپ لوگ بھی یہی کرنے لگیں تو فضا بدلے گی، زندگی کا لطف آئے گا، آج لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہے، ہر ایک کی نگاہ تجوری پر ہے، انسان کی مجبوری پر نہیں۔"

اس کے بعد فرمایا:۔

"ہم اپنے پیغام کو ہر پارٹی کے لئے ضروری سمجھتے ہیں اور ہمارا وجود ہر پارٹی سے زیادہ ضروری ہے کیونکہ ہمارا کام ہوگیا تو انسانیت کا مہکتا ہوا گلدستہ بنے گا، آج کانٹے پیدا ہورہے ہیں، آج انسان عنقا ہے۔ ہم کہنے آئے ہیں کہ انسانیت کی بہار لاؤ انسانیت کو نکھارو، آج انسانیت کے درخت سے کانٹے اور کڑوے کسیلے پھل پیدا ہورہے ہیں، آپ انسانیت کے میٹھے پھل پیدا کیجئے۔"

(پیام انسانیت۔ صفحہ ۷۱)

انسانیت ہی کے مسئلہ پر فرماتے ہیں:۔

"انسانیت کو آج ایمان ویقین، سچائی اور پاکیزگی، محبت ومروت اور ہمدردی وغمخواری کی ضرورت ہے، اس کا مداوا تہذیب نہیں، تحریر نہیں اس کو ضرورت ہے غمخوار انسانوں کی، دردمند انسانوں کی جو دوسروں کے لئے گھلیں اور اپنے کو مٹاکر دوسروں کو بنائیں، تہذیبوں اور تحریروں سے انسانیت نہیں پیدا ہوتی، یورپ نے ہم سے اخلاق اور روحانی اقدار (VALUES) چھین لئے، اس معاملہ میں وہ خود خالی ہاتھ تھا۔ اس نے ہمیں بھی دیوالیہ بنادیا، اس نے ہماری جھولیوں کو اخباروں سے بھر دیا معلومات سے بھر دیا مصنوعات سے بھر دیا۔ اس نے ہماری راتوں کو چراغوں سے جڑ دیا۔ بجلی کے قمقموں سے جگمگا دیا۔ ہمیں دل کی روشنی کی ضرورت تھی اس نے دل کا چراغ گل کردیا، مبارک تھا وہ زمانہ جب دل کی روشنی تھی، بجلی کی روشنی نہیں تھی آپ خود سوچیں آپ سے کوئی سودا کرنا چاہے تو آپ کو کون سا زمانہ پسند ہے؟ انسانیت کا، ہمدردی کا غمخواری کا زمانہ جس میں آدمیت کی قدر اور فکر تھی، یا وہ زمانہ جس میں انسانیت کا کوئی احترام نہیں مگر اس میں پریس ہیں، بجلی کی روشنی ہے اور برقی پنکھے ہیں۔ آج سکون قلب میسر نہیں، لیکن پیسہ کی افراط ہے، آج سب کچھ ہے لیکن روحانی قدریں عنقا ہیں، آج سب کچھ ہے لیکن مقصد نہیں، جس کے حلق میں کانٹے پڑ رہے ہوں، پیاس سے تڑپ رہا ہو۔ اسے چلو بھر پانی چاہئے۔ اس کے لئے سب کچھ، کچھ نہیں، اس کے لئے اشرفیاں موجود ہوں تو کیا؟ بس تمدن میں محبت کا ذرہ نہیں ایثار وہمدردی کا نام نہیں، جسے دیکھو غرض کا بندہ اس تمدن کو لے کر کیا کریں"۔

(پیام انسانیت صفحہ ۸۲، ۸۱)

مولانا علی میاںؒ نہایت دردمندی کے ساتھ دل کے دروازہ پر دستک دیتے ہیں:۔

"تہذیب وتمدن، سیاست وحکومت، ادب، فلسفہ اور علم وفن کے آشیانے انسانیت کی شاخ پر قائم ہیں، اگر انسانیت کی شاخ باقی ہے تو آپ جیسا چاہیں ویسا نشیمن بنالیں، لیکن شاخ ہی باقی نہ رہی تو نشیمن کا بقا کہاں؟ آج انسانیت کی شاخ پر کتنے تیشے چلائے جارہے ہیں، آگ لگائی جارہی ہے ہر شخص اس کوشش میں مصروف ہے کہ آدمیت کی شاخ پر بڑے سے بڑا تیشہ چلائے۔

آج ہمارے ملک میں انسان کو انسان سے محبت اور ہمدردی نہیں رہی، پہلو میں وہ دل نہیں جو انسانیت کے سوز میں جلتے ہوں، (اس کا درد محسوس کرتے ہوں، نفسا نفسی کا قیامت خیز منظر ہے، ہر ایک کو اپنی اپنی پڑی ہے۔ ہمارے ملک میں جب ریل، ہوائی جہاز کے حادثات ہوتے ہیں تو ہمارے سماج کی اخلاقی پستی عیاں ہوجاتی ہے۔ لوگ حادثہ کا شکار ہوتے والے مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کے بجائے ان کی کلائی کی گھڑیاں اور جیبوں سے پرس نکال لیتے ہیں، بے خطرہ کا وہ

سگنل ہے، وہ الارم ہے، جس پر پوری سوسائٹی کو چوکنا ہوجانا چاہیئے، فرقہ وارانہ فسادات ہندو مسلم مسئلہ نہیں بلکہ انسانیت کی بے حرمتی کی علامت ہیں، اصل مرض انسانیت کی بے وقعتی ہے ہم نے بعض اوقات درخت اور جانور کو انسان سے زیادہ وقعت دی ہے، ہم نے اکثر اوقات انسان کے مقابلہ میں پیسے کو ترجیح دی ہے حالانکہ پیسہ انسانی ہاتھ کا میل ہے ہم نے پیسہ کو انسان کے دل اس کی روح، اس کی آتما سے زیادہ اہمیت دی، حالانکہ انسان کا درجہ خدا نے اپنی تمام مخلوقات میں افضل اور اشرف رکھا۔ اس کے بلند مقام کی اس سے بڑھ کر اور دلیل کیا ہوسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی بھوک، پیاس، بیماری کو اپنا مسئلہ بنایا ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث قدسی کا مفہوم ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کسی بھوکے کو کھانا کھلانا، کسی پیاسے کو پانی پلانا۔ اور کسی بیمار کی تیمارداری کرنا گویا میرے ساتھ یہ حسن سلوک کرنا ہے، انسان کے مقابلہ میں دنیا کے تمام براعظم رکھ دیجئے تو انسان کا پلڑا بھاری ہوگا، تمام براعظم انسان کے لئے پیدا کئے گئے، انسان ان کے لئے نہیں پیدا کیا گیا۔" (تحفۂ انسانیت صفحہ ۳۸ تا ۴۰)

مولانا علی میاںؒ نے اپنی تقریروں میں بارہا اس واقعہ کو نقل فرمایا ہے کہ ایک بزرگ کی خدمت میں جب ان کے ایک مرید نے تحفہ میں "قینچی" پیش کی، تو بزرگ نے فرمایا کہ یہ دور قینچی پیش کرنے کا نہیں، سوئی دینے کا ہے، قینچی سے تو کاٹنے کام لیا جاتا ہے اور سوئی سے جوڑنے کا، گویا یہ اشارہ تھا اس طرف کہ انسان کو آپس میں کاٹنے کا نہیں بلکہ جوڑنے کا کام کرنا چاہیئے۔

مولانا علی میاں، محبوب الٰہی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کا یہ قول بھی اکثر نقل فرمایا کرتے تھے کہ:-

"اگر کوئی کانٹا رکھے اور تو بھی اس کے عوض کانٹا رکھے تو کانٹے ہی کانٹے ہوجائیں گے عام لوگوں میں تو یہ دستور ہے کہ نیک کے ساتھ نیک اور بد کے ساتھ بد ہوتے ہیں لیکن درویشوں میں یہ دستور نہیں، یہاں نیک و بد دونوں کے ساتھ نیک ہونا چاہیئے۔"

مولانا کے نزدیک اس وقت سب سے بڑا کام یہ ہے کہ:-

"ہم اپنے اپنے مذہب کے دائرے میں انسانیت کا احترام پیدا کرنے اور انسانیت کو زندہ کرنے کی کوشش کریں، انسان انسان کی طرح ملے، اس کے بعد پھر مطالعہ، غور و فکر اور توفیق الٰہی سے اپنے لئے پسندیدہ طریقۂ زندگی منتخب کرلے۔ لیکن پہلے باہمی اعتماد و محبت کی فضا تو پیدا کیجئے انسان کو گلے لگائیے تب آگے بات ہوگی۔ اگر انسانیت ہی نکل گئی تو کس سے بات کی جاتے (تحفۂ انسانیت صفحہ ۴۲)

اس وقت ملک اور معاشرہ کی جو صورتحال ہے اسے مولانا نہایت خطرناک قرار دیتے ہیں۔ اور اس صورتحال کو بدلنے کے لئے چار اہم نکاتی پروگرام پیش فرماتے ہیں۔ انھوں نے ناگپور کے "ڈائیلاگ" کے آخر میں فرمایا تھا۔

"اس صورت حال کی اصلاح کے لئے جو ملک کے لئے تباہ کن اس کو بدنام کرنے والی اور بیرونی دنیا کی نگاہ میں اس کو غیر وقیع بے اعتبار، غیر متمدن اور غیر ترقی یافتہ ثابت کرنے والی ہے، اور جس کی اصلاح یا تدارک میں ملک کے ذی شعور، دردمند اور انسان دوست طبقہ کی بہترین توانائیاں اور صلاحیتیں صرف ہوتی ہیں، ایک ہمہ گیر طویل المیعاد پروگرام کی ضرورت ہے جس پر ملک کے دانشوروں اصلاحی اور تعلیمی کام کرنے والوں اور سیاسی رہنماؤں کو جلد توجہ کرنی چاہیئے، میں اس سلسلہ میں ان چار نکات کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرنا چاہتا ہوں جو میرے نزدیک فوری طور پر موثر اور مفید ہوسکتے ہیں۔

۱۔ خالص مذہبی، اخلاقی، انسانی بنیاد پر عوام سے براہ راست رابطہ قائم کرنے کی کوشش اور دوروں، وفود، ملاقاتوں، محلوں بستیوں، گاؤں اور قصبات کی سطح پر جلسوں اور خطابات کی تنظیم، جن میں انسان کی جان اس کی عزت و آبرو، مال و املاک کی قدر و قیمت ذہن نشین کرنے کی کوشش کی جائے۔ ان کے احترام و تحفظ کی ذمہ داری کا احساس دلایا جائے۔

مذہبی، اخلاقی و انسانی بنیاد پر یہ کام اس لئے مفید اور موثر ہے کہ اس ملک کے باشندوں کا مزاج فطرتاً مذہبی، امن پسند، محبت آشنا اور انسان دوست واقع ہوا ہے وہ اسی زبان کو زیادہ سمجھتے ہیں اور اسی راستہ سے ان کے دل و دماغ تک پہنچنا آسان ہے اور اسی کا اثر مستقل اور دیرپا ہوتا ہے۔ دوسرے اس لئے کہ (افسوس اور شرم کے ساتھ یہ بات کہی جاتی ہے) بار بار تجربوں کے بعد عوام کا سیاسی پارٹیوں اور الیکشن کے موقع پر منشور اور اعلانات پر سے بھروسہ اور عقیدہ اٹھتا جا رہا ہے اور وہ اس سے متاثر نہیں ہوتے۔

۲۔ پرائمری کے مرحلہ سے لے کر کالجوں اور یونیورسٹیوں کے تعلیمی مرحلہ تک نصاب تعلیم بالخصوص تاریخ کے مضامین اور اس کے نصاب کی اصلاح جو ملک کے دو بڑے فرقوں (مسلمانوں اور غیر مسلموں) کے دل و دماغ میں منافرت کے بیج بونے کا ذمہ دار ہے چونکہ تعلیم و

وتلقین کا یہ سلسلہ بچپن کے ابتدائی دور سے شروع ہوجاتا ہے اور کتاب میں پڑھی ہوئی باتوں کا یقین (بالخصوص جب ان کو واقعات قصوں اور کہانیوں سے مستحکم کیا جائے اور استاد بھی اس کے پرجوش مبلّغ و داعی ہوں) طالب علموں کے دلوں میں پیوست ہوجاتا ہے۔ اور وہ ہر لکھی اور چھپی ہوئی بات کو ادب و احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں تو ان کا ذہن و دماغ اسی میں ڈھل جاتا ہے، اور ان کی پوری زندگی اسی کے سایہ میں گزرتی ہے، یہی زہر ہے جو آج ہمارے پورے معاشرہ میں پھیلا ہوا ہے اور کسی وقت وہ ہانڈی کا اُبال اور جذباتی اشتعال بن کر فرقہ وارانہ فسادات اور عملی تصادم کی شکل اختیار کرلیتا ہے جب تک اس نصاب تعلیم کی (جس کی داغ بیل انگریزوں نے اپنے سامراجی مقاصد اور "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" (DIVIDE AND RULE) کے اصول کے ماتحت ڈالی تھی) اصلاح نہیں ہوگی۔ اس امن و آشتی، باہمی اعتماد اور دونوں فرقوں کے درمیان خوشگوار تعلقات کی امید نہیں کی جاسکتی۔

۳۔ ہندوستانی پریس میں اپنی ذمہ داری کا احساس پیدا کرنے کی مؤثر اور طاقتور اور منظم اور مخلصانہ کوشش، یہ اخبارات اپنے ہیجان انگیز مضامین، سنسنی خیز خبروں اور تصویر کا بالعموم ایک رخ پیش کرنے اور ایک فرقہ کے ظلم اور ایک فرقہ کی مظلومیت ہی کو نمایاں کرنے کے ذریعہ لاکھوں انسانوں کے دل نفرت و عداوت کی آگ بھڑکا دیتے ہیں۔ اور کسی فرقہ، جماعت یا آبادی کے ایک عنصر کی طرف سے شکوک و بدگمانیوں کا ایک بادل بنا دیتے ہیں۔

میں نے کچھ عرصہ ہوا لکھنؤ میں مدیرانِ جرائد کی ایک معقول تعداد کے سامنے جو ایڈیٹرس کانفرنس میں شرکت کے لئے آئے تھے، فارسی کے ایک مشہور شعر کا ایک مصرعہ پڑھا تھا ؎

زیر قدمت ہزار جان است

شاعر محبوب کو مخاطب کرکے کہتا ہے تیرے قدم کے نیچے ہزاروں جانیں ہیں۔ اس لئے چلنے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے اس مصرعہ میں صرف ایک حرف کی ترمیم کے ساتھ میں نے اس کو اس طرح پڑھا تھا۔ ع

زیر قلمت ہزار جان است

آپ کے قلم کے نیچے ہزاروں انسانی جانیں ہیں اس لئے لکھنے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔

۴۔ برطانوی حکومت نے اپنی اس کمزوری اور اس حقیقت کا احساس کرکے کہ اس کے نمائندے ہندوستان میں بہت تھوڑی تعداد میں ہیں۔ اور وہ سات سمندر پار سے اس ملک اور اہل ملک کی مرضی کے خلاف اس پر اپنا قبضہ اور اقتدار قائم کئے ہوئے ہے، ہندوستان میں اپنے اور پبلک کے درمیان ایک "ایجنسی" کی ضرورت سمجھی تھی جو اس کا پبلک پر رعب وداب قائم رکھے اور جس سے یہاں کے عوام دہشت زدہ اور مرعوب رہیں اور جس کے سہارے وہ یہاں اپنے جابرانہ قوانین نافذ اور حالات کو کنٹرول کرسکے۔ یہ پولیس کا ادارہ تھا۔ اور چونکہ بدیسی حکومت میں اس کی بنیاد اسی نظریہ پر پڑی تھی۔ اس لئے اس نے اس کی تربیت دہشت انگیز پر کی تھی۔ اس کو جان بوجھ کر ہر طرح کی اخلاقی تربیت ہم وطنوں کے احترام اور لطیف و بلند انسانی احساسات و جذبات سے الگ رکھا تھا۔ اس کا نتیجہ اس کیریکٹر کی شکل میں ظاہر ہوا۔ جو اس ادارہ کا نہ صرف امتیازی نشان بلکہ قابل تعریف اور باعثِ افتخار بن گیا۔

لیکن اب جبکہ ہندوستان آزاد ہے۔ اور ہمارے منتخب کئے ہوئے بھائیوں کا کام اس ملک پر حکومت کرنا نہیں بلکہ اس کا انتظام سنبھالنا اور پبلک کی خدمت کرنا ہے پولیس کا معیار اور اس کے بارے میں نقطۂ نظر بدلنا چاہیئے۔ اور اس مفید ادارہ کی تربیت (جو ملک کی آبادی کا ایک اہم جزء اور قابلِ احترام عنصر ہے) بالکل دوسرے نہج پر ہونی چاہیئے اس میں اخلاقی تربیت، ہندوستانی شہریت اور انسانی احساسات دوسروں کی مدد کا جذبہ کمزوروں پر رحم، چھوٹوں پر شفقت اور پاکباز انسانوں کا احترام اور اپنے فرائض کو بہتر سے بہتر طریقہ پر ادا کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے تاکہ وہ اس طرح سے اہل ملک اور اپنے ہم وطنوں کی نظر میں مونس و غمخوار اور معاون و مددگار نظر آئیں، دوسرے ملکوں میں حتیٰ کہ خود برطانیہ میں اُن کو اسی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔" (ملک و معاشرہ انتہائی خطرناک موڑ پر ہے صفحہ ۲۶ تا ۳۰)

اس حقیقت سے باخبر حضرات بے خبر نہیں ہیں کہ ہمارا ملک ہندوستان انگریز کی غلامی سے طویل لڑائی کے بعد آزاد ہوا۔ ہندوستان میں مختلف مذاہب اور اقوام و ملل سے وابستہ افراد جو رہتے اور بستے ہیں ان کی رعایت کرتے ہوئے سب لوگوں کے لئے قابل قبول ایک سیکولر اور جمہوری دستور بنایا گیا، لیکن مفاداتِ حاصلہ تنگ نظری اور عصبیت کے شکار جو لوگ اس آئین اور دستور میں تبدیلی لانا چاہتے ہیں۔ مولانا ان کے اس رجحان کو ہندوستان کے لئے نہایت خطرناک قرار دیتے ہیں وہ فرماتے ہیں۔

"ملک کے ابتدائی اور مخلص رہنماؤں نے ملک کے لیے جو تین بنیادی اصول طے کئے تھے، وہی اس ملک کے لئے بقا اور سلامتی کی ضمانت ہے۔

۱۔ جمہوریت
۲۔ دوسرے نامذہبیت (SECULARISM)
۳۔ اور عدم تشدد

اگر ان کی خلاف ورزی کی گئی تو ملک تباہ ہو جائے گا۔" (مولانا علی میاںؒ کے خطوط مولانا عبدالکریم پاریکھ کے نام صفحہ ۳۶۱-۳۶۰)

مولانا پاریکھ صاحب ہی کے نام ایک دوسرے خط میں تحریر فرماتے ہیں:۔

ملک کا جو سیاسی اور انتظامی مستقبل نظر آرہا ہے وہ عمومی طور پر ملک کے لئے اور خصوصی طور پر ملتِ اسلامیہ کے لئے بڑا اندیشناک اور تشویش انگیز ہے

جن قائدین نے ملک کے لئے تین اصول اور شرطیں مقرر کی تھیں، وہ بڑے حقیقت پسند اور دوربین تھے۔ ایک یہ کہ اس ملک کی قیادت آزادی اور بقا کے لئے تین شرطیں ہیں۔

ا۔ جمہوریت (۲) نامذہبیت (۳) عدم تشدد

حقیقت یہ ہے کہ یہ ملک ان تینوں کی پابندی کے بغیر قلیل مدت تک بھی نہیں چل سکتا، اس وقت اس حقیقت کے اعلان کی بڑی ضرورت ہے

کاش! ملک قوم کے بہی خواہ اور جہاں دیدہ مبصر عالم کی بصیرت افروز رائے کا احترام کیا جاتا اور وہ لوگ جو عصبیت اور فرقہ پرستی کا خاص مزاج اور ذہن رکھتے ہیں وہ ہندوستان کے وسیع تر مفادات میں دستورِ ہند جو بلاشبہ دنیا کے دستوروں میں اپنی معنویت کے اعتبار سے اہم ترین دستور سمجھا جاتا ہے اس میں ترمیم کی بات سے باز آتے۔

مولانا علی میاںؒ نے ملک قوم کی بہتری کو پیش نظر رکھتے ہوئے دستورِ ہند کے سلسلہ میں اپنا جو نقطۂ نظر پیش کیا ہے اس سے ہر صاحبِ بصیرت اتفاق کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پائے گا۔

پڑھیں گے اہلِ جہاں جب تمہاری تحریریں

● وکیل احمد انصاری جونپوری

غموں کے جب بھی اندھیرے ہمیں ستائیں گے — یہ سوچتے ہیں کسے حالِ دل سنائیں گے
یہ بات عام تھی مسجد میں شیخ جائیں گے — جو معتکف ہیں انہیں بھی گلے لگائیں گے
خدا کے گھر میں نہ جاکر خدا کے پاس گئے — کسے خبر تھی انہیں پھر نہ دیکھ پائیں گے
پڑھیں گے اہل جہاں جب تمہاری تحریریں — وہ اپنے دل میں نئی اک شمع جلائیں گے
بڑھا کے مادرِ علمی کا تو وقار گیا — یہاں جو آئیں گے وہ تشنگی بجھائیں گے
اسے نہ خوف کبھی تھا کسی حکومت کا — پھر اس کے جیسا نڈر ہم کہاں سے لائیں گے
کرے گا وار کوئی بڑھ کے جب شریعت پر — تمہارے ایسے ہی جانباز یاد آئیں گے
دیا تھا تونے سبق بندے ماترم نہ پڑھو — کہ ایسے گیتوں سے ایمان ڈگمگائیں گے
سمجھ نہ پایا زمانہ کہ تو مجدد تھا — یہ بات سچ ہے زمانے کو ہم بتائیں گے
پیام جو ترا انسانیت کا سن لیں گے — وہ اپنے سارے ستم خود ہی بھول جائیں گے
لٹا دیا ہے وہ انعام جو ملا ہے تمہیں — تمہارے ایسا سخی اب نہ دیکھ پائیں گے
شرف جو تجھ کو ملا ہے کلیدِ کعبہ سے — ہم اہلِ ھند یہ تمثیل دے نہ پائیں گے
ہمیشہ عالمِ اسلام کی تھی فکر تجھے — تمہارے جیسا مفکر کہاں سے لائیں گے
نہ بجھ سکے گی کبھی شمع شاہ علم اللہ — ملے گا ان کو اجالا جو پاس جائیں گے
جناب رابع پہ رحمت ہے ذات باری کی — وہ جانشین ہوئے ہم سبھی کو بھائیں گے
یہ مانتے ہیں کہ تم دور جا چکے ہو مگر — تمہاری یادوں کے روشن دیئے جلائیں گے
دکھائی راہ جو تونے ہمیں اخوت کی — اسی پہ چل کے زمانے کو ہم دکھائیں گے
یقیں دلاتے ہیں ہر آشنائے گلشن کو — چمن کو اور بھی ہم دلنشیں بنائیں گے

خدا کی ذات پہ کرکے یقین کہہ دو وکیل
نئی صدی میں نئے بوالحسن بھی آئیں گے

اوپر کی سطروں میں مولانا علی میاںؒ کے جن افکار و خیالات کو پیش کیا گیا ہے، ان کی حیثیت "نورِ بصیرت" کی ہے اور بجا طور پر علامہ اقبال کے اس شعر کو مستعار لیکر مولانا کی طرف سے کہا جاسکتا ہے:۔

خدایا! آرزو میری یہی ہے۔
"مرا نور بصیرت عام کردے

اب ان کی کیسی صورت قسمت میں نہیں شاید
دامن بھی ہمارے پاس آنسو بھی ہمارے پاس

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

پروفیسر ضیاء الحسن ندوی

۳۱ر دسمبر ۱۹۹۹ء مطابق ۲۲ر رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ اسلامیان عالم کے لئے عموماً اور مسلمانان ہند کے لئے خصوصاً ایک ایسا دن تھا جس نے اس پورے سال کو "عام الحزن" غم کا سال بنادیا۔ بیسویں صدی کا یہ آخری سال جاتے جاتے دل مسلم پر کیسے کیسے داغ لگا گیا، نہ جانے کب تک ان سے دھواں اٹھتا رہے گا۔ فقہ اسلامی کے عالمی شہرت یافتہ ماہر شیخ مصطفیٰ الزرقاء، عربی زبان کے بے مثال ادیب وخطیب شیخ علی طنطاوی، حدیث کے عالم بے بدل شیخ ناصر الدین البانی، سعودی عرب کے سب سے بڑے عالم، دارالافتاء والارشاد کے بانی وصدر شیخ عبداللہ بن باز، سب اسی ایک سال کے اندر دنیائے فانی سے کوچ کرکے راہی ملک بقا ہو گئے۔ اور اس سال کے آخری دن ایک طرح ہمارا آخری سہارا بھی چھین لے گیا۔ علی میاں کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ عالم اسلام عہد آفریں شخصیت سے اور دارالعلوم ندوۃ العلماء اپنے سرپرست سے محروم ہوگیا۔

مصائب اور تھے پر دل کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہوگیا ہے

۳۱ر دسمبر ۱۹۹۹ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کی جامع مسجد میں نماز جمعہ کے بعد برادرم ڈاکٹر شفیق احمد خاں ندوی، صدر شعبہ عربی نے جب یہ اندوہناک خبر سنائی تو تمام سننے والوں کے (جن میں یہ خاکسار اور برادر گرامی پروفیسر محمد اجتبا ندوی بھی شامل تھے) دل کی حالت چہروں سے جھلک رہی تھی۔ صبر کا دامن چھوٹنے کو تھا کہ جامعہ کے قدیم ومحترم استاد ڈاکٹر اکرام خاں صاحب کی زبان سے ادا ہوا یہ جملہ پردہ سماعت سے ٹکرایا "مسلمانوں کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے بڑا کوئی غم نہیں ہے" اور زخم پر مرہم کا کام کر گیا۔ سچ ہے حیات جاوداں تو آخرت ہی کے لئے ہے، اس عالم آب وگل کے لئے تو فنا مقدر ہے ؎

بہ گیتی گر کسے پائندہ بودے
ابو القاسم محمد زندہ بودے

مولانا کی حیات بھی خوش گوار تھی اور وفات بھی شاندار، قدرت نے انہیں ایسی ہر دلعزیزی عطا کی تھی جس کی آرزو سے شاید کوئی دل خالی نہ ہو۔ مقبولیت بارگاہ ایزدی کا تاج آخری سانس تک سر پر رہا۔ وہ ایک فقیر بے نوا تھے جنہوں نے بے تاج بادشاہی کی، بے شمار دل ان کے قلمرو میں تھے، ان کی تقریر وتحریر "از دل خیزد بر دل ریزد" کی زندہ مثال تھی، وہ کبھی کاسۂ گدائی لئے کسی بڑے سے بڑے دربار میں نہیں دیکھے گئے، البتہ صاحبان دربار کی تمنائے باریابی کے شاہد ہزاروں ہیں، کسی سلطان جائر کا رعب انھیں کلمۂ حق سے باز نہ رکھ سکا، اپنی گوناگوں علمی، سماجی وملی ذمہ داریوں کے باوجود اپنے معمولات، اوراد واذکار میں کبھی کمی نہ آنے دی بلکہ اس میں ادنیٰ تقدیم وتاخیر بھی گوارا نہ کی۔ دینی غیرت وحمیت اور حب رسول میں جس نے کسی بڑے سے بڑے حاکم کی پرواہ نہ کی ہو۔ خوش گوار زندگی کی اس سے زیادہ واضح، روشن، بے داغ اور کیا مثال ہو سکتی ہے۔

رمضان کا مبارک مہینہ، فالج زدہ اور کمزور جسم کے ساتھ تمام روزے پورے کئے، ایک وقت کی فرض نماز کیا، سنت ونفل بھی فوت نہیں ہوئی۔ ذکر وتلاوت میں شمہ برابر کمی نہ آئی، شدید علالت میں بھی جس کی جماعت نہ چھوٹی ہو، جمعہ کے تمام مسنون آداب سے آراستہ، تقویٰ طہارت کا یہ پیکر حسب معمول مسجد جانے کے لئے تیار، دوران تلاوت جب سورہ یٰسین کی گیارہویں آیت "فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَأَجْرٍ كَرِيمٍ" (اسے مغفرت اور اجر کریم وعظیم کی خوشخبری سنادو) پر آخری سانس پر روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی، کیا کوئی موت اس سے زیادہ قابل رشک اور شاندار ہو سکتی ہے؟

وفات کی خبر تیز ترین ذرائع ترسیل وابلاغ کی بدولت ساری دنیا میں اسی دن پہونچ گئی، امام حرم کعبہ شیخ محمد بن عبداللہ السبیل نے فرمایا: "اس سانحہ اور اس محرومی پر ہم کس اور سے کیا تعزیت کریں کہ ہم خود بلکہ ساری امت اسلامیہ آج سزاوار تعزیت ہے"۔ رابطہ عالم اسلامی کے سکریٹری جنرل ڈاکٹر عبداللہ صالح العبید کا تاثر تھا کہ: "وہ اتحاد ویگانگت کا نمونہ، قوم وملت کے رہنما اور بے مثال دیدہ ور تھے"۔ عالمی رابطہ ادب اسلامی جس کی بنیاد ہی فکر ابوالحسن کی رہین منت ہے، کے نائب صدر اور سکریٹری جنرل ڈاکٹر عبدالقدوس ابو صالح نے مولانا کو خیر وبرکت کی علامت قرار دیا اور لکھا کہ: "اس عظیم شخصیت کا رعب مخالف وموافق سبھی دلوں پر تھا، ان کا بدترین مخالف

بھی انھیں نظرانداز کرنے کی جسارت نہیں کرسکتا تھا۔ عالمی رابطہ ادب اسلامی اپنے بانی صدر کے بعد دختر یتیم کی مانند ہے کہ اس کی تمام سرگرمیاں اسی ذات والاصفات کی رہنمائی اور دعاؤں کی رہین منت ہیں۔

ادارہ امور اسلامیہ قطر کے ڈائریکٹر خلیفہ جاسم الکواری نے لکھا کہ "اس عالم جلیل اور یگانۂ روزگار شخصیت سے محرومی مسلمانان عالم کے دل پر لگنے والی ایسی چوٹ ہے جس نے ان زخموں کو تازہ کردیا جو حال ہی میں ممتاز ترین علمائے دین کی ایک پوری کہکشاں کے غروب ہوجانے سے ان کے دل پر لگے تھے۔"

جمعیۃ علماء کے صدر مولانا سید اسعد مدنی نے فرمایا "مولانا کی شخصیت ساری دنیا کے لئے قابل احترام تھی" کل ہند مسلم پرسنل لابورڈ کے جنرل سکریٹری نے فرمایا "مولانا مرحوم کی ذات عالم اسلام کے لئے عموماً اور مسلمانان ہند کے لئے خصوصاً بہت بڑی نعمت خداوندی تھی۔" وقف دارالعلوم دیوبند کے ناظم اعلیٰ مولانا محمد سالم قاسمی نے لکھا: "بیسویں صدی کی آخری چوتھائی میں پورے عالم اسلام میں کوئی دوسری شخصیت ان کی ہم پلہ نظر نہیں آتی۔" غلام محمود بنات والا، صدر کل ہند انڈین یونین مسلم لیگ کہتے ہیں: "دنیا ایک قدآور شخصیت سے محروم ہوگئی۔" مولانا محمد سراج الحسن، امیر جماعت اسلامی ہند نے دعا کی "مولانا علی میاں کی سرپرستی و رہنمائی میں ملک و ملت کی جو خدمات انجام پارہی تھیں، اللہ تعالیٰ انھیں شرف قبولیت بخشے۔"

نائب صدر جمہوریہ ہند شری کرشن کانت فرماتے ہیں "انھوں نے ساری ہندستانی پیڑھیوں کی سوچ کو ایک نئی سمت دی۔" وزیر اعظم ہند نے کہا "ملک نے ایک عظیم دانشور اور مفکر کھودیا۔" سابق وزیر اعظم وی پی سنگھ نے مولانا کی وفات کو اپنا ذاتی نقصان قرار دیا۔ صدر کانگریس سونیا گاندھی فرماتی ہیں: "ہم نے نہ صرف ایک اسلامی دانشور بلکہ دنیا کا سب سے بڑا قابل تعظیم مذہبی رہنما کھودیا ہے۔" وزیر اعلیٰ اترپردیش کہتے ہیں" اسلام کے جید عالم نے پیام انسانیت کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا۔"

ممتاز مفکر مولانا وحید الدین خاں نے لکھا" ان کی شخصیت گویا سوسالہ دور کا احاطہ کئے ہوئے تھی، تاریخ میں وہ اس دور کی علامت کے طور پر دیکھے جائیں گے، ان کو بلاشبہ صدی کی شخصیت (MAN OF THE CEN-TURY) کہا جاسکتا ہے۔"

سعودی عرب کے روزنامہ عکاظ نے لکھا" وہ رہنما جس نے دنیا سے اسلامی تشخص کا لوہا منوالیا۔" وہیں کے روزنامہ المدینہ نے لکھا "بیسویں صدی کے ساتھ اس کا مایہ ناز سپوت بھی رخصت۔" جدہ کا روزنامہ اردو نیوز کہتا ہے" علی میاں کی وفات اس صدی کا آخری نقصان۔" عربی پریس کہتا ہے" ایک چراغ اور بجھا اور بڑھی تاریکی۔" ہندوستانی اخبارات لکھتے ہیں" وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان"، "اسلامی تاریخ وادب کا آفتاب غروب ہوگیا"، "خانہ کعبہ کا کلید بردار نہ رہا"،" ایک عہد اور صدی کا خاتمہ"۔

یہ تعزیتی تبصرے جو سیکڑوں ہزاروں بیانات میں سے چند ہیں صرف اس لئے نقل کئے گئے کہ عام انسانی دنیا خصوصاً امت اسلامیہ کے ہر درد وغم کو اپنے دل پر لینے والی شخصیت اور اس پر نم ہونے والی آنکھ جب دنیا سے رخصت ہوئی تو ایسا محسوس ہونے لگا کہ دل کی جگہ محض گوشت کا ایک لوتھڑا اور آنکھ کی جگہ محض شیشے یا پتھر کا ایک ٹکڑا رہ گیا ہے۔ محرومی کی فضا میں یہ احساس ستانے لگا کہ شاید اسلام اور مسلمانوں کے اس آڑے وقت میں کوئی دوسری رونے والی آنکھ اور پگھلنے والا دل باقی نہ رہے حالانکہ اس ناامیدی اور مایوسی کا کوئی جواز نہیں ہے۔ خون صد ہزار انجم سے سحر کی نمود کا مشاہدہ دنیا نے بار بار کیا ہے۔ مجھے یہ ماننے میں تامل ہے کہ مولانا کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ کبھی بھی پر نہ ہوگا۔ میرا اور میری طرح پوری امت اسلامیہ کا ایمان ہے کہ علی میاں تو رخصت ہوگئے لیکن ان کا اور پوری کائنات کا خالق و مالک موجود ہے، وہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا اور اس مجدد عصر کا بدل اور نعم البدل امت کو ضرور عطا کرے گا۔ آج اس غم کو ہلکا کرنے کے لئے ہمیں اسلام کے قرن اول کا وہ سانحۂ عظیم یاد آتا ہے جس پر عمر فاروقؓ جیسے آہنی اعصاب کا مالک بھی تھوڑی دیر کے لئے جیسے توازن کھو بیٹھا تھا، اگر کسی نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر زبان سے نکالی تو سرتن سے جدا کردیا جائے گا۔ رنج وغم کی اس بوجھل فضا اور ذہنی و اعصابی تناؤ کے اس پرخطر ماحول میں اللہ کا ایک برگزیدہ بندہ مسجد نبویؐ کے منبر پر کھڑے ہو کر ارشاد فرماتا ہے کہ" لوگو! جو کوئی محمد کو پوجتا تھا وہ سن لے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے جاچکے پر جو اللہ کو پوجتا تھا وہ یقین رکھے کہ اللہ زندہ ہے، اسے کبھی موت نہیں ہے۔" یہ الہامی فقرے دل ودماغ کے زخموں پر مرہم بن کر نازل ہوئے، فکر وعمل کا کھویا ہوا توازن بحال ہوگیا اور لوگ محسن انسانیت کی ہدایات وتعلیمات کے حرف حرف پر عمل پیرا ہوگئے۔ تاریخ انسانیت کا یہ عظیم حادثہ اور اس کا سبق آموز ردعمل آج ہمیں بھی درس توازن دے رہا ہے اور جانے والے کے بہترین اور

مثالی شب و روز کی پیروی کا حوصلہ بخشتا ہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی علمی اور تصنیفی خدمات اور ان کو ملنے والے علمی اور ادبی اعزازات کا تذکرہ اور تفصیل اس مختصر مضمون میں ممکن نہیں ہے تاہم ایک اجمالی جائزہ بے موقع بھی نہیں ہے۔

۱۔ مولانا کی کتاب "نبی رحمت" جو اصلاً عربی زبان میں لکھی گئی ہے اردو میں اس کا ترجمہ مرحوم سید محمد الحسنیؒ نے کیا۔ یہ کتاب سیرت سید المرسلین پر ایک شاہکار تصنیف ہے۔

۲۔ "المرتضیٰ" حیات امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر عربی میں ایک نہایت متوازن کتاب ہے۔ اس کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

۳۔ "تاریخ دعوت و عزیمت" مولانا کی ایک معرکۃ الآرا تصنیف ہے جو اس موضوع پر اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ اس کے عربی اور انگریزی اور ترکی ایڈیشن بھی موجود ہیں۔

۴۔ "سیرت سید احمد شہیدؒ" کے نام ہی سے اس کا موضوع ظاہر ہے۔

۵۔ "مطالعہ قرآن کے اصول و مبادی"

۶۔ "نقوش اقبال" مولانا کی اصل عربی تصنیف "روائع اقبال" کا اردو ترجمہ ہے اور عالم عرب میں اقبال شناسی کا سب سے مستند ذریعہ ہے۔

۷۔ "مذہب و تمدن" عربی اور انگریزی میں بیروت لکھنؤ اور کراچی سے شائع ہوئی۔

۸۔ "کاروان زندگی" سات ضخیم جلدوں میں مولانا کی خود نوشت سرگذشت حیات ہے۔

۹۔ "ارکان اربعہ" اسلام کے چار بنیادی ارکان نماز، روزہ، حج و زکاۃ اور اسلام کی اجتماعی زندگی میں ان ارکان کی اہمیت اور رموز و اسرار کی تشریح کرتی ہے۔ عربی میں بیروت، ترکی زبان میں انقرہ، اردو اور انگریزی میں لکھنؤ اور کراچی سے شائع ہو چکی ہے۔

۱۰۔ "پرانے چراغ" تین ضخیم جلدوں پر مشتمل معاصر بزرگوں، دوستوں اور اساتذہ کے دل کش تعارف، تاثرات و مشاہدات کا مجموعہ ہے۔

۱۱۔ "منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین" اپنے موضوع پر شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔

۱۲۔ "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" مولانا کی وہ شہرہ آفاق تصنیف جو اس وقت دنیا کی چھ زبانوں عربی، انگریزی، فرانسیسی، اردو، فارسی اور ترکی میں طبع ہو چکی ہے۔ کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ عربی میں اس کے ۱۴، اور اردو میں گیارہ ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

۱۳۔ "اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش" اصلاً عربی زبان میں چھپی ہے، انگریزی اور اردو میں اس کا ترجمہ ہوا۔

۱۴۔ "پا جا سراغ زندگی" ان تقاریر کا مجموعہ ہے جو طلبائے مدارس کے سامنے مختلف مواقع پر کی گئی تھیں۔

۱۵۔ "حیات عبدالحیؒ" جیسا کہ نام سے ظاہر ہے مولانا کے والد کا تذکرہ ہے۔

مولانا کی کم و بیش دو سو کتابوں کے تعارف کے لئے عمر نوح اور عزم کوہ کن چاہئے، تب شاید کئی جلدوں میں اس کو سمیٹا جا سکے۔ اس لئے یہیں قلم روکنے میں عافیت ہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی زندگی کا اصلی جوہر ان کے فکر و عمل کا توازن، انسانیت اور انسانی اقدار پر اعتماد، خلق خدا سے بے پایاں محبت، نیز دنیا کے اعلیٰ ترین اعزاز و اکرام کے باوجود ان کی بے مثال تواضع و انکساری میں پنہاں تھا۔ شفیق جونپوری نے ایک مرتبہ کہا تھا ؎

خاکساری تیری دیتی ہے پیام بوتراب
تیری دانائی میں انداز عمر پاتا ہوں میں
گر نہیں سیف و علم، نوک قلم سے کام لے
اے علی ندوی تجھے کچھ باخبر پاتا ہوں میں

اس مرد دانا، پیکر دانش و بینش، مجسمہ علم و عمل اور نمونہ تقویٰ و طہارت کو نہ جانے کب تک دنیا یاد کرتی رہے گی، شعراء اور ادباء اپنے خون جگر کو اس کے لئے جلاتے رہیں گے۔ ان کی وفات پر چار دانگ عالم سے موصول تعزیتی پیغامات و تاثرات کو زبان خلق کا درجہ دیا جا سکتا ہے جو حال و قال دونوں سے گواہی دے رہے ہیں کہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی عالم اسلام میں عصر جدید کے نقیب اور عالمی انسانی سماج میں ایک فکر جدید کے داعی تھے، ان کی سرپرستی میں گذشتہ تقریباً نصف صدی سے جاری عربی ماہنامہ "البعث الاسلامی" کے سرورق پر موجود یہ جملہ برابر قارئین کو یاد دلاتا رہتا ہے کہ:

شعارنا الوحید ـ الی الاسلام من جدید

ہماری واحد پہچان ـ اسلام کی طرف از سر نو کوچ
نئے سرے سے اسلام کی جانب سفر ہے۔

علی میاں کے فکر و عمل پر زندگی بھر سادگی، انکسار و اعتدال سایہ فگن رہا۔ ان کی بے مثال محبوبیت کا راز بھی شاید یہی تھا۔ وہ قدیم صالح اور جدید نافع کو ہمیشہ خود بھی قبول کرتے اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرتے رہے۔

جامعۃ الرشاد (اعظم گڑھ) کے بانی اور ناظم اور اسلامی علوم کے عظیم مصنف مولانا مجیب اللہ ندوی کسی مغل شاہزادے کے تحقیر آمیز رویہ پر خواجہ میر درد کا یہ شعر ؎

زنہار ادھر کھولیو مت چشم حقارت
یہ فقر کی دولت ہے کچھ افلاس نہیں ہے

سراپا عزیمت و دعوت

● خواجہ حسن ثانی نظامی، نئی دہلی

حضرت مولانا علی میاں علیہ الرحمہ کی ایک مشہور اور اہم کتاب کا نام "تاریخ دعوت و عزیمت" ہے۔ سچ پوچھئے تو اس کتاب کا عنوان صاحب کتاب کی اپنی زندگی کا عنوان بھی ہے، دو لفظوں میں کسی بڑی علی میاں جیسی شخصیت کا بیان مشکل ہی نہیں ناممکن سی بات ہے لیکن مرحوم اس مشکل کو خود آسان فرماگئے انھوں نے دعوت و عزیمت کی تاریخ ہی نہیں لکھی خود اپنے آپ کو بھی اس تاریخ کا ایک بہت اہم حصہ بناکر دکھادیا پیغمبر اسلام علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کے زمانے سے دوری بتدریج خیر و برکت سے دوری اور عزیمت و دعوت کی تحریک کے انحطاط کا نمونہ بھی خود ہادیٔ اعظمؐ کے قول و ارشاد کے مطابق بنتی رہی۔ لیکن اسلام اور مسلمانوں کی طویل تاریخ کے دوران الحمد للہ وہ برا وقت کبھی نہیں آیا کہ اسلام اور عزیمت و دعوت کے سچے نمونوں کا فقدان ہوگیا ہو۔ جس زمانے کو ہم خیر القرون کے نام سے یاد کرتے ہیں اس کو بھی فتنوں کے ظہور اور جمل و صفین جیسی جنگوں کے باوجود خیر القرون ہی کہا اور مانا جاتا ہے۔ اس طرح موجودہ گئے گزرے زمانے میں بھی حضرت علی میاں جیسی شخصیتوں کا تواتر کے ساتھ باقی رہنا ثبوت ہے اس بات کا کہ چراغ مصطفویؐ برابر روشن رہا ہے۔ حضرت مرحوم نے دعوت و عزیمت کے پرچم کو بلند رکھ کر اپنی صدی اپنے زمانے کو بے مایہ ہونے سے بچالیا۔ ان کے کام اور ان کی فیض بخش ذات کے اثر و نفوذ کا یہ عالم رہا کہ مشرق سے مشرق یعنی جغرافیائی اعتبار سے برونائی سے برونائی تک صرف عالم اسلام ہی میں نہیں کل جہان میں اس کمزور، بیمار اور نحیف انسان کی آواز پہنچتی رہی اور اثر انداز ہوتی رہی، اس کے توحید نشان لہجے کی دھمک صنم کدوں میں لرزہ ڈالنے کو کافی ہوتی تھی۔

ایک اور اہم پہلو مرحوم کی شخصیت کا یہ ہے کہ وہ بیک وقت تصوف دوست اور تصوف مخالف حلقوں میں مقبول تھے یعنی جیسا اجماع ان کی ذات پر عام مسلمانوں کا تھا ایسا اجماع کم دیکھنے میں آتا ہے، پچھلے کچھ برسوں میں ایک افسوسناک صورتحال یہ پیدا ہوگئی تھی کہ خانقاہیں علم سے عاری ہونے لگیں اور مدرسے روحانیت سے محروم نظر آنے لگے۔ حضرت علی میاں نے بیک وقت مدرسے اور خانقاہ کی لاج رکھی کہ نہ اس کو روحانیت سے خالی رکھا، نہ اس کو علم سے محروم ہونے دیا۔ وہ خود ایک صاحب اجازت اور صاحب نسبت بزرگ تھے، نقشبندیہ سلسلے کے علاوہ چشتی نظامی اور صابری اجازتوں سے آراستہ پیراستہ اور ہمیشہ فعال و سرگرم۔

علم و ادب، تعلیم و تربیت، روحانیت، دینی عظمت سیاسی بصیرت ہر حیثیت سے حضرت علی میاں فضائے بسیط اور آسمانوں کے آدمی تھے۔ لیکن اپنا جو روپ وہ ہمیں دکھا گئے وہ زمین کے انسان اور دھرتی کے باسی کا روپ رہا۔ نہ ثقہ علمائے کرام کا سا جبہ و دستار نہ تارک دنیا بے نیاز فقراء کی سی پیوند نمائی بس اپنے علاقے یوپی و لکھنؤ کے پڑھے لکھوں اور شرفاء کا عام لباس کرتا پاجامہ شیروانی ہی کے کپڑے سے بنی اچکن کیپ، نشست و برخاست گفتگو کا انداز۔ سب ویسا ہی۔ مگر ایک لحاظ سے منفرد بھی۔ لکھنؤ اسکول الفاظ کی ریل پیل اور آئینہ بندی سے عبارت سمجھا جاتا ہے، مگر علی میاں کے یہاں الفاظ بہت ہی احتیاط سے چنے ہوئے ہوتے۔ ہر لفظ باون تولے پاؤ رتی کی روایتی تول پر پورا اترنے والا، بیان میں نہ کہیں افراط نہ کہیں تفریط، مبالغے سے ایسا پاک اور بری کہ دوربین خوردبین کسی سے جانچ لیجئے، کسی بھی پیمانے سے ناپ لیجئے، میزان سے اتری اس میں کوئی چیز نہیں ملے گی۔ دو چار دفعہ کا صحبت یافتہ بھی اندازہ کرلیتا تھا کہ حضرت صرف متین اور سنجیدہ ہی نہیں ہیں، انھوں نے اپنے کسی لمحے کو نہ غیر ضروری طور پر استعمال کیا ہے نہ وہ لفظوں کی فضول خرچی کے عادی ہیں۔ اسی طرح فالتو موضوعات سے بھی انھیں قطعاً کوئی دلچسپی نہیں ہے، بس یوں لگتا تھا جیسے لکھنؤ کی اجارہ داری کے ساتھ ہی وہ دہلی اسکول کی سادگی اور پرکاری کا سرمایہ بھی سارا کا سارا اپنے ساتھ اٹھاکر رائے بریلی لے گئے ہوں، متانت اور سنجیدگی ان کی شخصیت میں کچھ زیادہ ہی تھی شوخی نے دربار عالی میں شاید کبھی بار نہیں پایا۔ اور شوخی کا کیا مذکور چلتی ہوئی بات کو بھی غالباً اپنی چلت پھرت دکھانے کی اجازت ان کے ہاں کبھی نہیں ملی۔ عربی زبان و ادب میں ان کی شان اور آن بان سے تو خیر راقم الحروف ناآشنا ہے، لیکن اردو کی حد تک یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ سنجیدگی کے ایسے ہالے میں رہنے والا بندہ بولے تو اور لکھے تو، نرمی اور گداز ہولے ہولے قدموں سے وجدان و احساس کو یوں آن جگائیں۔ اور ذوق و شوق اور کیفیات کی پھواریں یوں حرف حرف سے پھوٹیں اسے حیرت ہی حیرت نہ کہیئے تو کیا کہیئے ــــ مگر لاریب حیرت اسے ہو جو علی میاں سید زادے کے نانا پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ

(باقی صـ۲۶۰ـ پر)

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

مولانا مفتی محمد ظہور صاحب ندوی، صدر کلیۃ الشریعہ دارالعلوم ندوۃ العلماء،

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کیا تھے؟ ایسی جامع شخصیت کے بارے میں کیا کیا عرض کیا جائے۔ جو لکھا جائے وہ کم ہے، مرجع خاص و عام بلند پایہ۔ امت اسلامیہ کا سرمایہ پیکر خلوص و وفا، مسلم پرسنل لا بورڈ کے مسلّم بلا اختلاف صدر نشین، بے شمار اداروں کے رکن رکین۔ آکسفورڈ یونیورسٹی، مجلس اسلامی کے سربراہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کی مجلس شوریٰ کے ممبر، رابطہ عالم اسلامی کے دائمی ممبر دارالمصنفین اعظم گڑھ کے سرپرست، علم و ادب کے شہسوار، عالمگیر شہرت کے مالک۔ علم و تقویٰ کے لحاظ سے مینارۂ نور، ان کے دم سے ہم جیسے گنہگاروں کی عزت و آبرو قائم تھی۔ ان کی ایک ایک شفقت و محبت یاد آتی ہے۔ جب ان کی یاد آتی ہے تو دل دھڑکنے لگتا ہے بے ساختہ آنکھیں اپنا قیمتی سرمایہ نذر کر دینا شروع کر دیتی ہیں۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ حضرت مولانا ندوۃ العلماء کے معاملات سے دل برداشتہ ہو گئے تھے۔ اور قطعی علیٰحدگی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ بس قسم تو نہیں کھائی تھی لیکن فیصلہ کچھ اسی طرح کا تھا۔ سب حضرات مولانا کو راضی کرنے سے مایوس ہو گئے تھے لیکن اللہ کے یہاں مایوسی کفر ہے۔ راقم الحروف اساتذہ کی ایک جماعت لے کر رائے بریلی حاضر ہوا مسجد میں حضرت سے بات ہونے لگی۔ اللہ کے گھر کی برکت تھی کہ بات بن گئی میں نے عرض کیا کہ ہم سب تو آپ کے ساتھ دارالعلوم سے وابستہ ہیں، جب آپ ہی نہ ہوں گے تو ہم سب کیا رہیں گے، دارالعلوم یوں ہی بکھر جائے گا۔ حضرت کا دل آئینہ کی طرح صاف شفاف تھا کسی چیز کو ٹوٹتا اور بکھرتا ہوا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اور نہ اس کو برداشت کر سکتا تھا، راضی ہو گئے۔ اتنی خوشی ہوئی کہ اس کی حلاوت آج بھی محسوس ہوتی ہے۔ غور تو فرمائیے کہ جس ذات کی علیٰحدگی وقتی طور پر دارالعلوم سے گوارہ نہیں تھی وہ ہم سے ہمیشہ کیلئے جدا ہو گئی۔ اس پر صبر محض اللہ تعالےٰ کی توفیق سے ہے۔

قدیم و جدید کا ایسا حسین امتزاج ندوۃ العلماء کے تخیّل کا زندہ جاوید پیکر کبھی عرب کو آواز دے رہا ہے ان کو قومیت کے جال سے نکالنے کی کوشش کر رہا ہے اور کبھی عجم میں آواز لگا رہا ہے، نئے نئے اچھوتے اسلوب میں اسلامی افکار و خیالات اور تعلیمات کو پیش کر رہا ہے۔ اپنا دل نکال کر رکھ دیتا ہے، دل سے نکلی بات دل پر اثر رکھتی ہے مسلمانوں کے عروج و زوال کی داستان سنائی دنیا پر اس کے اثرات کی نشاندہی کی صرف داستان ہی سُنانا نہیں تھا بلکہ تاریخ دعوت و عزیمت لکھ کر عروج و اصلاح حال کی طرف رہنمائی بھی فرمائی۔ آہ! حضرت مولانا ملت کیلئے سرمایۂ حیات تھے، ہر خاص و عام کیلئے جائے پناہ تھے سادگی ان کا شیوہ تھا، عزم و استقلال کے پہاڑ تھے ان کی رفعت شان کا کوئی ہم پلہ نہیں تھا۔ زاہد بے ریا تھے، ہر مکتب فکر کیلئے وہ قابل قبول اور محترم تھے مسلمانوں کو غفلت سے جگایا۔ مسلمانوں کے مسلکی اختلاف کو مٹایا۔ امن و اتحاد، پیام انسانیت جس کی ہندوستان جیسے ملک میں بے حد ضرورت تھی اس کی بنیاد ڈالی اور ایک جماعت کو اس پر لگا دیا۔ باطل سے زمانہ کے فتنہ "سے مقابلہ کیا۔ اور خوب کیا۔ غیروں کو منہ کی کھانی پڑی فتنوں کے روک کے لئے آپ کی ذات ایک قابل قدر ہستی تھی، ایک پشتہ تھی روک تھی، سیل بیکراں کیلئے اللہ تعالیٰ اپنے فضل خاص سے ہند کے مسلمانوں کی حفاظت فرماتا رہے، حضرت نے جو علمی ذخیرہ چھوڑا، ہے وہ ایک فرد کا کام نہیں وہ ایک اکاڈمی کا کام ہے۔ اس پر حیرت ہے کہ یہ یکسوئی میں کام نہیں کیا گیا ہے یہ ایسے شخص کا کام ہے جو کثرت سے سفر کرتا رہا ہو، مختلف تنظیموں کے جلسہ و جلوس میں بھی شرکت کرتا رہا ہو عرب و عجم میں حضر سے زیادہ سفر پر رہا ہو اور مختلف النوع ذمہ داریوں کو بھی ادا کرتا رہا ہو جو انتظامی بھی ہوں اور نجی و واقعاتی بھی ہوں بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ آیَۃٌ مِن آیاتِ اللّٰہِ اللہ تعالیٰ ان بزرگوں کے اوقات میں بڑی برکت عطا فرماتا ہے۔

بلاشبہ حضرت کا تاریخی مطالعہ تاریخی تجزیہ و انتاج۔ اقوام و ملل کا تقابلی مطالعہ، قوموں کے عروج و زوال سے گہری واقفیت کسی سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح تفسیری مطالعہ، قرآن کا موجودہ دور کی تحقیقات سے ربط و اعجاز کے تعلق سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ عرب اور اس کے متعلقات سے ذوق و وجدان کے فطری تعلق سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے لیکن یہ سب ذیلی عنوانات ہیں۔ اصل چیز جو حضرت کو ان سب سے ممتاز کرتی ہے وہ

(باقی ص ۱۸۳ پر)

حضرت مولانا رحؒ کی محبوبیت و عظمت کا راز

● مولانا محمد برہان الدین سنبھلی

یوں تو حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ صفات کمالیہ کے جامع تھے کہ وہ بڑے عالم بھی تھے محقق بھی ادیب بھی تھے خطیب بھی، مرشد بھی تھے داعی بھی، سخی بھی تھے شفیق بھی، مبصر بھی تھے مفکر بھی، لیکن راقم کی نظر میں ان کے تمام کمالات اور ان کی شخصیت کی شاہ کلید جس کی بنیاد پر وہ محبوب خلائق اور معظم و محترم ہوئے دو چیزیں تھیں ایک ایمان کامل اور عمل صالح اور دوسری تواضع وانکساری۔

قرآن مجید میں (سورۂ مریم آیت ۹۶) اللہ نے فرمایا ہے " إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمَٰنُ وُدًّا "

"بلاشبہ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کئے (اللہ) رحمن ان کے لئے محبت پیدا کر دے گا۔"

تواضع وانکساری کی تاثیر حدیث نبوی میں یہ بیان کی گئی ہے ما تواضع احد للہ الا رفعہ اللہ (ترمذی) جو کوئی اللہ کی رضا کے لئے تواضع وانکساری اختیار کرتا ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ بلندی و عظمت عطا فرما دیتا ہے۔

حضرت مولانا رحؒ کی شخصیت اور ان کی محبوبیت و عظمت کا راز جاننے اور سمجھنے کے لئے یہ دونوں (آیت و روایت) کلیدی حیثیت رکھتی ہیں۔ قرآن مجید میں اللہ عز و جل نے فرمایا جو شخص کامل ایمان کے ساتھ عمل صالح اختیار کرتا ہے ہم اس کی محبت لوگوں کے دلوں میں بٹھا دیتے ہیں، حضرت مولانا موصوف فرمایا کرتے تھے کہ ایمان اور عمل صالح دو چیزیں نہیں ہیں بلکہ دو رخ ہیں یا دو پہلو، ایک باطن کا، ایک ظاہر کا، یا یوں کہہ لیجئے کہ دو محل ہیں، ایک قلب اور ایک قالب۔ ایمان کا محل قلب ہے، اور اعمال صالحہ کا محل قالب ہے، یعنی انسانی جسم اور اس کے اعضاء، ایمان نام ہے کسی چیز کو ماننے اور اسے سو فیصد صحیح سمجھنے کا۔ اور اسی ماننے اور سو فیصد صحیح سمجھنے پر ہاتھ پیروں کو آمادہ کر دینے کا نام عمل صالح ہے، واقعہ یہ ہے کہ حضرت مولانا رحؒ نے اپنی زندگی اسی سانچے میں ڈھال لی تھی، ان کا یقین قرآن و سنت میں بیان کردہ حقائق پر ایسا مضبوط تھا کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل سکتا ہے، لیکن جو باتیں اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائی ہیں۔ اس میں سر مو فرق نہیں ہو سکتا۔

عمل صالح کے بارے میں مولانا کا حال یہ تھا کہ چھوٹی سے چھوٹی سنت یعنی جس کو غیر مؤکدہ کہتے ہیں ترک کرنے پر بھی وہ آمادہ نہ ہوتے تھے، اس کے لئے مولانا کے عمل سے بس ایک مثال یہاں پیش کی جاتی ہے وہ یہ کہ مولانا نے اپنی زندگی کے آخری رمضان المبارک کی آخری تراویح بھی نہ صرف یہ کہ چھوڑی نہیں بلکہ باجماعت پوری بیس رکعتیں پڑھیں، حالانکہ تقریباً ایک سال سے مولانا کے ضعف جسمانی اور صحت کی خرابی کا جو حال تھا اس کی وجہ سے ہر مفتی و فقیہ مولانا کو تراویح کے ترک کا فتویٰ یا مشورہ دیتا۔ مگر مولانا کی طبیعت نے اسے گوارا نہیں کیا کہ فتوے کی دنیا الگ ہوتی ہے، اور تقوے کی الگ، ایسے ہی لوگوں کے لئے کہا گیا ہے "استفت قلبك ولو افتاك المفتون" (اپنے دل سے فتویٰ لو، چاہے مفتی فتویٰ دے چکے ہوں)

باوجودیکہ مولانا یہ بھی ضرور جانتے ہوں گے کہ مرض و معذوری کی حالت میں اگر کوئی ایسا عمل خیر ترک ہو جائے جس کا صحت کے زمانہ میں معمول تھا تو اللہ تعالیٰ جو رحیم و کریم ہے کی طرف سے پورا اجر ملتا ہے، "رحمت حق بہانہ می جوید ۔ رحمت حق بہا نمی جوید" اللہ تعالیٰ کی رحمت تو بس بہانہ ڈھونڈھتی ہے، ظاہری شکل و صورت پر نہیں جاتی، تقریباً یہی مفاد ہے۔ "انما الاعمال بالنیات" کا بھی (مگر رخصت و عزیمت میں فرق بہر حال رہتا ہے، بلاشبہ حضرت مولانا صاحب عزیمت تھے) اسی طرح کی ایک اور مثال کا ذکر کر دینا بھی بے محل نہ ہوگا۔ وہ یہ کہ جب بیماری کی وجہ سے مولانا کے لئے اٹھنا بیٹھنا بلکہ خود حرکت کرنا بھی مشکل ہی نہیں گویا ناممکن تھا، اس زمانہ میں بھی ان کی ہر نماز باجماعت ادا ہوتی تھی۔ اگرچہ اخیر بیماری میں عذر کی وجہ سے اپنی قیام گاہ پر ہی جماعت کر لیتے تھے۔ چند افراد نماز پڑھانے کے لئے مقرر تھے اور کچھ جماعت میں شرکت کیلئے، ظاہر ہے کہ یہ طرز "عمل صالح" کے علاوہ اور کیا ہے؟ سنتوں کا اہتمام اس حالت میں بھی فرماتے رہے۔ اور روزانہ تلاوت قرآن کریم کا معمول بھی رہا۔ حتیٰ کہ دم واپسیں بھی اسی محبوب کے کلام سے رطب اللسان تھے جس کے لقاء کا شوق غالب تھا جیسا کہ سب واقف جانتے ہیں کہ سورۂ یٰسین کی آیت "فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَأَجْرٍ كَرِيمٍ" کی تلاوت کرتے ہوئے مولانا کی روح نے قفس عنصری کو چھوڑا) یہ تو مرض اور عذر کی حالت کے معمولات تھے، صحت و تندرستی کے حال میں انکے معمولات تلاوت و ذکر نیز دیگر اعمال خیر کا تو کہنا ہی کیا!۔

ایمان و یقین کا یہ حال تھا کہ صورت حال چاہے جیسی خطرناک اور المناک ہو اور حالات کیسے ہی غیر یقینی ہوں مگر مولانا کو اللہ تعالیٰ کی ذات پر اعتماد اور اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت پر ایسا یقین تھا اسی طرح احادیث نبویہ کی بشارتوں پر بلکہ جیسے کہ عام لوگوں کو آنکھوں دیکھی چیزوں اور محسوسات پر ہوتا ہے اور اسی یقین قلبی کی تاثیر مولانا کی تحریروں، تقریروں اور زبانی گفتگوؤں میں ظاہر ہوتی جو سامع و قاری کے دلوں کو بھی یقین کی دولت سے مالا مال کر دیتی۔

اسی باعث ان کے پیغام میں وہ طاقت ہوتی تھی

کہ ہر آدمی پر اس کا گہرا اثر پڑتا تھا۔ ورنہ سب باخبر جانتے ہیں کہ عرصہ سے مسلسل پروپیگنڈے کی بنیاد پر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو فضا بنائی جا رہی ہے اس سے تقریباً ہر مسلمان احساس کمتری میں مبتلا تھا اور ہے، اس کو اسلامی حقائق پر اور ان باتوں پر پورے طور سے اعتماد باقی نہیں رہا جو ایمان کا تقاضا ہے، لیکن حضرت مولاناؒ کی تحریریں پڑھ کر اور ان کی تقریریں بلکہ باتیں سُن کر وہ یقین اکثر بحال ہو جاتا ہے، چنانچہ ایک بڑے عرب عالم نے مولانا کی تحریروں کی خصوصیت ہی یہ بیان کی ہے کہ وہ اسلام پر اعتماد بحال کرتی ہیں، دراصل اعتماد سے اعتماد پیدا ہوتا ہے چونکہ اسلامی حقائق پر مولاناؒ کو پورا اعتماد تھا، اور ان باتوں پر پورا یقین جو اللہ نے یا اللہ کے رسولؐ نے فرمادی ہیں، اسلئے مولاناؒ کے قلم یا زبان سے جو باتیں نکلتیں ان سے سامع و قاری کی طرف یقین منتقل ہو جاتا تھا۔ "از دل خیزد بر دل ریزد" کے مصداق، کہ بات جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔

گویا مولاناؒ کا اصل مرکزی موضوع یہی تھا جو حضرت مولاناؒ کی کتابوں کا مطالعہ کرنے والے ہیں وہ اس سے اتفاق کریں گے کہ مولاناؒ کی فکر کا مرکزی موضوع یہی تھا کہ یورپ کی تہذیب و تمدن سے آنکھوں کو خیرہ ہونے نہ دیا جائے، اس سے مرعوب نہ ہوا جائے، اور اسلام کی حقانیت پر پورے طور سے اعتماد برقرار رہے، اسلام کی حقانیت کے اعتقاد میں تزلزل نہ آنے پائے، چنانچہ مولاناؒ کی تقریروں اور تحریروں کا ایک خاص اثر پڑتا تھا۔ کیونکہ وہ یقین جو اندر کا تھا مولاناؒ کے قلم سے بھی نکلتا تھا اور مولانا کی زبان سے بھی، قلم اور زبان دونوں ذریعہ ہیں اظہار خیال کا (بلکہ عرب میں تو قلم کو "إحدى اللسانين" کہا ہی جاتا ہے)۔ خلاصہ یہ کہ ایمان اور عمل صالح یہ دو چیزیں تھیں جو مولانا کی شخصیت کی شاہ کلید تھیں، ان دونوں میں ان کو اللہ نے وہ امتیاز اور اعتماد عطا فرمادیا تھا جو بہت سوں کو نہیں حاصل ہوتا، دوسری بات مولانا کی انکساری اور تواضع تھی، حدیث میں ہے "ماتواضع احدٌ للّٰہ الا رفعہ اللّٰہ" واقعتاً ان کی تواضع اللہ کے لئے تھی اور حقیقی تھی اور جو بھی تواضع حقیقی (اللہ کے لئے) ہوتی ہے اللہ تعالیٰ ایسی تواضع والے کو وہ انعام عطا فرماتا ہے جس کا ذکر مذکورہ حدیث میں آیا ہے۔ اب اس کی ایک دو مثالیں عرض کی جاتی ہیں۔ مولاناؒ کے بارے میں سب ہی واقف ہیں کہ عرب ممالک میں انھیں جو عزت حاصل تھی وہ ہندوستان کے کم از کم کسی معاصر عالم کو حاصل نہیں تھی۔ اس پر سب ہی متفق ہیں: اس حقیقت کی تائید درج ذیل واقعہ سے ہوتی ہے۔

۱۹۵۰ء میں حضرت مولاناؒ اپنے شیخ حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ کے ساتھ حج کیلئے حجاز تشریف لے گئے تو کعبہ کے کلید بردار سے بھی آپ کی ملاقات ہوئی وہ بھی آپ سے متاثر ہوئے اور انھوں نے خود پیش کش کی کہ آپ کسی دن چاہیں تو کعبہ کا دروازہ کھلوا دیں۔ اور جس کو آپ چاہیں اندر ساتھ لے جائیں ہم اسے بھی **کعبہ کے اندر** جانے کی اجازت دیدیں گے، چنانچہ **ایک دن** مقرر ہو گیا۔ وہ حج کا زمانہ تھا دنیا بھر کے حجاج پہنچے ہوئے تھے، حضرت مولانا کے شناسا اور جاننے والے بھی بہت تھے، جاننے والا جو شخص ملتا اس کو حضرت مولاناؒ یہ خوشخبری سناتے اور دعوت دیتے کہ تمہیں کعبۃ اللہ کے اندر جانے کی خواہش ہو تو فلاں وقت فلاں جگہ آجانا۔ اس طرح بڑا مجمع ہو گیا۔ اور وہ وقت آگیا کہ اللہ نے یہ سعادت سب کو بخشی، بتانا یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ حضرت مولاناؒ اس سعادت کو اپنی کوئی بڑائی سمجھتے یا اپنا کوئی کمال خیال کرتے بلکہ چونکہ اس مجمع میں حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ (حضرت مولاناؒ کے شیخ اور مرشد) بھی تشریف فرما تھے اسلئے اس سعادت کے حصول کو اپنے شیخ کی کرامت قرار دیا اور لکھا کہ یہ ان کی برکت سے اور ان ہی کے طفیل ہم سب کو یہ سعادت حاصل ہوئی (تفصیل کے لئے دیکھئے کاروان زندگی جلد اول صفحہ ۳۵۵-۳۵۶)

حالانکہ یہ شرف اللہ تعالیٰ نے انہیں تواضع ہی کی وجہ سے عطا فرمایا تھا مگر انھوں نے اس شرف کو اپنی طرف منسوب کرنے کے بجائے اپنے شیخ اور مرشد کی طرف منسوب کر دیا۔ اس طرح کے بے شمار اہم واقعات حضرت مولاناؒ کی زندگی میں پیش آئے کہ انھوں نے اپنی طرف منسوب کرنے کے بجائے دوسروں کی طرف منسوب کیا۔

مولاناؒ کی تواضع ہر قدم پر ظاہر ہوتی مثلاً معاصر بزرگوں کے ساتھ تعلقات میں جس سے عوام کی ہی نہیں بزرگوں کی بھی انھیں محبت حاصل ہوئی اور بہت سے بزرگوں کے قلوب مولانا کی طرف اور بھی متوجہ ہو گئے۔

حضرت رائے پوریؒ کی مولانا سے محبت و تعلق کے تو خود مولانا نے بہت سے واقعات لکھے اور زبانی بھی سنائے ہیں، مثلاً یہ کہ مولانا ایک مرتبہ جب حجاز تشریف لے گئے اور وہ سفر تبلیغی جماعت کے اہم رکن کی یا ایک کارکن کی حیثیت سے ہوا تھا۔ (وہاں تبلیغ کا کام پھیلانے کے لئے) تو مولانا وقت بے وقت لوگوں سے ملنے اور انھیں کام سے متعارف کرانے تشریف لے جاتے اور کبھی بہت ناوقت لوٹتے تو حضرت رائے پوریؒ مولانا کے انتظار میں رہتے، کھانے کا وقت گذر چکا ہوتا اور مولانا چونکہ شروع میں بہت کمزور تھے اور معدہ کے بھی مریض تھے اور نان یا خمیری روٹیاں نہیں کھا سکتے تھے۔ اسی لئے حضرت رائے پوریؒ ان کے لئے چپاتی پکوانے کا اہتمام کرتے تھے۔ اور جب مولاناؒ واپس آتے تو فرماتے علی میاں تم کو تو کھانے کا بھی ہوش نہیں ہے میں تمہارے لئے چپاتی لئے بیٹھا ہوں۔

ایک مرشد و شیخ اپنے مرید کے ساتھ ایسا برتاؤ کرے، اس کی مثالیں کم ہی ملتی ہیں وہ بھی ایسا مقبول وکامل شیخ کہ جس کی بلندی اور عظمت پر ایک عالم متفق اور جس کے بڑے بڑے علماء مرید و مسترشد تھے حالانکہ اس وقت حضرت مولانا علی میاں بہت کم عمر تھے لیکن شیخ کے اندر ان کی محبت اس درجہ تھی کہ ان کے لئے چپاتی لئے انتظار میں بیٹھے رہتے اور اپنا دوپہر کا لیٹنا (قیلولہ جسے کہتے ہیں) اس کو مؤخر کر دیتے۔ یہ گویا "سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا" کی ایک عملی تفسیر تھی۔ ظاہر ہے کہ تقویٰ اور تواضع کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مولانا کو یہ عظمت عطا فرمائی ہر شخص ان کے ساتھ حتیٰ کہ ان کے شیوخ بھی (حضرت رائے پوریؒ اور حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ جیسے کاملین بھی) حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ لاہوری کی بھی غیر معمولی شخصیت تھی، حضرت مولانا علی میاںؒ فرمایا کرتے تھے، کہ کشف میں مولانا احمد علی صاحبؒ سے بڑھ کر ہم نے کسی کو نہیں دیکھا۔ اور نہ ورع و تقویٰ اور احتیاط میں خلاصہ یہ کہ مولانا کو اللہ نے جو خصوصیات عطا فرمائی تھیں ان میں سے یہ دو بہت اہم تھیں، ایک ایمان اور عمل واضح یعنی شریعت کے حقائق پر پورا الیقین، ایسا یقین کہ زمین ہل جائے، آسمان گر جائے، پہاڑ ٹل جائے یہ سب ممکن، لیکن شریعت کے حقائق پر سے یقین میں ادنیٰ کمی نہ آئے اور اس کے احکام پر پورا عمل، یہ مولاناؒ کا مزاج تھا۔ اور یہی مزاج مولاناؒ کی تحریروں میں پایا جاتا ہے۔ اور ان کے پڑھنے والوں میں منتقل ہو جاتا ہے، اور دوسری تواضع و انکساری، جن لوگوں نے مولانا کو دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ اگر مولانا کے سامنے کوئی شخص ان کی کسی خوبی کا تذکرہ کرتا تو وہ سر جھکا لیتے گویا کہ وہ شرمندہ ہو رہے ہیں یا جیسے کوئی خوبی بیان نہیں کر رہا ہے، بلکہ ایسی بات کہہ رہا ہے جس سے مولانا کو تکلیف پہنچ رہی ہے، یہ حال تھا، اخیر اخیر تک اور پھر اللہ نے مولانا کو ایسا استغناء

اور ایسی بے نیازی عطا فرما رکھی تھی کہ دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا حاکم آ جائے مولانا اسے اہمیت نہیں دیتے تھے، وزیر اعظم کسی کے یہاں پہنچ جائے تو کتنی بڑی بات سمجھی جاتی ہے مگر ہم نے دیکھا کہ وزیر اعظم کے مولانا کے پاس آنے کے بعد مولانا کی طبیعت پر کوئی اثر نہیں۔ اس واقعہ کا کوئی ذکر بھی نہیں، دوسرے لوگوں نے جب تذکرہ کیا کہ وزیر اعظم مولانا کی مزاج پرسی کرنے آئے یا فلاں وزیر آئے تھے تو بھی مولانا پر کوئی اثر نہیں نظر آیا۔ بلکہ ایسا لگا کہ جیسے کوئی غیر معمولی واقعہ ہی نہیں پیش آیا، سچ ہے کہ جس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی عظمت و محبت بیٹھ جاتی ہے ہر ایک کی مرعوبیت اس کے دل سے نکل جاتی ہے کسی بڑے سے بڑے حاکم کی مرعوبیت نہیں رہتی۔ خود مولاناؒ نے بہت سے اس قسم کے واقعات بزرگوں کے لکھے ہیں، ان حکایات و واقعات نے جن کو مولانا نے نقل کیا ہے خود ان پر ایسا اثر کر دیا تھا کہ وہ کیفیتیں مولانا کا حال بن گئیں تھیں، بڑے سے بڑا دولتمند یا بڑے سے بڑا رئیس نیاز مندانہ آتا۔ مولانا اس کی عزت و قدر تو کرتے لیکن اس سے کچھ وصول کرنے کا لالچ یا اس ہو کر نہیں پھٹکتا بلکہ کچھ شاید وہ مولانا سے لیکر ہی جاتا تھا، مجھے ابھی حال کا واقعہ یاد آیا وہ یہ کہ ابھی پچھلے دنوں حضرت مولانا کو جو کثیر رقمیں ملیں سبھی واقف جانتے ہیں کہ وہ سب تقسیم فرما دیں کروڑ سے اوپر کی رقم ملی۔ وہ جب تک تقسیم نہیں فرما دی تب تک چین نہیں آیا۔ برابر پوچھتے رہتے کہ رقم تقسیم ہو گئی یا رہ گئی؟ اسی طرح کی ایک حدیث یاد آتی ہے کہ اللہ کے رسولؐ کی خدمت میں کہیں سے بہت بڑی تعداد میں مال آیا تو آپ نے سب تقسیم فرما دیا تب اطمینان ہوا۔ لگتا ہے اللہ کے رسولؐ کی اس سنت کو آپؒ نے نمونہ بنایا۔ وفات سے شاید کچھ ہی روز پہلے سلطان برونائی کی طرف سے ایک انعام مولاناؒ کو دیا گیا تھا۔ (بیس لاکھ سے زیادہ کا تھا) وہ بھی مولاناؒ

نے تقسیم فرما دیا، اس تقسیم کی نوعیت ذرا بدل گئی تھی پہلے (دبئی کے) انعام کو مولانا نے تعلیمی اداروں نیز خیر کے کام کرنے والے اداروں میں تقسیم کیا، دوسرا انعام زیادہ تر احباب اور اہل تعلق میں تقسیم فرمایا، مولانا لینے کے بجائے دینا پسند فرماتے تھے، "الید العلیا خیر من الید السفلیٰ" (حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ اونچا رہنے والا ہاتھ بہتر ہے نیچے رہنے والے ہاتھ سے) کی حقیقت ان کے پیش نظر رہتی تھی۔ لاکھوں بلکہ کروڑوں کے مالکوں کو بھی مولانا نے دیا ہی ہے مگر اپنی ذات کے لئے کسی سے لیا نہیں، اپنی ذات کے لئے تو کیا اپنے ادارے کے لئے بھی مولانا نے براہِ راست کسی سے مطالبہ نہیں کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ مولانا کے نام پر اور مولانا کی نسبت سے اور لوگوں نے مطالبات کئے۔ یہ دو چیزیں دراصل مولانا کی شخصیت کی شاہِ کلید ہیں۔ اللہ کی ذات پر اللہ کی صفات پر، اللہ کے کئے ہوئے وعدوں پر، حدیث میں اور قرآن مجید میں آئی ہوئی باتوں پر یقینِ کامل، اسی لئے شریعت پر پورا انشراح، شریعت کے ہر ہر حکم پر عمل کرنے کا پورا جذبہ، شریعت کے سانچے میں اپنے کو ڈھال لینے کی پوری کوشش، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں پر پورا عمل، یہ مولانا کی خاص خصوصیات تھیں، اس کے نتیجہ میں قرآنی پیشین گوئی کے مطابق اللہ نے اپنا محبوب بنا لیا تھا۔ اسی وجہ سے خلق خدا کے بھی محبوب بن گئے گویا۔ "اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا" کا مظہر بنے، نیز "ما تواضع احد للہ الا رفعہ اللہ" کے وعدہ کا مصداق بھی ہوئے، تواضع و انکساری مولانا میں آخری درجہ کی تھی، ہر ایک سے اسی طرح ملتے کہ یہ معلوم ہوتا کہ مولانا چھوٹے ہیں اور وہ بڑا، حالانکہ ان کے زمانہ کے آخر میں شاید مجموعی طور پر ان سے بڑا کوئی نہیں رہ گیا تھا۔ لیکن جب بھی ملتے تو ایسا لگتا کہ ملنے والا بڑا ہے اور وہ اپنے کو

چھوٹا سمجھ رہے ہیں، اخیر دور میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا قدس سرہٗ، مولانا شاہ وصی اللہؒ الٰہ آبادی اور مولانا یعقوب صاحب مجددیؒ (بھوپال کے رہنے والے) چند بزرگ رہ گئے تھے۔ ان کی خدمت میں جاکر مولانا ایسے بیٹھتے تھے جیسے بہت معمولی شاگرد اپنے بڑے استاد کے پاس جاکر بیٹھتا ہے، حالانکہ خود مولانا کا مقام بہت بلند ہوچکا تھا اور مولانا کے حلقۂ ارادت میں بڑے بڑے لوگ شامل ہوچکے تھے لیکن مولانا کا اخیر تک یہ حال رہا۔

مولانا کی تواضع کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ علمی تحقیق کے سلسلے میں جس پر اعتماد کرتے اسکی بات مان کر بسا اوقات اپنی رائے تک بدل لیتے، حتیٰ کہ تصنیفات میں ترمیم فرما لیتے، چنانچہ راقم کی گذارش پر بعض آراء تبدیل کیں اور دوسرے ایڈیشن میں ترمیم فرمائی یہ تواضع کی انتہا ہے کہ حضرت مولاناؒ اپنے بعض خوردوں کے اردو مضمون کا بذات خود ترجمہ کرکے اپنی کتاب "الطریق الی المدینہ" میں شامل فرمایا۔ یہ تواضع کا ہی اثر تھا۔ ورنہ کوئی چھوٹا شخص بھی بڑی مشکل سے اپنی رائے بدلتا ہے۔ بلکہ اکثر اڑ جاتے ہیں۔ اور آج کل تو غلط بات تک پہ اڑ جانے کی عام عادت ہوگئی ہے، بلکہ غلط بات کو صحیح ثابت کرنے کی، مگر حضرت مولانا کا مزاج یہ بالکل نہیں تھا۔ اگر کسی پر اعتماد کیا ہے جس لائن میں بھی، تو اس کی بات مانی ہے، مولانا کے کاموں کے تنوع اور پھیلاؤ میں اس بات کا بڑا دخل تھا، کہ مولانا نے ہر لائن کے لئے لوگوں کا انتخاب کیا پھر ان پر اعتماد کیا۔ علمی لائن میں کچھ لوگوں پر عملی لائن میں، اسی طرح کچھ لوگوں پر مدرسے کی لائن میں کچھ لوگوں پر، کچھ لوگوں پر مسلم پرسنل لاء کی لائن میں جن پر اعتماد کرتے تھے ان کو پوری حمایت دیتے تھے۔ اس کا نتیجہ تھا کہ مولانا نے اتنے بہت سے اور متنوع کام کئے اور سب کاموں میں اللہ تعالیٰ نے خیر و برکت کا معاملہ فرمایا، غرضیکہ مولانا کی شخصیت کے یوں تو بہت سے قابل ذکر پہلو ہیں مگر راقم نے ان دو کے بارے میں کچھ معروضات پیش کیں، جو ہمیں کے نزدیک سب سے اہم تھے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مولانا کے مراتب بلند فرمائے اور اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے۔ نیز ان کے نقش قدم پر چلنے کی ہر ایک کو، بالخصوص ان کے وابستگان کو توفیق ارزانی کرے،

(مفتی صاحب)

(بقیہ) مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

حضرت کا اخلاص سوز دروں، للٰہیت زخم ہائے دل دردِ دل۔ صدق و وفاء، مضطرب و حساس دل امت کے ہر غم کو اپنا غم سمجھ لینا۔ اتباع سنت عشق رسول۔ اس کی روشنی لیں حضرت کی تحریروں اور خطابوں کا جائزہ لیجئے اور اس سے استفادہ کیجئے۔ اور ہوسکے تو اس گنہگار کو کبھی یاد کرلیجئے۔ آپ کی دعا بندۂ عاجز کے لئے زاد راہ ہوگی۔

(بقیہ) مولانا علی میاں اللہ میاں کو پیارے ہوگئے

فکر مسلم مجلس اور مجلس مشاورت سے ان کے تعلق اور تحریک "پیام انسانیت" کی تاسیس کا باعث تھی۔ ان کا خلوص مسلمانوں کے ساتھ مجلس مشاورت کے پلیٹ فارم پر خواص اور عوام کو جمع کرتا رہا۔ اور ان کی دردمندی والی باتوں کا ملک کے فرقہ وارانہ ماحول پر خوش گوار اثر پڑا۔ جب مسلم مجلس الکشن کے خارزار میں جانے لگی تو علی میاں نے اسے اس جنجال سے الگ رہنے کی صلاح دی۔ مگر جب اہل سیاست نے مجلس کو اپنا آلۂ کار بنانے کی کوشش کی تو مولانا اس سے الگ ہوکر "پیام انسانیت" کی ترویج اور تبلیغ میں لگ گئے۔ مسلم پرسنل لاء بورڈ کا قیام ان کے ایماء پر ہوا، یہ ان کا ایک لافانی کارنامہ ہے۔ کہ شاہ بانو کے معاملہ سے مسلم پرسنل لاء میں حکومت کی مداخلت کا جو راستہ کھل گیا تھا اسے انھوں نے بند کرا دیا اور اس زمانے کے وزیر اعظم راجیو گاندھی کو اس بات کا قائل کردیا کہ مسلمانوں کا پرسنل لاء ان کے مذہب کا جزء ہے۔

علی میاں کے عملی سیاست سے الگ رہنے کے باوجود ارباب سیاست چاہے وہ جس جماعت سے تعلق رکھتے ہوں ان کے در پر حاضری دیتے رہے۔ اور ہر ایک کو انسانیت کا پیام سناتے رہے اور ہر ایک سے یہ شکوہ کرتے رہے کہ ملک لاوارث ہو رہا ہے اس کو واپس پٹری پر لانے کے لئے مولانا کہتے تھے کہ آزادی کی تحریک کے رہنماؤں نے اور آزادی کے بعد ہندوستان کے آئین نے جمہوریت، سیکولرزم اور عدم تشدد کے جو تین بنیادی اصول بیان کئے تھے، ان تینوں کی پابندی اور ملک کی خوشحالی، نیک نامی اور استحکام کے لئے ضروری بلکہ لازمی ہے۔

(بقیہ) مولانا مختار احمد ندوی

روحانی عظمت دوبالا ہوئی۔ اور لوگ ہندوستان کو مولانا علی میاں صاحبؒ کے نام سے پہچاننے لگے۔ اور بلاشبہ مولانا ملک کی عزت و آبرو کی علامت بن گئے تھے، مولانا کی عبقری شخصیت نے خود علم دین اور علماء دین کی عظمت کا سکہ دلوں پر قائم کردیا۔ اور عوام و خواص میں علم دین کی اہمیت اور مقبولیت اور احادیث کا نقش دلوں پر چھوڑ دیا۔ ضرورت ہے کہ مولانا کی زندگی کے تمام گوشوں کو اجاگر کیا جائے۔ اور ان کے علمی اور عملی نقوش کو تابندہ اور پائندہ بنایا جائے، اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور ہمیں ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین۔

علی میاںؒ جو اللہ میاں کو پیارے ہوگئے

عشرت علی صدیقی

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ایسی موت پائی جس کی تمنا سب کو ہوتی ہے رمضان کی ۲۲ تاریخ کو جمعہ کے دن نماز کے لئے تیار ہوکر وہ کلام اللہ کی تلاوت کر رہے تھے جب اللہ میاں نے انھیں اپنے وہاں بلالیا۔ انھوں نے زندگی بھی ایسی پائی جس کی تمنا سب کو ہوتی ہے آخر وقت تک اور بیماری، آزاری اور معذوری کے دنوں ...... میں بھی پابند شریعت رہے، زندگی بھر دین کی خدمت کرتے رہے، اور دنیا کو انسانیت کا پیام سناتے اور انسانوں کو انسانیت کی طرف بلاتے رہے انھیں دنیا مفکر اسلام کہتی اور مانتی ہے۔ بلاشبہ اسلام کو ان کی فکر اور عمل میں کلیدی حیثیت حاصل تھی۔ اور انھیں اپنے عہد کی سب سے بڑی اسلامی شخصیت کئی بار قرار دیا گیا حکمرانوں کے نام سے منسوب اس اعزاز کے لئے ان کا انتخاب حکومتوں نے نہیں بلکہ جید عالموں نے کیا، اور اس اعزاز کو بھی انھوں نے قدرے تکلف سے اور بعض اوقات بادل نخواستہ قبول کیا۔ ان کی رہائش فقیرانہ تھی۔ مگر علم و فکر کی دنیا میں انھیں شاہانہ بلکہ شہنشاہانہ حیثیت حاصل تھی۔ وہ مفکر اسلام ہونے کے علاوہ مفسر قرآن بھی تھے محدث بھی تھے، کئی سو ایسی کتابوں کے مصنف بھی جو کئی زبانوں میں بار بار شائع اور عجمی و عربی درس گاہوں کی ابتدائی جماعتوں سے لے کر اعلیٰ ترین جماعتوں تک کے نصاب میں شامل ہوئیں۔ ان کی بہت سی کتابیں پہلے عربی میں لکھی گئیں۔ اس کے بعد دوسری زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ ان کی عربی تحریروں نے عربی ادب کے صف اول کے عالموں اور ناقدوں سے خراج تحسین وصول کیا۔

ان کی کئی کتابیں عرب ملکوں میں ٹسٹ بک بنیں، مختلف اسلامی علوم میں انھیں مہارت حاصل تھی۔ آج کے بہت سے بڑے بڑے عالم کل ان کے شاگرد تھے، وہ اپنے کو تاریخ کا طالب علم کہتے تھے۔ اور علم کے دوسرے میدانوں کی طرح اس میدان میں بھی انھوں نے اپنا سکہ جمالیا۔ یہ سکہ انھیں ترکہ میں ملا تھا۔ ان کے والد مولانا حکیم سید عبدالحیؒ نے ۹ جلدوں پر مشتمل اپنی عربی کتاب "نزہۃ الخواطر" میں ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے لے کر اپنے زمانے تک ہندوستان کے ہر شعبۂ حیات سے تعلق رکھنے والے قابل ذکر مسلمانوں کا ذمہ دارانہ تبصرہ کے ساتھ کیا تھا۔ یہ کتاب آج تک ایک مآخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ علی میاں کی پانچ جلدوں پر مشتمل تصنیف "تاریخ دعوت و عزیمت" اور چار جلدوں پر مشتمل کتاب "پرانے چراغ" دو جلدوں کی "سیرت سید احمد شہیدؒ"، "سوانح شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ"، "تذکرہ شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ"، "سوانح مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ" تذکرہ نویسی اور سوانح نگاری کے اعلیٰ ترین نمونوں کے علاوہ اردو کے نثری ادب میں روشن ستاروں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ادب پاروں کی اس کہکشاں میں "نبی رحمت" اور "المرتضیٰ" کو سورج اور چاند سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ اور "کاروان مدینہ" میں تاجدار مدینہ سے عشق و عقیدت کے اظہار کا جو اسلوب علی میاں نے اختیار کیا ہے وہ چودہ سو برس سے بار بار اور لگاتار نئے انداز سے بیان کی جانے والی اس داستان کو سحر آگیں بنا دیتا ہے۔

علی میاں نے "کاروان زندگی" کے عنوان سے اپنی سوانح حیات بھی سات جلدوں میں لکھی، ساتویں جلد کا آخری حصہ ان دنوں لکھا گیا اور شائع ہوا جب مولانا پر فالج کا حملہ ہو چکا تھا۔ ان دنوں میں تقریباً روزانہ حاضر خدمت ہوتا رہتا تھا اور مولانا برابر کتاب کی طباعت و اشاعت کے سلسلہ میں ہونے والی پیش رفت کا ذکر کرتے رہتے تھے، مسلمانوں کے حوالے سے مولانا نے تاریخ کا جو مطالعہ اور تجزیہ کیا اس کا نچوڑ انھوں نے اپنی کتاب "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" میں پیش کر دیا ہے۔ یہ کتاب انھوں نے پہلے عربی میں لکھی تھی بعد میں اس کا ترجمہ دنیا کی بہت سی دوسری زبانوں میں اور کئی کئی ایڈیشنوں میں شائع ہوا۔ ان کی تصنیفی زندگی کے ابتدائی دور کی اس کتاب نے دنیا بھر میں زبردست مقبولیت حاصل کی۔ جس اثر کا ذکر اس کتاب میں ہے۔ اس کی تفصیل "کاروان زندگی" میں بیان کی گئی ہے۔ ہندوستان اور عالم اسلام میں بیسویں صدی کے دوران جو کچھ ہوا اور اس صدی کے واقعات سے مسلمانوں کا جو تعلق رہا اس کے مطالعہ اور تجزیہ میں مولانا کے کاروان زندگی سے جتنی مدد مل سکتی ہے اتنی کسی دوسری کتاب سے نہیں مل سکتی۔ مولانا کا خاص شغل لکھنا پڑھنا رہا، مگر ایک دردمند انسان اور وطن دوست مسلمان کی حیثیت سے انھیں سیاسی اور سماجی معاملات سے بھی دلچسپی رہی۔ عملی سیاست اور الکشنی خلفشار سے وہ ہمیشہ الگ رہے لیکن مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور وطن کی خوشحالی اور نیک نامی کے تقاضوں کی طرف اہل وطن کو برابر توجہ دلاتے رہے ان کی یہی

(باقی صـ ۱۸۳ پر)

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

مولانا مختار احمد ندوی

افسوس بیسویں صدی عیسوی کے اختتام کے آخری دن حضرت العلامہ السید ابوالحسن علی الندوی اس دار فانی سے دار بقاء کی طرف رحلت فرما گئے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ فللہ ما اخذ ولہ ما اعطیٰ وکل عندہ لأجل مسمیٰ نحن کلنا بفراقک لمحزونون یا ابا الحسن غفر اللہ لہ وتغمدہ برحمتہ۔ آمین

اہل اسلام کے لئے یہ سال بڑا غمناک گذرا خصوصًا تین ایسی تاریخ ساز ہستیاں دنیا سے چلی گئیں جنھیں دنیا ہمیشہ یاد کرتی رہے گی اور ان کی علمی و دینی اور دعوتی خدمات ان کی یاد کو زندہ رکھیں گی۔ ان میں سرفہرست فخر العلماء و تاج العلم والدین العلامہ الشیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز رحمۃ اللہ کی ذات ستودہ صفات تھی جو اس صدی کے متفق علیہ عالم ربانی تھے، جن کے عقیدے، ایمان و عمل اور اخلاق کریمانہ اور خلق خدا پر ان کی شفقت واحسانات کا ان کی زندگی میں بظاہر کوئی ثانی نہیں تھا جن کی توصیات اور تصدیقی کلمات کی برکت سے ساری دنیا میں ہزاروں مساجد و مدارس اور مراکز دعوت قائم ہوئے ہیں اور لاکھوں گھرانے دینی و دنیاوی سعادت سے فیضیاب ہوئے ہیں فجزاہ اللہ خیر الجزاء جن کے انتقال سے دنیا سونی ہوگئی۔ اللہ ان کی نیکیاں قبول فرمائے۔ آمین۔

دوسری عظیم نادرۂ روزگار ہستی امیر المؤمنین فی الحدیث، خادم السنۃ النبویۃ علامہ شیخ محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ کی تھی جن کی وفات سے خدمت حدیث اور احیاء السنۃ النبویہ کا ایک دور ختم ہوگیا جن کی زندگی میں علم حدیث کا ان سے بڑا کوئی عالم نہیں تھا۔

تیسری عظیم تاریخ ساز اور دعوت وعزیمت کے امام مفکر اسلام، توحید وسنت اور منہج سلف صالح کے علمبردار داعی الی اللہ، عارف باللہ العلامہ السید ابوالحسن علی الندوی رحمۃ اللہ رحمۃ واسعۃ کی مبارک ہستی تھی، جو بلاشبہ دور حاضر میں اسلام کے داعی، امت اسلامیہ کے مصلح، کتاب وسنت کے معلم اور مزکی تھے، وہ صحیح معنوں میں توحید خالص کے علمبردار اور کتاب وسنت کے حامی اور ناصر تھے، وہ ایک موحد خاندان کے چشم وچراغ تھے۔ ان میں ان کے استاذ علامہ تقی الدین الہلالی المراکشی کی تعلیم وتربیت اور توحید وسنت کی غیرت اور حمیت پائی جاتی تھی مشہور عرب ادیب علامہ خلیل عرب اور علامہ محمد بن یوسف السورتی رحمہ اللہ کی علمی، ادبی اور تربیتی روح ان میں پائی جاتی تھی، انہیں مشہور ومعروف عالم علامہ نواب صدیق حسن خاں صاحب والی بھوپال کا علمی ورثہ ملا تھا، اور ان سے تعلق خاص کی سعادت حاصل تھی۔

مولانا مرحوم کی سب سے بڑی امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنے عقیدے اور عمل اور دعوت الی اللہ کے منصب عالی پر فائز ہونے کے اعتبار سے پوری ملت اسلامیہ کے نمائندہ تصور کئے جاتے تھے، وہ عالم اسلام کے ممتاز عالم اور سب کے لئے قابل قبول تھے، اللہ نے انہیں قبولیت عامہ عطا فرمائی تھی عوام وخواص کے دلوں میں ان کی محبت پائی جاتی تھی جو ان کے عالم صادق ہونے کی دلیل تھی، ان میں اصلاح دین کی بڑی تڑپ پائی جاتی تھی، انکی کتاب "ردۃ ولا ابا بکر لھا" اس کی زندہ جاوید شہادت ہے۔ بلاشبہ ان کے اندر شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ کی انقلابی واصلاحی اور جہادی روح پائی جاتی تھی، وہ ان کے علم و عقیدے کے صحیح معنوں میں ترجمان تھے۔

حضرت مولاناؒ تحریک شہیدین کے سچے نمونہ اور داعی تھے۔ ان کے اندر حضرت سید احمد شہیدؒ بریلوی رحمہ اللہ اور مولانا اسمٰعیل الشہید دہلوی رحمہ اللہ کی روح جہاد تڑپ رہی تھی وہ ہندوستان میں تحریک شہیدین کے سچے علمبردار اور سپاہی تھے جس کے لئے انھوں نے زندگی بھر قلمی اور لسانی جہاد جاری رکھا تھا۔

مولانا مرحوم کی ایک بڑی علمی اور تجدیدی خدمت یہ بھی ہے کہ انھوں نے ملک کے دو عظیم تعلیمی اداروں مسلم یونیورسٹی علی گڈھ اور دارالعلوم دیوبند کے درمیان مقصدی اور تعلیمی فاصلوں کو بہت حد تک قریب کیا جس کی وجہ سے اول الذکر میں دینی روح اور مؤخر الذکر میں فکری وسعت پیدا ہوئی اور بلاشبہ یہ مولانا مرحوم کا بہت بڑا اصلاحی اور علمی کارنامہ ہے۔

اسی طرح دارالعلوم ندوۃ العلماء کی تحریک میں مولانا کی حکمت عملی سے حقیقی معنویت اور مقصدیت پیدا ہوئی۔ بلاشبہ آپ نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں علم وادب کا صحیح ذوق زندہ اور تابندہ رکھنے کے ساتھ ساتھ اسے تزکیۂ نفس اور اصلاح قلب کا ایک عالمی تربیتی اور دعوتی مرکز بنادیا۔ جس سے سینکڑوں باصلاحیت علماء اور اسلام کے داعی اور مبلغ ساری دنیا میں دعوت الی اللہ کے منصب پر فائز ہوگئے۔

حضرت مولانا ہی کی یہ شخصیت تھی کہ انھوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کو ہندوستان کی علمی اور تہذیبی عظمت کا امتیازی نشان بنادیا، جس پر پورا ملک فخر کر رہا ہے۔

مولانا جہاں اپنی علمی اور دعوتی خدمات کی بناء پر ساری دنیا میں ممتاز تھے وہیں آپ کی ذات کریمانہ کی برکت سے خود ہندوستان کی علمی اور

(باقی ص ۱۹۳ پر)

روشن چراغ

مولانا عزیز الحسن صدیقی (غازیپوری)

۲۲ رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ کو جمعہ کی نماز سے ذرا پہلے رائے بریلی کے چھوٹے سے گاؤں تکیہ کلاں میں کیسا سانحہ پیش آیا جس نے ساری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔ ہندوستان ہو یا پاکستان بنگلہ دیش ہو یا ایران، دنیائے عرب ہو یا برّاعظم افریقہ، یورپ ہو یا امریکہ ہر جگہ اس درد کی کسک محسوس کی گئی۔ سبھی کی آنکھیں نم ہوئیں اور سبھی کے دل روئے، لاتعداد تعزیتی جلسے اور سیمینار ہوئے، مضامین لکھے گئے۔ کتابیں شائع ہوئیں، اخبارات و رسائل نے خاص نمبر نکالے اور یقیناً آئندہ بھی یہ سب کچھ ہوتا رہے گا مگر جو حادثہ پیش آچکا اس کو لوٹایا نہیں جا سکتا۔ جو نقصان ہو چکا اس کی تلافی ممکن نہیں ملت اسلامیہ کو جس کا غم اٹھانا تھا سو اس نے اٹھایا، قافلۂ ملت کو بے سہارا ہونا تھا سو ہوا، آنے والے زمانے میں مصائب و آلام کی گھنگھور گھٹاؤں اور مہمات و مسائل کے ہجوم میں ہماری نگاہیں اس کو تلاش کیا کریں گی مگر وہ اب ہمیں کبھی نہیں ملے گا ہاں اس کے قدم کے نشانات ہمیں ضرور ملیں گے جو یقیناً ہمارے لئے نشان راہ ثابت ہوں گے۔ جن راہوں سے وہ گذر گیا وہ ہمیں منزل کا پتہ دیتی رہیں گی اور عمل کی شاہراہ پر وہ جتنے چراغ روشن کر گیا ان سے ہمیں ہمیشہ روشنی ملتی رہے گی۔

قارئین محسوس کر سکتے ہیں کہ ہم کس عظیم ہستی کا ذکر کرنے جا رہے ہیں اور کس کی یاد میں آنسو بہانے پر مجبور ہوئے ہیں۔ ہم جس محسن قائد کی یاد تازہ کر رہے ہیں، وہ بلاشبہ موجودہ زمانے میں ملت بیضا کا پاسبان تھا اور اس نے انتہائی پُرآشوب زمانے میں اس خلا کو پُر کیا تھا، جو شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ کی رحلت سے پیدا ہوا تھا۔

یہ عجیب بات ہے کہ غلام ہندوستان تو بلند پایہ شخصیتوں سے بھرا پڑا تھا جب کہ آزاد ہندوستان کی کوکھ خالی نظر آئی۔ آسمان قیادت و سیادت پر جو چند ستارے جھلملاتے نظر آرہے تھے، وہ بھی ایک ایک کرکے ٹوٹ کر گر پڑے ایسے میں ہمیں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی ایک ذات نظر آتی ہے جو اپنی خداداد صلاحیتوں سے کام لے کر ملک و ملت کو سہارا دیتی ہے۔ اگر ایک طرف ہندوستان میں اس کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے تو دوسری طرف ہندوستان سے باہر بھی اس کے فضل و کمال کا ڈنکا بجتا نظر آتا ہے۔ دنیائے عرب میں اس کے نام کا گویا کہ سکہ چلتا ہے۔ عربوں کو وہ للکارتا ہے، ٹوکتا ہے اور ان کی کوتاہیوں پر گرفت کرتا ہے مگر عرب اس پر جان چھڑکتے ہیں۔

تقسیم ملک کے بعد ہمارے اکابر نے بجا طور پر مسلمانوں کو جذباتی سیاست سے دور رہنے اور تعمیری جدوجہد میں شمولیت کی تلقین کی تھی۔ مولانا آزاد نے ۱۹۴۷ء میں مسلمانوں کو علاحدہ سیاسی تنظیم قائم کرنے سے روکا تو مولانا علی میاں نے بھی مسلم مجلس مشاورت کو الیکشن کے خارزار میں قدم رکھنے سے روکا تھا۔ وہ پارلیمنٹری پالیٹکس سے دور رہے مگر پالیٹکس سے دور نہیں رہے۔ ان کی سب سے بڑی سیاست یہ تھی کہ لوگ ان کو غیر سیاسی سمجھتے رہے، ملک و ملت کا کون سا ایسا مسئلہ اور کون سا موڑ تھا جب وہ قیادت کے لئے سامنے نہیں آئے، سیاسی رہنمائی اور قیادت کے لئے سیاسی جماعتوں کا دم چھلا بننا ضروری نہیں ہے آدمی اگر باوزن اور باوقار ہو، بے غرض اور مخلص ہو اور صائب الرائے بھی ہو اور بروقت صحیح فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو تو اس کو حق پہونچتا ہے کہ آڑے وقتوں میں قوم و ملک کی رہنمائی کرے۔ اس کے لئے کسی سرٹیفکیٹ اور کسی سیاسی جماعت کی سند کی ضرورت نہیں ہے۔

گاندھی جی کی مثال سامنے ہے، اس بوڑھے ہندوستانی لیڈر نے اپنے مضبوط کیرکٹر اور بے لچک فیصلہ کی بنیاد پر بڑی بڑی حکومتوں کو جھکا لیا۔

مولانا علی میاںؒ نے موجودہ دور کے سیاسی لیڈروں کی طرح کبھی سیاسی کرتب نہیں دکھایا مگر قومی و ملکی مسائل میں برابر دلچسپی لیتے رہے اور اپنی رائے کا برملا اظہار بھی کرتے رہے۔ ان کی کتاب زندگی کے اوراق پلٹ کر دیکھئے تو اندازہ ہوگا کہ انھوں نے ہر موڑ پر قوم و وطن کو سہارا دیا۔

ویٹیکن سٹی میں بیٹھا ہوا اسقف اعظم کس طرح پوری دنیا کے معاملات پر رائے زنی کرتا ہے اور کیسے کیسے فیصلے صادر کرتا ہے، وہ کس پارٹی کا ممبر ہے۔ ہمارا ہندوستان عجیب ملک ہے اور ہندوستانی قوم عجیب تر ہے اور مسلم قوم تو ایک عجوبہ سے کم نہیں۔ اس نے جانے

کیسے کیسے معیار بنا رکھے ہیں۔ وہ خود لیڈر بناتی ہے اور کچھ دن اس سے کام لے کر اس کو نکما قرار دے دیتی ہے، گویا کہ لیڈر بازار سے خریدی ہوئی کوئی جنس ہو۔ جب تک پسند آئی ساتھ رکھا اور جہاں اس کی کوئی بات ناگوار خاطر ہوئی اس کو اٹھا کر پھینک دیا۔

مولانا علی میاںؒ نے اس ملک میں قیادت و رہنمائی کا جو طریقہ اختیار کیا وہ یہاں کے حالات کے عین مطابق تھا۔ راقم نے بہت کچھ کھونے اور سیکھنے کے بعد اسی طریقہ کو پسند کیا ہے۔

ملکی سیاست اور ملی مسائل میں ہمارا کیا رول ہونا چاہئے اس کے بارے میں مولانا اپنی رائے یوں ظاہر کرتے ہیں۔

"ایسے دور میں جب حکومتوں کا دائرہ اتنا وسیع اور زندگی پر حاوی ہے اور ایسے ملک میں جہاں اپنے حق رائے دہندگی، سیاسی اثر و نفوذ اور دانشمندی کے سوا کوئی ذریعہ اپنے تحفظ یا کسی خطرہ کو روکنے کا نہیں ہو سکتا، ایک ایسی ملت ملک کی سیاست اور جمہوری طریقہ سے اثر انداز ہونے سے کیسے کنارہ کشی اختیار کر سکتی ہے جس کے دین کا دائرہ اور تصور پوری زندگی پر محیط ہے وہ مذہب" بندہ اور خدا کے درمیان کا معاملہ ہے "کے مسیحی تصور پر یقین نہیں رکھتی۔ اس کا مذہب دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں زندگی پر حاوی اور محیط ہونے کی وجہ سے زیادہ ذکی الحس اور جلد متاثر ہونے والا ہے۔ اس ملت کے لئے جو لوگ سیاست کو شجر ممنوعہ نہیں بلکہ "الشجرة الملعونة في القرآن" کی تلقین کرتے ہیں اور اس کو ذہنی اور عملی عزلت کا مشورہ دیتے ہیں یا اس کو اس کی تلقین کرتے ہیں کہ پارسیوں اور مارواڑیوں کی طرح محض رفاہی اور خیراتی ادارے قائم کرنے یا اپنی اقتصادی اور مالی پوزیشن کو مضبوط کرنے یا تعلیم کا معیار بلند کرنے کی طرف کلیتاً متوجہ رہیں وہ حقیقت میں مسلمانوں کو اجتماعی اور ملی خودکشی کا مشورہ دیتے ہیں کہ اس طرح مسلمان نہ اپنے ملی تشخصات کی حفاظت کر سکیں گے نہ اپنے فرائض و شعائر دینی اور عائلی قوانین کے ساتھ باقی رہ سکیں گے اور قیادت و دعوت کا مسئلہ تو الگ رہا (جو اس وقت ملت کا حقیقی منصب ہے) اس ملک میں آزادانہ باعزت طریقہ پر زندگی بھی نہیں گذار سکیں گے۔"

قارئین محسوس کر سکتے ہیں کہ مولانا کس قدر حکیمانہ اور بلیغ انداز میں مسلمانوں کو ملکی سیاست کی طرف لا رہے ہیں اور آزاد ہندوستان میں ان کو اپنا واجبی رول ادا کرنے پر ابھار رہے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان اس ملک میں قیادت کا منصب سنبھالیں نہ کہ دوسروں کی خیمہ برداری کا ٹھیکہ لے لیں۔

کیا آپ اس فرق کو محسوس نہیں کرتے کہ رہنمایان عظام وزراء کی کوٹھیوں کا طواف کیا کرتے ہیں جب کہ عام سیاسی لیڈروں اور وزراء کی بات تو الگ رہی وزیر اعظم بھی خود چل کر مولانا کی چوکھٹ پر حاضری دینے آیا کرتا تھا ایسے وقت پر مولانا کی قیام گاہ دیکھنے کے لائق ہوتی تھی، قیام گاہ کے اندر اور باہر عام دنوں سے بھی زیادہ سکون ہوا کرتا تھا، کسی قسم کی بھاگ دوڑ یا چہل پہل دیکھنے میں نہیں آتی تھی۔ ہر شخص اپنے کام میں مصروف نظر آتا تھا۔

راقم کو اس وقت بے اختیار مولانا آزاد کا اسی طرز کا ایک واقعہ یاد آ رہا ہے، ہمارے خاندان کے ایک بزرگ مولوی عبدالوحید صاحب جو کلکتہ میں تجارت کرتے تھے، مولانا آزاد سے ملاقات کے متمنی رہا کرتے تھے، کئی بار وہ مولانا کی کوٹھی (ذاتی نہیں بلکہ کرایہ کی) تک گئے مگر سوائے مایوسی کے کچھ ہاتھ نہیں آیا، ایک دن مولانا کے سکریٹری (جن سے وہ رابطہ بنائے ہوئے تھے) نے کہا کہ آج وائسرائے آ رہا ہے، اس سے ملنے کے لئے مولانا اپنے کمرے سے نکل کر ملاقاتی کمرے میں جائیں گے، اس وقت یا وائسرائے کے رخصت ہونے کے بعد ملاقات ہو جائے گی۔ ان کا بیان ہے کہ میں خاموشی کے ساتھ بیٹھا ہوا سارے مناظر دیکھتا رہا۔ میں نے دیکھا کہ کوٹھی پر سکون و سکوت کی چادر تنی ہوئی ہے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ تھوڑی دیر میں ایک گاڑی اندر داخل ہوتی ہے اور وائسرائے ملاقاتی کمرے میں جا کر بیٹھ جاتا ہے پھر مولانا اپنے کمرے سے نکلتے ہیں اور اندر جا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ وائسرائے لوٹ جاتا ہے اور مولانا اپنے کمرے کا رخ کرتے ہیں۔ ٹھیک یہی حال مولانا علی میاں کا تھا۔

آیئے اب دیکھیں کہ مولانا آنے والوں سے کہتے کیا تھے، مولانا کہا کرتے تھے کہ ملک تباہی کے کگار پر کھڑا ہے، انسانیت دم توڑ رہی ہے، ملک کو بچانے کی فکر کیجئے۔ ہم سب ایک ایسی کشتی پر سوار ہیں جس میں سوراخ ہی سوراخ ہیں، اگر ان سوراخوں کو بند نہ کیا گیا تو کشتی ڈوب کر رہے گی اور ہم سب ڈوبیں گے۔ مولانا یاد دلاتے ... کہ آئین ہند میں وطن کی ترقی اور خوشحالی اور نیک نامی کے جو تین اصول جمہوریت، سیکولرزم اور عدم تشدد کے عنوان سے شامل کئے گئے ہیں، ان کی پابندی بہت ضروری ہے، اگر ان کو نظر انداز کیا گیا تو ملک کی خیر نہیں۔

دیکھ لیجئے آج انھیں بنیادوں کو ڈھایا جارہا ہے یا نہیں۔ بہت سے خیالی پلاؤ پکانے والے مولانا کی ان باتوں پر ناک بھوں چڑھاتے بلکہ ان پر "نیشنلسٹ مولانا" کی پھبتیاں بھی کستے مگر مولانا ان باتوں کا ذرا اثر نہیں لیتے تھے اور وہ اپنے مرشد حضرت رائے پوریؒ کی طرح سچی بات کہے بغیر نہیں رہتے تھے۔ وہ دیانتداری کے ساتھ یہ رائے رکھتے تھے کہ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں غیر مسلموں کی اکثریت ہے اور مسلمان تقسیم وطن کے نتیجہ میں زبردست خسارے سے دوچار ہیں اور اب نئے سرے سے اپنے آشیانے کے تنکے جمع کر رہے ہیں، سیکولر ڈھانچہ ہی ان کے لئے ڈھال کا کام دے سکتا ہے۔ حالات و تجربات نے تصدیق کردی کہ مولانا نے جو راہ متعین کی وہی صحیح تھی۔

۱۹۴۷ء کے بعد تو وہ سراپا درد و اضطراب بن گئے تھے اور حضرت مدنیؒ کی طرح خانقاہ بردوش بن کر ملک کی وسعتوں میں مارے مارے پھرے، کبھی پیام انسانیت کا پرچم ہاتھوں میں لئے ہوئے کبھی کاروان دعوت و عزیمت کی قیادت کا منصب سنبھالے ہوئے، کبھی کسی اجتماع میں صدائے حق بلند کرتے ہوئے دیکھے جاتے رہے۔

یہی نہیں کہ ان کی تگ و تاز کا میدان صرف وطن عزیز ہی رہا ہو بلکہ ہندوستان کے باہر بھی ان کے دورے ہوتے رہے۔ وہ جہاں گئے ہاتھوں ہاتھ لئے گئے۔ اگر ہندوستان کے عوام کے وہ محبوب رہنما تھے تو عالم اسلام کے بھی قائد تھے، بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کے لاکھوں غیر مسلم اور انکا دانشور اور تعلیم یافتہ طبقہ مولانا کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔

۱۹۶۴ء میں جب ہندوستان کی صنعتی بٹی (جمشید پور سے راوڑ کیلا تک) فرقہ واریت کی آگ میں جھلسنے لگی اور اس کے شعلے دور دور تک پہونچنے لگے تو مولانا بے چین ہوکر اٹھ کھڑے ہوئے۔ آپ نے اس پرآشوب زمانے میں جو کچھ بن پڑا کیا اور جو کچھ کیا اخلاص کے ساتھ کیا۔ اس موقع پر آپ نے ندوۃ العلماء میں ایک کل ہند مشاورتی اجتماع طلب کیا جس کی صدارت کا سہرا مشہور قومی رہنما ڈاکٹر سید محمود کے سر باندھا گیا اس کے بعد آپ محبت و شرافت اور امن و آشتی کا سندیسہ لے کر نکل پڑے اور ملک کے طول و عرض میں گئے۔ اس طویل سفر میں بہت سے قومی رہنما جس میں مسلم و غیر مسلم دونوں شامل تھے۔

مولانا نے اپنی تحریروں میں بار بار ذکر کیا ہے کہ تحریک خلافت کے بعد یہ دوسری تحریک تھی جس نے پورے ملک کو متأثر کیا۔ فرقہ وارانہ یگانگت اور فساد کی ٹنڈنسی کو ختم کرنے میں اس تحریک کا بڑا حصہ رہا ہے۔

مولانا نے اسی پر بس نہیں کیا۔ آپ نے گاندھیائی سادھو اور بھودان تحریک کے بانی اچاریہ ونوبا بھاوے اور ہندوؤں کے دھرم گروؤں سے بھی رابطہ قائم کیا اور ان سے کہا کہ فرقہ پرستوں اور وطن دشمنوں نے ہندو دھرم کی روایات اور اصولوں کو بدنام کردیا ہے۔ اہنسا اور مانوتا کے وہ اصول جن کی ہندو دھرم میں اہمیت ہے پس پشت ڈال دیئے گئے ہیں اس لئے آپ کا فرض ہے کہ اپنے دھرم کو رسوائی سے بچانے کی فکر کریں۔

پیام انسانیت فورم جس کے مولانا بانی تھے ملک کے اندر ایک جانا پہچانا پلیٹ فارم رہا ہے جو آزادی کے بعد مولانا نے قائم کیا تھا۔ فرقہ واریت کی بھیانک آگ کو ٹھنڈا کرنے میں اس فورم نے وہی رول ادا کیا جو زخم پر مرہم کرتا ہے۔

راقم کو یاد ہے کہ ۱۹۵۴ء میں اس کے والد مرحوم مولانا ابوالحسن صدیقی کو ان کے ہم نام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اپنے ایک خط میں تحریر فرمایا تھا کہ میں ایک جماعت لے کر غازی پور آرہا ہوں۔ میرے والد مرحوم نے شہر کی جامع مسجد میں جماعت کے قیام کا نظم کیا، کئی دنوں تک حضرت مولانا علی میاں یہاں مقیم رہے اور اس قیام کے دوران ایک شب ٹاؤن ہال میں پیام انسانیت کے جلسہ میں بھی تقریر کی جس میں غیر مسلم بھی بڑی تعداد میں شریک تھے۔

یہ پنڈت گوبند بلبھ پنت کی چیف منسٹری کا زمانہ تھا، سی۔ آئی۔ ڈی والے اس زمانے میں مسلمانوں کی ہر نقل و حرکت پر نظر رکھا کرتے تھے۔ انھیں کبھی ریل کے انجن پر پاکستان کا جھنڈا نظر آتا تو کبھی سرراہ پاکستانی جاسوس مل جاتا، کبھی گاندھی چبوترے پر جھنڈا لہراتے وقت انھیں یہ محسوس ہونے لگتا کہ پڑوسی مدرسہ کے مولوی صاحب یہاں کیوں حاضر نہیں ہیں، ہوسکتا ہے وہ غیر ملکی جاسوس ہوں لہٰذا ان کی گرفتاری کی کارروائی شروع کردی جاتی غرضکہ "ہر موڑ پر چند آنکھیں نگراں ہر موڑ پہ اک لیسنس طلب" والی کیفیت رہا کرتی تھی۔

پولیس والوں نے جب دیکھا کہ جماعت کے لوگ محلہ محلہ گھوم رہے ہیں مسجدوں میں جاکر مسلمانوں سے ملتے اور باتیں کرتے ہیں تو انھیں شبہ ہوا کہ یہ لوگ کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور کر رہے ہوں گے، سی۔ آئی۔ ڈی والے جب والد صاحب کے پاس آئے اور شکوک و شبہات کا اظہار کیا تو انھوں نے بتایا کہ یہ لوگ فسادی اور دیش دروہی نہیں بلکہ انسانیت کے خادم اور امن کے داعی ہیں۔ پنت جی اس زمانے میں اسی طرح کی رپورٹوں کی بنیاد پر تبلیغی جماعت پر پابندی عائد کرنے جارہے تھے۔

دینی تعلیمی کونسل کا قیام بھی مولانا کے کارناموں میں ایک اہم کارنامہ ہے جس نے دینی تعلیم کے لئے فضا ہموار کی اور ہزاروں مدارس و مکاتب

کے قیام کا ذریعہ بنی اور بے دینی اور الحاد کے طوفان کو روکا جاسکا۔

آئیے اب دیکھیں کہ مولانا علی میاں نے آزادی کے بعد کیا رول ادا کیا۔ کیا اپنے پیشرو کے نقش قدم پر وہ سرے سے نہیں چلے۔ جو بھی یہ بات کہتا ہے۔ مولانا نے سو سے کچھ زیادہ ہی کتابیں لکھیں اور کتابوں سے زیادہ کتاب لکھنے والے اپنے پیچھے چھوڑ گئے۔ کیا علامہ شبلی کی سیرۃ النبی ان کے شاگرد نے پوری نہیں کی پھر تعجب کیوں ہے، کیا مولانا کا چھوڑا ہوا کام ان کے شاگرد پورا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ ہم تو یہ دیکھ رہے ہیں کہ مولانا کا سارا کام مولانا کے شاگرد پوری محنت، مہارت اور مستعدی کے ساتھ کر رہے ہیں کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولانا بنفس نفیس موجود ہیں۔ ابھی مہمان خانہ سے باہر تشریف لائیں گے، ابھی مسجد کے زینے طے کریں گے۔ ابھی گاڑی پر بیٹھ کر کہیں تشریف لے جائیں گے اور کسی اجتماع میں خطاب فرمائیں گے ؎

کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی
ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے

آزادی کے بعد کے پر آشوب زمانے میں اور اپنی زندگی کے آخری لمحات تک انھوں نے جو کچھ بھی کیا، اس میں مسلمانوں کی آبرومندانہ زندگی و بقا کا مسئلہ سب سے اہم اور سنگین مسئلہ تھا۔ مسلمان دم توڑتا رہتا، مدارس پر تیشے چلتے رہتے اور مولانا بیٹھے کتابیں تصنیف کرتے رہتے تو یہ بات ہرگز مناسب نہ ہوتی۔ انھوں نے وہی کیا جو ایسے نازک دور میں انھیں کرنا چاہئے تھا۔ اسلاف کی روایات کے وہی تنہا امین رہ گئے تھے اور حق یہ ہے کہ یہ حق انھوں نے ادا کر دیا۔

اب وقت آگیا ہے کہ ہم ان کی تدریسی و تصنیفی صلاحیتوں کا، ان کی فکر اور ان کے علوم کا تذکرہ کریں، علم حدیث میں، تفسیر قرآن میں تاریخ دانی و تاریخ نویسی میں ان کا کیا مقام تھا اس پر گفتگو اب کی جاسکتی ہے۔

دنیا جانتی ہے کہ آزادی کے بعد سے اب تک مسلمانوں کی جان مارنے کی کوششیں جاری تھیں مگر اب ان کا ایمان چھیننے کی تیاریاں ہیں۔ قانون شریعت پر حملے جاری ہیں، اسکولوں میں مسلمان بچوں کو پوجا پاٹ کرنے اور مشرکانہ گیت گانے پر مجبور کیا گیا۔ ایسے تمام موقعوں پر مولانا پوری پامردی و استقامت کے ساتھ سامنے آئے اور جبر و استبداد کا مقابلہ کیا۔ یاد کیجئے وہ زمانہ جب اتر پردیش کے اسکولوں میں بندے ماترم اور بھارت ماتا کی پوجا پر اصرار کیا جا رہا تھا، اس وقت مولانا نے کتنی ہمت و جرأت کا ثبوت دیا اور کہہ دیا کہ اگر اس پر اصرار ہے تو مسلمان اپنے بچوں کو اسکولوں سے اٹھالیں گے۔ اس کے بعد اتر پردیش ہی نہیں پورے ملک میں بھونچال سا آگیا۔ بہت سے مسلمانوں نے بھی مولانا پر تنقید کی، جبین اقتدار پر شکنیں بھی ابھریں مگر مولانا اپنے موقف پر قائم رہے۔ بالآخر حکومت کو جھکنا پڑا، ایک وزیر کو کسی وزارت سے دست بردار ہونا پڑا اور جب کشتی ملت کا بوڑھا ناخدا گرداب بلا سے ملت کی کشتی نکال لایا تو بہت سے پائینچے چڑھانے والے دم بخود نظر آئے۔

مولانا کے مہمان خانہ پر چھاپہ پڑا، ندوہ پر حملہ ہوا، طلبہ کو زد و کوب کیا گیا مگر مولانا کے قدم نہیں ڈگمگائے۔ مولانا کو حق گوئی و بیباکی، پامردی و استقلال اپنے آبا سے ورثہ میں ملا تھا اس لئے ہمیں ان کے فیصلوں اور اقدامات پر حیرت نہیں تھی بلکہ اطمینان تھا اس لئے کہ انھوں نے اپنے اسلاف کی روایات کو زندہ کیا تھا۔

مولانا کی کامیابیوں اور کامرانیوں کا جب ہم ذکر کرتے ہیں تو ہمیں بے اختیار مسلم مطلقہ بل یاد آتا ہے جو راجیو گاندھی کے عہد حکومت میں پارلیمنٹ میں پاس ہوا تھا، یہ مولانا کی اور مسلم پرسنل لا بورڈ کی جس کے وہ صدر تھے زبردست کامیابی تھی۔ مولانا خلا میں تکے چلانے اور بیانات کے گولے داغنے والے لیڈر نہیں بلکہ برمحل اقدام اور بروقت فیصلے کرنے والے قائد تھے۔

غازی پور سے مولانا کا رشتہ

جب بھی مولانا کے سامنے غازی پور اور اس کے قصبات کا ذکر آتا مولانا کھل اٹھتے۔ اس ضلع کے متعدد قصبات (بھتری، زمانیہ، بارا، یوسف پور) ایسے ہیں جہاں حضرت سید صاحب اپنے دونوں تاریخی قافلوں کے ساتھ تشریف لا چکے ہیں۔ بعض مقامات پر تو آپ نے کئی کئی دن قیام بھی کیا تھا۔ اس ضلع کے کئی مجاہدین نے معرکہ بالاکوٹ میں جام شہادت بھی نوش کیا ہے۔ زمانیہ سے جب سید صاحبؒ واپس جانے لگے تو مولانا سید جعفر علی نقوی بستوی کو اپنی نیابت کے لئے چھوڑ گئے تھے جنہوں نے کئی مہینوں تک زمانیہ میں قیام کرکے اصلاحی خدمات انجام دیں۔ سید صاحبؒ جب یوسف پور کی آبادی میں داخل ہو رہے تھے تو آپ کی زبان پر "بوئے دوست می آید" کے الفاظ جاری تھے ادھر نواب فرزند علی بھتروی جو بیماری کی حالت میں اپنی سسرال میں ٹھہرے ہوئے تھے گھر سے باہر نکل پڑے اور ایک مقام پر دونوں بزرگ بغل گیر ہوئے۔

نواب فرزند علی کا اصلی وطن قصبہ بھتری تھا۔ غازی پور شہر میں دریائے گنگا کے کنارے محلہ قاضی ٹولہ میں ان کا قیام تھا۔ ان کی بنوائی ہوئی مسجد اب بھی موجود ہے، یہیں نواب صاحب نے سید صاحب کا استقبال کیا تھا۔ نواب صاحب اپنے بیٹے امجد علی کو رائے بریلی لے کر گئے تھے اور

سید صاحب کی خدمت میں یہ کہتے ہوئے پیش
کیا کہ "میری تمنا ہے کہ راہ خدا میں اس کی گردن پر
چھری چلے"۔ نواب صاحب کی یہ تمنا پوری ہوئی
اور امجد علی نے بالاکوٹ میں جام شہادت نوش
کیا۔ اسی تعلق کی بنا پر جب حضرت مولانا علی میاں
۱۹۹۴ء میں غازی پور تشریف لائے تو نواب
صاحب کے وطن بھتری بھی تشریف لے گئے اور
ان کے خاندان کے لوگوں سے ملاقات کی۔
راقم کی درخواست پر ایک بار پھر ۱۹۹۵ء
میں مولانا غازی پور تشریف لائے تو شوکت
منزل (مدرسہ دینیہ غازی پور کا شعبہ عربی) کے
گیٹ پر گاڑی سے اترتے ہوئے فرمایا: "ایک بار
پھر تم نے بلوایا" ناچیز دیر تک ان الفاظ کی
حلاوت محسوس کرتا رہا۔

خانقاہ فصیحی میں

غازی پور کے مشہور بزرگ حضرت
مولانا محمد فصیح رحمۃ اللہ علیہ جن کا فیض غازی پور
اور اطراف غازی پور ہی نہیں بلکہ بہار و بنگال
تک پہونچا، ابتدا میں پہلوانی کیا کرتے تھے مگر
حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی نظر کیمیا اثر
نے ان کی کایا پلٹ دی تھی۔ مولانا شاہ امانت اللہ
فصیحی انھیں کے صاحبزادے تھے۔ تاریخ ندوہ میں
ان کا تذکرہ ان الفاظ میں ملتا ہے:

"دستور العمل ندوۃ العلماء کی منظوری کے
بعد پہلی مجلس انتظامی کے لائق ذکر ارکان
میں جہاں ملک کے دوسرے بڑے علماء
کا نام شامل ہے وہیں مولانا امانت اللہ
فصیحی غازی پوری کا بھی نام درج ہے۔"
(تاریخ ندوہ حصہ اول ص ۱۳۲)

یہی رشتے تھے جن کی بنا پر حضرت مولانا علی میاںؒ
کے والد مکرم حضرت مولانا حکیم سید عبدالحیؒ
خانقاہ فصیحی میں تشریف لایا کرتے تھے۔ ۱۹۵۴ء
میں جب مولانا علی میاںؒ غازی پور تشریف لائے
تو جامع مسجد سے پیدل روحی منڈی تشریف لے
گئے۔ محلہ روحی منڈی میں ہی خانقاہ فصیحی واقع تھی۔
مولانا شہر کے لئے اجنبی تھے اس لئے والد مرحوم
نے مجھے ساتھ کر دیا تھا۔ راستے میں ایک لطیفہ یہ
پیش آیا کہ حضرت مولانا نے پوچھا کہ اس شہر میں
موٹر کاریں نہیں چلتیں، خادم نے جواب دیا چلتی
تو ہیں، اس پر فرمایا "کیا رات میں چلتی ہیں؟" اور
میں جھینپ گیا، واقعہ یہ ہے کہ اس زمانے میں
غازی پور میں کاریں شاید ہی ایک دو رہی ہوں گی صرف
افسران کے پاس گاڑیاں ہوا کرتی تھیں۔ مولانا خانقاہ
میں داخل ہوئے تو سجادہ نشین مولانا ابو اللیث
فصیحی نے پرتپاک خیر مقدم کیا اور پُر تکلف ناشتہ
کرایا، جب ناشتہ سے فارغ ہوئے تو مولانا نے
مولانا ابو اللیث فصیحی کے صاحبزادے مولانا ابو الغوث
فصیحی کو مخاطب کرکے فرمایا" ابو الغوث میاں!
آپ اس خاندان کے چشم و چراغ ہیں جس نے
اصلاح امت کا فریضہ انجام دیا، آپ کو ان کی
جانشینی کا حق ادا کرنا ہے۔"
انھیں مولانا ابو الغوث نے اپنی خانقاہ میں
بیٹھ کر اس خادم سے کہا تھا" ہمارے سلسلہ میں اور
ہمارے خاندان میں جو کچھ ہے وہ سب حضرت سید
احمد شہیدؒ کا دیا ہوا ہے" اس خانقاہ میں حضرت
سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے کچھ تبرکات بھی تھے۔
بعد والوں نے تو ساری نسبتوں کو مٹا ڈالا۔

بس کا سفر

۱۹۵۴ء میں جو عظیم جماعت حضرت مولانا
علی میاں کی سربراہی میں غازی پور آئی تھی چند یوم
کے بعد روانہ ہونے لگی تو اس میں یہ نامہ سیاہ بھی
حضرت مولانا کے ہمراہ مئو تک گیا تھا۔ یہ سفر روڈویز
کی بس سے ہوا تھا۔ مولانا کسی آرام دہ سواری میں
جا سکتے تھے مگر انھوں نے جماعت کو چھوڑنا گوارا
نہ کیا اور سب کے ساتھ سفر کیا۔ اس زمانہ میں روڈویز
کا اسٹیشن روضہ میں تھا اور چند ہی بسیں مئو جاتی
تھیں۔ مئو میں ہمارا قیام جامعہ مفتاح العلوم میں تھا۔
اسی سفر میں حضرت مولانا مئو سے فتحپور
تال نرجا حضرت شاہ وصی اللہ فتحپوریؒ سے ملاقات
کے لئے یکہ سے تشریف لے گئے۔ شاید اسی سفر میں
حضرت فتحپوری نے حضرت مولانا علی میاں کے منہ
میں لقمے بنا کر ڈالے تھے۔
کیسا زمانہ تھا، کیسے لوگ تھے اور کیا کیا
کر گئے۔ محبت کا یہ طریقہ اور محبت کا یہ انداز کیا ہوا۔
اب تو فیتہ لے کر شخصیتوں کو ناپا جاتا ہے اور تنقید
کی خراد پر بڑے بڑوں کو چڑھا دیا جاتا ہے۔

عجیب اتفاق

حضرت مولانا علی میاں جب ۱۹۹۴ء میں
غازی پور تشریف لائے تو آپ کے وفد کے ارکان
کی تعداد سات تھی، اس کو اتفاق ہی کہیں گے کہ
ٹھیک سو سال پہلے ۱۸۹۴ء میں ندوہ کے قیام کے
بعد اس کے علماء کا جو وفد غازی پور آیا اس کے
شرکاء کی تعداد بھی سات ہی تھی۔
مولانا عبدالاحد شمشاد لکھنوی نے اس
وفد کی خیر مقدمی تقریب میں ایک نظم پڑھی تھی جس
کے آخری بند یہ تھے۔

اب ہم سے سنو تھوڑے ہمارے اوصاف
ہم میں سے ہر ایک میں ہیں سارے اوصاف
ہم مجمع اوصاف نہ ہوتے تو .... پھر
ہرگز نہ سمجھتے تمہارے اوصاف

ان اشعار میں بظاہر شاعر نے تعلی سے کام لیا ہے
مگر حقیقتاً اس زمانے میں غازی پور کا حال یہی تھا۔

ایثار کی عجیب مثال

اس موقع پر مولوی شریف احمد نے علما ندوہ کو اپنی کوٹھی میں آنے کی دعوت دی اور ادب سے فرمایا کہ یہ کوٹھی جو اپنے رہنے کے لئے بنوائی تھی ندوۃ العلماء کی نذر ہے اور میں آپ کو قبضہ دلانے کے لئے لایا ہوں پھر اس کا وقف نامہ لکھوا کر انھوں نے بھیج دیا اور کرایہ کے مکان میں جا رہے۔ (تاریخ ندوہ حصہ اول ص ۱۸۳)

تاریخ کی کڑیاں

ہم نے اوپر ندوے کے جن وفود کا ذکر کیا ہے، وہ محض زیب داستان کے لئے نہیں بلکہ اس ایک صدی کے درمیان اور اس سے قبل تاریخی روابط اور واقعات کے تسلسل کی جو کڑیاں نظر آتی ہیں ان کو نظر انداز کرنا مشکل ہے۔ ہم یہ بھی عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ دونوں وفود کے ارکان کی تعداد ہی مشترک نہ تھی بلکہ مقاصد بھی مشترک تھے۔ ۱۹۹۴ء والے وفد کے سربراہ حضرت مولانا علیہ الرحمہ خود تھے جن کا دل غازی پور کا نام سن کر باغ باغ ہو جایا کرتا تھا۔ ماضی کی تاریخ ان کی نگاہوں کے سامنے تھی، حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک کے سارے خد و خال ان کے سامنے تھے اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اس تحریک نے غازی پور کی سرزمین پر کیسا انقلاب برپا کیا تھا۔

حضرت والا کا یہ سفر غازی پور کے مشہور دینی درس گاہ مدرسہ دینیہ کے خدام کی درخواست پر ہوا تھا اور اس مدرسہ کی تاریخی حیثیت یہ ہے کہ اس کی بنیاد نواب شیخ فرزند علیؒ کی تاریخی مسجد واقع قاضی ٹولہ میں پڑی تھی۔ آپ کی آمد سے جہاں سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یاد تازہ ہوئی، ان کی تحریک کا تذکرہ و تعارف ہوا وہیں ندوۃ العلماء کے مقاصد کی اشاعت بھی ہوئی، لوگ اس سے ہم آہنگ ہوئے اور غازی پور سے اس کے روابط کا تجدید و احیاء بھی ہوا۔

قافلہ نوبہار کی آمد

حضرت سید احمد شہیدؒ جب ۱۲۳۶ھ میں سفر حج پر روانہ ہوئے تو آپ کا قافلہ ۱۱ر محرم الحرام ۱۲۳۷ھ کو زمانیہ ہوتے ہوئے غازی پور پہونچا اور یہاں ۱۳ر محرم الحرام تک قیام کیا۔ اس سفر میں نواب صاحب سے سید صاحبؒ کی ملاقات کا ذکر تاریخ کی کتابوں میں نہیں ملتا مگر دو سال دس ماہ بعد جب ۱۲۳۹ھ میں آپ اپنے سفر حج سے واپس ہوئے ہیں تو چھ دن غازی پور میں قیام فرمایا۔ حضرت مولانا علی میاں اپنی کتاب "سیرت سید احمد شہیدؒ" میں تحریر فرماتے ہیں:

> "عظیم آباد سے ڈھکیا اور دانا پور ہوتے ہوئے کشتیاں رائے بریلی کی طرف روانہ ہوئیں۔ بھوجپور، بلسار، چھپرا، ریل گنج اور بکسر ہوتے ہوئے محمد آباد پہونچے۔ محمد آباد سے آپ ایک طرف کو روانہ ہوئے، لوگوں نے عرض کیا، کہاں تشریف لے جاتے ہیں؟ فرمایا کہ محمد آباد کے پاس ایک گاؤں جہاں سے ایک دوست کی بو آتی ہے، ملاقات کے لئے جاتا ہوں۔ راستہ میں ایک جگہ سے ڈھولک کی آواز آتی تھی، آپ نے مولانا اسمٰعیل سے فرمایا کہ سورۂ یٰسین پڑھئے۔ آپ نے سورۃ پڑھنی شروع کی اور ڈھولک کی آواز موقوف ہوئی۔ لوگوں نے دریافت کیا تو فرمایا۔ مجھے ڈھولک کی آواز ناگوار ہوئی، غیبی اشارہ ہوا کہ اس کو روکنے کے لئے سورۂ یٰسین پڑھی جائے، چنانچہ اس کی برکت سے یہ آواز بند ہو گئی۔
>
> آپ یوسف پور پہونچے، شیخ فرزند علی غازی پوری اس موضع میں بیمار تھے، وہ ناطاقتی کی وجہ سے خود تشریف نہ لاسکے انھوں نے اپنے لڑکوں کو استقبال کے لئے بھیجا تھا، آپ ان کے ساتھ شیخ صاحب کے پاس تشریف لے گئے۔ شیخ صاحب نے بڑی تعظیم و تکریم اور بڑی خدمت گذاری اور مہمانداری کی اور اپنے تمام اہل و عیال کو بیعت کرایا۔ آپ نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا کہ تم نے ہمارے دوست کو دیکھا؟ دوسرے روز کشتیاں غازی پور پہونچیں، شیخ صاحب اپنے بچوں کے ہمراہ تھے، آپ نے شیخ صاحب کے ہمراہ چھ روز قیام فرمایا۔ شہر کے لوگ بکثرت بیعت ہوئے اور راہِ راست پر آئے۔ شہر کی جامع مسجد سے جو ویران ہو چکی تھی آباد ہوئی اور پانچ وقت پابندی کے ساتھ نماز ہونے لگی" (ج۱ ص۳۱۲)

یہی نسبت تھی جو حضرت مولانا کے دامن دل کو بار بار غازی پور کی طرف کھینچتی تھی اور وہ اپنی تحریروں اور تقریروں میں بڑے والہانہ انداز میں نواب صاحب اور غازی پور کا ذکر کیا کرتے تھے۔

نواب صاحب کے صاحبزادگان میں دو ایسے نامور ہوئے ہیں جن پر نواب صاحب کے خاندان ہی کو نہیں بلکہ پورے ضلع کو ناز ہے، ان میں سے ایک امجد علی شہید تھے جن کے

بارے میں حضرت مولانا علی میاںؒ اپنی کتاب "تحقیق و انصاف کی عدالت میں" تحریر فرماتے ہیں :-

"اسلام کے اس رکن (حج) کو زندہ کرنے کے لئے سید صاحبؒ کے اس جہاد نے حج کو زندہ اور اپنی اصلی حقیقت و صورت کے ساتھ باقی رکھا اور مسلم معاشرہ نیز مسلمانوں کے افکار و خیالات، احساسات، جذبات، اسلامی ادب، اور اردو شاعری پر اس کے ناقابل انکار اثرات مرتب ہوئے، موت کا ڈر دلوں سے نکل گیا، راہ خدا میں تکلیفیں برداشت کرنا بلکہ جان قربان کرنا آسان معلوم ہونے لگا، نازپروردہ نوجوان اور امراء و اغنیاء ہجرت و جہاد کی سختیاں جھیلنے اور بے آرامی، زہد و قناعت اور ایثار و قربانی کی زندگی گذارنے پر آمادہ ہو گئے۔ جہاد و شہادت کا نشہ لوگوں پر ایسا طاری ہوا کہ بعض اوقات چاہنے والا باپ اپنے جوان بیٹے کو معرکہ کارزار میں شہید ہونے کے لئے پیش کرتا، جیسا کہ نواب فرزند علی رئیس غازی پور نے اپنے بیٹے امجد علی کو یہ کہہ کر پیش کیا کہ "میں چاہتا ہوں کہ ذبیح اللہ اسمٰعیلؑ کی طرح اس کے گلے پر بھی اللہ کی راہ میں چھری چلے"۔

دوسرے صاحبزادے شیخ صادق علی تھے جن کے بارے میں "نزھۃ الخواطر" جلد ۷ صفحہ ۲۱۸ پر درج ہے :-

"فاضل اجل جناب صادق علی بن فرزند علی بھتری میں پیدا ہوئے پھر بچپن ہی میں رائے بریلی چلے گئے اور وہاں حضرت شیخ ظاہر بن غلام جیلانی حسنی رائے بریلویؒ کی خدمت میں رہنے لگے اور ان سے درسی کتابیں ہدایہ تک پڑھیں اور وہاں کے مشہور اساتذہ سے علم حاصل کیا۔"

اسی خاندان کے ایک بزرگ محمد مجتبیٰ صاحب صدیقی مرحوم کے پاس سنہ ۱۹۰۰ء کی ایک یادداشت تھی جس میں لکھا ہوا تھا :-

"آپ نے بعد حصول فضیلت اور عطاء سند غازی پور پہونچ کر ایک بہت بڑی عمارت پختہ مدرسہ کے نام سے بنوائی۔ بہت بڑا کتب خانہ بھی جمع کر لیا مگر موت نے مہلت نہ دی اور عین شباب ہی میں ملک آخرت کا سفر اختیار کیا شیخ فرزند علی اور شیخ صادق علی (باپ بیٹے) دونوں ہی نے ایک ہی سن یعنی ۱۲۶۳ھ میں انتقال کیا۔"

شیخ فرزند علی کی مسجد اور محل

محلہ قاضی ٹولہ میں دریائے گنگا کے کنارے واقع تھے، مسجد تو اب بھی خستہ و شکستہ حالت میں موجود ہے مگر محل کا نام و نشان بھی مٹ گیا۔ اسی طرح شیخ صادق علی کا قائم کردہ مدرسہ اور کتب خانہ بھی نابود ہو گیا مگر تاریخ بہر حال زندہ ہے۔ اسی تاریخی مسجد میں حضرت سید صاحب کی آمد (۱۲۳۹ھ) کے ۱۱۴ سال بعد ایک چھوٹا سا مدرسہ "مدرسہ دینیہ" کے نام سے قائم ہوا۔ حضرت سید صاحبؒ کے تاریخی سفر (۱۲۳۶ھ) کے ۲۷ سال بعد ۱۲۶۳ھ میں شیخ صادق کا وصال ہوتا ہے اور اس کے ۸۷ سال بعد سنہ ۱۳۵۰ھ میں اسی جگہ مدرسہ دینیہ کا قیام عمل میں آتا ہے اس لئے اگر ہم اس مدرسہ کو شیخ صادق علی بھتریؒ کے مدرسہ کی نشاۃ ثانیہ قرار دیں تو اس میں انکار و اعتراض کا کیا سوال؟

معین الندوہ کا قیام

یہی وہ نسبتیں تھیں جن کی وجہ سے حضرت مولانا علی میاںؒ بار بار مدرسہ دینیہ میں تشریف لاتے رہے اور اہل غازی پور کو نوازتے رہے۔ علیٰ ہذا القیاس ندوۃ العلماء کا اس کے ابتداء قیام ہی سے غازی پور سے بڑا قریبی اور مستحکم رشتہ رہا ہے۔ ۱۳۹۴ھ میں جب پنجاب اور پورب کے شہروں میں ندوۃ العلماء کے اغراض و مقاصد کی تائید و اعانت کی غرض سے مجالس ماتحت قائم ہوئی تھیں مثلاً دہلی و کرنال، لاہور، ریواڑی، پٹنہ بانکی پور وغیرہ تو معین الندوہ کے نام سے ایک شاخ غازی پور میں بھی قائم ہوئی تھی جس کے محرک مولوی عثمان خاں اور مؤید مولوی عبد الصمد تھے۔

خوشی کی بات ہے کہ تاریخ کی یہ ساری کڑیاں باہم مربوط نظر آنے لگی ہیں اور کیوں نہ ہوں کہ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ خود اپنے مبارک ہاتھوں سے ان کو مربوط کر گئے ہیں، اب ہمیں انھیں مضبوط بنانا ہے اور جو لوگ ان رشتوں کو ختم کرنا اور دینی مدارس کو الگ الگ خانوں میں بانٹ دینا چاہتے ہیں، ان سے ہوشیار بھی رہنا ہے۔

مدارس کو بانٹا جا رہا ہے

یہ عجیب بات ہے کہ حکومت بھی مدارس کو بانٹنے کے درپے ہے اور بدقسمتی سے اہل مدارس بھی باہم دست و گریباں نظر آرہے ہیں، ایسے میں الامام محمد قاسم نانوتوی سیمینار کے پلیٹ فارم سے اتحاد و اتفاق کا جو دلنواز نعرہ بلند

ہوا ہے اس کو سن کر بے اختیار زبان پر یہ شعر جاری ہو گیا ؎

مؤذن مرحبا بر وقت بولا
تری آواز مکے اور مدینے

رسالہ "ترجمان دار العلوم" نئی دہلی (مارچ۔مئی ۲۰۰۰ء) میں اس کے مدیر رقمطراز ہیں:۔

"اس سمینار کا دوسرا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اپنے پلیٹ فارم پر ملک کے اہل علم و اہل قلم کی ایک بڑی تعداد کو جمع کر لیا۔ ندوۃ العلماء، مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ، دار العلوم دیوبند اور سہارنپور جیسے اداروں کے ذمہ داروں اور اس سے تعلق رکھنے والے ہی صرف اکٹھا نہیں ہوئے بلکہ اس اجتماع میں وہ بھی شامل تھے جو بمبئی کلکتہ، مدراس، حیدرآباد، اترپردیش، بہار، پنجاب اور کشمیر جیسے علاقوں اور ان کے مدارس عربیہ سے تشریف لائے تھے حتیٰ کہ ملی کونسل، امارت شرعیہ، مسلم پرسنل لا بورڈ، جمعیۃ اہل حدیث، جماعت اسلامی اور مرکزی جمعیۃ علماء ہند بھی اس اجلاس میں گھل مل گئے۔"

دیکھئے کس خوبصورتی سے داعیان سمینار نے ہندوستان کے سبھی دینی و عصری علوم کے اداروں اور مسلم جماعتوں کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کر لیا اور من و تو کے امتیاز کو ختم کر دیا۔ اہل مدارس کے ساتھ اہل یونیورسٹی بھی اکٹھا ہو گئے۔

سمینار کی تجویز نمبر ۹

اس سمینار نے اپنی تجویز کے دو جزء کئے ہیں۔ جزء اول میں کہا گیا ہے کہ عمومی دینی تعلیم جس کی ہر مسلمان کو ضرورت ہے اس کے تمام ضروری مضامین، انگریزی، حساب، جغرافیہ، عربی زبان، فارسی زبان، سائنس، معلومات عامہ اور انشاء وغیرہ کی تعلیم دی جائے۔ جزء دوم میں کہا گیا ہے کہ خصوصی دینی تعلیم یعنی وہ اعلیٰ تعلیم جو ہمارے بڑے مدرسوں میں دی جاتی ہے جس کی ضرورت باقاعدہ ماہر عالم دین بننے کے لئے ہے اس ضرورت کے لئے مروج درس نظامی ضروری ترمیمات کے ساتھ بالکل مناسب ہے۔

بس اس پر اب ایک نقطہ رکھنے کی گنجائش نہیں ہے۔ ہم اس تجویز کی تائید کرتے ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ ندوۃ العلماء کے نصاب پر محض اس لئے کہ اس نے انگریزی، تاریخ، جغرافیہ یا ادب و انشاء پر پہلے توجہ دی اب سب و شتم نہ کیا جائے گا اور سب مل کر نئے زمانے کے چیلنجوں کا مقابلہ کریں گے۔ اگر ہم ایسا کر سکے تو یقیناً بزرگوں کی روحیں خوش ہوں گی۔

روشنی کے مینار

آیئے اخیر میں حضرت مولانا علیہ الرحمہ کے قلم سے نکلے ہوئے یہ الفاظ دہراتے چلیں۔

"مدرسہ کا کام یہ ہے کہ وہ ایسے باضمیر، باعقیدہ، ایسے باایمان، ایسے باحوصلہ، ایسے باہمت فضلاء پیدا کرے جو اس ضمیر فروشی، اصول فروشی اور اخلاق فروشی کے دور میں روشنی کے مینار کی طرح قائم رہیں۔"

تذکرہ مشاہیر غازی پور

راقم کے دل میں عرصے سے یہ خواہش تھی کہ غازی پور جو ماضی میں علم و ادب کا ایک بڑا مرکز رہا ہے، بڑے بڑے علماء، و مجاہدین جس کی آغوش میں رہے ہیں اور آج بھی اس کو غازیان اسلام کا مدفن ہونے کا شرف حاصل ہے کے حالات قلمبند کرتا، اس کی تاریخ کی گمشدہ کڑیوں کو یکجا کرتا مگر اپنی علمی کم مائیگی اور صلاحیت کے فقدان کی وجہ سے کام شروع کرنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ ایک موقع پر مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری نے راقم سے فرمایا کہ یہ کام تم کو کر ڈالنا چاہیے۔

غازی پور کی تاریخ پر کچھ کام والد مرحوم کر چکے تھے، ان کی قلمی یادداشتیں جو بکھری پڑی تھیں ان کو یکجا کیا اور کام شروع کر دیا۔ دو سال پہلے میں اس کام سے فارغ بھی ہو گیا ڈرتے ڈرتے اس کا مسودہ حضرت مولانا کی خدمت میں بھیجا، مسودہ پیش کرنے کے بعد فکر دامن گیر ہوئی کہ مولانا کی بارگاہ میں اس کی کیا وقعت ہوگی، اس ادھیڑبن میں ایک دن مولانا خالد صاحب ندوی غازی پوری نے خوشخبری سنائی کہ حضرت مولانا نے میری کتاب پر تقریظ لکھ دی ہے، چند ہی دنوں میں مسودہ مجھے واپس مل گیا۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ مولانا نے ناچیز کی کوشش کو سراہا ہے، اس طرح یہ کتاب مستند کتاب بن گئی۔

راقم نے اپنی اس حقیر سی کوشش اور علمی کاوش کو بے حقیقت سمجھ رہا تھا مگر حضرت مولانا کی تقریظ نے اس کو زمین سے اٹھا کر ایک دم سے آسمان پر پہونچا دیا۔ ایسے ہی موقعوں کے لئے شاعر نے کہا تھا ؎

زاوج رفعت سلطاں نہ گشت چیزے کم
کلاہ گوشہ دہقاں بہ آفتاب رسید

لے اس جامع مسجد میں تعزیہ رکھا جاتا تھا۔ سید صاحب کے وعظ کا اتنا اثر ہوا کہ تعزیہ داروں نے اس کو خود نکال پھینکا۔

علم و عمل کی شمعیں جلا کر چلا گیا
راہِ وفا میں پھول بچھا کے چلا گیا

حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

عرب علماء و دانشوروں کی نظر میں

● محمد شاھد ندوی بارہ بنکوی

"اپنی ذات میں انجمن" کی معروف اصطلاح یوں تو کئی لوگوں کے لئے استعمال کی گئی ہے لیکن کلید بردار خانہ کعبہ عالم عرب کے دل کی دھڑکن اور عالم اسلام کے جیّد عالم دین مفکر اسلام حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات والا صفات پر جس طرح یہ بات بجا طور پر صادق آتی ہے۔ اس طرح شاید کسی اور پر فی الوقت صادق نہ آسکے۔

حضرت مولاناؒ ہندوستان کی اہم اور عظیم دینی تنظیموں، جماعتوں، تحریکوں اور اداروں سے وابستہ رہنے کے ساتھ ساتھ رابطہ عالم اسلامی کی مجلس عاملہ کے رکن، مؤتمر عالم اسلامی بیروت کی مجلس عاملہ کے ممبر، دمشق یونیورسٹی اور جامعہ اسلامیہ مدینہ منوّرہ کے سابق وزیٹنگ پروفیسر، اسلامک سینٹر جنیوا کی مجلس انتظامی کے رکن اور آکسفورڈ یونیورسٹی کے اسلامک سینٹر لندن کے سربراہ تھے، مولانا کو ان تنظیموں اور اداروں میں ایک ممتاز حیثیت حاصل تھی جس کا اعتراف عرب علماء اور مفکرین اپنی تحریروں اور تقریروں میں برابر کرتے تھے،

حضرت مولانا کو عربوں نے ان کی دینی دعوتی خدمات کے اعتراف میں جو خطوط اور مکتوبات لکھے، اور ان میں عالمانہ بلند کلمات سے نوازا۔ ان سے ان کے حضرت مولاناؒ سے والہانہ عقیدت مندانہ بلکہ نیازمندانہ و محبت آمیز تعلق کا اظہار ہوتا ہے اور ان کی وفات کے بعد جو انھوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ذمہ داروں کے نام تعزیتی خطوط لکھے اور اپنے رنج و غم کا اظہار کیا اور ان کے عربی اخبارات میں جو تأثرات شائع ہوئے ہیں۔ ان سے بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ عربوں کے دلوں میں حضرت مولاناؒ کی کتنی قدر و منزلت تھی اور ان کی عنداللہ اور عندالناس کتنی مقبولیت تھی واضح طور پر سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا کی عملی تفسیر معلوم ہوتی ہے، ہم ان جلیل القدر عرب علماء جنھوں نے حضرت مولانا کو برکۃ العصر کہا۔ ان کے بارے میں ان کے بلند کلمات و آراء کے کچھ نمونے پیش کرنے کی سعادت حاصل کررہے ہیں۔

ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین کا مقام

ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین کے واسطہ سے مصر کے مشہور اہل قلم اور عالم عرب کے نامور محقق و مفکر اور قائد و مجاہد سیّد قطب شہید اپنے قلمی تأثرات میں حضرت مولاناؒ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"عصر حاضر کی اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ مسلمانوں میں خود اعتمادی پیدا کی جائے ان میں ماضی پر اعتماد مستقبل کے بارے میں امید اور حوصلہ پیدا ہو اس دین پر ان کا ایمان و یقین تازہ اور زندہ ہو جائے جس کا نام تو وہ لیتے ہیں لیکن اس کی حقیقت سے ناآشنا ہیں۔ ان کا تعلق اس دین سے زیادہ تر نسلی اور موروثی ہے، انھوں نے اس کو سمجھنے کی بہت کم کوشش کی ہے۔

اس موضوع پر تمام قدیم و جدید لٹریچر میں چند بہترین کتابیں جو میری نظر سے گذری ہیں ان میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی جدید تصنیف "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" خاص مقام رکھتی ہے"

(مقدمہ (ماذا خسر العالم)

پوری انسانیت کے مربی و محسن

ترکی میں حضرت مولاناؒ کا تعارف کراتے ہوئے مصر کے مشہور عالم ڈاکٹر احمد یونس نے فرمایا

"مولانا سید ابوالحسن علی ندوی پوری انسانیت کے مربی و محسن اور رہنما ہیں اور عرب و عجم ان کے دعوت و فکر سے نہ صرف آشنا بلکہ قدرداں ہیں۔"

ڈاکٹر احمد یونس مصری

تاریخ کی روشن و شاندار علمی صفات

عظیم محدث اور ممتاز مفکر و داعی شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ صاحب حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے بڑا والہانہ تعلق رکھتے تھے جس کا کچھ اندازہ ان کے خطوط سے لگایا جاسکتا ہے وہ اپنے خط میں حضرت مولانا کو بڑے شاندار القاب و عنوان سے خطاب کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے آپ کو قلم کی طاقت، تحریر کی تاثیر اور اخلاص کی دولت سے نوازا ہے آپ کی باتیں۔ نوجوانانِ ملّتِ اسلامیہ کے دلوں کی کنجی ان کے ارادوں اور ہمتوں کی بیداری اور کامیاب مہم جوئی کا وہ پیغام ثابت ہوتی ہیں جس سے امتِ مسلمہ کا پہلا قافلہ بہرہ ور تھا"۔

میرے محترم! آپ کو اللہ تعالیٰ نے جو دولت

عطا کی ہے، اپنے خلوص دل، عقل روشن اور حسن کردار کے حامل ہونے کے سبب آپ ان معانی کو بیان کرنے کے سب سے زیادہ مستحق ہیں۔

محبکم عبدالفتاح ابو غدہؒ ریاض
۱۹؍۷؍ ۱۴۱۰ھ

(تعمیر حیات ۱۰؍ اگست ۱۹۹۰ء)

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں۔

"یحییٰ بن سعیدؒ ہم سے حدیث بیان فرماتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موتیوں کی بارش ہورہی ہے واللہ! آپ کی باتیں بھی ہمارے لئے ایسی ہی ہیں شکر اس خدا کا ہے جس نے آپ کو یہ نعمت دی اور اس پر قادر بنایا، اس کام کے لئے منتخب کر دیا اسکی قوت بخشی اور آپ کی شخصیت میں ہماری تاریخ کے روشن و شاندار علمی صفات دکھائے عالی مرتبت علماء سلف کی یاد تازہ کی۔ آپ الحمد للہ ان اسلاف کرام کو یاد دلانے کا بہترین نمونہ ہیں جن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے اپنی اور اپنے رسول کی محبت پیدا فرمادی تھی۔ اور اللہ کی محبت کے سبب انہیں لوگوں میں محبوب بنا دیا تھا۔ آپ کا اس اعلیٰ نمونہ کا ہونا کوئی انوکھی بات نہیں کہ بڑے اور گھنے سایہ دار درخت کی شاخیں تازہ، ہری بھری اور شاداب ہی ہوا کرتی ہیں، وہ ہر وقت اور ہر جگہ اپنی عطر بیزی سے فضا کو معطر کرتا رہتا ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ آپ کی عمر دراز فرمائے اور آپ کی بابرکت ذات کو عرصۂ دراز تک قائم رکھے۔"

محبکم عبدالفتاح ابو غدہؒ ریاض
۲۰؍۴؍ ۱۴۰۲ھ

(تعمیر حیات ۱۰؍ دسمبر ۱۹۸۹ء)

مولانا کے علم و فہم اور فکر و بصیرت کا اعتراف

شامی اخوان کے مراقب عام ممتاز عالم وفقیہ اور شعلہ بار مقرر اور عظیم داعی ومربی ڈاکٹر مصطفےٰ السباعی صاحب، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندویؒ کی عالمانہ رفعت کے دل سے معترف اور سچے قدرداں تھے، یہاں ان کا وہ تاریخی مکتوب نقل کیا جاتا ہے جو انھوں نے ۱۹۵۵ء میں حضرت مولاناؒ کو دمشق یونیورسٹی میں بطور استاد تشریف آوری کیلئے لکھا تھا۔

سماحۃ الشیخ ابی الحسن علی الندوی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

غالباً آپ کو یہ علم ہو گیا ہوگا کہ دمشق کی سوریہ یونیورسٹی نے شریعت اسلامیہ کا شعبہ (کلیۃ الشریعۃ الاسلامیۃ) قائم کیا ہے، یونیورسٹی کے اس اقدام سے مسلمانوں اور حق وصداقت کے سبھی حامیوں کو خوشی ہوئی ہے، کالج کمیٹی نے مجھ سے خواہش ظاہر کی ہے اور وہ آپ کی منظوری کی امیدوار بھی ہے کہ میں آپ کو دو سال یا ایک سال کیلئے جیسا آپ پسند فرمائیں آپ کو یہاں درس دینے کی دعوت دوں کہ طلباء آپ کے علم اور اسلام کے پیغام کی گہری فہم وبصیرت سے فائدہ اٹھائیں۔ مجھے توقع ہے کہ آپ کی طرف سے جلد ہی وہ جواب ملے گا جو اس گرانقدر آرزو وتمنا کو عملی جامہ پہنانے کی نوید جانفزا لائے گا۔[1]

مصطفےٰ السباعی
عمید کلیۃ الشریعۃ۔ دمشق
۱۲؍ جون ۱۹۵۵ء

(تعمیر حیات ۲۵؍ فروری ۱۹۹۰ء)

مولاناؒ کی شان وشکوہ

بلاد عربیہ کے مشہور و مایۂ ناز ادیب وانشاپرداز صاحب قلم اور جید عالم دین شیخ علی طنطاوی صاحب حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے والہانہ اور عقیدتمندانہ تعلق وربط رکھتے تھے اور ان کے علمی وفکری اور ادبی رفعت وبرتری کے دل سے معترف اور بڑے مداح تھے۔

حضرت مولاناؒ نے اپنی کتاب "الطریق الی المدینۃ" پر (جو عربی زبان وادب کے شہ پاروں میں شامل ہے اور کاروان مدینہ کے نام سے اردو میں شائع ہو چکی ہے) شیخ علی طنطاوی سے حضرت مولانا رحمۃ اللہ نے مقدمہ لکھنے کی فرمائش کی تو انھوں نے اس کے جواب میں جو کچھ لکھا اور جو حقائق ان کے مایۂ ناز قلم سے نکلے اس میں کتاب اور صاحب کتاب دونوں کا سراپا سامنے آگیا ہے ملاحظہ فرمائیں۔

"آپ نے مقدمہ لکھنے کی فرمائش کی ہے مجھے اس سے معاف رکھئے کیونکہ اس کی نہ آپ کو ضرورت ہے نہ اس کتاب کو کتابوں کے مقدمہ کی وہی حیثیت ہوتی ہے جو تاجر کیلئے دلال یا ایجنیٹ کی۔ نئے تاجر کو دلال کی اس لئے ضرورت ہوتی ہے کہ وہ اپنے غیر معروف سامان کی شہرت بڑھائے، جب خود خریدار تاجر کو ایجنیٹ سے زیادہ جانتے ہوں اور اس کا سامان خریدنے کے لئے اس زیادہ متمنی ہوں جتنا تاجر اس کے فروخت کرنے کا، تو ایسی حالت میں ایجنیٹ کیا کام دے سکتا ہے۔

والسلام علیک رحمۃ اللہ
علی طنطاوی مکۃ مکرمہ
۱۴؍۱؍ ۱۳۸۵ھ

(کاروان مدینہ۔ الطریق الی المدینہ)

شیخ ابوالحسن کی تحریروں میں ایک جادو ہے

شیخ محمد المجذوب ملک شام کے ایک جید عالم دین تھے، الاسلامی یونیورسٹی مدینہ منورہ میں استاذ تھے "علماء ومفکرون عرفتہم" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ اس میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی تصنیف وتالیف کی خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

[1] حضرت مولانا نے استاذ زائر کی حیثیت سے بلامعاوضہ چند ہفتہ "رجال الفکر والدعوۃ" کے موضوع پر محاضرات دینا منظور فرمایا اور تشریف لے گئے۔

"شیخ ندوی کی تحریروں کو پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی ادبی تحریر میں ایک سحر ہے ایک ایسا جادو ہے جو عموماً دوسرے مصنفین کی تحریروں میں نہیں ملتا۔ اس کے بعد حضرت مولاناؒ کے اوصاف و کمالات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:"

"حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے اپنے اس نیک بندے کے اخلاص کو قبول فرمالیا ہے اس لئے آپ کی کوشش میں برکت ہے اور آپ کی تقریروں و خطابت میں کشش و مقبولیت رکھی ہے اور آپ کے عمیق مطالعہ واخلاص سے لبریز اور حقائق سے بھرپور تقریروں کو جو ہندوستان میں اور بلاد عربیہ اور یورپی ممالک کے مختلف اسلامی سیمیناروں میں کی گئی ہیں جن میں آپ اپنے آرام و راحت کو قربان کرکے شرکت فرماتے ہیں، اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے زبردست مقبولیت سے نوازا ہے، یہاں تک کہ وہ ایک حق کے متلاشی کیلئے سیرابی و آسودگی کا سامان بن گئی ہیں یہ سب اسلئے ہوا کہ آپ کا مقصد صرف اللہ کی رضا کا حصول تھا نہ کہ شہرت و منفعت کی طلب"۔

مزید لکھتے ہیں!

شیخ ابوالحسن کے تذکرہ سے میرا مقصد ان کی سے گمنام شخصیت کو روشناس کرانا نہیں ہے بلکہ وہ تو جامعہ اسلامیہ (مدینہ منورہ) کی مجلس انتظامی کے تاحیات رکن ہیں لیکن اس کے باوجود انھوں نے کبھی بھی جامعہ سے ایک پیسہ نہیں لیا۔ اور مجھے یاد نہیں پڑتا کہ وہ کبھی کسی ہوٹل میں ٹھہرے ہوں حالانکہ اس کمیٹی میں شرکت کی غرض سے ان کو بارہا آنا پڑا مجھے تمام علماء امت میں ان (شیخ ابوالحسن) جیسے عظیم زاہد کی مثال نہیں ملتی۔ دنیا سے بے نیازی اس کمزور ونحیف جسم کی خصوصیت ہے۔ یہی وہ امتیاز ہے جس کی بناء پر وہ معاشرہ کی خرابیوں پر انگلی اٹھانے اور اس کی اصلاح میں پورے طریقے سے لگے ہوئے ہیں نہ کسی غلط کو صحیح کہتے ہیں نہ کسی حقیقت پر پردہ ڈالتے ہیں۔ آپ کی گفتگو کانوں میں رس گھولتی ہے، اور آپ کی باتوں میں ایسی حقیقت بھری ہوئی ہے کہ اس کو کوئی غلط نہیں کہہ سکتا۔ (علماء مفکرون عرفتهم)

مسلم دنیا کے لئے اعلیٰ مثال

علامہ شیخ یوسف القرضاوی عرب کے مشہور محقق عالم و داعی اور نامور مصنف ہیں اصلاً مصری ہیں عربی کے باکمال خطیب ہیں موجودہ عرب علماء میں ان کو خاص احترام حاصل ہے۔ انھوں نے حضرت مولاناؒ کے بارے میں جو بلند کلمات لکھے ہیں ملاحظہ فرمائیے اور اندازہ کیجئے عشق الٰہی کی معجز نمائی کا کہ نغمۂ ہندی کی حجازی لے پر عرب کا ایک بہترین عالم اور دانشور کس طرح جھوم رہا ہے۔

"ہم نے اپنے بزرگ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو مسلم دنیا کیلئے ایک اعلیٰ نمونہ پایا۔ تجدیدی فکر رکھنے والے داعی، ربانی علماء کی رقت قلب و لطافت مزاج کے حامل، اسلاف جیسا پختہ عقیدہ، توحید اور سنّت نبوی کے متبع، معلومات وثقافت میں جدید تعلیم یافتہ جیسا علم و فہم اور عمل میں کتاب وسنّت کے چشمۂ صافی سے فیضیاب، عربی فارسی اور اردو ادب میں باکمال، علوم اسلامیہ کے ذخیرہ سے اچھی طرح سیراب تھے نئی نسل حضرت والا کے علم نافع، عمل صالح اور تابندہ روح سے روشنی حاصل کرتی ہے وہ آپ کی ذات میں مرد مؤمن کی شان و آن مخلص کی صداقت، مجاہد کا صبر وثبات زہد واستغناء کی طاقت، علم کا وقار اور اس داعی کی روح پاتے ہیں جس نے اپنی نماز وعبادت سب اللہ رب العالمین کی رضا کے حصول کے لئے کردیا ہو۔ (تعمیر حیات ۱۰ر جنوری ۱۹۸۰ء)

اسلام کی آواز

"مصر کے شیخ الازھر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود نے حضرت مولانا کی عالمانہ بصیرت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا۔ شیخ ابوالحسن علی الندوی۔۔۔ آپ نے اپنی زندگی خدا تعالیٰ کے لئے وقف کررکھی ہے اور اپنے شب و روز ایک مخلص و متقی مسلمان جیسے گذار رہے ہیں۔ آپ نے پاکیزہ اسلوب و کردار اور فکر انگیز اسلامی لٹریچر کے ذریعہ اسلام کی آواز کو دنیا کے گوشے گوشے میں پھیلایا ہے، نیز اپنے دور دراز ممالک کے اسفار کے ذریعہ آپ نے اسلام کی اشاعت وتبلیغ کا فریضہ انجام دیا اور لوگوں کی رہنمائی ورہبری فرمائی۔

عالم اسلام کے گل سرسبد

علامہ شیخ احمد بن ابراہیم الغزاوی (نائب مجلس شوریٰ سعودی عرب) جزیرۂ عرب کے معاصر شعراء میں سب سے بڑے قابل قدر ادیب اور شاعر تھے جو صرف سلاطین و ملوک کی مدح کرتے تھے، انھوں نے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی مدح میں عربی میں ایک نظم ان کی حیات ہی میں لکھی اور فرمایا تھا کہ۔

"میں نے اب تک بادشاہوں کی مدح کی ہے آج عالم اسلام کے گل سرسبد کے حق کی ادائیگی کرکے اپنے کلام کو آراستہ کررہا ہوں"۔

سعودی فرمانروا شاہ فیصل کی نظر میں

ممتاز عالم دین، نامور محقق اور جادو بیان خطیب شیخ مناع قطانؒ سربراہ شعبۂ علوم اسلامیہ امام محمد بن سعود اسلامی یونیورسٹی ریاض سے شاہ فیصل بن عبدالعزیز آل سعود رحمۃ اللہ علیہ نے عالم اسلام کے ممتاز علماء کی فہرست تیار کرائی شیخ رحمہ اللہ نے فہرست پیش کی، شاہ فیصل نے فہرست دیکھی اور اپنے قلم سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا نام سرِ فہرست لکھ کر آخری شکل دینے کا حکم دیا۔

(شیخ مناع قطان سے ایک گفتگو)

آپ ہندوستان جارہے ہیں تو شیخ ابوالحسن سے پوچھئے گا۔

سفیر سعودی عرب برائے ہند عزت مآب شیخ انس یوسف یاسین رحمہ اللہ ماہ رمضان ۱۳۹۳ھ کی سہ تاریخ کو اپنی چھٹی گذار کر ہندوستان واپس آرہے تھے روانگی سے قبل شاہ فیصل کو سلام و وداع کے لئے حاضر ہوئے۔ دوران گفتگو شاہ سے عرض کیا کہ آج یہاں تیسرا روزہ ہے اور ہندوستان میں یکم رمضان ہے، میں نے ہندوستان پہونچکر اگر وہاں کے مطابق پورے روزے رکھے تو میرے ۳۲ یا ۳۱ روزے ہوجائیں گے ایسی صورت میں میرا کیا عمل ہونا چاہئے؟ شاہ فیصل نے شیخ انس یاسین کا سوال سن کر فرمایا: تم ہندوستان جارہے ہو جہاں شیخ ابوالحسن علی جیسے جلیل القدر عالم ہیں اور تم یہ مسئلہ مجھ سے پوچھ رہے ہو؟

ہم شیخ ابوالحسن کو سننا چاہتے ہیں

رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کی مجلس تاسیسی کی نشستوں کے اختتام پر سعودی فرمانروا شاہ فیصلؒ کی خدمت میں مجلس کے اجلاس کی رپورٹ اور شکریہ وسپاس پیش کرنے کیلئے منتخب علماء کا ایک وفد ریاض روانہ ہوگیا جس کے اراکین میں عراقی عالم و مجاہد اور اخوان المسلمین کے ممتاز رہنما شیخ محمد محمود الصواف مکہ مکرمہ کی سربرآوردہ شخصیت شیخ محمود الحافظ اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہم اللہ شامل تھے شیخ صواف نے بادشاہ سلامت سے گفتگو شروع کی اور اجلاس کی کارروائیوں اور تجویزوں کو بیان کر رہے تھے کہ شاہ فیصل رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا! "نبغی نسمع الشیخ ابوالحسن" ہم تو شیخ ابوالحسن سے کچھ سننا چاہیں گے!

مومن مخلص کی شان

مفتی امین الحسینیؒ فلسطین کے مفتی اعظم اور ایک عالم دین اور عظیم مجاہد تھے انھوں نے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو ایک ذاتی خط میں بڑے بلند کلمات سے خطاب کرتے ہوئے لکھا۔ "آپ کو مومن مخلص کی شان کے مطابق مرض کی تشخیص اور اس کیلئے دوا تجویز کرنے کی سعادت کی توفیق (منجانب اللہ) حاصل ہوئی ہے اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ امت کے اندر آپ جیسے مخلص اور کارکن علماء کی تعداد کو بڑھائے اور اللہ آپ کو اپنے حفظ وامان میں رکھے۔" (تعمیر حیات ۵ر جنوری ۱۹۹۱ء)

میرا عقیدہ ویقین ہے

جامعہ ام درمان الاسلامیہ سوڈان کے عالم دین اور عظیم مفکر شیخ محمد المبارک کو حضرت مولاناؒ سے انتہائی درجہ میں عقیدت و محبت تھی انھوں نے اپنے خط میں لکھا:

• دمشق میں آپ سے ملاقات کا موقع ہمارے لئے بڑی سعادت کا باعث تھا۔ آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ مجھے آپ سے جو خصوصی محبت ہے وہ کسی اور مفکر و داعی سے نہیں باوجود یکہ میں ان سب حضرات کا قدرداں ہوں اور سبھی سے محبت رکھتا ہوں۔

خدا گواہ ہے کہ میں آپ کی عنایت و توجہ کو رضاء خداوندی کے اسباب میں سے شمار کرتا ہوں۔ یہ میرا عقیدہ و یقین ہے، محض تکلف اور خوش کرنے کے لئے نہیں لکھ رہا ہوں اس وقت آپ کے سوا کوئی میرے لئے اس منزل و مرتبہ کا نہیں، میری اس عقیدت کا یہ عالم ہے کہ میں برابر سوچتا رہتا ہوں کہ قیامت کے دن آپ میرے سامنے ہوں گے میں آپ کو پکاروں گا اور مضبوطی کے ساتھ آپ کا دامن پکڑلوں گا۔ میرے دل میں بارہا یہ خیال آیا لیکن میں آپ سے بیان نہیں کرسکا۔

اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ وہ حشر میں مجھے آپ کے ساتھ اپنی رحمت کے سایہ میں رکھے گا۔ (تعمیر حیات ۱۰ر جولائی ۱۹۹۰ء)

ذیل میں عربی اخبارات میں شائع شدہ عرب علماء کے تأثرات پیش خدمت ہیں۔

دعوت الی اللہ کیلئے جسم وجان اور قلم وزبان وقف

• عالم جلیل اور داعی عظیم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے دعوت الی اللہ اور جہاد فی سبیل اللہ کیلئے اپنی زبان وقلم اور جسم وجان کو وقف کردیا تھا۔ اور اس میدان میں ان کے کارنامے ناقابل فراموش ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ مولانا مرحوم کو اپنی رحمتوں سے ڈھانپ لے اور انھیں اپنے نیکوکار بندوں میں شامل فرمائے اور انھیں ابرار واتقیاء شہداء وصالحین کے ساتھ اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے۔

شیخ محمد بن عبداللہ السبیل

(صدر شؤون الحرمین الشریفین امام وخطیب مسجد حرام مکہ مکرمہ)

آخری سانس تک قرآن وسنت پر مضبوطی سے قائم رہے

• علامہ سید ابوالحسن علی ندویؒ نے ایک طویل عرصہ تک مسلمانان عالم کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا اور اسلام کے اصل پیغام اور اس کی صحیح روح سے دنیا کو متعارف کرایا اور پوری حکمت ودانائی کے ساتھ دین حنیف کی دعوت دیتے رہے اور اس راہ میں سلف صالحین کے اسوۂ حسنہ کو برابر مشعل راہ بنائے رکھا۔ اپنی آخری سانس تک

قرآن وسنت پر مضبوطی سے قائم رہنے کی تلقین کرتے رہے۔

ڈاکٹر عبداللہ صالح عبید
(جنرل سکریٹری رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ)

جملہ مسلمانانِ عالم اس دانائے راز سے محروم

• ہم سب کے مخدوم و مشفق حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے محرومی کا غم محض رسمی تعزیت سے کم نہیں ہو سکتا ہندوستانی مسلمان اپنے سرپرست سے محروم ہو کر یتیموں کے مانند ہو گئے ہیں۔ اس عظیم شخصیت کا رعب وجلال مخالف وموافق سبھی کے دلوں پر تھا۔ اور ان کا بدترین مخالف بھی انھیں نظر انداز کرنے کی جسارت نہیں کر سکتا تھا۔ اور رابطہ ادب اسلامی اپنے بانی صدر کے بعد دختر یتیم کے مانند ہے کہ اس کی تمام تر سرگرمیاں اسی ذات والاصفات کی رہبری اور دعاؤں کی رہین منت تھیں۔

جملہ مسلمانانِ عالم اور بالخصوص ہندوستانی مسلمان اس دانائے راز سے محروم ہو کر اب کدھر جائیں اور کس کا سہارا لیں کہ ان کے درمیان سے خیر وبرکت کی علامت گویا اٹھ گئی۔ اور وہ مسلسل کئی نسلوں کے معلم ومربی اور اس عہد کے سب سے بڑے عالم اور داعی سے محروم ہو گئے۔

ڈاکٹر عبدالقدوس ابو صالح
نائب صدر عالمی رابطہ ادب اسلامی سعودی عرب

سب سے بڑا کارنامہ

• "مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے عربوں کی طرف اپنی توجہ مبذول کی، انھیں بیدار کیا، انھیں اپنے حقیقی منصب اور ذمہ داری سنبھالنے کی دعوت دی اور انھیں یاد دلایا کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں اعزاز وسربلندی، اسلام کے بدولت عطا کی۔ اور قرآن نے انھیں دنیا کی قیادت کیلئے تیار کیا۔"

ڈاکٹر انور الجندی

دعوت واصلاح کے امام

• "علامہ سید ابوالحسن علی ندویؒ دعوت واصلاح کے اماموں میں سے ایک امام تھے، ان کے اندر بیک وقت زہد وورع جہاد وسرفروشی اور فکر وادب کا حسین امتزاج پایا جاتا تھا، علامہ کی زندگی دعوت الی اللہ، خدمت اسلام اور اشاعت خیر کیلئے ایک جہد مسلسل سے عبارت تھی۔

ڈاکٹر احمد عثمان تویجری
(رکن مجلس شوریٰ سعودی عرب)

ناقابلِ تلافی نقصان

• حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی وفات کی خبر سے ہمارے اوپر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اس عالم جلیل اور یگانۂ روزگار شخصیت سے محرومی مسلمانانِ عالم کے لئے ناقابل تلافی نقصان ہے۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی علمی جدوجہد، دعوت وارشاد اور غرباء ومساکین کی امداد میں صرف کر دی۔

خلیفہ جاسم الکواری
(ڈائریکٹر ادارہ اسلامی امور قطر)

صحیح مقام کا اندازہ

• حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اپنی پوری زندگی کا ایک ایک لمحہ ملت اسلامیہ میں بیداری پیدا کرنے میں گذارا، مولانا ندوی ان قائدین میں تھے جنھوں نے مسلمانوں کو جوڑنے کی کوشش کی اور خالص دینی بنیاد پر علمی اور ثقافتی مجالس قائم کیں، میں جس قدر بھی کوشش کروں الفاظ اپنی وسعت کے باوجود ناکافی ہیں جن سے آپ کے صحیح مقام کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

عبدالرحمٰن بن ناصر العوہلی
(سفیر مملکت سعودی عرب برائے ہندوستان)

خالص اسلامی دعوت کے خوشگوار نتائج سامنے آئے

• حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اپنی خالص اسلامی دعوت اور برصغیر میں اس کے دور رس اثرات کی وجہ سے مشہور ومقبول ہوئے اس دعوت کے خوشگوار نتائج سامنے آئے یقیناً علماء کی وفات امت کے لئے بہت بڑا خسارہ ہوا کرتی ہے۔ مولانا مرحوم کی بے شمار تصنیفات ہیں جو اسلام کی خدمت کے جذبہ اور اس کیلئے درد وتڑپ سے مالا مال ہیں۔

شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ آل الشیخ
مفتی عام سعودی عرب

کلید کعبہ

• علامہ ابوالحسن علی ندویؒ ایک عظیم عالم دین تھے، انھوں نے اپنی زندگی ایک معلم، مؤلف اور داعی الی اللہ جیسی گذاری انھوں نے اپنی اسّی تصنیفات کے اندر اپنے اس علمی ورثہ کو چھوڑا جن کا کئی اسلامی اور بعض یورپی زبانوں میں ترجمہ ہوا سعودی حکومت نے آپ کے علم وزہد اور تقویٰ سے متاثر ہو کر آپ کو کلید کعبہ عطا کی تھی جب آکسفورڈ اسلامک سنٹر کا قیام عمل میں آیا تو اس کے بانیوں نے اس کی صدارت شیخ ندوی ہی کو سونپی، مولانا ندوی ایک ایسے مثالی عالم تھے جن کے علم کی وجہ سے ان کے معاصر فخر محسوس کرتے تھے۔

ڈاکٹر زکی بدر سربراہ جامعہ اسلامیہ لندن

دنداں شکن جواب

شیخ سید ابوالحسن علی ندویؒ دین کے معاملہ میں بڑے حساس اور غیرت مند تھے اس میں نہ کبھی نرمی برتی اور نہ مداہنت سے کام لیا۔ اور نہ اللہ کے معاملہ میں کبھی کسی کی پرواہ کی بلکہ اسلام پر جب کبھی کوئی حملہ ہوا اور اس پر آنچ آئی تو آپنے پوری قوت اور پامردی کے ساتھ اس کے لئے سینہ سپر ہوگئے اور اسلام کی طرف سے بھرپور دفاع کیا اور اس کا دنداں شکن جواب دیا۔ اور اپنے پائے ثبات میں کبھی لغزش نہیں آنے دی۔ ڈاکٹر محمد عبدہٗ یمانی

سابق وزیر الاعلام سعودی عرب

دعوت اسلامی کے علمبردار

• شیخ ندوی دعوت اسلامی کے علمبرداروں میں سے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعہ ہندوستان میں دعوت کے میدان میں بڑے بڑے کام لئے وہ حدیث کے امام تھے، ان کی وفات بلاشبہ دعوت کے میدان میں اثر انداز ہوگی۔ ان کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ ایک ایسے مدرسہ کی طرح تھے جو حکمت اور سلوک اور خالصتہً اللہ کیلئے دعوت میں ممتاز ہو

ڈاکٹر ابراہیم الفائز

استاذ کلیۃ الشریعۃ،

مسلمان ایک معتبر و مستند عالم سے محروم ہوگئے

• شیخ ندوی مربیوں اور داعیوں میں سے تھے اور ان کی ذاتی زندگی اور تالیفات اسلام کے بارے میں ان کی پیش کردہ خدمات کی روشن دلیل ہیں، ان کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ ایک ایسے باعمل داعی تھے کہ جس کے نقوش اس کے ختم ہونے کے بعد بھی زندہ و باقی رہیں گے۔ تصنیف و تالیف میں آپ کو یدطولیٰ حاصل تھا اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں نے ایک عظیم اسلامی داعی اور معتبر و مستند عالم کھو دیا۔

ڈاکٹر ابراہیم الوہیبی

جنرل سکریٹری ندوۃ الشباب الاسلامی العالمیۃ جدہ

دعوت کے میدان میں انمٹ نقوش

• شیخ ندوی کی دعوت کے میدان میں بڑی جانفشانیاں اور انمٹ نقوش ہیں اور دعوت کے سلسلہ میں ان کا ایک خاص اسلوب و نہج ہے جس میں وہ ممتاز و منفرد ہیں۔

ڈاکٹر خلیل الخلیل حمادہ

استاذ شاہ سعود یونیورسٹی (ریاض)

امتیازی شان

• شیخ ابوالحسن علی ندویؒ نے دعوت الی اللہ کے میدان میں بڑا مجاہدہ کیا اور عالم اسلام میں اسلامی پرچم کو بلند کیا وہ عصر حاضر کے علماء اور مصلحین کے درمیان علم وعمل اخلاص وللٰہیت اور اسلوب دعوت میں امتیازی شان رکھتے تھے۔

عمر بن محمد السبیل

امام وخطیب مسجد حرام مکۃ مکرمہ

عصر حاضر کے مجدد

• مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ عصر حاضر کے ایک مجدد تھے انھوں نے اپنے قلم سے دعوت کے میدان میں جہاد کیا، دین محمدیؐ کو غیروں کی تاویلات اور تحریفات سے بچایا۔ اسلام کی سچی دعوت و تعلیم کو ہندوستان میں خصوصاً اور عرب ممالک میں عموماً پیش کیا۔

نادر عبدالعزیز النوری

صدر مجلس ادارہ فلاح وبہبود (سعودی عرب)

دعوت واصلاح کے نقوش

• حضرت مولانا علی میاں ندویؒ نے دعوت و ارشاد اور وعظ و نصیحت کے ذریعہ اسلام کی خدمت انجام دینے میں بڑا مجاہدانہ کردار ادا کیا اور نہ صرف ہندوستان اور عرب ممالک بلکہ ساری دنیا میں ان کی دعوت واصلاح کے نقوش ثبت ہیں۔ انھوں نے اپنے علم وعمل سے مسلمانوں اور غیر مسلموں کو بڑا فائدہ پہونچایا۔ ڈاکٹر صالح مہدی السامرائی

صدر اسلامک سینٹر (جاپان)

انکی تصنیفات منارۂ نور اور مشعل راہ ہیں

شیخ ندویؒ نے اسلامی بیداری پیدا کرنے اور فکر کو جلا بخشنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ان کی تصنیفات اور کتابیں ہمارے لئے مشعل راہ ہیں جن سے مسلم نوجوان اسلامی علوم کے میدان میں اپنی علمی و فکری تشنگی دور کر رہے ہیں۔ اور وہ بڑی عقیدت و احترام کے ساتھ مسلم گھرانوں میں پڑھی جاتی ہیں۔

احمد عبدالوہاب بن عبدالرحمٰن نور ولی

نائب سکریٹری الندوۃ العالمیۃ للشباب الاسلامی جدہ

زہد وتقویٰ کے پیکر

میں نے ابوالحسن علی ندوی کو زہد وتقویٰ کے اعتبار سے بہت بلند مقام پر پایا۔ لوگوں کی زبانیں پرہیزگاری اور خدا ترسی کے کلمات سے تر رہتی ہیں لیکن ان کے دلوں کا حال کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ ان کے دل اس کیفیت سے یکسر خالی ہوتے ہیں جس کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ لیکن شیخ ابوالحسن زہد وتقویٰ کے پیکر تھے وہ باعمل علماء کی حسین لڑی کا ایک نہایت خوبصورت موتی اور امت کا بچا ہوا خزانہ تھے،

عبداللہ الطنطاوی (عمان)

کہکشاں کی انجمن میں جیسے ہو ماہِ تمام

حضرت مولاناؒ کے عہد نظامت کے اہم اجلاس کی روح پرور یادیں

● مولانا محمد خالد ندوی غازی پوری، استاذ حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء

دارالعلوم ندوۃ العلماء وہ تاریخ ساز ادارہ ہے جس نے علمی، فکری، دینی، روحانی اور ادبی میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں، اس ادارہ کے بانیوں کا اخلاص ہر دور میں برگ و بار لاتا رہا، اور "تُؤْتِيْ أُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا" کا منظر پیش کرتا رہا ہے، اس کی راہ میں طوفان آئے، تو اس نے اس کی پرواہ نہیں کی بلکہ اس کے رخ کو موڑ دیا۔ زندگی کی شاہراہ میں جہاں دراڑیں آئیں اور باہمی چپقلشوں کے نتیجے میں خلیجیں پیدا ہوئیں تو انھیں پاٹنے کا فریضہ انجام دیا، اس کی بنیاد اس پر رکھی گئی تھی کہ امت مسلمہ کی صفوں سے باہمی رنجشوں کو دور کرکے قوت و استحکام پیدا کیا جائے اور اس کے تعلیمی نظام میں جو نقص ہے اس کو دور کیا جائے، اور معاشرہ کی اصلاح کی ہر ممکن سعی کی جائے، اس کے لئے اس ادارے کے بیدار مغز بانیوں نے ملک کے طول و عرض میں اس کے پیغام کو پہونچانے کے لئے بڑے بڑے اجلاس منعقد کئے۔ اس کا آخری اجلاس نومبر ۱۹۲۷ء کو امرتسر میں منعقد ہوا اس کے بعد پھر تقریباً نصف صدی تک مختلف اسباب کی بنا پر اس کا کوئی اجلاس نہیں ہو سکا تھا۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے مجلس مشاورت کے وفد کے ساتھ ۱۹۶۶ء میں ریاست میسور کا سفر کیا، جہاں بلگام میں بھی ایک دن آپ کا قیام رہا، حیات عبدالحیؒ میں اس کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ:-

"اگرچہ اس اجلاس کو منعقد ہوئے نصف صدی ہو چکی تھی اور اس زمانہ کے اکثر لوگ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے، چند معمر بزرگ ہی باقی تھے جو اس اجلاس میں شریک تھے، لیکن ابھی تک دلوں میں اس کی یاد تازہ تھی، اور لوگ مزہ لے کر اس کا تذکرہ کرتے تھے۔"

(حیات عبدالحیؒ ص ۱۹۴)

غالباً ۱۹۶۲ء یا ۱۹۶۳ء میں حضرت مولاناؒ نے بحیثیت ناظم ندوۃ العلماء کے اولاً اس کی تحریک کی اس وقت اس سلسلے کے بعض اہم کام انجام بھی دیئے گئے... یہ بات بھی کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ تعمیر حیات کے اجراء میں (جس کا پہلا شمارہ نومبر ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا) یہ خواہش اور جذبہ بھی کارفرما تھا کہ اس سے اجلاس کی عمومی فضا اور ذہن تیار کرنے میں مدد ملے گی۔ لیکن بات اس سے آگے نہ بڑھ سکی اور ایک طویل عرصہ اس حال میں گذر گیا، آخر کار ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی نے اپنے جلسہ منعقدہ ۲۲ مارچ ۱۹۷۴ء (جو خاتون منزل گولہ گنج میں حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی صدارت میں ہوا) میں اس تحریک کو ایک مختصر تجویز کی شکل میں باضابطہ طور پر منظور کیا، اس موقع پر ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے مجلس انتظامی کو متوجہ کرتے ہوئے فرمایا تھا:

"ندوۃ العلماء کا اجلاس عام مدتوں سے منعقد نہیں ہوا، کچھ عرصہ پیشتر اس کا ذکر آیا مگر توجہ نہ دی جا سکی حالانکہ جلسہ عام کا انعقاد ایک بڑی ضرورت ہے، اور عدم انعقاد ایک بہت بڑی کمی، اب ان شاء اللہ اس کمی کو ضرور پورا کیا جائے گا اور اس میں تمام عالم اسلام کے ممتاز علماء اور دینی شخصیتوں کو بھی مدعو کیا جائے گا۔"

(کارروائی اجلاس ۱۸ اگست ۱۹۷۴ء)

اجلاس کے قریبی اور فوری محرکات میں سب سے بڑا حصہ (جس سے اس کا اولین تقاضا پیدا ہوا اور شدت اختیار کر گیا) حضرت مولانا نور اللہ مرقدہ کے ممالک عربیہ اسلامیہ کے مسلسل دوروں اور وہاں کی جامعات علمیہ مجالس اور عمومی اجتماعات میں ان کی تقریروں اور خطبات کا ہے، جن کا آغاز ۱۹۵۱ء میں سفر حجاز، شام اور مصر و سوڈان سے ہو گیا تھا، مصر میں جو اس وقت علم و ادب کے لحاظ سے اپنے پورے شباب اور عروج پر تھا، حضرتؒ کا قیام کئی ماہ مسلسل رہا، اور ندوۃ العلماء کے نام اور کام سے ایک بہت بڑا حلقہ اچھی طرح واقف ہو گیا، جس میں ہر طرح کے ممتاز و نامور افراد، تعلیم یافتہ ذہین اور بے چین نوجوان لائق

اساتذہ اور صف اول کے اہل فکر و اہل قلم بلکہ دیہات کے سادہ لوح اور مخلص مسلمان بھی شامل تھے۔

اس کے بعد حضرت والاؒ کے سفر برابر جاری رہے اور نہ صرف ممالک عربیہ بلکہ یورپ کے متعدد ملکوں تک اس کا سلسلہ دراز ہوگیا۔ اس کے علاوہ حضرت مولاناؒ کی عربی تصنیفات کی عالم عربی میں بڑے پیمانے پر اشاعت و مقبولیت کی وجہ سے ندوہ کو قدرتی طور پر عام مقبولیت حاصل ہوئی، اور اس کے فکر و نظر کی بلندی، تخیل و نصب العین کی جامعیت اور دماغ و دل کے توازن نے علمی و دینی حلقوں کو خاص طور پر اور وسیع پیمانے پر متاثر کیا، اور کہا جاسکتا ہے کہ شاید آج عالم اسلام میں ندوہ سے جتنے لوگ واقف ہیں اتنے خود اس ملک میں نہ ہوں گے۔

ان تمام باتوں کے پیش نظر محسوس کیا گیا کہ اب جو اجلاس ہو وہ کل ہند نہیں بین الاقوامی سطح پر منعقد ہو، خاص طور پر ممالک عربیہ کے علمی و تعلیمی حلقوں کو اس میں خاص طور پر اور بڑے پیمانے پر شرکت کی دعوت دی جائے تاکہ وہ اس ندوہ کو جس کے وہ نادیدہ مشتاق ہیں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ (روداد جشن)

دعوت کا آغاز

اس سلسلہ کی پہلی دعوت رابطہ عالم اسلامی کے جنرل سکریٹری شیخ صالح قزاز کو پیش کی گئی، حضرت والاؒ بہ نفس نفیس اپنے معتمد ترین مخلص و محبوب شاگرد حضرت مولانا عبداللہ عباس صاحب ندوی دامت برکاتہم اور اپنے بھتیجے جناب مولانا محمد الحسنیؒ کے ہمراہ شیخ کے دفتر واقع حرم مکی میں حاضر ہوئے اور دعوت پیش کی، شیخ نے بڑی خندہ جبینی اور کشادہ روئی کے ساتھ دعوت کو قبول کیا اور کامیابی کی دعا فرمائی۔ شیخ نے اجلاس کے موقع پر اپنے مرسلہ پیغام میں یہ تاریخی جملہ کہا تھا کہ "شیخ ابوالحسن علی ندویؒ عالم عربی کے لئے ہندوستان کا ایک تحفہ ہیں"۔

اس طرح اس بچاسی سالہ جشن کا دعوت کا آغاز اس سرزمین سے ہوا جہاں سب سے پہلی وحی نازل ہوئی تھی۔ اور اس میں جہل وضلالت میں ڈوبی ہوئی دنیا کو علم و آگہی کی بشارت دیتے ہوئے تعلیم کی طرف متوجہ کیا گیا تھا، اور اس اجلاس کا مقصد ہی تعلیم کی قندیلیں فروزاں کرنا اور موجودہ نظام تعلیم میں مثبت پہلوؤں کو فروغ دینا تھا۔ اجلاس کی صدارت کے لئے جامعۃ الازہر مصر کے الامام الاکبر شیخ عبدالحلیم محمود پر حضرت والاؒ کی نگاہ پڑی جو اس منصب کے لئے ہر طرح اہل تھے اور کرسی صدارت ان کی تشریف فرمائی پر نازاں تھی۔ بلاشبہ ایک موزوں انتخاب تھا حضرت مولانا سنہ ۱۹۷۳ء میں رابطہ عالم اسلامی کی سالانہ میٹنگ میں شرکت کے لئے مکہ معظمہ تشریف لے گئے تھے۔ اس اجلاس میں شرکت کے لئے شیخ الازہر بھی تشریف لائے تھے۔ حضرت مولانا عبداللہ عباس ندوی دامت برکاتہم نے شیخ کی قیام گاہ فندق شبرا میں حضرت والاؒ سے ملاقات کا نظم فرمایا، حضرتؒ تشریف لے گئے اور وہیں دعوت پیش کی گئی۔ اور شیخ نے شرف قبولیت سے نوازا، اور شریک اجلاس ہوئے۔ اس طرح اس اجلاس کی کامیابیوں میں وادی بطحا کی عطر بیز ہواؤں کے جھونکوں نے کلیدی رول ادا کیا، حضرت شیخ مولانا محمد زکریا مہاجر مدنیؒ نے جب سے اس اجلاس کی خبر سنی تھی۔ اس کی کامیابی کے لئے ہمہ تن متوجہ تھے، گھر کی خواتین اور اہل تعلق سے بھی دعا کا اہتمام کراتے رہے۔ حضرت شیخؒ کے قریبی لوگوں کا بیان ہے کہ اجلاس کے انعقاد کے زمانہ میں کبھی کبھی پوری رات حضرت شیخؒ خواب میں اجلاس کے انتظامات میں مصروف اور شرکاء اجلاس کی رہنمائی کرتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔

اجلاس کی تاریخیں ۳۱ر اکتوبر یکم اور ۲ر نومبر طے کی گئی تھیں، حضرت مولانا عبداللہ عباس صاحب ندوی دامت برکاتہم مکہ مکرمہ سے بطور خاص اس کے انتظام و انصرام کے لئے لکھنؤ تشریف لائے، اور حضرت والاؒ کے وطن تکیہ رائے بریلی میں اس سلسلہ کی پہلی میٹنگ ہوئی۔

راقم سطور اس زمانہ میں درجہ علیا اولی فضیلت اول کا طالب علم تھا، اساتذہ، طلبا، دارالعلوم کی تزئین و تحسین میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے، اکابر اساتذہ بھی طلبا کے ساتھ دارالعلوم اور فیلڈ کی صفائی اور تزئین میں دوش بدوش تھے۔ عجیب روحانی سماں تھا ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ عید آنے والی ہے ایسی عید جس کے لئے نگاہیں بے تاب اور قلب و ذہن میں ایک اضطراب برپا تھا۔ شوال کا مہینہ مدارس میں تعلیمی آغاز کا مہینہ ہوتا ہے، نووارد مہمانوں کا استقبال کوئی نئی بات نہیں، لیکن اس سال تو اس اجلاس کی برکت سے پورے عالم اسلام کی برگزیدہ ہستیوں کی کہکشاں جیسے اتر آئی ہو، لکھنؤ کی سرزمین اپنی تقدیر پر نازاں تھی۔ اموسی ہوائی اڈے سے دارالعلوم ندوۃ العلماء تک بے شمار گیٹ بنائے گئے تھے، جو تاریخ ساز علمی، دینی اور روحانی شخصیتوں کی طرف منسوب تھے۔ سب سے آخری گیٹ پنڈال کے قریب اسٹیج کے داہنی طرف تھا۔ وہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے نام سے منسوب کیا گیا تھا۔

عوام کے ساتھ حکومت بھی متحرک تھی۔ اس دور کے وزیر اعلیٰ آنجہانی ہیم وتی نندن بہوگنا بذات خود ندوہ کے روبرو گذرنے والی سڑک کی تجدید اور گومتی ندی پر بنے ہوئے باندھ کی تزئین میں سرگرم تھے۔ دن میں کئی دفعہ آتے رہے۔ اور حضرت والاؒ کی خدمت میں حاضری دے کر رضا کارانہ خدمات کی اجازت چاہتے رہے۔ حضرت نے ندوہ کے اندر کسی قسم کی خدمت یا تعاون سے معذرت کر لی تھی۔ انھوں نے اس موقع پر ایک خطیر رقم کی بھی پیش کش کی تھی لیکن شکریہ کے ساتھ اسے بھی واپس کر دیا گیا تھا۔

۳۱ اکتوبر کو ٹھیک ساڑھے نو بجے افتتاحی اجلاس شروع ہوا، شروع سے آخر تک اس جشن کے اسٹیج سکریٹری کے فرائض حضرت مولانا محمد رابع صاحب ندوی دامت برکاتہم نے انجام دیئے۔ وسیع و عریض اور خوبصورت ڈائس پر عرب مہمانوں کی قطاریں بڑا دلکش منظر پیش کر رہی تھیں۔ قاری ودود الحق صاحب ندویؒ کی تلاوت کلام پاک سے اجلاس کی باقاعدہ کارروائی شروع ہوئی۔ اس کے بعد ندوہ کے طلباء نے ندوہ کا ترانہ پیش کیا، جس کا ہر بند ندوۃ العلماء کے بلند عزائم و مقاصد اور اعلیٰ نصب العین کا آئینہ دار ہے ؎

ہم نازشِ ملک و ملت ہیں ہم سے ہے درخشاں صبح وطن
ہم تابشِ دیں، ہم نورِ یقیں، ہم حسن عمل، ہم خلق حسن

۳ نومبر تک اس اجلاس کے سارے پروگرام بحسن و خوبی انجام پذیر ہوتے رہے۔ ندوۃ العلماء کا یہ تعلیمی اجلاس ایک ایسا بین الاقوامی اجلاس تھا جسے ہم ملت اسلامیہ ہند کی تاریخ کا ایک اہم موڑ قرار دیں تو مبالغہ نہ ہوگا۔ آزادی کے بعد اس سرزمین میں مسلمانوں کو بڑی صبر آزما آزمائشوں سے گذرنا پڑا، ہر شعبۂ زندگی میں تعصب اور تنگ نظری اور مسلسل فرقہ وارانہ فسادات کے نتیجے میں مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے تھے، مسلمانوں کے ذہن میں یہ بات جم گئی تھی کہ اس ملک میں سکون و قرار ان کے مقدر سے اٹھ گیا ہے، اس ماحول اور ذہن کے خلاف جد و جہد میں حضرت مولانا نور اللہ مرقدہ پیش پیش تھے، انھوں نے ایک طرف تو تعصب و تنگ نظری اور ظلم و غارت گری کے خلاف بڑی بے خوفی اور بے باکی کے ساتھ قلم و زبان دونوں سے جہاد کیا، اس کے ساتھ ہی مسلمانوں میں خودداری، خود شناسی اور خود اعتمادی کا جذبہ پیدا کیا۔

یہ اجلاس حقیقت میں ہندی مسلمانوں کی زندگی اور قوت کا ایک ایسا ناقابل فراموش مظاہرہ تھا، جس کے بڑے دور رس اثرات ملک و ملت کی زندگی سے وابستہ تھے، بقول حضرت والاؒ کے:-

"اس ملک کے مسلمان پوری خودداری و خود شناسی، اپنے دینی شعائر، اپنی دینی و ملی تہذیب و شخصیت کے ساتھ اس ملک میں رہنے کا عزم صمیم کر چکے ہیں، یہ ہندوستانی مسلمانوں کی ذہنیت کا بھی امتحان ہے اور وفا کا بھی اور ان کے مضبوط اور غیر متزلزل عقیدہ کی بھی آزمائش ہے اور سچی حب الوطنی کی، ان کی طاقتور اور دلآویز شخصیت اور اعلیٰ کردار کی بھی اور مثبت طرز فکر اور جذبۂ عمل کی بھی۔"

اس اجلاس سے ہندوستان میں مسلمانوں کے وجود، ان کی افادیت اور فکر و عمل کے بارے میں جو بہت سی غلط فہمیاں تھیں وہ دور ہوئیں، مایوسی اور احساس کمتری کی گرد صاف ہوئی اور خود اعتمادی کا جذبہ پیدا ہوا۔

اس اجلاس میں ساری دنیا خصوصاً اسلامی ملکوں کے جتنے ممتاز علماء اور دانشور شریک ہوئے اس سے قبل کبھی کسی اجتماع یا اجلاس میں شریک نہیں ہوئے، اجلاس میں ملک کے گوشے گوشے سے علماء اور دانشوروں کی کثیر تعداد میں شرکت، نظم و ضبط اور جوش و اشتیاق دیکھ کر بیرونی مہمانوں پر ایک مسرت انگیز حیرت طاری تھی جس کا اظہار ان کے چہروں سے ہو رہا تھا۔

حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانیؒ نے اس اجلاس کے عظیم اور دور رس اکتسابات یوں بیان فرمایا:-

"عرب ملکوں میں یہ تأثر عام تھا کہ تقسیم کے بعد مسلمان اپنے متاع ایمان کے ساتھ پاکستان چلے گئے، اور ہندوستان میں بس وہی رہ گئے ہیں جن کو ایمان سے زیادہ اپنا گھر بار عزیز ہے اس لئے ہماری بڑی آرزو تھی کہ یہ حضرات ہندوستان آئیں اور دیکھیں کہ مشکلات اور آزمائشوں کے باوجود اسلام اور ایمان کی متاع کو کس طرح سینوں سے لگائے ہوئے ہیں۔"

مفکر اسلام حضرت مولاناؒ کی شخصیت سے عرب مہمان خوب اچھی طرح واقف تھے۔ لیکن ان کے لئے یہ انکشاف اور مسرت بخش تجربہ تھا کہ ان کے چھ سات کروڑ دینی بھائی پچاس کروڑ غیر مسلم برادران وطن کے درمیان اسلام و ایمان کا پرچم سربلند رکھے ہوئے ہیں۔ اس موقع پر حضرت مولاناؒ نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں ان مہمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ:-

"ہندوستانی مسلمان خدا کے فضل سے بڑی حد تک اسلام کے معاملہ میں خود کفیل ہیں۔ وہ اسلام کے اولین اور حقیقی سرچشموں کتاب وسنت اور اسلام کے اولین علم برداروں کی سیرت وکردار، ان کی قربانی وایثار، ان کی اولوالعزمی اور حوصلہ مندی کی جلائی ہوئی شمع سے روشنی حاصل کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنا عقیدہ وایمان اپنی جان ومال اسلام کے چمکتے ہوئے سورج کے ساتھ وابستہ کیا ہے، مسلم اقوام یا عرب ممالک کے ڈوبتے ابھرتے ستاروں اور ٹمٹماتے ہوئے چراغوں سے نہیں، وہ آنکھ بند کرکے ان میں سے کسی کی انگلی پکڑ کر چلنے والے نہیں، انھوں نے اللہ کے بھروسے پر یہ فیصلہ کیا ہے کہ ان کو اسلام اور اسلامی تعلیمات کو سینے سے لگائے رکھنا ہے، خواہ دنیا کی کوئی قوم عرب ہو یا عجم اس سے بے تعلقی اور روگردانی اختیار کرے۔"

حضرت والا نور اللہ مرقدہٗ کے ان الفاظ میں ہندوستانی مسلمانوں کا اسلام کے تئیں جو وفاداری، سچی محبت، اخلاص، اور اسلام کے فروغ کے لئے عظیم قربانی کا حوصلہ اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ اسلام کو اس کے اولین سرچشمے سے اخذ کرتے ہیں اور یہ کہ ان کی غیرت کسی اور کی طرف دیکھنے کی روادار نہیں صاف عیاں ہے، حضرتؒ نے جس خود اعتمادی کے ساتھ مسلمانوں کی ترجمانی فرمائی، عرب مہمان بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔

اس اجلاس میں بہت سے مفید اور پرمغز مقالات پیش کئے گئے، عربی مقالات اور تقریروں کی ترجمانی ندوہ کے اساتذہ اور فضلاء بڑی برجستگی اور روانی سے کرتے، اور اردو میں کی ہوئی تقریروں کے خلاصے بھی عربی میں پیش کئے جاتے رہے، پنڈال میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی عربی زبان میں گھنٹوں پروگرام میں عوام کی شرکت اس ذوق وشوق سے ہوتی رہی جیسے وہ ان مقالات وتقریروں کی روح سے آشنا ہی نہیں بلکہ اس کے مفہوم ومعنیٰ کے ذواق ہیں۔ سامعین کی بڑی تعداد عربی زبان سے ناواقف تھی، لیکن پروگرام کے دوران ایسا سکون، ایسی سنجیدگی اور سکینت کا مشاہدہ ہوتا رہا کہ دل ونگاہ نے ایسا منظر دیکھا نہیں تھا۔

یہ اجلاس حضرت والاؒ نے اس لئے نہیں منعقد کرایا تھا کہ ندوہ کو مالی وسائل فراہم ہوجائیں اور اس کی تشنہ عمارتوں کی تکمیل ہوجائے لیکن جب ندوہ کے کاز اور کام اور اس کی افادیت ونافعیت نیز صلاحیت وصالحیت کو دیکھ کر بعض عرب مندوبین کی طرف سے اس موقع پر مالی تعاون کی پیش کش کی گئی تو بعض حلقوں کی طرف سے بدگمانیوں کے اشارے محسوس کئے گئے۔

حضرت نور اللہ مرقدہٗ نے اس موقع پر برمحل، برجستہ، پرمغز اور ولولہ انگیز تقریر فرمائی۔

"اس جشن تعلیمی کا مقصد محض دعوت ہے، اور ہندوستان میں جو تعلیمی اصلاحی اور تجدیدی کوششیں ہوئی ہیں ان کی ایک تصویر ممالک اسلامیہ کے اہل علم ودانش کے سامنے رکھ کر ان کے تجربات وخیالات سے فائدہ اٹھانا ہے، اور بس! اس جشن کے انعقاد کے فیصلے سے آج تک کبھی حاشا وکلا اس کے ذریعہ حصول زر کا خیال بھی حاشیۂ دماغ میں نہیں آیا بعض عرب ممالک کے نمائندوں نے جن امدادی رقوم کا اعلان کیا ہے وہ ہماری منشا کے خلاف ہے"۔

حضرتؒ نے بڑے مؤثر اور جذباتی انداز میں مزید فرمایا:-

"یہ سونے کی چڑیاں تو اڑ جائیں گی لیکن ہمارے مدارس ہندوستان ہی کے مسلمانوں کے تھوڑے تھوڑے عطیات سے چلتے رہیں گے، ہم ان دولتمند ممالک کے سامنے کاسۂ گدائی لے کر نہیں جاتے اگر ایسا ہوتا تو آج ہماری دعوت پر ممالک عربیہ اسلامیہ کے اتنے جلیل المرتبت اشخاص یوں کھنچے چلے نہ آتے"۔

ہندوستانی مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"ہم آپ کو چھوڑنے والے نہیں ہیں، آپ جو چار آٹھ آنے دیں گے وہی ہمارے لئے اصل نعمت ہیں، کیونکہ یہ ہمارے مہمان جو کچھ دیں گے وہ اللہ کی ان دی ہوئی بے شمار دولت کا ایک چھوٹا سا حصہ ہوگا، اور آپ کا عطیہ آپ کی گاڑھی کمائی کا پیسہ ہے، یہ بات ہمیشہ ملحوظ رہنی چاہئے کہ ہم پیسوں کی خاطر اصول کا سودا کبھی نہیں کرسکتے، اب ہماری قسمت اسی ملک کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس لئے ہم اس ملک کی فلاح وبہبود کی خاطر اس کو ایک پیغام دینا چاہتے ہیں اور اس مہرجان تعلیمی (جشن تعلیمی) کا یہی اصل مقصد ہے"۔

حضرت مولانا کی تقریر کے ایک ایک لفظ سے خلوص وصداقت، غیرت وحمیت، خودداری اور خود اعتمادی کا چشمہ ابل رہا تھا، اس سے حاضرین بے حد متاثر ہوئے۔

اس اجلاس نے خوش سلیقگی، سنجیدگی، صفائی، ستھرائی اور مہر ومحبت اور اپنائیت کے ایسے تابندہ نقوش قائم کئے جس سے شرکاء اجلاس

کافی متأثر ہوئے۔ عباسیہ ہال میں جہاں ہندوستان کی پوری علمی ادبی تاریخ کا خاکہ ندوہ کی پچاسی سالہ علمی، فکری، دینی اور ادبی تاریخ کو ڈسپلے بورڈوں کے ذریعہ اس طرح پیش کیا گیا تھا، کہ اس کی پوری روح کشید کر رکھ دی گئی تھی۔ پھر اس کے ساتھ ہندوستان کے ممتاز علماء ادباء، نقاد، مؤرخین، مفسرین، محدثین، اصحاب فکر اور اہل دل کی کہکشاں مستزاد رنگ و نور کا سماں پیش کر رہی تھی، قیام وطعام کا نظم، وضوء اور نماز کا انتظام اس طرح کیا گیا تھا جیسے انگوٹھی میں نگینہ کو فٹ کر دیا جاتا ہے، عرب مندوبین کے قیام کے لئے شہر کے ممتاز ہوٹلوں میں نظم کیا گیا تھا۔ جب کہ ایک بڑی تعداد خانۂ خدا احاطہ کی مسجد میں فروکش تھی، انہیں دور سے آئے ہوئے مہمان بھی تھے، اور اہل دل مشائخ بھی، ایک طرف حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڈھی رحمۃ اللہ علیہ دل ونگاہ کی انگیٹھی گرما رہے تھے تو دوسری طرف داعی کبیر حضرت مولانا عبید اللہ صاحب بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ دعوت وارشاد میں منہمک دین کی ساتی گری میں مصروف تھے، رب کے حضور میں اجلاس کی کامیابی کے لئے تضرع والحاح کے ساتھ دعاؤں میں مصروف وہ مخلصین بھی تھے جو اعتکاف کی نیت سے اپنے مالک کے دربار میں حاضر تھے، اور ہمہ وقت اس اجلاس کی کامیابی اور مقصد میں نیک نامی کی بھیک مانگ رہے تھے۔ ان مخلصین کے لئے پنج وقتہ نمازوں کے سوا فجر کی نماز کے بعد حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے خصوصی وقت فارغ کیا تھا۔ فجر کے بعد حضرت کا بیان ہوتا تو سارا مجمع سمٹ کر پروانوں کی طرح مسجد میں آجاتا، اس موقع پر حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی مؤثر تقریریں فرمائیں۔ جس میں معاشرہ کی بگڑتی ہوئی حالت، بے حیائی، دین سے دوری نوجوانوں کی بے راہ روی، اخلاص ومروت کی کمی، بد اخلاقی کی گرم بازاری اور معاملات میں بگاڑ، تعلقات کی خرابی، دیدہ ودل کی بربادی کا بڑے مؤثر انداز میں تذکرہ ہوتا۔ صبح کی یہ تقریریں جشن کا ایک بہت اہم حصہ قرار دی جاسکتی ہیں، ان تقریروں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ امانتیں اور سوغاتیں اس منتخب اور چیدہ مجمع کو دیکھ کر جو طلب صادق کے جذبہ سے آیا ہے، مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے پورے اخلاص ودلسوزی کے ساتھ ایک ایک کر کے یہاں پیش کر دیں ؎

امیر جمع ہیں احباب درد دل کہہ لے
پھر التفات دل دوستاں رہے نہ رہے

ملت کے نام پیغام

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"میں اس وقت جو کہنا چاہتا ہوں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ دین جو اللہ نے اپنے فضل وکرم سے ہم کو عنایت کیا ہے اور جس کی وجہ سے ہم حقیقت میں انسان کہلانے اور دین ودنیا کی ساری نعمتوں کے مستحق ہیں، یہ دین نہ قیاسات پر مبنی ہے نہ خواہشات پر، لیکن اس سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ دین ودنیا کا فرق کیا ہے؟

دنیا وہ ہے جو آدمی اپنے قیاس، ظن وتخمین، اپنی عقل وتجربہ، اپنی ذہانت یا اپنے اندر کے تقاضے سے برتتا ہے اور دین وہ ہے جو اس کو اوپر سے ملتا ہے، دین ودنیا کو جو چیز علاحدہ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ دنیا سراسر قیاس اور خواہش پر مبنی ہے اور دین سراسر وحی الٰہی اور حکم الٰہی پر مبنی ہے، دنیا میں نفس کی تسکین... اور دین میں رضائے الٰہی اور حکم الٰہی پر اس کی نظر ہوتی ہے اور طاعت کا جذبہ کام کرتا ہے یہ ایک بہت موٹی سی بات ہے لیکن لوگوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ دین ودنیا کا فرق کیا ہے؟"

مزید فرمایا:

"بھائیو! اطاعت کی اور تعمیل حکم کی عادت ڈالنی چاہئے اس کے کسی چھوٹی سی چھوٹی بات پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا، جن کو بات ماننے کی عادت نہیں ان پر ہرگز بھروسہ نہیں کیا جاسکتا، بات ماننے کی عادت ڈالئے۔ مسلمانوں کا مزاج اگر ہندوستان میں یہ بن جائے تو انشاء اللہ ساری مشکلیں آسان ہو جائیں"۔

اخیر میں بڑے جذباتی انداز میں آپ نے فرمایا:

"معلوم نہیں آپ کا ملنا پھر کبھی ہو نہ ہو۔ میرے بھائیو! میں اس بات کو پھر آپ کے سامنے دہراتا ہوں، آپ اپنے طرز زندگی کو بالکل یگانہ اور بالکل جداگانہ اور نمایاں کیجئے کہ دور سے معلوم ہو کہ یہ مسلمان کا محلہ ہے، یہ مسلمان کا گھر ہے، یہ مسلمان کی دوکان ہے، یہ مسلمان کا مکان ہے ؎

بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی

اس طرح بن جائیے جیسے ایک چراغ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں جل رہا ہو، برسات کی اندھیری رات میں ایک جگنو بھی نظر آجاتا ہے تو آپ کیوں نہ نظر آئیں گے؟ پتھروں کے ڈھیر میں جس طرح ہیرے ہوتے ہیں اس طرح آپ ہیرے بن جائیے، سب سے سارا مسئلہ آپ کا حل ہے، مسئلہ اس کے بغیر حل نہیں ہو سکتا کہ آپ کی زندگی پرکشش ہو، آپ کی زندگی میں ایک جادو

ہو، موہنی ہو جو دیکھے آپ کا کلمہ پڑھنے لگے۔

یہاں سے آپ صرف یہ کہتے ہوئے نہ جائیں کہ خوب اجتماع ہوا، ایسے عربوں کو دیکھا، ایسے عالموں کو دیکھا اور اتنے نمازی تھے اور اتنی رونق تھی اور اتنا بڑا مدرسہ دیکھا، آپ یہ چیزیں لے کر جائیے اور لوگوں تک پہونچائیے۔"

(روداد چمن ص ۲۱۹)

ندوہ کا جشن تعلیمی جب اختتام کو پہونچا تو ہر طرف سے تہنیت و تبریک کی صدائیں بلند ہوئیں، اجتماعی زندگی میں ایک قوت محسوس کی گئی تو انفرادی زندگی بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ عربی زبان کی طرف ذوق و شوق پیدا ہوا۔ مدارس عربیہ میں اس نہج پر غور کیا جانے لگا اور عصری اداروں کے پردہ بھی رشک کی نگاہ سے دیکھنے لگے بقول رشید کوثر فاروقی:

"سب سے بڑا کارنامہ اس اجلاس کا میرے نزدیک یہ ہے کہ اس نے علماء کے وقار کو بحال کیا ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ مسلمانوں میں بصیرت پیدا کردی ہے۔"

اس تاثر کی جھلکیاں میں نے تقریباً ہر چہرے پر دیکھی خصوصاً سیکڑوں مغرب زدہ نوجوانوں کو اپنی تہی دامنی، کوتاہی اور بے سوادی پر متاسف پایا اور انھیں باہم گفتگو کرتے بھی سنا کہ علم دین نہیں تو علم دنیا سراب محض ہے۔ مدرسوں میں ترانوں کا رواج ہوا اور اپنے اکتسابات پیش کرنے کی خواہش انگڑائی لینے لگی۔ لیکن جو ندوہ کے پچاسی سالہ اجلاس کی روح تھی وہ پھر نظر نہ آئی ؎

زفرق تا قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

جشن روحانی

امام حرم مکی شیخ عبد العزیز بن عبد اللہ آل الشیخ کی آمد

دیدہ و دل فرش راہ

ابھی آپ دار العلوم ندوۃ العلماء کے جشن تعلیمی کی عطر بیز نکہت ریز اور نشاط انگیز فضاء، نورانی ماحول، ایمانی غیرت، اسلامی جوش و خروش اجتماعی روح اخوت کی پاسداری، ذمہ داریوں کا احساس، ذمہ دار معاشرہ کی صفات اور اسکے حاملین کا تذکرہ اور زخمۂ دل اور بربط احساس سے اٹھتے ہوئے سرمدی نغموں کی سامعہ نوازی سے محظوظ ہو رہے تھے۔ اب کشاں کشاں اس بارگاہ میں ایک دفعہ پھر حاضر ہوتے ہیں۔ حرمین شریفین سے اٹھنے والا ابر، ابر رحمت ہوتا ہے۔ اس کے رشحات سے دل کی کھیتی ہری اور فکر کو قوت علم کو گیرائی اور ذہن کو توانائی حاصل ہوتی ہے۔ ٹھیک دو سال بعد دار العلوم ندوۃ العلماء کے ذمہ داروں کو یہ خبر موصول ہوئی کہ حرم مکی کے امام حضرت الامام شیخ عبد العزیز بن عبد اللہ آل الشیخ اپنے دو اہم رفقاء (شیخ سعید جندول اور ورلڈ مسلم یوتھ آرگنائزیشن کے نائب سکریٹری ڈاکٹر احمد توتونجی) کے ہمراہ دار العلوم ندوۃ العلماء کی زیارت، اور اس کے ناظم مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی رح کی خدمت میں حاضری کی غرض سے آنے والے ہیں۔ حرم مکی کے امام کا ہندوستان کا یہ پہلا دورہ تھا۔ شیخ حرم عبد العزیز بن عبد اللہ آل الشیخ اس خانوادے کے چشم و چراغ تھے۔ جس کے دینی خدمات اور فکری اسلامی قیادت کو سعودی عرب میں نہ صرف قبول کیا جاتا ہے بلکہ اس خانوادے کے ساتھ حکومت کا معاملہ بھی خادمانہ اور قدردانہ ہے۔ اور عوام میں احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ حضرت والا نور اللہ مرقدہٗ کے امام حرم مکی کے قبلہ والد شیخ عبد اللہ بن حسن (جو اپنے وقت میں سعودی عرب کے قاضی القضاۃ تھے) سے گہرے اور مخلصانہ روابط اس وقت سے تھے جب۔ شیخ عبد العزیز بن عبد اللہ امام حرم مکی ابھی بہت کم سن تھے، اسی مناسبت سے وہ اپنی تقریروں میں حضرت رح کو ابونا او روالدنا کے الفاظ سے مخاطب کرتے تھے۔ اور شاید یہی وہ محرکات تھے کہ انھوں نے ہندوستان آنے کا قصد کیا اور حضرت رح کی خدمت میں محبت و عقیدت کی سوغات پیش کرنے کی غرض سے دار العلوم میں حاضری کی اطلاع بذریعہ ٹیلی گرام بھجوائی۔ یہ وفد ۳۱؍ جنوری کو دہلی پہونچنے والا تھا۔ دو دن دہلی میں گذار کر ۳؍ فروری ۱۹۷۶ء کو لکھنؤ میں تشریف آوری کے چرچے تھے۔ لکھنؤ کے قصبات دیہات اور نواحی اضلاع اور دور دراز علاقوں سے ایک دن پیشتر ہی اتنے مہمان لکھنؤ پہونچ چکے تھے کہ کوئی گھر مسلمانوں کا ایسا نہ تھا جہاں دو چار مہمان موجود نہ ہوں، اس میں یہ جذبہ بھی کارفرما تھا کہ حرمین شریفین کی حاضری کی سعادت ملے نہ ملے کم از کم حرم مکی کے امام کے پیچھے نماز ادا کی جائے یہ بھی ایک بڑی سعادت ہوگی۔ اہالیان لکھنؤ دو سال قبل منعقد ہوئے مہرجان تعلیمی کی خوشگوار اور سحر آگیں یادوں سے

مسحور ہی تھے کہ مذکورہ تاریخ میں اس تاریخی
شہر کے در و دیوار نعرۂ تکبیر کی صداؤں سے
پھر گونج اٹھے اور چشمۂ فلک نے سرزمین لکھنؤ
پر وہ کمال دیکھا جس کی روح پرور یادیں آنے
والی نسلوں کو ایمان و یقین کی حرارت سے
مدتوں گرم کرتی رہیں گی۔

یوں تو سرزمین مقدس سے آنے
والے معزز مہمانوں کے استقبال کے لئے کئی
روز پہلے سے پورا لکھنؤ چشم براہ تھا، اور
دیدہ و دل فرش راہ کر چکا تھا لیکن ۲ر فروری
کی شب خصوصیت کے ساتھ اہالیان لکھنؤ نے
عالم انتظار اور اضطراب میں گذاری اور صبح
ہوتے ہی یوں محسوس ہوا کہ جیسے ایمان کی
باد بہاری اموسی ہوائی اڈے کے رخ پر
چل پڑی ہے۔ حکومت نے اموسی تک خصوصی
مواصلات کا نظم کیا تھا اور سیکڑوں کاریں
اسکوٹروں کے قافلے کشاں کشاں مرکز نقل
اموسی کی طرف رواں دواں تھے۔

استقبال کا منظر

ندوہ سے اموسی ہوائی اڈہ تک متعدد
خیر مقدمی گیٹ بنائے گئے تھے۔ عالم باغ میں
سکھوں نے استقبالیہ گیٹ سے شاہراہ کو سجایا
تھا اور جا بجا شہری انجمنوں اور اداروں
نے بھی اس موقع پر اپنی محبت و سپاس کے
اظہار کے لئے قوس قزح کا نذرانہ پیش کیا تھا
اموسی ہوائی اڈے پر امام حرم کے استقبال کے
لیے اپنے محبوب رہنما شیخ جلیل مفکر اسلام
حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے ہمراہ
ایک بڑا مجمع امنڈ آیا تھا۔ جس وقت ہوا کے
دوش پر جانب مغرب سے آتا ہوا امام حرم کا
جہاز اموسی ہوائی اڈے پر اترا، پوری فضا
نعرۂ تکبیر کی صدا سے گونج اٹھی۔ پھر یہ ایمانی
اور روحانی کارواں دریاؤں کی طرح امنڈتے
ہوئے محیط علم دار العلوم ندوۃ العلماء کی وسعتوں
میں ٹھاٹھیں مارتا ہوا انسانی سمندر میں تبدیل
ہو گیا۔ معزز مہمانوں کے استقبال کے لئے عباسیہ
ہال کے پچھلے حصہ پر جو اس کے وسیع میدان کی طرف
تھا، اسٹیج بنایا گیا تھا۔ عباسیہ ہال جو اس وقت کا کتب خانہ
تھا جہاں جشن تعلیمی کے بہت سے بیش قیمت دیدہ زیب
باقیات سجائے ہوئے رکھے تھے جو دار العلوم ندوہ
کے فارغین کے اکتسابات اور ہند کے عہد زریں کی
قدآور شخصیتوں کے تذکرے اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے
تھے۔ سائنہ کے لئے حضرت والاؒ کے ہمراہ معزز
مہمانوں کو وہیں لے جایا گیا۔ تھوڑی دیر اس ماحول
میں جس کا ہر منظر دیدہ و دل کو اپنی طرف کھینچ رہا
تھا اور دعوت فکر و نظر دے رہا تھا) گذارنے کے
بعد مہمانوں کو اسٹیج پر لایا گیا۔ تا حد نظر انسانوں کا
بحر مواج تھا جس کی لہریں مسجد، دار العلوم، ہاسٹل
فیلڈ اور پارکوں، نیز عمارتوں کی چھتوں پر رواں
تھیں۔

سپاس نامہ

ٹھیک گیارہ بجے مولانا قاری ودود الحیؒ
ندوی کی دلنواز قرأت قرآن پاک سے جلسہ کا آغاز
ہوا۔ سپاسنامہ عربی میں دار العلوم ندوۃ العلماء
کے استاذ ادب (موجودہ کلیۃ اللغہ کے عمید)
جناب مولانا واضح رشید ندوی مدظلہ نے اپنے
مخصوص لب و لہجہ میں پیش کیا۔ جس کا ترجمہ
ندوہ کے موجودہ مہتمم جناب مولانا سعید الرحمان
اعظمی ندوی دام مجدہٗ نے پڑھ کر سنایا، بلا شبہ اس میں
نور ایمان و یقین کی کرنیں بھی تھیں، جذبات تشکر
و امتنان کی فراوانی بھی اور جرأت و حق گوئی کے
بصیرت افروز مظاہر بھی۔ ان تمام محاسن کی قوس قزح
نے سپاس نامہ کو شاہکار بنا دیا تھا۔

عالی مرتبت حرم مکی کے امام حضرت شیخ
عبد العزیز بن عبد اللہ آل الشیخ اور ان کی ہمرکابی
میں وارد مؤقر وفد کے ارکان کو مخاطب کرتے
ہوئے اس سپاسنامے میں کہا گیا تھا کہ ـــــ

" آج تاریخ بڑی امیدوں اور آرزوؤں
کے ساتھ آپ کی طرف دیکھ رہی ہے۔ وہ سانس
روک کر اس کی منتظر ہے کہ آپ اس نازک موقع
پر دنیا کے سامنے کیا کردار پیش کرتے ہیں
وہ اشتیاق و بے چینی اور کسی قدر اندیشہ کے
ساتھ آپ کی طرف نظریں لگائے ہوئے ہے
آج آپ کے شاگرد اور خوشہ چیں جن کو علم و
ایمان اور حدیث و قرآن کے اس خوان نعمت
کی ریزہ چینی پر فخر ہے آپ سے اس کے سوا
کسی اور چیز کے سائل نہیں کہ آپ اس عظیم
اور تاریخ ساز کردار کو دنیا کے اسٹیج پر پھر
پیش کریں جس کے ساتھ نسل انسانی کی قسمت
وابستہ ہے، آپ سے عالم اسلام کی آنکھیں پھر
ٹھنڈی ہوں اور مجروح انسانیت کو اپنے
زخم کا مرہم اور اپنے درد کا درماں ملے۔"
(منقول تعمیر حیات ۱۰ فروری ۷۷ء)

امام حرم مکی کا خطاب

اس کے بعد دار العلوم ندوۃ العلماء کے
ناظم مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن
علی ندوی نور اللہ مرقدہٗ نے امام محترم کو
دعوت دی، چنانچہ امام حرم وقار و متانت
کا پیکر اور فضل و تقدس کا مجسمہ بن کر مائک کے
سامنے کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ:

اسلامیان ہند کے لئے شیخنا ابو الحسن
علی ندویؒ اور ندوۃ العلماء ایک مینارۂ نور
کی حیثیت رکھتے ہیں، جس سے ہر شخص کو فیضان

حاصل کرنا چاہیے۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء جیسے عظیم ادارہ کے وجود پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا۔

"ہمارے اور آپ کے درمیان اسلام کا رشتہ ہے اور یہ تعلق دنیا کے تمام تعلقات سے زیادہ قوی ہے اور ہم صرف اسی رشتۂ اخوت کے باعث آپ سے ملنے اتنی دور سے چلے آئے ہیں۔ سامعین کو مخاطب کرتے ہوئے مزید آپ نے فرمایا کہ آفتاب اسلام طلوع ہو جانے کے بعد اب دنیا میں کسی مذہب کی گنجائش نہیں ہے۔ اللہ عز وجل کا ارشاد ہے "اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَام" اور جو کوئی شخص اس کے علاوہ کوئی اور مذہب اختیار کرتا ہے وہ مسلسل خسارے میں ہے۔ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ... اسلام کی تعلیمات کو اپنی عملی زندگی میں رچا کر ہی ہم بنی نوع انسان کی کوئی خدمت کر سکتے ہیں۔ دینی علمی اور تعلیمی میدانوں میں امام محترم نے حضرت مولانا رح کا بڑے اونچے الفاظ میں تذکرہ کیا، اور ندوہ کی ان مساعی کو دینی علمی اور تعلیمی میدانوں میں شاندار الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا۔

امام حرم کی تقریر کا سلیس اور شگفتہ اردو ترجمہ استاذ ادب (موجودہ مہتمم) جناب مولانا سعید الرحمان صاحب ندوی نے کیا۔

اس کے بعد سعودی عرب کے نائب وزیر تعلیم شیخ سعید جندول اور انجمن شباب اسلامی ریاض کے جوائنٹ سکریٹری ڈاکٹر احمد توتونجی نے حاضرین سے خطاب کیا، جس کا برجستہ رواں ترجمہ مولانا اسحٰق جلیس ندوی رح اور مولانا ڈاکٹر حبیب الحق ندوی رح نے کیا۔

حضرت مولانا رح کا خطاب

آخر میں حضرت مولانا نور اللہ مرقدہٗ نے اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

آج کا دن ہماری تاریخ کی ان چند عظیم مسرتوں اور مبارک تقریبوں میں شمار ہوگا جس کو ملت اسلامیہ ہند کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ مولانا کے خطاب میں آمد کا زور اور جذبات کے سیل رواں کا شور تھا۔ ایسی ولولہ انگیز تقریر تھی کہ پورا مجمع دم بخود ساکت وصامت اسٹیج کی طرف نظر جمائے حسن استماع کا مظہر تھا۔ لفظ لفظ سے خلوص و صداقت کا چشمہ ابلتا محسوس ہو رہا تھا، دل کی دنیا فرط مسرت سے نہال تھی حضرت مولانا نور اللہ مرقدہ نے معزز مہمانوں کا نہایت گرم جوشانہ خیر مقدم کرتے ہوئے فرمایا۔

بلاشبہ آپ اس سرزمین قدس سے تشریف لائے ہیں جسے ہر مرد مومن اپنا قیمتی ورثہ تصور کرتا ہے۔ وہ سرزمین جو دین کا مرکز اور ہدایت کا منبع ہے، وہیں سے ساری دنیا کو ایک عظیم پیغام اور ایک ہمہ گیر روشنی کی دولت ملی ہے۔ آج یہ نظر کے سامنے انسانی جسموں کا جو سیلاب امنڈ رہا ہے، بیتاب جذبات، عقیدت ومحبت کے اشکوں اور بیدار دل وضمیر کی سوغات لے کر آیا ہوا تا حد نظر فرزندان اسلام کا یہ عظیم اجتماع اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ یہ مہمان کرام جس پیغام کے امین اور جس دعوت و تبلیغ کے باعث لائق صد احترام ہیں، ہم مسلمانان ہند کا حق اس اسلام پر کسی اسلامی ملک سے کم نہیں ہے۔

از دل خیزد بر دل ریزد

بڑی پر تاثیر اور مرتعش آواز میں مزید فرمایا:

مجھے بحمد اللہ خدا نے جرأت وحق گوئی عطا کی ہے اس لیے ان معزز مہمانوں سے ڈنکے کی چوٹ پر کہتا ہوں، اور لکھنؤ والے نہ بھولے ہوں گے میں نے دو سال قبل اسی میدان میں عرب ممالک کے بکثرت نمائندوں کی موجودگی میں بصراحت حقیقت کا اظہار کیا تھا کہ بلاشبہ درست ہے۔ ہمیں اسلام کی قیمتی امانت آپ ہی کے نامور اسلاف کے ذریعہ ملی تھی، لیکن ہم نے اس ملک میں اسلام کی حفاظت وبقا اور ترویج واشاعت کی جو محیر العقول جدوجہد کی ہے اس کو آپ ملاحظہ فرمائیے۔ اس پر ہندوستان کا چپہ چپہ شاہد ہے اور آج بھی اس عظیم اجتماع کو شاہد بنا کر کہتا ہوں، سامنے مسجد کی میناروں کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ ہم ہندوستانی مسلمان اپنے اسلام میں کسی ملک کے مسلمان سے پیچھے نہیں ہیں۔

اسلام کا جو فرض ہم پر ہے اور ہمارا اسلام پر ہے، ہم اسے بخوبی جانتے ہیں۔ ہم بحمد اللہ اپنی اس ذمہ داری سے ہمیشہ بحسن وخوبی عہدہ برآ ہوتے رہے ہیں، اور کیوں نہ ہوں؟ ہم اس ملک کے مالی اور چمن آرا ہیں۔ محمد بن قاسم کی اس سرزمین پر آمد سے لے کر آج تک ہم نے اس ملک کو سنوارنے میں اپنی پوری توانائی اور بہترین صلاحیتیں صرف کی ہیں، ایسی صورت میں فطرت کا تقاضا ہے کہ ہم اس ملک کو تاراج ہوتے اس کا نقشہ بگڑتے، یا اس کا کوئی نقصان ہوتے کسی طرح گوارا نہیں کر سکتے۔

خاک وطن کا ذرہ ہمیں عزیز ہے

پھر حضرت والا رح نے بڑی خود اعتمادی اور باوقار انداز میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

"خاک وطن کا ہر ذرہ ہم کو عزیز ہے

امام حرم کی آمد پر نماز جمعہ سے قبل کا ایک منظر

شبلی کتب خانہ

رواق اطہر

رواق شبلی

رواق سلیمانیہ

دارالعلوم ندوۃ العلماء کا ایک عمومی منظر

دارالعلوم ندوۃ العلماء کا عقبی منظر

دفتر تعمیر حیات دفتر نظامت کی عمارت۔ ایک منظر

اس کی پوری تاریخ اور یہاں کے آثار و مشاہد ہماری عظمت پارینہ کا شاہد عدل ہیں۔ تاج محل کا حسن، قطب مینار کی بلندی، جامع مسجد شاہجہانی کا شکوہ و جلال اور لال قلعہ کی سطوت و عظمت اس حقیقت کی شہادت دیتی ہے کہ ؂

ابھی اس راہ سے گذرا ہے کوئی
کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی

نماز جمعہ کا منظر

جلسہ کا اختتام جمعہ کی اذان پر ہوا، اس وقت تک مجمع کا عالم یہ ہو چکا تھا کہ جدھر دیکھئے تا حد نظر امنڈتا ہوا انسانی سیلاب تھا۔ ندوہ میں کوئی جگہ باقی نہیں تھی جہاں لوگ صف بچھائے بیٹھے نہ ہوں۔ لکھنؤ کے اطراف سے بسوں ٹرینوں اور نجی گاڑیوں کے ذریعہ بے شمار لوگ امام حرم مکی کے پیچھے نماز جمعہ ادا کرنے کے لئے آگئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ شہر کی مسجدیں اس دن نمازیوں سے خالی تھیں۔ مجمع بڑھتے بڑھتے ہنومان سیتو۔ یونیورسٹی روڈ تک پہونچ گیا تھا، نمازیوں نے ہنومان مندر کے دروازے تک صفیں قائم کرلی تھیں۔ محتاط اندازے کے مطابق تین لاکھ سے زائد فرزندان توحید نے امام حرم مکی کی اقتدا میں نماز جمعہ ادا کی۔

نماز کے بعد بڑی مشکل سے امام حرم کو مہمان خانہ تک لے جایا گیا۔ مجمع ایک نظر دیکھنے کا شوق تھا، مہمان خانہ کے روبرو مجمع بے قابو ہو رہا تھا۔ حضرت رح کی اجازت سے مہمان مکرم امام حرم کو تین دفعہ تھوڑے تھوڑے وقفہ سے مہمان خانہ کی اوپری چھت پر لے جایا گیا تاکہ لوگ اپنے امام حرم مکی کی زیارت کرسکیں۔ وہ منظر عجیب دید نی کا تھا اسی دن شام کے پانچ بجے دینی تعلیمی کونسل کی جانب سے کلارک اودھ ہوٹل میں معزز مہمانوں کو استقبالیہ دیا گیا۔ سپاسنامہ عربی میں جناب مولانا سعید الرحمان صاحب ندوی نے پیش کیا جس میں گراں قدر مہمانوں کا استقبال اور دلی مسرت کے اظہار کے ساتھ اس حقیقت کا اعتراف کیا گیا تھا۔

"ہمارا دین تقاضا کر رہا تھا کہ ہم اپنے جگر گوشوں کو دینی تربیت اور قرآن و سنت کی تعلیم دیں اس مقصد کے لئے مسلمان اہل علم ماہرین تعلیم و تربیت اور مفکرین ملت کے مشورے سے ۱۹۵۹ء میں دینی تعلیمی کونسل کا قیام عمل میں آیا جس کو اولین یوم سے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رح کی سرپرستی حاصل ہے، جن کی شخصیت سارے عالم اسلام میں اپنے درد مند و پر سوز دل، اپنی بلند نگاہی اپنی وسعتِ علمی و دقت نظری نئے رجحانات اور جدید علوم سے اپنی واقفیت اپنی علمی تصنیفات و دیگر خدمات اور اپنی دینی تڑپ کے لئے مشہور ہے۔

اسی دن مغرب کے بعد لکھنؤ کا تاریخی پارک بیگم حضرت محل میں مہمانان کرام کو اہالیان شہر کی جانب سے استقبالیہ دیا گیا تھا۔ یہ اجتماع حضرت نور اللہ مرقدہ کی صدارت میں شروع ہوا شہر کی مختلف تنظیمیں اس اجتماع میں پیش پیش تھیں۔ مولانا محمد رضوان ندوی رح نے شہریوں کی جانب سے عربی میں سپاسنامہ پیش کیا۔ خیر مقدمی کلمات کے بعد امام حرم کو دعوت دی گئی۔ انھوں نے اپنی آمد اور لکھنؤ میں اس عظیم استقبال کو دیکھ کر تاثر آمیز خطاب کیا۔ آخر میں حضرت نور اللہ مرقدہ نے بڑی پرمغز ولولہ انگیز تقریر فرمائی جس میں شہریوں کو اس محبت کی لو کو مزید بڑھانے اور دین کے فروغ و اشاعت کی کوششوں میں جدو جہد کی دعوت دیتے ہوئے آپ نے فرمایا تھا۔

"آج اس موجزن انسانی سمندر کو دیکھ کر تحریک خلافت کے عہد شباب کی یاد تازہ ہو رہی ہے۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ معزز مہمان جو اسٹیج پر جلوہ افروز ہیں سونے چاندی کے سکے تقسیم کرنے نہیں آئے ہیں اسکے باوجود صرف ایمانی حمیت اور اس سرزمین قدس اور مرکز اسلام کی محبت کے رشتہ سے یہاں سخت سردی کے موسم میں آپ یہاں جمع ہوئے ہیں جہاں سے یہ حضرات نسبت کا شرف رکھتے ہیں۔ یہ حقیقت اس بات کا بین ثبوت ہے کہ ابھی مذہب کے سوتے خشک نہیں ہوئے ہیں مادیت نے روحانیت پر مکمل غلبہ حاصل نہیں کیا ہے، ابھی دل قبرستانوں میں تبدیل نہیں ہوئے ہیں آج بھی علم کی قدر و منزلت انسانوں میں اپنا احترام رکھتی ہے۔

صرف جذبات کے سہارے کوئی قوم زندہ نہیں رہتی

مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے مزید فرمایا تھا کہ

"آپ کے ان تمام جذبات عقیدت و محبت کے اعتراف و تحسین کے ساتھ یہ بھی عرض کروں گا کہ کوئی قوم صرف جذبات کے سہارے زندہ نہیں رہتی۔ ضرورت عمل کی ہے۔ جب یہ معزز مہمان سرزمین قدس اور سرچشمۂ اسلام کے تعلق رکھنے کے باعث آپ کی اس غیر معمولی عقیدت کا مرکز ہیں، تو پھر اس مرکز اسلام کا جو پیغام ہے اس کو اپنی عملی زندگیوں کا جز بنالیجئے تب ہی اس کا حق ادا ہو سکتا ہے۔ اسلامی کردار سے دوسری قوموں پر اثر انداز ہو لیے، ذخیرہ اندوزی، رشوت خوری اور انسان کشی کو مٹانے کے لئے آگے بڑھیئے۔

آخر میں حضرتؒ نے مسلمانان شہر کو مبارکباد دی کہ انھوں نے محبت و اخلاق، عزت، انسانی قدروں اور غیر معمولی ڈسپلن اور سکون کا مظاہرہ کیا اور شیخ سعید جندول کی پر اثر دعا پر اس مبارک تقریب کا اختتام ہوا۔

تیسرا تاریخ ساز اجلاس

قادیانیت کے خلاف محاذ

حضرت نور اللہ مرقدہٗ کی ذات ایک انجمن تھی درد وسوز وگداز، امت کیلئے اضطراب و بے قراری اس ذات کا طرۂ امتیاز تھا۔ آپ کے سینے میں امت کی زبوں حالی کو دیکھ کر آگ سی لگی ہوئی تھی، دیکھنے والا آپ کو پیکر سکون سادگی و متانت و سنجیدگی کا پیکر، سرور و شادمانی کا مجسمہ تصور کرتا۔ آنے والے کو آپ کی ذات سے سکون ملتا۔ کرب دور ہوتا پریشان خاطری کا ازالہ ہوتا۔ لیکن آپ کے اندر جو کرب تھا۔ اس کو کون پانے والا تھا حضرتؒ کبھی کبھی بڑے درد کے ساتھ اس حقیقت کو اس شعر میں ظاہر فرماتے ؎

ہر کسے از ظن خود شد یار من
واز درونِ من نہ جست اسرار من

حضرت نور اللہ مرقدہٗ صرف امت کی زبوں حالی کے ازالہ کیلئے کوشاں تھے بلکہ آپ کی تگ و دو اور جد وجہد کا ماحصل اسلام کا غلبہ اور عالم اسلام کی سربلندی تھی اس کیلئے وہ زندگی بھر کوشاں رہے۔ اس راہ میں خاروں کی پرواہ نہیں کی، تپتے ہوئے ریگستانوں اور لہراتے ہوئے سبزہ زاروں اور خوشنما پارکوں اور دلآویز مرغزاروں میں ان کے لئے اگر کوئی کشش تھی تو اسکا محرک اسلام تھا ؎

آغشتہ ایم ہر سرِ خارے بخونِ دل
قانونِ باغبانیٔ صحرا نوشتہ ایم

محمد عربی علی صاحبہ الصلاۃ والسلام کی محبت و عقیدت آپ کے رگ و ریشہ میں سرایت کی ہوئی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت و مشن کے لئے نقد جاں ہر آن نذر کرنے کیلئے تیار رہتے تھے۔ اس میں کسی کی وہ پرواہ نہیں کرتے کبھی کبھی یہ عربی کا شعر زیر لب گنگناتے ؎

فلیتک تحلو والحیاۃ مریرۃ
ولیتک ترضی والانام غضاب
اذا صح منک الود فالکل هین
وکل الذی فوق التراب تراب

قادیانیت کا فتنہ

اس دور کے فتنوں میں قادیانیت کا فتنہ سب سے خطرناک اور زہرناک ہے اس لئے کہ وہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں بلکہ اپنے ہی کو بزعم خویش مسلمان سمجھتے ہیں اس لئے مسلمانوں کو اس فتنہ سے آگاہ ہونا اور اس کا مقابلہ کرنا ضروری ہے، پاکستان میں جب اس جماعت کو غیر مسلم قرار دیا گیا تو مغرب کی توجہ وعنایات اس پر مزید ہوگئیں برطانیہ میں اس جماعت کا ٹی وی چینل اسلام کے تعارف پر مشتمل اپنے پروگرام برابر پیش کرتا رہتا ہے۔ حالانکہ جو کچھ اس میں پیش کیا جاتا ہے وہ اسلام نہیں بلکہ مرزائیت و قادیانیت ہے لیکن بھولے بھالے لوگ دین سے دوری اور عدم واقفیت کی بنیاد پر ایک طبقہ اس کے سحر کا اسیر ہے افریقہ کے دور دراز کے علاقوں گھنے جنگلوں، وادیوں اور پہاڑیوں میں اس جماعت کے دعاۃ سرگرم ہیں۔ اور مسلمانوں ہی کو کافر بنا رہے ہیں۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مقاصد میں ایسے فتنوں کا سدباب بھی ہے صحیح دعوت اسلامی کا فروغ پہلے دن سے اس کا نصب العین ہے اس لئے ضروری تھا کہ اس موضوع پر غور وفکر کرتے اور اس فتنہ کا سدباب کرنے کے لئے ایک بین الاقوامی اجتماع منعقد کیا جائے، لہٰذا حضرت نور اللہ مرقدہ کے ایماء پر حضرت مولانا عبداللہ عباس صاحب ندوی معتمد تعلیم ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب حسنی ندوی موجودہ ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء اور دیگر اکابر واساتذہ کی ایک نشست میں اس اجتماع کے انعقاد کے ضروری امور طے کرئے گئے۔ اور اس کا پورا نظام اور بیرونی مہمانوں کی دعوت کی ذمہ داری نیز اس کی ترتیب حضرت مولانا عبداللہ عباس صاحب ندوی دامت برکاتہم نے حضرت کی ایماء سے اپنے سر لی اور پوری طرح اس مبارک اجتماع کو کامیاب بنانے کے لئے مصروف ہوگئے۔ الگ اس کا دفتر قائم کردیا گیا۔ بنیادی طور پر اس اجتماع کے تین عنوان مقرر کئے گئے

۱۔ دعوت الی اللہ کے مسائل۔
۲۔ مذہبی تعلیم سے متعلق امور۔
۳۔ باطل اور گمراہ فرقے

اجتماع کا مقصد

اس اجتماع کا انعقاد کسی عجلت میں طے نہیں کیا گیا تھا۔ بلکہ بہت غور وفکر کے بعد اس کے انعقاد کا فیصلہ ہوا تھا۔ اور حضرت نور اللہ مرقدہٗ کی دیرینہ تمنا بھی تھی۔ لہٰذا اس اجتماع کی ضرورت واہمیت اور قادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے

حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب حسنی ندوی دامت برکاتہم نے اپنے خیر مقدمی کلمات میں فرمایا۔

"برصغیر سے انگریزی استعمار فوجی اور سیاسی سطح پر ختم ہوا لیکن اسلام دشمنی اور سازشی طریقہ کار کو جاری رکھنے کے لحاظ سے استعمار باقی اور قادیانیت کے فتنے کے ساتھ ان کی ہمدردی و تعاون برقرار رہا اس کی وجہ سے یہ فتنہ مزید پھیلنے اور بڑھنے لگا. اور ذرائع ابلاغ کی ترقی کر جانے کی صورت میں ان کو بھی اپنی تخریبی کوشش بڑھانے کا موقع مل گیا . اس وقت اس فتنہ کی وسعت بھی بڑھ گئی ہے اور اس میں ترقی بھی ہو رہی ہے، جس کی بناء پر امت اسلامیہ کے نمائندوں کو یہاں تشریف لانے کی زحمت دی گئی ہے۔

اجتماع کے شرکاء اور اس کا مقصد

یہ اجتماع دارالعلوم ندوۃ العلماء کے وسیع وعریض فیلڈ میں اسی شان سے منعقد ہوا جیسے ۱۹۷۵ء میں ندوہ کا پچاسی سالہ جشن ندوہ کی تاریخ کا پہلا اور دینی مدارس و مراکز کا نادر اجتماع تھا۔ حجاز مقدس ریاض، مصر، شام، عراق، الجزائر، لیبیا، تیونس، اور خلیج عرب تک کے متعدد اور معزز نمائندے عرب و ہند کی مشہور یونیورسٹیز کے وائس چانسلر، محققین، اسکالرس اس میں جمع تھے۔

۱۲، ۱۳ر نومبر ۱۹۹۷ء کو ایک بار پھر حضرت مولانا نوراللہ مرقدہ کی دعوت پر مسجد حرام کے خطیب و امام اور حرم مکہ مکرمہ اور حرم مدینہ منورہ کے جملہ امور کے ناظم اعلیٰ، مسجد اقصیٰ کے سابق امام، مدینہ منورہ کی اسلامی یونیورسٹی کے وائس چانسلر، وزارت شئون الاسلامیہ کے ڈپٹی منسٹر اور اسی قدو قامت کے افراد اور عالمی شہرت رکھنے والے اسکالر جیسے عالم عربی کے مشہور سیاست داں کامل الشریف اور ماہر تعلیم محسن بارود رونق اجلاس ہوئے۔

ان کے علاوہ ترکی، انڈونیشیا، ملیشیا سے بھی مؤقر وفود اس اہتمام میں شریک ہوئے۔ وفود کے ارکان میں وہ لوگ تھے جو دین کا اعلیٰ فہم اور دعوت کے کاموں کے ذمہ دار و ذواق تھے اندرون ملک سے قابل ذکر علماء، دعاۃ اور اسکالروں کی ایک بڑی جماعت حضرت نوراللہ مرقدہ کی دعوت پر شریک ہوئی تھی ایک عجیب سماں تھا۔ رنگارنگ پنڈال سامعین سے بھرا ہوا تھا۔ اور ڈائس پر عرب و عجم کا حسین امتزاج قوس و قزح کا سماں پیش کر رہا تھا۔ ایک نورانی سکینت طاری تھی، ڈائس پر حضرت مولاناؒ رونق افروز تھے۔ آپ کے پہلو میں ایک طرف علامہ شیخ سبیل ناظم اعلیٰ شئون الحرمین الشریفین اور دوسری طرف رابطہ عالم اسلامی کے نائب ناظم اعلیٰ شیخ محمد ناصر العبودی، ایک طرف مدینہ یونیورسٹی کے چانسلر اور دوسری طرف سعودی عرب کے مشہور سائنسداں کامل الشریف جلوہ آرا تھے۔

پروگرام کا آغاز

پروگرام کا آغاز کرتے ہوئے جناب ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی زید مجدہ نے فرمایا:

"حضرات اہل مجلس تحیۃ اسلامی قبول فرمائیے۔ آپ کا ہم استقبال کر رہے ہیں اپنے قافلہ سالار اور کاروانِ علم و فکر کے قائد حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (نوراللہ مرقدہ) کی طرف سے دارالعلوم کے طلباء و اساتذہ منتظمین ندوہ کی شاخوں اور ملحقہ مدارس کی طرف سے لکھنو کے مسلمان باشندوں کی طرف سے آپ کا استقبال دین اسلام کے ایک قلعہ میں جو مردانِ علم و فکر کی عقلی و ذہنی تربیت کا کارخانہ ہے اس میں کر رہے ہیں۔

جلسہ کا آغاز قاری محمد ریاض صاحب استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ ندوہ کے مہتمم (موجودہ ناظم) حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب ندوی نے خیر مقدمی کلمات ادا کئے۔ بعد ازاں حضرت مولانا نوراللہ مرقدہ کی بصیرت افروز تقریر ہوئی جس میں اصل موضوع کے علاوہ اس وقت ملک میں مسلمانوں کو جو خطرات درپیش ہیں، نئی نسل کا ایمان داؤں پر لگا ہوا ہے انھیں الحاد کے راستہ پر ڈالنے کی ہر طرف سے جو کوششیں جاری ہیں اس سے بھی باخبر کیا اور اس کے مداوا کیلئے ہندی مسلمانوں پر جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے اس پر کھل کر روشنی ڈالی۔ پوری تقریر اردو میں حضرت نے فرمائی اور حاضرین کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

ملی تشخص کی حفاظت

"اس کے ساتھ یہ بھی آپ نظر انداز نہ کیجئے کہ آپ ایسے ملک میں ہیں جس میں اکثریت غیر مسلموں کی ہے وہ جمہوری ملک ہے اور وہاں قانون ساز مجلسیں قانون بناتی ہیں جب یہ ملک جمہوری ہے تو پارلیمنٹ ہی قانون بنائے گی۔ اور جمہوریت کا یہ قاعدہ ہے کہ اکثریت کی رائے اور تائید سے قانون بنتا ہے اس لئے ہر وقت اس کا خطرہ ہے کہ ایسے قوانین جو ہمارے لئے بنیادی عقائد، مسلمات ہمارے جذبات اور ہماری ضرورتوں کے

خلاف بنیں یہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ مذہبی، تہذیبی اور لسانی بنیادوں پر جارحانہ احیائیت اور کلیت پسندی کی تحریکیں بھی زور شور سے چل رہی ہیں۔ اب آپ کا کام ہے کہ ایسے سیکولر اور جمہوری ملک میں اپنے ملی تشخص کی حفاظت آئینی طریقے پر کریں۔ آپ ہندوستان کے **وفادار**، مفید، کارآمد اور اس کے ضروری اجزاء ہونے کی حیثیت سے اپنی افادیت و اہمیت ثابت کریں اور مطالبہ کریں کہ کوئی قانون ہماری شریعت آسمانی کتاب اور ہمارے عقائد کے خلاف نہیں بنانا چاہیے۔

حضرتؒ نے مزید فرمایا:

"یہ کام آپ کو خلوص کے ساتھ کرنا ہوگا کہ ہر شخص اسٹیشنوں، پارکوں اور بسوں میں آپ کے کرب و بے چینی کو محسوس کرے، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ایک ہفتہ بھی ایسا قانون نہیں چل سکتا۔ میں نے دنیا کے آئینوں اور دستورِ حکومت کا مطالعہ کیا ہے اور جمہوریتوں کی تاریخ پڑھی ہے۔

ملی عزیمت اور اجتماعی فیصلہ

ملت کو درپیش مسائل اور مشکلات بے شمار ہیں ان کے حل کیلئے شاہ کلید کیا ہے۔ ارشاد فرمایا:

حضرات! مسائل و مشکلات کی نہ تعداد مقرر ہے نہ اقسام معین ہیں لیکن ایک شاہِ کلید (MASTAR KEY) ہوتی ہے جو سارے قفلوں کو کھول سکتی ہے اور ساری رکاوٹوں کو دور کر سکتی ہے اس کے لئے زمان و مکان کی بھی قید نہیں اور اسباب و وسائل کی بھی شرط نہیں، وہ شاہِ کلید جس سے ہر قفل کھل سکتا ہے وہ ہے ملی عزیمت اور اجتماعی فیصلہ۔ اگر اس ملک کے مسلمان یہ فیصلہ کرلیں کہ ان کو اپنی آئندہ نسلوں کے مستقبل کا تحفظ اور ان کی تعلیم کے مسئلہ کا حل ہر مسئلہ، ہر مفاد، ہر سہولت ہر عزت، ہر خوشحالی اور ہر کامیابی سے زیادہ عزیز ہے تو یہ مسئلہ ایک دن میں حل ہو سکتا ہے

امت کی بقاء مشروط ہے ختم نبوت کے عقیدے سے

فتنۂ قادیانیت کے نقصانات کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے پرزور الفاظ میں ارشاد فرمایا:

"امت کا باقی رہنا مشروط ہے ختم نبوت کے عقیدے سے، ورنہ یہ اذان نہ رہے گی میں یہ الفاظ بڑی معذرت کے ساتھ کہہ رہا ہوں نہ پانچ وقت کی نمازیں رہنے کا اطمینان ہے نہ قرآن مجید کا اپنے اصلی حروف و نقطہ کے ساتھ باقی رہنے کا پورا اطمینان ہے، پھر امت پچاس امتوں میں سینکڑوں امتوں میں بٹ سکتی ہے، اس کا جو تحفظ ہے عقیدۂ ختم نبوت سے ہے

فرمایا: اس اجتماع میں ایسی مؤقر شخصیتیں ایسے مختلف العناصر اور مختلف القومیات مختلف اللغات، مختلف الجہات علماء اور رہنما شریک ہیں۔ یہ بالکل بروقت ہو رہا ہے، اس وقت اس کی ضرورت ہے کہ یہ فتنہ سر نہ اٹھانے پائے اور اگر سر اٹھا تو اسلام کی ابدیت کے سامنے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاتمیت کے سامنے اس کا سر جھکا دیا جائے اس لحاظ سے یہ بالکل برموقع ہو رہا ہے۔

تحفۃ الندوہ

مرزا غلام احمد قادیانی نے اجلاس ندوہ کے موقع پر جو امرتسر میں ہو رہا تھا موقع سے فائدہ اٹھا کر ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام "تحفۃ الندوہ" رکھا تھا حضرت نے اس سیاق میں فرمایا۔

"ہم آج ایک نیا تحفۃ الندوہ پیش کر رہے ہیں ہم اس جلسہ کے ذریعہ اس جلسہ کی شکل و صورت میں ایک مخلصانہ "تحفۃ الندوۃ" پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ میں نے جب "القادیانی والقادیانیۃ" کتاب لکھی اس وقت مرزا صاحب موجود نہیں تھے، ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان کے بیٹے مرزا بشیر الدین محمود موجود تھے۔ ان کو میں نے یہ کتاب لاہور سے بھیجی اور اس پر لکھا کہ "تحفۃ الندوۃ" کے جواب میں تاخیر کی معذرت کے ساتھ کہ وہ بہت پہلے کی بات ہے، اتنے دنوں کے بعد میں جواب دے رہا ہوں، الحمد للہ وہ کتاب بہت مقبول ہوئی۔

بہر حال میں آپ کو مبارکباد پیش کر رہا ہوں کہ آج آپ نے ایک وقت میں ایک جگہ پر اتنی مبارک شکلیں دیکھیں۔ عالم اسلام کے اتنے نمائندے دیکھے اور میں صفائی سے عرض کرتا ہوں کہ اسی طرح کہ حرم کا تحفہ بھی یہاں آگیا ہے۔ آپ کے شہر میں خود حرم کا تحفہ بھی آگیا ہے۔ مسجد اقصیٰ کے امام شیخ محمد الصیام بھی تشریف رکھتے ہیں۔ یہ بھی اجلاس کی ایک خصوصیت ہے۔

حضرتؒ کی والہانہ، خودداراتہ، مخلصانہ اور مؤثر و دلپذیر تقریر کے بعد امام حرم مکی شیخ السبیل اور دیگر مہمانوں کی تقریریں ہوئیں۔ دو روزہ پروگرام بہت ہی کامیابی کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔ بقول مولانا عبد اللہ عباس صاحب ندوی

(باقی صفحہ ۲۴۴ پر)

حضرت مولانا علی میاں ندوی رحمۃ اللہ علیہ

فکر و نظر کے چند گوشے

اساتذہ، مشائخ اور اہل علم کے احترام و عقیدت کے تناظر میں

آفتاب عالم ندوی

ندوی فکر، ندوی قلم اور ندوی ثقافت جس کے داعی بانیان ندوہ تھے، اگر اس کو کسی شخصیت میں مجسم دیکھا جاسکتا ہے تو وہ علامہ سید سلیمان ندوی کے بعد صرف حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی شخصیت ہے، انھوں نے "متاع خیر ز ہر دکاں کہ باشد" پر زندگی بھر عمل کیا، لیکن ان کی شخصیت اور فکر پر صرف ندوہ اور ندوہ کی فکر غالب رہی۔

نواب صدیق حسن خاں صاحب مرحوم سے اپنے تأثر کا ذکر کرتے ہوئے مولانا نے لکھا ہے:۔

"ـــــ میں مختلف اوصاف و کمالات کی محبت، متنوع بلکہ متضاد انسانی صفات و خصوصیات، طرح طرح کے علوم و فنون، قسم قسم کی ثقافتوں اور تہذیبوں کو جمع کرنے، عالی ہمتی و بلند حوصلگی سے متصف ہونے اور ان تمام اوصاف و خصائص کو باہم منضبط و مربوط کرنے اور پھر ان سے مقصد حقیقی کے حصول و تکمیل کا کام لینے اور علم و دین کی خدمت کرنے کے موقف و نظریہ پر پروان چڑھا، خواہ اس کی وجہ سے بہت سے ایسے علوم کی تحصیل ہی کیوں نہ کرنی پڑے جن سے بہت سے علما اعراض کرتے ہیں، اور انھیں علم کا چھلکا سمجھتے ہیں۔"

(مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ۔ پروفیسر سید محمد اجتبا ندوی کی عربی تصنیف "الامیر سید صدیق حسن خاں۔ حیاتہ و آثارہ" کے مقدمہ کے ایک اقتباس کا ترجمہ)

سابق پروفیسر اقتصادیات کراچی یونیورسٹی اور جماعت اسلامی کے موجودہ قائدین میں جن کی عظمت تسلیم شدہ ہے وہ حضرت مولانا کی جامعیت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"ـــــ میں جب بیسویں صدی کی اسلامی فکر کی قوس قزح پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے ان کا (مولانا علی میاں) فکر و اسلوب ایک ایسا گلدستہ معلوم ہوتا ہے جس میں اس دور کے کئی اہم مفکرین اور داعیوں کے متفرق پہلوؤں کا اجتماع نظر آتا ہے، ان کے یہاں علامہ اقبال کا سوز و گداز، مولانا مودودی کی عقلیت اور تصور دین کی جامعیت، علامہ شبلی اور مولانا سلیمان ندوی کا ذوق تاریخ اور مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا محمد الیاس، مولانا عبدالقادر رائے پوری اور مولانا محمد زکریا کی روحانیت کا امتزاج نظر آتا ہے، علی میاں کے یہاں یہ سب ایک دوسرے کے ناقض نہیں، ایک دوسرے کی تکمیل کرنے والے ہیں۔"

(ترجمان القرآن فروری ۲۰۰۰ء از پروفیسر خورشید احمد)

حضرت مولانا کے اساتذہ و مشائخ مختلف مکاتب فکر اور مختلف مسلکوں سے تعلق رکھتے تھے. لیکن مولانا نے ان سے صرف ان کی خوبیاں لیں، وہ کسی کی انتہا پسندی اور کسی فکر و مسلک میں ان کے غلو سے مطلق متأثر نہیں ہوئے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی شخصیت کی تعمیر اور فکر کی تشکیل میں سید احمد شہید اور ندوۃ العلماء کی جامع و ہمہ گیر تعلیمی و فکری تحریک اور گھر کے دینی و علمی ماحول نے بنیادی کردار ادا کیا تھا، سید احمد شہیدؒ کی جامع، روح پرور، انقلاب انگیز تحریک خانۂ دل میں جاگزیں تھی، اس کی عظمت و محبت کے نقوش لوح دل و دماغ پر مرتسم تھے، خمیر اسی سے اٹھا تھا، رگوں میں خون اسی کا دوڑ رہا تھا، اسی کی تلاش و جستجو میں مرکز مرکز کا سفر تھا اور اصحاب دعوت و عزیمت کی تلاش تھی۔

مولانا نے جب ہوش سنبھالا تو تحریک سید احمد شہید ہی کی طرح تحریک ندوۃ العلماء کا بھی خاندان میں تذکرہ دیکھا، والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ اس کے ناظم تھے، پھر برادر معظم ڈاکٹر سید عبدالعلیؒ بھی اس کے ناظم بنائے گئے، اس لئے ان دونوں عظیم تحریکوں سے ان کا والہانہ اور جذباتی لگاؤ اور فکری ہم آہنگی تھی، اس کی وضاحت انھوں نے اپنی خود نوشت سوانح حیات "کاروانِ زندگی" میں یوں کی ہے:۔

"میرا ذہنی سانچہ جس کی تشکیل میں دادیہالی

اور ننھیالی اثرات، خاندانی ماحول اور روایات، تین پشتوں کے تصنیفی اور ادبی ذوق، حضرت سید احمد شہید کے خاندان و جماعت سے انتساب کے نتیجہ میں قلب و نظر کی وسعت اور دین کی حمایت و حمیت، پھر سب سے بڑھ کر اپنے برادر بزرگ و مربی مولوی حکیم ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب (جنہوں نے قدیم و جدید کی بہترین خصوصیات کو اپنے اندر جذب کر لیا تھا اور جو مشرقی و مغربی علوم کے مجمع البحرین تھے، جن کے متعلق کہنا صحیح ہوگا (مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ) کی صحبت و تربیت نے برابر کا حصہ لیا تھا، اپنی علمی بے بضاعتی اور کم حیثیتی کے باوجود جو اس سن و سال کا قدرتی تقاضا بھی تھا، ندوۃ العلماء کے اس دینی و فکری مزاج اور جس ثقافت کا وہ نمائندہ اور علم بردار تھا اس سے فطری مناسبت رکھتا تھا، اس لئے اس کو اپنے کو اس ماحول میں فٹ کرنے کے لئے (جس وقت بحیثیت استاد کے ندوۃ العلماء میں تقرر ہوا) کوئی ذہنی ہجرت اور کوئی طویل سفر کرنا نہیں پڑا، اس کو محسوس ہوا کہ وہ اپنے ہی گھر کے ایک گوشہ یا ایک کمرہ سے منتقل ہوکر دوسرے گوشہ اور کمرہ میں آگیا ہے، اس میں اس بات کو بھی دخل تھا کہ اس کا ذہنی و علمی نشو و نما شروع سے ندوہ ہی کے ماحول میں ہوا تھا، اور بچپن ہی سے اس کے کان میں وہ باتیں پڑی تھیں جو اس کو ندوہ کی تاریخ سے واقف، اس کے جلیل القدر بانیوں سے آشنا اور اس کے خیالات سے مانوس کرتی تھیں، اس کے مربی اور ولی نعمت برادر بزرگ، اس کے محبوب و شفیق استاد خلیل عرب اور اس کی ایک طرح کے ذہنی تربیت کرنے والے اور اس کے ایک دوسرے استاد اور اتالیق مولانا سید طلحہ صاحبؒ سب ندوہ ہی کے تعلیم یافتہ اور خوشہ چیں تھے۔" (کاروان زندگی اول ص ۱۴۵)

زمانۂ طالب علمی کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں :-

"اگرچہ دار العلوم ندوۃ العلماء سے میرا تعلق خاندانی اور موروثی تھا، اور میرا دماغ، فکر و طرز فکر اور ثقافت اسی کے سانچہ کی ڈھلی ہوئی ہے، لیکن میرا علمی استفادہ اور خوشہ چینی ۲۹-۱۹۲۸ء میں اس وقت شروع ہوئی جب میری فقہ کی تعلیم اس درسگاہ کے ایک قدیم تر اور مقبول و محبوب استاد مولانا شبلی صاحب جیراجپوری اعظمی کے یہاں شروع ہوئی۔"

(کاروان زندگی جلد اول ص ۱۱۲)

مولانا تحریک ندوۃ العلماء کو جس کے وہ زندگی بھر پُر جوش داعی و مبلغ رہے کس نگاہ سے دیکھتے تھے یہ جاننے کے لئے کاروان زندگی کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو!

"ندوۃ العلماء کی تحریک اصلاح نصاب اور دینی تعلیم کی ترقی اور اس کو عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق بنانے (تطویر) کی مہم کوئی محدود، مقامی اور وقتی تحریک نہ تھی، وہ ایک مستقل دبستان فکر تھا جو عقائد صحیحہ سے لے کر تعلیمی نظریہ، تاریخ کے خاص تصور، تہذیب و ثقافت علم و ادب کے خاص معیار سب کو اپنے وسیع دامن میں لئے ہوئے تھا۔"
(کاروان زندگی جلد اول ص؛ ۱۴۰)

ندوۃ العلماء کے مسلک و فکر کی تشریح کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"مختصراً یہ کہ وہ حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی (م ۱۱۷۶ھ) کے علمی و فکری و کلامی و فقہی مدرسۂ فکر سے زیادہ قریب اور ہم آہنگ ہے، اس لحاظ سے ندوۃ العلماء ایک محدود تعلیمی مرکز سے زیادہ ایک جامع اور کثیر المقاصد دبستان فکر اور مکتب خیال ہے۔"

(کاروان زندگی جلد اول ص؛ ۱۴۳)

ایک جگہ ندوی ثقافت کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"اس تحریر کے ساتھ جو ندوۃ العلماء کے دینی مسلک، اس کے نظریۂ علم و تاریخ اور طریق فکر سے متعلق ہے، اپنی ہی ایک تحریر کے اقتباس کا اضافہ کیا جاتا ہے جس سے اس ثقافت کی وسعت و تنوع کا اندازہ ہوتا ہے، جو بانیان ندوۃ العلماء کا شعار اور اس کے فضلاء کے لئے باعث افتخار ہے، اقتباس یہ ہے :

" اس تہذیب و ثقافت میں شکوہ بھی ہے اور تواضع بھی، حلاوت بھی ہے اور مروت بھی، گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی، صلابت بھی ہے اور رقت بھی، استقامت بھی ہے اور رواداری بھی، اس کی قلمرو میں علوم شریعت و حکمت بھی ہیں، اور ادب و شاعری بھی، فقر و درویشی بھی ہے اور نفاست و ذوق لطیف بھی، اس کی دلچسپی کے میدان قلعے بھی ہیں اور کتب خانے بھی، مدرسے بھی ہیں اور خانقاہیں بھی، تحقیق و تصنیف کے

حلقے بھی ہیں اور مشاعرے بھی، اس میں ثقافت بھی ہے اور ظرافت بھی، سخت جانی بھی ہے اور سبک روحی بھی، اس کے اظہار خیال اور اظہار کمال کا ذریعہ عربی بھی ہے اور فارسی بھی، اردو بھی ہے اور ہندی بھی" (کاروان زندگی جلد اول ص۱۴۲)

ان اقتباسات کے یہاں نقل کرنے کا مقصد صرف حضرت مولانا کی فکر و شخصیت کی تفہیم و تشریح ہے کہ وہ اس فکر و ثقافت کے ترجمان و نمائندہ تھے، تحریک ندوۃ العلماء اپنی تمام تر تابانیوں کے ساتھ ان کی شخصیت میں جلوہ گر تھی، یہ رنگ اتنا شوخ تھا کہ اس پر کوئی دوسرا رنگ کبھی نہ چڑھ سکا، ندوی فکر و ثقافت کے سامنے ہر فکر اور ہر ثقافت ماند پڑ گئی۔

اکابر دیوبند و سہارنپور اور مولانا علی میاںؒ

حضرت مولانا کی تعلیم و تربیت اصلاً ندوۃ العلماء میں اور اس کے تعلیم یافتہ فضلاء کے ہاتھوں ہوئی تھی، لیکن تزکیۂ نفس، اصلاح باطن علمی استفادہ اور دینی تربیت کے لئے شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا محمد الیاسؒ، مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ، مولانا احمد علی لاہوریؒ اور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہم کی خدمت میں مسترشدانہ و نیازمندانہ حاضری دی۔

مولانا کے خاندان کی ایک خصوصیت یہ بھی رہی ہے کہ باوجود اس کے کہ برابر اس میں بڑے بڑے علماء، اہل اللہ اور مشائخ پیدا ہوتے رہے کبر و نخوت میں یہ کبھی مبتلا نہیں ہوا، بلکہ ہر زمانہ میں متبع سنت، صاحب کمال مشائخ کی طرف بلاتکلف رجوع کیا۔

(اس کی تفصیل کاروان زندگی ج اول ص ۲۸ پر دیکھی جاسکتی ہے)

مولانا مدنیؒ کی خدمت میں

ندوۃ العلماء سے فراغت کے بعد مولانا کو ان کے بڑے بھائی ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب جنہیں اپنے چھوٹے بھائی کی تربیت و اصلاح اور دینی ترقی کا بڑا اہتمام رہتا تھا حضرت مدنی کی خدمت میں پیش کیا، مولانا نے کچھ اپنے حالات عرض کئے، مولانا مدنی نے مشورہ دیا کہ انھیں میرے پاس دیوبند بھیج دیا جائے، اس طرح مولانا علی میاں ندوی حضرت مدنی کی خدمت میں دیوبند پہونچ گئے جہاں انھوں نے کئی ماہ ان کی خدمت میں گزارے۔

مولانا ندوۃ العلماء میں شیخ الحدیث مولانا حیدر حسن خاں صاحب ٹونکیؒ سے بخاری، مسلم، ابو داؤد اور ترمذی وغیرہ پڑھ کر گئے تھے، مولانا حیدر حسن خاں صاحب، سہیل یمانی شیخ حسین بن محسن انصاری خزرجی کے ممتاز شاگرد اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کے مجاز تھے، محدث جلیل اور ممتاز محقق و ناقد مولانا محمد عبدالرشید صاحب نعمانی مولانا حیدر حسن خاں صاحب ہی کے شاگرد ہیں، حضرت مولانا کے فارغ ہونے کے بعد مولانا نعمانی ندوہ آئے تھے۔

دیوبند میں مولانا مدنی کے درس بخاری و ترمذی میں شریک ہونے کے علاوہ مولانا نے بعض مشکل آیات کے سمجھنے کے لئے جمعہ کا دن مولانا مدنی سے لے رکھا تھا لیکن شدید مصروفیات کی وجہ سے اکثر ناغے ہو جاتے تھے۔ اپنے مضمون "میرے مطالعۂ قرآن کی سرگذشت" میں لکھتے ہیں:

"مولانا مدنی اپنے زمانہ کے بلند ترین علماء میں تھے، اور علوم و فنون اور حدیث کے علاوہ (جس کے وہ مانے ہوئے استاد اور شیخ تھے) ان کو قرآن مجید کا خاص ذوق تھا، اس کا رنگ ان کی زندگی اور مزاج پر چھا گیا تھا۔

(ماہنامہ "صبح صادق" جنوری ۱۹۵۶ء قرآن نمبر)

دیوبند میں وابستگی کا واحد ذریعہ مولانا مدنیؒ

دیوبند کے زمانۂ قیام کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:۔

"دیوبند کے قیام میں میرے لئے وابستگی کا واحد ذریعہ مولانا کی ذات گرامی تھی، میری ذہنی و تعلیمی پرداخت اس انداز سے ہوئی تھی کہ میرے لئے وہاں کی درسی و مدرسی ماحول میں دلچسپی کا کم سامان تھا"

(پرانے چراغ جلد اول ص۱۰۳)

مولانا احمد علی صاحب لاہوری کی خدمت میں

مولانا عبیداللہ صاحب سندھی کے شاگرد رشید مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ سے تفسیر اور حجۃ اللہ البالغہ پڑھنے کے لئے لاہور میں بھی مولانا نے کچھ دن قیام کیا۔ لیکن اس طرز تفسیر سے انھیں کوئی مناسبت نہیں تھی، مولانا لکھتے ہیں:۔

"جہاں تک اس طرز کا تعلق ہے، مجھے اس سے کچھ زیادہ مناسبت نہیں تھی، اسی لئے میں نے اپنے درس قرآن میں جس کا سلسلہ میں نے لکھنؤ واپس آکر شروع کر دیا اور جس نے بعد میں ادارۂ تعلیمات اسلام میں شہر کے ایک بڑے مرکزی درس کی شکل اختیار کر لی جس میں شہر کے جدید تعلیم یافتہ اور اعلیٰ عہدیدار بڑی تعداد میں شریک ہونے لگے اس طرز کی پیروی نہیں کی لیکن اس درس سے مجھے فائدہ بہت ہوا، اور اس کی برکت میں نے اپنی بعد کی علمی اور تبلیغی زندگی میں محسوس کی" (پرانے چراغ ج اول ص۱۵۱)

علامہ سید سلیمان ندوی سے تفسیر میں استفادہ

"۔۔۔۔اس کے علاوہ مجھے مولانا سید سلیمان ندویؒ سے قرآن مجید کی بعض آیات کی تفسیر اور بعض آیتوں پر ان کی تقریر سننے کا موقع ملا، اور میرا تاثر یہ ہے کہ میں نے قرآن مجید کے بارے میں کسی کا فہم اتنا عمیق نہیں پایا جتنا کہ مولانا سید سلیمان ندوی کا، یہ ایک تاریخی انکشاف ہے، لوگ سید صاحب کو مؤرخ اور سوانح نگار کی حیثیت سے جانتے ہیں، متکلم کی حیثیت سے جانتے ہیں، لیکن میرے نزدیک فہم قرآن میں ان کا پایہ اتنا بلند تھا کہ مجھے ہندوستان ہی نہیں بلکہ تحتی براعظم میں بھی کوئی ایسا شخص نہیں ملا جس کا مطالعہ قرآن اتنا وسیع اور عمیق ہو۔" (قرآنی افادات ص: ۳۱)

حضرت مولانا ہمیشہ اکابر دیوبند و سہارنپور کی دینی خدمات اور ان کے اخلاص وللہیت کے معترف و مداح رہے، نجی مجلسوں، عام محفلوں اور اپنی تحریروں میں برابر ان کا ذکر خیر کرتے، متعدد بزرگوں کی حیات و خدمات پر مستقل کتابیں لکھیں اور لکھوائیں۔

علماء دیوبند و سہارنپور کے خلاف شرانگیزی اور مولانا کا دفاع

جب سلف کی طرف نسبت کرنے والی ایک جماعت نے جس نے آج کل ائمہ اربعہ خصوصاً امام ابوحنیفہؒ اور ان کی فقہ پر عمل کرنے والوں کی تحقیر و تفسیق بلکہ تکفیر ہی کو اپنا شعار بنا رکھا ہے، محض جماعتی و شخصی مفاد و مصلحت اور ایک خاص مشرب اور طریقہ کو فائدہ پہونچانے کی خاطر علماء دیوبند کی عقیدۂ توحید سے وابستگی، قرآن و حدیث سے ان کے تعلق اور شریعت اسلامیہ پر عمل پیرا ہونے کے سلسلہ میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کی مہم اور حقائق کو مسخ کرکے ان کی شبیہ بگاڑنے کی زور و شور سے کوشش شروع کی تو مولانا کے لئے خاموش رہنا ناممکن ہوگیا۔ اور "اضواء" کے نام سے ایک کتابچہ لکھ کر حجاز و خلیج میں تقسیم کروایا، اس میں دیوبند، مظاہر اور ان کے نامور اکابر مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا حسین احمد مدنیؒ، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ وغیرہم اور تبلیغی جماعت کے فکر و عقیدہ اور ان عظیم اداروں، تحریکوں اور ان کے عظیم بانیوں کی خدمات، قربانیوں اور تصحیح عقیدہ اور بدعات و خرافات کی بیخ کنی اور قرآن و حدیث سے عوام کا رشتہ جوڑنے میں ان کی کوششوں اور کامیابیوں کا تذکرہ کرکے ان کے خلاف جاری پروپیگنڈہ کی حقیقت واضح کی۔ برصغیر ہند و پاک کے لئے "اضواء" کا اردو ترجمہ "بصائر" کے نام سے چھپوا کر تقسیم کیا، اس کے پیش لفظ کے آخری جملے یہ ہیں:-

"ایسے ملک میں اس طرح کے مسائل چھیڑنے، مفید اور ضروری تعلیمی اداروں اور دعوتی تحریکوں پر بے بنیاد الزامات لگانے اور اس سے اپنے جماعتی مفادات کو بروئے کار لانے والوں سے قرآن کریم کی روشنی میں یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے:

یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰامِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ

اے ایمان والو! کھڑے ہو جایا کرو اللہ کے واسطے گواہی دینے کو انصاف کی،

تحریک سید احمد شہیدؒ اور اکابر دیوبند و سہارنپور

اس سے پہلے خاندان کے ایک صاحب فکر و بصیرت عالم مولانا سید سلیمان صاحب ندوی کا یہ بصیرت افروز قول کہیں گزر چکا ہے کہ "تحریک سید احمد شہیدؒ خانۂ دل میں جاگزیں تھی، رگوں میں خون اسی کا دوڑ رہا تھا، اسی کی تلاش و جستجو میں مرکز مرکز کا سفر اور اصحاب دعوت و عزیمت کی تلاش تھی"۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا نے جن بزرگوں سے مسترشدانہ و نیازمندانہ تعلق رکھا وہ سب سید احمد شہید ہی کے سلسلہ سے تعلق رکھتے تھے، ایک مرتبہ دارالعلوم دیوبند میں طلبہ کو خطاب کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا:-

"میں اس بات پر (مولانا مدنی سے استفادہ کے لئے دیوبند کے قیام پر) جتنا فخر کروں کم ہے، لیکن میری نیازمندی کی تاریخ اس سے زیادہ وسیع اور طویل ہے، کئی پشتوں سے میرا تعلق اس درس گاہ عالی مقام سے رہا ہے، یہاں کی زمین ان لوگوں کے آنسوؤں سے نم اور یہاں کی فضا ان کی دعاؤں اور آہوں سے اب بھی معطر ہوگی جو قافلہ بنا کر اس سرزمین سے گزرے" (یعنی سید احمد شہیدؒ اور ان کے رفقاء)

(پاجا سراغ زندگی ص۱۱۳)

حضرت قاری محمد طیب صاحب تاریخ دارالعلوم دیوبند کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:-

"میں نے اپنے بزرگوں سے بارہا سنا اور ان کے حلقوں میں ایک معروف اور عام زبان زد بات تھی اور پھر اس کی سند تاریخی اوراق سے بھی ملتی ہے کہ حضرت سید احمد شہیدؒ بریلوی رحمۃ اللہ علیہ جہاد کے سلسلہ سے صوبہ سرحد جاتے ہوئے جب دیوبند سے گذرے تو اس جگہ پہونچ کر جہاں آج مدرسہ واقع ہے فرمایا کہ مجھے یہاں سے علم کی خوشبو

آرہی ہے۔"

(تاریخ دارالعلوم دیوبند ج اول ص۷۴)

تحریک سید احمد شہید سے جو علاقے سب سے زیادہ فیضیاب ہوئے ان میں دوآبہ (دیوبند سہارنپور، گنگوہ، تھانہ بھون، نانوتہ، کاندھلہ وغیرہ) کا علاقہ سرفہرست ہے، اکابر دیوبند کے پیر ومرشد حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی خلیفہ تھے مولانا نور محمد جھنجھانوی کے، اور یہ خلیفہ تھے سید احمد شہید کے، ان حضرات کو یہ نسبت کتنی عزیز تھی، سید احمد شہید سے کیسا عشق تھا یہ دیکھنا ہو تو مولانا کے والد ماجد مولانا سید عبدالحی حسنی کی ارمغان احباب (دہلی اور اس کے اطراف) پڑھئے، یہ دراصل ایک سفر کی روداد ہے جو انھوں نے ستائیس سال کی عمر میں ۱۳۱۲ھ میں سید احمد شہیدؒ کے نقوش کی تلاش میں دہلی، سہارنپور، دیوبند اور گنگوہ وغیرہ کا کیا تھا:

مولانا محمود حسن صاحب کے یہاں دعوت

"وہیں سے میں اور بھائی جی (مولوی خلیل الدین رائے بریلوی) اٹھ کر مولوی محمود حسن (شیخ الہند) کے مکان پر آئے، مولانا ذوالفقار علی صاحب (شیخ الہند کے والد محترم) اور اکثر بزرگان دیوبند (مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری، حافظ محمد احمد صاحب، حاجی سید محمد عابد صاحب، مفتی عزیزالرحمن صاحب وغیرہم) بیٹھے ہوئے تھے، مولانا ذوالفقار علی صاحب نے نہایت فراخدلی سے ہم لوگوں کا خیر مقدم کیا، اور مل کر صدر مقام میں باوجود ہم لوگوں کی معذرت کے بٹھایا، اس کے بعد فرمایا کہ جس وقت میں نے سنا کہ رائے بریلی سے کوئی صاحب آئے ہیں تو میں سمجھ گیا تھا کہ صاحبزادہ ہونگے، کیونکہ علم سے ان لوگوں کو ہمیشہ سے مناسبت ہے، پھر انھوں نے ایسی باتیں شروع کیں جس کو سن سن کر شرم وندامت سے ہمارے سر جھکے جاتے تھے، اور جتنے حضرات وہاں بیٹھے تھے، انھوں نے ایسا اظہار عقیدت کیا کہ ہم کو ان بزرگوں کے حسن ظن پر حیرت ہے، ہم لوگوں کی مخدومیت اور اپنی خادمیت کا اظہار ہر ہر بات پر فرماتے تھے، سب سے زیادہ شکایت اس بات کی تھی کہ آپ سرائے میں کیوں ٹھہرے، کیا آپ ہم کو اپنا خادم نہیں سمجھتے، یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ آپ سرائے میں رہیں، مولوی محمود حسن صاحب (شیخ الہند) نے کہا کہ کل میں نے بہت اصرار کیا لیکن انھوں نے مانا نہیں، مولانا ذوالفقار علی صاحب نے کہا کہ آپ نے ان کے انکار کو تسلیم ہی کیوں کیا، آخر کو آدمی سرائے بھیجا گیا اور اسباب اٹھوا منگایا، اس عرصہ میں کھانا آیا، نہایت اہتمام کے ساتھ کھانا پکوایا گیا تھا، کھانے کے بعد مولوی ذوالفقار علی صاحب نے اور مولوی محمود حسن صاحب نے اپنے ہاتھ سے بستر بچھا کر کہا کہ آپ قیلولہ فرمائیں۔"

(دہلی اور اس کے اطراف ص: ۸۶)

اس ایک اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اکابر دیوبند کو سید احمد شہیدؒ سے کیسا جذباتی لگاؤ تھا، اس خانوادہ کے ایک نوجوان کی پیر ومرشد کی طرح عزت وتکریم کی جارہی ہے۔

ایک مرتبہ تبلیغی مرکز حضرت نظام الدین میں مولانا علی میاں علیہ الرحمہ صبح کی چائے میں شریک نہیں ہوئے، رئیس التبلیغ مولانا محمد الیاسؒ نے پوچھا! مولانا علی میاں صاحب نہیں آئے، لوگوں نے بتایا کہ وہ اوپر کمرہ میں ہیں، مولانا محمد الیاس صاحب نے فرمایا کہ لاؤ میں چائے لے کر جاؤں گا، چنانچہ خود چائے کی پیالی ہاتھ میں لے کر زینہ چڑھ کر اوپر کمرہ میں تشریف لے گئے، اور یہ کہتے ہوئے پیالی حضرت مولانا علی میاں صاحب کی طرف بڑھائی کہ مولانا! ابھی تک ہم لوگ حضرت سید صاحب کی تجدید کے سایہ ہی میں ہیں۔ (حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔ اکابر ومشاہیر امت کی نظر میں ص: ۶۴)

ایک مرتبہ حضرت مولانا اپنا ایک مضمون جو تصوف پر تھا حضرت مدنی کو دکھا رہے تھے، ایک جگہ سید احمد شہیدؒ اور شیخ سنوسی کا ذکر ایک ساتھ تھا، جوں ہی اس پر ان کی نگاہ پڑی غصہ سے چہرہ متغیر ہو گیا، اور جوش میں فرمانے لگے مولوی صاحب! شیخ سنوسی کو میں نے حجاز میں دیکھا ہے، ان سے ملا ہوں، کہاں سید صاحب اور کہاں شیخ سنوسی، پھر اپنے ہاتھ سے شیخ سنوسی کا تذکرہ نیچے الگ پیراگراف میں کر دیا۔

کاروان زندگی میں مولانا محمد الیاس صاحبؒ سے اپنی قربت ومناسبت کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا علی میاں لکھتے ہیں:-

"دوسری طرف مولانا کی مجھ پر جو خصوصی عنایت اور تھوڑے وقت میں جو قرب واختصاص حاصل ہوا اس کی ایک وجہ تو وہ عجیب وغریب تعلق وعقیدت ہے جو سلسلۂ رشیدی (سلسلۂ مولانا رشید احمد گنگوہی) کے تمام مشائخ کو حضرت سید احمد شہیدؒ کے ساتھ رہا ہے اور جس کا اندازہ کرنا ان لوگوں کے لئے دشوار ہے جنہوں نے ان حضرات کو قریب سے اور زیادہ نہیں دیکھا ہے۔"

(کاروان زندگی ج اول ص: ۲۸۴)

مولانا کے اساتذہ میں مولانا حیدر حسن خاں صاحب ٹونکی متشدد حنفی تھے، علامہ تقی الدین ہلالی مراکشی اور مولانا خلیل عرب صاحب ندوی

اہل حدیث تھے، خاص طور پر مولانا ہلالی بڑے کٹر تھے، خلیل عرب صاحب اپنے مایۂ ناز شاگرد مولانا علی میاں کو ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"عزیز محترم مولانا ابوالحسن علی صاحب اطال اللہ بقائہ وأعزأ یامہ، ومتع المسلمین بعلومہ عدا التصوف (آمین)"

(پرانے چراغ ج اول ص: ۲۲۶)

یعنی اللہ ان کے جملہ علوم سے مسلمانوں کو فائدہ پہونچائے سوائے تصوف کے۔

نصاب تعلیم، مولانا مودودی اور ان کی جماعت اور غیر مقلدین کے سلسلہ میں ہندستان کے علما کا موقف و نظریہ اور ان کی رائے معروف ہے، اسی طرح حجاز کی اکثریت کی تصوف اور صوفیوں سے وحشت ونفرت سے سبھی واقف ہیں، مولانا افراط وتفریط میں کبھی مبتلا نہیں ہوئے، انھوں نے ہر ایک کا احترام ملحوظ رکھا، لیکن زبان وقلم کی شرافت وشائستگی، اساتذہ، مشائخ بزرگوں اور اہل فضل وکمال کا حد درجہ احترام وادب اور تواضع وانکساری نے کبھی انھیں اس بات سے نہیں روکا کہ اپنے ان افکار ونظریات کو بلا تکلف پوری قوت کے ساتھ ظاہر کریں جنہیں وہ صحیح اور امت کے لئے مفید سمجھ رہے ہیں، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اپنی کسی رائے کا اظہار محض اس لئے نہ کیا ہو کہ فلاں اس سے متفق نہیں ہے، فلاں کی رائے اس کے خلاف ہے، ذیل میں ہم اس کی کچھ مثالیں پیش کرتے ہیں:-

نصاب تعلیم

سنہ ۸۴ء میں "ہندوستان میں عربی مدارس کا نصاب ونظام تعلیم" کے موضوع پر ندوۃ العلماء میں دوروزہ سمینار کا انعقاد ہوا تھا، حضرت مولانا نے افتتاحی اجلاس میں شرکا کو جن کا تعلق ہندوستان کے مختلف مدارس وجامعات سے تھا خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

"حقیقت میں نصاب تعلیم کسی قوم کے فکری ارتقاء، اس کے علمی تجربوں اس کے طریق فکر اور اس کی ذہنی صلاحیت کی ہانڈی کا سرجوش ہوا کرتا ہے، نصاب تعلیم کسی قوم کے مطالعہ، اس کی فکری سطح اور اس کی ذہنی صلاحیت کا نقطۂ عروج ہوتا ہے، نصاب تعلیم کا بھی ایک ضمیر ہوتا ہے، اس کی ایک روح ہوتی ہے جو اس کے پورے جسم میں سرایت کئے ہوتی ہے"

(تعمیر حیات ۲۵ مارچ - ۲۵ اپریل سنہ ۸۴ء)

دارالعلوم دیوبند میں اس کے اجلاس صد سالہ کے موقع پر نصاب تعلیم پر ایک سمینار ہوا تھا جس کی صدارت حضرت مولانا نے فرمائی تھی، اپنی صدارتی تقریر میں آپ نے اس موقع پر کہا!

"میں آپ سے اول تو یہ بات کہتا ہوں کہ نصاب تعلیم کی تاریخ بتاتی ہے کہ ہمارے اسلاف ہم سے کہیں زیادہ حقیقت پسند تھے اور ہم سے کہیں زیادہ وسیع النظر اور کہیں زیادہ فراخدل تھے، اس لئے کہ ہمیں نصاب کی پوری تاریخ میں نظر آیا کہ برابر تبدیلیاں ہوتی رہیں، اور معیار فضیلت بھی بدلتا رہا، دوسری بات یہ کہ یہ تضاد ہے تاریخ کا جس کو آپ حضرات کے سامنے رکھا جاسکتا ہے کہ جب ہندوستان میں ایک ہی حکومت تھی، یعنی صرف مسلمان حکومت کر رہے تھے، صرف خاندان بدلتے تھے، ایک ہی دین نہیں بلکہ مذہب فقہی بھی ایک تھا یعنی حنفی، آئین بھی ایک تھا، یعنی شرع محمدی، اس کی زبان ایک تھی، یعنی فارسی اور مذہبی زبان عربی تھی اور تہذیب بھی ایک تھی، سب میں وحدت تھی، اور تسلسل تھا، اس وقت تو نصاب تعلیم سو سو برس میں بدلتا رہا، اور جب زمین آسمان بدل گئے، اور نہ وہ حکمرانی رہی، اور نہ وہ تہذیب رہی، اور نہ وہ آئین رہا، اور مذہب بھی تزلزل میں پڑ گیا، اس وقت سے اس پر ایسی مہر لگی، ایسی مہر لگی کہ کوئی اس کو ہاتھ نہیں لگا سکتا، کیا اس کی بنا پر ایک مؤرخ یہ بے لاگ فیصلہ نہیں دے سکتا کہ ہمارے اسلاف ہم سے زیادہ وسیع النظر اور ہم سے زیادہ حقیقت پسند اور زمانہ شناس تھے، ان کا ہاتھ اور ان کی انگلیاں زمانہ کی اور ملت کی نبض پر رہتی تھیں، اور ہماری انگلیاں نبض سے ہٹ گئی ہیں، اور ہمیں معلوم نہیں کہ نبض کس طرح چلتی ہے، نصاب تعلیم کو ملت کے ساتھ، زمانہ کے ساتھ اور تقاضوں کے ساتھ مربوط رہنا چاہئے، اور یہ ہمارے لئے قرآنی نظریہ سے بھی، دعوتی نظریہ سے بھی اور عملی نظریہ سے بھی ضروری ہے"

(تعمیر حیات ۲۵ مارچ - ۲۵ اپریل سنہ ۸۴ء)

وہ دن بڑا مبارک ہوگا جس دن دارالعلوم دیوبند میں ضروری اصلاح اور تجدید عمل میں آئے گی

مولانا علی میاں ندوی علیہ الرحمہ کی بڑی خواہش تھی اور اس کے لئے انھوں نے کوشش بھی کی کہ نصاب تعلیم کے اس نظریہ کو دارالعلوم دیوبند اپنالے کہ برصغیر ہندو پاک میں تقریباً تمام مدارس وجامعات اسی کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں مولانا نے دیوبند کا ایک

سفر کیا تھا اور حضرت قاری محمد طیب صاحب سے
اس موضوع پر تبادلۂ خیال کیا تھا، اس کی روداد
خود انھیں کی زبانی سنئے!

"ہم پر دارالعلوم کے اسلامی ماحول کا
ہمیشہ سے اثر ہے، اب کی یہ معلوم کرکے
اور مسرت ہوئی کہ یہاں تجدید و اصلاح
کا نیا رنگ بھی شروع ہونے کو ہے، ہم
حضرت مولانا حسین احمد صاحب کی
اصلاحی کوششوں سے ناواقف نہیں تھے
اب یہ دیکھ کر مزید مسرت ہوئی کہ مولانا طیب
صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند بھی اصلاح
نصاب اور بعض اہم مضامین کے اضافہ
و تکمیل کیلئے کوشاں ہیں، اس سلسلہ میں
مولانا نے جن تفصیلات کا اظہار فرمایا
ان سے ہم کو بڑا اطمینان اور بے پایاں
مسرت حاصل ہوئی، ہندوستان کے
مسلمانوں کے لئے وہ دن بڑا مبارک ہوگا
جس دن دارالعلوم دیوبند میں ضروری
اصلاح اور تجدید عمل میں آئے گی۔"

(تاریخ ندوۃ العلماء جلد دوم ص۴۰۶، مرتب مولانا شمس تبریز خاں)

عربی زبان کی تعلیم کے لئے مولانا کے
قلم سے ایسی کتابیں نکلیں جن کی داد عربی کے
مستند ادبا اور ماہرین تعلیم نے دی، حتیٰ اسلوب
ادباء نے اپنی تیار کی ہوئی کتابوں پر ان کتابوں
کو فوقیت دی، لیکن ہندوستان کے عربی مدارس
میں انھیں داخل نصاب نہیں کیا گیا، اس پر افسوس
فطری بات ہے، کاروان زندگی میں مولانا لکھتے ہیں:

"مختارات" نے جلد مقبولیت حاصل کی
لیکن وہ زیادہ تر جدید حلقوں اور یونیورسٹیوں
کے شعبۂ عربی بی۔ اے، ایم اے کے کورس
میں داخل ہوئی، البتہ اس کو ہمارے قدیم
مدارس میں بڑی مشکل سے بار ملا، اور ملا
بھی تو جلد اس کو چھٹی دے دی گئی کہ ان
حلقوں کا عمل "انظر ما قال ولا تنظر الی
من قال" کے بجائے "انظر الی من قال
ولا تنظر الی ما قال" پر ہے۔

(کاروان زندگی جلد اول ص۲۱۳)

"قصص النبیین" کا ذکر کرتے ہوئے
لکھتے ہیں:-

"اگر مصنف کو اپنی کسی کتاب کے داخل نصاب
نہ ہونے پر استعجاب اور دوستانہ شکوہ
ہو سکتا ہے تو اس کتاب پر کہ وہ زبان
آموزی اور دینی تلقین کا بیک وقت کام
کرتی ہے، لیکن جماعتی اور مدرسی عصبیت
بڑے بڑے حقائق پر پردہ ڈال دیتی
ہے، اس بارے میں جدید تعلیمی ادارے
اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ زیادہ فراخدل
اور وسیع النظر واقع ہوا ہے۔"

(کاروان زندگی ج ۱ ص: ۲۱۹)

ندوہ کی تحریک اصلاح نصاب کا اثر

ندوۃ العلماء نے آج سے ایک صدی
پہلے اصلاح نصاب کی جو آواز لگائی تھی وہ اگرچہ
بعض اسباب کی بنا پر عمومی مقبولیت حاصل نہ
کرسکی لیکن بالکلیہ بے اثر بھی نہیں رہی، آج ہر
طرف سے اصلاح نصاب کی صدا آرہی ہے، بہت
سی جگہوں میں عملاً اس کام کا آغاز بھی کردیا گیا ہے
اس سے پہلے بھی متعدد روشن دماغ، اہل بصیرت
اور حالات حاضرہ پر گہری نظر رکھنے والے مخلص
علماء نے ندوۃ العلماء کی اس فکر کی پرزور تائید کی
ہے، یہاں صرف علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے شاگرد
رشید علامہ یوسف بنوریؒ کے چند جملے نقل کئے
جاتے ہیں۔

علامہ یوسف بنوریؒ کی رائے

ماہنامہ "الفرقان" میں ۱۹۷۵ء میں "عربی
مدارس کا نصاب و نظام تعلیم" کے عنوان سے
مولانا بنوریؒ نے ایک مضمون لکھا تھا، دارالعلوم
دیوبند کے اس وقت کے مہتمم جناب قاری محمد طیب
صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دارالعلوم کی طرف سے
کتابچہ کی شکل میں اپنے پیش لفظ کے ساتھ اسے
شائع فرمایا، پیش لفظ میں قاری صاحب تحریر
کرتے ہیں:-

"(یہ مضمون) اس قابل ہے کہ مدارس عربیہ
اور بالخصوص دارالعلوم دیوبند کے
اساتذۂ کرام کے مطالعہ میں آئے اور
اس کی روشنی میں جن نقاط کو پیش کیا
گیا ہے وہ محض نظری نہیں ہیں، بلکہ
تجرباتی بلکہ تجربوں کا بھی نچوڑ ہیں انھیں
سامنے رکھ کر اپنے نظام و نصاب اور
مناہج تعلیم پر غور و فکر فرما کر اس کے
بنیادی حصوں کو اپنائیں۔" (ص: ۲)

مولانا بنوری نے مضمون میں پہلے بتایا
ہے کہ زمانہ بدل چکا ہے، خیالات بدل گئے
ہیں، قوموں کی نفسیات بھی تبدیل ہوگئیں، سائنس
کی ترقیات نے معاشیات و اقتصادیات کی نئی
راہیں کھول دیں، فقہ اسلامی کے ابواب میں
تمدن حاضرہ نے بہت سے جدید ابواب کا اضافہ
کردیا ہے، اس کے بعد درس نظامی کی کتابوں
کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"مدارس عربیہ میں اس وقت جو نصاب تعلیم
رائج ہے، حدیث و فقہ کی چند کتابوں
کو مستثنیٰ کرنے کے بعد زیادہ تر ساتویں
صدی ہجری اور اس کے بعد کی قرون کی
یادگار ہیں، جہاں صحیح معنیٰ میں علمی انحطاط

کا دور شروع ہو چکا تھا، قدما ء کی وہ تالیفات جن میں علم کی روح موجود تھی، عبارت سلیس وشگفتہ، مسائل وقواعد واضح جن میں نہ عبارتی تعقیدات تھیں، نہ دور از کار ابحاث، جن کے پڑھنے سے صحیح معنی میں دل ودماغ متأثر ہو سکتے تھے، نہ وقت ضائع ہوتا تھا نہ دماغ پر بوجھ کا خطرہ ہوتا تھا، ان کی جگہ ایسی کتابیں تصنیف ہوئیں جن میں سب سے زیادہ کمال اختصار نویسی کو سمجھا گیا، زیادہ زور لفظی بحثوں پر دیا گیا، لفظی موشگافیاں شروع ہوئیں، یوں اگر کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ کاغذ تو کم خرچ کیا گیا لیکن وقت ودماغ کو اس کے حل پر زیادہ صرف کیا گیا، بڑا کمال یہی سمجھا گیا کہ عبارت ایسی دقیق وغامض ہو جس کے لئے شرح وحاشیہ کی ضرورت ہو، کئی کئی توجیہات کے بغیر حل نہ ہو، آخر یہ علمی عیاشی نہیں تو اور کیا ہے، میرے ناقص خیال میں یہ علم کا سب سے بڑا فتنہ تھا، جس سے اسلامی علوم اور اسلامی معارف کو بڑا نقصان پہونچا۔"

(مدارس عربیہ کا نصاب ونظام تعلیم ص: ۱۰)

اس کے بعد درس نظامی میں اصول فقہ، صرف ونحو، معانی بیان، منطق، فلسفہ، فقہ وتفسیر ادب وغیرہ کی تعلیم کے لئے پڑھائی جانے والی کتابوں کا جائزہ لینے کے بعد خلاصہ کے طور پر لکھتے ہیں:

۱۔ "کتابوں میں زیادہ تر وقت لفظی مباحث اور عبارتی موشگافیوں پر خرچ ہوتا ہے، ۲۔ فن کے قواعد اور مسائل کے یاد کرنے کے بجائے مصنف کا مقصد سمجھنے پر وقت ضائع ہوتا ہے۔ ۳۔ فن کے قواعد اور مسائل یاد ہو جانے سے جو ایک اعلیٰ سلیقہ اور ملکہ پیدا ہوتا ہے اور جو ایک خاص قسم کی بصیرت حاصل ہونی چاہئے ان مختصرات سے یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ ۴۔ صرف ان کا پڑھنے اور پڑھانے والا بہت مشکل سے اس فن کا محقق اور بابصیرت عالم بن سکتا ہے۔ ۵۔ متن اور اس پر شرح اور پھر شرح کا حاشیہ یہ اسلوب عصر حاضر کے ذوق کے بالکل خلاف ہے۔"

(مدارس عربیہ کا نصاب ونظام تعلیم ص: ۱۰۔۱۵)

عرب قوم پرستی کا فتنہ

یہ دراصل یہودیوں اور عالمی طاقتوں کی ایک گہری اور خطرناک سازش تھی دین اسلام کے خلاف، عرب قوم پرستی کا وہ سادہ مفہوم ہرگز نہیں ہے جو یہاں وطنیت یا وطن پرستی کا عام طور پر اب تک سمجھا جاتا ہے، بلکہ قومیت عربیہ کی حیثیت ایک دین اور ایک مذہب کی ہوگئی تھی، لیکن قومیت کے مغربی مفہوم اور قومیت عربیہ کے علمبرداروں کے افکار ونظریات سے ناواقفیت کی بنا پر عام طور پر ہندوستان کے دینی حلقے اس کی سنگینی کا اندازہ نہیں لگا سکے، ایک لبنانی مسلمان ناصر الدین اپنی کتاب "قضیة العرب" میں قومیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"وطن پر ایمان وطن کے لئے ٹھیک اسی طرح ہے جس طرح اللہ پر ایمان اللہ کے لئے ہو سکتا ہے۔"

یہی مصنف دوسری جگہ لکھتا ہے:۔

"یہ قومیت دین وسیاست کی تفریق پر ایمان رکھتی ہے، وہ اہل دین کو سیاست میں حصہ لینے کی اجازت نہیں دے گی۔"

اس کی مزید تشریح کرتے ہوئے یہ لکھتا ہے:۔

"قومیت عربیہ پر ایمان راسخ رکھنے والے ہم عرب قوم پرستوں کے نزدیک عروبہ بجائے خود ایک دین ہے، اس لئے کہ وہ اسلام اور مسیحیت دونوں سے پہلے سے اس دنیا میں موجود ہے۔"

جمال عبدالناصر اس قومیت کا علمبردار تھا، اس نے سرعام اپنی سات ہزار سالہ تہذیب پر فخر کیا اسی نے اخوان کے ذمہ داروں کو بے گناہ قتل کیا، ایذا رسانی کے نئے طریقے جو ہٹلر کے وقت جرمنی میں ایجاد ہوئے تھے وہ سید قطب اور دوسرے اسلام پسندوں پر آزمائے گئے، مشہور مصنف وادیب احمد حسن زیات نے "الأزهر" میں جو جامع ازہر کا ترجمان تھا قومیت عربیہ کے علمبردار کی حیثیت سے صدر ناصر کو نعوذ باللہ نعوذ باللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر فوقیت دی، اور ستم یہ کہ کوئی قابل ذکر احتجاج اس کے خلاف نہیں ہوا، قومیت عربیہ نے ذہن ودماغ کو کس طرح متاثر کیا تھا اس کا اندازہ ان مضامین سے لگایا جا سکتا ہے جو صدر جمال عبدالناصر کی وفات کے بعد اخبارات میں شائع ہوئے، ذیل میں کچھ نمونے پیش کئے جاتے ہیں:۔

"اس زمانہ کے نبی نے دنیا سے رحلت فرمائی (نعوذ باللہ) جمال عبدالناصر کا سال کے اسی دن انتقال ہوا جس میں اللہ نے اپنے نبی محمد بن عبداللہ پر معراج کی تجلی ظاہر کی اور ان کو اپنے پاس سدرة المنتہیٰ تک دلجوئی اور پاس خاطر کے لئے بلایا، ٹھیک اسی طرح جس طرح اللہ نے اپنے حبیب جمال کے لئے کیا، آپ کا سفر بھی ٹھیک اسی طرح ہوا تھا جس طرح جمال کا ہوا، جمال عبدالناصر کا انتقال نہیں

ہوا بلکہ وہ آسمانی سفر پر اس طرح روانہ
ہوئے جس طرح انبیاء اور قدوسیوں
کا سفر ہوتا ہے۔"
(الجمہوریہ ۳ اکتوبر ۱۹۷۰ء بحوالہ عالم عربی کا المیہ ص۲۱)
یہی اخبار ایک دن لکھتا ہے:۔
"اے وہ جس سے بڑھ کر معزز و محترم دنیا
نے کبھی نہیں دیکھا، حوادث کے سامنے ثابت قدم
رہنے والا اور جس وقت چاہے، جہاں چاہے
اور جس طرح چاہے ان میں تصرف کرنے والا۔"
(عالم عربی کا المیہ ص۲۱)

مولانا علی میاں ندوی اور ان کے تلامذہ
نے جب اس عرب قومیت اور اس کے سب سے بڑے
داعی وعلمبردار صدر ناصر کی مخالفت کا بیڑا اٹھایا تو
بعض دینی حلقوں کو یہ اچھا نہیں لگا بلکہ ان کی طرف
سے اس کی مذمت کی گئی۔

مولانا نے "صدر ناصر کی مخالفت کیوں"
کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جس میں تفصیل سے
ان اسباب پر روشنی ڈالی جنہوں نے انھیں ناصر
کی مخالفت کے لئے مجبور کیا۔ اس کا ایک اقتباس
یہ ہے:

مجھے اس کا اقرار ہے

"میں ہندوستان میں صدر ناصر کا بہت
بڑا مخالف سمجھا جاتا ہوں اور تعجب نہیں
اگر بہت سے لوگ مجھے اس ملک میں
ان کا سب سے بڑا مخالف سمجھتے ہوں،
مجھے بھی اس کا اقرار ہے کہ میں دس بارہ
برس سے ان کا شدید مخالف اور عربی
اردو دونوں زبانوں میں نیز تقریر و تحریر
کے ذریعہ ان پر شدید تنقید کرتا رہا ہوں،
میں اپنے اس طرز عمل کے بارے میں کسی
معذرت اور تاویل کی ضرورت نہیں سمجھتا۔"
(عالم عربی کا المیہ ص۱۴۸)

ہندوستان کے طبقۂ علماء سے گلہ

افسوس ہے کہ ہمارے ہندوستان
کے بہت سے اہل علم ممالک عربیہ کے جدید تغیرات
اور تازہ واقعات سے پورے طور پر واقف نہیں،
ان کو اندازہ نہیں کہ اس مدت میں وہاں کیا فکری
اور ذہنی انقلاب رونما ہوگیا اور معاملہ کہاں سے
کہاں پہونچ گیا ہے، ان کا ذریعہ معلومات زیادہ
سے زیادہ مصر و شام کے چند مذہبی رسالے اور
علمی و فقہی تصنیفات یا وہ معلومات ہیں جن کی ان
ملکوں کے سفارت خانے اشاعت کرتے رہتے
ہیں وہ سمجھ رہے ہیں کہ وہاں جو کچھ ہو رہا ہے وہ
صرف سرمایہ دار طبقہ کی چند ناانصافیوں کا خاتمہ
مصری معاشرے کی اصلاح اور معاشی زندگی کی
تنظیم ہے، ان میں بہت سے لوگ اب بھی اسے
طرز عمل کے لئے قرآن مجید کی آیات سے استدلال
اور حضرت ابوذر غفاری رضی کی زندگی سے مثال
پیش کرتے ہیں۔

تبلیغی جماعت اور حضرت مولانا علی میاں ندوی رح

مولانا مشاد علی صاحب قاسمی اپنی کتاب
"حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اکابر
ومشاہیر امت کی نظر میں" "تبلیغی جماعت سے
حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی وابستگی اور حضرت
مولانا محمد الیاس صاحب رح سے ان کے تعلقات
پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"حضرت مولانا (رحمۃ اللہ علیہ) تبلیغی جماعت
کے اولین معماروں میں سے ہیں اور اس
جماعت کے لئے بے شمار قربانیاں دے کر
افراد سازی و میدان سازی کر کے جماعت
کے لئے ملک و بیرون ملک میں کام کے
راستے آسان کرنے میں آپ کا کلیدی رول
رہا ہے، ہندوستان میں آپ نے بڑے
بڑے علماء اور مدارس و کالجز اور یونیورسٹیوں
کے طلبہ کو وسیع پیمانے پر اس کام میں
جوڑا، پھر ملک سے باہر اس دعوت کو عام
کرنے کے لئے قلب اسلام یعنی حرمین
شریفین (سعودی عرب) میں خاص اسی
مقصد کے لئے ایک طویل مدت تک قیام
کیا، اور اپنی خداداد صلاحیتوں اور انتھک
جدوجہد کے ذریعہ ایسا ماحول اور مخلص
معاونین کی ایک بڑی تعداد ایسی تیار کردی
جن کے ذریعہ تبلیغ و دعوت کا یہ کام عرب
ملکوں میں پھیلا، گویا عرب ممالک میں تبلیغ
و دعوت کے اس کام کو موجودہ مروجہ
انداز میں شروع کرنے اور عربوں کو اس
کار خیر پر لگانے کا سہرا حضرت مولانا رح
کے سر ہے۔" (ص۲۶)

مولانا محمد الیاس صاحب رح کے جانشین
مولانا محمد یوسف صاحب مولانا علی میاں رح کو ایک
خط میں لکھتے ہیں:۔

"حضرت عالی! مجھے دل سے اعتراف
ہے کہ آپ نے حضرت مرحوم کی اس وقت
قدر کی جس وقت یہ ناچیز ناقدری کر رہا
تھا اور آپ نے اس وقت اس عمل کی
طرف قدم اٹھایا جس وقت یہ حقیر اس سے
پہلو تہی کر رہا تھا آپ سنتے تھے تعمیل کرتے
تھے، سمجھتے تھے اور محفوظ رکھتے تھے اور
اس کام کے انہماک اور دعوت کی طرف
تیزی کے ساتھ بڑھتے چلے جا رہے تھے
اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعوت میں تاثیر
دی، اضلاع متصلہ سے باہر یہ کام آپ ہی
کی وساطت اور دعوت سے پھیلا اور علمی
حلقہ میں آپ ہی کی وساطت سے یہ چیز

پہونچی۔

علماء میں سے جماعتوں کو لے کر پھرنے کی طرف آپ ہی نے سبقت فرمائی، علمی حلقہ کی طرف اس دعوت کو لے کر آپ ہی بڑھے، علماء کی طبائع کا جائزہ حضرت مرحوم آپ ہی کی وساطت سے لیا کرتے، اور ان کے شکوک وشبہات کا ازالہ آپ ہی کے ذریعہ فرماتے۔"

(حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اکابر ومشاہیر امت کی نظر میں ص ۵۴)

لیکن مولانا محمد الیاس صاحب کی وفات کے بعد مولانا میں وہ جوش وخروش باقی نہیں رہا جو ان کی زندگی میں تھا اس کی وجہ خود "کاروان زندگی" میں تحریر فرمادی ہے۔

"میرا موقف اور طریق فکر" کے عنوان سے لکھتے ہیں، حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی ذات سے گہری عقیدت، ان کے فہم دین اور اخلاص پر کامل اعتماد، اس کام کی ضرورت اور افادیت پر یقین اور نہ صرف عملی شرکت بلکہ داعی اور ترجمان کے فرائض انجام دینے کے ساتھ (جو مولانا کے لئے بھی مسرت اور اطمینان کا موجب تھی)۔

"واقعہ یہ ہے کہ میرے ذہن کے سانچے کی (جو ایک خاص علمی ماحول اور مطالعہ سے تیار ہوا تھا) مکمل شکست وریخت عمل میں نہیں آئی تھی اور اس کی جگہ کسی دوسرے ذہنی اور فکری سانچے نے نہیں لی تھی، یہ صورت حال ان لوگوں کو اکثر پیش آتی ہے جن کا ذہنی اور فکری سانچہ پہلے سے تیار ہوگیا ہو، اور انھوں نے اپنے ذہن ومطالعہ سے کام لینا نہ چھوڑا ہو، زیادہ صحیح الفاظ میں انھوں نے دماغی سپر اندازی اور ماضی سے مکمل علاحدگی اختیار نہ کی ہو، اس لئے تحریکوں اور دعوتوں کے لئے وہ لوگ زیادہ مفید اور کارآمد ہوتے ہیں جن کا سانچہ انہی تحریکوں اور دعوتوں میں آنے کے بعد بنتا ہے، اور ان کو کوئی فکری ہجرت یا سفر نہیں کرنا پڑتا۔

میرا معاملہ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے اس سے مختلف تھا، میرا ایک فکری وعلمی پس منظر تھا، اصلاحی اور تجدیدی تحریکوں اور ان کی مرکزی شخصیتوں کا میں نے نہ صرف مطالعہ کیا تھا بلکہ ان کے تعارف وتذکرہ نویسی کا شرف بھی حاصل ہوا تھا، میں ہر دور میں منصوصات وغیر منصوصات اور مقاصد ووسائل میں فرق کرتا رہا، اور میرے نزدیک خوب سے خوب تر کی تلاش اور نافع سے انفع کی جستجو کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا، اسی طرح میرے نزدیک ہر تحریک ہر دعوت اور ہر ادارے میں جو دین کی خدمت اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے قائم ہو نمو وارتقاء، زندگی اور اس کے مسائل سے واقفیت اور جائزہ اور ضروری حد تک ان کی تکمیل اور زندگی کی تطبیق کی کوشش ضروری ہے ورنہ وہ تحریک اور ادارہ نمو اور زندگی کی صلاحیت سے محروم اور جمود کا شکار ہو جائے گا، اور اس کی افادیت محدود سے محدود تر ہو کر رہ جائیگی۔

ان خیالات نے جو میرے خاص ماحول مطالعہ اور ذہنی ساخت کا نتیجہ تھے کسی دور میں ساتھ نہیں چھوڑا، اور میں مولانا کی حیات میں بھی کبھی کبھی تنہائی میں اقبالؔ کا یہ شعر پڑھتا تھا ؎

اسی کشمکش میں گذریں میری زندگی کی راتیں
کبھی سوز وساز رومی، کبھی پیچ وتاب رازی

لیکن مولانا کی قوت نسبت، دریے پایاں شفقت اور عملی مشغولیت نے ان کی حیات کے پورے عرصہ میں اس فکر کو دبا رکھا تھا، مولانا کی وفات کے بعد وہ نمایاں طریقہ پر ابھرنے لگی اس نے پہلے یہ شکل اختیار کی کہ کام کو جواب سارے ہندوستان میں تقریباً پھیل چکا تھا، اور دوسرے ممالک کی طرف بڑھ رہا تھا کچھ زیادہ منظم، مؤثر اور ذہین وعلمی طبقہ کے لئے اطمینان بخش اور پرکشش بنانے کے لئے اصول دعوت۔ اور اس کے ان اجزاء کو قائم رکھتے ہوئے (جن کو اس تحریک میں ۶ نمبر کے نام سے یاد کیا جاتا تھا) کم تبدیلیوں اور زیادہ اضافوں کی ضرورت ہے، مختلف مجالس میں مولانا محمد یوسف صاحب اور ان کے اہل شوریٰ سے اس موضوع پر گفتگو ہوئی، مگر اندازہ ہوا کہ ان کا ذہن اس کا ساتھ نہیں دیتا اور وہ اس کی تائید میں نہیں ہیں، اور شاید مولانا کی وفات کے بعد دعوت کے اس ابتدائی مرحلہ میں اس احتیاط کی کسی قدر ضرورت بھی تھی، کئی بار متوجہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ جب تک خود اصل داعی کے ذہن میں جو دعوت کا روح رواں ہے، کسی ضرورت کا احساس، اور کسی تبدیلی کا تقاضا پیدا نہ ہو، باہر سے مشورہ دینا خصوصاً ان لوگوں کا جو عمل اور قربانی دینے والوں کے صف اول میں نہیں ہیں، اور جنہوں نے اپنی پوری زندگی وقف نہیں کر دی ہے، مفید اور مؤثر نہیں ہوا کرتا، اور بہت سے داعی اور ذمہ دار اس کو اسی نظر سے دیکھتے

ہیں، جیسے کوئی ایسا شخص امام کو لقمہ دے جو نماز میں شریک نہ ہو اور جس کے قبول کر لینے کو فقہاء مفسد صلوٰۃ کہتے ہیں۔

اس احساس اور بار بار کی کوششوں کے غیر مفید ہونے کے تجربہ پر، نیز جماعت کے اخلاص وللہیت، مولانا محمد یوسف صاحب کی قوت باطنی اور قوت دعوت اور اس میں فنائیت اور استغراق اور کام کے ہر حال میں نہ صرف مفید بلکہ زندگیوں میں تبدیلی لانے والا عمل دیکھ کر اس سلسلہ کو وہیں روک دینا مناسب سمجھا گیا، البتہ اپنے ذہن کے کام کرتے رہنے کو روکنا قدرت میں نہیں تھا، اس لئے یہ فیصلہ کیا کہ مرکز سے اس تعلق اور دعوت کی معنویت کو جاری رکھا جائے گا، البتہ اپنے دائرۂ کار (لکھنؤ اور اس کے اطراف) میں اس کو زیادہ مفید بنانے اور حالات و ماحول کا لحاظ رکھنے اور دعوت وتفہیم کی اپنی زبان استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ " قُلْ كُلٌّ يَعْمَلُ عَلَىٰ شَاكِلَتِهِ فَرَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ أَهْدَىٰ سَبِيلًا " ایک دائمی اور عالمگیر حقیقت ہے۔"

(کاروان زندگی ج اول ص۳۱۶)

مولانا مودودی کی خدمات کا اعتراف اور افکار پر تنقید

مولانا علی میاں ندویؒ جس بات کو حق سمجھتے برملا اس کا اظہار کرتے تھے، محض کسی شخصیت یا کسی حلقہ کی ناراضگی کے خوف سے کبھی کسی رائے اور نظریہ کے اظہار میں تأمل نہیں کیا۔

مولانا مودودیؒ کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

" اس میں شک نہیں کہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اسلام سے قریب کرنے اور ان کے دلوں میں اسلام کی طرف سے اعتماد بحال کرنے میں ان کے قلم نے جو خدمت انجام دی ہے وہ ہر شبہ اور اختلاف سے بالاتر ہے، اور عالم اسلام کی نشأۃ ثانیہ کی جدید تحریک اور جدوجہد کی تاریخ میں ناقابل انکار اور ناقابل فراموش ہے"

(پرانے چراغ ج دوم ص۳۱۲)

" جہاں تک اس تعلیم یافتہ اور ذہین طبقہ کا تعلق ہے اس اثر انگیزی میں (اس ربع یا نصف صدی میں) مشکل سے کوئی مسلمان مصنف اور مفکر ان کا مقابل وہمسر ملے گا"

(پرانے چراغ ج دوم ص۳۱۳)

اس مضمون کا اختتام ان جملوں پر ہوتا ہے:-

" بحیثیت مصنف، متکلم، مفکر اور داعی کے ان کی امتیازی و انفرادی خصوصیات اور بڑائی کا نہ صرف فراخدلی بلکہ مسرت اور بہت سے مشترک روابط و خصوصیات کی بنا پر ایک گونہ فخر کے ساتھ اعتراف کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کو ان کی اسلامی خدمات کا پورا صلہ عطا فرمائے" (پرانے چراغ ج دوم ص۳۱۸)

کاروان زندگی میں مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

" میں اگرچہ ان حدود تک کبھی نہیں پہونچ سکا جہاں تک مولانا مودودی کے شدید ناقد پہونچے جو تکفیر و تفسیق سے کم کے الفاظ پر قانع نہیں، مجھے اب بھی ان کے بہت سے ذہنی کمالات و خیالات کی قدر ہے، اور میں ان کی بہت سی چیزوں کو تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لئے مفید اور چشم کشا سمجھتا ہوں، اور ان کے مطالعہ کا مشورہ دیتا ہوں"

(کاروان زندگی ج اول ص۳۲۵)

لیکن جب حضرت مولانا نے دیکھا کہ مولانا مودودی صاحب کے تفردات اور "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" کی شکل میں دین کی تفہیم و تشریح نوجوانوں کی فکر و تحریر کو متأثر کر رہی ہے تو انھوں نے ایک دینی فریضہ سمجھ کر "عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح" لکھی اور اس فکر پر تنقید کی۔

ان چند مثالوں سے بخوبی اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نور اللہ مرقدہ کی وفاداری حق کے ساتھ کبھی حق بات کہنے میں کسی کی رضا مندی یا ناراضگی کی مطلق پرواہ نہیں کرتے تھے۔

مولانا کی عربی کتابیں پڑھنے والوں کا ایک بہت بڑا حلقہ وہ ہے جسے تصوف اور صوفیوں سے اللہ واسطے بیر ہے، اس کی نگاہ میں صوفی ہونا اور تصوف سے کسی طرح کا کوئی تعلق رکھنا ناقابل معافی جرم ہے، مولانا نے اس حلقہ کی رعایت میں کبھی اہل حق صوفیاء کی تعریف اور ان کی خدمات و کارناموں کے تذکرہ میں بخل سے کام نہیں لیا بلکہ امام سرہندی، مخدوم شرف الدین بہاریؒ شیخ معین الدین چشتی، شیخ عبدالقادر جیلانی اور مولانا روم جیسے اکابر صوفیاء کا تذکرہ لکھا۔

اسی طرح مولانا نے متعدد اہل حدیث علماء پر مضامین لکھے جن میں ان کی دینی خدمات اور ان کے اخلاص وللہیت کا فراخدلی سے اعتراف کیا ہے

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

دنیا کے فساد کا ذمہ دار مذہب نہیں ہے۔

(حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ)

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ

ایک نظر میں

— معید اشرف ندوی

ولادت :

• ۶ محرم ۱۳۳۲ھ مطابق ۵ دسمبر ۱۹۱۳ء بروز جمعہ، بمقام تکیہ کلاں، رائے بریلی (یو۔پی)

والدین :

• والد کا نام حکیم سید عبدالحی، اور والدہ کا نام خیر النساء تھا اور "بہتر" تخلص لکھتی تھیں، ڈاکٹر سید عبدالعلی ۱۳۸۱ھ آپ کے بڑے بھائی اور امۃ اللہ تسنیم صاحبہ م ۱۳۹۵ھ اور امۃ العزیز آپ کی بڑی بہن تھیں، مولانا مرحوم کی والدہ محترمہ حافظ قرآن تھیں اور آپ کی خالہ، اور خالہ زاد بہن، ممانی اور پھوپھی سب کی سب حفظ قرآن کئے ہوئے تھیں، نو سال کی عمر میں آپ کے والد ۱۳۴۱ھ اور ۵۶ سال کی عمر میں آپ کی والدہ کا ۱۳۸۸ھ میں انتقال ہوا،

ابتدائی تعلیم :

• ابتدائی تعلیم والدہ محترمہ سے حاصل کی، اس کے بعد مولانا سید عزیز الرحمٰن حسنی اور مولانا محمود علی سے قرآن مجید، اردو، فارسی پڑھی،

عربی تعلیم :

• باقاعدہ عربی تعلیم کا آغاز شیخ خلیل بن محمد انصاری یمانی سے اور ڈاکٹر تقی الدین ہلالی مراکشی سے حاصل کی، اور ان ہی کی تربیت میں عربی زبان و ادب کی تکمیل بھی کی ۔

علم تفسیر :

شیخ خلیل بن محمد انصاری سے منتخب سورتوں کی تفسیر کا درس لیا، اور مفسر قرآن مولانا احمد علی لاہوری (وفات ۲۳ فروری ۱۹۶۲ء) سے ان کے ترتیب دیئے نظام کے مطابق ۱۳۵۱ھ میں لاہور میں قیام کرکے پورے قرآن کریم کی تفسیر پڑھی،

علوم شرقیہ :

۱۹۲۷ء میں لکھنؤ یونیورسٹی کے علوم شرقیہ کے شعبہ میں داخلہ لیا، اس وقت مولانا لکھنؤ یونیورسٹی کے سب سے کم سن طالب تھے، اور یونیورسٹی سے فاضل ادب کی امتیازی سند حاصل کی۔

علم حدیث :

۱۹۲۹ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء کے شیخ الحدیث مولانا حیدر حسن خاں کے درس حدیث میں خاص طور سے شرکت کی اور ان سے صحیحین اور سنن ابی داؤد، اور سنن ترمذی حرفاً حرفاً پڑھی،

• ۱۹۳۲ء میں دار العلوم دیوبند جاکر شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ سے علم حدیث کے اسباق سے استفادہ کیا۔ اور آپ کے تفسیر و علوم قرآن کے اسباق میں بھی شرکت کی۔

علم فقہ :

دار العلوم دیوبند میں مولانا اعزاز علی صاحب سے علم فقہ کا درس لیا۔

علم تجوید :

قاری اصغر علی صاحب سے روایت حفص کے مطابق تجوید پڑھی،

نکاح :

شادی نومبر ۱۹۳۴ء میں حقیقی ماموزاد بہن سید احمد سعیدؒ صاحب کی صاحبزادی حضرت شاہ ضیاء النبیؒ کی پوتی اور مفتی عبدالرزاق صاحب صاحب صمصام الاسلام منظوم ترجمہ فتوح الشام کی نواسی سے ہوئی اور مہتمم و شیخ الحدیث دار العلوم ندوۃ العلماء مولانا حیدر حسن خاںؒ نے خطبہ نکاح پڑھا۔ آپ کی کوئی صلبی اولاد نہیں ہے، مگر روحانی اعتبار سے دنیا میں آپ کے عقیدت مندوں کی تعداد لاکھوں ہی نہیں کروڑوں ہے۔

فلسفہ :

مولانا سید سلیمان ندویؒ سے فلسفہ پڑھا، اور سید صاحب کے عزیز شاگرد رہے اور ان کے علم و طرز کار سے فیض حاصل کیا، اور علامہ شبلیؒ کے اسلوب و طرز بیان کے نہ صرف قدرداں رہے بلکہ خوشہ چیں بھی تھے،

سلوک و طریقت :

۱۹۳۱ء میں مولانا احمد علی لاہوریؒ کے شیخ مولانا غلام محمد بھاولپوریؒ سے بیعت کا شرف حاصل کیا، ۱۹۴۶ء میں اپنے شیخ کے اشارے پر مولانا عبدالرحیم رائے پوری کے خلیفہ مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ سے بیعت ہوئے۔

انگریزی تعلیم :

۱۹۲۷ء سے ۱۹۳۰ء کے درمیان انگریزی زبان سیکھنے پر توجہ دی جس سے اسلامی موضوعات اور عربی تہذیب و

تاریخ وغیرہ پر انگریزی کی کتابوں سے براہِ راست استفادہ کرنے کے لائق ہوئے۔

حلیہ ولباس: درمیانہ قد، بلندی تقریباً ساڑھے پانچ فٹ، گول چہرہ، صبیح رنگ، ہاتھ مخمل جیسا نرم وملائم، حساس طبیعت، ہمیشہ سفید کپڑے زیب تن فرماتے، کرتہ اور چوڑی مہری کا پائجامہ جو ٹخنوں سے اوپر رہتا، ٹوپی کبھی کھڑی دیوار، کبھی پلے دار، عیدین وتقریبات وسفر میں شیروانی پہنتے تھے اور عیدین کے موقع پر سر پر رومال اور جبّہ، چھڑی، تسبیح اور جیب گھڑی ساتھ رہتی،

رنج اور خوشی:

حضرت مولانا کے خادم خاص حاجی عبدالرزاق صاحب بتاتے ہیں کہ میں ۱۹۶۰ء سے مستقل حضرت کے ساتھ سفر وحضر میں رہا حضرت کا سب سے ممتاز خاصہ تواضع وانکساری ہے۔

اس چالیس سال کی طویل مدت میں ایک بار کسی بات پر حد درجہ ناراضگی جتاتے ہوئے صرف اتنا فرمایا، "تکلیف ہوئی" اور اس مدّت میں خوشی کا لمحہ وہ تھا جب ۱۹۹۸ء میں حرم شریف حاضری کے وقت کلید بردار نے کلید کعبہ شریف کے چوکھٹ پر رکھتے ہوئے، تالہ کھولنے کا اشارہ کیا، اور دخول کعبہ کا شرف حاصل ہوا۔

غم کا لمحہ: سب سے زیادہ غم ۱۹۶۱ء میں اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کی وفات کے وقت حاضر نہ رہنے کا، اس وقت حضرت مولانا برما کے سفر پر تھے،

پسندیدگی: سال کے دو ہی مہینے (علاوہ دسمبر و جنوری) برف کا ٹھنڈا پانی پیتے، چائے صبح ناشتہ کے بعد اور بعد عصر ایک وقت میں دو تین پیالی پینے کا معمول تھا۔ چائے کی پیالی لبریز اور گرم اتنی کہ لب سوز اور میٹھی اتنی کہ لب باز ہو،....

معمولات: رات کے آخری حصہ میں فجر کی نماز سے پہلے یاد الٰہی میں مشغول رہتے، بعد فجر ٹہلنے کا معمول تھا، آخری دنوں میں بیماری، کمزوری اور بے خوابی کی وجہ سے آرام فرماتے تھے، سات سے ۷½ بجے تک ناشتہ اور لوگوں سے ملنے کا معمول تھا۔ اس کے بعد نماز چاشت تلاوت قرآن مجید اور پھر دو تین معاونین کے ساتھ لکھنے پڑھنے کے لئے بیٹھ جاتے اور ۱۲½ بجے تک تصنیف، تالیف اور خطوط کے جوابات دیتے، بعد نماز ظہر کھانا کھاتے، اور اس کے فوراً بعد آرام فرماتے اور عصر کی نماز سے پہلے کبھی ڈاک، کبھی ملاقات اور کبھی قرآن مجید پڑھنے کا معمول تھا۔

عصر بعد مہمانوں سے ملاقات فرماتے، اور اور مغرب کی نماز سے بیس منٹ پہلے نماز کی تیاری، بعد نماز مغرب ـــــ اندرون خانہ جاتے، اگر تکیہ میں رہتے، اور سفر کی روانگی سے قبل قبرستان جاکر فاتحہ پڑھتے۔ عشاء کی نماز کے بعد کھانا کھاتے اور کھانے کے بعد تھوڑی دیر لوگوں کے ساتھ بیٹھتے، اس کے بعد تھوڑی دیر طلبہ واساتذہ سے گفتگو فرماتے۔ اور دس بجے تک سوجانے کا معمول تھا۔

ظرافت: حضرت مولانا کی طبیعت میں خشکی نہیں تھی، بلکہ طبعاً بہت ظریف تھے ایک مرتبہ

- انجینئر امتیاز صاحب جو ندوہ، تکیہ ضیاء العلوم اور تمیزوا کی عمارتوں کی نگرانی کرتے ہیں حضرت کا پیر دبانے لگے حضرت نے فرمایا آپ چھوڑ دیں، جہاں آپ کا ہاتھ لگتا ہے وہاں عمارت کھڑی ہوجاتی ہے، ایک مرتبہ
- حافظ عتیق الرحمٰن صاحب (ناظر مطبخ دارالعلوم ندوۃ العلماء) کا جب مطبع ندویہ سے مطبخ قدیم تبادلہ ہوا تو وہ حضرت سے مل کر اس کی اطلاع دی آپ نے فرمایا کہ صرف ع۔خ کا فرق ہے یعنی مطبع سے مطبخ آئے ہیں
- حاجی عبدالرزاق صاحب (حضرت کے خادم خاص) کے بارے میں ایک خط میں لکھا کہ یہ ہمارے زندگی کے ساتھی اور بوڑھاپے کی لاٹھی ہیں۔ ایک مرتبہ آپ بیٹھے ہوئے تھے کہ نیند آگئی کسی نے آپ کے کندھوں کے پاس سے کھٹمل پکڑا اور کہا حضرت کھٹمل تھا، آپ نے برجستہ کہا کہ میرا نام بھی تو علی ہے۔

علمی ودعوتی زندگی کا آغاز

- ۱۹۳۴ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مدرس بنائے گئے اور تفسیر وحدیث، ادب عربی، تاریخ ومنطق کے مضامین پڑھائے۔

۱۹۳۹ء میں دینی مراکز سے واقفیت کیلئے ایک سفر کیا جس میں حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ اور مولانا محمد الیاسؒ کاندھلوی سے تعارف حاصل ہوا، اور اسی وقت سے ان سے مستقل ربط وتعلق ہوگیا چنانچہ اول الذکر سے روحانی تربیت حاصل کی اور ثانی الذکر کی رہنمائی وسرپرستی میں تبلیغ ودعوت کا فریضہ انجام دیا۔ اور یہ تعلق تاحیات قائم رہا۔

- ۱۹۴۳ء میں انجمن تعلیمات اسلام کے نام سے ایک انجمن قائم کی جس میں قرآن کریم اور سنت نبویہ کے درس کا سلسلہ جاری کیا جو بے حد مقبول ہوا۔
- ۱۹۴۵ء میں ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی کے رکن کی حیثیت سے منتخب کئے گئے۔
- ۱۹۵۱ء میں علامہ سید سلیمان ندویؒ کی تجویز پر نائب معتمد تعلیم متعین کئے گئے۔
- ۱۹۵۱ء میں تحریک پیام انسانیت کی بنیاد ڈالی۔

• ۱۹۵۴ء میں علامہ سید سلیمان ندویؒ کی وفات کے بعد بالاتفاق معتمد تعلیم قرار پائے۔
• ۱۹۵۹ء میں مجلس تحقیقات و نشریات اسلام قائم کی۔
• ۱۹۶۱ء میں برادر بزرگ ڈاکٹر عبد العلی حسنی صاحب کی وفات کے بعد ناظم ندوۃ العلماء منتخب ہوئے۔

اعزازات، مناصب، تعلیمی اداروں اور تعلیمی مراکز کی رکنیت

• ۱۹۵۷ء میں دمشق کے مجمع اللغۃ العربیۃ کے مراسلاتی ممبر منتخب ہوئے۔
• ۱۹۶۲ء میں رابطہ عالم اسلامی کی تاسیس و قیام کے لئے پہلا جلسہ مکہ مکرمہ میں ہوا، جس میں جلالۃ الملک مسعود بن عبد العزیز اور لیبیا کے حاکم ادریس سنوسی بھی شریک تھے، اس جلسہ میں نظامت کے فرائض مولانا نے انجام دیئے
• ۱۹۶۲ء ہی میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کی تاسیس و قیام کے وقت اس کی مجلس شوریٰ کے ممبر بنائے گئے۔ اور مجلس شوریٰ کے خاتمہ تک اس منصب پر فائز رہے۔
• رابطۃ الجامعات الاسلامیہ (رباط مراکش) کی کانفرنس میں رابطہ عالم اسلامی کے سکریٹری جنرل کی قیادت میں شریک ہوئے، پھر ندوۃ العلماء کے نمائندہ کے طور پر مستقل ممبر رہے۔
• ۱۹۸۰ء میں اردن کے مجمع اللغۃ العربیۃ کے رکن بنائے گئے۔
• ۱۹۸۱ء میں کشمیر یونیورسٹی کی طرف سے ادب میں پی، ایچ، ڈی کی اعزازی ڈگری عطا کی گئی۔
• ۱۹۸۳ء میں آکسفورڈ کے اسلامک سنٹر کے قیام کے وقت تاحیات صدر بنائے گئے۔
• ۱۹۸۴ء میں رابطۃ الادب الاسلامی العالمیۃ کے قیام کے وقت تاحیات صدر بنائے گئے۔
• ۱۹۶۸ء میں سعودی وزیر تعلیم کی دعوت پر کلیۃ الشریعہ کے نصاب و نظام کی تیاری کے لئے ریاض تشریف لے گئے اور اس موقع پر وہاں جامعۃ الریاض اور کلیۃ المعلمین میں (ٹیچرس ٹریننگ کالج) کئی لیکچر دیئے۔
• ۱۹۳۲ء میں ندوۃ العلماء سے عربی نکلنے والے پرچے "الضیاء" کی ادارت میں اور ۱۹۴۰ء میں اردو پرچے الندوۃ کی ادارت میں شریک رہے اور ۱۹۴۸ء میں انجمن تعلیمات اسلام کی طرف سے "تعمیر" کے نام سے اردو میں ایک پرچہ نکالنا شروع کیا۔
• ۵۹-۱۹۵۸ء میں دمشق سے نکلنے والے پرچے المسلمون کے اداریئے تحریر فرمائے۔ پہلا اداریہ "ردۃ ولا ابا بکر لها" لکھا جس کا اردو ترجمہ نیا طوفان اور اس کا مقابلہ" کے نام سے شائع ہوا۔ اس کے علاوہ استاذ محب الدین خطیب کے پرچہ "الفتح" میں بھی بعض مقالات شائع ہوئے
• ۱۹۶۳ء میں لکھنؤ سے ندائے ملت نکلنا شروع ہوا ـــــ تو اس کی سرپرستی فرمائی۔ اور ۱۹۵۵ء میں ندوہ سے عربی رسالہ "البعث الاسلامی" اور ۱۹۵۹ء میں نکلنے والا عربی رسالہ "الرائد" نیز ۱۹۶۳ء سے نکلنے والا اردو رسالہ پندرہ روزہ "تعمیر حیات"، ان تینوں رسالوں کے سرپرست اعلیٰ رہے۔
• ۱۹۸۰ء میں اسلامی دنیا میں نمایاں علمی و عملی خدمات کے اعتراف میں (۱۴۰۰ھ) کا شاہ فیصل ایوارڈ آپ کو ۱۲ فروری ۱۹۸۰ء کو ریاض میں منعقدہ ایک پروقار تقریب میں دیا گیا حکومت سعودی عرب کا یہ اعزاز دو لاکھ چالیس ہزار ریال نقد (ہندوستانی رقم چوبیس لاکھ روپئے) اور ایک سند پر مشتمل تھا۔ حضرت مولانا مرحوم نے فیصل ایوارڈ کی نصف رقم افغان پناہ گزینوں اور بقیہ نصف رقم مکہ مکرمہ کے دو دینی اداروں (ادارہ حفظ قرآن اور مدرسہ صولیتہ) کو برابر تقسیم کر دیا۔
• علامہ سید سلیمان ندویؒ کی سیرت النبی جلد ۸ پر مقدمہ حضرت مولاناؒ نے لکھا تھا۔ کتاب جب پاکستان سے شائع ہوئی تو صدر ضیاء الحق مرحوم نے حضرت مولانا مرحوم کو ایک لاکھ روپئے کا ایوارڈ دیا، حضرت مولانا مرحوم نے نصف رقم دار المصنفین اعظم گڑھ اور نصف رقم علامہ سید سلیمان ندویؒ کی اہلیہ کو عنایت کر دی۔
• ۱۹۹۹ء میں دبئی کے بین الاقوامی حسن قرأت کے عالمی مقابلہ کے موقع پر عالم اسلامی کی عظیم اسلامی شخصیت کا ایوارڈ ایک شاندار تقریب میں پیش کیا گیا۔ یہ رقم بھی حضرت مولانا نے ہندوستان کے تمام دینی اداروں میں تقسیم کر دی جو تقریباً ایک کروڑ بیس لاکھ تھی۔
• ۱۹۹۹ء میں آکسفورڈ اسلامی سنٹر کی طرف سے تاریخ دعوت و عزیمت کے سلسلہ میں سلطان حسن بلقیہ (برونائی انٹرنیشنل ایوارڈ سے نوازے گئے، یہ رقم بھی احباب اور ضرورتمندوں کو تقسیم کر دی)

رکنیت:

• ۸ رجون ۱۹۶۱ء کو ناظم دار العلوم ندوۃ العلماء منتخب ہوئے
• صدر دینی تعلیمی کونسل اترپردیش۔
• صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ
• صدر مجلس انتظامی و مجلس عاملہ دار المصنفین اعظم گڈھ،
• صدر اسلامک سنٹر آکسفورڈ یونیورسٹی لندن۔
• صدر فاؤنڈیشن فار اسٹڈیز اینڈ ریسرچ لکزمبرگ۔
• صدر مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ۔
• صدر عالمی رابطہ ادب اسلامی۔
• رکن مؤسسۃ آل البیت، عمان، اردن،

- بانی وصدر تحریک پیام انسانیت لکھنؤ
- رکن مجلس تاسیسی رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ
- رکن مجلس شوریٰ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ۔
- رکن عربی اکیڈمی دمشق وقاہرہ واردن۔
- رکن اکیڈمی آف لیٹرس دمشق یونیورسٹی دمشق۔
- رکن مجلس عاملہ مؤتمر عالم اسلامی بیروت۔
- رکن مجلس انتظامی اسلامک سنٹر جنیوا۔
- رکن مجلس برائے فقہ اسلامی رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ
- رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند۔
- رکن مجلس عاملہ اسلامک یونیورسٹیز فیڈریشن رباط مراکش
- رکن اکیڈمی آف عربی لینگویجز عمان • رکن نیشنل فاؤنڈیشن فار ٹرانسلیشن ریسرچ اینڈ اسٹڈیز تیونیشیا
- وزیٹنگ پروفیسر دمشق مدینہ یونیورسٹی۔

اسفار : ۱۹۲۹ء میں لاہور کا سفر کیا جو دور دراز کا سب سے پہلا سفر تھا۔ جہاں لاہور کے علمی ودینی بزرگوں سے ملاقاتیں کیں اور شاعر اسلام ڈاکٹر محمد اقبال سے بھی ملے، جن کی نظم "چاند" کا عربی میں ترجمہ کیا تھا اسے پیش کیا۔

- ۱۹۳۵ء میں دلتوں کے لیڈر ڈاکٹر امبیڈکر کو اسلام کی دعوت دینے کے لئے بمبئی کا سفر کیا۔
- ۱۹۴۷ء میں حج کا پہلا سفر کیا، اور چند ماہ حجاز میں قیام رہا۔ یہ بیرون ملک کا سب سے پہلا سفر تھا، اور حج کا دوسرا سفر ۱۹۵۰ء میں ہوا، اور وہیں سے مصر، سوڈان وشام واردن کا سفر کیا۔
- ۱۹۵۱ء میں مصر کا پہلا سفر تھا جبکہ مولانا کی کتاب ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین (انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر) مولانا سے پہلے وہاں کے تمام علمی حلقوں میں پہنچ کر متعارف ہو چکی تھی، یہ کتاب خود مولانا کیلئے تعارف کا بہترین ذریعہ ثابت ہوئی۔ اسی سفر میں فلسطین بھی گئے اور بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ کی زیارت کی واپسی میں اردن کے حکمراں شاہ عبداللہ سے ملاقات ہوئی۔
- ۱۹۵۶ء میں ترکی کا پہلا سفر کیا۔ (جس کی روداد دو ہفتے ترکی میں) کے عنوان سے شائع ہوئی اسی سال لبنان کا سفر بھی کیا۔
- ۱۹۶۰ء میں برما کا سفر کیا۔
- ۱۹۶۲ء میں کویت کا پہلا سفر کیا بعد میں کویت اور خلیجی ممالک کے متعدد اسفار ہوئے اردن اور یمن کا سفر بھی ہوا۔ اور جگہ جگہ دعوتی خطاب ہوئے۔
- ۱۹۶۳ء میں یورپ کا پہلا سفر ہوا جس میں لندن، پیرس کیمبرج اور آکسفورڈ وغیرہ جانا ہوا۔ اور اسپین کے اہم شہر بھی گئے۔
- ۱۹۷۶ء میں مسجد اقصیٰ کا سفر ہوا۔
- ۱۹۷۷ء میں امریکہ کا پہلا سفر ہوا، یہ دو ماہ دس دن کا سفر تھا، اس سفر میں امریکہ کے مختلف شہروں میں جانا ہوا۔ اور دعوتی ودینی خطاب ہوئے اور آنکھ کا آپریشن بھی کرایا۔
- ۱۹۷۷ء میں افغانستان۔ ایران، عراق اور لبنان (مراکش) کیلئے رابطہ عالم اسلامی کے وفد کی قیادت کی۔
- ۱۹۸۵ء میں بلجیم کا سفر ہوا۔
- ۱۹۸۷ء میں تاشقند وسمرقند وغیرہ کا سفر ہوا، اردن کا سفر ۱۹۷۳ء اور ۱۹۸۴ء میں ہوا۔
- اسپین ۱۹۶۳ء، افغانستان ۱۹۷۳ء، متحدہ عرب امارات ۱۹۷۴ء، ۱۹۷۶ء، ۱۹۸۳ء، ۱۹۸۸ء ۱۹۹۳ء اور آخر میں ۱۹۹۹ء، شمالی امریکہ ۱۹۷۷ء ۱۹۹۳ء، یورپ ۱۹۶۳ء، ۱۹۶۴ء، ۱۹۶۹ء، ۱۹۸۳ء، ۱۹۸۶ء، ۸۷ء، ۸۹ء، ۹۲ء، ۹۳ء

ایران ۱۹۷۳ء
پاکستان ۱۹۵۹ء ۶۴ء ۷۸ء، ۸۴ء ۸۶ء
بخارا ۱۹۸۶ء
برطانیہ ۱۹۶۳ء، ۱۹۸۵ء
بنگلہ دیش ۱۹۸۲ء
برما ۱۹۶۰ء
ترکی ۱۹۵۶ء، ۶۴ء، ۸۶ء، ۸۹ء، ۹۳ء، ۹۶ء
الجزائر، ۱۹۸۲ء ۱۹۸۶ء
حجاز، ۱۹۴۷ء ۵۱ء، ۶۲ء، ۶۵ء، ۶۷ء، ۶۹ء
اس کے علاوہ بھی کئی اسفار ہوئے
قطر، ۱۹۷۹ء ۱۹۹۵ء
الرباط، ۱۹۷۶ء
سری لنکا، ۱۹۸۲ء
سمرقند، ۱۹۹۳ء
سوڈان، ۱۹۵۱ء
شام، ۱۹۵۱ء ۵۶ء، ۶۴ء، ۷۳ء
عراق، ۱۹۵۶ء، ۱۹۷۳ء،
عمان، ۱۹۵۱ء، ۱۹۷۳ء، ۱۹۸۴ء، ۱۹۹۸ء،
فلسطین، ۱۹۵۱ء
کویت، ۱۹۶۲ء ۶۸ء، ۸۳ء، ۸۷ء،
لبنان، ۱۹۵۶ء، ۱۹۷۳ء
لاہور، ۱۹۲۹ء
ملیشیا، ۱۹۸۲ء، ۱۹۸۷ء،
مراکش، ۱۹۸۶ء۔
مصر، ۱۹۵۱ء۔
یمن، ۱۹۸۴ء۔

تأثرات مع تاریخ وفات

— • مجیب الغفار اسعدؔ اعظمی

آہ صد افسوس سید ابوالحسن رخصت ہوئے
عالم بے مثل تھے وصاحب طبع نفیس
فکر اسلامی میں تھا ان کا بہت اونچا مقام
مختلف علمی اداروں کے وہ تھے رکن ورئیس
مغفرت کران کی اے اللہ اپنے لطف سے
قبر کی وحشت میں ہو تیرا کرم ان کا انیس
اسعدؔ اسوئے جناں جس دن ہوا اُن کا سفر
تھا جمعہ، بائیس رمضاں، اور سن چودہ سو بیس

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

اور تحریک پیامِ انسانیت

● ڈاکٹر محمد ایوب ندوی ریڈر شعبۂ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ ایک جامع اور ہمہ جہت شخصیت تھے۔ وہ ایک عالم، ایک ادیب، ایک داعی، اور مفکر تھے انھوں نے مختلف محاذوں پر اسلام کی خدمت کی، انھوں نے عالم عرب اور عالم اسلامی کی نازک موقعوں پر رہنمائی کی۔ ان کی عربی تحریروں نے عرب نوجوانوں کے قومیت عربیہ واشتراکیت کے دھارے میں بہنے سے روکنے کیلئے سدِ عالی کا کام کیا۔ مگر اسلامی دنیا کے عالمی مسائل میں اُلجھ کر وہ اپنے وطنِ عزیز اور اس دیش کے رہنے والوں کو نہیں بھولے،

۱۹۵۲ء کے بعد کا زمانہ تھا، مولانا مرحوم کو تبلیغی دوروں میں مختلف مخلوط اجتماعات کو خطاب کرنے کا موقع ملا۔ مولانا مرحوم کی ان تقریروں کو عوام، مسلمان وغیر مسلم سبھی حضرات نے توجہ سے سُنا۔ اور متعدد غیر مسلم تعلیم یافتہ طبقوں نے آپ کے خیالات کو بے حد سراہا، ان مخلوط اجتماعات کے تجربہ سے مولانا مرحوم کو محسوس ہوا کہ مسلمانوں سے دوری اور بے تعلقی کی وجہ سے غیر مسلم ہم وطنوں میں بہت سی غلط فہمیاں، اور شکوک وشبہات ہیں ان احساسات نے مولانا مرحوم کو بہت سوچنے پر مجبور کیا۔ اور مولانا مرحوم ہی کے الفاظ میں

" اسی تجربہ اور اقدام نے ۱۹۷۴ء میں " پیامِ انسانیت " کی تحریک کی شکل اختیار کرلی، جس کا تجربہ پچھلے تجربوں کی طرح کامیاب رہا۔ اور اس نے اکثریت کے طبقہ انصاف پسند غیر مسلموں اور دانشوروں میں اسلام اور سیرت کے مطالعہ کا کسی درجہ میں شوق اور جذبہ بھی پیدا کیا، ہندوستان انسانی بحران، اخلاقی انتشار، انسانی جان ومال کے عدم احترام وتحفظ، خودغرضی اور دولت پرستی کے جنون کی وجہ سے جس خطرہ سے دوچار ہے اس کا مہیب نقشہ پیش کرنے اور ملک کو بچانے کی جدوجہد کی دعوت دینے پر بعض ممتاز ہندوؤں نے یہاں تک کہا کہ آج معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو اس ملک کے بچانے کی فکر ہم سے زیادہ ہے۔"

(کاروانِ زندگی حصہ اول ص۳۰۰)

تحریک پیام انسانیت برپا کرنے کا خیال مولانا مرحوم کو کیوں اور کب آیا۔ آپ جبکہ تصنیف وتالیف کے کام میں مصروف تھے اور تبلیغی جماعت کے ایک اہم ترجمان، داعی اور اس کے مقاصد کے شارح اور مبلغ کی حیثیت سے کام میں مشغول تھے، اور پھر ندوۃ العلماء کے انتظام کی غیر معمولی ذمہ داری، اس بے پناہ مصروفیت کے باوجود مولانا مرحوم کو پیامِ انسانیت کا خیال کیسے آیا۔ مولانا مرحوم فرماتے ہیں :۔

" روزمرہ کا مشاہدہ تھا کہ یہ ملک تیزی کے ساتھ اخلاقی انارکی، بلکہ قومی و اجتماعی خودکشی کی طرف جارہا ہے، اخلاقی قدریں بے دردی کے ساتھ پامال کی جارہی ہیں، خودغرضی بلکہ خود پرستی کا جنون سب پر سوار ہے، انسان کی جان ومال، عزت وآبرو کا احترام تیزی کے ساتھ رخصت ہورہا ہے۔ حقیر شخصی فوائد کیلئے اجتماعی وملکی مفاد کو آسانی سے قربان کردیا جاتا ہے، کام چوری، احساس ذمہ داری کا فقدان، رشوت خوری، چور بازاری، ذخیرہ اندوزی، بے عنوانی، یہ سب اسی درخت کے پھل ہیں اور انھوں نے پوری زندگی کو عذاب بنادیا ہے۔

بہت انتظار کرنے کے بعد اپنی بے سروسامانی، تنہائی وبے اثری کا پورا علم واحساس ہونے کے باوجود ہم نے میدان میں آنے اور بلاتفریق مذہب وملت اس ملک کے رہنے والوں کے دلوں پر دستک دینے کا فیصلہ کیا کہ جب کسی محلہ وگاؤں میں آگ لگتی ہے تو کوئی اپنی کمزوری اور بے نوائی کو نہیں دیکھتا گونگے بھی چلاّ اُٹھتے ہیں اور اپاہج بھی دوڑ پڑتے ہیں "

ہندوستان میں تقسیم آزادی کے بعد کچھ ایسے فرقہ پرست اور انتہا پسند لیڈر و سیاستدان اٹھے جنھوں نے ثقافت، عقیدہ، قومیت و نسل کی بنیاد پر ایسی کشمکش اور جھگڑے پیدا کر دیئے کہ عام انسان پریشانیوں میں پڑ گیا تعلیمی و تعمیری کام کرنا دشوار ہو گیا، مولانا مرحوم ملک کو ایسی کشتی کے مانند قرار دیتے ہیں جو اگر اس طوفان کی نذر ہو گئی تو سب نیک و بد کو لے ڈوبے گی، ان حالات کے سدھار کے لئے مولانا مرحوم نے ملک کے زعماء سے ملاقاتیں کیں اور مختلف مذاہب کے سماجی نمائندوں سے باتیں کی اس سلسلہ میں مولانا مرحوم نے ونوبا بھاوے جے پرکاش نارائن سائیں بابا اور اندرا گاندھی کو ملک کی بگڑتی ہوئی صورتحال سے آگاہ کیا۔ دوسری طرف عوامی سطح پر ملک کے طول و عرض میں پیام انسانیت کے بینر تلے بڑے بڑے اجتماعات منعقد کئے جن میں تمام مذاہب کے ماننے والے شریک ہوئے، اور ان کے دلوں میں بھی ملک کے سنگین حالات کا احساس پیدا ہوتا۔ ان حالات اور سماج پر ان کے اثرات کے بارے میں مولانا مرحوم فرماتے ہیں:-

"کسی ملک اور دور میں بھی تعلیمی و تعمیری کاموں کیلئے (خواہ وہ کتنے مقدس ضروری اور مفید ہوں) شرط یہ ہے کہ اس ملک میں معتدل (NORMAL) حالات ہوں، جہاں کوہ آتش فشاں بار بار پھٹتا ہو، سائیکلون جلد از جلد آتے ہوں، سیلاب اپنی قہر سامانیوں کے ساتھ پورے شہروں اور صوبوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہو۔ وہاں تعلیمی و تعمیری کام کیلئے دماغی سکون اور ولولۂ عمل کہاں سے پیدا ہو سکتا ہے؟ یہ تو غیر اختیاری امور ہیں، اور ان پر کسی کا کوئی قابو نہیں، لیکن جہاں فرقہ وارانہ فسادات، انسان کشی اور انسانیت سوزی کے جنون کی لہریں اٹھتی ہوں، اور اچھے پڑھے لکھے انسانوں پر اعصابی (ہسٹریا) کے دورے جلد جلد پڑتے ہوں۔۔۔ اور یہ دورے کسی وقت بھی معاشرہ پر پڑ سکتے ہیں۔ اور لوگ معمولی بات پر اپنا دماغی توازن کھو سکتے ہیں وہاں کسی تعلیمی و تعمیری کام یا ادارہ کی بقا کی ضمانت کب تک دی جا سکتی ہے اور اس غیر یقینی اور ہیجانی فضا میں کوئی تصنیفی یا فکری کام کیسے ہو سکتا ہے؟ بقول میر

یوں زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے۔

میں تو سمجھتا ہوں کہ اس فضا میں ادب و شاعری اور فنون لطیفہ اور اقبالؒ کے الفاظ میں "لذت کردار اور جرأت اندیشہ کی بھی کیا گنجائش ہے۔"

مولانا مرحوم کے نزدیک اخلاقی سدھار کی یہ مہم اور پیام انسانیت کی تحریک، ملک کی تمام دینی، تعلیمی، کوششوں اور تحریکوں کیلئے ایک حصار کی طرح ہے جس کے اندر رہ کر ہر کوشش کامیاب ہو سکتی ہے اور اس کو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے پرسکون اور معتدل فضا مہیا ہو گی وہ اس لئے اس تحریک کو ہر تحریک کا خادم اور معاون بلکہ پاسبان و محافظ سمجھتے ہیں، یہ تحریک سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں کو روکنے کی تحریک ہے، یہ تحریک بھلائی کا حکم دینے برائی سے روکنے، اور فساد کو روکنے اور اصلاح کی تحریک ہے، یہ تحریک بعثت نبوی سے قبل ہوئے "حلف الفضول" کے معاہدہ کے مانند ہے جس میں اسلام کی آمد سے پہلے عربوں نے سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں پر روک لگانے، ظالم کو ظلم سے روکنے۔ اور حقدار کو اس کا حق پہنچانے کی بات کی تھی، جس کے بارے میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ "میں عبداللہ بن جدعان کے مکان پر ایک معاہدہ میں شریک تھا۔ جس کے نام پر اگر اسلام کے ظہور کے بعد بھی مجھے بلایا جائے تو میں اس کی تکمیل کیلئے تیار ہوں، اسی طرح یہ تحریک پیام انسانیت سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں سے روکنے کی ایک تحریک ہے اور اس تحریک کی کامیابی کی ذمہ داری سب سے زیادہ مسلمانوں پر ہے کیونکہ درحقیقت امت مسلمہ ہی برائی سے روکنے اور بھلائی کا حکم دینے کے لئے برپا کی گئی ہے۔ اور اگر مسلمانوں نے یہ فریضہ انجام نہ دیا تو یہ ان کی کوتاہی قرار پائے گی۔ مولانا مرحوم اپنی ایک تقریر میں جو بھیونڈی اور بمبئی کے فساد ۱۹۸۴ء کے چند روز بعد کی گئی تھی فرماتے ہیں۔

"اب آپ بتائیے کہ کسی ملک میں مسلمان ایک ہزار برس سے ہوں اور وہ مسلمان نہ اپنا تعارف کرا سکیں، نہ ان کو متأثر کر سکیں، تو بتائیے یہ کوتاہی ہے یا نہیں؟ اصل بات یہ ہے کہ ہمارے اخلاق کی خوشبو ہمارے ہم وطنوں کو نہیں پہنچ سکی، انھوں نے ہم کو سیاسی میدان میں دیکھا یا انتخابی معرکہ (الیکشن) کے میدان میں ہم کو آزمایا، یا تجارت کے مقابلہ میں ہم کو دیکھا، مسجدوں میں یہ آتے نہیں، انھوں نے ہم کو معاملات میں نہیں پرکھا، انھوں نے ہم کو اخلاق سے نہیں جانچا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اس طرح مسلمانوں پر حملہ کرتے ہیں جیسے بالکل غیر مانوس پردیسی اور دشمن پر کرتے ہیں، ابھی تک ان کو یہ نہیں معلوم کہ ہم اپنے اندر کیا جوہر رکھتے ہیں کیسی محبت رکھتے ہیں، کیسی انسانیت رکھتے ہیں، ہمارے دل میں ان کے لئے کیسی خیر خواہی کا جذبہ ہے، ہم اس ملک کیلئے

کتنے مفید ہیں، کتنے ضروری ہیں؟"

ایک دوسری جگہ مولانا مرحوم فرماتے ہیں:۔

افسوس تو یہ ہے کہ مسلمان بھی

"ہر کہ درکانِ نمک رفت نمک شد"

کا مصداق بن گئے ہیں، انھوں نے تعمیر انسانیت اور اخلاقی نمونہ پیش کرنے میں اپنا فرض ادا نہیں کیا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث قدسی میں بیان فرمایا تھا

"الراحمون یرحمهم الله الرحمٰن

ارحموا من فی الارض یرحمکم

من فی السماء"

مولانا حالی نے اس کا ترجمہ اس طرح کیا ہے۔

کرو مہربانی تم اہل زمیں پر

خدا مہرباں ہوگا عرش بریں پر

انسانیت کے اس پیغام کو عام کرنے کے لئے۔ مولانا مرحوم نے بہار، مدھیہ پردیش، راجستھان، ہریانہ پنجاب اور یوپی کے دورے کئے، ۱۹۷۴ء میں چنڈی گڑھ پنجاب کا دورہ کیا۔ اسی طرح جمشید پور کا دورہ کیا ۱۹۸۳ء میں مولانا مرحوم نے اترپردیش کے مختلف علاقوں اور شہروں کے متعدد دورے کئے رام پور، میرٹھ، مرادآباد، ہاپڑ، مظفر نگر، اور دوسرے شہروں میں کامیاب دورے ہوئے، ان پروگراموں میں بڑی تعداد میں ہندو، سکھ، جینی اور نچلے طبقے کے نمائندوں نے حصہ لیا، اور مولانا کے اس پیام انسانیت کی آواز کو سراہا۔

مولانا نے ایک تقریر میں فرمایا:۔

"کسی بھی معاشرہ کا بگاڑ اور اخلاقی اصولوں سے نظر اندازی، حرص وطمع، بڑھتی ہوئی مال کی محبت، ظلم وزیادتی، ناجائز قبضہ اور برائیوں کا اثر اس میں ملوث افراد ہی تک محدود نہیں رہتا، بلکہ اس کے اثرات پورے معاشرہ میں پھیل جاتے ہیں اور ہر وہ معاشرہ جو ان جرائم پیشہ افراد کو نظر انداز کرتا ہے، وہ خود ان جرائم میں مبتلا ہو جاتا ہے ہمیں تاریخ میں بہت سی ایسی تہذیبیں اور ثقافتیں نظر آتی ہیں جو عرصہ دراز تک ترقی کے بام عروج پر متمکن تھیں لیکن جب اس میں اخلاقی انتشار عام ہوا، حرص وہوس اور مال کی بڑھتی ہوئی محبت نے غلبہ پایا، انسانی ناموس وعزت کو پامال کیا جانے لگا۔ اور لوگ اپنی نفسانی خواہشات اور ذاتی اغراض کو پورا کرنے میں لگ گئے، دین و مذہب کی تعلیمات اور اخلاقی قدروں کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ ان کی تحقیر وتضحیک کا معاملہ شروع ہوگیا۔ تو یہ ترقی یافتہ تہذیبیں برباد اور نیست ونابود ہوگئیں۔"

(کاروان زندگی جلد چہارم ص۵۷)

مولانا مرحوم کی شروع کی ہوئی تحریک پیام انسانیت وقت کی آواز تھی مگر یہ مشن ابھی مکمل نہیں ہوا۔ ابھی ملک کے حالات نارمل نہیں ہیں غیر مسلموں میں اسلام کے تعارف کا کام ابھی باقی ہے اسلام کے ماننے والوں کو قریہ قریہ شہر شہر جانا ہوگا. اور انسانیت کا یہ پیغام عام کرنا ہوگا۔ ہندوستان میں انصاف کی بات سننے کے لئے ابھی اکثریت تیار ہے ہمیں آگے بڑھنا ہوگا۔ اور اپنے پڑوسیوں کے دلوں سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف عام کئے ہوئے شکوک وشبہات کا ازالہ کرنا ہوگا۔ ہمیں ان کو یہ باور کرانا ہوگا کہ اسلام امن وسلامتی اور شانتی کا مذہب ہے اسلام کے ماننے والوں کے دلوں میں لوگوں کے لئے نفرت نہیں بلکہ پوری انسانیت کیلئے پیار ہے ہمیں یہاں کے باشندوں کو بتلانا ہوگا کہ ہندوستانی سماج میں پھیلی ہوئی بیماریوں کے لئے اسلام ایک تریاق ہے، اگر ہم اپنے قول وعمل سے اور گفتار وکردار سے اپنے ہم وطنوں کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہوگئے کہ مسلمان اس ملک کی ضرورت ہیں، اور سماجی برائیوں کے ازالہ میں ہماری افادیت مسلّم ہے اور اس ملک کی تعمیر وترقی میں ہمارا کردار مثبت ہے تو ہم صحیح معنوں میں اس ملک کے اندر مولانا مرحوم کے وارث وجانشین قرار پائیں گے اور اس ملک میں پیام انسانیت کی کامیابی کا سہرا ہمارے سر ہوگا۔ اور یہ صرف اس ملک کی خدمت نہیں بلکہ اسلام کی بھی سچی خدمت ہوگی۔

شبلی کے فکر وفن کا نگہباں نہیں رہا

وارث ریاضی۔ چمپارن

جہد وعمل کا مہر درخشاں نہیں رہا
سوز وگدازِ قلب کا ساماں نہیں رہا

وہ یادگارِ بزمِ سلیماں نہیں رہا
شبلی کے فکر وفن کا نگہباں نہیں رہا

وہ مرجعِ طریقت واحساں نہیں رہا
روحِ روانِ محفل عرفاں نہیں رہا

اسلام کے علوم ومعارف کا ترجماں
رمز آشنائے سنت وقرآں نہیں رہا

صد حیف وہ مؤرخِ عالم چلا گیا
سیرت نگارِ محسنِ انساں نہیں رہا

وہ عارفِ سنائی ورومی کا رازداں
اقبال کا وہ مردِ مسلماں نہیں رہا

چھیڑے گا کون مہر واخوت کا زمزمہ
انسانیت کے درد کا درماں نہیں رہا

بزم ادب تھی جس کے تخیل سے مستنیر
وہ جلوہ رازِ کیف بہاراں نہیں رہا

اے خامہ، غم فشاں کہ نہیں صاحبِ قلم
اے نطق، اشک ریز کہ سحباں نہیں رہا

وارث بہارِ گلشنِ قوم ووطن نماند
برختم دو ہزار سدہ، بوالحسن نماند

۳۱ر دسمبر ۱۹۹۹ء

مولانا علی میاں سے پہلی اور آخری ملاقات

• شارق علوی ایڈیٹر فریگرینس آف ایسٹ ندوۃ العلماء لکھنؤ

دوسری جنگ عظیم (۴۵-۱۹۳۹ء) اپنے شباب پر تھی، ہندوستان کے مشرقی علاقے سراسیمگی کا شکار تھے کلکتہ سے آبادی کا تخلیہ ہو رہا تھا اور شمالی ہندوستان ڈر اور خوف کی لہروں کی چپیٹ میں تھا۔ فوجیوں اور فوجی سامان کی نقل وحرکت کی وجہ سے ریلوے نظام بری طرح متاثر تھا اور سواری گاڑیوں کی تعداد محدود کر دی گئی تھی، لکھنؤ سے دہلی براہ راست کوئی سواری گاڑی نہیں تھی اور کانپور یا براہ مراد آباد جانے میں مراد آباد تک سفر ایک گاڑی سے ہوتا تھا اور وہاں سے دوسری ریل گاڑی ملتی تھی۔ صرف فرسٹ اور سکنڈ کلاس جن میں زیادہ تر یورپین افسران یا فوج کے اعلی عہدیدار سفر کرتے تھے وہ تو پرسکون نظر آتے تھے لیکن انٹر اور تھرڈ کلاس کے ڈبوں میں مسافر مچھلیوں کی طرح بھرے ہوتے تھے۔

۴۵-۱۹۴۴ء میں حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی تبلیغی تحریک بھی اپنے شباب پر تھی، دہلی شہر سے باہر بستی نظام الدین میں ایک مسجد میں تبلیغی جماعت کا مرکز قائم تھا جہاں ملک کے مختلف علاقوں سے لوگ برابر آتے رہتے تھے۔ حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی رحلت کے بعد حضرت مولانا محمد یوسفؒ کی سربراہی میں تبلیغی کام زور شور سے چل رہا تھا اسی زمانے میں میوات (جو اب ہریانہ صوبہ کے ضلع گڑگاؤں میں ہے) مولانا الیاسؒ کی توجہ سے کفر اور شرک کے ماحول سے نکل کر خالص اسلامی ڈھانچے میں ڈھل چکا تھا اور تبلیغی تحریک سے متعارف کرانے کے لئے میوات کی سرزمین بڑی زرخیز تصور کی جاتی تھی اور اس علاقے میں مختلف مقامات پر اجتماعات منعقد کئے جاتے تھے اور تبلیغی جماعتوں کو چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں میوات میں مختلف سمتوں میں روانہ کیا جاتا تھا۔ اسی زمانے میں ایک اہم اجتماع سوہنا سے کچھ میل دور پر منعقد کیا گیا تھا جس میں مختلف مقامات سے لوگ سفر کی گوناگوں مصیبتیں طے کر کے شرکت کے لئے آئے تھے پہلے وہ دہلی مرکز میں جمع ہوئے اور پھر وہاں سے بسوں کے ذریعہ اجتماع کی منزل تک آئے۔

عم محترم حضرت مولانا افضل علیؒ جن کا قیام تھلوارہ ضلع بارہ بنکی میں رہتا تھا وہ بھی اس اجتماع میں شرکت کے ارادے سے روانہ ہوئے لکھنؤ میں ایک دن ان کا قیام رہا اور وہ مجھے نیز میرے بڑے بھائی کو بھی اپنے ساتھ دہلی لے جانے پر راضی ہو گئے اس وقت میری عمر تقریباً دس سال رہی ہوگی۔ یہ چھوٹا سا قافلہ دلی کے لئے روانہ ہوا۔ لکھنؤ سے کب چلے اور کس حال میں ریل کا سفر طے کیا یہ تو اب یاد نہیں لیکن دہلی (پرانی دلی) ریلوے اسٹیشن پر ہماری گاڑی عصر کے وقت پہونچی۔ اسٹیشن سے باہر نکل کر بستی حضرت نظام الدینؒ تک پہونچنے کا کیا ذریعہ ہوگا اور کس سمت جانا ہوگا ابھی یہ معلومات ہمارے بزرگ کر ہی رہے تھے کہ کسی نے فوارہ (جو دلی اسٹیشن سے متصل ہی ہے) جاکر وہاں سے اوکھلا جانے والی بس پکڑنے کا مشورہ دیا۔ ہم لوگ تھکے ہارے وہاں تک پہونچے، یہاں کچھ لوگ پہلے ہی سے بس کے منتظر تھے ان میں سے ایک صاحب شیروانی میں ملبوس عینک لگائے عم محترم صوفی افضل علی کی طرف لپکے اور بڑے ادب سے مصافحہ کرتے ہوئے اپنے ساتھ بستی حضرت نظام الدین چلنے کی دعوت دی۔ یہ تھے حضرت مولانا علی میاںؒ جن کو میں نے پہلی بار دلی اسٹیشن کے باہر فوارہ کے بس اسٹینڈ پر دیکھا تھا۔ ہمارے خاندانی معالج تھے ڈاکٹر عبدالعلی مرحوم اس لئے میری ان سے زیادہ واقفیت تھی مولانا علی میاں سے ہمیں ڈاکٹر عبدالعلی کے بھائی کی حیثیت سے متعارف کرایا گیا۔ بہرحال ہم لوگ دو دن مرکز میں رہے علی میاں کا قیام تو کسی مخصوص کمرے میں تھا لیکن نماز کے وقت ان کا دیدار ہو جاتا تھا۔

میوات کے اجتماع میں مولانا محمد زکریاؒ، مولانا محمد یوسفؒ، مولانا منظور نعمانیؒ، حضرت مولانا علی میاںؒ اہم مقررین میں تھے۔ کم عمری اور اسلام کے بارے میں زیادہ معلومات نہ ہونے کی وجہ سے میں ان بزرگان دین کی تقاریر سے مستفیض نہیں ہو سکا لیکن چونکہ حضرت مولانا علی میاںؒ سے خاص تعلق تھا اس لئے ان کی تقریر ضرور بغور سننے اور سمجھنے کی کوشش کی۔

دو دن کے اجتماع کے بعد تبلیغی جماعتوں کی تشکیل ہوئی اور ایک جماعت کے امیر صوفی افضل علیؒ بنائے گئے جن کی ہمراہی میں ہم لوگ تقریباً ایک ہفتے میوات کے دیہاتوں میں گھومتے رہے۔ حضرت مولانا علی میاںؒ اجتماع گاہ سے دیگر علماء کرام کے ساتھ سیدھے دہلی واپس آ گئے تھے۔ ہماری جماعت جب دلی پہونچی تو وہ وہاں سے جا چکے تھے۔

۵۷-۱۹۵۰ء کے درمیان میرا قیام نظر آباد میں تھا جو کچہری روڈ لکھنؤ پر واقع تبلیغی جماعت کے مرکز سے قریب تھا اس لئے میں نہ صرف یہ کہ جمعرات کو اجتماع میں شریک ہوتا تھا بلکہ اکثر وبیشتر

نماز اسی مسجد میں ادا کرتا تھا، یہاں حضرت علی میاںؒ سے قربت بڑھ گئی تھی کیونکہ ان کا قیام زیادہ تر مرکز میں ہی رہتا تھا۔

۸۶-۱۹۵۸ء کے درمیان ملازمت کے سلسلے میں دیگر مصروفیات کی وجہ سے مولانا سے رابطہ منقطع ہوگیا۔ ۱۹۸۶ء میں میرے ماموں زاد بھائی چودھری احسن سعید علوی کلکٹر کسٹم و سنٹرل اکسائز کے عہدے سے ریٹائر ہوکر لکھنؤ میں ہی قیام پذیر تھے، حضرت مولانا علی میاں سے ان کے خاص مراسم تھے اور وہ اکثر و بیشتر مولانا کی عصر بعد کی نشست میں شرکت کرتے رہتے تھے۔ حضرت مولانا علی میاںؒ کبھی کبھی ان سے صوفی افضل علیؒ کے خاندان والوں کے بارے میں دریافت کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ ایک دن وہ مجھ کو اپنے ساتھ ندوہ لے گئے اور مولانا سے پرانے تعلق کی تجدید کرائی۔ مولانا بہت خوش ہوئے، کافی دیر تک مجھ ہی سے باتیں کرتے رہے اگلے دن انھیں انگلستان کے سفر پر جانا تھا میں نے جب ان سے ذکر کیا کہ میری لڑکی کیمبرج یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کرنے جا رہی ہے تو انھوں نے اس کی کامیابی اور شالی مسلمان بچی ہونے کے لئے دعا فرمائی۔

مارچ ۱۹۹۳ء میں سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہوتے ہی میں مئی ۱۹۹۳ء میں حج بیت اللہ کے لئے روانہ ہوگیا وہاں سے واپسی پر میں نے ایک مختصر کتابچہ "سفر حجاز" تالیف کیا جسے مولانا کی خدمت میں پیش کیا۔ میرا زیادہ تر وقت اب اخبارات و رسائل کے لئے مضامین لکھنے میں صرف ہوتا تھا ہندی کے ایک ہفتہ وار اخبار "گنگا جمنی تہذیب" کی ادارت کی ذمہ داری بھی میں نے اپنے سر لے لی تھی۔ ۱۹۹۴ء میں کسی سازش کے تحت دار العلوم ندوۃ العلماء میں طلباء کی اقامت گاہ پر پولیس نے چھاپہ مارا اور بے گناہ طلباء سے بدسلوکی کی، حکومت اور پولیس کی اس حرکت سے نہ صرف یہ کہ ندوہ کے اساتذہ اور طلباء ہی متاثر ہوئے بلکہ پوری قوم نے اسے ایک شرمناک اور متعصبانہ کارروائی بتایا میں بھی ندوہ سے اور خاص طور پر علی میاںؒ سے اپنے تعلق کی وجہ بے چین ہوگیا اس سلسلے میں اپنے وسائل و روابط کا استعمال کرتے ہوئے میں نے ندوہ کی مدافعت میں اور طلباء کی بے گناہی ثابت کرنے میں جو کچھ ہوسکتا تھا کیا۔ انگریزی اور ہندی اخبارات کو ندوہ، مسلمانوں اور خاص کر حضرت مولانا علی میاںؒ کے خلاف خامہ فرسائی کا اچھا مواد اس مذموم حرکت نے مہیا کر دیا تھا اس کے تدارک کی پوری کوشش کی گئی اور انگریزی و ہندی اخبارات کو صحیح صورتحال سے نہ صرف یہ کہ مطلع کیا گیا بلکہ ان پر غلط بیانی کی تردید کے لئے بھی زور دیا گیا چنانچہ کچھ اخبارات نے ندوہ کے ذمہ داروں کے بیانات بھی نمایاں طور پر شائع کئے۔

اس موقع پر حضرت مولانا علی میاںؒ کی دیرینہ خواہش کہ ایک فعال اور موجودہ ترقی یافتہ دور کی ضرورتوں کے مطابق "میڈیا سنٹر" قائم ہونا چاہئے کو عملی جامہ پہنانے پر سنجیدگی سے غور کیا گیا اور مولانا سید محمد رابع حسنی جو اس وقت دار العلوم ندوۃ العلماء کے مہتمم تھے اور اب ناظم ہیں کی سربراہی میں میڈیا ریسرچ سنٹر کا قیام عمل میں آیا۔ سید غلام محی الدین مرحوم جنہوں نے حضرت مولانا علی میاںؒ کی متعدد کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ فرمایا، راقم الحروف، مولانا واضح رشید ندوی کرنل ایم۔ جے۔ شمسی اور..... اطہر حسین پر مشتمل ایک بورڈ کی تشکیل ہوئی اور سنٹر کا کام شروع ہوا۔

ہندوستان میں مختلف شہروں سے شائع ہونے والے انگریزی، ہندی اور اردو اخبارات میں اسلام، مسلمانوں، مسلم تعلیمی اداروں وغیرہ کے بارے میں شائع ہونے والی خبروں اور مضامین کا مطالعہ کیا جاتا ہے اور اگر ضرورت محسوس کی جاتی ہے تو اس پر اپنی آراء سے متعلقہ اخبار یا رسالہ کو مطلع کیا جاتا ہے، حضرت مولانا کی خواہش تھی کہ ندوہ سے ایک انگریزی رسالہ بھی شائع کیا جائے۔ الحمدللہ مولانا کی سرپرستی میں سہ ماہی " دی فریگرینس آف الیسٹ" کی اشاعت بھی ۱۹۹۸ء میں شروع کر دی گئی جس کا ہر شمارہ مولانا کی خدمت میں بحیثیت ایڈیٹر میں خود پیش کرتا تھا۔ اکتوبر دسمبر ۱۹۹۹ء کا شمارہ آخری شمارہ تھا جو مولانا کی خدمت میں نومبر ۱۹۹۹ء میں پیش کیا گیا تھا جسے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے اور اپنے سرہانے رکھ لیا کہ پڑھوں گا۔

حضرت مولانا علی میاںؒ رمضان المبارک کا آخری عشرہ اپنے وطن تکیہ شاہ علم اللہ میں گزارنا چاہتے تھے چنانچہ لکھنؤ سے ان کی روانگی سے قبل ۲۸ر دسمبر ۱۹۹۹ء کو میں ان کی خدمت میں عصر اور مغرب کے درمیان حاضر ہوا انھوں نے روزہ افطار اور رات کے کھانے کے لئے رکنے کی خواہش ظاہر کی جس کی میں نے تعمیل کی اور دسترخوان پر ان کے قریب بیٹھنے کا شرف حاصل کیا۔ اس آخری ملاقات میں مولانا نے یہ بھی ہدایت فرمائی کہ " فریگرینس" کو جاری رکھئے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ مولاناؒ سے یہ میری آخری ملاقات ہے۔

عالم کو دے رہا تھا جو توحید کا پیام
تھا دشمنانِ دیں کے لیے تیغ بے نیام
قائل تھے جس کے خُلق کے دنیا میں خاص و عام
لکھا ہے جس کا حرفِ جلی سے افق پہ نام

اللہ شافی

ڈاکٹر عبد المعبود خاں
گرین کراس نرسنگ ہوم، لکھنؤ

ڈاکٹر عبد المعبود خاں صاحب نے حضرت مولانا قدس سرہٗ کی علالت کے زمانہ میں ندوۃ العلماء کے مہمان خانہ کو تمام طبی آلات مہیا کر کے ایک ہاسپٹل کا کمرہ بنا دیا تھا اور خود بھی شب و روز حاضر رہے۔ اسی طرح ڈاکٹر کرنل شمسی، سحر نرسنگ ہوم کے ذمہ دار جناب ڈاکٹر غوث اور ان کے بھائی ڈاکٹر عرفان بھی مسلسل خدمت اور خبر گیری کرتے رہے ذیل کا مضمون عبد المعبود خاں کے تاثرات ہیں جس کو قدر دانی کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔

—ادارہ—

تقریباً پانچ سال قبل کی بات ہے کہ ایک دن حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ گرین کراس نرسنگ ہوم دار العلوم کے ایک استاذ کی عیادت کے لئے تشریف لائے حضرت سے اگرچہ کئی بار ملاقات ہو چکی تھی۔ لیکن اس تشریف آوری کے موقع پر دیر تک حضرت سے گفتگو کا شرف حاصل ہوا۔ جتنی دیر تشریف فرما رہے دینی دعوت ہی کا ذکر فرماتے رہے۔ مسلمان ڈاکٹروں نے لکھنؤ میں نرسنگ ہوم قائم کرنے کی طرف جو توجہ کی ہے حضرت اس پر مسرت کا اظہار فرماتے رہے، اور اس پر زور دیتے رہے کہ عبادت سمجھ کر یہ کام کرنا چاہیئے۔ اسی کے ساتھ مریضوں سے تسکین و تسلی کی بات کرے اور گفتگو کے دوران اللہ تعالیٰ سے امید رکھنے اور اس سے صحت و شفاء کی توقع رکھنے پر زور دے۔ حضرت نے یہ بات کئی بار فرمائی کہ قرآن کی آیت جو شفا سے متعلق ہو نمایاں طریقہ سے لکھ کر معہ ترجمہ کے نمایاں جگہ پر آویزاں کر دیا جائے، کبھی کبھی مریضوں کو سمجھانا بھی چاہیئے۔

چنانچہ راقم سطور نے قرآنی آیت: وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ (جب میں بیمار ہوتا ہوں تو اللہ تعالیٰ ہی مجھ کو شفا عطا فرماتا ہے)۔ ہم نے خوش خط طریقہ سے لکھوا کر ہسپتال میں آویزاں کر دیا۔ اگرچہ حضرت کے حکم کی تعمیل میں ہم نے یہ کام کر دیا۔ لیکن اس کا صحیح مفہوم حضرت والا کی علالت کے دوران ہی سمجھ میں آیا۔

۷ ار مارچ ۱۹۹۹ء کو جب حضرت والا پر فالج کا حملہ ہوا تو میڈیکل کالج کی پروفیسر ڈاکٹر دیو لیکا ناگ۔ اور ماہر امراض قلب ڈاکٹر منصور حسن نے علاج کے سلسلہ میں ضروری ہدایات دیں اور یہ مشورہ بھی دیا کہ ضروری انجکشن فوری لگائے جائیں۔ آکسیجن بھی درمیان میں دی جاتی رہے۔ ادھر دہلی سے ڈاکٹر خلیل اللہ نے مشورہ دیا کہ علاج کے لیے فوراً دہلی لے آیا جائے تاکہ اپولو میں علاج ہو سکے۔ صوبہ یوپی کے وزیر اعلیٰ نے مخصوص ہوائی جہاز بھی مہیا کر دیا تاکہ اس پر حضرت کو دہلی منتقل کیا جائے یہ بات بھی طے ہو گئی کہ رات کو دس بجے دہلی کے لئے روانگی ہوگی۔ لیکن حضرت والا کو اطلاع دی گئی تو دہلی جانے سے انکار فرما دیا۔

راقم سطور نے مولانا سید محمد رابع صاحب ندوی سے درخواست کی کہ حضرت کو انجکشن لگانے کی اجازت دے دیں۔ مگر انھوں نے اس کی اجازت نہیں دی۔ فرمایا کہ حضرت کی مرضی کے خلاف اب کچھ بھی کرنا مناسب نہیں۔ اللہ مالک ہے۔ اس طرح بغیر کسی علاج و انجکشن کے رات گذر گئی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ شافی مطلق ہے۔ وہی صحت و تندرستی دینے والا ہے۔

دوسرے دن یعنی ۱۸ مارچ کو صبح ہونے پر جب سانس کی رفتار تیز ہوئی تو ڈاکٹر منصور حسن کو پھر بلایا گیا۔ انھوں نے علاج کے سلسلے میں ضروری مشورے دیئے اور تاکید کی کہ علاج فوری طور پر شروع کر دیا جائے۔ مجھے الگ لے جاکر کہا کہ فوری طور پر آکسیجن اور انجکشن لگا دیا جائے، ہوشیار کمپونڈر بلا لیے گئے تھے۔ ہم لوگوں نے حضرت کو سمجھا کر آکسیجن اور انجکشن لگوانے کے لیے تیار کر لیا۔ چنانچہ آکسیجن اور انجکشن دونوں لگائے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے دوا میں اثر دیا اور فوری طور سے افاقہ ہوا تمام لوگوں میں خوشی و مسرت کی لہر دوڑ گئی، دو گھنٹے کے بعد دہلی کے ڈاکٹر خلیل اللہ آ گئے۔ ڈاکٹر منصور حسن دوبارہ آئے۔ ان دونوں حضرات نے اس افاقہ پر اطمینان کا اظہار کیا۔ مزید مشورے بھی ہوئے۔

اس طرح دو مرحلے چوبیس گھنٹے کے اندر پیش آئے کہ بغیر کسی دوا علاج کے رات گذر گئی۔ دوسرے دن علاج ہوا تو فوری طور پر افاقہ ہوا۔

۲ر اکتوبر ۱۹۹۹ء کی شب میں ڈیڑھ بجے کے قریب حضرت کے خادم خاص بھائی عبدالرزاق کا فون آیا کہ جلدی آیئے۔ ہم نے فوراً ایمبولنس پر آکسیجن اور ضروری دوائیں رکھیں اور اپنے کمپونڈر راشد کو ساتھ لیا، بارہ تیرہ منٹ کے اندر مہمان خانہ پہونچ گئے۔ ہماری آمد کے چند منٹ بعد ہی ڈاکٹر نظر احمد صاحب پہونچ گئے جو برسوں سے حضرت کا علاج کر رہے تھے

حضرت والا نے خود ہی انجکشن اور آکسیجن لگانے کے لیے فرمایا۔ پچھلے تجربے نے ہم لوگوں کی ہمت بڑھا دی تھی۔ ہم دونوں نے بلا تکلف کہہ دیا کہ ابھی چند منٹ میں آرام ہو جائے گا۔ یہ جملہ ہم لوگوں نے اپنی دواؤں اور انجکشن پر ناز کرتے ہوئے کہا۔ ہم نے احتیاطاً ڈاکٹر منصور صاحب سے فون پر استفسار کیا تو انھوں نے بھی یہی جواب دیا کہ ضروری انجکشن تو آپ کو معلوم ہیں وہ لگا دیجئے گا، فوراً آرام ہو جائے گا۔ ہم لوگوں نے انجکشن لگانا شروع کیا۔ لیکن نس میں انجکشن نہیں لگ پا رہا تھا۔ اس لیے دوا بھی آگے نہیں جا رہی تھی۔ ایک اور ماہر امراض قلب ڈاکٹر کو بلا لیا گیا۔ انھوں نے ای سی جی کیا، اور بتایا کہ حالت بگڑ رہی ہے۔ چار قیمتی انجکشن جو بیرونی ملکوں کے تھے وہ ناکام ہو چکے تھے۔ حضرت بار بار فرماتے کہ ہماری سانس اکھڑ رہی ہے۔ ڈاکٹر نظر احمد صاحب اور ہماری گھبراہٹ بڑھتی ہی گئی۔ اس وقت مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ہمارا یہ دعویٰ کہ چند منٹ میں افاقہ ہو جائے گا، کامیابی کی راہ میں حائل ہے۔ رات کا وقت تھا، ہم چند آدمی تھے۔ مولانا محمد رابع صاحب اور مولانا محمد واضح صاحب دیوار کے قریب بیٹھے دعاؤں میں مشغول تھے ڈاکٹروں کے دعوے کی سزا اللہ تعالیٰ اس شخص کو نہیں دینا چاہتا تھا جس کا وقت ابھی پورا نہیں ہوا تھا۔ مجھے اندر سے اپنے دعوے پر شرمندگی اور ندامت کا احساس ہوا، ایک کمزور و عاجز اور بے بس انسان کی طرح میں نے روتے ہوئے مولانا محمد رابع صاحب سے۔ جو حضرت کے جانشین ہونے والے اور بزرگ تھے، دعا کی درخواست کی۔ پھر جیسے ہی وہ گڑگڑائے اور بلبلا کر بڑے اضطرار کے عالم میں دعا کی۔ شافی مطلق کی مرضی سے ایک ایسا انجکشن لگ گیا جس کی قیمت صرف ڈھائی روپے تھی۔ انجکشن کے ذریعہ وہ دوا دی گئی، چند لمحوں میں دوران خون کے ساتھ بدن کے تمام حصوں میں یہ دوا پہونچ گئی۔ حضرت والا کی حالت سنبھلنے لگی۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا ظہور ہوا اور فجر کے وقت تک حضرت اس قابل ہو گئے کہ نماز با جماعت ادا کر سکیں۔ ہم نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس شافی مطلق نے اپنے عاجز بندوں کی دعائیں سن لیں۔

اس واقعہ کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ اس بار حضرت کو لکھنؤ میں ہی رمضان المبارک گذارنا ہوگا۔ نظام کے مطابق شعبان کے آخر میں تین دن کے لئے حضرت رائے بریلی رہ کر واپس لکھنؤ تشریف لے آئے۔ رمضان کے مبارک دن اچھی طرح گذار رہے تھے۔ سارے معمولات حسن و خوبی پورے ہو رہے تھے۔ سب سے پہلے ڈاکٹر نظر احمد صاحب نے رائے بریلی جانے کی اجازت دے دی مگر میں اصرار کر رہا تھا کہ سردی بہت بڑھ رہی ہے اور عرض کر رہا تھا کہ ۲۲ رمضان کو جمعہ کے دن تشریف لے چلیں تاکہ ہم بھی وہاں آٹھ دن رہ سکیں۔ حضرت نے فرمایا کہ آپ مجھے دو دن پہلے جانے دیجئے تاکہ آخری عشرہ تکیہ پر گذاریں اور اپنے وطن میں رہیں۔ آپ ان دو دنوں کی فکر نہ کریں میں نے عرض کیا، جیسی حضرت اللہ کی مرضی ہو۔ ہم انشاء اللہ ۳۱ر دسمبر کو جمعہ کے دن نماز سے پہلے حاضر ہو جائیں گے۔

اس روز صبح ہی سے سخت سردی تھی، کہرا بڑھا ہوا تھا۔ مجھے فکر تھی کہ وعدے کے مطابق رائے بریلی وقت پر پہونچ جاؤں جو سفر ڈیڑھ گھنٹے میں طے ہوتا تھا وہ اس دن کہرے کی وجہ سے قریب ڈھائی گھنٹے میں طے ہوا۔ رائے بریلی جب پہونچا تو ساڑھے دس بج رہے تھے۔ حضرت مجھے دیکھ کر فرمانے لگے۔ آپ اس سخت سردی میں آگئے۔ ہم نے عرض کیا کہ آپ سے وعدہ کیا تھا کہ اس بار اپنے ساتھ ساری ضروری دوائیں آکسیجن اور مانیٹر لازمی ہوگا۔ وہ سب لے آیا ہوں۔ حضرت یہ سن کر مسکرا دیئے۔ میں نے آج تک کبھی حضرت سے معانقہ کی جرأت نہیں کی تھی ہمیشہ مصافحہ ہی کیا کرتا تھا۔ آج بھی میں نے ہاتھ ملایا تو حضرت کھڑے ہو گئے۔ اور مجھ سے معانقہ کیا۔ یہ میری خوش نصیبی تھی۔

اس ملاقات کے بعد حضرت قرآن کی تلاوت میں مشغول ہو گئے۔ اس سے فراغت کے بعد غسل کے لیے تشریف لے گئے۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد کپڑے زیب تن کیے۔ شیروانی کے سارے بٹن لگائے۔ برسوں کے معمول کے مطابق سورۂ کہف پڑھنے کے لئے قرآن مجید منگوایا۔ اس درمیان

سورۂ یٰسین پڑھنا شروع کر دیا۔ مگر حالت بگڑنے لگی۔ میں جمعہ کی نماز میں حضرت کو مسجد لے جانے کے لیے گاڑی کمرے کے سامنے لگا رہا تھا کہ شور ہوا، ڈاکٹر کو بلاؤ۔ میں فوراً اندر پہونچ گیا۔ آکسیجن لگایا، کمپونڈر راشد بھی پہونچ گیا۔ اوپر کے کمرے سے ڈاکٹر قمرالدین صاحب پہونچ گئے۔ حضرت نے ایک لمبی سانس لی۔ انھوں نے اس بار آکسیجن یا انجکشن طلب نہیں فرمایا۔

یہ حقیقت اب سمجھ میں آئی کہ شفا تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ اس کی مشیت ہر جگہ اور ہر لمحے کام کرتی ہے۔ اس کی مرضی کے بغیر نہ کوئی پتہ ہل سکتا ہے اور نہ کوئی ذرّہ اڑ سکتا ہے۔

ایک رمز جو ڈاکٹری تعلیم کے دوران ہم سب کو پڑھایا گیا تھا اور آج بھی پڑھایا جا رہا ہے کہ نسخہ لکھنے سے پہلے Rx لکھنا ضروری ہے۔ جس کا مطلب بتایا جاتا ہے۔

"Take thou in the name of God Jupiter"

دوا کھاؤ (نعوذ باللہ) جوپیٹر خدا کے نام سے۔ میں نے میڈیکل کالج میں جاکر پڑھا تو معلوم ہوا کہ جوپیٹر کو بہشتوں اور زندگیوں کا خدا مانا جاتا ہے۔

(God of heavens and Guardian of life)

میں تو ڈاکٹری میں ۱۹۶۱ سے بھوپال میں داخلے کے بعد سے Rx لکھتا چلا آ رہا تھا۔ لیکن جب حضرت مولانا کے مشورے سے قرآن کی آیت کو سمجھنے کی توفیق ہوئی تو میں نے اللہ شافی (ALLAH SHAFI) کا رمز As لکھنا شروع کر دیا۔ میں سبھی طبیبوں سے استدعا کروں گا کہ وہ بھی As لکھیں۔ انشاء اللہ ہمارے نسخے میں اثر ہوگا اور Rx لکھنے کے گناہِ عظیم سے ہم بچ جائیں گے

وہ زیبِ لوح و قلم شانِ علم و دانائی

پروفیسر شیث محمد اسمٰعیل اعظمی

وہ عندلیبِ حرم فخرِ نطق و گویائی — وہ زیبِ لوح و قلم شانِ علم و دانائی
وہ یادگارِ سلف فخرِ منبر و محراب — ریاضِ مصطفوی کا نہالِ رعنائی
وہ آشنائے رموزِ کلامِ ربانی — خرد کلامیِ ختم الرسل کا شیدائی
زوالِ شام و عراق و عجم پہ نالہ کناں — عروجِ امتِ خیر البشر کا سودائی
جنید و شبلی و عطار کا مزاج شناس — وہ قدردانِ بوصیری اسیرِ طغرائی
حریفِ قلزمِ معنیٰ زبان تھی جس کی — قلم سے جس کے رواں سلسبیلِ دانائی
وہ جس کی خاکِ قدم سرمۂ نگاہِ خرد — وہ جس کے در پہ کرے آگہی جبیں سائی
وہ خاکسار کہ دائم خراج دے جس کو — شکوہِ خسروی و طمطراقِ دارائی
و نکتہ سنجِ غزالی و رومی و اقبال — وہ جس کی فکر نے ہر وقت کی مسیحائی
ہجومِ یورش و یلغارِ غم ہے ہر جانب — حجاز و مصر سے تا لکھنؤ و ممبائی
گدازِ جاں کا کوئی ترجماں نہیں ملتا — کہیں سے آج میسر نہیں شکیبائی
اب اس کے بعد تو ہر صبح روزِ حشر کی صبح — اب اس کے ہجر میں ہر شام شامِ تنہائی
حدودِ شہرِ تمنا میں کچھ رہا ہی نہیں — نہ بام و در ہیں نہ دہلیز ہے نہ انگنائی

عقیدتیں یہی ہر دم سوال کرتی ہیں
فنا سبھی کو ہے کس سے کریں شناسائی

قبلہ نما

مدرسہ کا کام یہ ہے کہ وہ ایسے باضمیر باعقیدہ، ایسے باایمان باحوصلہ ایسے باہمت فضلاء پیدا کرے کہ جو ضمیر فروشی، اصول فروشی اور اخلاق فروشی کے دور میں روشنی کے مینار کی طرح قائم رہیں کہ وہ کہیں نہیں جاتا اپنی جگہ پر کھڑا ہے راستہ بتاتا ہے، جیسے قبلہ نما کہ آپ کہیں ہوں وہ آپ کو قبلہ بتا دے گا، ہندوستان میں بتائے گا دوسرے ملک میں بتائے گا، پہاڑ پر رکھیں تو بتائے گا، پل پر رکھیں تو بتائے گا یہ عالم کا کام ہے کہ ہر زمانہ میں ہر جگہ قبلہ نما رہے۔

(حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ)

مولانا علی میاں ندوی رحمۃ اللہ علیہ

علالت سے وفات تک

تحریر: حسین امین

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ۔ یہ ایک ایسا نام ہے جسے بچپن سے لے کر جب اس نام کے مالک سے صورت آشنا بھی نہیں تھا ہمیشہ اس حیثیت سے جانا کہ اس نام کے مالک کی شخصیت بہت محترم ہے۔ پھر صحافت کے پیشے میں داخل ہونے کے بعد سے اس نام نامی کو متعدد نوعیت کے پس منظر اور تناظر میں اور مختلف زاویوں سے لکھنے کی سعادت حاصل کرنے کا موقع پانے میں جتنا خوش نصیب راقم الحروف رہا ہے اتنا شاید ہی کوئی دوسرا صحافی ہو۔ اس نام سے اور اس کے مالک سے ساری محبت، انسیت اور عقیدت یکطرفہ نہیں رہی ہے بلکہ دوسری طرف سے بھی بے حد شفقت اور محبت ملتی رہی ہے اور خاندانی روابط کے پس منظر میں حضرت مولانا علی میاں کی طرف سے ایک "عزیز" کا درجہ عطا ہوا تھا چنانچہ وہ ہمیشہ راقم کو اپنے اعتماد میں لیا کرتے تھے۔ اس وقت اس نام کو لکھتے وقت کلیجہ منہ کو آرہا ہے کہ ابھی "اس روز" ہی تو انھوں نے ندوہ کے مہمان خانے کے سامنے راقم کو اپنے پاس بلاکر "دھوپ کھانے" کو کہا تھا، اور یہ جان کر کہ عید الفطر کے روز یہ ناچیز رائے بریلی میں رہے گا، خوشی ظاہر کرتے ہوئے رات کے کھانے پر مدعو کیا تھا۔ آج اس نام کا مالک موجود نہیں ہے، خالقِ کائنات نے اپنے اس نیک بندہ مولانا علی میاںؒ کے درجات بلند کرنے کے لئے بیسویں صدی کے آخری دن ۲۲ر رمضان المبارک کو جس کی آنے والی شب میں شب قدر کا امکان ہوتا ہے، نصف النہار سے کچھ قبل نماز جمعہ کی تیاری کے بعد سورہ یٰسین کی تلاوت کے دوران عین اس وقت جب وہ کمرہ سے باہر ایک مرد مومن کی شان سے جمعہ کے لئے نکلنے والے تھے اپنے حضور میں بلا لیا اور ان کو اسی تاریخ کا حصہ بنا دیا جس کے مطالعے کا شوق ان کو "لت" کی حد تک تھا۔

مولانا علی میاں نے جن کے نام کے ساتھ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے وقت ابھی مدتوں اپنی انگلیوں پر قابو رکھنا پڑے گا، جتنی قابل رشک زندگی گذاری اتنی ہی قابل رشک وفات پائی جس کی تفصیل سننے والا کوئی بھی شخص بہ آواز بلند اس تمنا کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ کاش اپنا بھی آخری وقت ایسا ہی ہو۔

مولانا علی میاں کی علالت کے آغاز سے لے کر ان کے سانحہ ارتحال تک ملت اسلامیہ میں ان کی صحت کے لئے دعاؤں اور فکرمندی کی جو کیفیت تھی اس کو قلم بند کرنے کے لئے ایک پوری کتاب مرتب کی جاسکتی ہے، اور شاید ایسا ہو بھی تاکہ ان کی شخصیت سے جس کا نصب العین کار نبوت کو آگے بڑھانا تھا، آنے والی نسلیں ہمیشہ متعارف ہوتی رہیں گی۔ بہرحال ازراہ تذکرہ اس فکر کی سطح یہ تھی کہ ہندوستان کے وزیر اعظم اٹل بہاری باجپئی، ان کی پارٹی کے اعلیٰ مرکزی وریاستی رہنما اور وزراء، یوپی کے گورنر اور متعدد وزراء نے ملک کے ایک ممتاز شہری اور عالمی سطح کے ممتاز عالم دین اور بے داغ شخصیت کی حیثیت سے ندوہ کے مہمان خانے میں پہونچ کر ان کی عیادت کی۔ ملک کی جدوجہد آزادی کی قیادت کرنے والی سیاسی جماعت کانگریس کی صدر اور پارلیمنٹ میں حزب اختلاف کی لیڈر سونیا گاندھی اور ان کی بیٹی پرینکا گاندھی، سابق وزیر اعظم ہند وی۔پی سنگھ، مرکزی حکومت کے ممتاز سابق وزراء نرائن دت تیواری، ملائم سنگھ یادو، جعفر شریف، کیپٹن ستیش شرما ایم۔پی، جی ایم بنات والا، مولانا اسعد مدنی صدر جمعیۃ العلماء ہند، سید سبط رضی وغیرہ صاحبان، خادم الحرمین شریفین، جلالۃ الملک فہد بن عبدالعزیز کی طرف سے ان کے خصوصی ایلچی کی حیثیت سے سفیر سعودی عرب برائے ہند ہز ایکسی لینسی عبدالرحمٰن بن ناصر العویلی اور سفارت خانے میں دینی امور کے انچارج ہز ایکسی لینسی ولید بن عبدالکریم، ایران کے صدر عزت مآب محمد خاتمی کی طرف سے ان کے مشیر برائے سنی امور مولانا اسحاق مدنی اور مشیر برائے شیعہ امور مولانا محمد علی خلیلی نے بہ نفس نفیس ندوہ پہونچ کر مولانا علی میاں کی عیادت کی۔ اس کے علاوہ دوسرے ملکوں کے سربراہوں نے بھی یا تو کسی ایلچی کے ذریعہ یا ٹیلی فون اور فیکس کے ذریعہ خیریت معلوم کی۔

مولانا علی میاں کے لئے صحت کی دعاؤں کے ساتھ ان کے عقیدت مندوں نے خود کو کسی اندوہناک خبر کو سننے کے لئے اگرچہ تیار کر لیا تھا، لیکن اللہ کو تو کچھ اور ہی منظور تھا۔ چنانچہ جب مولانا کے سانحہ ارتحال کی خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیلی تو ساری "تیاری" بے سود ثابت ہوگئی۔ صبر کا دامن چھوٹ گیا۔

در اصل مولانا علی میاںؒ نے اپنی وفات سے چند روز قبل کٹھمنڈو سے روانہ ہونے والے انڈین ایر لائنس کے ایک طیارے کو اغوا

کئے جانے کے خلاف ایک بیان جاری کیا تھا جس سے سبھی کو ان کی صحت کے بارے میں تسلی ہوگئی تھی۔ یہ بیان ان کی فعال اور ہمہ وقت سرگرم زندگی کا حصہ تھا جس نے کسی ناخوشگوار خبر کے تصور کو ختم کر دیا تھا۔

مولانا علی میاں کی رحلت کے بعد ملت اسلامیہ کی حالت کیا تھی اس کی ایک مثال ۳۱ر دسمبر ۱۹۹۹ء کی کڑکڑاتی سردی اور کہرے کی دبیز چادر میں لپٹی ہوئی اس سیاہ رات کو دیکھنے میں آئی جب دوپہر سے اپنے گھروں سے کار، اسکوٹر، موٹر سائیکل سائیکل، ٹرین غرض ہر دستیاب سواری سے روانہ ہونے والوں کا سلسلہ رات تک جاری رہا تھا، ہر راستہ گویا رائے بریلی کے علمی، سیاسی اور دینی اعتبار سے مشہور تاریخی شہر میں تکیہ کلاں پر واقع دائرہ شاہ علم اللہ پر ختم ہو رہا تھا جہاں حسنی سادات خانوادے کے عظیم مجاہد آزادی سید احمد شہیدؒ نے ہندوستان کو برٹش راج کے چنگل سے آزاد کرانے کے لئے جد وجہد آزادی کا آغاز کیا، حکیم سید عبد الحی حسنی نے اپنی تحریروں سے علمی خزانے مالا مال کئے۔ ان کے صاحبزادوں ڈاکٹر سید عبد العلی حسنی اور مفکر اسلام مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے علم اور دین کی خدمت میں اپنے بزرگوں کے کام کو آگے بڑھایا۔ مولانا علی میاں نے تو اپنی الگ پہچان کے ساتھ بزرگان دین کا نچوڑ تھے نہ صرف اپنے خاندان کا نام روشن تر کیا بلکہ اپنے "وطن عزیز" کی "آبرو" بن کر اس کا سر اکثر فخر سے اونچا کیا۔ اس روز ہر گھر میں اداسی کا سماں تھا، کہیں کوئی پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا کہیں کوئی سر پکڑے بیٹھا تھا۔ مگر اہل خاندان پر آنسوؤں کی سوغات کے ساتھ سکینہ کی چادر تنی ہوئی تھی لکھنؤ اور دوسرے شہروں میں مساجد سے گلوگیر اور رندھی آواز میں اعلان ہو رہا تھا لکھنؤ میں بعض ٹرانسپورٹروں نے رائے بریلی کیلئے بسوں کا مفت انتظام کر دیا تھا، بازار بند ہو گئے تھے۔ لکھنؤ رائے بریلی روڈ پر کئی جگہوں پر خاص کر بچھراواں میں سڑک کے کنارے رہنے والوں نے اپنے گھر میں افطار اور نماز کا اہتمام کر رکھا تھا تاکہ اس وقت ادھر سے گذرنے والوں کو زحمت نہ ہو۔ اس سڑک پر اس رات کی ساری سیاہی کو ادھر سے گذرنے والی کار کی ہیڈ لائٹوں نے نگل لیا تھا۔ رات کے کسی بھی حصے میں سڑک کے کسی بھی حصے پر روشنی کی کمی نہیں تھی۔ اتنی بڑی تعداد میں کاروں کا آنا جانا اس سے پہلے وہاں رہنے والوں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اور تکیہ کلاں پر ایسا انسانی سمندر کبھی نہیں دیکھا گیا تھا۔ ان سواریوں پر ارباب اقتدار اور ان کے نمائندے بھی تھے، علمائے حق بھی تھے، اکابرین ملت بھی تھے، وکلاء تھے، صحافی تھے، کاروباری تھے، دانشور تھے، سیاسی، سماجی اور ملی رہنما تھے، عورتیں تھیں اور بچے تھے۔

اداس دلوں کی اس بھیڑ میں ہر دل رو رہا تھا، حضرت مولاناؒ کے آخری دیدار کے لئے لمبی قطار لگی ہوئی تھی، تدفین کا وقت آیا تو کاندھا دینے کے لئے ہر شخص بے چین تھا، مولانا کے گھر سے ان کے آبائی قبرستان تک کا چند منٹوں کا راستہ کئی گھنٹے میں طے ہوا۔ لاکھوں نے نماز جنازہ میں شرکت کی اور تدفین کے بعد مٹی دینے کا سلسلہ کئی روز تک جاری رہا، متعدد بار قبر سے مٹی زیادہ ہو جانے کی وجہ سے ہٹائی گئی۔

اس وقت جب لوگ تیزی کے ساتھ رائے بریلی کی طرف بھاگ رہے تھے، دنیا بھر میں ایک طبقہ ایسا بھی تھا جس نے اپنے کو دوسرے ہی قسم کی مصروفیت میں لگا رکھا تھا۔ یہ طبقہ اخبار نویسوں کا تھا جس کا قلم اسی تیزی سے اس "رات" سے لے کر آج تک چل رہا ہے جس تیزی سے سواریاں رائے بریلی کی طرف رواں دواں تھیں۔ اخبارات دیر رات تک خبریں جمع کرتے رہے جو رائے بریلی سے براہ راست موبائیل کے ذریعہ بھیجی جا رہی تھیں۔ اور اس کے بعد مولانا علی میاں کے بارے میں خصوصی اشاعتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ندوۃ العلماء کے ترجمان پندرہ روزہ "تعمیر حیات" نے جس کا ۲۵ر دسمبر تا ۱۰ر جنوری والا شمارہ پریس میں پہونچ چکا تھا۔ مولانا علی میاں کی رحلت سے متعلق تمام تفصیلات کے ساتھ منظر عام پر آنے میں اپنے کو ممتاز کیا۔ اس شمارہ کی اشاعت کو روک لیا گیا تھا اور اسے عملاً ایک خصوصی نمبر کی شکل دے دی گئی تھی جو دوسرے تمام خصوصی نمبروں میں اس لحاظ سے بھاری تھی کہ صدر نشین امور حرمین شریفین امام وخطیب مسجد حرام مکہ مکرمہ شیخ محمد بن عبد اللہ السبیل کا تعزیتی پیغام شامل کیا گیا، حرمین شریفین میں مولانا علی میاں کی غائبانہ نماز جنازہ کی خبر شامل کی گئی جو ۲۶ر رمضان المبارک کو ۲۷ ویں شب میں خادم الحرمین شریفین جلالۃ الملک فہد بن عبد العزیز فرماں روائے مملکت سعودی عربیہ کے حکم سے ادا کی گئی تھی۔ مولانا ڈاکٹر عبد اللہ عباس ندوی کا جامع مضمون شامل کیا گیا۔

مولانا علی میاں کے خادم خاص حاجی عبد الرزاق، مولوی سید بلال حسنی ندوی اور مولوی سید محمود حسنی ندوی کی مولاناؒ کے بارے میں روائتوں پر مشتمل جسے مولانا نذر الحفیظ ندوی نے ترتیب دیا تھا ایک بھرپور مضمون شامل کیا گیا۔ خود مولانا نذر الحفیظ کا کوئی مضمون نہیں ہے لیکن مذکورہ حضرات کی روایت جس انداز میں ترتیب دی گئی ہے وہ بجائے خود ان کے حضرت مولانا کے تعلق سے جذبات اور احساسات کی مکمل ترجمان ہے۔ اس شمارہ میں سکریٹری جنرل رابطہ عالم اسلامی ڈاکٹر عبد اللہ صالح العبید، نائب صدر عالمی رابطہ ادب اسلامی ڈاکٹر عبد القدوس ابو صالح (جس

کے حضرت مولاناؒ صدر تھے) خلیفہ جاسم الکواری مدیر ادارۃ الشئون الاسلامیہ وزارت اوقاف والشئون الاسلامیہ قطر، مولانا شاہ ابرار الحق (ہردوئی) جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ مولانا نظام الدین صاحب، صدر جمعیۃ العلماء ہند مولانا سید اسعد مدنی، نائب مہتمم دار العلوم دیوبند مولانا عبد الخالق، نائب صدر جمہوریہ ہند کرشن کانت جی، وزیر اعظم ہند اٹل جی، وی۔ پی۔ سنگھ، پارلیمنٹ کی لیڈر آف اپوزیشن مسز سونیا گاندھی، وزیر اعلیٰ یو۔پی کلیان سنگھ وغیرہ ممتاز شخصیات کے تعزیتی پیغام اور عربی اور ہندوستانی میڈیا کے بعض حلقوں کی شاہ سرخیاں بھی جمع کر دی ہیں، "مولانا علی میاں ایک نظر میں" کے عنوان سے ان کی زندگی کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ اور پروفیسر وصی احمد صدیقی صاحب نے اس انکساری کے ساتھ دل کو چھو لینے والا خصوصی اداریہ لکھا کہ "یہ اداریہ حضرت مولانا کے دینی اور علمی کارناموں کے بیان کے لئے نہیں لکھا جا رہا ہے؛ سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کے لئے"۔ ایک اور خصوصی شمارے کے لئے تعمیر حیات کے عملے کا قلم اب بھی چل رہا ہے۔

ملک اور بیرون ملک کے اخبارات مولانا علی میاں کے سانحۂ ارتحال کی خبر تک محدود نہیں رہے جو شاہ سرخیوں کے ساتھ شائع ہوئی بلکہ پہلے ہی دن سے بیسویں صدی کے تین چوتھائی حصے پر اپنی ایک منفرد اور لاثانی شناخت کے ساتھ دعوتی، علمی، دینی، تعلیمی، تصنیفی، تحقیقی اور خدمت خلق کے میدانوں پر چھائی رہنے والی انقلابی شخصیت مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندوی کی جو خیر و برکت کی منزل کا راستہ مختصر کرنے کے لئے "معنوی اور فکری نہر سوئز" کھودنے کے بھی داعی تھے، شخصیت پر بھرپور مضامین بھی شائع کئے جس کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے، دنیا بھر کے ممتاز علماء اور اکابرین ملت نیز دانشور حضرات نے اپنے مختلف جرائد میں تحریروں اور یادگاری جلسوں میں اپنی تقریروں میں بعض ایسی صفات بیان کی ہیں جو مولانا علی میاں کی شخصیت کے ان پہلوؤں کو نمایاں کرتی ہیں جو بصورت دیگر کبھی سامنے نہ آتیں۔ مثلاً ٹرینی کلوز لندن کے انڈیا مسلم فیڈریشن ہال میں برطانی مسلم تنظیم انڈین مسلم فیڈریشن کے زیر اہتمام مولانا علی میاںؒ کی یاد میں ہونے والے جلسے میں جس میں مولانا کی ایک تقریر کا کیسٹ بھی سنوایا گیا اسلامک فاؤنڈیشن لیسسٹر کے ڈاکٹر مناظر احسن صاحب نے بتایا کہ مولانا جب انگلستان آتے فاؤنڈیشن میں ضرور آتے اور نصیحت کرتے کہ ہر مکتبۂ فکر کے علماء کو مدعو کیا جائے اور اتحاد قائم کرنے پر زور دیا جائے۔

مشہور زمانہ آکسفورڈ یونیورسٹی کے سنٹر برائے اسلامک اسٹڈیز کے ڈائرکٹر فرحان نظامی نے انکشاف کیا کہ اگر مولانا ذاتی دلچسپی نہ لیتے تو یہ عظیم مرکز کبھی قائم نہ ہوتا جس کی فاؤنڈیشن کے وہ چیئرمین بھی تھے۔ انھوں نے ندوہ کی ضروریات کا ذکر کبھی کسی سے نہیں کیا جب کہ اس سنٹر کے قیام کے لئے ضرور ایسا کیا۔ اس جلسے میں اسلامک مشن کے سابق صدر رشید احمد صدیقی، لندن میں مولانا علی میاں کے مستقل میزبان مسرور صاحب اور لٹن اسٹون مسجد کے امام مولانا الیاس نے بھی اظہار خیال کیا۔ مولانا علی میاں کی یاد میں نہ صرف جرائد خصوصی نمبروں کی اشاعت میں پیش پیش ہیں بلکہ مختلف تنظیمیں ان کی یاد میں عام جلسے کرنے میں بھی جوش و خروش سے سرگرم ہیں۔

مولانا علی میاں کی یاد میں دہلی سے جناب شاہد صدیقی کی ادارت میں نیشنل پریس کے زمرے میں آنے والے ہفت روزہ جریدے "نئی دنیا" نے جو خصوصی نمبر شائع کیا وہ اپنا جواب آپ ہے۔ اس میں نہ صرف مولانا کی مختلف جہتوں پر مضامین ہیں بلکہ بعض نادر تصاویر بھی شامل کی ہیں۔ لکھنؤ میں ممتاز عالم دین اور خطیب مولانا سید سلمان حسینی ندوی کی سرپرستی میں شائع ہونے والے جمعیت شباب الاسلام کے ترجمان ماہنامہ "بانگ درا" کی خصوصی اشاعت میں بھی مولانا علی میاں کی شخصیت کے مختلف گوشوں پر ممتاز صحافی عشرت علی صدیقی، مولانا سید محمد واضح رشید ندوی، مولانا سید سلمان حسینی ندوی، مولانا محمد سعد کاندھلوی (تبلیغی مرکز نظام الدین) مولانا یوسف لدھیانوی، ممتاز عالم دین مولانا برہان الدین سنبھلی، امین الدین شجاع الدین، مولانا محمد خالد ندوی غازیپوری، محترمہ ڈاکٹر نسیم اقتدار علی، قاضی مجاہد الاسلام قاسمی اور مولانا شاہد سہارنپوری وغیرہ صاحبان نے فاضلانہ مضمون لکھے ہیں۔ ماہنامہ "رضوان"، ہفت روزہ "اخبار نو" "الجمعیۃ" دہلی، پندرہ روزہ "خبردار" دہلی، سہ روزہ "دعوت" دہلی، لکھنؤ کے روزنامے "صحافت" "اِن دنوں"، "سہارا" نے مولانا علی میاںؒ کی شخصیت پر مضامین شائع کئے۔

انجمن ترقی اردو ہند کے ترجمان ہفت روزہ "ہماری زبان" نے مولاناؒ سے عقیدت کا حق متعدد مضامین شائع کر کے ادا کیا ہے جس میں "مولانا ابو الحسن علی ندوی، وضاحتی کتابیات" کے عنوان سے دو قسطوں پر ایک مضمون اہمیت کا حامل ہے جو ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری جامعہ ملیہ اسلامیہ میں دستیاب اردو کتابوں پر مبنی ہے. اس میں مولانا کی ۱۶۱ تصنیفات کی فہرست ہے. اس مضمون کی آخری قسط یکم جون ۲۰۰۰ء کے شمارے میں شائع ہوئی ہے۔ "سالار" بنگلور "سیاست" حیدر آباد، "آزاد ہند" کلکتہ، "انقلاب"

قاردو ٹائمز" بمبئی سمیت برصغیر کا شاید ہی کوئی روزنامہ یا رسالہ ایسا ہو جس نے مولانا کے متعلق خصوصی اشاعت نہ کی ہو۔

روزنامہ "صحافت" لکھنؤ نے ۱۲ر جنوری ۲۰۰۰ء کی اشاعت میں مولانا علی میاں کی تصانیف کی ایک فہرست شائع کی ہے۔ اور یہ ایک خاص بات ہے کہ بعض جرائد نے مولانا کی صرف تصانیف کی فہرست شائع کی ہے جس سے ان کی شخصیت ان کی تصانیف کے آئینے میں ابھرتی ہے۔ پندرہ روزہ "خبردار" دہلی نے جناب سعید سہروردی کا ایک مضمون بعنوان "اپنی ذات میں انجمن تھے، علی میاں" شائع کیا جس میں مصنف نے مولانا کو عظیم عالم کے زمرے میں رکھ کر وضاحت کی کہ اس کی زندگی درس مسلسل ہوتی ہے اپنی زندگی کے باہر عملی زندگی میں بھی وہ منارۂ نور کی حیثیت رکھتا ہے۔ مولانا علی میاں بیک وقت کئی اقلیموں کے تاجدار تھے۔ ان کے ہر وصف کے لئے ایک صحیفہ درکار ہے۔

مولانا علی میاںؒ کے سانحۂ ارتحال کے بعد سے نہ صرف صحافت کی دنیا آج تک ان کے اوصاف، ان کی تصنیفات، ان کی علمی، دینی، پیام انسانیت کی شکل میں انسانی خدمت کے حوالوں سے قلم چلا رہی ہے، بلکہ دنیا بھر کی مختلف ملی تنظیموں کی طرف سے مختلف عنوان سے جلسوں کی شکل میں عقیدت کا خراج پیش کیا جا رہا ہے۔

لکھنؤ میں جسے مولانا علی میاںؒ اپنا وطن ثانی کہتے تھے شہریوں نے ان سے اپنی عقیدت اور محبت کا حق ادا کرنے کے لئے کرسچین کالج گراؤنڈ پر جلسہ پیام انسانیت کا انعقاد کیا تو سارے شہر نے اپنا کاروبار معطل کر کے اس میں لاکھوں کی تعداد میں شرکت کی۔ شہر کے کیلے اور تھوک کی منڈیاں بند رہیں جو بڑی بات تھی، دہلی، مراکش، ایران کی ممتاز اسلامی، مسیحی، بودھی، جینی اور ہندو دھرم کی روحانی شخصیات نے اس جلسے میں حصہ لیا۔ حکومت یوپی کے نمائندے کے طور پر ریاستی وزیر چودھری نریندر سنگھ نے شرکت کی اور کہا کہ مولانا علی میاں کی وفات صرف ان کے خاندان کے لئے نہیں بلکہ ساری دنیا کے لئے باعث صدمہ ہے۔

اسی طرح مولانا عبدالشکورؒ ہال اور قصبہ بجنور ضلع لکھنؤ میں بڑے جلسے ہوئے۔ عرب ممالک اور یورپ کے مختلف شہروں میں حضرت مولاناؒ پر جو سمینار اور جلسے ہوئے اس کے لئے ایک مفصل مضمون کی ضرورت ہے۔

ہندوستان کی تاریخ میں شاید یہ پہلا موقع تھا جب تقریباً بیک وقت تین بڑے شہروں میں کسی ممتاز شخصیت کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے لئے سمینار کا اہتمام ہوا۔ یہ شہر بھی اپنی اپنی جگہ منفرد شخصیت کے حامل تھے۔ یعنی لکھنؤ، علی گڑھ (مسلم یونیورسٹی) اور بمبئی جہاں انجمن اسلام کے زیر اہتمام اس کے صدر ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا کی زیر صدارت ۲۸ر مارچ کو سمینار ہوا۔ اسی روز جمعیت شباب الاسلام کے بانی سربراہ مولانا سید سلمان حسینی ندوی کی کاوش سے ملیح آباد کے مشہور برائے آم قصبہ کے علاقہ کٹولی میں واقع جامعہ سید احمد شہیدؒ کے زیر اہتمام سہ روزہ بین الاقوامی سمینار ہوا جس میں شرکت کرنے والوں میں مسجد اقصیٰ کے امام ڈاکٹر شیخ محمد محمود الصیام شامل ہیں، علی گڑھ میں یونیورسٹی کے شعبہ سنی دینیات کے ناظم سعود عالم قاسمی صاحب کے زیر اہتمام ۲۶ر مارچ کو منعقدہ سمینار میں بھی ڈاکٹر شیخ محمد صیام نے حصہ لیا تھا۔ اس وقت کے وائس چانسلر محمود الرحمٰن صاحب مولانا علی میاں کے نام سے ایک چیئر قائم کرنے کا اعلان پہلے ہی کر چکے تھے۔

پھر رائے بریلی نے اپنے "انمول رتن" کی یاد میں کل ہند سطح کا جلسہ "پیام انسانیت" منعقد کیا جس میں سابق وزیر اعظم ہند وشوناتھ پرتاپ سنگھ سمیت ملک کی اکابر شخصیات نے شرکت کی جس کی صدارت مولانا علی میاں کے جانشین اور ان کے ہی خانوادہ کے ایک فرد مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے فرمائی۔ ملک کے باہر بھی مولانا علی میاںؒ کی یاد میں جلسوں کا اہتمام کیا گیا جس میں سے دو تین جو نیپال کے علاقوں کٹھمنڈو اور سنسری میں دارالعلوم نورالاسلام کے زیر اہتمام پیام انسانیت اور اصلاح معاشرہ کے عنوان سے جلسے ہوئے جن میں اہل ہنود نے بھی حصہ لیا۔ سنسری میں وہاں کے میئر اور ضلع مجسٹریٹ نے جو دونوں غیر مسلم ہیں جلسہ پیام انسانیت میں شرکت کی، کٹھمنڈو کی جامع مسجد میں بھی ایک بڑا جلسہ ہوا۔ ان تقریبات میں مولانا محمد عباس ندوی، مولانا محمد ایوب ندوی وغیرہ صاحبان نے کلیدی رول ادا کیا۔ اس کے علاوہ انڈونیشیا، ملیشیا اور برطانیہ وغیرہ میں بھی مولانا کی یاد میں بین الاقوامی اجتماعات ہونے کی تیاری چل رہی ہے۔ لندن میں بھی ایک سمینار ہوا۔

زیر نظر مضمون محض ایک خاکہ ہے ان حالات کا جو مولانا علی میاں کی علالت سے لے کر وفات تک اور اس کے بعد تک ہم اور آپ دیکھتے، سنتے اور پڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ یہ مضمون دستیاب مواد کی بنیاد پر تیار ہوا ہے اس میں بہت سی کمیاں ہیں جس کا راقم کو اعتراف ہے۔

مولانا علی میاں کے سانحۂ ارتحال پر جو عالمی شخصیات کے تعزیتی پیغام آئے ان میں امام حرم شیخ عبداللہ السبیل اور خادم الحرمین الشریفین ملک فہد بن عبدالعزیز نے جو تعزیتی پیغام بھیجا اور

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کو ندوۃ العلماء کا ناظم منتخب کئے جانے پر جو مبارکباد کا پیغام آیا وہ بھی اپنی جگہ پر علمی حیثیت کے حامل ہیں۔ نہ صرف خادم الحرمین الشریفین ملک فہد بلکہ ایران، یو۔ اے۔ ای اور دیگر مختلف ممالک، وزیر اعظم ہند اٹل بہاری باجپئی، پارلیمنٹ میں حزب اختلاف کی لیڈر اور کل ہند کانگریس کی صدر مسز سونیا گاندھی وغیرہ کے تعزیتی پیغامات بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ تمام مذکورہ سرگرمیوں میں ایک اور زبردست سرگرمی وہ ہے جو ملک فہد بن عبد العزیز خادم الحرمین الشریفین کے حکم سے ہوئی تھی یعنی مولانا علی میاں کے لئے باقاعدہ اعلان کرکے حرمین شریفین میں غائبانہ نماز جنازہ۔ یہ درجہ ان ہی کو نصیب ہوتا ہے جن کے درجات اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں بلند ہوتے ہیں۔ اور مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے بارگاہ الٰہی میں درجات کی بلندی کا حال تو یہ تھا کہ ان کو کعبۃ اللہ کے کلید بردار شیبی نے ایک بار کعبۃ اللہ کا دروازہ کھولنے کے لئے کلید کعبہ پیش کی جو ایک تاریخ ساز واقعہ تھا، یہ بھی کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ قرآن شریف کے اردو ترجمے اور تفسیر کی اشاعت سے قبل مولانا علی میاںؒ کی منظوری کو حرف آخر قرار دیا جائے اور مترجم حضرت مولانا محمود حسنؒ اور مفسر حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کے ساتھ مولانا علی میاں کا نام بھی شامل کیا جائے۔ یہ بھی کچھ کم تاریخی اہمیت کا واقعہ نہیں ہے کہ ایسا موقع آئے جب مولانا علی میاں کے ایک طرف امام حرمین شریفین شیخ السبیل تشریف فرما ہوں اور دوسرے بازو پر امام مسجد اقصیٰ ڈاکٹر شیخ محمد صیام جلوہ افروز ہوں۔

مولانا علی میاں کے بارے میں تمام تحریریں اور تمام تقریریں ایک ایسے علمی ذخیرے کی حیثیت رکھتی ہیں جو اگر جمع کر دی جائیں تو آنے والی نسلیں اور محقق ہمیشہ ان سے مستفید ہوتے رہیں۔

وہ جن کا رتبہ عالی رہا اعلیٰ قیادت میں

مجیب بستوی

جناب بوالحسن ندویؒ رہیں دامانِ رحمت میں
رہے مشہور جو تشہیر انسانی اخوت میں

وہ جن کے سامنے حکام عالم سر جھکاتے تھے
وہ جن کا رتبہ عالی رہا اعلیٰ قیادت میں

بصیرت پر سیاسی، جن کا لوہا مان جاتے تھے
سبھی اہل سیاست، قومی و ملکی سیاست میں

کتابیں جن کی لاتعداد علمی اور اصلاحی
بہت مدت سے ہیں مقبول اسلامی شریعت میں

پڑ دیتی ہیں ندوہ والوں کی اندوہگیں آنکھیں
نہ فرق آئے خدایا ندوۃ العلماء کی عظمت میں

حضور پاکؐ کی مدحت میں گذرا جن کا ہر لمحہ
رہا مصروف ہر لمحہ جو مولا کی عبادت میں

مہارت جن کو حاصل تھی علوم دین و دنیا کے
جبال العلم ندوہ ہو گیا جن کی نظامت میں

جنہوں نے بیش قیمت کارنامے کتنے کر ڈالے
مثیل ان کا نہیں ملتا کوئی دنیا کی وسعت میں

گذر اوقات فرماتے تھے مولا کی عطاؤں پر
رہے مشہور پھر بھی وہ غریبوں پر سخاوت میں

مثال ان کی نہیں ملتی کہیں اقصائے عالم میں
نہیں شبہ کوئی ان کی قیادت اور کرامت میں

نہ ہوں کیوں واضح و رابع بھلا مغموم اور محزوں
نہیں جب بوالحسن موجود ندوہ کی عمارت میں

وہ سلمان و صہیب آئے ہوئے ہیں اشک برساتے
علاوہ صبر کے اب کیا ہے اک معصوم فطرت میں

وہ عبد اللہ و حمزہ اور ہیں عمار نم دیدہ
کہ ان کے دن گذرتے ہیں بڑی نادیدہ حالت میں

بلال اسحاق احمد اور وہ محمود وہ جعفر
قیامت ان پہ ٹوٹی جیسے میدانِ قیامت میں

حسین آئے، حسن کے غناکی کی حالت میں
گھڑی ان کی گذرتی ہے بہت حرمان و حسرت میں

ملے رزاق حاجی پھر نثار احمد، نیاز احمد
بہت ہیں غمزدہ، رہتے جو تھے حضرت کی خدمت میں

نہیں چلتا مجیب اپنا قلم اب اور کیا لکھے
دعا ہے بس یہی حضرت مرے پہونچے ہوں جنت میں

(بقیہ)

توصیف کیا بیاں کریں

اور وہ وقت منتخب فرمایا جس میں وہ تلاوت قرآن کریم میں مشغول تھے۔ ان کی زندگی جتنی پاکیزہ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے موت بھی ایسی ہی پاکیزہ عطا فرمائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس واقعے پر یوں تو ہر مسلمان تعزیت کا مستحق ہے۔ لیکن خاص طور پر حضرت کے اہل خانہ دار العلوم ندوۃ العلماء کے منتظمین اور اساتذہ نیز حضرت کے تمام متوسلین کی خدمت میں البلاغ کی طرف سے پیغام تعزیت پہنچ سکے۔

حضرت مولانا اب دنیا میں نہیں ہیں، لیکن انھوں نے جو گرانقدر مآثر چھوڑے ہیں وہ انشاء اللہ رہتی دنیا تک امت کی رہنمائی کریں گے۔

ہر آنکھ آج اس کے لئے اشکبار ہے
شمس و قمر اداس فضا سوگوار ہے

یادوں کے دریچے سے

ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی جنرل سکریٹری دینی تعلیمی کونسل اترپردیش

حضرت مولانا علی میاں اور میری عمر میں ۱۸ سال کا فرق تھا تقریباً ۵۳ سال کی رفاقت رہی خاص طور پر ۱۹۴۷ء سے لے کر انتقال کے وقت تک۔ میری طالب علمی کا ابتدائی دور ہائی اسکول تک پرتاپ گڑھ میں گذرا، ابتدائی دور میں میرے مربی اور استاد مولوی عبیدالرحمٰن صاحب مرحوم گورنمنٹ ہائی اسکول پرتاپگڈھ میں اردو وعربی کے استاد تھے۔ ان کی شخصیت میں عجیب دلآویزی اور مقناطیسیت تھی، ہندو مسلمان کی کوئی قید نہیں تھی جس کا بھی ذرا ان سے رابطہ ہو جاتا اس میں صلاح اور خیر کا عنصر ابھر آتا۔ مسلمان لڑکے نماز کے پابند ہو جاتے، ہر شخص ان کا احترام کرتا ان کی نجی زندگی میں سادگی سخاوت اور سنت نبوی کی جھلک بہت نمایاں تھی، اللہ تعالیٰ سے خاص تعلق بہت نمایاں تھا۔ استاد اور شاگرد کا براہ راست تعلق تو مشکل سے چھ مہینے رہا ہوگا لیکن ان سے مسلسل رابطہ اور رہنمائی کا سلسلہ بہت بعد تک رہا ان کا حال یہ تھا کہ جس شہر میں جاتے نوجوانوں میں دینی تعلق بڑھ جاتا۔ ان کا موقف یہ تھا کہ مسلمانوں کو خصوصیت سے تجارت کی طرف راغب ہونا چاہئے، وہ خود بھی اس کام کو کر کے دکھاتے تھے۔ اس پس منظر کے ریکارڈ پر لانے کا مقصد یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء سے پہلے کی کیفیت کا کچھ اندازہ ہو سکے مولوی عبیدالرحمٰن صاحبؒ کا خیال تھا کہ آزادی کے بعد جبریہ تعلیم کا نفاذ ہوگا، ان کے اس احساس کا نتیجہ تھا کہ ہماری نوجوانوں کی تنظیم جس کا نام مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن تھا اس نے لڑکے لڑکیوں کا اسکول قائم کیا شہر میں ایک ایک گھر کا سروے کیا ایک دارالمطالعہ قائم کیا جو تنظیم کے کاموں کا مرکز تھا، دراصل یہ میری سرگرمیوں کا آغاز تھا جس کے نتیجہ میں شہر میں ایک ممتاز متحرک تنظیم جو دینی تعلیمی اور تعمیری کاموں میں سرگرم تھی وجود میں آگئی، شہر کے نوجوانوں کو فجر کی نماز سے پہلے بیدار کرتا، صبح کی نماز میں یہ نوجوان شریک ہوتے اور کچھ ورزش کر کے دارالمطالعہ سے کتاب لے کر اپنے گھروں کو واپس ہو جاتے عصر کے وقت پھر یہی نوعیت ہوتی۔ شہر میں اکثر جلسے ہوتے اور عیدین کے موقع پر کبھی تعلیمی اداروں کے لئے چندہ جمع کیا جاتا تھا۔

مقامی سی۔آئی۔ڈی نے یہ رپورٹ دیدی، یہ چندہ جمع کر کے قاسم رضوی کی تنظیم اتحاد المسلمین حیدرآباد کو بھیجا جاتا ہے اور بھی ایسے ہی بے بنیاد الزام اس نے تراشے، یہ کہ ۱۵ راگست کو جھنڈا جلوادیا وغیرہ۔ تفتیش بھی ہوئی لیکن بات بالکل بے بنیاد تھی اس لئے اس کو کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔

اس درمیان کسی شخص نے مجھے متوجہ کیا کہ لکھنؤ میں مولانا علی میاں ہیں ان سے ملوں۔ لکھنؤ میرا آبائی وطن بھی ہے میں نے لکھنؤ جاکر مولانا سے ملاقات کی۔ یہ پہلی ملاقات ظہر کے وقت محمد علی لین کی مسجد میں ہوئی۔ نماز کے بعد مولانا نے میری روئداد اطمینان سے سنی سب کچھ سن کر ایک جملہ کہا کہ "کچھ دن ساتھ رہنے کی ضرورت ہے"، پھر کہا کہ صبح آجاؤ تو مولانا منظور نعمانی صاحبؒ سے ملوادوں، وہ مولوی گنج میں ذرا اندر کے حصے میں رہتے تھے ان کو دیکھنے سے اندازہ ہوا کہ کوئی بہت اللہ والی شخصیت ہے. جیسے انوار کی بارش ہو رہی ہو۔ میں نے اپنے کام کی پوری تفصیل انھیں بھی سنائی، مولانا نے اطمینان سے پوری بات سن کر یہ کہا کہ "اگر کسی شہر میں تم یہ نظام قائم کر دو تو ہم اسے اپنا لیں گے"۔ میں نے عرض کیا کہ ہم تو طالب علم ہیں جو ہم سے ہو سکا کیا یہ تو بڑوں کا کام ہے۔

اس کے تھوڑے دن بعد مولانا علی میاں ۳۲ آدمیوں کی ایک تبلیغی جماعت لیکر پرتاپگڈھ آئے، جماعت جامع مسجد میں ٹھہری ایک پرچہ کے ذریعہ مجھے گھر پر اطلاع کرائی کہ ہم آگئے ہیں۔ میں فوراً جامع مسجد گیا اور طلبا کی ٹیم کو بلا کر ان کے ذمہ تمام کام سپرد کر دیئے۔ یہ رمضان المبارک کا مہینہ تھا افطاری کھانا، سحری ہر چیز کا نظام بن گیا۔ عصر کے وقت مولانا نے فرمایا کوئی سائیکل مل جائے گی میں نے ایک صاحب سے پرانی سائیکل لے کر دی، اس کے ذریعہ وہ پہلی مرتبہ میرے والد صاحب سے ملنے گئے۔ والد صاحب مرحوم ڈاکٹر محمد کرامت حسین قریشی شہر کی ممتاز ترین شخصیت تھی۔ مجھے ایسے کسی کام سے منع نہیں کرتے تھے، علماء کا اکرام کرتے تھے۔ یہ حضرت مولانا سے ان کی پہلی ملاقات تھی۔

حضرت مولانا نے تراویح کے بعد جماعت میں شامل ایک ممتاز شاعر سے مسجد ہی میں فرمائش کی کہ یہ نوجوان ہیں ان کو اقبالؒ کے اشعار سنائیں میں نے ادھر ادھر دیکھا اور یہ خیال پیدا ہوا کہ مسجد

والے کیا کہیں گے رمضان المبارک میں مسجد میں شاعری ہو رہی ہے لیکن مولانا بالکل مستغنی۔ کچھ دیر یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد لوگ آرام کرنے لیٹ گئے۔ صبح شہر کے بہت سے لوگ فجر کی نماز کے بعد جمع ہوئے انھیں حضرت مولانا نے خطاب کیا کوئی ٹس سے مس نہ ہوا، اس طرح حضرت مولانا تین بار پرتاپ گڈھ تشریف لائے حضرت مولانا نے آخر میں فرمایا کہ معلوم ہوتا ہے یہاں ہمارا کوئی حصہ نہیں ہے میں نے عرض کیا مولانا کھونٹا ہونا ضروری ہے پھر ہمارے ایک ساتھی ہاشم جو نویں درجہ کے طالب علم تھے اس کام سے وابستہ ہوگئے پھر تبلیغی جماعت کے کام کو بہت فروغ ہوا نوجوان طبقہ متوجہ ہوگیا ہر مسجد میں توسیع ہوئی اور پورے ضلع میں کام پھیل گیا۔ ایک مرتبہ شہر کے مضافات کٹرہ اور ایک مرتبہ مئو آئمہ کا سفر ہوا، چالیس نوجوان ساتھ میں تھے۔ مئو آئمہ قصبہ میں عجب ویرانی تھی مسجد بہت شاندار لیکن نمازی کوئی نہیں۔ دوپہر میں دو تھیلیاں مانگ کر دال چاول پکوائے اور مسجد کے فرش کو دھو کر اسی پر کھانا کھایا گیا، عصر کے بعد دیکھا مولانا مسجد کے صحن میں ٹہلتے جاتے تھے اور روتے جاتے تھے۔ کٹرہ میدانی گنج پرتاپ گڈھ کے سفر میں وضو کر کے اٹھنے لگے تو کہا میں بوڑھا ہوگیا ہوں، حالانکہ اس وقت چالیس سال کی عمر ہوگی۔ کتاب پڑھی گئی مولانا محمد ثانی مرحوم بھی تھے، انھوں نے دعا کرائی، دعا میں ایسی رقت طاری ہوئی کہ معلوم ہوتا تھا دو چار کا انتقال ہو جائے گا ایسی کیفیت کبھی دیکھی نہیں۔

۱۹۴۸ء میں راقم کی تحریک پر مجلس اسلامیات کے سکریٹری نے حضرت مولانا علی میاں کو علی گڈھ مسلم یونیورسٹی آنے کی دعوت دی۔ مولانا محمد رابع حسنی ندوی ساتھ تھے۔ یونیورسٹی گیسٹ ہاؤس میں جو کبھی پروفیسر حلیم پرو وائس چانسلر کا مکان تھا اس میں قیام رہا، یونین میں مولانا نے تقریر کی راقم کو مختلف ہالوں میں مولانا کا طلبا سے تعارف کرانے کی سعادت حاصل ہوئی نواب حبیب الرحمن خاں شروانی سے اسٹریچی ہال کے باہر مولانا سے ملاقات ہوئی تو نواب صاحب نے فرمایا کہ تمہیں معلوم ہے یہاں ایک حبیب بھی رہتا ہے پھر مولانا ان کی کوٹھی حبیب منزل میرس روڈ منتقل ہوگئے دراصل وہ مولانا کے والد مولانا عبدالحی رح کے رفیق خاص تھے انتہائی ذی علم اور مولانا آزاد کے مخصوص دوستوں میں اور ان کے میزبان تھے۔ نہایت وجیہہ خوبصورت چہرہ بے حد نورانی۔ مولانا نے میرا بھی تعارف کرایا، بہت ہی شفقت سے میرے چہرہ پر ہاتھ پھیرا۔

اس کے بعد علی گڈھ سے دہلی کا سفر ہوا، نظام الدین کے شاہ حسن عطا سکریٹری مسلم یونیورسٹی یونین، میں اور میرے ایک ساتھی عباد صاحب ساتھ تھے، یہ تبلیغی سلسلہ کی پہلی جماعت تھی جو نظام الدین گئی۔ نظام الدین کی مسجد میں مولانا یوسف رح سے ملاقات ہوئی اس وقت معلوم ہوا کہ جامعہ کے ۵۲ سینیر طلبا میں مشکل سے دو دینی ذہن کے ہیں باقی ۵۰ ترقی پسند یا دوسرے الفاظ میں کمیونسٹ ذہن کے طلبا ہیں۔

مولانا سے تعلق تو مسلسل قائم رہا، لیکن تعلیم کی وجہ سے لمبا وقفہ ہوتا رہا یہاں تک کہ ۱۹۵۱ء میں میرا ڈھاکہ میڈیکل میں داخلہ ہوگیا مجیب الرحمن نے ۱۹۵۱ء میں اردو، بنگالی کا قضیہ کھڑا کیا حکومت پاکستان کی انتظامیہ نے گولی چلائی چار نوجوان مر گئے، اس کے بعد حالات تیزی سے بدلنا شروع ہوئے۔ میرا صرف تعلیم کے لئے ڈھاکہ بدرجہ مجبوری جانا ہوا تھا وہاں مستقل رہنے کا ذہن نہیں تھا میں نے واپس آنے کا ارادہ کر لیا، لوگوں نے منع بھی کیا میرا جواب تھا کہ اللہ تعالیٰ نے جو روزی مقرر کی ہے وہ تو ملے گی دوسرے سب نوجوان پاکستان چلے جائیں گے تو ہندوستانی مسلمانوں کا کیا ہوگا۔ اس لئے واپس آگیا لکھنؤ میں ہومیوپیتھک کالج میں داخلہ لیا، فائنل کے بعد لندن پوسٹ گریجویٹ کورس کے لئے چلا گیا واپس آکر اسی کالج میں بحیثیت سینیر لکچرر ملازمت مل گئی، ۱۷ سال پڑھانے کے بعد ایک اہم واقعہ کی بنیاد پر استعفیٰ دے دیا، استعفیٰ دینے کی جو خوشی اس وقت ہوئی وہ نوکری ملنے کے وقت بھی نہیں ہوئی تھی، سب سے پہلے مرکز کچہری روڈ جاکر مولانا محمد میاں کو خوشخبری سنائی۔ ملازمت کا یہ دور ۱۹۵۶ء سے شروع ہو کر ۱۹۷۳ء پر ختم ہوا۔ دراصل جذبہ یہ تھا کہ ابھی صحت ٹھیک ہے کچھ کام ہو جائے گا ورنہ صرف آرزو ہی رہے گی کہ صحت ٹھیک ہوتی تو یہ کرتا وہ کرتا۔ حالانکہ سرکاری ملازمت گزیٹڈ ہونے کے باوجود میرے کسی کام میں رکاوٹ نہیں تھی تمام کاموں میں سرگرمی سے شرکت کرتا رہا۔

اسی زمانہ میں ۳۰۔۳۱ر دسمبر ۱۹۵۹ء کو دینی تعلیمی کونسل قائم ہوئی۔ ۱۹۶۲ء میں ندائے ملت شائع ہونا شروع ہوا۔ ۱۹۶۴ء میں مسلم مجلس مشاورت کا قیام عمل میں آیا، ۱۹۶۵ء میں مسلم یونیورسٹی حکومت کی تحویل میں چلی گئی، ۱۹۶۷ء میں مسلم یونیورسٹی کے تعلق سے یوپی مشاورت نے ڈاکٹر فریدی اور ان کے رفقاء کے ایما پر یوپی میں کانگریس حکومت کے خلاف ووٹ ڈالنے کی تحریک چلائی گئی کانگریس حکومت ٹوٹ

گئی۔ مولانا کی فکر ان تمام مسائل میں پوری طرح حاوی تھی میں ہر مرحلہ پر پوری طرح اس میں شریک تھا۔ بعد میں ۱۹۶۷ء میں رامپور میں آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کے بعض اراکین نے فریدی صاحب سے یہ کہا کہ مشاورت غیر سیاسی جماعت ہے اس لئے اگر سیاست کرنی ہے تو علیحدہ تنظیم قائم کر لیجئے، مولانا ہر حال میں ڈاکٹر فریدی صاحب کے حق میں تھے۔ مشاورت کے اسی اجلاس میں میں نے تعمیری منصوبہ پیش کیا جو متفقہ طور پر منظور کیا گیا۔ ۱۹۶۷ء میں لکھنؤ میں مسلم مجلس قائم ہوگئی ۱۹۷۲ء میں ممبئی میں مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام عمل میں آیا۔

۱۹۶۲ء میں مولانا کے ساتھ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل ہوئی۔ اسی سفر میں رابطہ عالم اسلامی کا قیام عمل میں آیا۔ شاہ سعود کی موجودگی میں ۱۹۶۳ء میں مولانا کا سفر یورپ اور انگلینڈ کا ہوا۔ میں رفیق سفر تھا۔ واپسی میں اندلس کا دورہ تھا، قرطبہ غرناطہ۔ اشبیلیہ۔ میڈرڈ وغیرہ مقامات پر خصوصیت سے جانا ہوا۔ یہ ایک تاریخی یادگار سفر تھا ہر جگہ تاریخی عمارتوں پر "ولا غالب الا اللہ" لکھا ہوتا تھا ہوٹل اندلس کی ایک شب یادگار تھی ذکر جہری مولانا نے شروع کیا علیحدہ علیحدہ کمروں میں۔ مولانا نے فرمایا کہ ایسا معلوم ہوتا تھا روحیں لپٹی جا رہی ہیں۔ عجب کیفیت تھی، جمعہ کا دن تھا میں نے عرض کیا آج جمعہ پڑھ لیا جائے۔ چند اخوانی نوجوان بھی تھے ۴ صدیوں کے بعد شاید یہ پہلا جمعہ تھا مولانا نے خطبہ دیا نماز پڑھائی۔ مسجد قرطبہ میں بھی دو رکعت نماز پڑھی گئی تو اس میں اندر گرجے بنے ہوئے تھے۔ لندن کے سفر میں آکسفورڈ، کیمبرج اور دوسرے تاریخی مقامات کے ساتھ انڈیا لائبریری بھی جانا ہوا، پروفیسر آربری سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اپنی لائبریری دکھائی کہ یہ سات سو برس پرانی ہے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کے مختلف شعبے دیکھے، مختلف میوزیم دیکھے، پیرس میں ڈاکٹر حمید اللہ سے ملاقات ہوئی انھوں نے سوڈان یونیورسٹی دکھائی، ڈاکٹر حمید اللہ نے فرانسیسی زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا تھا۔ اُسے پڑھ کر کثرت سے لوگ مسلمان ہو رہے تھے اس وقت ۲۰ ہزار نسخے دو مرتبہ چھپ چکے تھے سوڈان کے موجودہ اسپیکر حسن ترابی جو نوجوان تھے اور آجکل صدر جنرل بشیر ابوبکر کی طرح انتہائی اہم دینی شخصیت ہیں۔ اس زمانہ میں سوبورن یونیورسٹی میں قانون کے طالب علم تھے۔ مولانا سے والہانہ تعلق رکھتے تھے۔ ہر جگہ اخوانی نوجوان جو مولانا کی کتابوں کے ذریعہ اُن سے واقف تھے انتہائی گرویدگی کا مظاہرہ کرتے تھے برابر ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ سوبورن یونیورسٹی کے اخوانی نوجوانوں سے بھی مولانا نے خطاب کیا۔

جنیوا میں ڈاکٹر سعید رمضان جو شیخ حسن البنا کے داماد اور شعلہ بیان مقرر اور ممتاز قانون داں تھے جلاوطنی کی زندگی گذار رہے تھے۔ وہی دراصل اس سفر کے داعی اور میزبان تھے جنیوا GENEVA میں مولانا کی والدہ کی علالت کی خبر ملی۔ ان کا اصرار تھا کہ مولانا کچھ دن اور قیام کریں صحت کے خیال سے۔ یہ بھی کہا کہ راقم رائے بریلی چلا جائے اور والدہ کی خیریت معلوم کر کے آجائے۔ لیکن مولانا کا جو اپنی والدہ سے والہانہ تعلق تھا اس کیلئے راضی نہیں ہوئے، مولانا کا حال ہمیشہ یہ رہا کہ مولانا کہیں ہوں والدہ کی علالت سن کر پھر نہیں رکتے تھے اور اکثر سفر بھی ملتوی کر دیتے تھے۔ اس زمانہ میں عبد الرؤف صاحب سوئٹزرلینڈ میں ہندوستان کے سفیر تھے۔ انھوں ہی نے مولانا کا ایئر پورٹ پر استقبال کیا، بڑی اپنائیت کے ساتھ اپنی قیام گاہ پر لے گئے، کھانا کھلایا سوئیس قوم کی پیسے کی فری نظام تعلیم کی گرانی اور سوئیس قوم کے قومی کردار کے دوسرے دلچسپ قصے سناتے رہے۔ مولانا کے پاسپورٹ کی مدت ختم ہو رہی تھی خود ہی جا کر ان کی تصویر کھنچوا دی چھٹی ہونے کے باوجود دوسرا پاسپورٹ بنوا کر دیا۔

مولانا کے سفر نامے ہمیشہ بہت مقبول ہوئے امید تھی کہ یہ بھی منظر عام پر آئیگا لیکن پتہ نہیں کیوں ابھی تک شائع نہیں ہو سکا۔ جنیوا GENEVA کے قیام میں یورپ کے مختلف شہروں میں مقیم بہت سے نوجوان آگئے تھے۔ یحییٰ اسلام سے بہت تعلق رکھتے تھے اکثر یہ لوگ ننگے سر نماز پڑھتے۔ مولانا سے ایک مرتبہ کہا کہ کبھی کبھی ہم ننگے سر نماز پڑھ لیا کریں اور آپ ٹوپی پہن کر۔ مولانا کا دراصل اصلاح کا یہی دلآویز طریقہ تھا۔ کبھی جارحیت کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ لوگوں نے اس کا بہت اثر لیا۔ سعید رمضان جب پہلی مرتبہ ۱۸ سال کی عمر میں لکھنؤ آئے تھے تو مولانا نے ان کا زبردست استقبال کیا تھا۔ گنگا پرشاد میموریل ہال میں انھوں نے زبردست تقریر کی تھی۔ مولانا نے خصوصیت سے ان کا تعارف کرایا تھا حالانکہ وہ ترکی ٹوپی پہنے ہوئے تھے اور سوٹ میں تھے جو مصری تعلیم یافتہ نوجوانوں کا عام لباس تھا۔ بعد میں حکومت ہند کو سعید رمضان مرحوم سے کچھ شکایت یا غلط فہمی ہوگئی تھی تو وہ ان کی آمد پر بہت نظر رکھتی تھی بعض وقت مضحکہ خیز نوعیت پیش آئی کہ وہ لکھنؤ پہنچ کر ۳۷۔ گوئن روڈ پر چھپے ہوئے ہیں۔

۱۹۷۴ء میں ندوہ کا تاریخی اجلاس تھا ایمرجنسی اور اندرا گاندھی کا دور تھا۔ دعوت نامہ تو چلا گیا اجلاس کی تاریخیں قریب آگئیں لیکن مہمانوں کی آمد کی کوئی اطلاع نہیں آ رہی تھی۔ مولانا خاموشی سے رکشہ پر ٹیلہ والی مسجد گئے وہاں انتہائی عاجزی سے دعا کی عین اجلاس کے وقت پھر تو ایسا اژدحام ہوا کہ یہ اجلاس یادگار بن گیا۔

بہت سے انتظامی امور اور شہری استقبالیہ کا انچارج میں تھا۔ ایک اجلاس کے موقع پر بھیڑ بہت تھی مہمانوں کو کلارک اودھ پہونچانا تھا خیال تھا کہ اجلاس ختم ہونے سے پہلے جبکہ بھیڑ نہیں ہوگی مہمانوں کو پہونچا دیا جائے۔ ورنہ گاڑیوں کا نکلنا مشکل ہو جائیگا ان کی سیکورٹی کا بھی مسئلہ تھا۔ لیکن مولانا نے اچانک جلسہ کے اختتام کا اعلان کر دیا۔ میں عجلت سے مولانا کے پاس ڈائس پر پہونچا کہ ذرا توقف کر لیا جائے۔ لیکن جو بات میں نے محسوس کی جیسے کوئی بھٹی دہک رہی ہو اور مولانا بالکل مطمئن اور صورتحال سے بالکل غیر متأثر۔ مولانا کی یہ بات میں نے اکثر مواقع پر دیکھی خدا کی ذات پر مکمل بھروسہ اور توکل اور حالات سے بالکل غیر متأثر اور بے نیاز وہ اکثر اہم موقع پر چند لوگوں کو خاص طور پر صوفی انیس کو جو مجذوب صفت تھے مسجد میں بٹھال دیتے تھے کہ یکسو ہو کر ذکر میں مشغول رہیں۔ ندوہ کے اس اجلاس میں جو بات محسوس کی گئی جیسے سکینت کی چادر تنی ہو۔

مولانا کے وہاں اسفار میں کھانے پینے اور سفر خرچ کا کوئی اہتمام نہیں ہوتا تھا کہ کھانے پینے کی چیز رکھی جائے۔ اس طرح اکثر ایک ہی وقت جو سامنے پڑا اس کو کھانے پر مدعو کر لیا منتظمین کو اندازہ رہتا تھا کہ کھانا کم ہے یا گوشت کم ہے یا مرغ ایک ہی ہے۔ مولانا کو اس تحقیق کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ لیکن دیکھا بھی گیا کہ کھانا بچ ہی رہا کوئی بھوکا نہیں رہا۔ لوگ خوب کھاتے بھی تھے۔ اور کھانے میں بڑی لذت محسوس کرتے تھے خاص طور پر جب کھانا مولانا کے گھر کا ہوتا تھا خواہ دال روٹی ہی کیوں نہ ہو۔

مولانا اپنی تقریروں اور تحریروں میں تو بہت پر جوش تھے لیکن براہِ راست روک ٹوک اور تلقین کی عادت نہیں تھی اس لئے ہر قسم کے لوگ مولانا کی مجلس میں ہوتے ملاقات کرتے اور ہر قسم کی ضرورت کی درخواست بھی کرتے ایک مرتبہ مولانا کے دیوبند کے ایک ساتھی نے مولانا سے دریافت کیا کہ مولانا آپ تقریر کس طرح تیار کرتے ہیں۔ مولانا نے فرمایا کہ تقریر سے پہلے کچھ نہیں معلوم کہ کیا کہنا ہے۔ یہ دعا ضرور کرتا ہوں کہ "اللہ تعالیٰ اس ٹھیکری میں کچھ ڈال دے"

مولانا اپنے بزرگوں کا اتنا ادب کرتے تھے کہ خود سے گفتگو کبھی نہیں کرتے تھے گھنٹوں خاموش بیٹھے رہتے تھے۔ ان بزرگوں نے کچھ بھی پوچھا تو مؤقر جواب دیا۔ حضرت رائے پوری کے بعد مولانا کی تمام توجہ کا مرکز حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ تھے، ہر مسئلہ میں مشورہ کرنا خواہ خطوط کے ذریعہ یا کسی کو بھیج کر یا حاضر ہو کر سیاسی مسائل ہوں یا دینی مسائل ہوں، مشاورت کی انجمنیں ہوں یا ملکی یا غیر ملکی مسائل ہوں، یوپی کی مشاورت کی چیئرمینی کا مسئلہ تھا مولانا نے حضرت شیخ سے پوچھا۔ انھوں نے فرمایا فریدی کو بنا دو ۱۹۶۷ء اکتوبر کے بعد مجھے یوپی مشاورت کا چیئرمین بنا دیا گیا تھا۔ مجلس تحقیقات دراصل مولانا کی اس فکر کا نتیجہ تھا کہ نوجوانوں میں غیر شعوری طور پر ارتداد بڑھ رہا ہے۔ اس موقع پر "نیا طوفان اور اس کا مقابلہ" ایک کتابچہ لکھا۔ دراصل اس سے مزید تحریک ہوئی میں نے ہی اس ادارہ کا نام تجویز کیا ACADAMY OF ISLAMIC RESEERCH & PUBLICATION۔ ابتدائی رقم میری اور مولانا کے ایک مخلص محمد تقی فاروقی جن کی حیثیت ریلوے کے ایک ملازم کی تھی۔ اور ایک بڑی رقم یعنی ایک ہزار حیدرآباد کے ایک تاجر ایچ ایم حسین نے بعد میں دی تھی جس کا مولانا بار بار ذکر کرتے تھے۔ پھر بعد میں بمبئی کے مخیر حضرات سے بار بار رقم حاصل ہوئی۔ محمد ہاشم، محمد توفیق، احمد غریب اور بعض دوسرے حضرات سے ندائے ملت کے لئے بھی بار بار رقم میں ہی بمبئی کے مخلصین سے لاتا رہا۔

مجلس تحقیقات رفتہ رفتہ ایک بڑا ادارہ بن چکا ہے۔ اس کی اپنی عمارت ہے مولانا کی اکثر کتابوں کے ترجمے غیر ملکی زبانوں میں ہو کر ان ملکوں میں شائع ہو رہے ہیں۔ غیر ممالک میں مولانا کے تعارف کا ذریعہ زیادہ تر ان کی کتابیں تھیں۔ علمی حلقوں اور نوجوانوں میں ان کا بڑا استقبال پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے۔

مولانا کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ حافظہ بیحد قوی تھا۔ تاریخ دعوت وعزیمت کی پہلی جلد زیر ترتیب تھی۔ اتفاق سے میرا اور مولانا محمد منظور نعمانی صاحب کا رائے بریلی سفر ہوا مولانا ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پر بغیر کسی کتاب کے حوالے کے لکھ رہے تھے۔ مولانا منظور نعمانی صاحب نے بڑی حیرت کا اظہار کیا اور کہا بھی مولانا آپ کیسے کتاب لکھتے ہیں مولانا کے ساتھ طویل رفاقت اور سفر وحضر میں کثرت سے ساتھ ہوا۔ اس لئے اپنی ریل بھی چلی جاتی ہے، حالانکہ کوشش یہی رہتی ہے کہ خود مولانا کی شخصیت ہی کا ذکر ہو کم سے کم وہ باتیں ریکارڈ میں آجائیں جو تاریخی بھی ہیں اور جن سے کوئی رہنمائی بھی ملتی ہے۔

مولانا، گاندھی اور پنڈت نہرو کے بعض شریفانہ کردار کے معترف تھے اور راجیو گاندھی نے شاہ بانو کیس میں مولانا کے موقف کی جس طرح تائید کی تھی اس کے لئے اپنی تقریروں میں اکثر اس کا تذکرہ کرتے تھے، علامہ اقبال اور مولانا محمد علی جوہر کے مسئلہ میں مولانا کا طرز عمل انتہائی والہانہ تھا، یوں تو علماء کے طبقہ میں ان کا تعلق بہت وسیع تھا۔ لیکن مولانا محمد الیاس صاحبؒ سے بیحد تعلق رکھتے تھے۔ لیکن بیعت کا خصوصی تعلق حضرت رائے پوری سے تھا۔ انتقال

سے چند روز پہلے میں نے سوال کیا کہ اس دور میں ان کے نزدیک سب سے زیادہ بالغ نظر عالم دین کون تھا۔ اس پر انھوں نے فرمایا حضرت رائے پوری کبھی کبھی فرمایا کرتے تھے کہ حضرت رائے پوری کی مثال گنا کیسی ہے جہاں منھ دگائیے میٹھا۔ مولانا کا معمول تھا کہ جب بھی سفر کرتے جانے سے پہلے اور آنے کے بعد ان کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتے، مشورہ بھی کرتے اور روئداد بھی سناتے۔

مولانا نے ایک مرتبہ لکھا کہ جب تک امریکا میں اسلامی انقلاب نہیں آئے گا خلیج اور سعودی عرب میں نہیں آئیگا اس لئے کہ یہ ملک ہر چیز وہیں سے اخذ کرتے ہیں۔ مولانا تمام زندگی بیچ دھارے میں رہے۔ مسائل سے براہ راست نمٹتے تھے لیکن خاموشی سے اور جو جس کام کا اہل ہوتا اس کو آگے بڑھاتے، خود نمائی سے احتیاط کرتے، شہرت سے اجتناب کرتے خود کریڈٹ لینے کی کوشش نہیں کرتے۔ اپنی شخصیت کا اخفا بہت تھا۔ کہیں سے کسی قسم کی بزرگی کا اظہار نہیں ہوتا۔ دوسروں کی حوصلہ افزائی کرتے، کسی نے معمولی سی بھی خدمت کر دی تو اسے ہمیشہ یاد رکھتے، کوئی چیز خود ان کے پاس ہوتی تو عنایت فرماتے۔ سفر میں شگفتگی رکھتے نماز اول وقت میں پڑھتے زیادہ تر تھرڈ کلاس میں سفر کرتے۔ معذوری زیادہ ہو جانے کے بعد فرسٹ کلاس یا ایئر کنڈیشن میں سفر کرنے لگے تھے، سفر ہو یا قیام تہجد میں اٹھنے کا معمول تھا عام طور پر ایک خاص کیفیت کے ساتھ یہ شعر پڑھتے ؎

ہزار بار بشویم دہن ز مشک و گلاب
ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی است

اکثر بہت گہری سانس لیتے اور کہتے خدایا عاقبت محمود کر دے، اکثر واقعات کی وجہ سے انسردگی طاری ہوتی تو فرماتے کوئی خوشخبری سناؤ جا ہے بعد میں تردید کر دینا۔

آخری دنوں میں اہل اغراض کی آمد کچھ زیادہ ہوگئی تھی۔ اپنے مختلف کاموں خاص طور پر خلیج کے اسفار یا مختلف قسم کی سفارشوں کے سلسلہ میں مولانا سے گذارش کرتے، مولانا کی افتاد طبع یہ تھی کہ شاید ہی کوئی مایوس جاتا کسی طرح اس کے کام کی ترتیب بن جاتی۔ اکثر یہ کام مولانا محمد رابع صاحب (ان کے بھانجے) کو کرنا پڑتا۔ جہاں تک میرے علم میں ہے اپنی کوئی جائیداد نہیں بنائی جو یافت ہوتی۔ دوسروں کی نذر کر دیتے آخر میں بھر بھر کر لوگوں کو دیتے رہے یہ سب کام پورے اخفا سے ہوتا۔

مولانا اپنے تمام کاموں میں دینی تعلیمی کونسل کے کام کو بڑی اہمیت دیتے۔ اس کی خاطر ہر جگہ سفر کیلئے تیار ہو جاتے۔ اس تعلق سے اپنے تمام مخصوص اصحاب کا بہت احترام بھی کرتے اور ان کو بیحد عزیز رکھتے۔

دنیائے اسلام میں اہل علم حضرات ہوں یا جو دین اسلام کی نصرت کرنے والے ہوں ان کی برابر فکر کرتے اور بہت تعلق کا اظہار کرتے۔

یہ تحریر مختصر ہوتے ہوئے بھی طویل ہوگئی لیکن ۵۳ رسال کی طویل مدت میں جن واقعات کا عینی شاہد رہا اس کو لکھنا اور دریا کو کوزہ میں بند کرنا آسان کام نہیں ہے امید ہے کہ دوسرے تذکرہ نگار اس کمی کو پورا کریں گے یا پھر کبھی موقع ہو تو واقعات کا تفصیل سے ذکر ہوگا جو بہت اہم ہیں۔ اور اس وقت لکھنے سے رہ گئے۔

بازیچۂ اطفال

"سب سے پہلے اللہ کے پیغمبروں نے دنیا کی یہ حقیقت منکشف کی کہ دنیا بچوں کا کھیل ہے جیسے ریت پر بیٹھے وہ گھر بناتے ہیں، محل بناتے ہیں گھروندے بناتے ہیں پھر اپنے ہاتھ سے توڑ دیتے ہیں پھر بناتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں اور پھر خود ہی توڑ دیتے ہیں، بازیچۂ اطفال ہے یہ دنیا ان کے عقلاء کے سامنے، عارفین کے سامنے اللہ نے یہ حقیقت منکشف کی، اگر آپ تاریخ پڑھیں تو آپ کو یہ سب کچھ نظر آجائے گا۔"

(دعوت فکر و عمل ص ۱۶۹)

(بقیہ) کہکشاں کی انجمن میں ......

یہ کامیابی حضرت مولانا کی اخلاص کی تقریر تھی اور تمام مسلمانوں کے جذبۂ عمل کا عکس جمیل۔ اس میں غیر ملکی شخصیتوں کے پہلو بہ پہلو ہندوستان کی قدیم علمی درسگاہوں اور عصری جامعات کے سربرآوردہ اساتذہ اور مختلف دینی جماعتوں اور مکاتب فکر کے نمائندے شریک تھے۔

اس اجتماع کے جتنے روشن پہلو تھے وہ حضرت مولانا نور اللہ مرقدہ کے اخلاص دعائے نیم شبی، آہ سحر گاہی کا نتیجہ اور اس صدق احساس اور غیرت صدیقی کا کرشمہ تھا جس میں سیاست نہیں شہامت اور اپنی ناموری نہیں بلکہ دین کی پاسداری مطلوب ہوتی ہے ؎

خودی سے سرد خود آگاہ کا جمال و جلال
کہ یہ کتاب ہے باقی تمام تفسیریں
حکیم میری نواؤں کا راز کیا جانے
ورائے عقل ہیں اہل جنوں کی تدبیریں

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی وفات پر

سیمنار، علمی مذاکرے، سمپوزیم، رسائل کے خصوصی نمبر

مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

● محمد شاہد ندوی بارہ بنکوی

کلکتہ و کابل میں بچھی ہے صفِ ماتم
اس غم میں سیہ پوش ہیں بغداد و سمرنا

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات جمعہ کے روز ۲۲ رمضان ۱۴۲۱ھ۔ اور عیسوی بیسویں صدی کے آخری دن ۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ء کو ہوئی۔ تقریباً دو لاکھ افراد نے سخت سردی اور کہر میں لمبی مسافتیں طے کر کے جنازے میں شرکت کی مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ، دبئی شارجہ۔ عمان کی مسجدوں میں تدفین سے پہلے ہی نماز جنازہ غائبانہ پڑھی گئی جس میں سرکاری طور پر خادم الحرمین الشریفین کے حکم سے حرمین شریفین میں شب قدر کو نماز جنازہ غائبانہ پڑھی گئی۔ رباط۔ الجزائر، موریتانیا۔ لیبیا، ۔ اور دنیا کے دوسرے کنارے پر سنگاپور، کوالالمپور (ملیشیا) تعمرح (ملیشیا) جاکرتا (انڈونیشیا) کے علاوہ آسٹریلیا کے متعدد مقامات پر جلسہ ہائے تعزیت منعقد ہوئے۔ ان کی فہرست تیار کرنا مشکل ہے۔ البتہ جو خاص اطلاعات اور اخبارات کے ذریعہ جن کا علم ہوا۔ ان کا ذکر ان سطور میں کیا جا رہا ہے۔

لکھنؤ میں ہونے والے اہم اجلاس

● ادارہ دار المبلغین لکھنؤ کے زیر اہتمام ۹ فروری ۲۰۰۰ء کو مولانا عبدالشکور ہال میں مولانا علی میاں کی یاد میں "پیغامِ رشد و ہدایت" کے عنوان سے ایک بڑا جلسہ ہوا۔ اس جلسہ میں مولانا عبداللہ عباس ندوی مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، مولانا عبدالعلیم فاروقی، ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی وغیرہ نے بڑے جذباتی انداز میں مولانا کی سیرت کے علمی، دعوتی اور اصلاحی پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالی، اور عرب و عجم کے حکمرانوں، سلاطین و امراء سے مولانا کے بے غرض زاہدانہ تعلقات کا تذکرہ کیا۔

● شہر لکھنؤ کی جانب سے انجمن محمدیہ ویلفیر سوسائٹی نظیر آباد لکھنؤ کے زیر اہتمام گنگا پرشاد میموریل ہال امین آباد میں ایک اہم یادگاری جلسہ مولانا کی یاد میں منعقد ہوا، جس میں مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی مولانا محمد زکریا ندوی اور ڈاکٹر کلب صادق وغیرہ نے حضرت مولانا کو ان کی ہمہ جہت اور عالمگیر شخصیت اور ان کے داعیانہ کردار کی روشنی میں خراج عقیدت پیش کیا۔

● مولانا علی میاں یادگاری کمیٹی کے زیر اہتمام قصبہ بجنور لکھنؤ میں مولانا کی یاد میں ایک جلسہ "امن و آشتی" کے عنوان سے مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی کی صدارت میں منعقد ہوا، جس میں گورنر اتر پردیش جناب سورج بھان نے کہا کہ مولانا علی میاں ایک نیک انسان اور سچے دیش بھگت تھے اس جلسہ میں ڈاکٹر کلب صادق۔ اور مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی نے مولانا کی امتیازی خصوصیات پر روشنی ڈالی۔

● حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی یاد اور ان کی تحریک "پیام انسانیت" کے سلسلے میں کرسچن کالج کے گراؤنڈ گولہ گنج لکھنؤ میں ایک عظیم الشان اجلاس ہوا۔ جس میں مختلف مکاتبِ فکر کے علماء و دانشوروں نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ مولانا علی میاں ندوی سے حقیقی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ ان کے پیام "پیام انسانیت" کو نہ صرف عام کیا جائے، بلکہ اسے عملی جامہ پہنایا جائے، اور ان کی زندگی کو نمونہ اور مشعلِ راہ بنایا جائے، اس جلسہ میں مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی، مولانا احمد میاں فرنگی محلی، مولانا سلمان حسینی ندوی، مولانا سجاد نعمانی، ڈاکٹر کلب صادق مولانا عبدالعلی فاروقی، مولانا جہانگیر عالم قاسمی شنکر اچاریہ سوامی نند وغیرہ نے شرکت کی،

● جمعیت شباب الاسلام کے زیر اہتمام جامعہ سید احمد شہید احمد آباد کٹولی لکھنؤ میں ۲۸، ۲۹، ۳۰ مارچ ۲۰۰۰ء کو "حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اپنی دعوت و فکر کے آئینہ میں" کے موضوع پر ایک سہ روزہ سیمنار منعقد ہوا۔ جس میں مسجد اقصیٰ کے امام شیخ محمد محمود الصیام نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی، اور حضرت مولاناؒ کی شخصیت پر ایک قصیدہ سنایا اور ان کی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی، سیمنار میں

مولانا عبداللہ عباس ندوی، مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، مولانا تقی الدین ندوی، مولانا محمد اجتباء ندوی مولانا سید نظام الدین (پٹنہ) مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی، مولانا شمس الحق ندوی، مولانا برہان الدین سنبھلی، مولانا محمد سالم قاسمی، مولانا محمد باقر حسین بستوی۔ مولانا عبدالکریم پاریکھ، جناب عشرت علی صدیقی مولانا سید سلمان الحسینی ندوی، مولانا ابوسحبان روح القدس ندوی، مولانا نذرالحفیظ ندوی، مولانا محمد خالد ندوی، ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی، مولانا نثار الہدیٰ قاسمی، قاری محمد قاسم (مدراس) ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی (علی گڑھ) شیخ محمد عبداللہ مولانا شمس تبریز خاں صاحب، ڈاکٹر طفیل احمد مدنی مولانا عبدالعلیم قاسمی بھٹکلی وغیرہ نے مولانا کی علمی و دینی اور ادبی خدمات پر تقریریں کیں، اور مقالات پڑھے، مقررین نے کہا کہ حضرت مولانا ایک بے لوث انسان تھے، ان کے اندر انسانیت کا درد تھا۔ وہ ملک وطن کے سلسلے میں بہت فکرمند رہتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ حضرت مولانا کے کام اور پیغام کو عام کیا جائے اور اپنے اندر جذبۂ عمل پیدا کیا جائے، یہی مولانا کا پیغام تھا، اور یہی ان سے سچی عقیدت و محبت کی نشانی ہے۔

● مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی یاد میں ہونے والے سیمناروں میں ایک سیمینار "مولانا علی میاں اور حب الوطنی" کے عنوان سے ۹ر اگست ۲۰۰۰ء کو مولانا محمد علی جوہر فاؤنڈیشن لکھنؤ کے زیر اہتمام گاندھی بھون میں مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کی صدارت میں ہوا جس کا افتتاح کرتے ہوئے مولانا عبداللہ عباس ندوی نے کہا کہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ایک پکے مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک سچے محب وطن بھی تھے، اور تحریک پیام انسانیت کے پلیٹ فارم سے انکی ملکی و قومی خدمات اسکی زندہ مثال ہیں" مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے اپنی صدارتی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ آزادی کے بعد پوری دنیا میں خصوصًا عالم اسلام میں ہندوستان کا تعارف ایک معتبر اور پروقار ملک کی حیثیت سے حضرت مولانا نے کرایا۔ انھوں نے کہا کہ مولانا جہاں چودہ سو سالہ تاریخ کے امین تھے وہیں جذبۂ حب الوطنی میں اپنی مثال آپ تھے۔ اس سیمنار سے مولانا عبدالکریم پاریکھ، مولانا سید سلمان حسینی ندوی، پروفیسر محمود الرحمٰن (سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) بی ایم گولا (علی گڑھ) عشرت علی صدیقی، چودھری شرف الدین داؤ جی گپتا، ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد، اور وصی احمد صدیقی وغیرہ نے بھی خطاب کیا۔

علی گڑھ کے اہم سیمنار

شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی جانب سے ۲۳ر ۲۴ر فروری ۲۰۰۲ء کو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی "ہندوستان میں علوم عربیہ و اسلامیہ کا ارتقاء" کے موضوع پر دو روزہ علمی مذاکرہ کا اہتمام کیا گیا جس میں ہندوستان کے اہم اداروں، جامعات اور مدارس کے معروف علماء و ادباء اور اساتذہ نے مولانا ندوی کی علمی و ادبی خدمات پر مقالے پیش کئے، اور بحث و مباحثہ میں حصہ لیا، اس ادبی و علمی مذاکرہ میں مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء، ڈاکٹر محمود الرحمٰن صاحب وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، پروفیسر کفیل احمد، ڈاکٹر محمد صلاح الدین عمری، پروفیسر محمد راشد ندوی اور پروفیسر محمد سالم قدوائی وغیرہ نے حضرت مولانا کی علمی و دینی خدمات پر اپنے تحقیقی مقالے پیش کئے۔

● ۵ر مارچ ۲۰۰۲ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایک دوسرا دو روزہ اہم سیمنار ناظم شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے زیر اہتمام حضرت مولانا کی شخصیت پر ہوا جس میں مولانا نظام الدین صاحب جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ، مولانا سعود عالم قاسمی ناظم شعبۂ دینیات اور مفتی ظفیر الدین صاحب دارالعلوم دیوبند، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی لکھنؤ، مولانا سید سلمان الحسینی ندوی مولانا عتیق احمد بستوی، مولانا ابوسحبان روح القدس ندوی ندوۃ العلماء لکھنؤ کے علاوہ ملک کے اہم علماء و دانشوروں نے شرکت کی اور مقالے پڑھے ناظم ندوۃ العلماء مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی خود تو شرکت نہ فرما سکے۔ البتہ ان کا مقالہ بعنوان "مولانا علی میاں اور ندوۃ العلماء" ان کے عزیز سید محمود حسنی ندوی نے اس سیمنار میں پیش کیا، وائس چانسلر ڈاکٹر محمود الرحمٰن صاحب نے خصوصی طور پر دلچسپی لی اور شرکت بھی کی، اور "باغ علی میاں" کے نام سے ایک چمن کا افتتاح امام مسجد اقصیٰ شیخ محمد محمود الصیام سے کرایا۔

دہلی

پیام انسانیت کے واسطے سے ایک سیمینار دہلی میں عزت مآب جناب کرشن کانت نائب صدر جمہوریہ ہند کی صدارت میں منعقد کیا گیا، جس میں محترم نائب صدر صاحب کے علاوہ سابق وزیر اعظم جناب وی پی سنگھ، جناب اٹل بہاری واجپئی وزیر اعظم ہند کے دہلی سے باہر ضروری سفر کی وجہ سے ان کی نمائندگی مرکزی وزیر جناب راج ناتھ سنگھ نے کی، ناظم ندوۃ العلماء مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، معتمد تعلیمات ندوۃ العلماء مولانا عبداللہ عباس ندوی، مولانا عبدالکریم پاریکھ صاحب وغیرہ نے تقریریں کیں، جلسہ میں دہلی کی سربرآوردہ شخصیتوں کے علاوہ دہلی یونیورسٹی، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی جامعہ ملیہ اسلامیہ اور جامعہ ہمدرد کے اساتذہ و طلباء اور عوام و خواص کا ایک بڑا مجمع شریک ہوا؛

● دہلی شاخ کے عالمی رابطہ ادب اسلامی نے

حضرت مولانا علی میاںؒ کی یاد میں جلسہ منعقد کیا اس میں صدر رابطہ شاخ دہلی پروفیسر محمد اجتباء ندوی نائب صدر پروفیسر سید ضیاء الحسن ندوی پروفیسر شفیق احمد خاں ندوی وغیرہ نے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو خراج عقیدت پیش کیا، پروفیسر شیث اسماعیل اور جناب وکیل احمد نے اپنی تعزیتی نظمیں پڑھیں۔

• ایک جلسہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے کانفرنس ہال میں ذاکر حسین اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ کی جانب سے منعقد کیا گیا جس میں پروفیسر اختر الواسع، خواجہ حسن ثانی نظامی پروفیسر نثار احمد فاروقی، پروفیسر ظفر احمد نظامی اور پروفیسر سید ضیاء الحسن ندوی نے مقالات پڑھے۔ اس سمینار کے اہم شرکاء میں پروفیسر شمیم احمد حنفی، پروفیسر علی نقی جعفری، پروفیسر محمد اجتباء ندوی، پروفیسر بدر الدین الحافظ اور پروفیسر شفیق احمد خاں وغیرہ تھے، جلسہ میں حضرت مولانا کیلئے دعائے مغفرت بھی کی گئی۔

ممبئی

انجمن اسلام ممبئی کے زیر اہتمام حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی حیات و خدمات پر ایک سمینار ۲۰؍ مارچ ۲۰۰۰ء کو صابو صدیق انجینرنگ کالج کے لطیفی ہال میں منعقد ہوا۔ اس سمینار میں مولانا محمد سالم قاسمی، مولانا ضیاء الدین اصلاحی مولانا تقی الدین ندوی مظاہری، ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا، مولانا ابو ظفر حسان ندوی، جناب شمیم طارق مولانا عبد الرزاق ندوی وغیرہ نے شرکت کی مقررین نے اپنی تقریروں اور مقالوں میں جذباتی انداز میں حضرت مولانا کو خراج عقیدت پیش کیا انھوں نے کہا کہ مولانا علی میاں ندوی ایک غیر متنازع شخصیت تھے جن کو ہر مذہب مسلک والے قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

اورنگ آباد

• جامعہ کاشف العلوم اورنگ آباد میں حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی حیات و خدمات پر ایک اہم سمینار ۲۹؍ اپریل ۲۰۰۰ء کو ہوا جس میں مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، مولانا واضح رشید ندوی، مولانا عبد الکریم پاریکھ، پروفیسر ضیاء الحسن ندوی، مولانا نذر الحفیظ ندوی، پروفیسر محمد اجتباء ندوی، مولانا محمد سالم قاسمی کے علاوہ دیگر علماء و ادباء نے حضرت مولاناؒ کی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی، اور مقالے پڑھے، مقالات کے عناوین اور شرکاء کے اعتبار سے یہ سمینار بڑا کامیاب رہا۔

رائے بریلی

• وصی نقوی نیشنل انٹر کالج رائے بریلی میں مولانا کی یاد میں ہونے والے "پیام انسانیت" کے جلسہ سے مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، مولانا عبد الکریم پاریکھ، مولانا کلب صادق، مولانا عبد اللہ مغیثی، مولانا محمد حمزہ حسنی ندوی، اور سابق وزیر اعظم وی. پی. سنگھ وغیرہ نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ مولانا علی میاں نے ہمیں پیام انسانیت کی جو راہ دکھائی ہے اس کو اختیار کر کے زندگی کا سفر طے کریں۔ مقررین نے کہا کہ مولانا نے اپنے کردار و عمل سے انسانیت کو زندہ کیا۔ اس لئے ہمیں بھی صالح پاکیزہ اور سچا انسان بننا چاہیئے۔

کلکتہ

• مدرسہ باب العلوم کلکتہ کی جانب سے حضرت مولانا علی میاں ندوی کے نام سے ایک خصوصی سمپوزیم کلکتہ مسلم انسٹی ٹیوٹ ہال میں منعقد ہوا جس میں مولانا سعید الرحمن اعظمی ندوی اور مولانا ابو محفوظ الکریم معصومی نے کہا کہ مولانا کی ہمہ جہت شخصیت اپنے اندر ایک دعوت اور ایک پیغام رکھتی ہے، آج اس تاریک دور میں مولانا کی تعلیمات کو عام کرنے کی سخت ضرورت ہے، سمپوزیم سے دوسرے اہم علماء و دانشوروں نے بھی خطاب کیا۔

سری نگر کشمیر

• انجمن نصرۃ الاسلام سرینگر کشمیر کے زیر اہتمام میر واعظ مولوی محمد عمر فاروق کی سربراہی میں مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی حیات و خدمات کے موضوع پر ایک اہم سمینار ہوا جس میں مولانا محمد خالد ندوی غازیپوری، مولانا انظر شاہ کشمیری اور مولوی محمد عمر فاروق نے حضرت مولانا کی علمی، عملی، فکری، روحانی اور دعوتی زندگی پر بھرپور روشنی ڈالی۔

نیپال

• جامعہ نور الاسلام جلپا پور نیپال کے زیر اہتمام ایک جلسہ ہوا جس میں حضرت مولاناؒ کو جذباتی انداز میں یاد کیا گیا۔ اسی طرح مدرسہ نور العلوم نول پراسی میں بھی ایک بڑا جلسہ ہوا۔

دہرہ دون

• شہر دہرہ دون میں انجمن شباب الاسلامی کے زیر اہتمام ایک اہم جلسہ ہوا جس میں مقررین نے کہا کہ حضرت مولانا علیہ الرحمہ کی ذات والاصفات ایک "شجرۂ طیبہ" تھی، جس کی جڑیں ہندوستان میں اور شاخیں سارے جہان میں پھیلی ہوئی ہیں، اس کے ثمرات انشاء اللہ رہتی دنیا تک سرسبز و شاداب، زندہ اور زندگی بخش رہیں گے، مقررین نے کہا کہ حضرت مولانا نے اپنے افکار و خیالات، داعیانہ کردار، حکمت و بصیرت اور مومنانہ فراست کے جو گرانقدر نقوش چھوڑے ہیں وہ عوام و خواص سب کے لئے مفید ہیں اس لئے لوگوں کو ان سے فائدہ اٹھانا چاہیئے

جلسہ سے انجمن کے سکریٹری جناب سال الدین ندوی حقانی اور جناب عبد الصمد قاسمی نے بھی خطاب کیا۔

دبئی

● ابنائے ندوہ امارات کے زیر اہتمام دبئی میں حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ کی حیات وخدمات کے موضوع پر جناب سید خلیل الرحمٰن کی صدارت میں ۸ رجون ۲۰۰۰ء کو ایک سیمنار ہوا جس میں دبئی وشارقہ میں مقیم ابنائے ندوہ کے علاوہ شہر دبئی کے چیدہ چیدہ علماء، تجار، دانشور اور علم دین سے شغف وتعلق رکھنے والے لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی، اس سیمنار میں جن ندوی فضلاء نے حضرت مولانا کی حیات وخدمات کے مختلف گوشوں پر مشتمل مقالے پڑھے وہ یہ ہیں: جناب فخر علی ندوی، جناب سید محمد ظفر ندوی، جناب نعمت اللہ ندوی، جناب عبید اللہ صدیقی ندوی، حبیب اللہ ندوی، جناب عبد المتین منیری بھٹکلی اور محمد نعمان ندوی بھٹکلی،

جلسہ کی صدارت مولانا احمد سعید ندوی بھوپالی نے کی۔ اور مولانا محمد خالد ندوی کانپوری نے تلاوت کلام پاک ربانی سے جلسہ کا افتتاح کیا پھر جمعیت ابناء ندوہ کے سکریٹری جناب نظام الدین صاحب ندوی نے حاضرین کا استقبال کرتے ہوئے سیمنار کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی اور کہا کہ اس سیمنار سے ہمارا مقصد محض شخصیت پرستی یا ایک رسم کی ادائیگی نہیں ہے بلکہ مادر علمی ندوۃ العلماء کی فکر اور حضرت مولانا کی تعلیمات وارشادات کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہونچانا ہے۔

● دبئی ہی میں حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ کی یاد میں "انڈین اصلاحی سینٹر" اور "مرکز اہلسنۃ والجماعۃ" کی جانب سے اہم جلسے ہوئے جن میں وہاں کے اہم علماء، ادباء اور دانشوروں نے شرکت کی، اور مقررین نے حضرت مولانا کی عالمی پیمانہ علمی، دینی اور دعوتی خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالی، اس کے علاوہ دبئی کی مختلف اسلامی انجمنوں، تنظیموں اور اداروں کی طرف درجنوں جلسے ہوئے اور ان میں مولانا کے اوصاف وکمالات بیان کئے گئے۔

ملیشیا

● ملیشیا میں حضرت مولانا کی وفات کی اطلاع ملتے ہی کوالالمپور، ترنگانو، قدح، کلنتن، جزیرۂ ملکاکس میں تعزیتی جلسے اور غائبانہ نماز جنازہ کا اہتمام کیا گیا۔ سب سے بڑا تعزیتی جلسہ ۲ر رمضان المبارک ۱۴۲۱ھ کو معہد التربیۃ الاسلامیہ قدح میں ہوا جہاں پورے ملیشیا سے ندوی فضلاء شریک ہوئے ان کے علاوہ ملیشیا کے ممتاز علماء اور داعیوں نے اس جلسہ میں حضرت مولانا کی وفات پر اپنے رنج و غم کا اظہار کیا۔

رمضان المبارک کے بعد کوالالمپور میں دو بڑے سیمنار منعقد ہوئے جن میں حضرت مولانا کی زندگی اور علمی ودعوتی کارناموں پر مقالات پیش کئے گئے۔

پہلا سیمنار کوالالمپور میں انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی کے زیر اہتمام ہائر اسٹڈی کے اساتذہ اور طلبہ کی طرف سے منعقد کیا گیا جلسہ کی صدارت وائس چانسلر ڈاکٹر محمد کمال حسن نے کی، انھوں نے مولانا کی شخصیت اور ان کی جامعیت اور ان کے علمی ودعوتی کارناموں کا جائزہ لیا، اور اس طرح کے علمی سیمنار کے انعقاد کو وقت کی ضرورت قرار دیا۔ وائس چانسلر کے علاوہ شعبۂ تاریخ کے صدر ڈاکٹر ارشاد السلام نے مولانا کی زندگی اور علمی وتربیتی کارناموں پر مقالہ پیش کیا۔ دوسرا مقالہ ڈاکٹر منجد بہجت پروفیسر شعبۂ عربی ادب نے مولانا کے تنقیدی اصول ومعیار کے عنوان سے پیش کیا۔ ڈاکٹر منجد نے چند ماہ قبل ایم اے کے ایک مقالہ کی نگرانی بھی کی تھی۔ جو مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی عربی زبان وادب کی خدمات سے متعلق تھا۔ تیسرا مقالہ کلیۃ اصول الدین کے پروفیسر ڈاکٹر محمد بن نصر نے پیش کیا جس کا موضوع تھا "معاشرہ کی اصلاح کے بارے میں مولانا ندویؒ کا طریقۂ کار" ڈاکٹر محمد بن نصر یونیورسٹی سے نکلنے والے رسالہ کے چیف ایڈیٹر بھی ہیں۔ انھوں نے مولانا کے تعلیمی اور تربیتی ادارہ اور مجددین و مصلحین کی اصلاحی جد وجہد کے بارے میں مولانا کے اصول اور طریقۂ کار کا جائزہ ان کی تحریروں کی روشنی میں لیا۔ اور بتایا کہ شیخ ندوی کانے موجودہ دور کے نوجوانوں کی ذہن سازی کا جو طریقہ اختیار کیا وہ نبوی اسلوب سے ہم آہنگ ہے، چوتھا مقالہ شعبۂ قرآن وسنّت کے استاذ لیث سعود قیبسی نے پیش کیا جس کا عنوان تھا شیخ ندوی اور ان کی کتاب "السیرۃ النبویۃ" صاحب مقالہ نے تفصیل کے ساتھ اپنے مقالہ میں بتایا کہ مولانا ندوی نے سیرت کے موضوع پر جو کتاب لکھی ہے وہ وہ اپنے منہج اور اسلوب کے اعتبار سے اچھوتی اور البیلی کتاب ہے یہ صرف آنحضرت کی سیرت ہی نہیں بلکہ اسلام کی جامع اور زندہ تصویر ہے۔ اس میں مغرب کے فسوں آفریں تہذیب سے متأثر نئے طبقہ کی تسکین کا پورا سامان موجود ہے۔ یہ کتاب غیر مسلموں کو بلا تحفظ کے دی جاسکتی ہے۔

سیمنار کا آخری مقالہ شعبۂ تاریخ و اسلامی تہذیب کے پروفیسر ڈاکٹر محسن محمد صالح کا تھا۔ جنھوں نے "رویۃ الندوی للتاریخ الاسلامی" کے عنوان سے محاضرہ پیش کیا۔ اس مقالہ میں مولانا کی "متنوع ثقافت" چار زبانوں پر قدرت

اوران کے علمی وتاریخی ذخیروں تک رسائی کا تذکرہ کرکے یہ بتایا کہ مولانا نے روایتی تاریخی کتابوں پہ بھروسہ نہ کرکے نئے سرچشمے تک رسائی حاصل کی۔ انھوں نے تاریخ نویسی کے نگے بندھے طریقہ پر تنقید کی اور نئے انداز سے تاریخ نویسی کا بلند معیار پیش کیا۔ اس میں جامعیت اور توازن ہے

• دوسرا سیمینار ملیشیا کے نوجوانوں کی مشہور تنظیم حرکۃ الشباب الاسلامی (ABIM) کے زیراہتمام انٹرنیشنل یونیورسٹی کے کیمپس میں ملک فیصل ہال میں منعقد کیا گیا۔ اس میں شرکت کیلئے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے استاذ مولانا نذرالحفیظ ندوی کو دعوت دی گئی تھی۔ مولانا نے اپنی تقریر میں حضرت مولانا کی حیات و خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ اس سیمنار میں احمد فہمی زمزم ندوی اور بدرالدین ندوی نے مولانا کے حیات و خدمات اور تصنیفی خصوصیات پر مقالے پیش کئے۔ ان کے علاوہ ملیشیا کے ممتاز عالم و محقق ڈاکٹر عثمان محمدی نے مولانا کے تربیتی افکار و نظریات پر مقالہ پیش کیا۔

چوتھا مقالہ انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی کے پروفیسر و پرنسپل کلیۂ اصول الدین ڈاکٹر عبدالمجید نے پیش کیا۔ جس کا عنوان تھا "مغربی افکار پر مولانا ندوی کی تنقید"۔ پانچواں مقالہ ابیم کے سابق صدر پروفیسر صدیق فاضل نے پیش کیا مقالہ کا موضوع تھا "فکر دین کی تجدید میں مولانا ندوی کا حصہ"۔

مقالات کے علاوہ عربی اور ملیشین زبانوں میں حضرت مولانا کی تصنیفات کی نمائش بھی لگی تھی جو دلچسپی سے اور شوق سے لوگوں نے دیکھی۔ اس موقع پر ندوی فاضل احمد فہمی زمزم کی ترتیب دی ہوئی کتاب کا رسم اجراء بھی ہوا۔ یہ کتاب ملیشین نوجوانوں کی تنظیم (ABIM) کی فرمائش پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور ان کی حیات و خدمات اور علمی کارنامے کے عنوان سے ملیشین زبانوں میں تیار کی گئی تھی۔ چند گھنٹوں کے اندر اس کتاب کے پانچ ہزار نسخے ...... شائقین نے خرید لئے۔

سائنس یونیورسٹی پینانگ کے منتخب اساتذہ اور رابطہ ادب اسلامی کے ارکان کی ایک نشست شعبۂ ادب کے دفتر میں منعقد ہوئی۔ مولانا نذرالحفیظ ندوی نے اس موقع پر حاضرین کی طلب و خواہش پر مولانا کے انتقال کے واقعہ کی تفصیلات بتائیں

انڈونیشیا

• انڈونیشیا کے شہر ہوان اور جاکرتا سے جو اطلاعات ملی ہیں ان سے معلوم ہوا کہ بڑی مسجدوں میں غائبانہ نماز جنازہ کا اہتمام کیا گیا۔ اور تعزیتی جلسے بکثرت منعقد کئے گئے۔

بنگلہ دیش

• بنگلہ دیش اور تھائی لینڈ سے ندوی فضلاء نے غائبانہ نماز جنازہ اور تعزیتی جلسوں اور سیمنار کی تفصیلی خبریں ارسال کی ہیں اس کے علاوہ اردن کی راجدھانی عمان، دمشق، استنبول تونیہ، انقرہ۔ ریاض، دمام۔ الخبر۔ جدہ، حرمین شریفین رباط کاسا بلانکا، الجزائر، بیروت، دبی، شارجہ ابوظبی میں تعزیتی جلسے منعقد کئے گئے۔ جن میں چند کی خبریں دی جارہی ہیں۔ جنوبی افریقہ اور مشرقی افریقہ کے شہروں اور مقامات پر بھی جلسے ہوئے۔

پاکستان

• پاکستان میں کراچی، لاہور، فیصل آباد، گجرانوالہ، اسلام آباد، اکوڑہ خٹک، کوئٹہ، پشاور، حیدرآباد، سندھ سے تعزیتی جلسوں اور سیمناروں کی تفصیلی رپورٹیں موصول ہوئی ہیں۔

رابطۂ ادب اسلامی کے زیر اہتمام لاہور اور اسلام آباد میں سیمنار ہوا۔

• اسلام آباد میں حضرت مولاناؒ پر ایک سیمنار کا انعقاد انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی کے زیراہتمام ہوا، جس میں صدر پاکستان جناب رفیق تارڑ نے خصوصی دلچسپی لی اور شرکت فرمائی عرب ممالک کے اہم مفکرین، ادباء خصوصاً مصر کے فضلاء نے شرکت کی اور اپنے تاثرات پیش کئے اور مقالات پڑھے۔

مصر

• مصر میں رابطۂ ادب اسلامی کے زیراہتمام حضرت مولانا کی یاد میں ایک اہم جلسہ کا انعقاد کیا گیا۔ جس میں رئیس جامعۃ الازھر ڈاکٹر عبدالحلیم عویس نے بھی شرکت کی۔ اس جلسہ میں مصر کے نامور علماء وفضلاء شریک ہوئے اور حضرت مولانا کی علمی، دینی، دعوتی اور اصلاحی خدمات پر تقریریں کیں۔ ڈاکٹر عبدالحلیم عویس نے کہا کہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ ایک بابصیرت، عالم دین بلند پایۂ مفکر اور ممتاز صاحب قلم شخصیت کے حامل تھے۔ اس کے علاوہ مصر میں مقیم ندوی فضلاء کی جانب سے دو جلسے منعقد ہوئے، جن میں ندوی فضلاء نے اپنے محسن و مربی حضرت مولانا علی میاں کے عظیم کارناموں پر روشنی ڈالی اور اپنے جذبات و احساسات کا اظہار بڑے مؤثر اور دل گیر انداز میں کیا۔ اسی طرح مصر کے دیگر شہروں میں حضرت مولانا کی یاد میں متعدد جلسوں اور سیمناروں کا اہتمام کیا گیا۔

جنوبی افریقہ

● جنوبی افریقہ میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے موسوم دارالعلوم زکریا میں حضرت مولانا علی میاں ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی یاد میں ایک عمومی جلسہ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کی صدارت میں ہوا۔ جس میں حضرت مولانا کے بارے میں دارالعلوم کے مفتی رضاء الحق صاحب کا عربی میں منظوم نذرانۂ عقیدت دارالعلوم کے ایک طالب علم نے پیش کیا جس کے ہر شعر سے عقیدت و محبت کے جذبات کا اظہار ہوتا تھا۔ اس کے بعد مفتی رضاء الحق صاحب نے نثر میں بھی حضرت مولانا سے اپنے والہانہ تعلق و جذبات کا اظہار ایک مقالہ میں کیا خصوصاً حضرت سید احمد شہیدؒ کے احسانات اور ان کے دینی و دعوتی کارناموں اور سرفروشانہ کوششوں کا تذکرہ نہایت والہانہ انداز سے کیا۔ جس کا ایک سبب خود مفتی صاحب کا علاقہ پنج تار سے وطنی تعلق بھی ہے جو حضرت سید صاحب کی سرفروشانہ کوششوں کا ایک مرکز رہا ہے۔

جلسہ کے آخر میں صدارتی تقریر فرماتے ہوئے مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے حضرت مولانا کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی طرف روشنی ڈالتے ہوئے بعض اہم واقعات کی طرف اشارہ کیا کہ حضرت مولانا نے کیسے کیسے اہم اور نازک موقع پر بات کی اور اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت ایسی کھل کر سامنے آئی کہ تمام سننے والے اور حاضرین مجلس حیرت میں رہ گئے۔

اس جلسہ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مؤقر استاد مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی اور مولانا عبدالعزیز بھٹکلی ندوی نے بھی شرکت کی۔

برطانیہ

● برطانیہ کے مسلم کمیونٹی فورم کی جانب سے ڈیوس میری اسپورٹس سنٹر واقع ویسٹ پارک لندن میں ۳۰ رجولائی ۲۰۰۰ء کو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی شخصیت پر ایک عالمی سیمینار ہوا۔

لندن کے اس سیمینار میں امریکہ، یورپ افریقہ، ہندوستان، پاکستان، دبئی، لندن کویت انگلینڈ اور عرب ممالک کے جید علماء و فضلاء، ادباء اور دانشوروں نے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ پر مختلف عنوانات کے تحت مقالے پیش کئے۔ اور ان کی زندگی کے مختلف گوشوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔

اس سیمینار میں شریک ہونے والوں میں مولانا محمد تقی عثمانی (پاکستان) مولانا مجاہد الاسلام قاسمی، مولانا سید سلمان الحسینی ندوی، مولانا مفتی احمد خان پوری، مولانا عبداللہ کپودراوی (ہندوستان) مولانا تقی الدین ندوی مظاہری (دبئی) مولانا عتیق الرحمن سنبھلی (لندن) ڈاکٹر مزمل حسین، مولانا محمد یعقوب قاسمی (امریکہ) مولانا محمد عیسیٰ منصوری (لندن) مفتی زبیر بیات (افریقہ) ڈاکٹر مناظر احسن، ڈاکٹر ڈیوڈ براڈننگ (انگلینڈ) کے نام قابل ذکر ہیں۔

انگلینڈ

● شمالی انگلینڈ کے شہر باٹلے (BATLEY) میں حضرتؒ کی یاد میں ۲۴ رجنوری ۲۰۰۰ء کو ایک اہم جلسہ ہوا، جس میں مولانا محمد یعقوب قاسمی (ڈیوز بری) نے حضرت مولانا کے مناقب اور اوصاف پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ حضرت مولانا کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ دین کا درد اخلاص نیت اور دین کی خاطر سب کچھ کر گزرنے کا جذبہ ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ جلسہ سے مولانا عتیق الرحمن سنبھلی نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ مولانا مرحوم ان شخصیتوں میں تھے کہ ان کی صحبت اور عقیدت سے جس نے فیض پایا اس نے بڑی چیز پائی۔

اسی طرح ملک و بیرون ملک میں سیکڑوں علمی، دینی اور ادبی اداروں، تنظیموں، انجمنوں کے زیر اہتمام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی ہشت پہلو، عالمگیر و ہمہ گیر شخصیت پر علمی بلکہ سیمینار، کانفرنس، سمپوزیم اور اجلاس منعقد ہوئے، جن میں حضرت مولانا کے اوصاف و کمالات، افکار و تصورات اسلوب دعوت، مختلف تحریکات، دینی و علمی اداروں سے ان کا قائدانہ تعلق، عرب و عجم پر ان کے فکر کے اثرات اور دیگر بہت سی خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اخبارات و رسائل اور خصوصی و یادگاری نمبر

● حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی دینی علمی، دعوتی اصلاحی، ادبی خدمات اور ان کے کارناموں کو اجاگر کرنے اور ان کے دعوتی پیغام کو عام کرنے اور ان کی تحریک پیام انسانیت کو مزید تقویت پہنچانے کے لئے ملک کے اندر اہم دینی اداروں اور ان کے اصلاحی رسالوں کے ذمہ داروں نے حضرت مولاناؒ کی شخصیت پر عربی اور اردو میں درجنوں خصوصی اور یادگاری نمبر نکالے جن میں حضرت مولاناؒ کی ہمہ جہت اور ہمہ گیر بلکہ

عالمگیر شخصیت کو ان کے شایان شان خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ کتابیں تصنیف کی گئیں اور رسالوں میں کثرت سے مضامین شائع کئے گئے۔

البعث الاسلامی

● "البعث الاسلامی" جو دار العلوم ندوۃ العلماء کا اہم دینی اصلاحی اور ادبی رسالہ ہے اس نے ۲۹۰ صفحات پر مشتمل خصوصی نمبر "عدد ممتاز عن فقید الأمۃ الإسلامیۃ سماحۃ العلامۃ الشیخ ابی الحسن علی الحسنی الندوی" کے نام سے نکالا، جس میں ہندوستان اور عرب ملکوں کے علما، ادباء اور دانشوروں کے اہم مضامین خطوط، پیغامات شائع ہوئے۔ یہ خصوصی نمبر مجلس صحافت و نشریات ندوۃ العلماء کے زیر اہتمام مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء کی ادارت میں منصۂ شہود پر آگیا ہے۔

الرائد

● "الرائد" بھی ندوۃ العلماء کا ایک مؤقر عربی رسالہ ہے جسے عرب دنیا میں بڑی مقبولیت حاصل ہے اور عرب علماء و ادباء بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اس نے بھی حضرت مولانا پر اپنا خصوصی شمارہ۔ "عدد ممتاز عن سماحۃ الشیخ الندوی" کے نام سے شائع کیا۔ یہ شمارہ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کی سرپرستی اور مولانا سید واضح رشید ندوی اور مولانا سید عبد اللہ حسنی ندوی کی سربراہی میں منظر عام پر آگیا ہے۔ یہ دونوں رسالے عربی جاننے والوں کے لئے بیش قیمت تحفہ ہیں۔

تعمیر حیات

● حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات حسرت آیات کے فوراً بعد "تعمیر حیات" نے اپنا خصوصی ضمیمہ عام شمارہ کے ساتھ نکال دیا تھا جس میں حضرت مولانا کی عظیم المرتبت شخصیت اور ان کے اوصاف و کمالات کا تذکرہ چند مضامین کے ساتھ اجمالاً آگیا تھا۔ اب ماشاء اللہ حضرت کی سیرت و سوانح پر عرب و عجم کے نامور، مشہور و معروف علماء، ادباء اور دانشوروں کے اہم مضامین مولانا کی علمی و دینی خدمات، افکار و خیالات، اسلوب دعوت طریقۂ کار مختلف تحریکوں، اداروں، انجمنوں سے ان کا قائدانہ تعلق اور عرب و عجم پر ان کی فکر کے اثرات اور ان کے امتیازی اوصاف و کمالات، منتخب شعراء کے کلام و دیگر بہت سی خصوصیات پر مشتمل خصوصی و یادگاری مجلہ "مفکر اسلام نمبر" منصۂ شہود پر آگیا ہے اور آپ کے ہاتھوں میں ہے جس میں حضرت کی ہمہ گیر، عالمگیر شخصیت اور پاکیزہ زندگی کا مکمل احاطہ کیا گیا ہے، تعمیر حیات کا یہ خصوصی اور یادگاری نمبر مولانا عبد اللہ عباس ندوی معتمد تعلیمات دار العلوم ندوۃ العلماء مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی ناظم ندوۃ العلماء کی سرپرستی میں مولانا سید محمد واضح رشید ندوی، پروفیسر وصی احمد صدیقی، پروفیسر سید محمد اجتباء ندوی، پروفیسر ضیاء الحسن ندوی مولانا نذر الحفیظ ندوی، مولانا محمد حمزہ حسنی ندوی (ناظر عام ندوۃ العلماء) کی نگرانی اور مولانا شمس الحق ندوی کی ادارت میں شائع ہو کر منظر عام پر آگیا ہے۔ یہ نمبر خوبصورت ٹائیٹل دیدہ زیب کتابت عمدہ طباعت، بہترین کاغذ اور دیگر بہت سے محاسن و خوبیوں پر مشتمل ہے اور ظاہری و معنوی اعتبار سے قابل تعریف اور ایک تاریخی دستاویز ہے۔

فریگرینس آف ایسٹ

● دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے نکلنے والے انگریزی سہ ماہی "فریگرینس آف ایسٹ" نے بھی اپنا خصوصی شمارہ علی میاں نمبر (SPECIAL ISSUE ON ALI MIYAN) انگریزی میں نکالا ہے جس میں حضرت مولانا علی میاں ندوی کی حیات و خدمات اور دعوت و تعلیمات پر انگریزی میں اہم مضامین شامل کئے گئے ہیں یہ میگزین مولانا سید واضح رشید ندوی اور جناب شارق علوی کی سربراہی میں ماشاء اللہ منظر عام پر آگیا ہے۔

بانگِ درا لکھنؤ

● انجمن شباب الاسلام لکھنؤ کی جانب سے مولانا سید سلمان الحسینی الندوی کی سربراہی میں بانگ درا کا خصوصی نمبر نکلا جو مضامین کے لحاظ سے قابلِ تحسین اور قابل مطالعہ ہے۔ اس رسالہ کے "مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں نمبر" میں ملک و بیرون ملک کے نامور اہل علم علماء اور دانشوروں کے اہم مضامین شامل ہیں جو قارئین کو دعوتِ مطالعہ دیتے ہیں۔

الفرقان لکھنؤ

● الفرقان لکھنؤ کا بھی خصوصی شمارہ شائع ہوا۔ جس میں حضرت مولانا کی دینی و علمی خدمات پر کس قدر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

لاریب کلکتہ

● مدرسہ باب العلوم کلکتہ کے رسالہ لاریب نے

ایک خصوصی اور یادگاری مجلہ" مولانا علی میاں نمبر" شائع کیا۔ یہ مجلہ اپنے منتخب مضامین اور حضرت مولانا کی شخصیت اور ان کے اقوال و احوال کے لحاظ سے قابلِ قدر اور داد و تحسین کے لائق ہے

رضوان لکھنؤ

● ماہنامہ "رضوان" لکھنؤ کی طرف سے بھی حضرت مولانا کی شخصیت پر خصوصی شمارہ نکالا گیا یہ شمارہ مولانا محمد حمزہ حسنی ندوی کی ادارت میں منظرِ عام پر آگیا ہے، اور اہلِ علم صاحبانِ قلم، عوام و خواص خصوصاً خواتین کے لئے حضرت کا ایک تحفہ ہے جسے حاصل کر کے ضرور مطالعہ کیجئے۔

الصحوۃ الاسلامیۃ حیدرآباد

● جامعہ اسلامیہ دارالعلوم حیدرآباد سے عربی میں نکلنے والے رسالہ "الصحوۃ الاسلامیۃ" کا مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں نمبر نکلا! اس میں عرب و عجم کے علماء و دانشوروں کے منتخب مضامین شائع ہوئے ہیں

الداعی دارالعلوم دیوبند

● الداعی جو دارالعلوم دیوبند کا عربی ترجمان ہے۔ اس کے فاضل ایڈیٹر نور عالم خلیل امینی نے بڑی نفاست اور ذوق سے اعلیٰ ترین پیمانہ پر حضرت مولانا کی شخصیت پر خاص نمبر عربی میں شائع کیا ہے جو ایک دستاویزی حیثیت رکھتا ہے اور خود رئیس التحریر کی تحریر اخلاص و صداقت کا نمونہ ہے۔

الشارق اعظم گڈھ

● جامعہ اسلامیہ مظفر پور قلندر پور اعظم گڈھ کا ترجمان رسالہ "الشارق" کا خصوصی نمبر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی یاد میں مولانا تقی الدین ندوی مظاہری کی سرپرستی میں شائع ہوا، جس میں حضرت مولانا کی عظمت و رفعت اور ان کے اوصاف و کمالات کا تذکرہ ملک بیرون کے اہلِ علم و قلم نے اپنے مضامین میں بڑے محبت آمیز انداز میں کیا ہے۔

نوائے ادب ممبئی

● انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ممبئی سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا قریبی تعلق تھا۔ اور وہ انجمن کے معاملات میں دلچسپی بھی لیا کرتے تھے اس انجمن کے زیر اہتمام "سہ ماہی نوائے ادب" کا "مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نمبر" شائع ہوا ہے جس میں حضرت مولانا کی حیات و خدمات کے بارے میں فکر انگیز اور معلومات افزا مضامین شامل کئے گئے ہیں۔ انجمن اسلام نے اپنے محسن کو اس خصوصی نمبر کے ذریعہ خراج عقیدت پیش کر کے انکے کارناموں کی یاد تازہ کر دی ہے۔

نصرۃ الاسلام کشمیر

● ماہنامہ "نصرۃ الاسلام" جو خطۂ کشمیر کا ایک دینی تعلیمی، اخلاقی، اصلاحی اور ادبی رسالہ ہے۔ جس نے حضرت مولانا کی شخصیت پر اپنا ایک خصوصی شمارہ "مفکر اسلام نمبر" نکالا ہے، یہ نمبر انجمن نصرۃ الاسلام کے سرپرست میر واعظ مولوی محمد عمر فاروق کی سرپرستی اور محمد سعید الرحمٰن شمس کی ادارت میں شائع ہوا ہے جس میں متعدد اہل قلم کے مضامین شائع کئے گئے ہیں۔

ارمغان شاہ ولی اللہ پھلت

● ماہنامہ "ارمغان شاہ ولی اللہ" پھلت نے اپنا خصوصی شمارہ "گوشۂ مفکر اسلام" کے نام سے نکالا جس میں حضرت مولانا کی شخصیت، حیات اور امتیازی کمالات اور ان کی تعلیمات پر مشتمل مضامین شائع کئے گئے ہیں۔

نئی دنیا دھلی

● ہفت روزہ "نئی دنیا" دہلی نے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی پر اپنا خصوصی شمارہ "مفکر اسلام نمبر" بڑی آن بان اور بڑے آب و تاب کے ساتھ باتصویر شائع کیا۔ یہ شمارہ اپنے مضامین، انتخاب، تصاویر اور ترتیب و تزئین کے لحاظ سے قابل قدر اور قابل تحسین ہے۔ اس میں مولانا کی خدمات اور عالمی پیمانہ پر ان کی مقبولیت اور ان کی خصوصیات و امتیازات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے یہ رسالہ تصاویر کی وجہ سے بڑا پُرکشش تھا اور بروقت بھی نکلا تھا۔ اسی لئے اس کی اشاعت ایک لاکھ کے قریب ہوئی اور کئی ایڈیشن بھی نکلے۔

الجمعیۃ دہلی

● ہفت روزہ "الجمعیۃ" نئی دہلی نے اپنا خصوصی شمارہ "مفکر اسلام مولانا علی میاں ندوی نمبر" کے نام سے شائع کیا، جس میں حضرت مولانا کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے، ان کی دینی خدمات کا اعتراف بھی کیا گیا ہے اور ان کی تعلیمات کو مشعلِ راہ بنانے کی ترغیب بھی دی گئی ہے۔

افکار ملی دہلی

• "افکار ملی" دہلی نے بھی اپنا ایک خاص شمارہ حضرت مولانا کی یاد میں نکالا۔ اس میں اہل قلم اور صاحبان علم و دانش نے حضرت مولانا کی خدمات اور ان کی امتیازی خصوصیات کا بڑے دلنشیں انداز میں تذکرہ کیا۔

ملی اتحاد دہلی

• "ملی اتحاد" دہلی نے بھی اپنی ایک اشاعت میں حضرت مولانا پر ایک خصوصی ضمیمہ شائع کیا، جس میں مولانا کی پہلو دار شخصیت پر روشنی ڈالی گئی؛

ہدایت جے پور

• ماہنامہ "ہدایت" جے پور نے بھی ایک خصوصی نمبر حضرت مولانا علی میاں کی نسبت سے نکالا، جس میں حضرت مولانا کی عالمی پیمانہ پر مقبولیت اور ان کی دینی و دعوتی خدمات کا تذکرہ اہل علم و قلم نے تفصیل سے کیا۔

تذکیر غازی پور

• مجلّہ "تذکیر" غازی پور نے بھی اپنی خصوصی اشاعت "بیادگار مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں ندویؒ" میں کئی اہم مضامین اور حضرت مولانا کی اہم تحریریں شائع کرکے حضرت مولانا کو خراج عقیدت پیش کیا ہے،

نقش نوائط بھٹکل

• بھٹکل سے حضرت مولانا علی میاں صاحب ندوی کو بڑا لگاؤ تھا۔ اور اہل بھٹکل بھی حضرت مولانا سے عقیدتمندانہ بلکہ نیازمندانہ تعلق رکھتے تھے وہاں سے نکلنے والے رسالہ "نقش نوائط" نے اپنا خصوصی شمارہ "مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں نمبر" کنڑ زبان میں شائع کرکے اپنی محبت و عقیدت کا اظہار کیا ہے،

ارمغان جامعہ بھٹکل

• جامعہ اسلامیہ بھٹکل سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا بحیثیت سرپرست بڑا تعلق تھا اور جامعہ کے اساتذہ بھی حضرت مولانا سے بڑی عقیدت و محبت رکھتے تھے۔ طرفین کے اس خصوصی تعلق کی بنا پر جامعہ میں حضرت مولانا کی یاد میں جلسہ بھی ہوا۔ اور طلباء نے اپنے اساتذہ کی نگرانی میں حضرت مولاناؒ پر ایک خصوصی رسالہ اردو میں ارمغان جامعہ کا "مفکر اسلام نمبر" بھی نکالا۔ جس میں مولانا کے حیات و خدمات پر کسی قدر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

الزھرۃ بھٹکل

• اسی طرح جامعہ اسلامیہ بھٹکل سے نکلنے والے عربی مجلہ "الزھرۃ" نے بھی "عدد ممتاز عن سماحۃ الشیخ ابی الحسن علی الحسنی الندوی" کے نام سے خصوصی نمبر نکالا ہے، اس میں بھی حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے عظیم کارناموں اور عالمی پیمانہ پر ان کی دینی و دعوتی کوششوں کو بیان کیا گیا ہے۔

صوت القرآن احمد آباد

• ماہنامہ "صوت القرآن" احمد آباد کی جانب سے "مفکر اسلام نمبر" شائع ہوا، جس میں حضرت مولانا کی ہمہ گیر شخصیت اور ان کی دینی و علمی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے

بیرون ملک کے اخبارات و رسائل

• اسی طرح ملک اور بیرون ملک سے شائع ہونے والے عربی، اردو، ہندی کے جرائد و رسائل میں حضرت مولانا کی حیات و خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی، اور اور بہت خوب لکھا گیا۔ روزنامہ "الشرق الاوسط" لندن، "المدینہ" مدینہ منورہ، روزنامہ "عکاظ" مدینہ منورہ، روزنامہ "البیان" متحدہ عرب امارات، "صراط مستقیم" برمنگھم، "اردو نیوز" جدّہ، "المجتمع" کویت، المسلمون، الدعوۃ، الارتجاء، الرابطہ، العالم الاسلامی کے علاوہ دوسرے بہت سے عربی رسالوں نے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو خراج عقیدت پیش کیا اور عرب اہل قلم و دانشوروں کے معیاری مضامین بھی شائع کئے۔

پاکستانی اخبارات و رسائل

• پاکستان کے اہم رسالوں میں "الفاروق" کراچی، "البلاغ" کراچی، "تعمیر افکار" کراچی، "ختم نبوت" کراچی، "تکبیر" کراچی "بینات" کراچی، "انوار مدینہ" لاہور، "حق چاریار" لاہور "الحق" اکوڑہ خٹک، "النصیحۃ" لاہور — "الصیانۃ" لاہور، "ترجمان القرآن" لاہور، وغیرہ نے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت پر تفصیلی مضامین چھاپے اور مولانا کی زندگی کے نقوش اور خدمات کا تفصیلی خاکہ پیش کیا، جن میں ماہنامہ "الحق" کا کردار خاص طور پر قابل ذکر رہا ہے۔

بنگلہ دیش کے اخبارات و رسائل

● بنگلہ دیش کے اخبارات و رسائل میں بھی حضرت مولانا کی سیرت پر مضامین شائع کئے گئے جو کافی مقبول ہوئے۔

ہندوستانی اخبارات و رسائل

● ہندوستان کے عربی اردو، ہندی انگریزی اخبارات و رسائل نے بھی اس سلسلے میں قابل ذکر رول ادا کیا ہے، اور حضرت مولانا کی جلالتِ شان اور علمی شخصیت سے قارئین کو روشناس کرایا۔ ان اخبارات ورسائل میں "البعث الإسلامی" "الرائد" "تعمیر حیات"، "کاروانِ ادب"، فریگرینس" (انگریزی) ندوۃ العلماء لکھنؤ، "بانگ درا" لکھنؤ، الفرقان لکھنؤ، ندائے ملت لکھنؤ، البدر، کاکوری لکھنؤ، نئی دنیا، نئی دہلی، روزنامہ انقلاب ممبئی، معارف اعظم گڑھ، ماہنامہ "دارالعلوم دیوبند"، ماہنامہ "مظاہر علوم" سہارنپور، آئینہ دارالعلوم دیوبند، ندائے دارالعلوم وقف دارالعلوم دیوبند، یادگار شیخ سہارنپور ندائے شاہی مرادآباد، فیض محمود اعظم گڑھ الرشاد اعظم گڑھ، الشارق اعظم گڑھ، ماہنامہ رضوان لکھنؤ، سہ ماہی اسلام اور عصر جدید دہلی، ماہنامہ اشرف العلوم حیدرآباد، ملی اتحاد دہلی، ارمغان پھلت منظفر نگر، سہ روزہ دعوت دہلی، افکار ملی دہلی، اردو راشٹریہ سہارا لکھنؤ، روزنامہ ان دنوں لکھنؤ، حقیقت لکھنؤ، پیام سحر لکھنؤ، مرکز جدید لکھنؤ، صحافت لکھنؤ، لاریب لکھنؤ، السراج جھنڈانگر، نور توحید کشمیر، فراستہ المؤمن کانپور، نقیب پٹنہ، اردو ٹائمز ممبئی، سالار بنگلور، سیاست بنگلور، روزنامہ مقدس اورنگ آباد، ماہنامہ ہدایت جے پور، مجلہ تذکیر غازیپور، نقشِ نوائط بھٹکل، الداعی دارالعلوم دیوبند، سہ ماہی صفا حیدرآباد، ماہنامہ ہجرت ونصرت پونہ، روحانی اسرار سہارنپور، دعوت وعزیمت دہلی، اخبار مشرق کلکتہ، صوت الأمۃ بنارس، محدث بنارس، ترجمان القرآن بنارس، المحمود ہاپوڑ المآثر مئو، نور توحید جھنڈانگر، برہان دہلی، النور مہاراشٹر، ماہنامہ ذکریٰ رامپور، سہ ماہی السلام دہلی، نصرۃ الإسلام کشمیر، روزنامہ ٹائمز اورنگ آباد، پائنیر لکھنؤ، ٹائمس آف انڈیا لکھنؤ، ہندوستان ٹائمس لکھنؤ، اسٹیٹس مین دہلی، ہریانت جدید کانپور، انڈین ایکسپریس دہلی، جاگرن لکھنؤ، مسلم بنگلور، ریڈینس دھلی، ارمغان جامعہ بھٹکل ہ کے علاوہ سیکڑوں ہندی، انگریزی، عربی، اردو، فارسی اخباروں نے حضرت مولانا پر ان کی شایانِ شان مضامین شائع کئے۔ اور ٹی وی ریڈیو وغیرہ نے خبریں نشر کیں، اور حضرت مولانا کی پاکیزہ سیرت اوران کی دینی وعلمی خدمات سے لوگوں کو روشناس کرایا۔

عالِم تھے باعمل تھے محبِّ وطن بھی تھے

قمر الحفیظ قسمر

حق گوئیوں کی شان تھے سید ابوالحسنؒ
مذہب کی آن بان تھے سید ابوالحسنؒ

دانشور و مفکرِ اسلام ہی نہیں
دنیا کے پاسبان تھے سید ابوالحسنؒ

تہذیب و انکسار کی دولت سے مالامال
مخلص تھے مہربان تھے سید ابوالحسنؒ

عالم تھے باعمل تھے محبّ وطن بھی تھے
انسانیت کی جان تھے سید ابوالحسنؒ

شام وعرب عجم ہوں کہ یونان ومصر ہوں
سارے جہاں کی شان تھے سید ابوالحسنؒ

اک محسنِ جلیل کی تعریف کیا لکھوں
اس دور کے نشان تھے سید ابوالحسنؒ

صدیقؓ کی صفت تھی جسارت عمرؓ کی تھی
عثمانیت کی شان تھے سید ابوالحسنؒ

قول وعمل میں فاتحِ خیبر کی تھی ادا
ملت پہ سائبان تھے سید ابوالحسنؒ

ہندوستاں کو ناز تھا حضرت کی ذات پر
ہندوستاں کی جان تھے سید ابوالحسنؒ

ان کے قلم نے طے کیا کونین کا سفر
خوش قول و خوش بیان تھے سید ابوالحسنؒ

دین محمدیؐ کا گلستاں کھلا رہے
توحید کی زبان تھے سید ابوالحسنؒ

ندوہ کہ جس کا درس ہے آفاق پر عیاں
ندوے کے پاسبان تھے سید ابوالحسنؒ

قمرالحفیظ تم بھی بڑے خوش نصیب ہو
تم پر بھی مہربان تھے سید ابوالحسنؒ

جان کر منجملۂ خاصانِ میخانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام وپیمانہ مجھے

حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

کی

تصنیفات و تالیفات کا تجزیہ

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی

معروف تصنیفات اور ان کا پیغام

ایک تجزیہ

پروفیسر وصی احمد صدیقی

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارے "آں" فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

(اقبالؔ)

میں نے یہ قطعہ جو شاعرِ مشرق نے اپنے لئے لکھا تھا ذرا سی تبدیلی کے ساتھ صرف اس لئے لکھا ہے کہ اپنے بعد دوسرے دانائے راز کے نہ آنے کا جو اندیشہ علامہ کو تھا وہ بجا نہ تھا. خود ان کی حیات میں دانائے راز کی آمد ہو چکی تھی، وہ نظم کی اقلیم کے بادشاہ تھے۔ حضرت مولاناؒ نثر کے، قدرِ مشترک اسلام کا ماضی، حال اور مستقبل تھا. دونوں برگزیدہ ہستیوں کو انعام ان کی زندگی ہی میں مل گیا۔ بقائے دوام کا تاج دونوں کے سر پر رکھا گیا۔ ایسا لگا کہ مافوق الفطرت قوتوں نے پیکرِ مرئی اختیار کیا۔ دونوں کے کمال عطیۂ الٰہی تھے. ایک غیبی قوت دونوں کو قلم پکڑ کر لکھا رہی تھی. گزری ہوئی تاریخ سامنے لائی جا رہی تھی۔ ماضی کے دھندلے نقوش صیقل پا رہے تھے۔ دونوں کے دل عشق کے جلوہ گاہ تھے۔ دونوں کے احساس فطری حسین اور عالی تھے۔ دونوں کے علم بے پناہ تھے، ایک اگر بے مثال شاعر تھا تو دوسرے کا ادراک بھی شاعرانہ تھا۔ دونوں حضرات جس ماحول میں تھے اس سے ان کو بھڑک نہ تھی مگر دونوں اپنے ماضی کو مڑ مڑ کر دیکھتے تھے اور سوچتے تھے کہ انسانیت کا پودا تو ہم نے لگایا تھا اور علم تو ہمارا گمشدہ مال تھا۔ یہ کیسی خزاں آگئی۔ یہ اپنی متاع ہم نے کیسے کھو دی۔

میرے یہ دونوں ممدوح صحیح معنوں میں سزاوار مدیح ہیں مگر مجھے اپنے مضمون کے موضوع کا خیال آرہا ہے۔ اب میں حضرت مولاناؒ کی تصنیفات کے بیان پر آتا ہوں۔

میں نے ان کی کتابیں جو اردو میں ہیں پڑھی ہیں۔ ان کی تقریریں بھی سنی کم اور پڑھی زیادہ ہیں اور بطور تحدیث نعمت عرض کر رہا ہوں کہ میں ان کے ذہنی ماحول میں تقریباً جذب ہو گیا ہوں۔ میں کندن تو نہیں بن سکا لیکن مسِ خام سے کوئی بہتر چیز ضرور ہو گیا ہوں۔ یہ میرا احساس ہے۔ وہ کتابیں پڑھیں جن کی معنویت سے قطع نظر ان کے الفاظ کے تار و پود میں بھی ریشم کی ہمواری اور بلور کی شفافیت ہے۔

میں ان کے تعلیمی طریقے، ان کے قرآن مجید کی تدریس، ان کا عربی دنیا سے تعلق اور اس طرح کے موضوعات پر کچھ نہیں لکھنے جا رہا ہوں۔ میں دینی تعلیم کا پس منظر نہیں رکھتا اور نہ زبانِ عربی سے واقف ہوں پھر کیسے ان موضوعات پر لکھنے کا اہل ہوں۔ عرفیؔ کا شعر میرے حسبِ حال ہے ؎

مدارِ صحبت مابر حدیثِ زیر لبی الیست
کہ اہل بزم عوام اند گفتگو عربی الیست

میرؔ نے اسی خیال کو عرفیؔ سے مستعار لیا ہے ؎

ہر ایک سے کہا بزم میں پر کوئی نہ سمجھا
شاید کہ میرے حال کا قصہ عربی ہے

اس کے لئے دوسرے مردانِ کار ہیں۔ زبان عربی کے محرم۔ علوم جدید و قدیم کے ماہرین اور رامورِ مذہب کے واقف کار۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ وہ دانائے راز تھے جن کی دانائی کا ان کی زندگی میں اعتراف کیا گیا۔ یہ ہماری ملت کے مزاج سے ذرا سی الگ بات ہے ورنہ ہم اپنے ساری عقیدت کے اظہار کو موت کے بعد کے لئے رکھ چھوڑتے ہیں۔ یہ ایک منفرد بات ہے اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ کارواں کا متاع گراں بہا ہونے کے ساتھ ساتھ میر کارواں بھی تھے۔

حضرت مولانا نے ماضی کی طرف نظر دوڑا کر اپنے گزرے ہوئے سنہرے عہد کو دکھایا ہے۔ حال پر مہربانی کی نظر ڈالی ہے اور شاندار مستقبل کے لئے فکر کی ہے۔ انھوں نے دین و دنیا کے بیچ کی خلیج کو پاٹنے کی کوشش کی اور یہ پیغام دے گئے اسی زندگی سے آنے والی دائمی زندگی کی امیدیں وابستہ ہیں۔ فرمایا کہ آزادی اور انسانیت کی تکمیل محض ایمان اور ایثارِ نفس کے ذریعہ سے ہو سکتی ہے۔ ان کے خواب، ان کے خیال تقریباً بشارتوں کا درجہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے رسمی عقیدے اور روایتی مسلمات کو اسی حد تک قبول کیا جو ان کی تحقیق کی کسوٹی پر پورے اترے۔ ان کی ذکاوت تقریباً وجدان کی شکل میں تھی۔ وہ ایک

وہبی ملکہ کے حامل تھے اور ان کے علمی کارنامے مذہب کے خواص کے محدود حلقہ سے نکل کر عوام تک پہونچے۔ بقول میرؔ ؎

شعر میرے ہیں گو خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

حضرت نے بتایا کہ مذہب کا مقرر کردہ نصب العین ہی انسان کی منزلِ مقصود ہے اور کوئی منزل نہیں جس کی طرف ہمارا کارواں رواں ہو۔ انسانی روح لایزالی ہے اور ہمارا پروردگار جو لامکاں اور لازماں ہے اسی پر ہمیں ایمان قائم رکھنا ہے اور اسی سے مدد مانگنا ہے۔

حضرت مولانا کے قوت احساس میں انتہا درجہ کی ذہانت اور قوت تخیل میں انتہا درجہ کی وسعت تھی انھوں نے قرون وسطیٰ کی طرف بازگشت کو منتہائے مقصود نہیں سمجھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اللہ کا دین مکمل ہے مگر زندگی متحرک اور تغیّر پذیر ہے اور اسلام کے ابدی حقائق ایسے ہیں کہ وہ ہر دور میں دنیا کی رہنمائی کر سکتے ہیں۔

پھر یہ بات دہراؤں گا کہ حضرت مولانا زندگی کا وسعت یافتہ تصور اور تہذیب کے قدروں کا تربیت یافتہ علم رکھتے تھے۔ ایسا علم جو لامتناہی اور ابدی ہے۔ ان کی کتابیں جیتی جاگتی روحیں لگتی ہیں۔ جہاں وہ تاریخ کے نکتے بیان نہ کر رہے ہوں بلکہ صرف بات کر رہے ہوں تو ان کا وہی بیان منطقی دلائل پر مافوق ہو جاتا تھا۔ پھر لگتا تھا کہ ہم فیضان قدسی سے مستفید ہو رہے ہیں۔ اس بیان کو ہم حضرت کا اندرونی تقاضہ سمجھیں یا آمد کہیں یا الہام، یہاں پر ناطقہ سر بگریباں ہے۔

حضرت مولانا سے میں نے اپنی تلخیص نگاری کی داد پائی ہے لیکن گفتگو میں نہیں، صرف تاثرات میں۔ بقول غالبؔ "پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں"۔ کبھی کبھی یہ فرمایا کہ مفید کام کر رہے ہو۔ آج کل لوگوں کے پاس ضخیم کتابیں پڑھنے کا وقت نہیں، جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے میرا انعام صرف مہربان چہرے کے نقوش ہوتے تھے۔ بس دو مرتبہ حضرت مولانا نے بشاشت کا اظہار کیا تھا اور مہربانی کے کلمات کہے تھے جو آج بھی مجھے فخر و مسرت سے بھر دیتے ہیں۔ پہلی مرتبہ جب میں تاریخ دعوت و عزیمت کی دوسری جلد سے تیسری جلد پر آیا یعنی امام ابن تیمیہ سے مشائخانِ چشت پر تو مضمون کے تسلسل میں روانی رکھنا تقریباً پُل بنانا تھا۔ اس کو میں نے اس طرح لکھا تھا۔

"اس حقیر مضمون نگار کو یہ احساس ہوتا کہ جیسے وہ ایک عظیم الشان بلند و بالا سر بفلک پہاڑ کی چوٹی سے ایک ایسی خنک وادی میں داخل ہو گیا ہے جہاں ہر طرف سبزہ ہے۔ گھنے سایہ دار درخت ہیں۔ شفّاف پانی کی نہریں بہہ رہی ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ جیسے گناہ گار پر اللہ کی رحمت کا نزول ہو رہا ہے"۔ حضرت مولانا نے فرمایا کہ تم نے بڑی خوبی سے سب کا حق ادا کیا ہے۔ دوسری مرتبہ جب میں نے پُرانے چراغ پر تبصرہ "شہر خوشاں کے مکیں" کے نام سے لکھا تھا اور ابتدا شیکسپیئر کی ایک برمحل چھوٹی سی نظم کے ترجمہ سے کی تھی۔ یہ نظم میں آگے لکھوں گا۔ حضرت مولانا نے نام کی بھی داد دی تھی اور نظم کی بھی، اس داد کا ذکر ضروری نہ تھا مگر کیا عرض کروں میری خوشی کا پیمانہ گہرا نہیں ہے اور چھلک جاتا ہے۔

میں نے تلخیص نگاری کی ابتدا تاریخ دعوت و عزیمت سے کی تھی۔ ان کتابوں سے حضرت مولانا نے ماضی کے مرجھائے ہوئے نقوش میں نیا رنگ بھرا تھا۔ اسلام کی بہترین شخصیتوں کو بقائے دوام دیا۔ جو آنکھ سے اوجھل تھے سامنے آ گئے اور ہمیں چلتے پھرتے نظر آنے لگے لیکن اپنے اس مضمون کو میں سیرت سید احمد شہیدؒ سے شروع کروں گا۔ حضرت سید احمد شہید کی زندگی اور شہادت اس آیت کی عملی تفسیر ہے جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

"ان ایمان والوں میں کچھ لوگ ایسے ہیں کہ انھوں نے اللہ سے جس بات کا عہد کیا تھا اسے سچ کر دکھایا، ان میں کچھ وہ ہیں جو اپنی نذر پوری کر چکے اور کچھ وہ ہیں جو (شہادت کے) مشتاق ہیں اور انھوں نے اپنے (قول کو) ذرا بھی نہیں بدلا۔"

یہ کتاب ملّت کے لئے حضرت مولانا کا ایک عظیم تحفہ ہے۔ شہیدوں کے ذکر کا زندگی سے بھرپور پیغام۔ وہ شہدا جن کے امیر حضرت سید احمد شہیدؒ تھے۔ وہ مجاہدین جو آب و گل کی تسخیر کے لئے نکلے تھے۔ بادشاہوں سے خراج لینے والے درویش جو سورج اور چاند پر کمند ڈالتے تھے اور جن کی آغوش میں زمان و مکان تھے۔ اپنی محفلوں میں وہ ایسے نرم تھے جیسے پرنیاں اور حریر اور رزم گاہ میں وہ اپنے آپ کو بھول جاتے تھے۔ یہی لوگ رنگ بدلتے آسمان کو نظام تازہ بخشتے تھے۔ علامہ اقبالؔ نے ان حضرات کا کیسا خوبصورت بیان کیا ہے۔

یہ کتاب حضرت سید احمد شہیدؒ کی مفصل سوانح حیات ہے جس میں ان کے اصلاحی اور تجدیدی کارناموں کا بیان ہے۔ اس عظیم الشان تحریک کا بیان جس کے اثر میں علماء حجروں سے اور امراء محلوں سے نکل نکل کر میدان میں آ رہے تھے۔ اسلام کے اخلاقی، روحانی، مادّی اور سیاسی غلبہ کی کوشش کرنا۔ یہ ایثار اور سرفروشی کی ایک داستان ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے لئے یہ شعر

حسب حال ہے ۔

ہمارے پاس ہے کیا جو فدا کریں تجھ پر
مگر یہ زندگی مستعار رکھتے ہیں

ان مجاہدین نے کیا نہیں دیکھا۔ میدان جنگ کے سب نشیب وفراز اور حالات کے سب تغیرات دیکھے۔ فتوحات بھی ہوئیں، علمداری بھی قائم ہوئی۔ ایک دینی ریاست کا انتظام بھی کرنا پڑا۔ شکستیں بھی ہوئیں، اسلام کی غیرت کے یہ محافظ اپنے محفوظ گھروں سے نکلے اور بہت دور بالاکوٹ کی پہاڑیوں میں اپنی جان جاں آفریں کے سپرد کر دی۔ نہ مال غنیمت نہ مقبوضہ علاقے، دن کا نیر درخشاں ڈوب گیا اور رات کی چاندنی کی چھاؤں میں اپنی آخری آرام گاہ میں لیٹ گئے۔

ایک خونچکاں کفن پر کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی
(غالب)

حضرت مولانا نے مسلمانوں کے ہاتھ میں رشد وہدایت اور عزم وہمت کا ایک صحیفہ دے دیا۔

پھر "ماذا خسر العالم" منظر عام پر آئی جو تیس برس کی عمر میں لکھی گئی تھی اور جس نے ساری علمی دنیا میں ایک ہلچل مچا دی اور جس کے آگے ابن خلدون کے فلسفۂ تاریخ کا مشہور مقدمہ گرد ہوگیا۔ حضورؐ کی بعثت کے وقت دنیا کا کیا حال تھا اور انسانیت کس پستی تک پہونچ چکی تھی۔ اسلام نے کس طرح زمام قیادت اپنے ہاتھ میں لی اور اس کی ترقی نے دنیا کی تہذیب پر کیا اثر ڈالا۔ پھر یہ قیادت کیسے کمزور اور غافل لوگوں کے ہاتھ میں پہونچی۔ مسلمانوں کا زوال صرف ایک ملی حادثہ نہیں بلکہ انسانیت کی بدقسمتی تھی۔ کتاب پڑھ کر پتا چلتا ہے کہ مسلمانوں نے کیسی مجرمانہ کوتاہی اور غفلت کا ارتکاب کیا، یہ نکتہ ہر جگہ واضح رہا کہ اللہ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود نہ بدلے۔

حضرت مولانا نے بڑے شاندار اساتذوں سے پڑھا مگر سچی بات یہ ہے کہ وہ تلمیذ الرحمٰن تھے "ماذا خسر العالم" یا "شرق اوسط کی ڈائری" لکھتے وقت مولانا کی عمر ۳۰ یا ۳۱ سال کی تھی مگر ان کا علمی ادبی اور ذہنی سانچہ بن چکا تھا۔

مولانا کی کتابوں کے متعلق میری شروع کی سطریں تاریخ دعوت وعزیمت کی سیریز سے متعلق تھیں جن کا ذکر میں پھر اس طرح کروں گا کہ حضرت مولانا نے اپنی ملت کے روحانی وارثوں کے نام اور کام کو ایک لوح سیمیں پر ثبت کیا ہے۔ یہ وہ انگارے تھے جو بجھے نہ تھے مگر تاریخ کے خاکستر میں دب گئے تھے۔ انھیں مولانا نے کرید کرید کر نکالا ہے اور پھونک پھونک کر روشن کیا ہے۔

پھر حضرت مولانا کی سیریز "پرانے چراغ" سامنے آتی ہے جس پر میں نے مضمون "شہر خموشاں کے مکیں" کے عنوان کے تحت لکھا تھا۔ اس کی ابتدا شیکسپیئر کی اس چھوٹی سی نظم سے ہوئی ہے (ترجمہ):

جب اپنے میٹھے خاموش خیالوں میں۔
گذرے ہوؤں کی یاد آتی ہے۔
میں سرد آہیں بھرتا ہوں ان کی یاد میں جو کھو گئے۔
اور پرانے غموں کے ساتھ نئے غم بھی سامنے آجاتے ہیں۔
میری آنکھیں بہتی ہیں ان کے لئے جن کو موت نے چھپا لیا۔
اور کراہتا ہوں ان صورتوں کے لئے جن کو دیکھنا اب نصیب نہ ہوگا۔
یہ بیان ہے ان کا جن کو میں پہلے بھی رو چکا ہوں۔

ان کتابوں میں ان لوگوں کا بھی بیان ہے جو خود حضرت مولانا کے گھر کے گوہر شب چراغ تھے۔ ایسے لوگ بھی جن سے علم اور محبت کے سبب سے ربط قائم ہوا۔ پرانے چراغ سے الادین کے چراغ کا جن سامنے آتا ہے مگر اس کا کام عجیب وغریب پرتکلف کھانوں کی فراہمی اور محلات کی تعمیر نہیں بلکہ وہ ایک دردمند دل، حساس اور بیدار ذہن کے مالک کا تابع ہے اور اس نے بصائر اور معرفت کا قیمتی ذخیرہ فراہم کیا ہے۔ مضامین الگ الگ لوگوں پر ہیں مگر ان میں ایک خارج از بیان صفت ہے جو سارے مضامین کو ایک وحدت بخشتی ہے۔ ان لوگوں کا ذکر ہے جن کی زندگی کی نیکیاں، غیر معمولی علم ولیاقت، اسلامی سیرت واخلاق، ظاہری اور باطنی کمالات کے خود حضرت مولانا شاہد ہیں۔

حضرت مولانا انتقال فرما گئے۔ دیکھیں اس سیریز کا کون تتمہ لکھتا ہے۔

اب حضرت مولانا کی کتاب کاروان مدینہ کا ذکر آتا ہے۔ اقبال نے جس دیار کے لئے کہا تھا "اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است" مضامین کا یہ کارواں اسی سمت رواں ہے۔ ان مضامین کے لئے کون سا لفظ استعمال کیا جائے۔ سروش غیبی، فیضان الٰہی ساری کتاب ربودگی اور از خود رفتگی وجد اور سرور کی فضا رکھتی ہے۔ وہ باتیں جو عام مسلمانوں کے علم میں ہیں ان کو اس طرح بیان کیا ہے کہ ایک پراسرار تفسیر ان باتوں میں ایک نئی تب وتاب پیدا کر دیتا ہے۔ دل کھنچا جاتا ہے۔ دل کی گہرائیوں میں موسیقی گونجنے لگتی ہے۔ ایک برقی رو ہے جو دل کو مرتعش کر دیتی ہے۔ ایک مکمل سکون کا احساس ہوتا ہے۔

یہ ایک بلند نگاہ، لطیف الاحساس اور صاحب تخیل مصنف کے قلم کی سحر طرازی ہے جسے سحر حلال کہیں گے۔ مصنف نے اپنی کتاب کی تزئین کے لئے آسمان کے تارے نہیں توڑے

ہیں، ان کے پیر زمین ہی پر رہے ہیں۔ وہ زمین جس نے وہ آسمان پیدا کیا جو کتاب کے اندر اور لوگوں کے دل پر محیط ہے۔

اس کتاب کو پڑھتے ہی مصنف کی کتاب "نبیٔ رحمت" کا خیال آتا ہے۔ سیرت مبارکہ پر وہ کتاب جس کا حسن، حسنِ بیان، حسنِ ترتیب اور حسنِ انتخاب میں مضمر ہے۔ اس کتاب میں حضورؐ کی مبارک سیرت اور پاک زندگی کے درخشاں نقوش ثبت ہیں۔ جو زندہ حقیقتیں اور جانی ہوئی سچائیاں ہیں اسے اپنی حقیقی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ حضورؐ کی سیرت لکھتے وقت کوئی بھی عاشقِ رسولؐ اپنے امنڈتے ہوئے جذبات کو ایک طرف نہیں رکھ سکتا ہے مگر فلسفہ آرائی اور رنگ آمیزی کہیں بھی نہیں ہے۔ سیرتِ رسول پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں مولانا سلیمان منصور پوری کی کتاب رحمۃ للعالمین کو حضرت مولانا اپنی محسن کتابوں میں مانتے ہیں مگر مولانا کی یہ کتاب اس لئے دوسری کتابوں سے مختلف ہے کہ نئی نسل کی فہم اور نفسیات کی موجودہ سطح اور عصری اور علمی اسلوب کا پورا خیال رکھا گیا ہے۔ قدیم و جدید دونوں قسم کے علمی ماخذ سے استفادہ کیا گیا ہے۔ کاروانِ مدینہ اور اس کتاب میں وہ فرق ہے جو نعت اور تاریخ میں ہوتا ہے۔ نعت کا تعلق صرف والہانہ فریفتگی سے ہے۔ تخیل نعت کی جان ہے۔ یہاں شاعرانہ ادراک صوفیانہ ادراک بن جاتا ہے۔ نعت شعورِ حسن کا اظہار ہے۔ ان لاہوتی طبقات تک پرواز جو صرف عشق کے پروبال پر ہو سکتی ہے۔ پیکرِ نبوی کے جمالِ جہاں آرا کا ذکر، بے پناہ جذبہ رحمت کا ذکر، اللہ اور اس کے فرشتوں کے حضور پر درود بھیجنے کا ذکر، شفیع و شافع روزِ جزا ہونے کا ذکر، شبِ معراج کا ذکر، نعت کا تعلق گو نظم سے ہے مگر نثر میں بھی نعت ہو سکتی ہے۔ حضرت خدیجہؓ کا آپؐ کو تسکین دینا۔ ام معبد کا سراپائے رسول کا بیان یہ سب نعت ہے۔ نعت اور سیرت میں فرق ہے۔ سیرت حضورؐ کی مقدس زندگی کا مکمل بیان ہے۔ نعت اُس زندگی کا روحانی کہیں یا رومانی جزو ہے۔

حضرت مولانا مرحوم کی کتاب "المرتضیٰ" جو عربی میں لکھی گئی اور جس کا ترجمہ اردو میں جناب مولانا عبداللہ عباس صاحب ندوی نے کیا تھا اپنے طرز کی واحد کتاب ہے جو حضرت سیدنا علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کی مکمل سوانح حیات ہے اور ان کے خصائص اور کمالات پر روشنی ڈالتی ہے۔ یہ ایک ایسے نادرۂ روزگار عبقری شخصیت کی سوانح ہے جن کی اصلی شخصیت افراط و تفریط اور اختلافات کے پردے کے پیچھے چلی گئی ہے۔ مسلمانوں کے مختلف گروہوں نے ان کو اپنے افکار و نظریات اور روایتی عقائد کے تحت دیکھا ہے۔ المرتضیٰ کے مصنف نے ان کی پاک اور بیداغ زندگی، ان کی شخصی خصوصیات، ان کے اعلیٰ اسلامی قدروں کو جس پر وہ کاربند تھے اس انداز سے لکھا ہے کہ ان کے عہد کی پوری تصویر بھی سامنے آگئی اور عہدِ خلافت میں جن مسائل اور مشکلات سے وہ گزرے اور جو نازک مرحلے ان کی زندگی میں پیش آئے سب کا مورخانہ بیان بھی ہے۔ ان کی بے نظیر زاہدانہ زندگی، صحیح فیصلے اور اقدامات، فرزندانِ والا مرتبت اور سادات کرام (آلِ رسول) کے اعلیٰ اخلاق و شمائل سب کا بیان مستند تاریخ کی کتابوں سے اخذ کیا ہے اور تجزیہ کیا ہے۔

یہ نبیؐ کے چچازاد بھائی، یہ بچپن میں سب سے پہلے ایمان لانے والے، یہ ہجرت کی رات نبی کے بستر پر سونے والے، یہ امانتوں کی واپسی کے بعد حضور تک پہونچنے کے لئے مکہ سے مدینہ تک پیدل سفر کرنے والے جن کے پیروں کا ورم دیکھ کر حضورؐ رو دیے۔ یہ نبی کی بیٹی سیدۃ النساء حضرت فاطمہ زہراؓ کے زوج یہ جنّت کے جوانوں کے سردار حضرات حسنینؓ کے والد، اس بے مثال کتاب میں ان کی تابناک زندگی کے سارے پہلو سامنے آگئے۔ یہ کتاب ایک تاریخی دستاویز اور رسول کے تربیت گاہ کے منتخب ترین تربیت یافتہ کی سیرت لکھنے کی ایک مخلصانہ کوشش ہے۔

حضرت مولانا کی کتاب بصائر ہندوستان کی اسلامی اور علمی تاریخ کا ایک منصفانہ جائزہ ہے۔ یہ کتاب اپنے زعیموں کی داستان، ان کے کارنامے، ان کا دبستانِ فکر، ان کے بنا کردہ اعلیٰ دینی مدارس، تربیتی مراکز، ان کی لائی ہوئی اصلاحی تحریکات کا ایک خاکہ ہے۔ جن کا بیان ہے ان کی خوبی اور محبوبی سے مولانا کا دل سرشار ہے۔ کتاب میں ذکر کردہ قدسی صفات عالی نفوس حضرات احیائے دین کے بانی مبانی تھے۔ انھوں نے مذہب کی تجدید کے ساتھ معاشرے کی تجدید بھی کی ہے۔ حضرت مولانا نے مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی سے ابتدا کی ہے اور علامہ سید سلیمان ندوی پر خاتمہ کیا ہے ایک طبقہ نے جماعتی مفاد یا شخصی مصلحت یا ایک خاص مشرب اور طریقہ کو فائدہ پہونچانے کے لئے ان بزرگوں کی بنا کردہ دینی تحریکوں، دعوتی سرگرمیوں اور اصلاحی کوششوں کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کرنے اور تعلیمی مرکزوں کے سلسلے میں شکوک اور شبہات پیدا کرنے کی کوشش شروع کی ہے، یہ کتاب اس کے ازالے کے لئے لکھی گئی ہے۔ مصنف کتاب نے اس رکاکت اس شناعت کے توڑ کے لئے کوئی الزام نہیں لگایا ہے، ان کی تحریر خالص ایجابی ہے۔ ایسی حقیقتوں کا بیان جو خود اپنی سچائی کی گواہ ہیں۔ جن کا بیان ہے ان پر پہلے بھی حضرت مولانا بڑے شاندار مضامین اور کتاب لکھ چکے ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت شاہ ولی اللہؒ پر تاریخ دعوت و عزیمت کی دو ضخیم

جلدیں تصنیف کی ہیں جو دائرۃ المعارف کا درجہ رکھتی ہیں۔حضرت سید احمد شہیدؒ پر مولانا کی تصنیف وہ معرکۃ الآراء تصنیف ہے جس کے ٹکر کی کتاب اردو میں نہیں لکھی گئی۔اس کتاب میں حضرت مولانا سید اسماعیل شہیدؒ کے کارنامے کا مفصل بیان ہے۔ مولانا قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ، شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کے حوالے مولانا کی بیشتر کتابوں میں مل جائیں گے۔حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ مولانا حسین احمد مدنیؒ، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا، مولانا محمد الیاسؒ، مولانا سید سلیمان ندویؒ پر مولانا کے لکھے ہوئے بہترین خاکے "پرانے چراغ" میں شامل ہیں۔ان حضرات نے آدم گری، مردم سازی اور روحانی تزکیہ اور تربیت کا کام انجام دیا ہے۔ایسے مردان کار تیار کئے جو حمایت شریعت اور محو بدعت کا عظیم الشان کام انجام دینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

اللہ تعالیٰ ان کو نیک ہدایت دے جو بقول حضرت مولانا بے مقصد جہاد اور بغیر دشمن کی جنگ لڑنے پر آمادہ ہیں کیا یہ زمانہ انہی باتوں کا ہے۔

یہ کتابیں حضرت مولانا کی بہت معروف کتابیں ہیں۔ان کے علاوہ حضرت مولانا کی بے شمار ایسی کتابیں ہیں جو مقامی اور وقتی مسائل کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہیں جیسے مغرب سے صاف صاف باتیں یا نئی دنیا امریکہ میں صاف صاف باتیں۔

مغرب سے صاف صاف باتوں میں حضرت مولانا بقول مولانا محمد الحسنی مرحوم کے ایک ایسے داعی کی شکل میں سامنے آتے ہیں جو مغرب کو اسلام کی دعوت بغیر کسی ندامت اور شرمندگی کے دیتا ہے اور اس کے لئے غیر ضروری تاویلات کا سہارا نہیں لیتا۔حضرت مولانا مغرب کو بنی نوع انسان کی قیادت میں اہم کردار ادا کرنے اور زندگی کا رخ تبدیل کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔علوم اور وسائل پوری انسانیت کو بلا تفریق و امتیاز حقیقت اور سعادت سے ہم کنار کر سکتے ہیں بشرطیکہ ایمان اور صالح مقاصد کے ساتھ ان کا جوڑ ہو۔انانیت تکبر اور علمی غرور قبول حق کی راہ میں حائل ہو گیا ہے۔

دوسری کتاب، امریکہ اور کناڈا میں مولانا مرحوم کی اہم تقریروں اور خطبات کا فکر انگیز مجموعہ ہے۔ مغربی تہذیب اور امریکی معاشرت کا جائزہ، تجزیہ اور مطالعہ ہے اور امریکہ کے مقیم مسلمانوں کے بارے میں اہم مشورے دیئے ہیں مشینی تہذیب کے سب سے بڑے مرکز میں اس بلند سطح سے گفتگو کی گئی ہے جس پر دیکھنے والوں کو پرانی اور نئی دنیا ایک بے حقیقت سراب اور اس کی چمک دمک جھوٹے نگینوں کی آب و نظر آتی ہے۔

حضرت مولانا کی سرسبز کاروان زندگی کو میں نے سب سے آخر میں رکھا۔میر کارواں کی آخری منزل تو آگئی، ساتویں منزل پر انھوں نے پڑا ڈالا۔اب آگے نہیں بڑھنا ہے۔نوا تو حضرت مولانا کی کبھی تلخ نہ ہوئی کیونکہ ذوق نغمہ کو انھوں نے کمیاب نہیں پایا، مگر اب نہ جرس کارواں ہے نہ حُدی خواں۔ اب آگے کچھ لکھتے وقت میرا دل بھر آتا ہے۔بس یہی کہنا ہے کہ یہ سرسبز تاریخی مرقع ہونے کے علاوہ فکر و عمل کی بھی دعوت دیتی ہے۔ان کتابوں میں ملک کے اندر اور ملک کے باہر طویل اسفار کا بیان ہے۔اس دوران ہونے والے اہم واقعات پر تبصرہ ہے اور یہ تبصرہ نتائج کی شکل میں نظر آتا ہے۔حضرت مولانا تو تاریخ اور فلسفہ تاریخ کے زبردست واقف کاروں میں رہے ہیں جن حالات اور جن واقعات کو وہ بیان کرتے ہیں ان کے اسباب و علل پر غور کرکے وہ منطقی نتیجہ پر آتے ہیں، کانفرنسوں اور سیمیناروں میں شرکت کی رودادیں پوری دلچسپی پیدا کرتے ہوئے قاری کے علمی، دینی اور اصلاحی جذبہ کو بیدار کرتی ہیں۔یہاں جغرافیائی حدود و ثغور سے معاملہ نہیں۔مذہب جو سطور میں عیاں اور بین السطور میں نہاں ہے اس نے کسی ملک اور کسی زمانہ میں اپنی شکل نہیں بدلی۔وہ نظریہ حیات سامنے آتا ہے جو اسلام کی دین ہے۔ہر بیان میں ایک حسن تکمیل بھی ہے۔

یہ مضامین جہاں مولانا کے اجتہاد ذاتی کا اظہار کرتے ہیں وہاں یہ بھی لگتا ہے کہ مجددین، مجتہدین، مصلحین ایک جماعت میں اپنے تحائف حضرت مولانا کو دے رہے ہیں۔مولانا کا ہر فرمانا مکمل اور مستند ہوتا، ہم آہنگی، توازن اور جامعیت حضرت کی تحریر کے وصف ہیں۔آپ سطح کے اوپر کے مشاہدات کے ساتھ سطح کے نیچے بہنے والی لہروں UNDER CURRENT کو بھی محسوس کریں گے۔ ع

داستان فصل گل خوش می سراید عندلیب

ص ـــ کا بقیہ

سراپا عزیمت ودعوت

وائسلام کی ذات پاک کی تجلیات سے سنی سنائی حد تک بھی بے بہرہ اور ناواقف ہو۔صدی بہ صدی گزرتی گئی ان مبارک قدموں کے نشانوں پر سر کے بل چلنے والے اسی طرح کی شان دکھاتے آئے ہیں۔جیسی شان علی میاں نے دکھائی۔یہ بزرگ تو خاص کے مدینے کا رنگ رکھنے والے بزرگ ہیں، لکھنؤ و دہلی کے بیچارے اس کے آگے کیا حیثیت رکھتے ہیں۔

انسان کی تعریف :۔ انسان کی تعریف یہ نہیں کہ وہ غلطی نہیں کرتا، غلطی کرنا تو اس کی سرشت اور خمیر میں داخل ہے، تعریف یہ ہے کہ وہ غلطی کا اعتراف کرتا ہے اور اس پر نادم ہوتا ہے۔

(حضرت مولانا علی میاںؒ)

سیاہ تازہ برانگیزم از ولایت عشق

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

کی

دو شاہکار تصنیفات

نبیِ رحمت اور ارکانِ اربعہ

تحلیل و تجزیہ : ـــــــ مولانا نذر الحفیظ ندوی۔ استاذ ادب دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

ندوۃ العلماء پر اس کے قیام کے بعد ہی سے اللہ تعالیٰ کے جو خاص انعامات ہوئے ان میں ایک بیش بہا احسان اس کا یہ بھی ہے کہ ندوہ سے نسبت رکھنے والوں کو اس نے اپنے آخری محبوب نبیؐ کی سیرت لکھنے کی توفیق عطا فرمائی۔ ان کے قلم سے امہات المومنین، خلفائے راشدین صحابہ کرامؓ، صحابیات، تابعین، ائمہ مجتہدین، صلحاء، شہداء، علماء و مشائخ اور اصحاب دعوت و عزیمت کی سوانح اور تذکرے نکلے جو چودہ صدیوں کی تجدیدی و اصلاحی کوششوں پر محیط ہیں، ندوی فضلاء کی دوسری نسل میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی اس اعتبار سے ممتاز و فائق ہیں کہ ان کے قلم سے سیرت و سوانح، تاریخ و ادب، عقائد و عبادات اور اخلاق و معاملات پر ایسی کتابیں نکلیں جنھوں نے دینی فکر کی تجدید اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ کا اعتماد اسلام کی ابدی صداقت پر از سر نو بحال کیا۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے جس گھرانے میں آنکھیں کھولیں وہ دینی و اخلاقی قدروں کا حامل تھا۔ گھر ہر وقت قرآن و حدیث، سیرت نبویؐ، صحابہ کرامؓ کے تذکرے، مجددین و مصلحین اور مجاہدین کے کارناموں سے گونجتے، اسی پاکیزہ ماحول میں جن عناصر سے مولانا کی سیرت و کردار کی تشکیل ہوئی ان میں سیرت نبوی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے، دس بارہ سال کی عمر میں رحمۃ للعالمین جیسی کتاب کے مطالعہ نے مولانا کو ایسی دولت سے آشنا کیا جو ان کے نزدیک ایمان بالغیب کے بعد سب سے قیمتی چیز بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں ایمان ہی کا ایک حصہ ہے، ابن ہشام کی "السیرۃ النبویۃ" اور ابن قیم کی "زاد المعادؒ" کے مطالعہ میں انھوں نے زندگی کے شب و روز بسر کئے، یہی وہ وقت تھا جب ان کا دل ایمان و یقین کی حلاوت سے آشنا ہوا، اور ان کے جذبۂ شوق و محبت کو نئی غذا ملی اور اس کی از سر نو آبیاری ہوئی، مولانا کے کردار کی تعمیر، عقیدہ کی پختگی، اخلاق کی بالیدگی اور ایمان کی تخم ریزی و پرورش میں سیرت نبوی کے مطالعہ نے بڑا بنیادی اور موثر رول ادا کیا، اس مبارک موضوع نے ان کے دل میں اس خوابیدہ اور مخفی محبت کو ابھارا جس کے بغیر زندگی میں کوئی مزہ نہیں اور جس کے بغیر زندگی کی کوئی قیمت بھی نہیں، بقول حضرت مولانا کے یہی دیوانگی محبت تو زندگی کا حاصل اور مغز ہے۔

در خرمنِ کائنات کردیم نگاہ
یک دانہ محبت است باقی ہمہ کاہ

مولانا کی پوری زندگی اس دیوانگی محبت کی تعبیر تھی، اس محبت کے طفیل ان کے نقوش قلم میں تازگی تھی، اپنے مقاصد و مطالب کی وضاحت کے لئے ان کو قوی سے قوی تر دلائل اور بلیغ سے بلیغ تر مثالیں سیرت کے جمال و کمال ہی سے ملتی تھیں، اور سیرت ہی سے ان کی طبع میں روانی و جولانی پیدا ہوتی تھی اور ان کی خوابیدہ صلاحیتیں بیدار ہوتی تھیں، ان کی تمام تحریروں پر اسی جمال محمدی کا پرتو اور سیرت نبوی کے گہرے مطالعہ اور فکر و تدبر کا عکس پایا جاتا ہے۔

لیکن مولانا نے جس دور میں ہوش سنبھالا وہ ایمان و مادیت کے درمیان کشمکش کا تھا، تمام مسلم ممالک پر عام طور پر اور عرب ممالک پر خاص طور پر مغربی صیاد کے اقبال کا سحر تھا، مغربی سانچوں سے ڈھل کر جو نئی نسل باہر آرہی تھی وہ اعتقادی و ذہنی اور تہذیبی ارتداد کے رنگ ڈھنگ اختیار کر رہی تھی، مولانا نے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا کہ مغربی علوم اور مادی فلسفے جدید تعلیم اور قوم پرستی کی رہنمائی میں عرب و عجم بلکہ خود حرم کے اندر غنیم کی فوجیں داخل ہورہی ہیں، مولانا کے حساس اور دردمند دل پر اس صورت حال نے زبردست چوٹ لگائی، انھوں نے دیکھا کہ قوم پرستی کی تحریکیں، مغربی تعلیم کے اثرات اور دور حاضر کی مادیت ہر جگہ اپنا اثر دکھلا رہی ہے اور دلوں کی اس گرمی اور اس سوز کو نقصان پہونچا رہی ہے جو اس امت کا بہت بڑا سرمایہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اسی سرمایۂ ملت کی نگہبانی

کے لئے بروقت اپنے ایک بندے کو خبردار کیا اور اس سے ایسی کتاب لکھوائی جس نے اسلامی دنیا کے اس طرزِ فکر کو یکسر تبدیل کر کے رکھ دیا جو مغرب کی بالادستی کی وجہ سے پیدا ہوگیا تھا، بلکہ اس کتاب نے مغربی ارتداد کے سیلاب بلاخیز کے آگے زبردست پشتہ کا کام دیا۔[1]

مولانا نے ایمانی فراست اور ذکاوت حس سے اس کا ادراک علمی و دعوتی سرگرمیوں کے آغاز ہی میں کر لیا تھا کہ مغربی ارتداد نے عالمگیر وبا کی صورت اختیار کر لی ہے اور یہ طوفان و سیلاب کی طرح تیزی سے پھیل رہا ہے، مولانا کے ہوش سنبھالنے تک مسلمانوں کی دو نسلیں مغربی سانچوں سے ڈھل کر نکل چکی تھیں، اس لئے انھوں نے از سر نو تعمیر حرم کی ضرورت محسوس کر کے مشرکانہ ماحول میں آنکھیں کھولنے والے مسلمان بچوں کی دینی و اخلاقی تعلیم و تربیت کے لئے عربی زبان میں قصص النبیین تیار کی جس نے بچوں کے لئے علم کلام کا کام دیا[2] نوجوانوں کی نفسیات اور ان کے عقلی و جذباتی تقاضوں کو سامنے رکھ کر عربی نصابی کتابیں تیار کی گئیں۔

مغرب کی شک آفریں تہذیب و ثقافت نے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے دل و دماغ میں یہ بات بٹھادی تھی کہ پوری اسلامی تاریخ میں چودہ صدیوں تک خلفائے راشدین کے بعد کوئی مجدد و مصلح پیدا نہیں ہوا، شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ بات بعض داعیوں کے قلم پر آرہی تھی جو بڑی تحریف کا پیش خیمہ تھا کہ خدانخواستہ اسلام کے اندر اس کی صلاحیت ہی نہیں کہ وہ ضرورت کے وقت ایسے مردان کار تیار کر سکے جو اصلاح و تجدید کا کام انجام دے سکیں۔ اس بنیادی موضوع پر مولانا نے ایک ایسا سلسلۃ الذہب تیار کر دیا جس نے اسلامی تاریخ کے بہت بڑے خلا کو پر کر دیا، یا اسلامی سرحد کے اس زبردست رخنہ کو بند کر دیا جہاں سے ذہنی و اعتقادی ارتداد کی فوجیں داخل ہو رہی تھیں۔[3]

سیرت نبوی مولانا کا ایسا محبوب موضوع تھا کہ وہ ان کے دل و دماغ اور اعصاب پر حاوی تھا، ایسا کہ ان کی تحریر و تقریر اور اصلاحی و دعوتی کوششوں کا محور و مرکز تھا۔ وہ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ ملت کے اس رہنما اور سربراہ طبقہ کی (جو ملت کی فکری، علمی اور سیاسی قیادت کر رہا ہے) موجودہ بے راہ روی، اسلام کی صحیح روح سے بُعد، آسمانی مذاہب کے مخالف مادی اقدار کی غلامی، مصنوعی طریقوں اور مغربی طرزِ فکر سے وابستگی اور اس کے اثر سے اسلام کی ایک نئی تعبیر اور دین کی ایک نئی تفہیم کو دنیا کے سامنے پیش کرنا، منہاج و مزاج نبوت سے ناآشنائی اور اس کی اصل قدر و قیمت سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے، اس طبقہ کو نہیں معلوم کہ زندگی، تہذیب و تمدن اور عقل انسانی پر نبوت کے کیا احسانات ہیں، اس نے دنیا کو کیا عطا کیا، اور اس سے نئی نسل، نئے تمدن کا رشتہ منقطع ہوجانے سے زندگی اور انسانی معاشرہ کس غلط راستہ پر پڑ گیا ہے اور وہ تباہی کے کس عمیق اور مہیب غار کی طرف رواں دواں ہے۔ مولانا کا یہ عقیدہ تھا کہ عرب ہی اس دولت (ایمان) کے سب سے بڑے امین و علمبردار تھے اور عالم اسلام کے بقاء اور استحکام کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہمیشہ اس قوت کا سرچشمہ اور اس دولت کے پاسبان و محافظ رہیں، اور ان سے عالم اسلام کو فیض ملتا رہے۔ عربوں کو ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلانے کے لئے وہ اتنے بے چین اور مضطرب رہا کرتے کہ ان کے شب و روز اسی پیچ و تاب اور سوز و ساز میں گذرتے اور کسی نہ کسی موقع سے وہ اس سے فائدہ اٹھانے سے دریغ نہ کرتے، سیرت رسول اکرمؐ، سیرت محمدیؐ کا پیغام بیسویں صدی کی دنیا کے نام، سیرت نبویؐ دعاؤں کے آئینے میں، الطریق الی المدینۃ، إلی الاسلام من جدید، النبوۃ والانبیاء فی ضوء القرآن، السیرۃ النبویۃ، نیز درجنوں رسائل ایسے سپاہ تازہ کی مانند تھے جنہوں نے مادیت کے مقابل صف آرا ہوکر عقل خام اور سطحی علم کا مقابلہ کرنے میں بڑا بنیادی کردار ادا کیا، گویا مولانا نے اقبال کے الفاظ میں ؂

سپاہ تازہ برانگیزم از ولایت عشق
کہ در حرم خطرے از بغاوت خرد است

کا فریضہ انجام دیا۔

الطریق الی المدینۃ کا مرکزی موضوع اگرچہ سیرت نبویؐ سے متعلق ہے لیکن ہر مقالہ کا اسلوب اچھوتا اور دلوں کو موہ لیتا ہے، نئے نئے پہلوؤں سے بعثت محمدیؐ کے حسنات کی جلوہ گری ان مقالات میں نظر آتی ہے۔ مصنف نے پوری انسانیت پر نبوت محمدی کے انعامات و احسانات کا ذکر کرتے ہوئے اس کے فیضان عام کا تعارف ایسے البیلے انداز میں کرایا ہے کہ ہر مقالہ کرشمہ دامن دل می کشد اور خوب سے خوب تر کی مثال ہے۔ کتاب کی غیر معمولی تاثیر کا اعتراف عالم عربی کے ممتاز ادیب و نقاد استاذ علی الطنطاوی نے اپنے دلچسپ اور اچھوتے مقدمہ میں کیا ہے۔

۱۹۶۲ء میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کی طرف سے جامعہ کے طلبہ کے ذہن کی تعمیر اور سیرت کی تشکیل کے لئے محاضرہ دینے کی پیش کش ہوئی تو مولانا نے النبوۃ والانبیاء فی ضوء القرآن کا موضوع منتخب کیا۔ اس موضوع کے انتخاب

میں بھی یہی جذبہ کارفرما تھا کہ یہ موضوع ان اہم مباحث اور تحقیقات میں ہے جن کی نئی نسل کو خاص طور پر ضرورت ہے اس لئے کہ مولانا کے بقول اسلامی دانش گاہوں کی بنیادی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ پہلے نعمت نبوت کے سمجھنے کی طرف توجہ کرے۔ جس سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ نے کوئی نعمت نہیں اتاری، اور اس نعمت کی قدر و شکر کے ساتھ اس کے سرگرم حامیوں اور داعیوں میں ہو، اور وہ زندگی کی رزم گاہ میں جہاں جاہلیت، ارتداد اور انقلاب کے پرچم ہر طرف لہرا رہے ہیں۔ وہ لوائے محمدی اور خیمۂ مصطفوی کے سائے میں آجائے اور زندگی کے ہر محاذ پر خواہ وہ فکری و اعتقادی ہو یا علمی و انتظامی، اخلاقی و اجتماعی ہو یا تمدنی و سیاسی، اسلام کی سربلندی کے لئے اپنے کو وقف کر دے، اس طرح کسی بھی اسلامی دانش گاہ کے فارغین و متوسلین کا دائمی شعار اور ان کا سب سے گرانقدر مقصد نبوت اور اس کے طریقۂ کار کا، ہر فکر و فلسفہ، مذہب و مسلک فکر کے ہر ڈھنگ، زندگی کے ہر رنگ اور انسانیت و تمدن کے ہر آہنگ پر ترجیح دینا، اور اسے برتر سمجھنا چاہئے، کیونکہ اگر کوئی نہ ختم ہونے والی اور حقیقی فیصلہ کن جنگ ہے تو وہ نبوت و جاہلیت کی جنگ ہے، وہ جاہلیت جس کی نمائندگی مغرب کر رہا ہے اور وہ اسلام (دین حق) جس کا علمبردار تنہا مسلمان رہ گیا ہے۔ اس جنگ کے سوا تمام جنگیں نقلی اور خانہ جنگیاں ہیں، لیکن فکر و نظر کی دائمی جنگ جاہلیت و نبوت کے درمیان ہی ہے۔ مولانا نے آٹھ محاضرات کے ذریعہ اسلام کے بنیادی عقائد کو ادبی اسلوب میں اچھوتے انداز سے پیش کیا ہے۔ ان محاضرات میں بنی نوع انسان اور تمدن انسانی پر نبوت کے احسانات، انبیاء کرام کی امتیازی خصوصیات، نبوت کے پیدا کردہ ذہن و مزاج، طریقۂ فکر، نبوت کے تیار کردہ انسانی نمونوں، نبوت محمدی کے لافانی کارناموں، نیز ختم نبوت کی ضرورت و اہمیت اور اس کے دوررس عمیق اور انقلاب انگیز اثرات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب ایسے اشارات و حقائق پر مشتمل ہے جو گہرے غور و فکر کو دعوت اور موجودہ مسلم معاشرہ میں جو ایک عبوری مرحلہ سے گذر رہا ہے اور اقدار و افکار کی تند و تیز کشمکش سے دوچار ہے، غور و فکر کا پیغام ہے، اور اس دینی فکر کی تجدید بھی جس پر مادی و سیاسی طرز فکر کا غبار پڑ گیا ہے۔

مندرجہ بالا دونوں کتابوں کی اشاعت کے ایک مدت بعد مولانا نے قصص النبیین کا آخری حصہ خاتم النبیین پر لکھنا چاہا تو بچوں کی نفسیات اور عقلی سطح کے مطابق کتاب کی تیاری میں بقول مولانا کے خاصی دشواری پیش آئی، لیکن اس محبوب موضوع کی برکت سے جہاں ... یہ دشوار مرحلہ طے ہو گیا وہیں ایک بڑی کتاب مرتب کرنے کا خیال بھی چٹکیاں لینے لگا۔ یہ مبارک خیال دل و دماغ اور اعصاب پر ایسا حاوی ہو گیا کہ ایک سال کے اندر کتاب تیار ہو گئی، یہی مولانا کا مزاج اور ان کی طبیعت تھی کہ جب وہ کسی کام کا ارادہ کر لیتے تھے تو مولانا ہی کے بقول وہ ہتھیلی پر سرسوں جمانے کی کوشش کرتے تھے۔

سیرت کے موضوع پر کتابوں کا اتنا بڑا کتب خانہ تیار ہو گیا ہے جس کی نظیر کسی قوم میں نہیں ملتی، ہر دور میں اللہ کے بندوں نے اس محبوب موضوع پر لکھنا اپنے لئے باعث سعادت و نجات اخروی سمجھا، مغربی عہد اقتدار میں انسانیت کو جو معنوی خسارے ہوئے ان کی بھرپائی کے لئے جہاں دینی و اخلاقی موضوعات پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں وہیں سیرت کے موضوع پر بھی کتابیں لکھی گئیں۔ ان میں بعض کا انداز دفاعی اور معذرت خواہانہ تھا، بعض کتابیں مستشرقین کے اعتراضات کو سامنے رکھ کر لکھی گئیں، تیسری قسم ان کتابوں کی ہے جو ادبی اسلوب اور خالص علمی انداز میں تحریر کی گئیں، لکھنے والوں نے صرف عربوں کے دور جاہلیت کے بعض گوشوں کو بیان کرنے کے بعد ولادت و بعثت نبویؐ سے لے کر ہجرت، غزوات اور سیرت نبویؐ کے بعض واقعات، خصوصاً معجزات کا ذکر کرنے پر اکتفا کیا۔ پوری انسانی دنیا پر جاہلیت کا جو شامیانہ تنا ہوا تھا، بعثت نبویؐ کے عمیق اور دوررس اثرات نے کس طرح اس عالمی فضا کو تبدیل کر دیا۔ اس کی طرف ان سیرت نگاروں کا ذہن نہیں گیا، دوسری طرف سیرت کے موضوع پر جو کتابیں نئے اسلوب میں لکھی گئیں ان میں سیرت نگاروں نے اپنے خاص ذوق و رجحان کے مطابق (شعوری یا غیر شعوری طور پر) صاحب سیرت کو اپنے ذوق و رجحان کے تابع کر دیا۔ ایسی بھی کتابیں تیار کی گئیں جن میں سیرت نگار نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت لکھنے کے لئے قلم اٹھایا لیکن اس کے بجائے خود اپنی تصویر کھینچ کر رکھ دی، ایسا بھی ہوا کہ سیرت نگاروں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات و سوانح پر معروضی اور بے لاگ طریقہ پر روشنی ڈالنا چاہا لیکن ان کو اپنے ذاتی میلانات و تجربات اور اپنے نقطۂ نظر کی عینک سے دیکھا اور حالات و واقعات کو اپنے مخصوص پیمانوں سے ناپنا شروع کر دیا، ایک دشواری یہ بھی تھی کہ سیرت نبویؐ دوسرے افراد بنی آدم میں (بشمول انبیاء و غیر انبیاء) اپنی نزاکت و لطافت، وسعت و جامعیت، زندگی کی نازک تفصیلات

اور دقیق سے دقیق معانی و مطالب اور دل کی دھڑکنوں، اور پیشانی کی سلوٹوں اور نفس انسانی کی مختلف حالتوں کے احاطہ و استیعاب اور اس کی مکمل تشریح و ترجمانی میں سب سے ممتاز اور بلند مقام رکھتی ہے، ایسی سیرت کی گیرائی و ہمہ گیری اور جہاں آرائی کے باوجود آپ کی زندگی اور مکارم اخلاق کی صحیح تصویر، آپ کے حسن سیرت و صورت و کمال ظاہر و باطن، آپ کی محبت و شفقت اور دل داری و دلنوازی، آپ کی دعائیں اور خدا سے عرض حال، بنی نوع انسان اور انسانیت کے مستقبل کے لئے آپ کی بے قراری و دل سوزی، آپ کی فصاحت و بلاغت علم و حکمت اور کمال و جامعیت کی ان روشن اور جاں نواز نشانیوں اور زندۂ لافانی معجزوں کا مفصل و مکمل بیان قریب قریب ناممکن ہے، خصوصاً نفس انسانی کی تہہ تک پہونچنا اور اس کے وسیع آفاق اور فضائے محیط کا علم، پھر اس کی جامع اور نازک تصویر کشی، علوم ادبیہ اور اسالیب بیانیہ کی سب سے دشوار، نازک اور بہت جلد متاثر ہونے والی صنف ہے۔ یہی نزاکتیں اور دشواریاں تھیں جن کی بنا پر عرصہ تک اس محبوب موضوع پر (قلبی و ذہنی و وجدانی شغف کے باوجود) قلم اٹھانے سے مولانا ہچکچاتے رہے حالانکہ ان کو مشہور و اہم شخصیتوں کی سوانح حیات اور متقدمین و متاخرین کے حالات زندگی اور ان کے کارنامے لکھنے اور بیان کرنے کا آغاز شباب ہی سے موقع ملا۔ مصلحین امت اور اصحاب دعوت و عزیمت کے حالات و تراجم کے علاوہ تاریخ و ادب، عقائد و عبادات اور اخلاق و معاملات پر جو کتابیں ان کے قلم سے نکلیں انھوں نے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کا اعتماد اسلام پر از سر نو بحال کرنے میں بڑا بنیادی کردار ادا کیا۔ اس کے پیش نظر عالم عربی کے بعض چوٹی کے داعیوں اور اہل نظر نے مولانا پر زور دیا کہ وہ سیرت پر بھی ایسی کتاب تیار کر دیں جو عصری اسلوب کے ساتھ علمی و دعوتی اور تربیتی پہلوؤں کی جامع ہو، عقل و جذبات اور نوجوانوں کی نفسیات کا بھی اس میں لحاظ رکھا جائے۔ یہ کتاب ایسی ہو کہ غیر مسلموں کو بھی بغیر کسی استثناء اور تحفظ کے دی جاسکے کہ وہ اس کے زیادہ حقدار ہیں۔

مولانا نے نبی رحمت کی تیاری میں جن بنیادی خصوصیات کو پیش نظر رکھا ہے وہ حسب ذیل ہیں:۔

• چونکہ بعثت نبوی کے اثرات بڑے وسیع و عمیق ہیں، پوری انسانی تہذیب اس سے متاثر ہوئی اور زندگی کے تمام گوشے اس روشنی سے منور ہوئے، اس لئے عالمی جاہلیت کا اصل نقشہ، اس کے فساد و اضطراب، اخلاقی پستی، خود فراموشی و خودکشی کی زندہ و متحرک تصویر پیش کرنا مصنف نے ضروری سمجھا کہ اس کے بغیر بعثت محمدی کی عظمت و وسعت اور منصب نبوت کی نزاکت و اہمیت اور اس کے عظیم الشان نتائج کی اہمیت و تاثیر کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جاسکتا، چونکہ مصنف جاہلی دور کے عقل و شعور اور اس زمانہ کی تہذیب و تمدن نیز اجتماعی و سیاسی اور دینی و مذہبی حالات، اس کے اقتصادی و سیاسی ڈھانچہ اور عسکری طاقت کی نوعیت سے واقف ہیں اس لئے انھوں نے ان ملکوں کے باشندوں کے صحیح رجحانات، ان کے مزاج و افتاد طبع، ان کے ذہن و نفسیات پر روشنی ڈالی ہے، اس کی بنا پر قاری کو ان دشواریوں اور رکاوٹوں کا پوری طرح اندازہ ہوتا ہے جو اسلام کی پیش قدمی کی راہ میں حائل ہو رہی تھیں، اس کو یہ یقین ہو جاتا ہے کہ عالمگیر سطح پر انسانیت کے دھارے کو جس طرح تبدیل کیا گیا وہ ایک نبی مرسل ہی کر سکتا ہے جس کو نصرت و تائید الٰہی حاصل ہو۔ اس لئے کہ مستشرقین نے اپنی تصنیفات سے یہ تاثر دینے اور جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کا ذہن بنانے کی کوشش کی ہے کہ یہ تبدیلی بعثت محمدی کا نتیجہ نہیں بلکہ حالات کا رد عمل تھا اور پہلے سے اس انقلاب کا لاوا لوگوں کے اندر پک رہا تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کل کام یہ ہے کہ انھوں نے بر وقت اپنی دعوت پیش کر دی، مولانا نے اس کا جواب مستشرقین ہی کی کتابوں سے دیا ہے، دوسری طرف خود مکہ کی سیاسی، اقتصادی، سماجی و تمدنی تاریخ سے بھی اس کے دلائل دئیے ہیں اور بتایا ہے کہ مشرکین مکہ نے حضور کے سامنے دولت و حکومت کی پیش کش کی تھی، لیکن آپؐ نے انکار کر دیا کہ آپ کا بنیادی مقصد پوری انسانیت کی ہدایت تھا نہ کہ اقتدار کا حصول اور عربوں کی شیرازہ بندی۔

• اسی طرح مولانا نے مدینہ کی اجتماعی، اقتصادی اور سیاسی حالت، وہاں کی زمین کی خاصیت، اس کے جغرافیہ، گرد و نواح وہاں کی انفرادی و علاقائی طاقتوں، ان کے باہمی تعلقات، روابط، باہمی معاہدوں اور عہد ناموں اور ہجرت سے قبل کے معاملات اور قومی و ملکی دستور، رسم و رواج، اور باہم متضاد و متحارب گروہوں اور مختلف قبائلی عناصر پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے کہ ان کے جانے بغیر قاری نہیں سمجھ سکتا کہ اسلام نے ان افراد کی کب اور کیسے تربیت کی اور ان کو کیسے حیات نو بخشی، مختلف مسائل کو کس طرح حل کیا، متضاد و متحارب عناصر کو کس طرح شیر و شکر کیا، اس سلسلہ میں

نبوت محمدیؐ کا کیا کارنامہ ہے، اس نے ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے اور روٹھے ہوئے انسانوں کو ملانے اور ان کی تعلیم و تربیت اور تزکیہ وتطہیر کا فریضہ کس طرح انجام دیا، یہ بات صرف اس وقت سمجھی جا سکتی ہے جب آدمی کے سامنے اس عجیب وغریب اور پیچیدہ ماحول کی پوری تصویر ہو جس کا سامنا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کرنا پڑا۔

● اس اصول کو مصنف نے اس وقت کی معاصر حکومتوں اور پڑوسی ریاستوں پر بھی منطبق کرتے ہوئے ان کی تہذیب وثقافت عسکری قوت، فارغ البالی، مرفہ الحالی، نیز ان سلاطین کی مطلق العنانی، رعب و دبدبہ اور شان وشوکت کا جائزہ تفصیل سے لے کر بتایا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی دعوت کے لئے جو قدم اٹھایا اور جو خطرات مول لئے وہ ایک رسول اور مبعوث من اللہ ہی کر سکتا ہے۔ مولانا نے عالمی جاہلیت کے موضوع پر قدیم وجدید دونوں مصادر سے فائدہ اٹھایا ہے، لیکن اس کے ساتھ مصنف کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے سیرت کی دو اصل بنیادوں قرآن وحدیث سے سرمو انحراف نہیں کیا ہے اور نہ ہی بغیر کسی نقد وتحیص کے سیرت کے واقعات کو انسائیکلوپیڈیائی انداز میں پیش کیا ہے بلکہ ان تمام قیمتی معلومات کو ایسے علمی وعصری اسلوب میں ایسے سلیقے سے پیش کیا ہے کہ اگر پڑھنے والا مسلمان ہے تو اس کے ایمان میں اضافہ اور اگر غیر مسلم ہے تو اس کی فطرت اور عقل عام خود بخود اعتراف پر مجبور ہوگی یا کم سے کم اس کے اندر یہ سوال ضرور پیدا ہوگا کہ عالمی سطح پر جو تبدیلی ہوئی یقیناً اس کے پس پردہ کوئی بڑی طاقت کارفرما ہے، کسی مصلح اور سماجی رہنما کے بس کی بات نہیں۔

● اس کتاب کی چوتھی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نے واقعات سیرت اور اقدامات وارشادات نبوی سے ان دوررس وحکیمانہ نتائج اور ان بلیغ وعمیق اشارات کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی ہے جو سیر الانبیاء خصوصاً سید الانبیاءؐ کی سیرت ودعوت کے مطالعہ، نفسیات انسانی، علم الاخلاق وعلم الاجتماع میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور جن سے ہر زمانہ اور ہر مقام میں دعوت وتربیت کے کام، قوموں اور نسلوں کی رہنمائی اور زندگی کے پیچ در پیچ مسائل ومشکلات کی عقدہ کشائی میں بیش قیمت فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

● چونکہ مصنف جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی نفسیات، عقلی سطح اور اس کی کمزوریوں سے خوب واقف ہیں اس لئے وہ منفی انداز اور ناقدانہ لہجہ کے بجائے مثبت طریقہ سے زندگی اور حرارت سے بھرپور ایسے اقتباسات پیش کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کے ذہن کی گرہیں خود بخود کھلتی جاتی ہیں اور بغیر کسی تلقین کے اسوۂ نبوی کی پیروی کا جذبہ اس کے اندر پیدا ہونے لگتا ہے، لیکن خوراک کی مقدار اتنی رکھی گئی ہے کہ نئی نسل اس کو ہضم کر سکے۔

● مصنف نے رنگ آمیزی، داستان طرازی اور تزئین وآرائش کے بغیر جمال محمدیؐ کو پڑھنے والے کے سامنے رکھ دیا ہے تاکہ وہ اس سے اپنی آنکھیں اور دل روشن کرے، مصنف نے اس میں صرف حسن انتخاب، حسن ترتیب اور حسن بیان سے کام لیا ہے اور یہ کتاب کی امتیازی خوبی ہے۔

● کتاب میں عالمانہ بحث اور معروضی نقد وجائزہ بھی ہے لیکن ایسے دلکش اور اچھوتے اسلوب میں کہ جذبۂ محبت اور ذوق وشوق کی کیفیت میں افسردگی کے بجائے تازگی وشگفتگی پیدا ہوتی ہے اور سیرت کے جمال جہاں آرا سے لطف اندوز ہونے اور اپنے دیدہ ودل کو اس سے روشن اور منور کرنے کا جذبہ بیدار ہوتا ہے اس لئے کہ کتاب میں عقل وجذبات دونوں کی بیک وقت اور شانہ بہ شانہ جلوہ گری وکارفرمائی ہے، البتہ یہ جذباتی وایمانی عناصر عقل سلیم کے تقاضوں پر غالب نہیں ہیں اور نہ ہی وہ منطق کے صحیح، معقول اور قابلِ فہم اصولوں سے متصادم ہیں۔

● جس کا علم النفس اور اخلاقیات کے کوچہ سے کبھی گذر ہوا ہے اور معاصر شخصیتوں کے مطالعہ ومشاہدہ کا اسے کبھی موقع ملا ہے اور اس نے ایک طویل عرصہ ان کی رفاقت وصحبت میں گذارا ہے وہ بآسانی اندازہ کر سکتا ہے کہ نفس انسانی کی تہہ تک پہونچنا، اور اس کے وسیع آفاق اور فضائے محیط کا علم، پھر اس کی جامع اور نازک تصویر کشی، علوم ادبیہ اور اسالیب بیانیہ کی سب سے نازک، دشوار اور بہت جلد متاثر ہونے والی صنف ہے۔ مگر مصنف نے توفیق الٰہی کی بدولت اس بال سے باریک اور تلوار سے زیادہ تیز پل صراط کو بڑی کامیابی سے طے کیا ہے، اس میں جہاں ان کے سیرت نبوی سے مکمل ذوقی ووجدانی مناسبت، سیرت کے موضوع کے گہرے اور متنوع مطالعہ اور طویل تدبر کو دخل ہے وہیں عربی زبان وادب پر قدرت ومہارت کے ساتھ خود ان کی ذاتی زندگی میں سوز وساز، سرور وشوق، روح کی تپش اور دل کے گداز کا حصہ ہے، اس بنا پر کتاب انتہائی موثر اور فکر انگیز ہے۔

۱۔ ماذا خسر العالم کا موثر ترین حصہ

"محمد رسول اللہ روح العالم العربی" ہے، اسی طرح روائع اقبال میں اقبال کا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ تعلق و محبت کو نمایاں کیا گیا ہے۔

۲۔ نبی رحمت میں مسلم سماج کی تصویر پیش کی گئی ہے جو عام سیرت کی کتابوں میں نہیں ملتی، اسی طرح سماج کے مختلف طبقات اور افراد کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سلوک مثلاً ازواج مطہرات کے ساتھ، ساتھیوں کے ساتھ، دشمنوں کے ساتھ، خدام کے ساتھ، کتاب اس بیان پر ختم ہوتی ہے جس سے حب رسول میں اضافہ ہوتا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اعلیٰ ترین انسانی نمونہ ظاہر ہوتے ہیں، سیرت نگاری کی کامیابی اس میں ہے کہ جس کی سیرت پیش کی جارہی ہے اس کی محبت قارئین کے دل میں راسخ ہو جائے، اس کے ساتھ اصحاب رسول کی محبت بھی دل میں پیدا ہوتی ہے، اور اس وقت کا سماج بہترین سماج ظاہر ہوتا ہے۔

● کتاب نئے تقاضوں، ضرورتوں، نئے طرز تحقیق اور اس طرز کلام کے مطابق طاقتور عصری اسلوب میں ہے جو رائج الوقت ہے اور اس بڑے خلا کو پر کرتی ہے جو عرصہ سے علمی و دعوتی حلقوں میں پایا جارہا تھا۔ غالباً یہی وجوہات ہیں جن کی بنا پر ۱۹۷۷ء سے لے کر ۲۰۰۰ء تک عربی میں کتاب کے بارہ ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ ندوۃ الشباب العالمیہ نے پچاس ہزار نسخے چھپوا کر یورپ و امریکہ میں تقسیم کیا، سعودی عرب کی جامعات کے نصاب میں داخل ہوئی، اردو انگریزی، ملیشین، ترکی اور ہندی میں ترجمہ ہوا، اور دسیوں ایڈیشن ان زبانوں میں شائع ہوئے۔

فکر اسلامی کی تجدید کے موضوع پر

حضرت مولاناؒ کی دوسری شاہکار تصنیف "ارکان اربعہ"

انبیاء علیہم السلام کی دعوت اور ان کے مزاج و منہاج پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جن عقائد، دعوت و پیغام اور شریعت کے بارے میں جس کو وہ لے کر آتے ہیں بڑے غیور اور ذکی الحس واقع ہوتے ہیں، وہ کسی حال میں بھی (خواہ دعوت کی مقبولیت اور کامیابی کی مصلحت ہی کا تقاضا کیوں نہ ہو) اس کے لئے تیار نہیں ہوتے کہ اپنی دعوت اور شریعت میں کوئی ترمیم، یا تغیر و تبدل گوارہ کرلیں ان کے یہاں مداہنت اور تبدیلی موقف کی گنجائش نہیں ہوتی، اسی طرح ان کی یہ بھی خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ تبلیغ و دعوت اور اپنی تفہیم و مکالمہ میں وہی اسلوب اور وہی تعبیرات اختیار کرتے ہیں جو ان کی دعوت کی روح اور نبوت کے مزاج و منہاج سے ہم آہنگ ہوتے ہیں، ان کا عہد بھی مادی فلسفوں اور نظریات سے جو ان کے عہد کی سطح اور حالات کے مطابق ہوتے ہیں، یکسر خالی نہیں ہوتا، اس عہد میں کچھ طبقوں کی خاص اصطلاحات ہوتی ہیں، وہ ان سے ناواقف نہیں ہوتے، وہ یہ بھی خوب سمجھتے ہیں کہ یہ فلسفے اور اصطلاحات سکۂ رائج الوقت ہے، لیکن لوگوں کو قریب کرنے اور اپنی طرف آنے کی دعوت دینے کے لئے وہ ان سے کام نہیں لیتے، یہی وہ غیرت ہے جو انبیائے کرام کے اصحاب اور نائبین میں منتقل ہوئی، انھوں نے بھی کامیابی و ناکامی اور سود و زیاں سے آنکھیں بند کر کے قرآنی تعلیمات، شرعی احکام اور اسلام کے اصول و ضوابط کی حفاظت کا فریضہ انجام دینے کی بھرپور کوشش کی اور اس راہ میں کسی طرح کی ایثار و قربانی سے دریغ نہیں کیا۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا خاندان ان باتوفیق خاندانوں میں سے ایک ہے جس نے ہر دور میں دین و شریعت کی روح اور شکل دونوں کی حفاظت میں ہر طرح کی قربانی دی۔

مولانا نے علمی و دعوتی سرگرمیوں کے آغاز ہی میں اس حقیقت کا ادراک کرلیا تھا کہ بعض داعی اور اہل قلم جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں اپنی دعوت کو مقبول بنانے کے لئے (شعوری یا غیر شعوری طور پر) بتدریج وہ اسلوب اختیار کرتے جارہے ہیں جو ان کے اندر اسلامی فکر اور دعوتی و تجدیدی کوششوں کے بارے میں سلبی انداز فکر پیدا کردیں گے جس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ اسلام کے شجر طیبہ کے اندر برگ و بار لانے کی قطعی صلاحیت

۱؎ اس سے مراد مولانا کی شہرہ آفاق کتاب ماذا خسر العالم ہے جو دنیا کی نو زبانوں میں پڑھی جارہی ہے۔

۲؎ اردو میں مولانا کی رہنمائی و فرمائش پر حکیم شرافت حسین رحیم آبادی نے یہ سلسلہ تیار کیا جس کے نمونے ہمارا ایمان، ہمارے حضور، حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت خدیجہ، حضرت عائشہ، اچھی باتیں (آٹھ حصے) میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ بچیوں کے لئے اپنی ہمشیرہ امۃ اللہ تسنیم سے قصص الانبیاء اور ہمارے حضور لکھوائی۔ زاد سفر، اور حسن معاشرت بھی اسی نصاب کا حصہ ہے۔

۳؎ سلسلۂ تاریخ دعوت و عزیمت۔

۴؎ ملاحظہ ہو نبی رحمت ص۱۵۳، ص۱۹۰ ص۱۹۸ ص۲۱۴ ص۲۱۵ ص۲۸۸ ص۲۹۹۔

نہیں ہے، اور اس دین کو صرف تین صدیوں تک سمجھا گیا ہے۔

مولانا براہ راست قرآن مجید کے گہرے مطالعہ وتدبر، سیرت انبیاء، اور مجددین امت کی اصلاحی کوششوں کے جائزے سے اس نتیجہ تک پہونچے کہ سیاسی طرز فکر جدید سیاسی اصطلاحات اور موجودہ زمانہ میں سیاست وریاست کی اہمیت کا، ذہن وفکر، طرز ادا اور تقریر وتحریر پر ایسا گہرا اثر پڑا ہے کہ اس نے کسی چیز کو مادیت اور ملمع سازی کے اثر سے آزاد نہیں چھوڑا، حقائق کچھ اور ہوتے ہیں۔ نام اس کے برعکس رکھے جاتے ہیں، اصطلاحات اور پرشکوہ الفاظ کا بکثرت رواج ہے، ظاہر وباطن کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں، آغاز وانجام تمہید واختتام، علمی نظریات اور عملی تجربوں میں یکسانیت کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی جاتی، یہی حال ان فلسفوں اور نعروں کا ہے جنھوں نے مذاہب کی جگہ لے لی ہے اور انسانوں کے دل ودماغ کو مسحور کر رکھا ہے یہاں تک کہ دعوت اسلامی کے بعض داعی اور قائد اور بلند پایہ اہل قلم بھی اپنی تحریروں میں بے تکلف وہ سیاسی اصطلاحات اور تعبیرات استعمال کرنے لگے جن کے ساتھ خاص مفاہیم وافکار پیوست اور ایک خاص تاریخ وابستہ ہے اور جن کا ایک خاص پس منظر ہے اور وہ ایک مخصوص ومحدود مفہوم رکھتی ہیں اور انبیاء علیہم السلام کی دعوت کی روح اور مزاج کی صحیح ترجمانی کرنے سے نہ صرف قاصر ہیں بلکہ مختلف قسم کی غلط فہمیاں، شکوک وبدگمانیاں پیدا ہونے کی باعث ہوتی ہیں۔ مولانا کا عقیدہ یہ ہے کہ قرآن کے مطالعہ وتفہیم کو زمانہ کے محدود پیمانوں کا پابند نہیں بنانا چاہئے، کیوں کہ زمانے آتے جاتے رہتے ہیں۔ غور وفکر کے انداز بھی بدلتے رہتے ہیں، اشیاء کی قدر وقیمت کو بھی قرار نہیں، جبکہ قرآن ایک بلند آسمانی کتاب ہے۔ وہ مستقل انفرادی حیثیت رکھتی ہے۔ علوم انسانی کا پورا خزانہ ریت کے پھسلتے ٹیلے کی مانند جو پھیلتا بھی ہے، سمٹتا بھی ہے۔ اس پر کسی چیز کی بنیاد رکھنا خاص طور سے قرآن مجید جیسی بلند آسمانی کتاب کا، کیسے ممکن ہے، یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ دین ابدی اور اس کے حقائق ناقابل تغیر وتبدل ہیں، دوسری طرف یہ زندگی تغیر پذیر اور رواں دواں ہے۔ اسلاف نے ان دونوں حقائق کو سامنے رکھ کر دین کی تشریح وتفہیم کا ایسا نازک اور مشکل فریضہ انجام دیا کہ صراط مستقیم سے سر مو انھوں نے انحراف بھی نہیں کیا اور نئی نسل کے دلوں میں ایمان ویقین بھی پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

۱۹۴۷ء کے بعد سے مولانا نے براہ راست عالم عربی کا مشاہدہ کیا، وہاں کے ادباء، مفکرین، اہل قلم، اور داعیوں اور حکمرانوں بلکہ ہر طبقہ سے ملاقاتیں کیں، تحریکوں اور جماعتوں اور ان کے کارکنوں کو بہت قریب سے دیکھا۔ ان کا یہ تاثر تھا کہ عربوں کے دل ودماغ اور اعصاب پر مغربیت مسلط ہو رہی ہے۔ نظام حکومت کے پہیے کو تعلیم وتربیت اور میڈیا کے ذریعہ مکہ کے بجائے ترکستان کے راستے پر ڈالا جا رہا ہے۔ مولانا نے بین الجنة والهداية. إلى اين تتجه جزيرة العرب. جیسے طاقتور خطوط ومقالات لکھ کر عرب حکمرانوں اور "کیف توجه المعارف" لکھ کر دانشوروں کو مشورہ دیا کہ عالم عربی کو مغربیت کے دلدل سے کیسے نکالا جا سکتا ہے لیکن انھیں اندازہ ہوا کہ مسئلہ اس سے کہیں زیادہ سنگین ہے اور وہ یہ ہے کہ عرب ممالک کے داعی حضرات بھی مادی طرز فکر سے متاثر ہو کر اسلامی عبادات کی تشریح وتفہیم کرنے لگے ہیں جو بڑے تحریف بلکہ خدانخواستہ اس امت کو ذہنی واعتقادی ارتداد کی طرف لے جائے گی، اس خیال اور احساس کا اظہار انھوں نے ردة ولا أبا بكر لها رسالہ میں کیا اس میں انھوں نے مغرب کے شک آفریں تہذیب کے نتیجہ میں پھیلے ہوئے عالمگیر ذہنی واعتقادی اور تہذیبی ارتداد کی نشاندہی کر کے اس کے مقابلہ کی دعوت دی۔ خود بھی عملی طور سے مجلس تحقیقات ونشریات قائم کر کے اس کے ذریعہ اسلام کی موثر اور طاقتور نمائندگی کرنے والی کتابیں تصنیف کیں تاکہ وہ ذہنی وفکری بے چینی وانتشار دور ہو جو مغرب کی مادہ پرست اور شک آفریں تہذیب وادب نے عالمگیر پیمانے پر پیدا کر دیا ہے اور اس نئے ارتداد کا مقابلہ کریں جو طوفان وسیلاب کی طرح تمام عالم میں پھیل گیا ہے۔

اسی مندرجہ بالا احساس نے مولانا کو سیتاپور آئی ہوسپٹل میں قیام کے دوران ایسا بے چین ومضطرب کر دیا کہ آنکھ کی شدید تکلیف میں بھی یہ احساس دل ودماغ پر چھایا رہا۔ چنانچہ وہاں سے فرصت پانے کے بعد اگر چہ آنکھ کی معذوری باقی رہی، لیکن صدیقی غیرت وحمیت (اینقص الدین وانا حي) کی روح اتنی طاقتور تھی کہ ایسی ہی مؤثر اور طاقتور کتاب بھی اس منفرد موضوع پر تیار ہو گئی جس کے ۱۹۶۷ء سے لے کر اس وقت تک پانچ زبانوں میں ستائیس ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

ارکان اربعہ کی تالیف کا بنیادی محرک یہ احساس اور خیال تھا کہ اسلام کے ان عظیم بنیادی عملی ارکان (نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج) کی روح، ان کی حکمتوں، اور حقیقتوں، مصالح اور فوائد اور ان کے مقاصد کے سمجھنے اور بیان میں مسلمان مصنفین اور اہل قلم کے یہاں عرصہ سے ایک عجیب قسم کا انتشار اور بے اعتدالی نظر آ رہی ہے۔ ان کو بڑی بے تکلفی کے ساتھ عصر حاضر کے فلسفوں، اقتصادی وسیاسی مکاتب

خیال اور ان کی محدود اصطلاحات و تعبیرات کا پابند خوشہ چیں بنا یا جا رہا ہے، اس کی وجہ سے اس کا قوی اندیشہ پیدا ہو گیا ہے کہ اس مخصوص طرزِ فکر سے متاثر ہونے والے قارئین کہیں خدانخواستہ دین کے ان بنیادی ارکان کی حقیقت اور اس کی اصل طاقت سے محروم نہ ہو جائیں اور ان مقاصد ہی سے ہاتھ نہ دھو بیٹھیں جن کے لئے ان ارکان کی تشریع عمل میں آئی ہے جدید مادی تعبیر اور عصری تشریح کے دائرۂ اثر میں آکر ایمان و احتساب کا مفہوم بھی ہمارے ذہنوں اور دلوں سے نکل جائے اور مادی طرز فکر، عبادت اور اخلاص کی روح پر غالب آجائے یہ بات امت کے لئے بڑا خطرہ اور ایک عمیق معنوی تحریف کا پیش خیمہ ہے۔

اسلامی عبادات پر اب تک تقابلی انداز میں روشنی نہیں ڈالی گئی ہے صرف فقہی انداز میں بیشتر کتابیں لکھی گئی ہیں۔ یہ علمی و دعوتی میدان کا بہت بڑا خلا تھا، اسلئے کہ مسلمانوں کو قرآن و حدیث کے احکامات سنا کر اسلامی عبادات کا قائل کرنا آسان ہے لیکن غیر مسلموں کو ان ہی دلائل سے مطمئن کرنا ممکن نہیں۔ یہ بھی ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ اسلام کی دولت بے بہا اور قرآن کی نعمت کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ اس وقت تک ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ اسلام اور دوسرے مذاہب کی عبادتوں کی شکلیں نظر کے سامنے نہ ہوں۔

مصنف کا یہ بھی احساس تھا کہ عام طور پر اسلامی عبادات کو زندگی اور روح سے خالی اور انفرادی و اجتماعی زندگی سے الگ تھلگ سمجھا جاتا ہے حالانکہ مومن کے لیے ان کی حیثیت ایسی ہے جیسے مچھلی کے لئے پانی۔ اس لیے اس بات کی ضرورت تھی کہ ان عبادات کا رواں دواں زندگی سے مربوط تعلق واضح کیا جائے اور بتایا جائے کہ ہر دور میں ان عبادات کے اثرات انفرادی و اجتماعی زندگی پر رونما ہوتے رہے ہیں۔ اور انسانوں کی نفسیات کو یکسر تبدیل اور اخلاقی امراض کو دور کرنے میں ان کا کردار قیامت تک کے لئے باقی رہے گا۔

اگرچہ شاہ ولی اللہ دہلوی کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ اپنے موضوع پر منفرد اور بے نظیر ہے، لیکن نئی نسل کی عقلی سطح سے کتاب بلند ہے اس لیے جدید تعلیم یافتہ (جو شک آفرین تہذیب کا پروردہ ہے) کو مطمئن کرنے کے لیے جدید عصری اور علمی اسلوب میں ایسی کتاب کی ترتیب وقت کا اہم تقاضا ہے۔

مصنف نے سب سے پہلے اپنے عزیز دوست ڈاکٹر سعید رمضان کی فرمائش پر روزہ کے موضوع پر رسالۃ الصیام کے عنوان سے دو مقالے لکھے جو جنیوا سے شائع ہونے والے رسالۃ المسلمون میں بطور افتتاحیہ شائع ہوئے پھر سعودی ریڈیو سے کئی بار نشر بھی ہوئے۔ پھر اگلے دو سالوں میں رسالۃ الحج کے عنوان سے جو مقالے لکھے گئے وہ بھی افتتاحیہ کے طور پر شائع ہوئے اور ان کو بھی جدید تعلیم یافتہ اور علمی حلقوں میں پذیرائی ہوئی ان مضامین کی پذیرائی اور حالات کے تقاضے کی بنا پر مصنف نے بقیہ دونوں موضوعات نماز اور زکوٰۃ پر بھی ایسے ہی مضامین لکھ کر کتابی صورت میں شائع کرنے کا ارادہ کر لیا۔ چنانچہ یہ داعیہ اور خیال مصنف کے دل و دماغ پر ایسا چھا گیا کہ بقول ان کے سال بھر ایسا گذرا کہ اس موضوع پر مطالعہ، غور و فکر کرنے اور اس کے قدیم ماخذ پر نظر ڈالنے کے سوا کوئی اور مشغلہ نہ تھا۔ مصنف کی یہی افتاد طبع اور مزاج و خصوصیت تھی کہ جب تک وہ اپنے علمی اعتکاف میں رہتے اس وقت تک ہر لمحہ اس موضوع پر سوچنے کے علاوہ کسی اور مضمون و موضوع کے فکر و خیال کی گنجائش نہیں ہوتی، یہ ذہنی استغراق و اعتکاف جہاں مصنف کی صحت کے لیے مضر ہوتا تھا وہیں کتاب کی تکمیل اور مرکزیت خیال میں یکیفیت ممد و معاون ہوتا۔

اس کتاب کی تالیف میں مصنف نے جہاں قرآن کا از سر نو مطالعہ کیا وہیں احادیث کے معتبر ماخذ کا دوبارہ جائزہ لیا اور ان ارکان کے موضوع اور اس کی تشریح و تفصیل اور ان کے مقاصد و اسرار کے سلسلہ میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس پر نظر ڈالی، پھر ان ائمہ اسلام کی تحریروں اور تحقیقات سے فائدہ اٹھایا جن کو اللہ تعالیٰ نے اسلام کے فہم کا صحیح حصہ وافر عطا فرمایا تھا اور وہ افراط و تفریط اور تکلف و مبالغہ آرائی سے محفوظ رہ کر اس کی گہرائیوں تک پہونچ گئے تھے۔ اور جنھوں نے مقاصد شریعت، رموز کتاب اور اسرار احکام کے بیان اور تشریح میں وہی طریقہ اختیار کیا جو شریعت کو مطلوب ہے اور جو ان اولین مسلمانوں کا شیوہ تھا، جو اس کے براہ راست مخاطب تھے اور جن کی زبان میں قرآن مجید نازل ہوا۔ یہ لوگ دین کی گہری بصیرت، صحیح فہم، عمیق علم، مکمل عمل۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم بہ قدم اتباع علم و عمل کے میدان میں جہد مسلسل کے جامع تھے۔ ایک طرف ان عبادات کی روح ان کے سارے وجود میں جاری و ساری تھی اور وہ اس رنگ میں پوری طرح رنگ چکے تھے۔ دوسری طرف وہ ان علوم کے قلب و جگر میں اتر گئے تھے۔ اور اس میں بھی ان کو مرتبہ کمال حاصل تھا جن کے بغیر ان اسرار و رموز تک رسائی ناممکن تھی۔ انھوں نے صدق و اخلاص سے اس پر عمل کیا اور اعلیٰ درجہ کی بصیرت، ذہانت، گہرائی اور دقت نظر کے ساتھ اس کی روح کو

سمجھا تھا۔

چونکہ مصنف کے اسلوب پر قرآنی چھاپ ہے اس لئے انھوں نے مفصل طریقہ سے مثبت انداز میں اسلام کے ان بنیادی ارکان کو پیش کیا ہے لیکن اس میں انھوں نے حسن تلخیص، حسن ترتیب اور حسن بیان سے کام لیا ہے جس کا یہ فطری اور منطقی نتیجہ نکلتا ہے کہ قاری کے ذہن کی گرہیں خود بخود کھلتی چلی جاتی ہیں اور وہ بغیر کسی جبر وتلقین کے موضوع کی روح اور مرکزِ خیال سے ہم آہنگ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس حسن ترتیب اچھوتی ترتیب اور البیلے اسلوب کی داد یہودی نومسلم مریم جمیلہ نے خاص طور سے دی ہے۔ مصنف نے قرآن کی روشنی میں انسانی مزاج وطبائع اور اس کی نفسیات کا جو تحلیل وتجزیہ کیا ہے وہ مصنف کے قرآن مجید کے قلب وجگر میں اترنے اس کے گہرے تدبر، طویل غور وفکر اور انسانی نفسیات سے وسیع واقفیت بلکہ ان کی روحانی ذہانت کا نتیجہ ہے، اس طرح کے نمونوں سے پوری کتاب بھری ہوئی ہے، اس باب میں مصنف اپنے وقت کے شاہ ولی اللہؒ نظر آتے ہیں۔

مصنف نے تقابلی مطالعہ میں دنیا کے مشہور آسمانی مذاہب کی عبادتوں، طور طریقوں ان کی تاریخ، فلسفہ اور احکام وتعلیمات کا موازنہ اسلام اور شریعت اسلامی کے احکام اور اس کے فلسفے اور اصول سے کیا۔ اس سلسلے میں مصنف نے ان ہی مراجع و مآخذ پر اعتماد کیا جو ان مذاہب کے علماء ومصنفین کی نظر میں حجت اور لائق شہادت تھے۔ اسلام کے چاروں ارکان کے سلسلہ میں زیادہ تر قرآن وحدیث پر بھروسہ کیا گیا ہے۔ کہیں کہیں ائمہ اسلام کی کتابوں پر بھی بھروسہ کیا گیا ہے۔ بلاشبہ یہ موازنہ انتہائی مشکل اور دشوار تھا۔ لیکن مصنف نے بال سے باریک اور تلوار سے تیز اس راستہ کو کامیابی سے عبور کر لیا۔ یہ موازنہ غیر جانبدارانہ غیر جذباتی اور دیانتدارانہ اور علمی اصولوں پر مبنی ہے۔ اسی بنا پر ان مذاہب کے مقننین اور فقہا کے نزدیک جو جوہر اور مغز تھا وہ قاری کے ہاتھ آجاتا ہے خاص طور سے اس تقابلی مطالعہ سے ایک مسلمان کے ایمان ویقین میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ دوسری طرف یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی نظام عبادات کے مقاصد، ترتیب، نظام طہارت سے متعلق جس طرح تمام باریکیوں کی مستند تفصیلات موجود ہیں اسی طرح ان عبادات کی روح اور شکل کی حفاظت کے لئے ہر دور میں جو کوششیں کی گئیں مصنف نے ان کی جستہ جستہ مثالیں دے کر اس خیال کی پرزور تردید کردی ہے کہ قرآن کے بنیادی اصطلاحات کو صرف تین صدیوں تک سمجھا گیا۔

مصنف نے ان ارکان کا رواں دواں زندگی سے گہرا ربط اور پائیدار تعلق بھی بتایا ہے اور دینی تحریکات کے علمبرداروں، اصلاحی ودعوتی جدوجہد کرنے والوں اور ماہرین تعلیم وتربیت کو مشورہ دیا ہے کہ وہ اس قیمتی میراث اور بے بہا دولت کو ہاتھ سے کسی قیمت پر جانے نہ دیں، اور تغیر وانقلاب اور مادیت کے تند وتیز تھپیڑوں کے باوجود اس روشنی کو کسی قیمت پر بجھنے نہ دیں، اس لیے کہ اس خسارے کی تلافی احکام فقہ کے بڑے سے بڑے ذخیرے، اسرار شریعت کے علم سحر بیانی اور زور قلم کسی چیز سے نہیں ہوسکتی۔ دوسری بنیادی حقیقت یہ بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ ان تمام عبادات کی ظاہری وباطنی دونوں حیثیتیں اور شکلیں مطلوب ہیں۔

مصنف نے قرآن مجید اور اسلامی نظام عبادات کے گہرے مطالعہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ختم نبوت کے بعد امت کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت وخلافت اور خالق ومخلوق کے درمیان رابطہ کے لیے دو چیزیں عطا کی گئیں۔ ایک قرآن جس کا ہر ہر حرف زندگی وقوت سے لبریز ہے جس تازگی کبھی زائل نہیں ہوتی اور جس کے عجائبات ختم نہیں ہوتے، دوسری چیز نماز جو قرآن کی طرح زندگی وقوت سے بھرپور ہے اس کو وصول الی اللہ، تعلق مع اللہ اور تقرب وولایت کے حصول میں جو کمال درجہ تاثیر اور غایت درجہ اہمیت ہے وہ پورے نظام شریعت میں کسی اور چیز میں نہیں نیز ان دونوں چیزوں کے ذریعہ اس امت کے محققین ومجاہدین، ہر نسل اور ہر دور میں ایمان ویقین، علم ومعرفت، روحانیت، للہیت اور قرب وولایت کے ان درجات تک پہونچ گئے جہاں اہل ذہانت کی دقیقہ رسی اور حکماء وعقلا کا تصور وخیال بھی نہیں پہونچ سکتا۔

مصنف نے جہاں تقابلی مطالعہ کیا ہے وہیں ان مذاہب کے نظام عبادات پر علمی روشنی ڈالنے کے بعد ان عبادات میں اسلام کے اصلاحی کردار سے بھی بحث کی ہے جو بالکل نئی اور اچھوتی ہے اور اس بحث کے ہر جملہ کے پیچھے طاقت ور دلائل کا لشکر ہے۔

---

[1] مولانا نے عرصہ تک قرآن مجید کا درس دیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے گذشتہ قوموں، خصوصاً یہود ونصاریٰ کے عقائد، تاریخ ثقافت وتہذیب، نفسیات، واخلاق اور انسانی سوسائٹی پر ان قوموں کے اثرات کا گہرا مطالعہ کیا۔ نیز بچپن سے سورۂ کہف سے شغف اور عشق نے ان کو دجالی تہذیب کے فتنے اور اسکی دعوت وتحریکات کو نہ صرف سمجھنے کا شعور بخشا بلکہ اس سورہ نے ان کے ذہن ودماغ کو اس عالمگیر فتنہ کے

(باقی ص ۳۲۹ پر)

حضرت مولانا علی میاںؒ کا اسلوب بیان

تعمیری ادب کا اعلیٰ نمونہ

مولانا محمد علاء الدین ندوی۔ استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء

مولانا کے اسلوب کی بنیادی خصوصیات

مولانا کا علم وفن شعوری اور گہری فکر کا نتیجہ ہے، مستعار نہیں ہے، گہری اور شعوری فکر ونظر کے نتیجہ میں ظاہر ہونے والا علم ہی سرچشمۂ حکمت ومعرفت ہوتا ہے، جب کہ مستعار علم صرف معلوماتی ہوتا ہے، مولانا کے ادب میں ایک رواں دواں اور پیہم جواں زندگی کا احساس ہوتا ہے، ایسی زندگی ادب وفن میں اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اس میں خونِ جگر کی آمیزش کے ساتھ عشق وعمل کی روح پھونک دی گئی ہو۔

آپ کے ادب کی دوسری خصوصیت بوقلمونی ہے، بوقلمونی سے میری مراد موضوعات کا وہ تنوع بلکہ فکر وخیال کے وہ مختلف رجحانات ہیں جن میں ایک مضبوط تال میل اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

تیسری خصوصیت اتقان ہے، اتقان مضبوطی اور پختگی کو کہتے ہیں، یہاں اس سے مراد کمال ہے، مولانا کے کمالِ اسلوب کا خاصہ ہے کہ ان کی تحریروں میں طبیعت کی جولانی، جذبات کی فراوانی، ایمان کی پختگی اور زبان کی شگفتگی کا حسین رچاؤ جادو جگاتا ہے، شبلیؒ وسلیمان ندویؒ کے مقالاتی اسلوب سے کسب فیض کے ساتھ آپ کے یہاں ہلکے قوافی، مترادفات کی بہار اور ازدواجیت کا رنگ نظر آتا ہے جو اصل میں خطابت کا خاصہ ہے، یوں خطابت کی ہلکی چاشنی نے الہامی زبان سے تاثر کے رنگ وروغن کو گہرا کردیا ہے۔

چوتھی خصوصیت پاکیزگی ہے، پاکیزگی سے مراد طہارت، معصومیت اور تزکیہ ہے، کسی نے کہا ہے: "العقل السلیم فی الجسم السلیم" میں یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ: "الفکر السلیم فی القلب السلیم"، فکر سلیم قلب سلیم کا عطیہ ہے، مولانا کی سلامتی فکر ونظر، اور طہارت قلب وجگر کا یہ عالم تھا کہ کسی انسان کے شیشۂ دل پر کبھی بال نہ آنے دیا۔ حد یہ کہ جب تنقید واحتساب کا خیر خواہانہ قلم سنبھالا تب بھی قلم کی پاکیزگی اور زبان کی شائستگی کو کبھی مجروح نہ ہونے دیا۔ عزت وشہرت اور ہر دلعزیزی ومحبوبیت کے بام عروج پر پہونچ کر انسان عُجب، کبر اور خود پسندی کے پل صراط سے باہر نکل آئے نادر نہیں تو کمیاب ضرور ہے، یہ نبوی اخلاق وسیرت کا عکس ہے جو وارثین نبوت پر جلوہ فگن ہوتا ہے۔

اعتدال وتوازن اور جامعیت مولانا کے اسلوب کی نمایاں خصوصیت ہے، موضوع اور ہیئت کی بنیادی جہتیں ہوں، جذبات واحساسات کی خوش خرامی ہو، انداز بیان کی پرکیف رنگینی ہو، فکر رسا کی گل افشانی ہو، اخلاق کی دلبری ہو یا آدم گری اور کردار سازی کی پرپیچ راہیں ہوں، لب ولہجہ کی متانت ہمیشہ قائم رہے گی، اور اعتدال وجامعیت کا رنگ ہمیشہ نمایاں رہے گا، اور اسلوب بیان خوش اسلوبی کے ساتھ اپنا گہرا اور دیرپا اثر چھوڑے بغیر نہیں رہے گا، شاید یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آپ کے اکثر فقروں میں شاعرانہ تب وتاب اور خطیبانہ رنگ وآہنگ ہوتا ہے جو دھیرے دھیرے قاری کے سرد جذبات کو تپاتا رہتا ہے۔

آپ کا اسلوب عطر مجموعہ ہے

مولانا کی شخصیت کی اٹھان، ان کے مزاج ومنہاج کی تشکیل اور ان کے جامع دینی تخیل میں جن اسباب وعوامل کا حصہ ہے، ان میں ان کے دینی گھرانے کا موحدانہ اور حقیقت پسندانہ دینی مزاج بھی ہے، ان کے بڑے بزرگوں اور مربیوں کی مومنانہ تربیت اور پدرانہ شفقت کی تاثیر بھی ہے، حکمت ولی اللّٰہی اور سوز علم اللّٰہی کے سرچشمۂ انوار کا فیض بھی ہے، بزرگانِ قریۃ الصالحین (دائرہ شاہ علم اللہ تکیہ کلاں) کے آداب سحرگاہی اور سید احمد شہیدؒ کے جذبۂ شہادت کا اثر بھی ہے، صاحب نزہۃ الخواطر کی تبحر علمی اور علامہ سید سلیمان ندویؒ کی بالغ نظری بھی ہے، قرآنی تعلیمات کی پاکیزہ روح اور اس کا جلال وجمال بھی ہے، سیرت طیبہ کی دلآویزی اور اس کی اثر آفرینی بھی ہے۔ اہل دل کا جذب وکشش بھی ہے، اپنے ماحول کا منظر اور پس منظر بھی ہے، اغیار کی غلامی سے نفرت بھی ہے، سقوط خلافت کا زخم بھی ہے، عالمی استعماری استبدادیت سے غیظ وغضب کا لاوا بھی ہے، جام شریعت بھی ہے اور سندانِ عشق بھی ہے۔ میدان کارزار کی گرمی بھی ہے اور محفل شعر وسخن کا خداداد ذوق بھی — پھر اس سب کے ساتھ ان کی اپنی شریفانہ خو ہے۔ طبیعت کی نرمی ہے، ان کے اخلاق کی رفعت ہے، ان کی تواضع اور وضع داری ہے، آپ کا ذوق نظر اور سوز دروں ہے، علم کی گہرائی اور شخصیت کی دلآویزی ہے،

جامعیت کا کمال ہے اور بے ہمہ و باہمہ ذات کا حسن کردار ہے، ان میں پہاڑوں کا شکوہ بھی ہے اور دریاؤں کا اضطراب بھی، متحرک زندگی کی سعی و تڑپ بھی ہے اور تحقیق و جستجو کا پرسکون ماحول بھی ان ہی متنوع اور رنگا رنگ پھولوں کے رس نے آپ کی شخصیت کو عطر مجموعہ بنادیا ہے اس عطر مجموعہ کی خوشبو آپ کے طرز زندگی میں اور اسلوب نگارش میں بسی ہوئی ہے۔

مولانا احساس جمال اور کیفیات حسن کے دلدادہ ہیں، وہ ایک حساس اور باشعور انسان ہیں اس لئے ان کی قوتِ وجدان حسن و جمال کا خوب ادراک کرتی ہے، انسان کی روح اور کائنات کی روح میں بڑی مماثلت ہے، جو انسان اپنی روح کو کائنات کی روح سے اور اپنے ذوق جمال کو کائنات کے حسن و جمال کے ہم آہنگ کرپاتے ہیں، وہ اپنی غایت تخلیق کے اعتبار سے خلیفۃ اللہ ہونے کا حق ادا کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں، اگر انسان اپنے جوہر ذاتی اور اس کے حسن کے ادراک کی جستجو میں لگ جائے تو یہ جستجو اسے خالق کائنات اور حسن ازل سے روشناس کراتی ہے۔ مولانا کا یہ تصور حسن و عشق، احساس بندگی کے گہرے شعور سے رونما ہوتا ہے اور احسان کی کیفیت سے نکھرتا ہے، لہٰذا جو تصورِ حسن و عشق اس روح سے تابندگی حاصل نہ کرسکے وہ مفلوج حسن ہوگا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں:-

"مولانا احساس جمال اور حسن کی کیفیات کے دلدادہ ہیں، مگر زندگی کی تازگی، قلب واضطراب سے عاری فن کو مفلوج سمجھتے ہیں۔" لے

مولانا کے اسلوب میں سلاست، حلاوت و قوت، ان کی روح کی لطافت، ان کی حمیت و غیرت ان کی طبیعت کا جوش، ان کے جذبات کی فراوانی ان کے قلب کی پاکیزگی، ان کی باطنی کیفیت و سرمستی، ان کے یقین و خود اعتمادی کا نتیجہ ہے۔ شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے مکتوبات کی ادبی تاثیر کے پہلو کو اجاگر کرتے ہوئے حضرت مولانا خود اس حقیقت سے پردہ اٹھاتے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ اس اقتباس کا لفظ لفظ آپ کی شخصیت کے لئے آئینہ بن گیا ہے فرماتے ہیں:-

"ادب و انشاء کے سلسلہ میں عام مؤرخ و نقاد اس حقیقت کو نظر انداز کردیتے ہیں کہ تحریر کی قوت، کلام کی تاثیر اور قبول عام اور بقائے دوام کے لئے سب سے زیادہ معاون عنصر لکھنے والے کی اندرونی کیفیات، اس کا یقین، دلی جذبہ، کسی حقیقت کے اظہار کے لئے اس کی بے چینی اور بے قراری ہے، ایسے کسی شخص کو جو اس اندرونی کیفیت سے سرشار اور اس کو دوسروں میں پیدا کرنے کے لئے مضطرب و بے قرار ہو، جب قدرت کی طرف سے ذوق سلیم بھی عطا ہو، الفاظ و اسالیب بیان پر ضروری حد تک قدرت بھی حاصل ہو اور اس کی تحریر میں علم و ادب، عقل و استدلال اور حسن بیان کے ساتھ سوزِ دروں اور خونِ جگر بھی شامل ہو تو اس کی تحریر میں ایسا زور پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے زمانے میں ہزاروں دلوں کو زخمی کرتی ہے اور سیکڑوں برس گذر جانے کے بعد بھی اس کی تازگی و زندگی اور اس کی تاثیر و قوتِ تسخیر قائم رہتی ہے۔" ٢ے

مولانا کلام نرم و نازک سے دل کے تاروں کو چھیڑنا اور پھول کی پتی سے ہیرے کے جگر کو کاٹنا خوب جانتے ہیں، سوئے ہوئے جذبات کو بیدار بھی کرتے ہیں مگر سو کر اٹھنے والے کو جذبات کی رو میں بہہ جانے کے لئے چھوڑ نہیں دیتے بلکہ اس کی باگ کو بڑی دانشمندی (WISDOM) کے ساتھ علم نبوت کے ہاتھ میں تھما دیتے ہیں — مولانا کے احساس بندگی، احسان کے رتبۂ بلند پر پہونچنے کی تابندگی، زندگی کی اعلیٰ قدروں کی بازیافت مقصدیت کی بلندی، فکر اسلامی کے احیاء کی جدوجہد، اور اسلامی مزاج کی تشکیل جدید، پھر اپنی گہری علمیت کے ساتھ ساتھ گلشن ادب اور ذوق جمالیات سے فطری لگاؤ نے تاریخی، ادبی اور اسلامی ادب کا ایک نیا گلدستہ سجا دیا ہے جہاں حسن کے عناصر اربعہ (اتقان، توازن و ہم آہنگی پاکیزگی اور بوقلمونی) کی جھلک نظر آتی ہے۔

مولانا کا اسلوب ان کے فکر کے تناظر میں

مولانا کی تاریخی اور فکری شخصیت کا دلکش سراپا ان کے ادبی اسلوب میں پنہاں ہے اس لئے ہم ان کے تاریخی اور فکری ادوار کو اسلوب حیات یا طرز نگارش کے تناظر میں تین مرحلوں میں تقسیم کرتے ہیں اگرچہ اس تنوع کے باوجود ان کی شخصیت کی طرح ان کے اسلوب میں بھی یک رنگی اور یکسانیت ہے۔

دور اول:- یہ دور آپ کے عہد شباب سے شروع ہوتا ہے، اسی دور شباب میں "سیرت سید احمد شہید" اور "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" (انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر) جیسی معرکۃ الآرا تصنیفات سامنے آئیں، اس دور کی فکر میں جاہلیت جدیدہ کے رخ سے نقاب ہٹا کر اس پر برملا تنقید کی گئی اور اسلام کو ایک مکمل نظام حیات اور تہذیب و تمدن کی حیثیت سے پیش کیا گیا، معبودان باطلہ (اپنے وسیع تر مفہوم میں) کے خلاف اعلان جنگ کرتے ہوئے اسے مکمل طور پر اسلام کا حریف و رقیب گردانا گیا،

"سیرت سید احمد شہیدؒ کی تصنیف کو مسلمانوں کی اپنی کھوئی ہوئی عظمت رفتہ کی بازیافت کے لئے ایک مثالی کردار اور نشان منزل (SIGN POST) کی حیثیت سے پیش کیا گیا۔

دور ثانی :۔ دور لاؔ اور الاّ کی زبردست آویزش وکشاکش میں جاہلیت جدیدہ پر برملا تنقید اور مجاہدانہ وانقلاب آفریں اسپرٹ کے مقابلہ میں دعوت وعزیمت اور ارشاد واصلاح کی اہمیت جتلائی گئی، اس موقف کی تائید میں تاریخ دعوت وعزیمت اور متعدد اہل اللہ کے سوانحی تذکرے پیش کئے جاسکتے ہیں۔

تیسرا دور :۔ اس دور میں پیام انسانیت کے پلیٹ فارم سے انسانی اور اخلاقی قدروں کے احیا، پر توجہ مرکوز کی گئی، اگرچہ اس کا عملی خاکہ آزادی ہند کے چند برسوں بعد ہی سامنے آگیا تھا مگر پچھلی صدی کی ساتویں دہائی کے بعد سے اس میں رنگ بھرنے کی رفتار تیز ہوگئی تھی۔

ان فکری مراحل حیات کے شفاف آئینہ میں آپ کی دلآویز وجامع شخصیت کے جلال وکمال کو اور اس کی سطح پر جھلکنے والے اسلوب کو صاف محسوس کیا جاسکتا ہے۔

عہد شباب کے اسلوب کا نمونہ

"سیرت سید احمد شہید" گیارہ سو صفحات پر پھیلی ہوئی ۲۴ سال کی عمر کے ایک جواں سال قلم کی دین ہے، تذکرہ سید احمد شہیدؒ کا جن کی اصلاحی اور تجدیدی کوششوں نے لوگوں کی زندگیوں میں وہ انقلاب برپا کردیا کہ صحابہ کرامؓ کے عہد زریں کی یاد تازہ ہوگئی اور جن کی نظیر امارت اور خلافت حکومت نے صدیقؓ وفاروقؓ کی تاریخ دہرادی، پھر قلم اس فرشتہ صفت انسان کا جس نے اس پاک طینت انسان کی محبت وعشق کے تسنیم وکوثر کا جام وسبو عہد طفلی ہی سے لنڈھایا تھا اور جس کے حرارت اور جوش وولولہ اس کی حمیت دینی اور غیرت اسلامی کو لو پہونچاتی رہی تھی، ان عناصر کے ساتھ زبان وبیان کی خداداد طاقت، موضوع سے حد درجہ شیفتگی، راہ سلوک کے رموز واشارات کے ذوق آشنا، کتاب سوانح وتذکرہ نگاری کا اعلی نمونہ اور تصنیف وتحقیق کا پیکر مجسم بن کر ایمان افروز بن گئی جس کی سطر سطر الفاظ کا جادو جگاتی اور فکر کی بالیدگی پیدا کرتی ہے، یوں پوری کتاب وجدانی کیفیات کا شاہکار بن گئی ہے، نہ معلوم کتنے انسانوں نے کتاب پڑھی اور اپنے گرم گرم آنسوؤں سے دامن تر کئے (مولانا محمد منظور نعمانیؒ کے الفاظ کہ" اسے پڑھ کر اپنے اندر ایک آگ سی بھڑک گئی" مولانا مودودیؒ کو پھانسی کی سزا سنائی گئی تو یہ کتاب زیر مطالعہ رہی) کتاب کے صفحات پڑھتے جایئے اور دل ودماغ کو روشن کرتے جایئے، مواد، ہیئت، وحدت اور حقائق ومعارف کی پردہ کشائی ہر زاویہ سے ایک مکمل تصنیف اور علمبرداران اسلام کے لئے ایک نادر تحفہ، یہاں زندگی بخش اور دلآویز اسلوب کا ایک نمونہ پیش کیا جاتا ہے:

"اسلام کی تحریک ایک جاوداں تحریک ہے، جو زمان ومکان کے حدود وقیود سے آزاد ہے، جو آفتاب کی طرح ڈوب کر ابھرتی ہے اور شمع کی طرح کشتہ ہوکر بھڑکتی ہے، وہ ہر زمانہ میں خدا کے معجزات ظاہر کرسکتی ہے، اس کے عجائب غیر متناہی ہیں.....

یہ زمانہ بعض حیثیتوں سے کام کرنے کے لئے زیادہ موزوں ہے اور آج کام کرنے والوں کو وہ سہولتیں حاصل ہیں، جو پہلے حاصل نہ تھیں، زمین صاف کرنے کا بہت سا کام ہوگیا ہے، دماغوں کی بہت سی الجھنیں دور ہوگئی ہیں، بہت سے اسلامی حقائق جو پہلے اسرار ورموز تھے اب زبان زد خاص وعام ہیں، اوہام وخرافات کا طلسم ٹوٹ چکا ہے، رسوم وبدعات کی جڑیں بھی اب زمین چھوڑ چکی ہیں، جاہلیت کے بہت سے مورچے اور قلعے بھی متزلزل ہوگئے ہیں، شرک ووثنیت کی غیر معقولیت اب پہلے سے زیادہ واضح ہوچکی ہے، تکفیر کا فتنہ اپنا پورا زور صرف کرکے نڈھال ہوچکا ہے، اسلامی نظام زندگی کا واضح تصور سامنے آتا جاتا ہے۔ اسلامی حکومت اور حکومت الٰہی کے الفاظ جو پہلے غیر مفہوم اور کانوں کے لئے غیر مانوس تھے اب زبانوں پر ہیں، کسی تحریک کی اشاعت اور کسی جماعت کی تنظیم کے وسائل اور مواقع پہلے سے بہت زیادہ ہیں، عملیت، روحانیت اور للہیت کی بیشک کمی ہے اور یہ صحیح اسلامی تحریک کی بنیاد اور اسلامی جماعت کی روح ہے، لیکن قرآن وحدیث کے صحیفوں کی موجودگی اور ایسے انسانوں کی موجودگی میں جو قرآن وحدیث کے صحیفہ ناطق ہیں یہ کمی پوری کی جاسکتی ہے، ان چراغوں کی لو سے اپنے بجھے ہوئے دیئے روشن اور ان کے سینوں کے تنور سے اپنے دل کی بجھی انگیٹھیاں گرم کی جاسکتی ہیں، بعض گذشتہ بزرگوں کی سیرت میں بھی یہ خاصیت ہے، کہ ان کی گرمی صدہا انسانوں تک منتقل ہوجاتی ہے، یہ سیرت بھی اسی سلسلہ کی ایک چیز ہے"

نوجوانان اسلام کو ایک انقلابی شان سے اٹھنے، اپنے اندر حرکت وعمل پیدا کرنے اور

زمانہ کے رخ کو بدل دینے کا سبق سکھاتے ہوئے اپنے مخصوص صوت و آہنگ میں فرماتے ہیں:۔

" وہ خود بدلنے کے بجائے زمانے کو بدلنے کی ہمت کریں ؎

ناز کیا جو بدلا ہے زمانے نے تجھے
مرد وہ ہیں جو زمانے کو بدل دیتے ہیں

سلطنتوں کو فتح کرنے کا حوصلہ کریں کہ نوجوانوں نے یہ بھی کیا ہے، جسم کی آرائش و زیبائش چھوڑ کر بزم جہاں کی آرائش کی فکر کریں، اور دیکھیں کہ کیا چیزیں کم ہیں کہ پوری کر دیں، کیا رخنے ہیں کہ بھر دیں، کیا چیزیں بیکار ہو گئی ہیں کہ نکال دیں۔" سکہ

فکر اسلامی کے انقلابی تصور کا اظہار یوں فرماتے ہیں:۔

" اسلام کی خدمت اور نوع انسانی کی سعادت کا ایک ہی لائحہ عمل ہے اور وہ وہی ہے جس کے مطابق جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کے خلفائے راشدین اور بعض مجددین ملت نے عمل کیا یعنی دنیا میں اسلامی شریعت اور خلافت کا نظام قائم کرنا اور اسلام کے اخلاقی، روحانی، مادی، سیاسی غلبے کی کوشش کرنا۔" ۵ہ

سیرت سید احمد شہیدؒ کے بعد دوسری انقلاب انگیز تصنیف " ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" (اردو ترجمہ "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر") منظر عام پر آئی، اب آپ کی عمر لگ بھگ تینتیس سال کی ہوا چاہتی تھی، مولانا عبد اللہ عباس ندوی مصنف "میر کارواں" نے اس دور کو " زندگی کے انقلابی مراحل" سے تعبیر کیا ہے۔

یہ ایک تجزیاتی، تحقیقی اور معروضی اسلوب کا شاہکار ہے، یہ کتاب تاریخی حقائق، فلسفۂ تاریخ، اسلامی نقطۂ نظر سے تاریخ نویسی، اسلامی نشأۃ ثانیہ کی جد و جہد اور حیات انسانی کی فکری، تہذیبی اور تمدنی ارتقار کی ایک جامع اور وسیع و وقیع دستاویز بن گئی ہے، معروضی بحث و تحقیق کے ساتھ ساتھ ادب کی جمالیاتی کیفیت فکر کی لطافت، رواں اور شگفتہ زبان اور پختہ اور واضح اسلوب کا اعلیٰ نمونہ قرار پائی ہے۔ ڈاکٹر شکری فیصل جنہوں نے رسالہ " الثقافۃ" میں کتاب پر جی کھول کر تبصرہ کیا ہے، کہتے ہیں:۔

" حقیقت تو یہ ہے کہ کتاب کا ایک خاص وصف اس کا یہی واضح اسلوب ہے، اور شاید اسلوب کی یہی شگفتگی، عقیدہ و نظریہ کے نکھار اور اس پر ایمان و یقین کا عکس ہے۔ اس کے علاوہ یہ اسلوب بہت پختہ اور متین ہے، مصنف قرآن مجید سے استشہاد پر پوری طرح قادر ہیں.... عربی ترکیبوں کا بہترین استعمال، عنوانات کا لاجواب انتخاب اور تنوع اور ہر چیز کو اپنی جگہ رکھنا گویا وہ اسی کے لئے تھی، یہ سب باتیں ایک متین، پختہ اور شگفتہ اسلوب کی نشانی ہیں۔" ـہ

ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

" یہ کتاب اس قابل ہے کہ مشرق کا کوئی گھر اس سے خالی نہ رہے، اور ہمارا کوئی نوجوان اس کے مطالعہ سے محروم نہ رہے۔" ؎

وہ کتاب جس میں فکری و تاریخی حقائق اور جمالیاتی ادب ایک دوسرے سے یوں پیوست ہوں جیسے گلاب میں خوشبو اور شکر میں مٹھاس، وہاں کوئی شگفتہ معیاری اور بلیغ زبان کا نمونہ کاٹ کر جدا کرنا بیحد مشکل کام ہے تاہم ایک نمونہ جو تمثیل و تشبیہ کا عمدہ شاہکار ہے پیش کیا جاتا ہے، مولانا " انسانی سعادت کے لئے عربوں کی قربانی" کی ضرورت کا احساس دلاتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

" دنیا کی سعادت و کامرانی کی منزل تک پہونچنے کے لئے ضروری ہے کہ مسلمان نوجوان اپنی قربانیوں سے ایک پل تعمیر کریں، اس پل پر سے گزر کر دنیا بہتر زندگی کی منزل تک پہونچ سکتی ہے، زمین کھاد کی محتاج ہوتی ہے، لیکن انسانیت کی زمین کی کھاد جس سے اسلام کی کھیتی برگ و بار لاتی ہے وہ وہی انفرادی خواہش و ہوس ہے جس کو مسلم نوجوان اسلام کا بول بالا کرنے اور اللہ کی زمین میں امن و سلامتی پھیلانے کے لئے قربان کریں۔ آج انسانیت کی افتادہ زمین کھاد مانگتی ہے، یہ کھاد آرام و راحت کے مواقع، انفرادی ترقی کے امکانات اور عیش کے اسباب ہیں جن کو مسلمان بالخصوص عرب اقوام قربان کر دینے کا ارادہ کر لیں، چند انسانی جانوں کی جد و جہد اور ان کی قربانیوں سے اگر انسانی گلہ آگ کی راہ سے نکل کر جنت کی راہ پر لگ جاتا ہے تو یہ بڑا سستا سودا ہے۔" شہ

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ " سیرت سید احمد شہید" ایک ایسا تاریخی، ملی اور ادبی ریکارڈ ہے جس میں اسلامی نشأۃ ثانیہ کی انقلابی و جہادی کوششوں اور عظمت رفتہ کی بازیافت کے سارے اسباب و وسائل یکجا کر دیئے گئے ہیں، مولانا انسانیت کے ہمہ گیر بگاڑ پر جب نظر ڈالتے ہیں تو حقیقت کا ادراک کر لیتے ہیں، اسی کتاب کی ابتدا میں فرماتے ہیں:۔

"اس کو (دنیا کو) محسوس ہوکر حالات میں کوئی بڑی تبدیلی اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک دنیا کی قیادت، مادہ پرست اور نا خدا ترس انسانوں کے ہاتھ سے نکل کر خدا شناس اور خدا ترس انسانوں کے ہاتھوں میں نہ پہونچ جائے، جو پیغمبروں پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کی ہدایات اور تعلیمات سے روشنی اور رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔" ۹؎

مولانا نے اس حقیقت کا اظہار اپنی تحریروں اور تقریروں میں بار بار کیا ہے کہ "ادب کی طاقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، ادب ایک آلہ ہے تعمیر کا بھی اور تخریب کا بھی، وہ ذہنوں کو بناتا بھی ہے اور بگاڑتا بھی ہے.... ادب کی بڑی خاصیت و قوت یہ ہے کہ وہ رجحانات اور میلانات اور عمل، طرز فکر، اخلاق اور انقلاب کے محرکات پیدا کرتا ہے..... اس لئے اس کو کسی حال میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔" ۱۰؎

اور مولانا نے اس عظیم طاقت کو قطعاً نظر انداز نہیں کیا اور نہ کر سکتے تھے کہ آپ زندگی کا ایک واضح نصب العین رکھتے تھے اور زندگی بھر اس کے احیاء کے لئے کوشاں رہے، ادب اسی اعلیٰ ترین نصب العین کے لئے ہتھیار کا کام کر رہا تھا۔

سچ تو یہ ہے کہ زیر نظر تصنیف میں صاحب تصنیف کی شخصیت کی لطافت، موضوع اور حقیقت میں موزونیت، عشق و ایمان کا خمیر، اخلاص کی حلاوت اور خود اعتمادی کی طاقت، متین و سنجیدہ اور معروضی و تجزیاتی پیش کش نے "از دل خیزد بر دل ریزد" کی شان پیدا کر دی ہے، اس شان و کیفیت میں آبشاروں کی روانی تو ہے مگر موجوں کی طغیانی نہیں۔ خوشبوؤں کی عطر بیزی تو ہے مگر شعلوں کی لپٹ نہیں، کائنات کا جلال تو ہے مگر برق و رعد کی کڑک نہیں، مولانا کا اصلی حسن ان کے توازن میں پنہاں ہے، وہ زمین و آسمان کے قلابے ملانا نہیں جانتے۔

تاریخ دعوت و عزیمت

تاریخ و تذکرہ نویسی آپ کے مطالعے اور ذوق و رجحان کی خصوصی جولان گاہ ہے تاریخ دعوت و عزیمت کی پانچوں جلدیں، پرانے چراغ کے تینوں حصے، تذکرہ حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادیؒ، سوانح حضرت مولانا عبد القادر رائے پوریؒ، سوانح مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ جیسی تصنیفات میں جن اصلاحی اور تجدیدی کارناموں کو اجاگر کرتے ہوئے قرطاس و قلم سنبھالا گیا ہے تو اس حسن انتخاب نے آپ کے احساس و شعور میں سرور و ابتہاج اور قلم میں زور و بانکپن پیدا کر دی ہے، ان ممتاز شخصیتوں اور مصلحانہ کارنامہ انجام دینے والوں کا تذکرہ خود مصنف کی دینی اٹھان، ان کے ذوق و رجحان اور ان کی چاہت و پسندیدگی کا آئینہ دار ہے۔

ادباء و نقاد کا خیال ہے اور صحیح ہے۔ کہ ادب کو زندگی کے تعمیری مقاصد کی تکمیل کرنی چاہئے، اسے زندگی کا نقاد و ترجمان ہونا چاہئے، اسے سماجی و تہذیبی بازیافت کا فرض نبھانا چاہئے، اسے ماضی پہ روشنی، حال کی ترجمانی اور مستقبل کے لئے صحیح اور راست پیشین گوئی کرنی چاہئے۔

پھر شاندار و ستھرے ادب کے لئے ضروری ہے کہ وہ مثبت اجتماعی خواہشات کی تکمیل کرے۔ اچھے خیالات، صحت مند تصورات پیش کرے۔ نیز اقدار و نظریات سے جدا نہ ہونے پائے ـــــ ادبی محاسن کے ضمن میں یہ امر لائق توجہ ہے کہ اس میں زبان کی سلاست ہو، بیان کی خوبی ہو، تشبیہ و استعارے کی آراستگی ہو، حسین پیرایۂ اظہار ہو، تخیل کی بلندی ہو، مسرت و لطف کی بازآفرینی ہو۔

سوانح نگاری اور تذکرہ نویسی کے ضمن میں مولانا کا پاکیزہ شعور و گہرے ادراک سے مالا مال قلم جب رواں ہوجاتا ہے تو وہ مصلحین و مجددین یا عظماء کی سیرت ہی بیان نہیں کرتے بلکہ ان کی اضطرابی روح کو زندگی عطا کر دیتے ہیں جس نے ان کو باطل کی آندھیوں کے مقابلہ میں اسلام کی شمع کو فروزاں رکھنے پر آمادہ کیا، اپنے اپنے دور کی جاہلیت کے بگولوں کا خاتمہ کیا، دین کے حقائق و معارف، دین کے مزاج و منہاج پر از سر نو اعتماد بحال کیا، شہادت حق کا فریضہ نبھایا اور اپنے علم کلام کی طاقت سے جاہلی شہ زوروں کو پچھاڑ کر دکھایا۔

تاریخ دعوت و عزیمت پر بصیرت افروز نگاہ ڈالتے ہوئے پروفیسر وصی احمد کہتے ہیں:-

"جو کچھ آپ پڑھ رہے ہیں وہ آپ کے ذہن سے اترتا نہیں بلکہ زندہ رہتا ہے، صورت اور معنیٰ، ہیئت اور مضمون بحیثیت مجموعی پوری کیفیت کے درمیان ایک توازن اور روحانی ہم آہنگی ہوتی ہے، پڑھنے والا ایک عجیب خوشگوار لذت میں مبتلا ہوتا ہے۔

حضرت مولانا کا بیان زندگی اور تاریخ کے ادراک میں کسی نقطۂ انجام کو قبول نہیں کرتا بلکہ مسلسل اپنے دائرۂ نظر کو وسیع سے وسیع تر بناتا چلا جاتا ہے ان عظیم شخصیتوں کا بیان اس طرح ہے کہ ان کے احساسات میں عظمت، جذبات میں نیکی، استدلال میں صداقت، اور

کارناموں میں حسن نظر آتا ہے، یہ وہ مقدس سلسلہ ہے جو عوام کے نفوس کو ان عظیم نفوس کے ساتھ متعلق کرتا ہے جن سے ایک مقناطیس کی طرح لہریں اٹھ اٹھ کر لوگوں کی روحانی زندگیوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کرتی ہیں، وہ جذبات جو اس کتاب کے مطالعے سے پیدا ہوتے ہیں دل کو ایسی نرمی اور دماغ کو ایسی بالیدگی بخشتے ہیں جو انسان کو پہلے سے زیادہ دیندار اور دانا بنا دیتے ہیں[13]

راست اسلوب نگارش

مولانا نے ایک طویل اور بھرپور مقصدی زندگی گزاری، آپ نے حقیقت میں مصلحانہ اور مجددانہ کوششوں کا بیڑا اٹھایا تھا، اس لئے زبان و بیان کا بھی ایک نیا اسلوب لے کر آئے تھے، یہ اسلوب احیاء اسلام کی خاطر آب و تاب اور ذوق و تپش پیدا کرنے کا ذریعہ بنا، آپ نے اپنے ذوق جمال اور فکر و فن کو دعوت اسلامی کے فروغ میں صرف کیا، یوں اردو زبان و ادب کے گیسو سنوارنے میں نمایاں کردار ادا کیا، اہل ذوق کا ایک وسیع حلقہ بنایا، جن کے اندر آپ کی علمی دینی اور فکری تحریروں سے بالغ نظری پیدا ہوئی، ذہن و دماغ میں روشن ضمیری اور بالیدگی آئی، فکر اسلامی کے ہمہ گیر تصور نے طائر خیال کو بلندی عطا کی، مناظرانہ فکر و خیال کے تنگ دائرہ سے قاری کو نکال لائے اور سوچ کی نئی جولان گاہیں بخشیں، دینی جذبات کو مہمیز لگایا، حمیت اسلامی کی لہر دوڑا دی، بربط دل کو چھیڑا اور اسے نئی رفعتیں عطا کیں، فطری جرأت، ایمان و یقین سے لبریز خود اعتمادی اور گرمی گفتار سے قاری کے لہو کو دھیرے دھیرے گرمایا، پھر راست گفتاری، مقصدیت کے رچاؤ اور اخلاص و سوز یقین کی طراوٹ نے برگ گل میں باد سحرگاہی کی نمی پیدا کر دی، خطابت میں بسا اوقات ضرب کلیمی کا بانکپن ظاہر ہوا، اس پر عوامی مقبولیت اور شخصیت کی عظمت مستزاد کہ زمانہ کی گردش جاتی رہی اور فضا میں ٹھہر کر گوش بر آواز ہو جایا کرتی تھیں۔

زور استدلال، اثر انگیزی کی طاقت وحدت موضوع اور ہیئت و معنیٰ میں اعتدال و توازن قاری کو خود اعتمادی عطا کرتا ہے اور وہ اس لذت سے سرشار رہتا ہے کہ مولانا اسے ساتھ ساتھ لے کر چلتے ہیں اور کسی مرحلہ میں بھی رفاقت سے محروم نہیں کرتے۔ عرصہ دراز تک ان کی زبانوں میں بربط دل کو چھیڑنے کی صلاحیت و قوت باقی رہے گی۔

حضرت یحییٰ منیریؒ کے علمی و ادبی مکتوبات پہ ادیبانہ و مبصرانہ تبصرہ کرتے ہوئے حضرت مولانا نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس کا لفظ لفظ خود صاحب تحریر کی شخصیت پر صادق آتا ہے کہ اسلوب شخصیت کا پرتو اور اظہار خیال حقیقت دل کا ترجمان ہوتا ہے، فرماتے ہیں:-

"بعض اہل دل کے کلام میں جو غیر معمولی حلاوت اور قوت ہے، وہ ان کی روح کی لطافت اور قلب کی پاکیزگی اور اندرونی کیفیت و سرمستی کا نتیجہ ہے۔ اور اس کے لئے وہ کسی خارجی مدد اور مقام اور وقت کے محتاج نہیں ہوتے، ان کی خوشی و سرمستی کا سرچشمہ اور ان کی دولت کا خزانہ ان کے دل میں ہوتا ہے، خواجہ میر درد نے اس پورے گروہ کی ترجمانی اس شعر میں کی ہے ؎

جائیے کس واسطے اے درد مےخانے کے بیچ
کچھ عجب مستی ہے اپنے دل کے پیمانے کے بیچ[12]

---

[1] نقوش اقبال ص۱۰۱
[2] تاریخ دعوت و عزیمت حصہ سوم ص۲۴۲
[3] میر کارواں ص۱۳۸ [4] ایضاً ص۴۶
[5] ایضاً ص۴۳
[6] ماخوذ از میر کارواں ص۳۹۳
[7] ایضاً ص۳۹۴
[8] انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر ص۲۴۹
[9] ایضاً ص۱۵
[10] کاروان ادب جنوری۔جون ۱۹۹۸ء
[11] میر کارواں ص۳۹۹
[12] کاروان ادب جولائی ۱۹۹۷ء ص۴۴
[13] تاریخ دعوت و عزیمت حصہ اول ص۲۴۴

(بقیہ) حواشی موروثی اثرات

[16] مولانا سید امین صاحب نصیرآبادیؒ اپنے جوار اور عہد کے مشہور شیخ و مصلح۔
[17] کاروان زندگی اول ص۱۲۱-۱۲۲ [18] ایضاً ص۴۸-۴۹
[19] ایضاً ص۹۴-۹۵ باختصار
[20] ایضاً ص۱۰۱ [21] پرانے چراغ اول ص۲۴۸
[22] کاروان زندگی اول ص۴۸-۴۹
[23] انتخاب و تلخیص کاروان زندگی ص۸۶-۸۷
[24] ڈاکٹر صاحبؒ، والد صاحبؒ کو میاں کہتے تھے
[25] کاروان زندگی اول ص۱۱۸
[26] کاروان زندگی اول ص۱۱۹
[28] حیات عبدالحیؒ ص۳۹۳ [27] ایضاً ص۳۹۴
[29] حیات عبدالحیؒ ص۳۹۴
[30] کاروان زندگی اول ص۳۱۴ باختصار
[31] حیات عبدالحیؒ ص۳۸۹

کتاب کی کہانی خود مصنف کی زبانی

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ ــــــ ترجمہ: فیصل احمد بھٹکلی ندوی

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ الامین وعلیٰ آلہ وصحبہ اجمعین ومن تبعہم باحسان إلیٰ یوم الدین۔

شاید بہت سے قارئین کرام کو معلوم نہیں کہ یہ کتاب (انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر) مصنف کی اولین تصانیف میں سے ہے دوسرے الفاظ میں کہا جاسکتا ہے کہ اس کتاب سے (عربی میں) اس کے تصنیفی کام کا آغاز ہوتا ہے، کتاب کی تالیف کے وقت مصنف کی عمر تیس سال کی تھی یہ ۴۵-۱۹۴۴ء کا درمیانی زمانہ ہے اور موضوع اپنی اہمیت اور عظمت کے پیش نظر اس عمر سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا تھا اور پھر مصنف کی نشو و نما اور تعلیم و تربیت جس ملک و ماحول میں ہوئی تھی وہ عربی ثقافت اور زبان و ادب کے مرکز سے ہزاروں میل دور ہے اور ابھی اسے ہندوستان سے باہر کسی سفر کا اتفاق بھی نہیں ہوا تھا، پہلا مبارک سفر جس کی اللہ نے مجھے توفیق دی وہ حج کا سفر تھا جو ۱۳۶۶ھ مطابق ۱۹۴۷ء میں پیش آیا جب کہ کتاب کی تالیف پر تین سال گذر چکے تھے، واقعہ اور حقیقت یہ ہے کہ میری عمر اور حیثیت سے بلند یہ ایک جرأتمندانہ علمی اقدام تھا اور یہ بڑی ہمت کی بات تھی کہ میں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا جس کو دراصل مجھ سے زیادہ مشاق قلم مجھ سے زیادہ وسیع عقل اور مجھ سے زیادہ طویل تجربہ کی ضرورت تھی لیکن یہ تقدیری بات تھی کہ اللہ نے یہ کتاب مجھ سے لکھوائی۔

میرے اندر اس موضوع پر کچھ لکھنے کا ایسا غیر معمولی تقاضا ہوا کہ میں اس کو ٹال نہیں سکا گویا کوئی غیبی طاقت اس موضوع پر لکھنے پر آمادہ کر رہی ہو، یہ خیال میرے شعور و وجدان پر پوری طرح سوار ہوگیا بلکہ کہنا چاہئے کہ اگر میں اس بارے میں عقل سے مشورہ لیتا اور مصنفین کے تجربات ان کے علمی مقام و مرتبہ پر اعتماد کرتا تو یقیناً مجھے اس سے پیچھے ہٹنا پڑتا، اور اگر کسی بڑے عالم و فاضل اور ادیب و مصنف سے اس کا تذکرہ کرتا تو ضرور وہ مجھے اس علمی و عقلی معرکہ آزمائی سے دور رہنے کا مشورہ دیتا، لیکن بڑا اچھا ہوا کہ میں نے کسی سے مشورہ نہیں لیا (واقعہ یہ ہے کہ موضوع میرے دل و دماغ اور اعصاب پر اس طرح چھا گیا تھا کہ مجھے کسی سے مشورہ لینے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی) اس موقع پر مجھے اقبال کا یہ شعر یاد آتا ہے وہ کہتے ہیں ؎

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

جنگ عظیم ثانی کی بنا پر عربی مصادر و مراجع جن سے اس موضوع پر استفادہ و اقتباس کی مجھے ضرورت تھی بہت کم میسر تھے، ہندوستان اور عرب ملکوں کے مابین مواصلات کا نظام درہم برہم تھا، اس لئے اس وقت عربی کا بہت کم علمی سرمایہ اور تاریخی و ادبی مراجع ہندوستان پہونچ پاتے تھے جن سے بلاد عربیہ اور بالخصوص مصر مالا مال تھا، جہاں تک انگریزی اور اردو مراجع کا تعلق ہے تو وہ کافی تعداد میں مہیا اور میری دسترس میں تھے اور خود گہوارۂ علم و ادب لکھنؤ میں بہت سے ایسے بیش بہا کتب خانے تھے۔ جہاں انگریزی کی جدید ترین (LATEST) مطبوعات اور انسائیکلو پیڈیا موجود تھے۔ ان سے میرا برابر ربط تھا میں وہاں سے کتابیں مستعار لیتا اور پڑھتا تھا اور بعض شخصی کتب خانوں سے بھی فائدہ اٹھاتا تھا۔

اس کتاب کی تصنیف و تالیف کے لئے محض توفیق خداوندی کی بات تھی کہ قریب ہی عرصہ میں یورپ کی سیاسی و اجتماعی، مذہبی و اخلاقی اور تہذیبی و ثقافتی تاریخ کا بڑی توجہ اور دلچسپی اور پوری گہرائی اور گیرائی سے مطالعہ کر چکا تھا، اور مذہب و سائنس اور حکومت و کلیسا کے مابین کشمکش کے موضوع پر بھی خاص طور سے پڑھا تھا، نیز یورپ کی اخلاقی تاریخ اس کی عہد بعہد تبدیلیاں اور وہ اسباب و محرکات جنھوں نے یورپ کو ایک خاص سانچہ میں ڈھالا تھا جس کا نتیجہ وہ مادہ پرستی تھی جس نے مغربی و مشرقی قوموں کی رفتار و کردار اور ان کے افکار پر ایک عمومی اور فیصلہ کن اثر ڈالا، یہ سب موضوعات میری نظر سے گزر چکے تھے۔

اس سے ہٹ کر میں نے اسلامی و مشرقی ممالک اس کے ادیان و مذاہب اس کی تحریکات اور فلسفے کی تاریخ، عام اسلامی تاریخ اور عربوں کی جاہلی اور اسلامی عہد کی تاریخ خصوصاً اس موضوع سے متعلق ادبی تصنیفات کا بھی مطالعہ کر چکا تھا، چونکہ میں دینی و ادبی ماحول میں پروان چڑھا تھا اور تاریخی موضوعات سے مجھ کو خاندانی طور پر مناسبت تھی اس لئے یہ کام میرے لئے نسبتہً آسان تھا اور اس کا مجھے اچھا موقع بھی میسر تھا، ندوۃ العلماء کا عظیم کتب خانہ اور بعض دوسرے شخصی کتب خانوں میں اس موضوع پر خاصی کتابیں موجود تھیں، نیز برصغیر کے نشریاتی اور اشاعتی اداروں سے

بھی میرا مستقل رابطہ تھا اور وقیع علمی اخبار و رسائل کے مطالعہ اور ان سے استفادہ کا بھی موقع ملتا رہتا تھا، اس میں اس بات کو بھی دخل ہے کہ میری ذہنی و فکری اور نفسیاتی تشکیل خاص ایسے ماحول میں ہوئی تھی جس میں اسلام کے پیغام کی حقانیت اور ہر زمانہ میں نوع انسانی کی قیادت کی صلاحیت پر غیر متزلزل ایمان تھا اور یہ کہ نسل انسانی کے امام و قائد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے، اسی کے ساتھ اس پر بھی یقین تھا کہ مغربی اقوام کے مزاج اور ان کی تہذیب کے اندر جو خرابیاں اور نقائص ہیں وہ کبھی ان سے جدا نہیں ہوں گی اور یہ مجسم صورت میں مغرب کی قیادت میں ظاہر ہو چکی ہے۔ یہ نتیجہ تھا میرے برادر بزرگ مولوی حکیم ڈاکٹر سید عبد العلی حسنی کی تربیت کا جو قدیم و جدید کے جامع اور اسلامی و عصری علوم اور اسلام کے عمیق فہم اور فکری اعتدال و توازن (جو ہر قسم کے غلو اور انتہا پسندی سے پوری طرح پاک تھا) کی ایک نادر مثال تھے۔ ان سب باتوں نے مجھے اس کا اہل بنا دیا تھا کہ میں اپنے متنوع مطالعہ سے جو بسا اوقات متضاد بھی ہوتا تھا اور (جو بہت سے پڑھنے والوں کے لئے جو ابھی فکری مراہقت کے دور سے گزر رہے ہوں ذہنی تشویش اور فکری انتشار کا باعث بنتا ہے) فائدہ اٹھاؤں اور اس سے متعین مثبت (POSITIVE) نتائج کا استنباط کروں اور قرآن مجید کی تعبیر میں "مِنْ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ" یعنی گوبر اور خون کے بیچ سے خالص دودھ جو پینے والوں کے لئے خوشگوار اور راحت بخش ہو۔ اس مطالعہ سے ہر دور میں اسلام کی قائدانہ صلاحیت پر میرا یقین بڑھتا تھا اور اس بات پر ایمان میں اضافہ ہوتا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی ــــ

دانائے سبل ختم الرسل، مولائے کل

ہیں۔ اور اپنی نوعمری، بے بضاعتی اور کم مائیگی اور موضوع کی اہمیت وعظمت، اس کے اچھوتے پن اور جدت اور اس کی نزاکت کا مجھے پورا احساس تھا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ میں نے اس طرف خود قدم نہیں بڑھایا تھا بلکہ کشاں کشاں مجھ کو لے جایا گیا۔ گویا کوئی میرے کان میں کہہ رہا تھا اور میرے دل میں ڈال رہا تھا کہ اس موضوع پر کتاب لکھنا ضروری ہے۔

اس کتاب کی طرف جو لوگوں کی توجہ مرکوز ہوئی اور بہت سے لوگ اس سے جو حیرت زدہ ہو گئے اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ یہ موضوع بالکل نیا اور انوکھا تھا" ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان پہونچا؟ کیا عالم انسانی کے انجام اور عالمی صورتحال سے مسلمانوں کا بھی کوئی ایسا تعلق ہے جس میں یہ کہنا بجا ہو کہ مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو نقصان پہونچا یا مسلمانوں کی ترقی اور انسانی قیادت کی باگ تھامنے سے عالم کو کیا فائدہ ہوگا۔

اس انداز میں کوئی یہ سوچتا ہی نہیں تھا، لوگ صرف اس طرز پر سوچنے کے عادی ہو گئے تھے کہ دنیا کی ترقی سے مسلمانوں پر کیا اثرات پڑے، اور اس کے تنزل سے مسلمان کتنے متاثر ہوئے ہیں۔ وہ مسلمانوں کو عالمی تاریخ کے آئینہ سے دیکھتے تھے یا بہت زیادہ قدم بڑھایا تو صرف اتنا کہ وہ مسلمانوں کو دیگر اقوام و ملل کی طرح ایک قوم اور ایک امت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ لیکن اس کتاب کے مصنف نے ہمت کر کے ان فرضی حدود و قیود کو توڑ دیا اور عرب و عجم کے مصنفوں اور ادیبوں کے گرد جو دائرہ کھینچ دیا گیا تھا اس روایتی دائرہ سے اس نے قدم باہر نکالا اور یہ چاہا کہ مسلمانوں کے پیمانہ سے انسانی دنیا کو دیکھے اور اس بات کا جائزہ لے کر مسلمانوں کی ترقی و تنزل اور ان کے عروج و زوال سے عالم پر کیا اچھے برے اثرات پڑے۔ ان دونوں طرز فکر اور نظریوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے ایک نظریہ وہ ہے جس سے مسلمانوں کو اس حیثیت سے دیکھا جاتا ہے کہ دنیا میں رونما ہونے والے واقعات و انقلابات سے مسلمانوں پر کیا اثرات مرتب ہوئے۔ جس طرح دوسری قومیں ہیں مسلمان بھی ایک قوم ہیں جو عالمی سطح پر پیش آنے والے واقعات سے متاثر ہوتے ہیں، عام طرز فکر یہ تھا کہ فلاں واقعہ سے مسلمانوں پر کیا اثر پڑا، فلاں حکومت کے زوال سے مسلمانوں کا کیا نقصان ہوا، مغرب کی حالیہ بیداری سے مسلمانوں کا کیا خسارہ ہوا، مغرب کے عظیم صنعتی انقلاب سے مسلمان کس سود و زیاں کا شکار ہوئے، خلافت عثمانیہ کے خاتمہ سے مسلمان کن حالات سے دوچار ہوئے۔ اسلامی ممالک کے چھن جانے اور مغرب کے ان پر تسلط جمانے سے مسلمان کس طرح بے وزن ہو گئے، معاشی پسماندگی، سیاسی پژمردگی اور فوجی ناطاقتی سے مسلمانوں کو کیسے دن دیکھنے پڑے۔

یہ ایک روایتی انداز فکر تھا جس کے لوگ عادی بن چکے تھے اس سے ہٹ کر وہ سوچنا ہی نہیں چاہتے تھے، لیکن اللہ نے میرے دل میں یہ بات ڈالی اور اس کے لئے میرے سینے کو پوری طرح کھول دیا کہ میں اس موضوع پر لکھوں کہ مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصانات پہونچے، گویا مسلمان محدود جغرافیائی حدود سے قطع نظر عالمی سطح پر رونما ہونے والے واقعات میں ایک مؤثر اور فعال عنصر (FACTOR) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کیا واقعی مسلمان اس پوزیشن میں ہیں کہ یہ کہا جا سکے کہ ان کے زوال و تنزل اور

دنیا کی قیادت ورہنمائی سے کنارہ کش ہوجانے سے انسانیت کو کچھ نقصان پہونچا۔ مجھے تو بڑا خطرہ ہے کہ بہت سے اسلامی مفکرین ومصنفین (جن کے اپنی جگہ بہت سے قابل قدر کارنامے بھی ہوں گے) انھوں نے بھی اس طرح نہ سوچا ہوگا حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تاریخ کو مسخ کرنا اور ایک تنگ زاویہ سے اس کو دیکھنا اور وہ احساس کمتری جس کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ شکار ہے، بہت سے مؤرخین ومحققین کے لئے یہ بات رکاوٹ کا باعث ہے کہ وہ مسلمانوں کے مسئلہ کو انسانیت کے مسئلہ سے جوڑ دیں، دنیا کی قیادت کے سامنے مسلمانوں کی کیا حیثیت ہے وہ کس مقام اور پوزیشن میں ہیں، وہ تو کمزور ہیں، بے بس ہیں، لاچار ہیں، مغرب کے محکوم اور غلام ہیں، جدید انقلاب کے تابع اور اس کے سامنے سرنگوں ہیں، تو کیا عالم انسانیت کے انجام کو مسلمانوں کی صورت حال اور ان کے انجام سے جوڑنا صحیح ہے؟ نہیں ایسا نہیں ہوسکتا، بلکہ بہت سے لوگ تو اس وقت یہ ماننے کے لئے بھی تیار نہیں تھے کہ مسلمانوں کی وہ حیثیت و پوزیشن ہے جس سے کسی مصنف ومحقق کو یہ حق پہونچے کہ وہ اس نقطہ نظر سے بحث کرے کہ مسلمانوں کے زوال وانحطاط سے عالم انسانی کا کیا نقصان ہوا۔ موضوع بڑی اہمیت کا حامل تھا اور اس پر کچھ لکھنا جان کو جوکھم میں ڈالنے اور کسی خطرناک وادی میں کود پڑنے کے مرادف تھا لیکن محض توفیق الٰہی نے دستگیری فرمائی۔

میں نے یہ کتاب بڑے تردد اور پس وپیش کے عالم میں لکھی اس لئے کہ میں تصنیف وتالیف کے میدان میں بالکل نو وارد تھا خصوصاً عربی زبان میں باقاعدہ تصنیف کا اس سے پہلے کوئی تجربہ نہیں تھا، میرا عربی زبان وادب سے تعلق ایک طالب علم اور زیادہ سے زیادہ ایک مطالعہ کرنے والے کا تھا جس کی پیدائش اور نشوونما عربی زبان وادب اور علوم اسلامیہ کے اصل مرکز سے بہت دور ہوئی تھی، مجھے بڑا شک تھا کہ یہ کتاب عربی اور اسلامی ملک و ماحول میں کوئی پذیرائی حاصل کرسکے گی چنانچہ میں نے اس کے مضامین کی فہرست "لجنۃ التالیف والترجمۃ والنشر" مصر کے صدر ڈاکٹر احمد امین کو بھیجی۔ جو اپنی مشہور کتابوں بالخصوص فجر الاسلام، ضحی الاسلام کی بنا پر عالمگیر شہرت حاصل کرچکے تھے اور جن کی یہ کتابیں بڑی مقبولیت حاصل کرچکی تھیں اور علمی حلقوں میں جن کی ایک گونج تھی اور میں بھی ان کا قدرداں تھا اور میں نے پوری دلچسپی کے ساتھ بغور ان کا مطالعہ کیا تھا بلکہ بہت سی جگہوں پر ان کے افکار وآرا اور پر میں نے نوٹ بھی چڑھایا تھا جن میں کہیں کہیں ان کی رائے سے اختلاف کا بھی اظہار کیا تھا تاہم کتاب کے سنجیدہ علمی اسلوب کا بڑا قدرداں تھا میں نے اس بنا پر یہ پسند کیا کہ یہ کتاب مصر کے ایسے باوقار تصنیفی ادارہ سے شائع ہو جو اپنی بلند پایہ علمی مطبوعات کی وجہ سے پورے مشرق وسطیٰ میں شہرت اور وقعت حاصل کرچکا تھا۔ تعلیم یافتہ نوجوان اور سنجیدہ بامقصد علمی تحقیقات سے دلچسپی رکھنے والے حضرات جس کی مطبوعات کو ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے، چنانچہ میں نے کچھ صفحات ڈاکٹر احمد امین کو بھیج دیئے تاکہ کتاب کے اجمالی خاکہ کا اندازہ ہوجائے، لیکن اس کا انجام میں نہیں جانتا تھا کہ کیا ہوگا، جس کا لکھنے والا ایک گمنام شخص تھا عالم عربی میں اس کا کوئی تعارف بھی نہیں تھا جس کا نہ کوئی علمی کام سامنے آیا تھا اور نہ اس کا کوئی سفارشی تھا۔

ایک دن اچانک مجھے ڈاکٹر احمد امین کا خط ملا جس میں انھوں نے مجھ سے کتاب کا کوئی نمونہ طلب کیا تھا، چنانچہ میں نے کتاب کا ایک اقتباس بھیج دیا۔

کتاب کے موضوعات، اس کے مضامین پر مشتمل ذیلی عناوین اور اس کے مباحث ڈاکٹر احمد امین کو پسند آئے۔ لیکن چونکہ یہ کتاب ایک ایسے عالم دین کے قلم سے تھی جس نے عالم عربی سے دور رہ کر تعلیم وتربیت پائی تھی۔ احمد امین کو اندیشہ ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ علمائے ازہر اور قدیم دینی اداروں کے فارغین کی طرح اس پر مذہبی اور لغوی چھاپ ہو، اس بنا پر انھوں نے مصنف سے دریافت کیا کہ کیا اس نے انگریزی مآخذ سے بھی استفادہ کیا ہے۔ جب اثبات میں ان کو جواب ملا اور مصنف نے انگریزی مراجع کی فہرست ان کو بھیجی تو انھیں کچھ اطمینان ہوا اور انھوں نے مطلع کیا کہ کمیٹی نے اس کتاب کی طباعت واشاعت کا فیصلہ کیا ہے. اور کتاب کے ادبی اور معنوی محاسن سے انھوں نے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ جس دن مصنف کتاب کو ڈاکٹر احمد امین کا یہ خط ملا وہ اس کی زندگی کے انتہائی خوشی ومسرت کے دنوں میں سے تھا، آج تک اس کو وہ فراموش نہیں کرسکا۔

اس واقعہ پر کئی مہینے گزر گئے اور مجھے اس کتاب کے انجام کی کوئی خبر نہیں تھی۔ اسی اثنا میں ۱۹۵۰ء میں دوسری مرتبہ حجاز کا سفر پیش آیا اور حسن اتفاق سے ناگہانی طور پر مجھے اس کا مطبوعہ نسخہ شامی سفیر استاد جواد المرابط کے پاس مل گیا وہ ایک فاضل وادیب تھے اور المجمع العلمی العربی دمشق کے رکن بھی، اس کا دلچسپ واقعہ ہے اس سفر میں مکہ کے طویل قیام کے دوران میرا شام کے سفر کا ارادہ ہوا چنانچہ شام کا ویزا لینے میں شامی سفارت خانہ جدہ گیا تو میں نے ویزا لینے کے بعد شامی سفیر سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی. چنانچہ سفارت خانہ کے ذمہ داروں نے میری

ان سے ملاقات کرائی۔ سفیر صاحب سے مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی، اس گفتگو میں مصر کے ادباء اور اہل قلم پر بات آئی تو ہم نے ان سے اپنے تأثر کا اظہار کیا لیکن اس کے برعکس وہ علماء ہند کی تعریف کر رہے تھے جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ان کی فکری گہرائی اور پختگی کے بڑے قدر داں ہیں انھوں نے یہ بھی کہا کہ ہندوستانی علماء اور مصنفین کی تحریروں میں جو اثر اور دلآویزی محسوس ہوتی ہے وہ ان مصری ادباء کے یہاں نہیں جو بہت شہرت رکھتے ہیں مثال کے طور پر انھوں "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" کا نام لیا جو مصر کے حالیہ سفر میں ان کے ہاتھ لگی تھی اور قاہرہ سے اس کا ایک نسخہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ انھیں معلوم نہیں تھا کہ وہ اس کے مصنف ہی سے بات کر رہے ہیں۔ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ایک غیر مشہور نوجوان مصنف کو سب سے بڑے دار الاشاعت سے شائع ہونے والی اپنی اس پہلی کتاب کو اچانک دیکھ کر کتنی خوشی ہوئی ہوگی۔ چنانچہ میں نے محترم سفیر صاحب سے چند دنوں کے لئے اس کو مستعار لے لیا، لیکن اس کے ساتھ ہی اس کو یہ بھی احساس ہوا کہ احمد امین نے کتاب پر جو چھوٹا سا مقدمہ تحریر کیا ہے اس نے کتاب کی قدر وقیمت میں اضافہ کرنے کے بجائے اس کی روح کو نقصان پہونچایا ہے۔ اس میں وہ قوت اور تاثیر نہیں تھی جس کی مصنف کو ڈاکٹر احمد امین جیسے ادیب سے ایک عظیم اسلامی اسکالر ہونے کی بنا پر توقع تھی، انھوں نے کتاب اور مصنف کتاب کے بارے میں اپنے احساسات اور تأثرات کے اظہار میں بڑی احتیاط سے کام لیا تھا۔

یہ کوئی زیادہ تعجب کی بات بھی نہیں تھی (اگرچہ مصنف کو یہ بات بہت شاق تھی) اس لئے کہ ہر مقدمہ نگار کتاب کے موضوع کا پرجوش داعی اور وکیل ہو یہ کوئی ضروری نہیں، اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ مقدمہ نگار مصنف کے فکر کے ساتھ پوری ہمدردی اور اس کے مقصد پر پورا ایمان ویقین نہ رکھتا ہو اور یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر بڑا محقق وادیب خواہ ڈاکٹر احمد امین کے درجہ کا ہی کیوں نہ ہو یہ سمجھتا ہو کہ انسانیت کو مسلمانوں کے تنزل وانحطاط اور میدان قیادت ورہنمائی سے ان کے کنارہ کش ہو جانے سے حقیقت میں کوئی بڑا نقصان پہنچا ہے، یہ تو تاریخ کے خاص قسم کے مطالعہ اور مخصوص غور وفکر کا نتیجہ ہے، ضروری نہیں کہ ہر مصنف اور محقق اس سے اتفاق رکھے۔ اس میں ڈاکٹر احمد امین کا کوئی قصور نہیں، اپنے مؤقر ادارہ "لجنۃ التالیف والترجمۃ والنشر" کی طرف سے اس کتاب کی اشاعت ان کا ہم پر ناقابل فراموش احسان ہے۔ دراصل قصور مصنف کا ہے جس نے ان سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ کرلی تھیں اور خاص تعلیم وتربیت اور خاص ماحول میں نشوونما پانے کی وجہ سے جس کے لئے وہ فکری اور علمی طور پر تیار نہیں تھے مصنف نے اس پر ان کو آمادہ کرنے کی کوشش کی تھی، پھر احمد امین جو نئی نسل کے مربیوں اور بڑے درجہ کے ادیبوں اور مصنفوں میں سمجھے جاتے تھے کو یہ خوف محسوس ہوا اور اس بارے میں ان کو معذور قرار دیا جاسکتا ہے) کہ وہ ایسے مصنف کو جس سے شخصی طور پر وہ ناآشنا تھے اور جس کی علمی سطح سے واقف نہیں تھے اور نہ یہ جانتے کہ کس نظر سے اس کے ہم وطن علماء اس کو دیکھتے ہیں انھیں اندیشہ ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ وہ اس کو وہ مقام دیں جس کا وہ مستحق نہ ہو، پھر انھیں مورد الزام بنایا جائے کہ انھوں نے اس کو اس کی قامت وقیمت سے بڑی حیثیت دی ہے۔ اللہ ان سے درگذر فرمائے اور انھیں مصنف اور قارئین کرام کی طرف سے بہترین بدلہ عنایت فرمائے، کیونکہ دراصل وہی اس کتاب کے منظر عام پر آنے اور ان روشن خیال علمی حلقوں میں اس کے پہونچنے کا سبب بنے ورنہ اگر کسی دینی ادارہ سے یہ کتاب شائع ہوتی تو جدید تعلیم یافتہ حلقہ اس کو بالکل خاطر میں نہیں لاتا۔

جنوری ۱۹۵۱ء میں مصنف کتاب کو مصر کے سفر کا موقع ملا جب کہ کتاب کی اشاعت پر دو تین مہینے گزر چکے تھے تو اس کو یہ جان کر حیرت کے ساتھ مسرت بھی ہوئی کہ علمی اور دینی حلقوں میں کتاب ہاتھوں ہاتھ لی گئی تھی۔ اور بڑی گرمجوشی سے اس کا استقبال ہوا تھا اور مصنف کی توقع سے بڑھ کر (بلکہ جس کا وہ خواب بھی نہیں دیکھ سکتا تھا) اس کو پذیرائی حاصل ہوئی تھی۔ اور جدید تعلیم یافتہ طبقوں اور اسلامی فکر کے ان حلقوں میں وسیع پیمانہ پر پڑھی گئی تھی جو اسلام کی نشأۃ ثانیہ اور مسلمانوں کی بیداری سے دلچسپی رکھتے تھے۔

مصر میں اخوان کی سرگرمیاں محدود پیمانے پر دوبارہ شروع ہو چکی تھیں اس کتاب نے ان کی کچھ مشکلات کو آسان کر دیا گویا یہ کتاب مناسب وقت پر مناسب جگہ منظر عام پر آئی۔ یہ ان کو اپنی فکر ودعوت سے ہم آہنگ محسوس ہوئی۔ امام حسن البناء شہیدؒ کی شہادت کی وجہ سے ان کا زخم ہرا تھا اور اخوان کی تحریک پر پابندی عائد کر دی گئی تھی، یہ کتاب ان کے لئے باعث تعزیت وتسکین ثابت ہوئی بلکہ اس نے ایک علمی ہتھیار کا کام دیا جس سے وہ اپنی فکر ودعوت کا دفاع کرسکیں اور اپنی بیٹری کو از سر نو چارج کرسکیں، اخوان کے ذمہ داروں نے اس کو اپنے تعلیمی وتربیتی کورس میں شامل کر لیا تھا، مطالعہ وتربیت کے حلقوں سے لے کر جیل خانوں تک میں اس کی

اشاعت ہوئی تھی، عدالت کی بحثوں اور پارلیمنٹ کی تقریروں تک میں اس سے استفادہ کیا گیا تھا۔ چنانچہ یہ فطری بات ہے کہ اخوان کے حلقوں میں کتاب کے مصنف کا بڑی محبت اور گرمجوشی سے استقبال کیا گیا۔ کتاب اس نووارد مہمان مصنف کے لئے بہترین تعارف کا ذریعہ ثابت ہوئی گویا اس نے "وزیٹنگ کارڈ" کا کام دیا، مستقبل میں اس پر اعتماد کی راہ ہموار اور اللہ کو عالم عربی میں اس سے جو دعوتی کام لینا تھا اس کے لئے میدان صاف کر دیا۔

سید قطب[1] جو مصر میں اسلامی فکر اور دعوت کے سب سے بڑے علمبردار اور ادب اسلامی کے ایک بلند مینار تھے انھوں نے اس کتاب کا بڑے ذوق و شوق سے مطالعہ کیا تھا اس کی بڑی داد دی تھی اور بڑی حوصلہ افزائی فرمائی تھی اور انھوں نے اپنے دوستوں اور شاگردوں کو اس کے مطالعہ پر آمادہ کیا تھا، اور ان کی ہفتہ وار مجلس مذاکرہ میں جو ان کے مستقر حلوان میں ہر جمعہ کو منعقد ہوتی تھی اور جہاں کسی اسلامی موضوع کو موضوع بحث بنایا جاتا تھا اس کتاب کی تلخیص اور اس پر بحث و مباحثہ بھی ہوا تھا، مصنف کو بھی ایک دن[2] اس میں شرکت کی سید قطب کی طرف سے دعوت ملی ان کے ایک شاگرد (جو جامعہ فواد الاول کے فارغ تھے) نے "ماذا خسر العالم" کی تلخیص کی تھی۔ مصنف نے اس دعوت کو بسر و چشم قبول کیا جو درحقیقت اس کی حقیر علمی اور تصنیفی کوشش کی قدردانی کی ایک علامت تھی۔ چنانچہ اس نے اس مجلس میں شرکت کی اور بحث میں حصہ لیا اور مصنف کی حیثیت سے بعض سوالوں کا جواب دیا۔

وہیں اس کے ذہن میں یہ بات آئی کہ سید قطب[1] سے کتاب پر مقدمہ لکھنے کی فرمائش کرنی چاہئے تاکہ وہ اپنے طاقتور مومنانہ قلم اور بامقصد علمی اسلوب سے اس پر مقدمہ لکھیں۔ انھوں نے اس فرمائش کو انتہائی مسرت کے ساتھ قبول کیا اور پورے جوش و جذبہ کے ساتھ مقدمہ لکھا وہ ایک ایسا طاقتور مقدمہ ہے جس میں انھوں نے کتاب کی پوری روح کھینچ لی ہے اس سے کتاب کی قدر و قیمت میں ایک وقیع اضافہ ہوا[3] اس طرح اس نقصان کا تدارک ہوا جو احمد امین کے مقدمہ سے کتاب کو پہونچا تھا۔

اسی موقع پر مصنف کے مخلص دوست اور کتاب کے خاص قدردان ڈاکٹر یوسف موسیٰ (استاد جامع ازہر اور اس کے اشاعتی ادارہ جامعۃ الازہر للتالیف والترجمۃ والنشر کے سربراہ) نے اپنی کمیٹی کی طرف سے اس کی طبع ثانی کی پیشکش کی، مصنف نے بخوشی ان کو اجازت دے دی شیخ یوسف موسیٰ نے ڈاکٹر احمد امین سے اس کی قانونی اجازت حاصل کی تھی، انھوں نے بھی از راہ کرم ایک مقدمہ تحریر فرمایا جس میں کتاب کے متعلق اپنے قلبی تاثرات اور علمی خیالات کا اظہار کیا اور کتاب کا بہترین تعارف کرایا جس کی سطر سطر سے ان کا اخلاص و محبت اور مقصد کتاب سے ان کی ہم آہنگی کا پتہ چلتا ہے[4]

علاوہ بریں مصنف کے بے تکلف دوست ڈاکٹر احمد شرباصی (جو علماء ازہر میں ایک ممتاز مقام رکھتے تھے اور اس کے فاضل اساتذہ میں سے تھے) نے ایک نجی ملاقات میں مصنف سے اس کے خاندان، ماحول، تعلیم و تربیت اور اس کی زندگی کے متعلق کچھ معلومات حاصل کیں، مصنف کو معلوم نہیں تھا کہ وہ ان معلومات کو کیا کریں گے لیکن انھوں نے اس سے اپنے مخصوص انداز میں صاحب کتاب کا تعارف کرایا اور "اخی ابوالحسن (صورۃ وصفیۃ)" کے نام سے اس کے مختصر حالات زندگی پر مشتمل ایک مضمون لکھ کر شامل کتاب کر دیا۔ مصنف کو ۱۹۵۳ء میں کتاب کی طبع ثانی کے بعد ہی اس کا علم ہو سکا اس کے بعد کتاب کے مسلسل کئی ایڈیشن نکلے اور مشرق و مغرب کی متعدد زبانوں میں اس کے ترجمے ہو کر شائع ہوئے (اس میں اردو، انگریزی فرنچ، فارسی، ترکی کے علاوہ جنوبی ایشیا کی دوسری زبانیں شامل ہیں) یہ اس کا تیرہواں قانونی ایڈیشن ہے[5]

یہ کتاب کی مختصر کہانی تھی جس کو میں نے صداقت و امانت اور صفائی اور صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے، بس اللہ ہی کا شکر ہے اور اسی کا احسان ہے۔

---

[1] اس سے پہلے راقم کے قلم سے قصص النبیین کے دو حصے اور القراءۃ الراشدۃ کے تین حصے اور مختارات من ادب العرب نکل چکی تھی مگر ان سب کتابوں کا تعلق درسی کتب سے تھا، جو ہندوستان کے عربی مدارس میں تعلیم حاصل کرنے والے مسلمان بچوں کو عربی زبان و ادب سکھانے کے لئے لکھی گئی تھیں۔ [2] یہ ۱۹ر۸ر۱۳۷۰ھ مطابق ۲۵ر ۱۹۵۱ء کا واقعہ ہے۔

[3] ان کے مقدمہ کا ایک چھوٹا سا اقتباس یہاں پیش کیا جاتا ہے تاکہ ان کی قدردانی اور حوصلہ افزائی کا کچھ اندازہ ہو جائے لکھتے ہیں:

"اس کتاب کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نے اسلام کے اصول و کلیات کو ان کے وسیع دائرہ کے اندر اور اسلام کی صحیح روح کے مطابق سمجھا ہے اس بنا پر نہ صرف یہ کتاب دینی و اجتماعی تحقیق علمی کا نمونہ ہے بلکہ اس کا بھی نمونہ ہے کہ اسلامی زاویۂ نگاہ سے تاریخ کو کس طرح مرتب کرنا چاہئے۔"

آگے لکھتے ہیں:

"اسی خصوصیت کی بنا پر یہ کتاب تاریخ نویسی کا ایک کامیاب نمونہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسلمان کو یورپ کے اسلوب نگارش سے بے نیاز

(باقی ص ۳۲۹ پر)

خاندان

اور

شخصیت ساز ماحول کے اثرات

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

والدہ صاحبہ کے تربیتی خطوط اور دعاؤں کی روشنی میں

● مولانا سید محمد واضح رشید ندوی

دل کی گہرائیوں سے نکلے سچے جذبات واحساسات کا جیسا اظہار خطوط میں ہوتا ہے وہ دوسری تحریروں میں کم ہوتا ہے خطوط میں بےتکلفی اور بے ساختگی اور تعبیر کی سچائی، کامل طور پر پائی جاتی ہے، اس میں بھی ماں باپ کے خطوط امتیازی حیثیت رکھتے ہیں جو وہ اپنی اولاد کو لکھتے ہیں، جس میں بچہ کے ذہن کی پوری رعایت رکھی جاتی ہے، اور بچہ کی ذہنی وفکری ترقی کے ساتھ یہ اسلوب بھی اس کے مطابق بلند ہوتا چلا جاتا ہے۔ علوم ومعارف، حکایتوں قصوں، اور مثالوں سے یہ مزین ہوتے ہیں۔ ان خطوط میں زندگی کے متعلق ہدایات، مسرت اور رنج کا بیان، انعام ومحرومی کا ذکر، حوادث وواقعات کا تذکرہ، اور جو کچھ گھر میں بھلا برا، مفید اور غیر مفید، پیش آتا ہے، اور زندگی کے جو مسائل ہوتے ہیں ان سب کا بے تکلف بیان ہوتا ہے۔ پھر یہ خطوط قاری پر دو قسم کے خاص اثر ڈالتے ہیں، ایک تو یہ کہ قاری کے اندر خوشی کے جذبات موجزن ہوتے ہیں، دوسرا اس کے برعکس تاثرِ غم یہ ہوتا ہے۔

چنانچہ علماء ومشائخ، قائدین وعمائدین کے تذکرے ان ماؤں کے ذکر کے بغیر ادھورے رہتے ہیں، جن کا ان کی تربیت اور نشو ونما میں اہم کردار رہا ہے اور ان کی شخصیت سازی میں اہم عنصر رہا۔ ماں کی ممتا اور شفقت، اس وقت کام آتی ہے جب باپ اپنی تمام تر کوششوں کو بے اثر دیکھ رہا ہوتا ہے۔ اس وقت ماں کی محبت اور تڑپ اپنا کام دکھاتی ہے .... اس لئے بڑی شخصیات کی شخصیت سازی کا اہم اور بنیادی سبب تلاش کرنے پر وہی عنصر نمایاں نظر آتا ہے جو ماں کے نصائح اور توجیہات سے متعلق ہے حالانکہ یہ نصائح اور توجیہات استاد، مرشد ومربی کی نصائح وارشادات سے مختلف اور الگ ہیں لیکن دل کی تپش اور آنسوؤں کی تاثیر دل کو زخمی کرکے قاری کو بیخود بنادیتی ہے۔ اسی چیز نے خطوط کی اس قسم کو ادبی حلاوت اور فنی جمال کا رنگ دے کر، ادب کی اہم قسم بنادیا۔

مخدومی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نوراللہ مرقدہٗ کی تربیت اور ان کی شخصیت سازی کے بنیادی عناصر وعوامل میں جہاں ان کے ماہرین فن اساتذہ، اور بلند پایہ مشفق مربیوں اور مشائخ کرام پر نظر جاتی ہے جن کی زمانہ اور اس کے حالات اور تقاضوں پر نظر تھی اور جو مزاج شناس اور نباض تھے، وہیں ان کی والدۂ ماجدہ کی دعائیں اور تربیت وارشاد اہم عنصر ہے جنہوں نے ابتدائے طفولیت سے لے کر زمانۂ طالب علمی اور جوانی تک پوری نگہداشت رکھی اور فکر کی اور دعاؤں کو اپنا لازمی اور بڑا وظیفہ بنایا وہ خطوط کے ذریعہ وقتاً فوقتاً جھنجھوڑتی اور زندگی میں انقلاب برپا کردینے والے جملوں کا استعمال کرتیں، چونکہ وہ شاعرہ بھی تھیں اور قادر الکلام تھیں مناجات کہتیں اور اس سے ہدایات ورہنمائی کا وہ کام لیتیں، جو ایک واعظ اور مصلح اپنے وعظ وبیان سے کم لے پاتا ہے، والدۂ ماجدہ کی آہ سحر گاہی اور نالۂ نیم شبی ہی ہے کہ جس نے ان کو ان بلند اوصاف وکردار کا حامل بنایا جس کے حامل کم ہی ہوتے ہیں۔

یہ شب بیدار اور برگزیدہ خاتون مخدومہ سیدہ خیرالنساء بہتر صاحبہ بنت مصلح کبیر حضرت شاہ ضیاء النبی حسنیؒ رائے بریلوی ہیں۔ دائرہ حضرت شاہ علم اللہؒ میں ۱۸۷۸ء میں پیدا ہوئیں اور ایک خاص علمی، دینی، روحانی ماحول میں پروان چڑھیں، یہ اس خاندان کی بی بی تھیں، جو ایک چھوٹا خاندان ہونے کے باوجود شعراء، ادباء، مصلحین اور علماء ومشائخ کی جماعت ہر زمانہ کو دیتا رہا ہے، اس نامور خاندان کے بزرگوں کی میراث، آپ میں مجموعی طور پر منتقل ہوئی جس نے آپ کی مناجات اور شعر ونثر کی کتابوں میں وہ بلا کی تاثیر اور کشش پیدا کی جس سے آپ کی مناجاتوں اور کتابوں کو بڑی قبولیت حاصل ہوئی، آپ کو قرآن کریم سے والہانہ تعلق تھا، اور اپنے ذوق وشوق سے قرآن مجید پورا یاد کرلیا تھا، تلاوت کا خاص معمول تھا، بہنیں اور سہیلیاں بھی حفظ قرآن کریم کی دولت سے بہرہ ور تھیں۔

تلاوت قرآن کریم، اور دعاؤں ومناجات نے ان کے دینی جذبات واحساسات اور اللہ کی طرف رجوع اور انابت میں جوش پیدا کیا، اس آیت کریمہ سے ...... خاص مناسبت من جانب اللہ پیدا ہوئی۔ وہ یہ ہے:-

"وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ، أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ، فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي، وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ"

(سورۃ البقرۃ الآیہ ۱۸۶)

خود فرماتی تھیں، اس آیت کریمہ کو ہم نے سوبار پڑھا، دعا میں آپ کا انہماک اور اشتغال بڑھتا ہی چلا گیا، اور اس کے نتیجہ میں اللہ کے وعدہ اور اس کی نصرت وتائید اور توفیق پر آپ کا یقین بڑھتا چلا گیا، دعا سے آپ کا ایمان ولیقین اتنا بڑھ گیا کہ یہ اعتقاد کامل طور پر پیدا ہو گیا کہ کوئی بھی چیز معمولی ہو یا غیر معمولی، اس کو انسان اپنی دعا کے ذریعہ حاصل کر سکتا ہے، یہی وجہ تھی کہ انھوں نے اپنی اولاد کو دعاؤں کا عادی بنایا، اور یہ دعا تو خاص طور پر یاد کرائی۔" اللّٰھم اٰتنی بفضلك أفضل ما تؤتی عبادك الصالحین" انھوں نے اپنے فرزند حضرت مولانا علی میاں صاحب قدس سرہ سے تاکیداً فرمایا کہ جب بھی کوئی تحریر لکھو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بعد یہ دعا لکھا کرو۔ حضرت مولانا قدس سرہ فرماتے تھے کہ یہ معمول ہمارا لکھتے وقت رہا اور یوں بھی دعا کرتے وقت اکثر یہ دعا زبان پر آجاتی تھی۔

دعائیں خوب آپ کو یاد تھیں اور بزرگوں کے واقعات اور حکایتیں ذہن نشین تھیں، جن سے وہ ارشاد وتربیت میں کام لیتی تھیں، اور معاشرے پر گہری نظر رکھتیں، مشورے دیتیں، اور خود بھی شرکت فرماتیں، چنانچہ سلائی، پکائی، صفائی، تمام امور مہارت اور سلیقہ کے ساتھ انجام دیتیں، اور یہ مصروفیات کبھی بھی ذکر وتلاوت اور دعا ومناجات میں مانع اور حارج نہ بنیں، ادبی ذوق اور تربیتی مزاج، جو کہ ایک خاندانی خصوصیت اور امتیاز رہا ہے، ان میں منتقل ہوا تھا، جس کو انھوں نے اپنی خوبیوں سے اور جلاء بخشا، نظم ونثر دونوں میں اچھی قدرت رکھتی تھیں، قلبی کیفیات اور دینی جذبات کو نظم میں ڈھالتیں، اور ان توقعات وآرزوؤں کو بھی نظم کرتیں جو انھوں نے اپنے فرزند گرامی سے باندھ رکھی تھیں، چونکہ وہ ایک دردمند اور فکرمند خاتون تھیں، اس لئے وہ ایک لڑکی کو مثالی عورت دیکھنا چاہتی تھیں جو شوہر کے لئے باعث راحت وسکون بنے، اور بیٹے کے لئے محبت نچھاور کرنے والی اور اس کے ساتھ اس کی تربیت سے غفلت نہ برتنے والی ماں بنے، اور اپنی حد تک گھریلو معاشرہ کو صحیح اسلامی معاشرہ میں ڈھال دینے والی خاتون بنے، اس کے لئے کتابیں بھی لکھیں۔"حسن معاشرت" اور" ذائقہ " کو نثر میں اور نظم میں" کلید باب رحمت" کو بڑی مقبولیت ملی۔

ادب وتربیت دونوں اعتبار سے آپ کے خطوط میں وہ دینی جذبہ اور حکیمانہ اسلوب ملتا ہے جو اثر ڈالے بغیر نہیں رہ سکتا، اس میں زندگی ہے، تحریک ہے، حساسیت ہے اور درد وسوز ہے، دنیا کا وصف بھی اور اس کے کھوٹ کا اظہار بھی، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمانہ کی خرابیوں اور فتنوں سے کس باریک بینی سے واقف تھیں اور ایک نوخیز کے جذبات کو سمجھنے میں کس درجہ حساس تھیں، ان خطوط میں جو انھوں نے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو ان کے لکھنؤ میں تعلیم کے دوران لکھے تھے، جہاں نرمی، گرمی، صراحت اور کنایہ نظر آئے گا وہیں کبھی لچکدار لہجہ اور کبھی طاقتور اسلوب میں واقعات، مثالوں کے ذکر کے ساتھ مخاطب ہوتی ملیں گی، یہ خطوط ان سخت حالات میں تحریر کئے گئے ہیں جب ان کے عظیم المرتبت شوہر مولانا حکیم سید عبد الحی صاحب حسنیؒ کا حادثۂ ارتحال پیش آیا تھا اور مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی عمر صرف نو سال کی تھی، ایسے حالات میں ایک ہوشمند اور غیور وباحمیت خاتون کو جو کرنا چاہئے تھا اس سے زیادہ وہ کرتی نظر آتی ہیں، انھوں نے اپنی ذمہ داری محسوس کی اس کا کچھ اندازہ ان کے خطوط سے کیا جاسکتا ہے جو محفوظ رہ گئے، ایک خط میں جب انھوں نے مولانا کا انگریزی کی طرف رجحان کو زور پکڑتے دیکھا تو تحریر کیا۔

" مجھے تو انگریزی سے بالکل انسیت نہیں، بلکہ نفرت ہے، مگر تمہاری خوشی منظور ہے، علی! دنیا کی حالت نہایت خطرناک ہے، اس وقت عربی حاصل کرنے والوں کا عقیدہ ٹھیک نہیں، تو انگریزی والوں سے کیا امید ؟...... علی! اگر میرے ہزاروں اولادیں ہوتیں تو سب کو میں یہی تعلیم دیتی، اب تم ہی ہو، اللہ تعالیٰ میری خوش نیتی کا پھل دے، کہ ہزاروں کی خوبیاں تم سے حاصل ہوں، اور میں دارین میں سرخ رو، نیک نام اور صاحب اولاد کہلاؤں، آمین ثم آمین "۔

انگریزی سیکھنے کا اور اسکول میں پڑھنے کا جذبہ، مولانا رحمۃ اللہ علیہ پر اس وقت طاری ہوا تھا جب مغربی تہذیب اپنے عروج پر تھی، برٹش اقتدار تھا، اور یہی تعلیم بڑے دنیوی عہدوں اور مناصب پر فائز ہونے کے لئے ضروری سمجھی جاتی تھی، اور اسی میں مہارت اور کمال کو ترقی اور مستقبل کی تابناکی کے لئے ضروری سمجھا جاتا تھا۔ اور اکثر افرادِ خاندان اسی کی طرف مائل تھے، مولانا چونکہ ایک بڑے ذہین طالب علم تھے وہ اس رجحان سے متاثر ہوئے، اور اتنے ہوئے کہ انگریزی سیکھنے کا ان پر زبردست جذبہ طاری ہوا، اس خبر سے والدہ صاحبہ کی نیند اڑ گئی، کہ کہیں نئے تہذیبی وثقافتی دھارے کی زد میں یہ نہ آجائیں، اور عصری تقاضے دینی تقاضوں پر غلبہ نہ پالیں، خود مولانا تحریر فرماتے ہیں۔

" ایک زمانہ میں میری طبیعت دینی تعلیم سے کچھ اچاٹ سی ہونے لگی اور انگریزی

تعلیم حاصل کرنے اور سرکاری امتحانات دینے کا دورہ سا پڑا، بھائی صاحب نے کسی خط میں، یا رائے بریلی کے کسی سفر میں، والدہ صاحبہ سے میرے اس نئے رجحان کی شکایت کی، اس پر انھوں نے میرے نام جو خط لکھا اس سے ان کے دلی خیالات، جذبات اور ان کی قوت ایمانی، اور دین سے محبت و عشق کا اندازہ ہوتا ہے۔

دینی علم، اور دنیوی علم کے سلسلہ میں ان کی غیرت و حمیت کا کچھ اندازہ ان کے خط کے ایک اقتباس سے بڑی حد تک ہو سکتا ہے، وہ ملاحظہ ہو:

"علی! اگر لوگوں کا عقیدہ ہے کہ انگریزی والے مرتبے حاصل کر رہے ہیں کہ کوئی ڈپٹی، اور کوئی جج، کم از کم وکیل اور بیرسٹر ہونا تو ضروری ہے، مگر میں بالکل اس کے خلاف ہوں، میں انگریزی والوں کو جاہل، اور اس کے علم کو بے سود، اور بالکل بے کار سمجھتی ہوں۔

علی! تم کسی کے کہنے میں نہ آنا، اگر خدا کی رضامندی حاصل کرنا چاہتے ہو، اور میرے حقوق ادا کرنا چاہتے ہو، تو ان سبھوں پر نظر کرو، جنہوں نے، علم دین حاصل کرنے میں عمر گذار دی ان کے مرتبے کیا تھے، شاہ ولی اللہ صاحبؒ، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ، شاہ عبدالقادر صاحبؒ، مولوی ابراہیم صاحبؒ، اور تمہارے بزرگوں میں خواجہ احمد صاحبؒ اور مولوی سید محمد امین صاحبؒ مرحوم جن کی زندگی اور موت قابل رشک ہوئی، کس شان و شوکت کے ساتھ دنیا برتی اور کیسی کیسی خوبیوں کے ساتھ رحلت فرمائی۔"

مزید لکھتی ہیں:۔

"میں خدا سے ہر وقت دعا کرتی ہوں کہ وہ تم میں ہمت اور شوق دے، اور خوبیاں حاصل کرنے کی اور تمام فرائض ادا کرنے کی توفیق دے۔ آمین۔"

ساری نصیحتوں کے بعد اس عمل پر انعام کا ذکر کرتے ہوئے خط کو یوں ختم کرتی ہیں:۔

"بہت جلد خیریت کی اطلاع دو، اور اگر دیر کروگے تو میں سمجھوں گی کہ میری نصیحت تمہیں ناگوار ہوئی، انشاء اللہ تعالیٰ رمضان شریف میں تم سے وعظ کہلاؤں گی، اللہ تعالیٰ میری خواہش سے زیادہ تمہیں توفیق دے کہنے کی، اور تمہارا کلام پر اثر اور خدا کی خوشی و رضامندی کے قابل ہو۔ آمین۔ اللّٰھم اٰتنی بفضلك افضل ما تؤتی عبادك الصالحین۔ تم خدا کی رحمت سے تیار رہو، تم نے وعدہ بھی کیا ہے"۔

ایک مکتوب میں تعلیم میں انہماک، جفاکشی اور قدیم طالبعلمانہ صفات کی تلقین کرتے ہوئے لکھتی ہیں:۔

"تمام باتوں کا شوق بے کار سمجھو، شوقین مزاج والوں سے دلچسپی نہ رکھو، طالب علموں کو صرف پڑھنا چاہئے، کپڑے پھٹے ہوں یا جوتا، کچھ شرم کی بات نہیں، بلکہ فخر کرنا چاہئے یہ حالت فلاح و بہبودی کا باعث ہوتی ہے، انھیں تکلیفوں میں علم کی قدر ہوتی ہے، عقلمند اور خوش نصیب وہ ہے، جو نایاب چیز حاصل کرے، وہ کیا ہے؟ شریعت کی پابندی۔

اس وقت کا علم عام ہے، اور ہر کسی کو میسر ہے، دو چار کتابیں لے لیں بس قابل ہو گئے، ہزاروں خطرے پیش نظر رہتے ہیں، یہ خط اگر دل چاہے، غور سے دیکھنا اور اکثر اس پر نظر ڈالتے رہنا۔"

ایک مکتوب میں بزرگوں کے طریقہ کی طرف متوجہ کرتی ہوئی لکھتی ہیں:۔

"..... اور جہاں تک ممکن ہو اگلے علماء کی سی لیاقت پیدا کرو، وہی معلومات حاصل کرو کہ کوئی بات شریعت کے خلاف نہ ہو، اور تمام مسئلوں سے بخوبی واقف ہو جاؤ، اس وقت اسی علم کی ضرورت ہے، اس وقت کے علماء کچھ نہیں جانتے، اور فتنے پیدا کرتے ہیں، میری دلی تمنا ہے کہ تم علم میں وہ مرتبہ حاصل کرو جو بڑے بڑے علماء نے حاصل کیا، جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترس رہی ہیں، کان مشتاق ہیں، دل شوق میں مٹا جاتا ہے، علی! اس سے زیادہ کوئی خواہش نہیں، اللہ تعالیٰ سے دعا کرتی ہوں کہ وہ تمہیں تمام خوبیاں عطا کرے کہ جو اس کی رضا کا باعث ہوں۔ وہی وقت آجائے۔ آمین۔"

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ خود اپنی والدہ صاحبہ کی تربیت اور نگرانی کا حال بیان فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"گھر میں کسی بڑے مرد کے نہ ہونے کی وجہ سے والدہ صاحبہ ہی میری نگرانی، اخلاقی و دینی تربیت کی ذمہ دار تھیں، مجھے قرآن مجید کی بڑی بڑی سورتیں انھوں نے اسی زمانہ میں یاد کرائیں، باوجود اس کے کہ ان کی شفقت خاندان میں ضرب المثل تھی، اور والد صاحب کے انتقال کی وجہ سے وہ میری دلداری اور ایک حد تک ناز

برداری قدرتاً دوسری ماؤں سے زیادہ کرتی تھیں لیکن دو باتوں میں بہت سخت تھیں، ایک تو نماز کے بارے میں مطلقاً تساہل نہیں برتتی تھیں، میں عشاء کی نماز پڑھے بغیر کبھی سوگیا خواہ کیسی ہی گہری نیند ہو اٹھا کر نماز پڑھواتیں، اور نماز پڑھے بغیر ہرگز نہ سونے دیتیں، اسی طرح فجر کی نماز کے وقت جگا دیتیں، اور مسجد بھیجتیں، اور پھر قرآن مجید کی تلاوت کے لئے بٹھا دیتیں، دوسری بات جس میں وہ قطعاً رعایت نہ کرتیں اور اس میں ان کی غیر معمولی محبت وشفقت حارج نہ ہوتی یہ تھی کہ اگر میں خادم کے لڑکے یا کام کاج کرنے والے غریب بچوں کے ساتھ کوئی زیادتی نا انصافی کرتا یا حقارت اور غرور کے ساتھ پیش آتا تو وہ نہ صرف مجھ سے معافی منگواتیں بلکہ ہاتھ تک جڑواتیں اس میں مجھے کتنی ہی اپنی ذلت اور خفت محسوس ہوتی مگر وہ اس کے بغیر نہ مانتیں، اس کا مجھے اپنی زندگی میں بہت فائدہ پہنچا اور ظلم وتکبر وغرور سے ڈر معلوم ہونے لگا اور دل آزاری اور دوسروں کی تذلیل کو کبیرہ گناہ سمجھنے لگا، اس کی وجہ سے مجھے اپنی غلطی کا اقرار کرلینا ہمیشہ آسان معلوم ہوا۔

والدہ صاحبہ کی تربیت کے اس انداز کا ذکر کرتے ہوئے ایک تجربہ اور مشورہ کے طور پر اس کا بھی ذکر کردینے کو جی چاہتا ہے کہ بچوں کی مذہبی واخلاقی اٹھان اور ان کے اس قابل ہونے میں کہ اللہ تعالیٰ ان سے اپنے دین کی کوئی خدمت لے یا قبولیت عطا فرمائے دو چیزوں کا بڑا دخل ہے ایک یہ کہ وہ اپنی عمر کے مطابق ظلم اور دل آزاری سے محفوظ رہیں، اور کسی دکھے دل کی آہ یا مظلوم کی کراہ ان کے مستقبل پر اثر نہ ڈالے، دوسرے یہ کہ ان کی غذا غصب وحرام اور مشتبہ مال سے پاک رہے، بظاہر اللہ تعالیٰ نے اس عاجز کے ساتھ ان دونوں چیزوں کا انتظام فرمایا، میرا ادھیال جائداد واملاک اور مشترک مال وحقوق سے عرصہ سے محفوظ تھا، والد صاحب کی آمدنی خالص طبی پیشہ کی رہین منت تھی، ویسے بھی اللہ تعالیٰ نے نہ صرف مشتبہ مشکوک مال سے بچایا بلکہ بدعات ورسوم کے کھانوں سے بھی۔

اس سلسلہ میں ایک واقعہ یاد آگیا کہ میں اپنے گھر کی ایک بڑی بوڑھی انا کے ساتھ جو پڑھی لکھی نہ تھیں اپنی پھوپھی کے پاس "خالص ہاٹ" (رائے بریلی کا ایک محلہ) جارہا تھا راستہ میں کہیں غریبوں کو کھانا کھلایا جارہا تھا (جو چالیسویں یا صدقہ کا کھانا تھا) بڑی بی نے جن کے ساتھ میں جارہا تھا وہ کھانا لیا اور وہیں بیٹھ کر کھانے لگیں، میں بچہ تھا میرے بھی منہ میں پانی بھر آیا اور میں نے شرکت کرنی چاہی، انھوں نے کہا بیٹا! یہ تمہارے کھانے کا نہیں، اور انھوں نے مجھے کھانے نہیں دیا، یہ غالباً گھر کے ماحول اور احتیاط کی اس فضا کا نتیجہ تھا جس کو وہ دیکھا کرتی ہوں گی۔

اس زمانے میں ہمارے خاندان میں ایک بڑا اچھا دستور تھا کہ جہاں کوئی ایسا غمناک واقعہ پیش آتا، دل دکھے ہوئے ہوتے یا کوئی پریشانی کی بات ہوتی تو "صمصام الاسلام" سنی جاتی، یہ مشہور مؤرخ واقدی کی مشہور کتاب "فتوح الشام" کا پچیس ہزار اشعار میں ترجمہ ہے، اور یہ ترجمہ اور نظم ہمارے ہی خاندان کے ایک بزرگ میرے والد صاحب کے حقیقی پھوپھا منشی سید عبدالرزاق صاحب کلامی کی لکھی ہوئی ہے، جوش وخروش سے بھری ہوئی، درد واثر میں ڈوبی ہوئی جنگ کا نقشہ ایسا کھینچتے کہ دل جوش سے اچھلنے لگتے اور نبض تیز ہوجاتی۔ شہادت کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ خود راہ خدا میں جان دینے کے لئے دل بے تاب ہوجاتا ہے، اور صحابۂ کرامؓ اور مجاہدین کے غم کے سامنے آدمی اپنا غم بھول جاتا ہے، میری بڑی خالہ مرحومہ صالحہ بی جو قرآن مجید کی بھی حافظ تھیں یہ منظوم "فتوح الشام" بڑے پر اثر اور دلکش لہجہ میں پڑھتی تھیں اور پڑھتے پڑھتے کتاب ان کو بہت رواں ہوگئی تھی عموماً عصر کے بعد یہ مجلس ہوتی، بچے بھی کبھی اپنی ماؤں کے پاس کھیلتے کھیلتے یا کسی پیغام کے لئے آجاتے اور بے ارادہ کچھ دیر ٹھہر کر سنتے، کبھی بالارادہ بیٹھ جاتے اور کبھی مائیں اپنے پاس بٹھا کر سننے کا موقع دیتیں پھر جب اس میں لطف آنے لگتا تو کھیل چھوڑ کر اس مجلس میں شریک ہوتے۔"

والدہ صاحبہ کے دعا کے اہتمام اور اس کے ذوق وشوق کے بارے میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:۔

"ان کو ہر دعا پر اعتماد اور اللہ تعالیٰ کی رحمت پر ناز بھی بہت تھا، اچھے اچھے لوگوں میں

(باقی صفحہ ۲۹۴ پر)

چچا میاں رحمۃ اللہ علیہ

کیا دیکھا؟ کیسا پایا؟

مولانا سید محمد طاہر منصور پوری
سابق مددگار ناظم ندوۃ العلماء

چچا میاں (مخدوم گرامی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ) سے ہمارے تعلق کی ابتدا ۴۸-۱۹۴۹ء سے ہے جب انھوں نے ہم کو حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں دیکھا تھا۔ پھر شیخ رح کے ہی ایما پر ہم لکھنؤ ندوہ آگئے، اور یہاں چچا میاں کو خوب قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ ان کی قربانی، مجاہدہ، مشقت، اور عسرت کا زمانہ تھا دارالعلوم ندوۃ العلماء سے تنخواہ لینا بند کر چکے تھے، اور ادارہ ان کی خدمات سے فائدہ اٹھا رہا تھا۔ ضرورت پڑنے پر قرض لیتے، اور یہ دوسروں کے کام آتا، خود صبر سے کام لیتے اور مجاہدہ کرتے، اسی عسرت کے زمانہ کا حال ہے کہ فجر کی نماز پڑھنے کے بعد ٹہلنے نکل جایا کرتے، اور وہاں سے اتنی دیر میں آتے تھے کہ لوگ سمجھیں کہ ناشتہ کر چکے ہیں۔ آتے ہی درجہ کا وقت ہو جایا کرتا تھا، اور وہ درجہ چلے جاتے تھے، ہمیں شبہہ ہوا اور پھر یہ تقاضا ہوا کہ آپ کے لئے ناشتہ تیار کر کے لے چلیں جب ہم ناشتہ لے کر پہونچتے ہیں، تو ان کو ناشتہ نہ کرنے کی وجہ سے اس حال میں دیکھتے ہیں کہ وہ اس قدر کمزوری محسوس کر رہے تھے کہ اٹھنا مشکل ہو رہا تھا، اتفاق سے اس دن اور دنوں کے مقابلہ میں ناشتہ کی زیادہ حاجت تھی، چنانچہ وہ بڑے ہی خوش ہوئے، اور دعائیں دیں، کھایا بھی خوب رغبت سے، اور پھر کبھی اس واقعہ کو بھولے نہیں۔ ان کا ایک بڑا وصف یہ بھی تھا کہ کوئی ان کے ساتھ ذرا بھی خیر کا معاملہ کرتا تو وہ اس کے ساتھ بہت کچھ کرنا چاہتے، اور اس پر مستزاد اس کے احسان کو برابر یاد رکھتے۔ اور موقع موقع پر اس کا تذکرہ بھی کرتے، ہمیں جو اللہ نے یہ توفیق دی اس پر ہم اس کا شکر ادا کرتے ہیں۔

اسی زمانہ میں ہم کو ان کے قرآن کریم کے درس میں شرکت کا موقع ملا، "مطالعہ قرآن" کے سلسلہ میں وہ نوٹ لکھایا کرتے تھے، جو ہمارے پاس محفوظ رہے اور بعد میں "مطالعہ قرآن کے اصول ومبادی" کے نام سے کتاب کی صورت میں مکتبہ اسلام لکھنؤ سے شائع ہوئے۔

جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ وہ شروع ایام میں مالی اعتبار سے خاصی پریشانی سے دوچار رہے، جس کی وجہ سے مقروض رہنا پڑتا تھا۔ لیکن دعوتی، تبلیغی، اصلاحی اسفار میں فرق نہیں آنے دیتے تھے۔ قرض لیتے اور جہاں کا تقاضا ہوتا وہاں کا رخت سفر باندھ لیتے، اپنے شیخ ومرشد کی خدمت میں رائے پور بھی آمدورفت رہتی، کرایہ تک کے پیسے نہ ہوتے تھے، لیکن حضرت رائے پوریؒ کو دیکھا وہ ان کا بہت خیال کرتے تھے۔ اور واپسی کے وقت کچھ نہ کچھ دے کر ان کو رخصت کرتے تھے، جبکہ چچا میاں اپنا یہ حال بالکل ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے، لیکن حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو اکثر ادراک ہو جایا کرتا تھا۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو چچا میاں سے اس قدر تعلق تھا کہ جب وہ سفر سے آتے تھے تو حضرتؒ خلوت خانہ میں بلا کر بڑی تفصیل کے ساتھ حالات سنتے۔ اور بڑی مسرت اور خوشی کا اظہار فرماتے، اور اس کی ترغیب فرماتے کہ باہر کے جتنے مواقع ملیں ان سے فائدہ اٹھایا جائے۔ حضرتؒ کے ہی ایماء پر "قادیانیت" کتاب لکھی۔ حضرتؒ کی طرف سے خدام کو یہ تاکید تھی کہ "علی میاں" کا الگ کمرہ میں انتظام کیا جائے۔ جہاں کوئی بھی شخص خلل انداز نہ ہو۔ کھانے پینے کا نظم ان کا وہیں الگ رہے۔ ادھر ان کا یہ معمول تھا جو کچھ روز لکھتے تھے وہ شام کی مجلس میں سنا دیا کرتے تھے۔ اس سے حضرت کے تعلق میں برابر اضافہ ہی ہوتا گیا۔ حجاز مقدس کے سفر میں جس میں میں بھی ساتھ تھا۔ حضرت رائے پوریؒ کا چچا میاں کے ساتھ وہ تعلق دیکھا جو ماں کو اپنے بیٹے کے ساتھ ہوتا ہے، اپنے ساتھ رکھتے۔ وہ کہیں چلے جاتے تو حضرت رائے پوریؒ منتظر رہتے۔ اور بڑی محبت کا اظہار

فرماتے۔ جہاز میں حضرتؒ فرسٹ کلاس میں تھے اور چچامیاں دوسرے کلاس میں۔ حضرتؒ نے ان کو وہاں سے بلالیا اور اپنے ساتھ فرسٹ کلاس میں رکھا۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ کا تعلق بھی کم نہیں تھا، وہ جیسا معاملہ حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ اور حضرت مولانا محمد انعام الحسن صاحبؒ کے ساتھ رکھتے تھے۔ بعینہٖ ویسا ہی چچا میاں کے ساتھ بھی رکھتے تھے، کھانے میں تنوع اور اہتمام کرتے اور چاول کا التزام فرماتے۔ اور چاہتے تھے کہ کیا کیا انھیں کھلادیں اگر چچا میاں کی موجودگی میں کوئی اہم بات پیش آتی تو مشورہ میں ان کو ضرور شریک کرتے، یہاں تک کہ مولانا اسعد میاں بھی کسی مشورہ کے لئے آتے تو، تو شیخ "چچا میاں،، سے بھی رائے لیتے "شیخ" کا تعلق بڑھتا ہی چلا گیا۔ خاص طور پر جب انھوں نے شیخ کے مدینہ منورہ میں قیام کے لیے کوشش کی تو اس وقت سے وہ شیخ کے دل میں سما گئے، وہاں ہجرت سے پہلے جب کبھی شیخ حجاز تشریف لے جاتے تو ان کی یہ خواہش اور تمنا ہوتی تھی کہ "علی میاں،، بھی اس "موقع" پر وہاں رہیں، اور چاہتے تھے کہ اس کے لئے کوئی سبیل نکل آئے۔ چنانچہ اکثر ایسا ہو جایا کرتا تھا کہ رابطۂ عالم اسلامی یا جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کا کوئی پروگرام نکل آتا۔ یا کوئی دوسری صورت پیدا ہو جاتی تھی۔ اور ان کا سفر طے ہو جاتا تھا۔ مدینہ طیبہ کے قیام کے زمانہ میں شیخ کا یہ بڑا اہتمام تھا کہ جب ذکر کی مجلس فجر بعد ہوتی تھی تو چارپائی کے پاس بٹھا کر کے، خمیرہ گاؤزباں، یا اور کوئی خمیرہ کھلاتے، اور ابلا انڈا بھی ساتھ ہوتا، کھانا بھی ساتھ کھانے پر اصرار تھا۔ شیخ کے کھانے کا معمول ایک وقت کا تھا۔ سہارنپور میں دن کو کھاتے تھے، شام کو نہیں۔ اور مدینہ میں شام کو کھاتے تھے، دن کو نہیں۔ اس لئے وہ شام کی دعوت کہیں قبول نہیں کرتے تھے کہ شیخ کے ساتھ کھانا ہے۔

شیخ کی خدمت میں چچا میاں کثرت سے جایا کرتے تھے۔ شیخ کو اس بات کی بڑی فکر رہتی تھی کہ علی میاں کا وقت لکھنے لکھانے تصنیف وتالیف میں زیادہ خرچ ہو۔ اور لوگ ان کا وقت ضائع نہ کریں۔ اس کے لیے آدمی بھی مقرر تھے اور شیخ کو چچا میاں سے اس قدر تعلق تھا کہ ان کے تعلق سے بھی کوئی جاتا تو اس کا بھی بڑا خیال کرتے اور فرماتے۔ تمہیں چاہوں تمہارے چاہنے والوں کو بھی چاہوں یہ رمضان میں تراویح کے بعد چچا میاں کو خصوصیت سے بلاتے، فرماتے، علی میاں اور ان کی پارٹی کہاں ہے۔ پھر ضیافت کرتے۔

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ بھی آپ کا بڑا لحاظ کرتے تھے۔ حضرت مدنی نے، میاں یعنی مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحبؒ سے کہا تھا کہ ان کا خیال رکھئے گا۔ چنانچہ میاں آپ کا بڑا خیال کرتے۔ سبھی مشائخ اور بزرگان دین کو آپ سے خصوصی تعلق تھا شاہ یعقوب صاحب مجددی تو بھوپال اسٹیشن پہنچ جایا کرتے تھے۔ کہ خود وہاں جا کر ملیں، اور استقبال کریں۔ ایسے ہی شاہ وصی اللہ صاحب فتحپوریؒ کا معاملہ تھا۔ اور دوسرے بزرگوں کا۔ مولانا الیاس صاحبؒ کے آپ کے نام جو خطوط ہیں اس سے ان کے تعلق کو خوب سمجھا جاسکتا ہے۔

خاندانی اثرات، وخصائص بزرگوں کی شفقت وتوجہ، ذکر وعبادت میں انہماک یہ سب چیزیں آپ کے اندر ایسی جمع ہوگئی تھیں کہ آپ ان خوبیوں کے مجموعہ بن گئے۔ جو کسی ایک میں مشکل سے آتی ہیں۔ تواضع، مروت، مہمان نوازی کہ نہ ہونے پر بھی بہت کچھ کرتے تھے۔ ذات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق ومحبت، صبر وتحمل کہ سخت سے سخت بات سنتے اور برداشت کرتے، اور جس سے تکلیف واذیت پہونچتی اس کے ساتھ معاملہ اچھا ہی رکھتے، ان سے ملنا جلنا خیال رکھنا، اس کا اہتمام کرتے اور اسکے لیے کبھی سخت رویہ یا نامناسب طریقہ اختیار نہیں کیا۔ ندوہ کی زندگی ہو، محلہ کی زندگی ہو دعوتی میدان ہو، ہر جگہ آپ کو صبر کے مراحل سے گزرنا پڑا۔ اور آپ ثابت قدم رہے شروع میں دعوت کا بڑا ہی غلبہ تھا۔ تہجد کے ہمیشہ سے پابند رہے۔ اور اس کا بڑا اہتمام کرتے تھے۔ ہم نے خود دیکھا مدینہ طیبہ کے قیام میں کہ تہجد کے لیے مسجد نبوی جاتے تھے، اور دیر تک وہاں رہتے۔ ذکر کی بھی مواظبت رکھی، جہری بھی، سری بھی، جہری شروع میں زیادہ کرتے تھے۔ لیکن آواز میں اعتدال کو ملحوظ رکھتے تھے۔ اسی طرح تلاوت کا ہمیشہ اہتمام رکھا۔ اور مختلف اوقات میں الگ الگ سورتوں کے پڑھنے کا بھی التزام تھا روضۂ اقدس پر حاضری کے وقت مواجہ شریف کے سامنے کم بیٹھتے تھے، ریاض الجنہ کے پاس بیٹھتے تھے۔ اور وہیں ذکر کرتے تھے۔ ذکر میں اللہ کی محبت کے اشعار زبان پر آجایا کرتے تھے۔ اسی طرح دعا بھی اہتمام سے کرتے۔

عزیزوں کے ساتھ حسن سلوک، غریبوں

(باقی ص۲۹۴ پر)

حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

اہلِ خانہ اور اعزّہ کے درمیان

عمار عبد العلی حسنی ندوی

اگر اس قد آور، مختلف النوع خصوصیات کے حامل، ایک مرد آہن، عالم ربانی، مفکرِ اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی گھریلو زندگی کو بھی دیکھا جائے تو وہ ایک ایسے روشن آفتاب کے مانند ہے کہ جس کی ضیاء ہر ایک کو فائدہ پہونچا رہی ہو اور ہر ہر فرد کو اس آفتاب کی کرنوں سے آس ہو، اور اگر معاشی اعتبار سے آپ کی زندگی کو دیکھا جائے تو اس میں نشیب و فراز بھی ہیں۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں کہ والد صاحب مرحوم نظامت ندوۃ العلماء میں ۳۰۔۴۰ روپئے ماہوار کے ملازم تھے پھر اس کو بھی ترک کر دیا تھا، ایسی حالت میں میرے والد صاحب کا عقد ثانی کا پیغام حضرت شاہ ضیاء النبیؒ کے یہاں ...... پہونچا تو انھوں نے دنیاوی اعتبار سے اس سے بڑے رشتہ کو جو ضلع کے ایک تعلقدار اور خود انھیں کے چچا زاد بھائی کا تھا یہ کہتے ہوئے رد کر دیا کہ سید ایک صالح نوجوان عالم اور ہونہار ہیں میں ان پر کسی کو ترجیح نہیں دے سکتا (حضرت مولانا کے والد صاحب کی عرفیت اور عقیقہ کا نام سید احمد تھا) جب کہ والد صاحب کے گھر میں تنگی اور فاقہ تھا، فرماتے ہیں کہ جب والدہ صاحبہ اس نئے گھر آئیں تو انھوں نے وہی سب کچھ پایا جو سن رکھا تھا (تنگی و فاقہ) والدہ صاحبہ نے کئی بار سنایا کہ جب میں کسی کو اپنے میکہ سے آتا دیکھتی تو چولھے پر ہانڈی رکھ دیتی اور آگ جلا دیا کرتی تاکہ آنے والے کو احساس ہو کہ ہمارے یہاں فاقہ نہیں ہے، حضرت شاہ ضیاء النبیؒ اور علامہ عبد الحی حسنیؒ قریبی عزیز اور پیر بھائی تھے۔

اسی گھر میں جون ۱۹۰۶ء کو حضرت مولاناؒ کی بڑی ہمشیرہ امۃ العزیز صاحبہ والدہ حضرت مولانا سید محمد ثانی حسنی صاحبؒ مظاہری سابق ایڈیٹر ماہنامہ "رضوان"، حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی صاحب ناظم ندوۃ العلماء وحضرت مولانا سید محمد واضح رشید صاحب ایڈیٹر (الرائد) کی ولادت ہوئی، اور ۱۹۰۷ء کو دوسری ہمشیرہ امۃ اللہ تسنیم (عائشہ بی) مصنفہ "زادِ سفر" اور "بچوں کی قصص الانبیاء"، "ہمارے حضورؐ" کی ولادت ہوئی، اس کے بعد محرم ۱۳۳۳ھ مطابق ۱۹۱۴ء کو وہ چاند طلوع ہوا جس کی روشنی سے تقریبًا پوری دنیا کو منور ہونا تھا، وہ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات تھی، (یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ جس کمرے میں حضرت مولاناؒ کی ولادت ہوئی اسی کمرہ میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو سفر آخرت کے لئے غسل دیا گیا)۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت کے وقت خاندان میں دینی رجحان ایسا نہیں تھا جو بعد میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے وجود مسعود کے فیوض و برکات کی وجہ سے ہوگیا، حقیقتًا یہ وہ زمانہ تھا جس میں انگریز اور فکر فرنگی سے لوگ مرعوب تھے، جس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت مولاناؒ کے ایک قریبی عزیز سید محمد احمد جب ۱۹۱۵ء میں انگلستان سے بیرسٹری پاس کر کے آئے تو ان کا استقبال اس انداز سے ہوا کہ گویا وہ آسمان سے تارے توڑ لائے ہوں، یہ زمانہ انگریزی اقتدار اور اس کی تہذیب کے اقبال و عروج کا زمانہ تھا، ہر اس چیز کو عزت سے دیکھا جاتا تھا جس کا اس ملک و قوم سے انتساب ہو اسی کا اثر تھا کہ خاندان کے کئی لوگ جس میں حضرت مولاناؒ کے حقیقی ماموں زاد بھائی سید سراج النبی حصول تعلیم کے لئے امریکا گئے اور ایک دوسرے قریبی عزیز سید محمد عمر حسنی صاحب جاپان سے واپس آنے کے بعد جرمنی گئے اور وہاں سے انجینیرنگ کی اعلیٰ ڈگریاں حاصل کیں۔

لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود اس وقت خاندان کی بچیوں میں قرآن مجید کے حفظ کا خاص شوق اور اس میں زیادہ سے زیادہ آگے بڑھ جانے کا جذبہ تھا، حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ "میں اپنے بچپن میں دیکھتا تھا کہ مستورات میں پانچ بیبیاں حافظ قرآن تھیں، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی والدہ صاحبہ، خالہ، ممانی اور والدہ سید ابوالخیر صاحب اور ایک حقیقی خالہ زاد بہن اور والدہ سید مسلم حسنی صاحب اور سب کی سب بہت صحیح اور بڑی حد تک تجوید کے اصول کے مطابق پڑھتی تھیں۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ:-

"جب سے مجھے شعور آیا ہے میں نے یہ دیکھا کہ میرے ننہال میں کافی فراخی اور میرے ددیہال میں تنگی اور پریشانی تھی، اسی وجہ سے کچھ عرصہ کے بعد والد صاحب نے مطب شروع کرنے کا ارادہ

فرمایا، والدہ صاحبہ کہتی تھیں کہ مجھ سے مشورہ لیا، میں نے اس کی تائید کی اور مطب کا سلسلہ شروع ہوگیا اور بہت جلد اتنی برکت اور ترقی ہوئی کہ گھر کا نقشہ بدل گیا۔ یہ والد صاحب کی دوسری شادی تھی، بڑے بھائی ڈاکٹر عبد العلی صاحبؒ کی والدہ کا انتقال ۱۹۰۱ء میں ہوگیا تھا۔"

اس وقت ان کے بھائی صاحب (ڈاکٹر عبد العلی صاحبؒ) کی عمر ۸ سال تھی، اور جب حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی والدہ گھر آئیں اس وقت ان کے بھائی صاحبؒ کی عمر گیارہ سال تھی، اگر خاندان میں دیکھا جائے تو اس وقت خاندان کی سب سے محترم اور مقتدر شخصیت حضرت مولاناؒ کے چچا مولوی خلیل الدین صاحبؒ کی تھی، وہ بہت بارعب اور باوقار، شفیق، معاملہ فہم منتظم، راسخ العقیدہ انسان تھے، تکیہ انہی کے نام سے موسوم خلیل میاں کا تکیہ کہلاتا تھا۔

لکھنؤ (امین آباد) کے اس محلہ میں جس کو اس وقت بازار جھاؤلال کہتے تھے، اب وہ محمد علی لین کے نام سے جانا جاتا ہے، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے والد صاحب کا گھر اور مطب تھا، اس میں چار افراد، دو بھائی اور دو بہنوں پر مشتمل حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا گھرانا رہتا تھا، آپ کے والد صاحب کا سارا وقت تصنیف و تالیف، مطب، اور ندوۃ العلماء کی نظامت کے کاموں میں صرف ہوتا تھا بڑے بھائی ڈاکٹر عبد العلی صاحبؒ لکھنؤ میڈیکل کالج میں زیر تعلیم تھے، کیونکہ اس وقت میڈیکل تعلیم (خصوصاً اس زمانہ میں) ایسی محنت طلب تھی کہ ان کا سارا وقت مطالعہ، تیاری اور میڈیکل کالج کی آمد و رفت میں گذرتا تھا، ڈاکٹر صاحب کی اس وقت شادی ہو چکی تھی۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:۔

"ہماری بھاوج بھی اس مختصر خاندان کی ایک فرد تھیں، کیونکہ وہ اپنی نیک دلی پاکیزہ نفسی اور محبت کی وجہ سے ہماری بہنوں میں ایک اضافہ تھیں۔"

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا گھرانہ ہمیشہ علماء و مصنفین کا گہوارہ رہا ہے، آپ کے والد ماجد خود ایک عظیم مؤرخ و مصنف تھے، یہ آبائی اثر اور والد صاحب کا ذوق و شوق حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ پر سایہ فگن تھا۔

حضرت مولاناؒ لکھتے ہیں:۔

"کتب بینی کا شوق اور اس سے بڑھ کر لت بیماری کی حد تک پہونچ گیا تھا، کوئی چھپی ہوئی چیز سامنے آجاتی اسے پڑھے بغیر چین و سکون نہ ہوتا تھا۔"

حضرت مولاناؒ نے گھر کی مجلسوں میں اس واقعہ کو متعدد بار بیان فرمایا کہ ایک بار کچھ پیسے آگئے، سوچا کہ کتاب خریدی جائے، یہ سوچ کر جھنڈا والا پارک امین آباد کے سامنے والی لائن میں جہاں اس وقت زیادہ تر دواؤں کی دوکانیں تھیں۔ کسی ایک دوکان پر جو کہ غالباً سالومن کمپنی تھی۔ پیسے بڑھائے کہ کتاب دید یجئے، دوکان پر کام کرنے والے شخص نے یہ سوچ کر کہ کسی شریف گھرانہ کا پڑھنے کا شوقین بچہ معلوم ہوتا ہے، اس نے دواؤں کی فہرست دیدی اور پیسے بھی واپس کر دئیے۔ حضرت نے فرمایا کہ میں اتنا چھوٹا تھا کہ سمجھ نہیں سکا اور اس کو ایک قیمتی کتاب سمجھ کر گھر خوشی خوشی آیا کہ کتاب بھی مل گئی اور پیسے بھی واپس ہو گئے۔ اور اس کو اپنے ذاتی کتب خانہ کی زینت بنایا جس کا نام انھوں نے کتب خانہ ابوالحسن علی رکھا تھا، فرماتے تھے مجھ کو اس کتب خانہ میں اضافہ کرنے کا بڑا شوق تھا اس کم عمری میں اچھے برے کی تمیز تو نہیں تھی لیکن جو کتاب بھی مجھے گھر میں کہیں بے کار پڑی ملتی تو اس کو اپنے کتب خانہ میں سجالیتا۔

حضرت مولاناؒ اکثر رائے بریلی بھی جایا کرتے تھے، اگر لکھنؤ اور رائے بریلی کی مدتِ قیام کا موازنہ کیا جائے تو لکھنؤ کا قیام زیادہ ملے گا، جس میں ان کے والدِ محترم کے مطب، نظامت اور کتابوں کی کثرت اور لکھنے پڑھنے کے موزوں ماحول کو دخل ہے۔

لکھنؤ اور رائے بریلی کے علاوہ ایک تیسری منزل قصبہ ہسوہ ضلع فتح پور تھی، جہاں ان کے والد صاحب اور بھائی صاحب کا ننہال اور سسرال تھی اور سادات حسینی کی ایک معتبر شاخ آباد تھی اور دینی اور دنیاوی وجاہت سے سرفراز، دینی وجاہت کا سبب حضرت شاہ عبد السلام صاحب واسطیؒ کی ذات تھی جو کہ حضرت شاہ احمد سعید صاحب مجددی کے اصل خلفاء میں تھے، دنیاوی وجاہت کا سبب زمینداری تھی، حضرت اپنے والد صاحب کے ساتھ ہسوہ جایا کرتے تھے، ایک بار حضرتؒ نے اپنے والد صاحب سے کہا کہ آپ ہسوہ آکر اتنا خوش کیوں ہوتے ہیں، والد صاحب نے جواب دیا احمد سعید اور عبید تمہارے کون ہیں، تم رائے بریلی جاکر کیوں خوش ہوتے ہو؟ وہ تمہارے ماموں کا گھر ہے، یہ ہمارے ماموں کا گھر ہے۔

والد ماجد کی وفات

۲ر فروری ۱۹۲۳ء کو جمعہ کے دن اس چھوٹے سے خاندان کی تاریخ کا زریں ورق پلٹ گیا، گویا گھر کی بساط الٹ گئی، حضرت مولاناؒ کے والد مرحوم نے چند گھنٹوں کی مختصر علالت کے بعد جان جاں آفریں کے سپرد کر دی، حضرت

فرماتے تھے کہ اس وقت تنہا میں ان کے پاس
۹-۱۰ برس کا بچہ تھا، بھائی صاحب بمبئی میں تھے،
وہاں ان کو یہ خبر والد صاحب کے ایک دوست
نے دی، اور وہ فوراً رائے بریلی واپس ہوئے،
اور سیدھے قبر پر گئے، میں بھی ساتھ ہولیا مجھے آج
بھی ان کا قبر پر پھوٹ پھوٹ کر رونا یاد ہے۔

حضرت کے والد صاحب کے انتقال
سے پہلے ڈاکٹر صاحب صرف تعلیم کی تکمیل کے لئے
ہمہ تن یکسو تھے لیکن انتقال کے بعد حضرت مولانا
رحمۃ اللہ علیہ خود فرماتے تھے۔ اب وہ ہم چھوٹے
بھائی بہنوں کے شفیق باپ، اور والدہ صاحبہ کے
ایک سعادت مند فرزند تھے۔

یہاں اس خط کا اقتباس نقل کرنا مناسب
ہے جو کہ نواب سید علی حسن خاں صاحب نے
(جو کہ والد صاحب کے دوستوں میں تھے) انھیں لکھا تھا:

"تم اپنے دل میں یہ ہرگز خیال نہ کرو کہ بابا
نہیں ہیں (حضرتؒ اپنے والد کو بابا کہتے
تھے) تو ہم کیونکر اور کیسے پڑھیں گے، میں
نے سنا ہے تم لوگوں سے کہتے ہو کہ اب
ہماری تعلیم کیسے ہوگی، تم ہرگز پریشان نہ
ہو تمہارے بھائی تمہاری پڑھائی کا مناسب
بندوبست کریں گے، علاوہ اس کے لوگوں
کی نگاہیں تمہاری طرف ہیں، تم بالکل نہ گھبراؤ
اللہ تعالیٰ نے چاہا تو تم بہت آرام وآسائش
سے پڑھو گے، اخیر میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ
تعالیٰ تمہاری عمر میں برکت عطا فرمائے اور
تم خاندان کا نام روشن کرو۔ (آمین)"

حضرت مولاناؒ فرماتے تھے کہ میرا بچپن
بڑا مایوس کن اور غیر درخشاں تھا، والد صاحب کے
سایہ کے اٹھ جانے سے والدہ صاحبہ کو فطری طور
پر میری بڑی فکر لاحق ہوگئی تھی۔ خاندان کی عزیز
خواتین اور بعض بزرگ حضرات بھی اس احساس
کو نمبروں سے تازہ کرتے رہتے تھے، اس کا ایک
بڑا فائدہ یہ ہوا کہ والدہ صاحبہ نے میری اصلاح
وتربیت، حصول علم اور قبولیت وکامیابی کے لئے
دعائیں مانگنے کو اپنا وظیفہ بنالیا، پھر اللہ تعالیٰ نے
ان کو نظم ونثر میں ایسی ایسی دعائیں مانگنے کی
توفیق بخشی جس کی مثال اس دور میں ملنا دشوار
ہے ؎

علی ٹھنڈک ہو آنکھوں کی
علی راحت ہو سینوں کی

أَمَّنْ يُجِيبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ
السُّوءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَاءَ الْأَرْضِ۔

ایک احساس محرومی

حضرت مولاناؒ کو یہ قلق رہا کہ وہ اپنے
عہد کم سنی کے ایک بزرگ، یادگار سلف اور ایک
عالم ربانی، مولانا محمد امین صاحب نصیر آبادیؒ سے
شرف ملاقات حاصل نہیں کر سکے، جو اپنے دور
کے ممتاز ترین حامی سنت اور ماحی بدعت تھے،
اور وہ "مَنْ رأى منكم منكراً فليغيره
بيده فمن لم يستطع فبلسانه فمن لم
يستطع فبقلبه وذلك أضعف الإيمان"
کے حکم کی حرف بہ حرف تعمیل کرنا چاہتے تھے، آج
بھی ان کے عقیدت مند، سلطان پور، پرتاپ گڈھ
اعظم گڈھ میں پائے جاتے ہیں،

تیمارداری کا موقع

حضرت رحمۃ اللہ علیہ ۱۹۳۰ء میں رمضان
المبارک کے موقع پر تعطیل میں رائے بریلی آئے اور
وہ پورے انہماک کے ساتھ اس تعطیل کو مطالعۂ حدیث
میں گزارنا چاہتے تھے۔ لیکن اچانک ان کے بھانجے
(برادر اکبر مولانا محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی
ناظم ندوۃ العلماء) سید محمود حسن (م ۱۹۴۲ء) کے گردہ میں
سخت تکلیف شروع ہوگئی، جن کو لے کر وہ مع
ہمشیرہ صاحبہ کے لکھنؤ آگئے، اور کم سن مریض کے
ساتھ (جن کی عمر ۹ سال رہی ہوگی) نو عمر تیمار دار
اس کو لے کر کئی رات اسپتال میں رہا اور اسپتال
ہی میں عید کا دن بھی گزرا، کسی اسپتال میں رہنے
کا یہ پہلا تجربہ تھا،

دوسری تیسری مرتبہ والدہ معظمہ کے موتیابند
کے آپریشن کے موقع پر حضرتؒ کو کئی کئی ہفتے اسپتال
میں رہنے کی نوبت آئی، والدہ کی خوب خدمت
کی اور دعائیں لیں۔

انگریزی پڑھنے کا غلبہ اور والدہ کی فکرمندی

ایک زمانہ میں حضرت مولاناؒ پر انگریزی
پڑھنے کا غلبہ ہوا تو میٹرک کی انگریزی کتابیں
خرید کر ایک استاذ سے پڑھنے لگے، جب
والدہ صاحبہ کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے اپنے
جگر پارے کو خط لکھا۔ جس کا اقتباس یہ ہے:۔

"علی! تم کسی کے کہنے میں مت آؤ،
اگر تم اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل
کرنا چاہتے ہو، اور تم کو میرے حقوق
ادا کرنے کا شوق ہے، تو تم ان لوگوں
کی سیرت کا مطالعہ کرو جنہوں نے علم دین
حاصل کرنے میں عمریں گذار دیں، ان
کے مرتبے کیا تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ
صاحبؒ، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ، شاہ
عبدالقادر صاحبؒ اور تمہارے بزرگوں
میں خواجہ احمد صاحبؒ اور مولانا محمد
امین صاحبؒ جن کی زندگی اور موت
دونوں قابل رشک ہوئیں، کس شان
سے دنیا برتی اور کیسی کیسی خوبیوں کے
ساتھ رحلت فرمائی، یہ مرتبے انگریزی
پڑھ کر حاصل نہیں کئے جاسکتے، انگریزی

بڑھنے والے تمہارے خاندان میں بہت ہیں، مگر اس مرتبہ کا کوئی نہیں۔

علی! اگر میری سو اولادیں ہوتیں تو میں سب کو یہی تعلیم دیتی، اب تم ہی ہو، اللہ تعالیٰ میری خوش نیتی کا پھل دے اور سنو کی خوبیاں تم سے حاصل ہوں اور میں دارین میں سرخرو اور نیک نام ہوں اور صاحب اولاد کہلاؤں۔ آمین یارب العالمین۔"

شادی

۱۹۳۴ء میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی شادی ان کی حقیقی ماموں زاد بہن سید احمد سعید صاحبؒ کی بیٹی، شاہ ضیاء النبیؒ کی پوتی اور منشی سید عبدالرزاق صاحبؒ کلامی صاحبؒ صمصام الاسلام کی نواسی سے ہوئی، نکاح مولانا حیدر حسن خاں صاحبؒ نے پڑھایا، اور بڑے بھائی ڈاکٹر عبدالعلی صاحبؒ نے ولیمہ کا اہتمام ازراہ شفقت اعلیٰ پیمانہ پر بڑی فراخ دلی اور خوشی کے ساتھ کیا، تاکہ والد صاحبؒ کے نہ ہونے کا احساس کسی بھی صورت میں نہ ہو۔

حضرت مولاناؒ کی ذاتِ بابرکات خاندان والوں کے درمیان

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی ذات خاندان والوں کے لئے سراپا رحمت و برکت تھی اور ایک ایسے انمول موتی جیسی تھی جو بہت کم خانوادوں کو میسر آتی ہے، عزیز و اقارب ان کی شخصیت کو اللہ تعالیٰ کا خصوصی انعام و احسان اور ایک قیمتی تحفہ تصور کرتے تھے۔

آپ کا قافلہ جب رائے بریلی پہونچتا تو پورا خطہ جگمگا اٹھتا، اور آپ کی روحانیت کا نور پھیل جاتا، آپ کا فیض جاری ہو جاتا، عوام و خواص سبھی جوق در جوق اور پروانہ وار آپ کی طرف آنے لگتے اور آپ کے علم و روحانیت سے فیض یاب ہوتے۔

آپ کو ہر ایک کی اصلاح و تربیت کی فکر دامن گیر رہتی اور ہر شخص کی مسیحائی فرماتے تھے، آپ کی رائے بریلی آمد، رائے بریلی شہر اور اطراف شہر کے لئے جہاں باعث خیر و برکت تھی، وہیں دور دراز کے علاقوں اور دیہاتوں کے لئے بھی باعث تسکین تھی، لوگ آپ کی آمد کی خبر سن کر دور دور سے امنڈنے لگتے اور لوگوں کی آمد کا تانتا بندھ جاتا تھا، آپ کی ہر بات کو لوگ نصیحت سمجھ کر ہمہ تن گوش سنتے اور بعض نوٹ کر لیا کرتے تھے۔

یہی صورت حال رشتہ داروں کی بھی تھی وہ سب ایک ایک آکر مصافحہ کرتے اور آپ کی مجلس میں بیٹھتے اور اس کو اپنے لئے باعث خیر و برکت سمجھتے تھے۔ مستورات کا بھی یہی حال ہوتا جب حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ گھر تشریف لیجاتے تو اس وقت جشن کا سماں ہوتا۔

حضرتؒ کا یہ مستقل معمول تھا جب وہ کسی سفر پر تشریف لے جانے والے ہوتے تو بالکل اخیر میں گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے گھر تشریف لیجاتے جہاں مستورات پہلے سے ان کی منتظر ہوتی تھیں، خاص طور سے دونوں ہمشیران گرامی، اہلیہ محترمہ، بھتیجیاں اور گھر کے تمام بچے، جو کہ اباجان کے گھر میں داخل ہونے کی سب سے پہلے اطلاع دیتے تھے، انھیں میں کے کچھ بچے جو کہ حضرت کو بہت محبوب بھی تھے، گھر میں داخل ہوتے وقت آپ کی انگلی پکڑ لیتے اور ایک انوکھے انداز سے مسکرا کر اظہار مسرت کرتے تھے۔ حضرت مولاناؒ جب گھر میں داخل ہوتے تو سب سے پہلے آپاجان (ہمشیرہ صاحبہ) والدہ مولانا محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی سے ملتے جو پہلے سے ان کی منتظر ہوتی تھیں، فرماتیں: علی تم جارہے ہو پھر کندھے پر ہاتھ رکھ کر دم فرماتیں اور اللہ تعالیٰ کے حفظ وامان میں کرتیں اور دعاؤں کے ساتھ رخصت فرماتیں اور گھر کی دوسری تمام خواتین پر منتظر دیکھتی رہتیں اور بہت اچھا معلوم ہوتا تھا، بسا اوقات ہمشیرہ صاحبہ حضرتؒ سے فرماتیں:۔ بھیا علی تم چلے جاتے ہو تو تکیہ کی رونق چلی جاتی ہے تکیہ پر اچھا نہیں لگتا ہے۔ کبھی فرماتیں، بھیا علی تم سفر بہت کرتے ہو، جواب میں حضرت مولاناؒ فرماتے تھے نہیں آپاجان ہم کو کوئی سفر کا شوق نہیں ہے مجبوری میں سفر ہوتا ہے، کیا کریں سفر کرنا پڑتا ہے۔

تقریباً یہی معمول سفر سے واپسی پر بھی رہتا تھا جب کسی سفر سے لوٹتے تو کبھی شیروانی اتارنے سے پہلے اور کبھی شیروانی اتار کر فوراً گھر تشریف لیجاتے تھے اور گھر کی مستورات اور عزیز و اقارب سے ملاقات کرتے اور دس پندرہ منٹ تک یہ سلسلہ رہتا اس کے بعد باہر تشریف لیجاتے اور باہر کھڑے ہوئے مہمانوں سے ملاقات فرماتے اور پھر سفر کے تکان کو دور کرنے کی خاطر تھوڑی دیر آرام فرماتے تھے، پھر جب تک رائے بریلی میں قیام رہتا دو وقت گھر جانے کا معمول رہتا تھا، ایک بارہ ۱۲ و ساڑھے بارہ ۱۲-۳۰ کے درمیان، دوسرا مغرب کے بعد، اس معمول میں کبھی کسی زمانہ میں کوئی فرق نہیں آیا، سوائے آخر زمانہ کے جب حد درجہ کمزوری ہوگئی اور ہمشیرہ صاحبہ کا بھی انتقال ہوگیا تھا، اس معمول میں کبھی کبھار تبدیلی ہونے لگی تھی، گھر کی یہ دونوں مجلسیں بڑی باوقار اور مفید ہوا کرتی تھیں، جس میں عام طور سے بزرگوں کے تذکرے سید احمد شہیدؒ اور حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے حالات و واقعات ہوتے تھے، اور اپنے

بچپن کے حالات اور اپنے والد و والدہ، دونوں بہنوں اور بڑے بھائی ڈاکٹر صاحب کا خصوصی ذکر ہوا کرتا تھا، اور ان کا ذکر اس انداز میں حضرت فرماتے تھے کہ سننے والوں کو آپس کی محبتوں کا پورا اندازہ ہوجاتا بلکہ لطف آتا، اپنے بھائی صاحبؒ کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ جو کچھ بھی آج ہم ہیں وہ بی بی (والدہ صاحبہ کو کہتے تھے) کی دعاؤں اور بھائی صاحبؒ کی تربیت کا نتیجہ ہے، بھائی صاحب نے جس طرح ہماری تعلیم و تربیت فرمائی ہے وہ بے مثال ہے، باپ اپنے بیٹے کے ساتھ جو کر سکتا ہے وہ ہمارے بھائی صاحبؒ نے ہمارے ساتھ کیا، انھوں نے ہمارے ساتھ انتہائی شفقت و محبت کا معاملہ فرمایا اور والد صاحب کی کمی کبھی محسوس نہیں ہونے دی، گھر کی مجلس میں اس وقت خصوصی لطف آجاتا جب اس میں مولانا ابوبکر صاحب حسنی مدظلہ العالی اور سید سلم صاحب حسنی بھی ہوتے، یہ دونوں حضرتؒ کے ہم عمر، بچپن کے ساتھی، دوست ساتھ کھیلے ہوئے تھے، اس وقت مجلسوں میں بچپن کے حالات و واقعات کا ذکر خصوصیت سے ہوتا تھا کہ کس طرح سے ہم لوگ کھیلتے تھے اور کیا کیا کھیلتے تھے، لکھنؤ میں کس طرح سے ہم لوگ ساتھ رہتے تھے، اور ہمارے بڑے کس طرح سے ہم لوگوں سے شفقت و محبت کا معاملہ فرماتے تھے، غرض کہ رائے بریلی، لکھنؤ اور ہسوہ تینوں جگہ کی زندگیاں سامنے آجاتیں، کبھی کبھی ہنسی مذاق کی بات بھی ہوجایا کرتی تھی، جس سے مجلس میں موجود لوگوں کو بہت لطف آتا تھا، اور جب مجلس میں حضرت مولانا محمد رابع صاحب حسنی اور مولانا واضح صاحب حسنی بھی تشریف فرما ہوتے تو زیادہ تر گفتگو علمی ہوا کرتی اور حالات حاضرہ، موضوع بحث ہوتے اور بیچ بیچ میں اسلاف کے کارناموں اور اس سلسلہ میں ان کی کاوشوں کا ذکر بھی ہوتا تھا۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود حضرت کو اس بات کا خیال رہتا کہ یہ مستورات کی مجلس ہے ہر ایک سے آپ اس کے مرتبہ کے مطابق مخاطب ہوتے رہتے اور اس کی خیریت پوچھتے، حالات دریافت کرتے اور ان کو نصیحتیں فرماتے رہتے، دوران مجلس آنے والی کوئی عزیزہ اگر سلام کرتیں تو ان کے سلام کا جواب پوری توجہ سے دیتے اور پھر اپنی بات کو جاری رکھتے، عورتوں کو ہر طرح کی نصیحت فرماتے، جس میں گھریلو معاملات بھی شامل ہوتے اور دینی امور کو مرکزیت حاصل رہتی، اخلاص وللہیت پر خاص زور ہوتا، ہمیشہ کمزوروں پر ظلم کرنے سے بچنے کی تاکید فرماتے، کہتے کہ مظلوم کی آہ اور اللہ کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں ہوتا ہے، کہتے ظالم مت بنو چاہے مظلوم بننا پڑے، ایک بات اور بہت قوت و تاکید سے فرماتے تھے، وہ یہ کہ تم لوگ ہمیشہ خود بھی حرام مال سے بچنا، اور اپنی اولاد کو بھی ہمیشہ اس کی تاکید کرتی رہنا، کیونکہ حرام مال کھانے سے خود بھی آدمی برباد ہوتا ہے اور اولاد بھی ناقص الایمان پیدا ہوتی ہے، اس سے اس طرح گھن کھاؤ جس طرح غلاظت سے انسان گھن کھاتا ہے، اور فرماتے کہ مال کی حد سے بڑھی ہوئی محبت ایمان کو کھا جاتی ہے، حرام مال کے کھانے والے سے کسی خیر کی امید رکھنا بے کار ہے۔

عیدین میں بھی آپ کچھ باتوں کا اہتمام فرماتے تھے، عید کی نماز کے لئے پوری طرح سے تیار ہوکر پہلے آپ اپنے گھر تشریف لے جاتے اور وہاں اپنی ہمشیرہ صاحبہ سے ملتے پھر نماز کے لئے تشریف لے جاتے، نماز سے فارغ ہونے کے بعد پہلے آپ قبرستان تشریف لے جاتے، روضہ پر پہونچ کر فاتحہ پڑھتے پھر تکیہ پر موجود سات گھروں میں سے ہر گھر میں تشریف لے جاتے، اور اس خوشی کے دن ہر ایک کو عید کی مبارک باد دیتے تھے، آپ کے اس عمل سے ہر گھر کے لوگوں کو مسرت حاصل ہوتی اور لوگ اس مبارک ساعت کے لئے اس مبارک دن کا مہینوں سے انتظار کرتے تھے، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ تمام عزیزوں کا بڑا خیال فرماتے، ان کی خوشی سے حضرت کو خوشی ہوتی اور ان کے غم سے آپ کو غم ہوتا، اور اس طرح سے اعزہ بھی آپ کی ذات پر جو خاندان کے لئے باعث عزت و افتخار تھی اپنی جانوں کو نچھاور کرنے کے لئے تیار رہتے۔

حضرت مولاناؒ گھروں میں تشریف لے جاتے تو بچوں سے خصوصی شفقت و محبت کا معاملہ فرماتے، گھر جاتے وقت اپنے ساتھ ٹافیاں ضرور لے جاتے اور اگر کسی وجہ سے ٹافیاں لے جانا رہ جاتا تو کسی کو بھیج کر ٹافیاں منگواتے اور ایک ایک بچے کو اپنے ہاتھ سے ٹافیاں عنایت فرمایا کرتے تھے۔

بچوں کی ماؤں نے اپنے بچوں کو سکھا دیا تھا کہ جب اباجان تشریف لائیں تو سلام کرنا، ادب سے بیٹھنا، اور ان کی باتوں کو غور سے سننا، شور بالکل نہ کرنا، بعض ماؤں نے اپنے بچوں کو یہ سکھایا تھا کہ جب ابا جان بیٹھ جائیں تو ان کے پیر دبانا (ایسے بچوں کی عمریں عام طور پر ۲ یا ۳ سال کی ہوتی تھیں) کبھی حضرتؒ ان بچوں کو شاباشی دے کر رخصت فرمادیتے اور کبھی تربیتاً کچھ دیر پیر دلوا لیتے اور ان کی سعادت مندی پر خوشی کا اظہار فرماتے تھے، حضرتؒ کو اہل خانہ کی تعلیم و تربیت کی بڑی فکر رہتی تھی، ہر ایک کے بارے میں پوچھتے رہتے کہ وہ کیا پڑھ رہا ہے، اس کے مطالعہ میں کون سی کتاب ہے، بسا اوقات کتابوں کے نام لے کر اس کو پڑھنے کی ہدایت فرماتے، جن کتابوں کا آپ بہت زیادہ نام لیتے ان میں نبی رحمت، سیرۃ النبیؐ

کاروانِ زندگی، نزہۃ الخواطر، تاریخ دعوت وعزیمت، سیرت سید احمد شہیدؒ، اور تذکرہ شاہ علم اللہؒ، حیات عبدالحئیؒ اور اس کے علاوہ بعض دوسرے مصنفین کی کتابوں کے مطالعہ کا حکم دیتے تھے۔

حضرت مولاناؒ جہاں اپنے گھر والوں کی دینی فکر رکھتے وہیں ان کے صحیح راستہ پر باقی رہنے کے اسباب اختیار کرتے اور گھر کے ہر فرد سے دینی امور کے بارے میں پوچھتے رہتے کہ وہ اس کی انجام دہی میں کوتاہی تو نہیں کرتا، اور اس کو نصیحت فرماتے رہتے کہ دین و دنیا کی فلاح و ترقی اسی راستہ کو اپنانے میں ہے، اور اپنے والد صاحبؒ اور بھائی صاحبؒ کو مثال کے طور پر پیش کرتے کہ ان کی نیک نیتی اور اخلاص کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو دین و دنیا میں سرخرو فرمایا۔

اور حضرت مولاناؒ اپنے اس گھر سے جو محمد علی لین امین آباد میں واقع تھا خصوصی لگاؤ رکھتے تھے کیونکہ اس میں ان کے والد صاحبؒ اور بھائی صاحبؒ اور وہ خود تقریباً سو سال سے رہ رہے تھے، اور خود ان کے بچپن کی یادیں اس سے وابستہ تھیں، اور اس وجہ سے بھی خصوصی تعلق تھا کہ اس میں بڑے بڑے بزرگ حضرات تشریف لا چکے تھے، مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری، حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ مولانا الیاس صاحبؒ امیر و بانی تبلیغی جماعت، علامہ شبلی نعمانی، مولانا محمد علی مونگیریؒ، مولانا محمد احمد صاحب پھولپوریؒ اور مولانا قاری صدیق احمد صاحب باندوی اور ان جیسے بہت سے بزرگ حضرات۔ اور حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ کا تو اس خصوصی تعلق کے باوجود جب حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو معلوم ہوا کہ مالک مکان عبدالمجید صاحب کو مکان کی ضرورت ہے اور وہ اس کو اپنے اور اپنے بچوں کے لئے تجارتی کامپلکس بنانا چاہتے ہیں تو حضرت نے بغیر کسی پس و پیش کے اپنے نواسوں اور پوتوں کو اس گھر کے چھوڑنے کا حکم دیا، اگرچہ اس کے چھوڑنے کے بعد رہائش کا مسئلہ پیش آیا، لیکن متبادل کی تلاش شروع ہوئی اور خاتون منزل میں اللہ کا نام لے کر تعمیر شروع ہوگئی، اور یہاں قیام اختیار کیا گیا۔

حضرت مولانا نماز کا حد سے زیادہ اہتمام فرماتے تھے، اذان سے پندرہ ۱۵ بیس ۲۰ منٹ پہلے سے نماز کے لئے تیاری شروع فرما دیتے اور اذان سنتے ہی وہ مسجد کی طرف روانہ ہوجایا کرتے تھے، اذان کے بعد نہ تو وہ خود جائے قیام پر ٹھہرتے اور نہ دوسروں کا تاخیر کرنا پسند کرتے تھے، مسجد میں داخل ہوتے تو ہمیشہ سنت کے مطابق داہنا پیر داخل فرماتے اور نکلتے وقت بایاں پیر نکالتے تھے۔ ناشتہ کے بعد (جو اپنے مہمانوں کے ساتھ ہی تناول فرماتے تھے) سب سے پہلے وضو فرماکر دو ۲ رکعت نماز اشراق پڑھتے اور اس کے بعد ایک پارہ تلاوت کلام اللہ ضرور فرمایا کرتے تھے پھر کوئی کتاب یا مضمون لکھواتے تو بارہ ۱۲ ساڑھے بارہ سے پہلے نہیں اٹھتے تھے اور لکھوانے کے درمیان کھانے سے بالکل پرہیز کرتے البتہ پانی تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد پیتے رہتے تھے، شاید کھانے کو اپنے لکھوانے کے بیچ حارج مانتے تھے۔

اس کے بعد گھر تشریف لے جاتے اور وہاں مستورات کی مجلس ہوتی پھر اذان سے قبل اپنے مہمان خانہ آجایا کرتے اور وضو فرماکر نماز کے لئے تیار ہوجاتے تھے، نماز سے فراغت کے بعد کھانا اپنے مہمانوں کے ساتھ ہی تناول فرماتے اس کے بعد قیلولہ کے لئے تھوڑی دیر آرام فرماتے اور نماز عصر سے کافی پہلے اٹھ جاتے، اور استنجاء وغیرہ سے فراغت کے بعد وضو کرکے عصر کی نماز کے لئے تیار ہوجاتے تھے، بعد نماز عصر مجلس ہوتی تھی جس میں کافی دور دور سے لوگ شرکت کی غرض سے حاضر ہوتے تھے، اس کے بعد مغرب کی نماز پڑھی جاتی اور حضرت اس کے بعد گھر تشریف لے جاتے تھے عشاء کی نماز کے بعد فوراً کھانا ہوتا اور مختصر سی مجلس، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو چونکہ تہجد میں اٹھنا ہوتا تھا اس وجہ سے آپ جلدی سونا پسند فرماتے تھے۔

جمعہ کے دن لکھوانے اور خطوں کے جواب دینے کا سلسلہ منقطع رہتا، اور آپؒ تلاوت کلام پاک کے بعد غسل وغیرہ کی تیاری شروع فرما دیتے اور غسل کے بعد آپؒ سورہ یٰسین کی ۴۱ مرتبہ تلاوت فرماتے، اس کے ذریعہ ان شخصیات کو ایصال ثواب کرتے جو دنیا سے رخصت ہوچکیں اور وہ کسی نہ کسی تحریک سے وابستہ تھیں اور ایک ایک شخص کا نام لے کر ایصال ثواب کرتے تھے، ان میں حسن البناؒ شہیدؒ، حضرت عبدالقادر جیلانیؒ، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ، مولانا مدنیؒ، مولانا رائے پوریؒ، مولانا محمد الیاس صاحبؒ بانی تبلیغ وغیرہ کے نام نمایاں ہوتے تھے، اس کے بعد سورۂ کہف کی تلاوت فرماکر نماز جمعہ کے لئے تیار ہوجاتے، جمعہ کے دن بعد نماز مغرب ذکر بالجہر کا اہتمام ہوتا تھا جس میں مہمانوں کے علاوہ بڑی تعداد میں شہر و دیہات کے لوگ شریک ہوتے تھے۔

غریبوں سے ہمدردی حضرت مولاناؒ کا امتیازی وصف تھا وہ اس طرح کے لوگوں کی مدد کو ایک لازم فریضہ سمجھتے تھے، بڑی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جن کو آپ نے ماہوار باندھ رکھا تھا، جب تک آپ رائے بریلی میں رہتے

ایسے لوگوں کی روزانہ بھیڑ لگ جاتی اور کوئی
ایک فرد بھی مایوس واپس نہیں جاتا، رمضان المبارک
میں یہ جذبہ بہت بڑھ جاتا تھا اور دنوں سے
کہیں زیادہ غریبوں کی مدد فرماتے تھے۔

مریضوں کی عیادت بھی آپ کا ایک
امتیازی وصف تھا، خاندان میں اگر کوئی شخص
بیمار ہوجاتا خواہ وہ قریبی رشتہ دار ہوتا یا دور
کا، تو آپ اس کے گھر جاکر پورے اہتمام سے
اس کی مزاج پرسی فرمایا کرتے تھے۔

اگر وہ اسپتال میں زیر علاج ہوتا تو
اس کی عیادت کے لئے اسپتال جانے میں ان
کو ادنیٰ تکلف نہیں ہوتا تھا۔

اسی طرح خاندان کے کسی فرد کا اگر انتقال
ہوجاتا تو آپ کتنے ہی دور ہوں، اگر اس کے
جنازہ میں شریک ہونا ممکن ہوتا تو ضرور شرکت فرماتے،
جب آپ تشریف لے آتے تو نماز جنازہ بھی آپ
ہی پڑھاتے تھے۔

آپ کی موجودگی میں آج تک کسی اور نے
کسی کی نماز جنازہ نہیں پڑھائی، خاندان کے ہر
ہر فرد کو ناز ہے کہ اس کے والد، والدہ اتنے
خوش قسمت تھے کہ ان کی نماز جنازہ حضرتؒ نے
پڑھائی ہے۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ خاندان کے ہر
فرد کے ساتھ انتہائی اخلاق کا اور شفقت کا معاملہ
فرماتے تھے، یہی تمام وجوہات ہیں جس کی بنا
پر حضرت مولاناؒ پورے خاندان کے محبوب تھے،
اور حضرتؒ کے وصال کی خبر پورے خاندان
پر بجلی بن کر گری، اس موقع پر ہر شخص کی زبان
پر بس صرف یہ تھا کہ حقیقتاً اب ہم لوگ یتیم ہوگئے
ہیں ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

(بقیہ)
والدہ کے تربیتی خطوط

ہم نے دعا کا وہ ذوق اور دعا میں الیقین
نہیں دیکھا جیسا اپنی والدہ صاحبہ کی
زندگی میں دیکھا ہے، ان کی زندگی اس
حدیث کی تعمیل کا نمونہ تھی جس میں کہا گیا
ہے کہ تمہاری ہانڈی کا نمک کم ہوجائے
تو اس کو دعا ہی کے ذریعہ طلب کرو، اور
تمہاری جوتی کا تسمہ ٹوٹ جائے تو اس
کو بھی اللہ ہی سے مانگو، ان کی ساری
زندگی دعا اور مناجات میں گذری، وہ
خود اپنا حال بیان کرتی ہیں ؎

ترا شیوہ کرم ہے اور مری عادت گدائی کی
نہ ٹوٹے آس اے مولا ترے در کے فقیروں کی

اپنی ایک مناجات میں وہ حضرت مولانا کا ذکر اس طرح کرتی ہیں ؎

رہے زندہ باقی جہاں میں علی
رہے تیرے حفظ و اماں میں علی
ہو آباد کون و مکاں میں علی
ہو سرسبز باغ جہاں میں علی
علی سے ہو روشن چراغ جہاں
علی سے ہو سرسبز باغ جہاں

ایک دوسری مناجات میں فرماتی ہیں ؎

تو حافظ ہے اس کا تو ہی ہے رقیب
بلا کوئی آوے نہ اس کے قریب
دعا سن لے میری تو رب مجیب
الٰہی علی کو تو کر خوش نصیب
علی سے بڑھے خاندان علی
علی سے نمایاں ہو شان علی

ترجمہ از عربی
سید محمود حسن حسنی

(بقیہ)
چچامیاں۔ کیا دیکھا کیا پایا

کے کام آنا۔ حاجت مندوں کی حاجت براری،
بڑوں کا احترام، چھوٹوں پر شفقت، مریضوں
کی عیادت، دوسروں کا خیال اور ان کے جذبات
و مزاج کی رعایت۔ پھر یہ کہ ان کی ذات سے
کسی طرح بھی دوسرے کو کوئی تکلیف نہ پہنچنے
پائے، اور اپنے ذاتی طرز عمل سے اگر ایسا
محسوس کیا تو فوراً تدارک کرتے۔ ایسا نہیں
ہوا کہ صرف آپ کا اعزاز و اکرام ہی ہوتا رہا
ہو۔ مخالفتوں کا جگہ جگہ سامنا کرنا پڑا۔ لیکن
آپ نے کسی کے بارے میں کبھی زبان نہیں
کھولی۔ دل آزاری آپ کے یہاں بدترین
جرم تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کی حسنات کا انھیں
بہتر سے بہتر بدلہ عطا فرمائے۔

۱؎ موصوف مضمون نگار کا تعلق منصورپور
مظفر نگر کے سادات خاندان سے ہے۔
اور وہ مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب
رحمۃ اللہ علیہ (برادر اکبر حضرت مولانا سید
ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ) کے داماد
بھی ہیں۔ ندوۃ العلماء میں طویل عرصہ تک
مددگار ناظم کے عہدہ پر فائز رہے۔ اور حضرت
مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ و حضرت
شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ سے انھیں
قرب و اختصاص رہا۔ (اطال اللہ بقاءہ)

دینی تحفظ :- آپ کو اپنی نسل کے دینی تحفظ اور اسلام سے اس کے ربط
و تعلق کا انتظام کرنا ہے اور یہ ذمہ داری غذا، لباس، دوا، علاج، تعلیم،
اور معاش سے زیادہ ضروری ہے۔
(حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ)

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی

شخصیت کی تشکیل میں موروثی اثرات

مولوی بلال عبدالحی حسنی ندوی

انسان کے مزاج ونداق کی تشکیل، اس کے فطری جوہر چمکانے اور اکثر اوقات زندگی کا رخ متعین کرنے میں اس کے خاندان اور قریبی اجداد کا اثر علم الحیات اور علم النفس کی ایک مسلم حقیقت ہے، جس کی تصدیق گذشتہ تاریخ نیز پے درپے مشاہدات وتجربات سے ہوتی رہتی ہے، اس کا انکار ایک امر بدیہی کا انکار ہے۔

یہ اثر انسان پر دو راستوں سے ہوتا ہے ایک نسلی طور پر کہ یہ خصائص (کمالات وکمزوریاں) باپ سے بیٹے کی طرف منتقل ہوتے ہیں، دوسرے ذہنی وفکری طور پر کہ خاندانی روایات اور آباء واجداد کے قابل فخر کارناموں کا تذکرہ، ان کی اصولی زندگی، عقائد ومسلمات اور ان کے معیار واقدار کا چرچا جن کو وہ ہمیشہ سینے سے لگائے رہے، خاندان کی محبوب ومقتدر شخصیتوں کے نام پھر ان مقاصد کا ذکر جن کے لئے انھوں نے بڑی سے بڑی قربانی پیش کرنے سے دریغ نہیں کیا، بچپن سے کانوں میں پڑتے ہیں، اور اس کے دل ودماغ کی تختی پر نقش کالحجر ہوجاتے ہیں اور یہ سب چیزیں شعوری اور غیر شعوری طور پر اس کی شخصیت وسیرت کی تعمیر اور اس کی صورت گری کرتی ہیں۔[1]

مفکر اسلام امام العصر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی قدس اللہ سرہٗ نے ایسے خاندان میں آنکھیں کھولیں جو ایک طویل زمانہ سے علمی ودینی خدمات انجام دے رہا تھا، بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کی پوری تاریخ میں شاید کوئی دور ایسا نہیں گذرا جس میں کوئی مصلح، مصنف اور داعی نہ پیدا ہوا ہو، درمیان میں اس میں ایسے ایسے مجددین اور حاملین دعوت بھی پیدا ہوئے جنہوں نے بعض مرتبہ صدیوں تک فکری قیادت کی اور جن کی تجدید واصلاح کی فکر ودعوت کو لے کر عرصہ تک کام کرنے والوں نے رہنمائی حاصل کی۔

اسی سلسلۃ الذہب کی سب سے پہلی کڑی جس نے ہجرت وجہاد اور اصلاح کے ارادہ سے ہندوستان کا رخ کیا وہ امیر کبیر شیخ الاسلام قطب الدین محمد المدنی کی ذات تھی جو چھٹی صدی کی ابتداء میں ہزاروں معتقدین کے ساتھ تشریف لائے اور "کڑہ مانک پور" کے نواح میں جہاد کرکے اس ظلمت کدہ کو نور اسلام سے منور کیا۔ امیر قطب الدین مدنی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے بھانجے اور بیک واسطہ خلیفہ تھے، براہ راست بھی شیخ سے استفادہ کیا تھا۔ جلیل القدر اولیاء اللہ میں سے تھے "کڑہ" ہی میں وفات پائی اور وہیں پیوند خاک ہوئے۔

امیر قطب الدینؒ کی اولاد میں اتنے اولیاء، علماء اور مشائخ پیدا ہوئے کہ کم خاندانوں میں اس کی مثال ملے گی، ان کے حفید سعید قاضی سید رکن الدین بڑے بلند پایہ بزرگ تھے، پھر ان کی اولاد میں حضرت قاضی سید احمد نصیر آبادی بڑے باہمت اور صاحب نسبت بزرگ تھے ان کے پوتے حضرت سید محمد فضیل بھی زہد وریاضت اور اتباع سنت میں مرتبہ عالی رکھتے تھے۔ دوسرے پوتے حضرت سید محمد اسحٰقؒ بھی عارف کامل تھے، ان کے صاحبزادہ دیوان خواجہ احمد صاحب زبردست عالم اور صاحب سلسلہ شیخ طریقت تھے، حضرت سید محمد فضیل کے صاحبزادہ حضرت سید شاہ علم اللہ اس سلسلۃ الذہب میں اپنی ایک شان رکھتے ہیں، آپ حضرت سید آدم بنوریؒ کے اجل خلفاء میں سے تھے، اتباع سنت میں دور دور ان کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ شاہ صاحب کی اولاد میں حضرت مولانا سید محمد جی، حضرت شاہ لعل صاحب، حضرت مولانا سید محمد حیا، حضرت مولانا سید محمد صابر، حضرت شاہ ابوسعید، حضرت شاہ محمد واضح، حضرت مولانا سید قطب الہدیٰ محدثؒ، حضرت مولانا سید محمد طاہرؒ اور حضرت شاہ ضیاء النبیؒ بڑے بلند پایہ بزرگ گذرے ہیں لیکن ان میں سب سے نمایاں شخصیت حضرت سید احمد شہید کی ہے جو حضرت شاہ صاحب کی چوتھی پشت میں ہیں، ان کے انفاس قدسیہ سے مسلمانوں کو جو فائدہ پہونچا ہے اس کی مثال ملنی مشکل ہے، ان کی برکات سے وہی لوگ انکار کرسکتے ہیں جو جو علم وعرفان کی روشنی سے فیضیاب نہیں۔

سید محمد اسحاقؒ کے صاحبزادہ سید ہدایت اللہؒ بڑے بلند پایہ عالم گذرے ہیں عہد شاہجہانی میں امور مذہبی کے صدر الصدور تھے، ان ہی مولانا ہدایت اللہؒ کی اولاد میں مولانا سید عبدالعلیؒ ایک درویش سیرت فاضل بزرگ تھے۔ حضرت سید احمد شہیدؒ کے مرید ومجاز تھے خشیت الٰہی کا یہ حال تھا کہ جب ڈاک سامنے آتی تو نامۂ اعمال یاد کرکے گریہ طاری ہوجاتا۔ نقاشی وخوش خطی کا بہت اعلیٰ ذوق تھا، زیادہ تر آمدنی

مستحقین پر صرف کر دیتے،" دست بکار دل بیار" کا نمونہ تھے، اخلاق کریمانہ کے ساتھ زندگی گذاردی اور صرف ۴۸ سال کی عمر میں فالج کے مرض میں انتقال فرمایا، آخری کلام جو زبان سے ادا ہوا وہ "ھوالرفیق الاعلیٰ" تھا۔

حضرت کے جد امجد مولانا حکیم سید فخرالدین خیالیؒ انہی مولانا عبدالعلی کے فرزند ہیں، دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی میں ۱۲۵۶ھ کو ولادت ہوئی اپنے نانا مولانا سید محمد طاہرؒ کے دامن تربیت میں پرورش پائی طب اور شاعری میں بھی رسوخ پیدا کیا، مزاج میں خاموشی، متانت، حلم اور عجلت پسندی انتہادرجہ تھی، صبر و قناعت کی صفت ہر ادا سے ظاہر ہوتی تھی، تمکنت و غرور ان کو چھو نہیں گیا تھا بیعت طریقت اپنے پھوپھا حضرت خواجہ احمد صاحب سے کی تھی اجازت سے بھی سرفراز کئے گئے، حضرت مولانا سید محمد طاہر صاحب نے بھی اجازت بیعت مرحمت فرمائی تھی مگر کبھی پیری مریدی نہیں کی۔ ذکر و شغل کے ہمیشہ پابند رہے، کتب بینی اور تصنیف و تالیف سے خاص مناسبت تھی، تاریخ کا بڑا اچھا ذوق تھا، درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رہتا' متعدد تصانیف یادگار ہیں جن میں سب سے زیادہ اہم "مہر جہاں تاب" ہے۔ اظہار کمال سے سخت نفرت تھی یہی وجہ ہے کہ زندگی میں ان کو کم کسی نے جانا، ۱۰ رمضان المبارک ۱۳۲۶ھ کو ذکر کی حالت میں رحلت فرمائی۔

حضرت کے جد مادری حضرت شاہ ضیاء النبی حسنیؒ بھی اپنے دور میں عظمت و بزرگی کی علامت اور پورے خاندان ہی نہیں بلکہ قرب وجوار کے اضلاع میں بھی مرجعیت کے مقام پر فائز تھے۔ خاندان میں ان کے اتباع سنت کے اہتمام' نمازوں میں غایت درجہ خشوع و خضوع اور اخلاص و استقامت کے چرچے تھے حضرت کے دل و دماغ پر اس کا اثر پڑنا بھی لازمی اور قدرتی تھا۔

والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ ایک بلند پایہ مؤرخ اور حدیث و فقہ کا ذوق رکھنے والے عالی مرتبہ عالم تھے، عربی اور اردو پر یکساں قدرت تھی، تحریر نہایت شستہ و شگفتہ اور رچی تلی ہوتی۔ بڑے بلند اخلاق کے حامل تھے، ان کی امتیازی صفت ایذا رسانی اور دلآزاری سے حد درجہ اجتناب اور دوسروں کی دلداری تھی۔ صرف ۵۳ سال کی عمر پائی اور تصنیفات کا بے پایاں دفتر چھوڑا جن میں سب سے اہم اور ممتاز تصنیف "نزہۃ الخواطر" ہے۔

والدہ ماجدہ بھی اپنے زمانہ کی ممتاز خواتین میں تھیں قرآن مجید کی حافظہ تھیں اور شاعری کا نہایت ستھرا ذوق رکھتی تھیں، دعا و مناجات سے خاص مناسبت تھی۔

برادر اکبر مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب اپنی بہت سی خوصیات و کمالات کی وجہ سے ایک نادرۂ روزگار شخصیت تھے جس میں قدیم و جدید، تہذیب و ثقافت اور مشرقی و مغربی علوم کا نہایت حسین و دلآویز امتزاج نظر آتا ہے جو "مرج البحرین یلتقیان بینھما برزخ لا یبغیان" کی ایک عملی تصویر تھا۔

خاندان کی نمایاں شخصیات کی امتیازی صفات و خصوصیات کا نسل میں منتقل ہونا ایک مسلمہ حقیقت ہے، حضرت کی حیات و شخصیت پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ خاندان کے بزرگوں کے اوصاف و کمالات کو حضرتؒ نے اپنے اندر سمیٹ لیا تھا خاندان کی جن شخصیتوں نے حضرتؒ پر گہرے نقوش چھوڑے ان میں سرفہرست حضرت امیر المومنین سید احمد شہیدؒ کی ذات والا صفات ہے جس نے ذہنی اور فکری طور پر سب سے زیادہ متأثر کیا اور حضرتؒ نے تجدید و اصلاح کی جو کوششیں فرمائی ہیں ان میں اس کی گہری چھاپ نظر آتی ہے، حضرت سید احمد شہیدؒ اس خاندان کے وہ بدر کامل ہیں جن کی کرنوں سے ایک عالم منور ہوا۔ خاندان میں ان کے حالات و کمالات کا چرچا ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ پھر حضرت کے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی اور برادر بزرگوار مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحبؒ کو حضرت سید صاحبؒ سے خصوصی عقیدت و مناسبت تھی، مولانا سید عبدالحی حسنیؒ کے دہلی اور اس کے اطراف کے سفرنامے سے اس عقیدت و محبت بلکہ عشق و وارفتگی کا جا بجا اظہار ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے بارے میں حضرتؒ سے بارہا سنا ہے کہ حضرات صحابہ کرامؓ کے بعد معلوم ہوتا تھا کہ بھائی صاحب کو حضرت سید صاحبؒ سے ہی سب سے زیادہ عقیدت ہے۔ حضرت سید احمد شہیدؒ کا نام بچپن ہی سے حضرتؒ کے کانوں میں پڑا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی فکر و توجہ سے اس میں جلا پیدا ہوئی۔ اور حضرت سید صاحبؒ کی ذات اور ان کی سیرت و دعوت سے گہرا تعلق پیدا ہوا۔ اس کا واقعہ حضرتؒ خود تحریر فرماتے ہیں:۔

"اللہ تعالیٰ نے بھائی صاحب کو تعلیم و تربیت کا فطری اور خداداد ملکہ عطا فرمایا تھا اور اس میں وہ نئے نئے طریقہ اختیار کرتے تھے، وہ چاہتے تھے کہ میرا حضرت سید احمد شہید کی ذات اور ان کی سیرت و دعوت سے گہرا تعلق پیدا ہو کہ ہمارے اجداد انھیں کے سلسلہ کے حلقہ بگوش اور اس میں صاحب اجازت تھے اور ہماری جدی شاخ کا ان سے بہت گہرا ربط تھا۔ اسی زمانہ میں رسالہ "توحید" میں جو مولانا سید داؤد غزنوی

کی ادارت میں امرتسر سے نکلتا تھا مولوی محی الدین صاحب قصوری کا ایک سلسلۂ مضامین "ہندوستان کا مجاہد اعظم یا مجدد اعظم" کے نام سے نکلا تھا جس میں پہلی مرتبہ حضرت سید صاحب کی حیات و دعوت کو سلیقہ اور نئے اسلوب کے ساتھ پیش کیا گیا تھا۔ بھائی صاحب نے مجھے اس کے عربی ترجمہ کی ہدایت کی میں نے اس کا ترجمہ تیار کیا۔

اس رسالہ سے حضرت سید احمد شہیدؒ کے حالات کے مطالعہ کا مبارک سلسلہ شروع ہوا۔

والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ کا سفرنامہ "دہلی اور اس کے اطراف" گھر کی کتاب تھی جو ایک قلمی رسالہ کی شکل میں ان کے مسودات میں محفوظ تھی اس کا نام انھوں نے ارمغان احباب رکھا تھا۔ جو بعد میں "دہلی اور اس کے اطراف" کے نام سے شائع ہوئی۔ اس کے مطالعہ نے گہرا اثر ڈالا۔ حضرت خود تحریر فرماتے ہیں کہ:

"مجھے سب سے زیادہ جس تحریر نے سید صاحب کی شخصیت سے متعارف اور متأثر کیا وہ یہی روزنامچہ یا سفرنامہ ہے۔"

بالآخر وہ زمانہ اور مبارک موقع بھی آیا جو حضرت کے الفاظ میں زندگی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے بلکہ ایک نئے اور مبارک دور کا آغاز سنہ ۱۹۳۶ء کی گرمیوں کی تعطیل میں حضرت مولانا حیدر حسن خاں صاحب کی دعوت پر ٹونک کا سفر ہوا، ٹونک سے خاندان کے قریبی روابط تھے، اعزہ کی بڑی تعداد کا مسکن تھا اور حضرت سید صاحب کی شہادت کے بعد ان کے قریبی اہل خاندان اور بقیہ مجاہدین نے اس کو اپنا مستقر بنالیا تھا، حضرت نے جس زمانہ میں ٹونک کا سفر فرمایا اس وقت وہاں حضرت سید صاحب کے حقیقی نواسہ کے صاحبزادہ سید محمد اسماعیل صاحب موجود تھے جو حضرت کے رشتہ میں چچا ہوتے تھے۔ دوسرے نواسہ کے صاحبزادہ حافظ محمد یونس صاحب کی صاحبزادی بھی وہاں موجود تھیں، جو حضرت کے دوسرے رشتہ کے چچا سید عبدالحفیظ صاحب کی اہلیہ تھیں۔ اگرچہ حضرت کا زیادہ تر قیام داعی ومیزبان حضرت مولانا حیدر حسن خاں صاحب کے یہاں رہا۔ جو بڑی محبت کرنے والے اور شفیق استاد تھے۔ لیکن یہ اعزہ بھی محبت وتعلق میں کم نہ تھے، خاص طور پر اہلیہ سید عبدالحفیظ صاحبؒ نے بزرگانہ شفقت فرمائی حضرت اکثر انھیں کے یہاں مہمان رہے۔ ان ہی کے گھر سے حضرت سید صاحبؒ کے حالات وواقعات کا سب سے مستند وضخیم مرقع "وقائع احمدی" کئی جلدوں میں ملا۔

اسی سفر میں "سیرت سید احمد شہید" کی تالیف کا آغاز ہوا۔ اس کا واقعہ خود حضرتؒ کے الفاظ میں نقل کیا جاتا ہے:۔

" ایک دن جب میں مولانا کے ساتھ دریائے بناس کے کنارے ٹھہرا ہوا تھا جہاں سید صاحب اور ان کے کبار مجاہدین نے بارہا وضو کیا ہوگا صبح کے سہانے وقت طلوع آفتاب سے پہلے ایک پتھر پر بیٹھ کر دریا میں پاؤں ڈال کر سیرت سید احمد شہیدؒ کا مقدمہ لکھا جس پر مئی سنہ ۱۹۳۶ء کی تاریخ پڑی ہوئی ہے جو سید صاحب کی سیرت پر ایک اجمالی نظر کے عنوان سے کتاب میں شامل ہے۔ یہ بڑا مبارک آغاز تھا اور اس سے میری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے مجھے خود اندازہ نہ تھا کہ یہ اقدام خود میری زندگی میں انقلاب انگیز بلکہ عہد آفریں ثابت ہوگا۔"

وقائع احمدی سیرت سید احمد شہیدؒ کا بڑا ماخذ ثابت ہوئی اور بعد کے ایڈیشن میں اس سے بڑا فائدہ اٹھایا گیا اسی کے ساتھ اس کے مطالعہ سے حضرت پر گہرا اثر پڑا اس کے بارے میں حضرت سے راقم نے خود سنا ہے کہ "دارالعلوم کے مہمان خانہ میں راتوں کو لالٹین جلا کر میں اس کے مطالعہ میں محو ہو جاتا۔ بعض بعض مرتبہ معلوم ہوتا تھا کہ رحمت الٰہی کا کوئی جھونکا آیا، رقت طاری ہو جاتی اور خود بخود دعا کے لئے ہاتھ اٹھ جاتے۔" اسی سلسلہ میں یہ واقعہ بھی سنایا کہ "رائے بریلی کے سفر میں یہ کتاب مطالعہ میں تھی جب اسٹیشن پر اترا تو سواری والے دریافت کرنے لگے" کہاں جاؤگے؟" ہم پر اتنا گریہ طاری تھا کہ یہ بتانا بھی مشکل ہو رہا تھا۔"

حضرت سید صاحبؒ کے مجاہدانہ ومجددانہ کارناموں سے حضرتؒ کے تأثر کا اندازہ اس مختصر سے ٹکڑے سے بھی کیا جاسکتا ہے جو حضرت نے ٹونک کے سفر میں سیرت سید احمد شہیدؒ کے مقدمہ کے طور پر تحریر فرمایا تھا۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ اس تحریر کا لکھنے والا کوئی سن رسیدہ پختہ کار مصنف نہیں بلکہ صرف تیئیس ۲۳ سال کا نوجوان ہے جس نے ابھی تصنیف وتالیف کے میدان میں قدم رکھا ہے اس سے نوعمر مصنف کے طرز تحریر اور انداز فکر کا بھی اندازہ ہوگا۔

"کیفیات ایمانی کے جاں نواز جھونکے تاریخ اسلام میں بارہا آچکے ہیں لیکن ایمان ویقین اور خلوص وللہیت کی ایسی باد بہاری ہمارے علم میں کم سے کم اس ملک میں اس سے پہلے نہیں چلی۔ نہ اس سے پہلے اتنے بڑے پیمانہ پر عزم وتوکل، جوش جہاد، ایمان

واحتساب، شوقِ شہادت اور یقین آخرت کے ایسے نمونے دیکھنے میں آئے آدم گری، اور مردم سازی، اصلاح انقلاب کے ایسے محیر العقول واقعات اصلاح و تربیت کی تاریخ میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں"۔[۵۳]

حضرت سید صاحب کی عقیدت و محبت اور عظمت و بزرگی کا جو تخم بچپن میں پڑ گیا تھا وہ برگ و بار لاتا رہا۔ اخلاص و للّٰہیت، دینی حمیت، جوش دعوت، جذبۂ اصلاح و تجدید اور اللہ کے دین کو اللہ کی سرزمین میں سربلند دیکھنے کی تمنا اور امت کا جو درد حضرت کے دل میں تھا اس کی بنیاد اسی زمانہ میں پڑ گئی تھی، جب حضرت سید صاحبؒ کی ذات اور ان کی تحریک اصلاح و تجدید سے تعارف ہوا تھا۔ اس کی تعمیر و ترقی میں اگرچہ بعض دوسرے حضرات کا بھی حصہ ہے۔ لیکن حضرت سید صاحبؒ کی زندگی اور کارناموں کا جو اثر ابتداءً میں حضرت پر پڑا تھا اس کی چھاپ ساری زندگی رہی۔

دوسری شخصیت جس کی خصوصیات و امتیازات کی عکاسی حضرت کی زندگی پر نظر آتی ہے وہ والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ کی ذات بابرکات ہے اگرچہ حضرت نے ان کا زمانہ کم پایا۔ ان کی وفات کے وقت حضرت کی عمر دس سال سے بھی کم ہی تھی۔ لیکن ان کی خصوصیات موروثی طور پر بھی حضرت میں منتقل ہوئیں اور دینی و فکری طور پر بھی ان کمالات نے اثر ڈالا۔ خاص طور پر دو ایسی صفات ہیں جن میں والد صاحب کو خاص امتیاز تھا اور حضرت میں دونوں صفات پوری طرح منتقل ہوئیں ایک ایذا رسانی اور دل آزاری سے حد درجہ اجتناب دوسرے تصنیفی اور تاریخی ذوق۔

فرزند اکبر مولانا حکیم سید عبدالعلیؒ والد صاحبؒ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ کسی کا دل دکھانا، یا نقصان پہونچانا ان کے مذہب میں کفر تھا، حضرت کی زندگی بھی اسی کی آئینہ دار نظر آتی ہے۔

والد صاحب کی دوسری صفت بلکہ ان کا امتیاز وہ تصنیفی اور تاریخی ذوق ہے جس نے "نزہۃ الخواطر" جیسی تصنیف ان کے قلم سے نکلوائی جو اسلامیان ہند کی مکمل واحد تاریخ ہے، یہ آٹھ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے، اور اس میں ساڑھے چار ہزار اہل کمال اور مشاہیر رجال کے حالات لکھے گئے ہیں، حضرتؒ کو جو تاریخی ذوق بلکہ ذائقہ حاصل تھا وہ ان کو ورثہ میں ملا تھا، جد امجد مولانا حکیم سید فخر الدین خیالی بھی ایک بلند پایہ مصنف و مورخ تھے والد صاحبؒ بھی اس فن میں امتیازی مقام کے حامل تھے اس لئے اس کا ایک باکمال فرزند کی طرف منتقل ہونا ایک فطری اور قدرتی امر ہے، حضرت کے ادبی ذوق میں بھی والد صاحب کا بڑا حصہ ہے یہ کچھ تو موروثی طور پر منتقل ہوا اور کچھ ان کی تصنیفات کے مطالعہ سے پیدا ہوا، ان میں خاص طور پر "گل رعنا" کے بارے میں حضرت تحریر فرماتے ہیں کہ "یہ گھر کی کتاب تھی اس کو اتنی بار پڑھا کہ اردو شاعری کی تاریخ اور شعراء کے متعلق اتنی معلومات حاصل ہوگئیں کہ اس موضوع پر مجلس میں گفتگو کرنے اور گفتگو میں حصہ لینے کی استعداد پیدا ہوگئی"[۵۴] "یاد ایام" کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ" اردو مضمون نویسی میں ابتدائی اثر" والد مرحوم کی کتاب "یاد ایام" کا تھا جو سنجیدہ زبان کا ایک شگفتہ نمونہ ہے جس میں تاریخ کی متانت کے ساتھ زمانہ کا بانکپن بھی موجود ہے"[۵۵]

اب خاندان کے ان دو بزرگوں کا ذکر کیا جا رہا ہے جو براہ راست حضرتؒ پر اثر انداز ہوئے اور ان کی تربیت و نگہداشت کا حضرت کی آئندہ زندگی پر بنیادی اثر پڑا۔ ان میں پہلے والدہ ماجدہ کا تذکرہ مناسب ہے کہ ماں کی گود ہی انسان کی پہلی تربیت گاہ ہے اس کے بعد برادر اکبر جناب مولانا حکیم سید عبدالعلیؒ صاحب کا تذکرہ کیا جائے گا جو والد ماجد کے قائم مقام تھے، اور جن کی تربیت میں رہ کر ہی حضرتؒ نے تعلیم حاصل کی۔

والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی کی وفات ہوئی تو حضرت کی عمر دس سال سے بھی کم تھی، برادر بزرگوار اس وقت مدراس و بمبئی کے سفر پر تھے، وفات ہی کے دن راتوں رات تابوت تیار کیا گیا اور نعش رائے بریلی منتقل کی گئی پورا خاندان رائے بریلی منتقل ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب کی تعلیم کا سلسلہ ابھی جاری تھا اس لئے لکھنؤ قیام کی کوئی صورت نہ تھی اس طرح تقریباً دو سال رائے بریلی میں گذرے اور اس پورے عرصہ میں والدہ ماجدہ ہی نے تربیت فرمائی۔ حضرت "ذکر خیر" میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"گھر میں کسی بڑے فرد کے نہ ہونے کی وجہ سے والدہ صاحبہ ہی میری نگرانی اور اخلاقی و دینی تربیت کی ذمہ دار تھیں، مجھے قرآن مجید کی بڑی بڑی سورتیں انھوں نے اسی زمانہ میں یاد کرائیں باوجود اس کے کہ ان کی شفقت خاندان میں ضرب المثل تھی اور والد صاحب کے انتقال کی وجہ سے وہ میری دلداری اور ایک حد تک ناز برداری قدرتاً دوسری ماؤں سے زیادہ کرتی تھیں۔

لیکن دو باتوں میں بہت سخت تھیں، ایک تو نماز کے بارے میں مطلق تساہل نہیں برتتی تھیں۔ میں عشاء کی نماز پڑھے بغیر ہی اگر سو گیا خواہ کیسی ہی گہری نیند ہو اٹھا کر نماز پڑھواتیں اور نماز پڑھے بغیر ہرگز سونے نہ دیتیں، اسی طرح

فجر کی نماز کے وقت جگا دیتیں اور مسجد بھیجتیں اور پھر قرآن مجید کی تلاوت کے لئے بٹھا دیتیں۔ دوسری بات جس میں وہ قطعاً رعایت نہ کرتیں اور اس میں ان کی غیر معمولی شفقت و محبت حارج نہ ہوتی، یہ تھی کہ اگر میں خادم کے کسی لڑکے، یا کام کاج کرنے والے غریب بچوں کے ساتھ کوئی زیادتی کرتا یا حقارت کے ساتھ پیش آتا تو وہ نہ صرف مجھ سے معافی منگواتیں بلکہ ہاتھ تک جوڑواتیں اس میں مجھے کتنی ہی ذلت و خفت محسوس ہوتی مگر وہ اس کے بغیر نہ مانتیں اس کا مجھے اپنی زندگی میں بڑا فائدہ پہونچا، اور ظلم و تکبر اور غرور سے ڈر معلوم ہونے لگا اور دلآزاری اور دوسروں کی تذلیل و تحقیر کو کبیر گناہ سمجھنے لگا، اور اس کی وجہ سے مجھے اپنی غلطی کا اقرار کر لینا ہمیشہ آسان معلوم ہوتا۔"[۴۸]

حضرت مزید تحریر فرماتے ہیں:

"انھوں نے دل کھول کر میری اصلاح و تربیت، حصول علم اور قبولیت و کامیابی کے لئے دعائیں مانگنے کو اپنا وظیفہ اور ورد بنا لیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی زبان سے نظم و نثر میں جو کچھ کہلوایا اس کی مثال اس دور میں مشکل سے ملے گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ مجھے جو دو حرف آئے اور خدا کے نیک و مقبول بندوں سے قرب کی دولت اور ان کی شفقت اور دعاؤں کی نعمت حاصل ہوئی وہ انھیں کی مضطربانہ دعاؤں کی برکت ہے۔"[۴۹]

دعاؤں میں یہ اضطراب اور گریہ وزاری اور پھر وہ یقین جس کے ساتھ وہ دعا کرتی تھیں خاندان میں ضرب المثل تھا، روزانہ گھنٹوں دعاؤں میں صرف ہوتے، بعض بعض مرتبہ دوپٹہ آنسوؤں سے تر ہو جاتا، اس میں ان کے والد بزرگوار حضرت شاہ ضیاء النبی حسنیؒ کی نسبت و توجہ کو بھی دخل تھا جو اپنے وقت کے عارف کامل تھے اور یقیناً ان کی نسبت حضرت کی طرف بھی منتقل ہوئی اور حضرت کی زندگی میں زہد و قناعت دنیا سے بے رغبتی، خوف آخرت اور معرفت الٰہی کی جو درخشانی ہے اس میں حضرت شاہ صاحب کا بھی موروثی اثر ہے جو والدہ صاحبہ کی وساطت سے منتقل ہوا۔

برادر اکبر مولانا ڈاکٹر سید عبد العلی صاحبؒ کو جب لکھنؤ کے قیام میں اطمینان ہو گیا تو انھوں نے حضرت کو جلد ہی اپنے پاس بلوایا اور باقاعدہ تربیت و تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ لیکن والدہ صاحبہ کی دعاؤں اور تربیتی خطوط کا سلسلہ جاری رہا۔ خاص طور سے دو موقعوں پر جو اس کا اثر ہوا اس کے واقعات حضرت کی زبانی درج کئے جاتے ہیں:-

"ہمارے گھر میں کئی پشتوں سے ایک قیمتی ذخیرۂ کتب چلا آ رہا تھا جس میں بعض اہم خاندانی مخطوطات غیر مطبوعہ قلمی کتابیں اور مشاہیر کے خطوط، مسندات اور فتاویٰ کا اتنا بڑا ذخیرہ تھا جو کسی کے شخصی ذخیرہ کتب (PRIVATE COLLECTION) میں مشکل سے ہوگا اور ہمارے بزرگ اس ذخیرہ کو سینہ سے لگائے رہے اور سیلابوں اور نقل مکانی میں اس کی حفاظت کرتے رہے۔ بھائی صاحب مرحوم کی بڑی خواہش اور تاکید تھی کہ میں اس کی دیکھ بھال کرتا رہوں شاید ان کا مقصد یہ تھا کہ اس طرح مجھے اپنے خاندانی تبرکات اور علمی مطبوعات و مخطوطات سے واقفیت حاصل ہوگی اور میں ان کی قدر و حفاظت کر سکوں گا۔ میں اپنی نوعمری اور ادبی ذوق کی بنا پر پرانی قلمی کتابوں کی ورق گردانی اور ان کے مطالعہ سے گھبراتا تھا، بھائی صاحب مرحوم نے جب میرا تساہل دیکھا تو والدہ صاحبہ کو لکھا کہ وہ مجھے اس کی تاکید کریں۔ والدہ صاحبہ مرحومہ کا غالباً ۱۹۲۹ء یا ۱۹۳۰ء کا لکھا ہوا ایک طویل خط ذکر خیر میں درج کیا گیا ہے۔ اس کا ایک اقتباس یہاں پیش ہے:

"علی! ایک نصیحت اور کرتی ہوں بشرطیکہ تم عمل کرو اور اپنے بزرگوں کی کتابیں کام میں لاؤ اور احتیاط لازم رکھو جو کتاب نہ ہو، وہ عبدہٗ سلمہٗ کی رائے سے خریدو، باقی وہ کتابیں کافی ہیں اس میں تمہاری سعادت مندی ظاہر ہوگی اور کتابیں برباد نہ ہوں گی اور بزرگوں کو خوشی ہوگی، اس سعادت مندی کی مجھے بے حد خواہش ہے کہ تم ان کتابوں کی خدمت کرو۔"

مثل مشہور ہے کہ "کوئلوں کی دلالی میں ہاتھ کالے" ان کتابوں کے اٹھانے رکھنے اور ورق گردانی سے میری واقفیت عامہ میں بھی اضافہ ہوا اور خاندانی ذوق اور اسلاف کی خدمات دینی و علمی سے بھی شناسائی ہوئی مطبوعات میں تاریخ ہند و تراجم علماء اور تذکرے و سوانح کا بڑا ذخیرہ تھا۔ اس لئے کہ والد صاحب کو "نزہۃ الخواطر" کی تالیف کے سلسلہ میں ان کی ضرورت پڑتی رہتی تھی جو لوگ ان کی اس مشغولیت سے واقف تھے وہ ایسی کتابیں ان کو بھیجتے رہتے تھے جن سے ان کے اسلاف کا

تذکرہ محفوظ اور کتاب میں شامل ہو جائے ان کتابوں پر سرسری نظر ڈالنے سے بھی مجھے بہت نفع ہوا اور ہندوستان کی اسلامی و دینی تاریخ سے ذوق و شغف پیدا ہو گیا جو بعد میں بہت کام آیا"[11]

دوسرے واقعہ کے بارے میں حضرت تحریر فرماتے ہیں:

"۱۹۲۹ء میں مجھے میٹرک پاس کرنے کا خیال پیدا ہوا یہ وہ زمانہ ہے کہ خاندان کے سب لڑکے انگریزی تعلیم حاصل کر رہے تھے، عرب صاحب[12] بھی اس کی ضرورت وافادیت کے قائل تھے، اسی زمانہ میں مجھ پر انگریزی پڑھنے کا دورہ پڑا اور اس کا بخار چڑھا میں نے میٹرک کے کورس کی کتابیں خریدلیں اور پوری طرح اس کی تیاری میں منہمک ہو گیا ابھی امتحان میں بیٹھنے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ والدہ صاحبہ کو (غالباً بھائی صاحب کے ذریعہ) میرے اس انہماک کا علم ہوا انھوں نے مجھے بڑے موثر اور دردمندانہ خطوط لکھے ان میں سے ایک کا اقتباس یہاں پیش کیا جاتا ہے:-

"علی! تم کسی کے کہنے میں نہ آؤ اگر خدا کی رضامندی حاصل کرنا چاہتے ہو اور میرے حقوق ادا کرنا چاہتے ہو تو ان مردوں پر نظر کرو جنہوں نے علم دین حاصل کرنے میں عمر گذار دی ان کے مرتبے کیا تھے۔ شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ، شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ، شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ، مولوی محمد ابراہیم[13] صاحب رحمۃ اللہ، اور تمہارے بزرگوں میں خواجہ احمد صاحب رحمۃ اللہ[14] اور مولوی محمد امین صاحب رحمۃ اللہ[15] جن کی زندگی اور موت اس وقت قابل رشک ہوئی، کس شان و شوکت کے ساتھ دنیا برتی اور کیسی کیسی خوبیوں کے ساتھ رحلت فرمائی۔ یہ مرتبے کیسے حاصل ہو سکتے ہیں۔ انگریزی مرتبہ والے تمہارے خاندان میں بہت ہیں۔ اور ہوں گے مگر اس مرتبہ کا کوئی نہیں۔ ...... علی! اگر میرے سو اولادیں ہوتیں تو میں یہی تعلیم دیتی، اب تم ہی ہو اللہ تعالیٰ میری خوش نیتی کا پھل دے، کہ سو کی خوبیاں تم سے حاصل ہوں، اور میں دارین میں سرخرو اور نیک نام ہوں اور صاحب اولاد کہلاؤں آمین ثم آمین یارب العالمین"۔

والدہ صاحبہ کی دعائے نیم شبی اور آہ سحرگاہی کا اثر تھا کہ میرا دل اچانک انگریزی کی مزید تعلیم سے اچاٹ ہو گیا"[16]

والدہ مرحومہ نے اپنی توجہ، دعاؤں اور تربیت کا اثر اپنی نگاہوں سے دیکھا اور جس طرح اللہ نے ان کی ایک ایک دعا قبول فرمائی اور حضرت کو اصلاح و تجدید دین کی خدمت کے لئے قبول فرمایا وہ کسی صاحب نظر سے مخفی نہیں۔

یہاں پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ والدہ محترمہ کے ساتھ ہی ان کے شفیق ماموں کا بھی ذکر کر دیا جائے جو بڑی محبت کرنے والے تھے اور رائے بریلی کے قیام میں ان کی توجہ و سرپرستی بھی حاصل رہی، حضرت نے ان کے بارے میں خود ہی "کاروان زندگی" میں تحریر فرمایا ہے:

"ماموں مولوی حافظ محمد عبید اللہ صاحب مرحوم عجیب دلآویز اور جامع شخصیت کے مالک تھے، اسلامی زندگی کا ایک چلتا پھرتا نمونہ، بڑے جفاکش، پابند اوقات اور مستعد تھے۔ تہذیب و شائستگی ان پر ختم تھی، میری ذہنی و اخلاقی تربیت میں ان کا بھی بڑا حصہ ہے۔ ۳۱ مئی ۱۹۳۶ء کو وفات ہوئی"[17]

اردو ادب، شعر فہمی اور ذوق آفرینی میں ماموں زاد بھائی حافظ سید حبیب الرحمٰن صاحب کی صحبت کا بھی اثر پڑا ان کا ایک خاص ذوق یہ تھا کہ بچوں سے اساتذہ کے اشعار کا مطلب پوچھتے اور اردو میں تقریر و تحریر کا مقابلہ کرواتے۔ ان کے بڑے بھائی مولانا سید ابوالخیر برق کا بھی اس میں حصہ ہے جو زبان کا اچھا ذوق اور الفاظ کی تذکیر و تانیث میں سند کا درجہ رکھتے تھے"[18]

مولانا سید طلحہ صاحب حضرت کے حقیقی پھوپھا تھے وہ صرف و نحو کے استاد ہی نہیں بلکہ امام تھے اور خاص طور پر اس کی مشق کروانے میں ان کو ید طولیٰ حاصل تھا وہ ادبی اور صرفی و نحوی غلطی معاف نہیں کرتے تھے اور کئی کئی دن اس پر طنز فرماتے اور چٹکیاں لیتے رہتے تھے، بڑے متنوع الکمالات اور صاحب ذوق تھے، مجلسی علم میں مشکل سے کوئی ان کا ہم پلہ ہو گا حضرت نے صرف و نحو کی ان سے مشقیں کی ہیں۔ تحریر فرماتے ہیں:-

"صحیح عبارت پڑھنے اور صرف، نحو کے ضروری مسائل کے جزو دماغ بن جانے میں ان کا بڑا دخل ہے اس کے علاوہ ان سے اور بہت سے علمی فوائد حاصل ہوئے اور ذہنی تربیت ہوئی اور تاریخی شعور پیدا ہوا، اور اس متنوع ثقافت میں سے کچھ حصہ ملا۔ جس میں ان کو اپنے باکمال معاصرین میں بھی امتیاز حاصل تھا"[19]

دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں:-

"مجھے ان کی کتابی تعلیم سے زیادہ ان کی علمی صحبتوں سے نفع پہونچا اور اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ میرے ذہن کی تربیت و تشکیل اور میرے ذوق و معلومات میں جن

کو ایک مفرد لفظ "ثقافت" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے ان کا بہت بڑا حصہ ہے ان کا ایک بڑا تعلیمی فیض یہ تھا کہ اپنی تحریر کو بار بار تنک و تنقید کی نگاہ سے دیکھنے عربی الفاظ و صلات کے صحیح استعمال کا اطمینان کرنے اور عربی تراجم کی طرف بار بار مراجعت کرنے کی عادت پڑ گئی[۱۲۰]

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت کے عم محترم مولانا سید عزیز الرحمٰن صاحبؒ کا بھی تذکرہ کر دیا جائے جو حضرت کے والد مولانا حکیم سید عبدالحی صاحبؒ کے پھوپھی زاد بھائی اور مخصوص معاونین میں سے تھے، مولانا سے ان کو بڑی محبت و عقیدت تھی، حضرت کی تسمیہ خوانی انہی مولانا عزیز الرحمٰن صاحبؒ نے کرائی۔ حضرتؒ نے مولانا سے اردو کی بعض ابتدائی کتابیں بھی پڑھیں جن میں "سفینۂ اردو" خاص طور پر قابل ذکر ہے، اس کے بعد صرف و نحو کی بھی بعض کتابیں پڑھیں۔ حضرت "کاروان زندگی" میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"میری تسمیہ خوانی رائے بریلی میں ہمارے چچا مولوی سید عزیز الرحمٰن ندوی نے کرائی تھی، صرف و نحو کی قدیم نصابی کتابوں میں سے میں نے "میزان"، "منشعب" انھیں سے "صرف میر"، "نحو میر"، "پنج گنج" اپنے چچا مولوی سید عزیز الرحمٰن صاحب سے پڑھی جو بڑی محنت اور نگرانی سے ان کتابوں کو پڑھاتے تھے، اور جن کے یہاں تساہل و تسامح کا کوئی خانہ نہ تھا، جب کچھ زیادہ دنوں کے لئے رائے بریلی آتا، تو اس عربی کتاب کا حصہ بھی ان سے پڑھتا رہتا، جو عرب صاحب کے یہاں زیر درس ہوتی تھی۔"

لیکن جس شخصیت نے حضرت کی زندگی پر سب سے زیادہ اثر ڈالا اور جس کی تعلیم و تربیت میں رہ کر حضرت نے ترقی کے منازل طے کئے وہ برادر اکبر مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحبؒ کی ذات تھی، جو والد ماجد کی وفات کے بعد والد کے قائم مقام اور سرپرست تھے اللہ نے ان کو تعلیم و تربیت کا فطری اور خداداد ملکہ عطا فرمایا تھا اس کے لئے وہ نئے نئے طریقے اختیار کرتے تھے۔

والد ماجد مولانا سید حکیم عبدالحی حسنیؒ کی حیات میں وہ پوری طرح اپنی تعلیم میں منہمک رہے، ان کا سارا وقت اسی میں صرف ہوتا تھا لیکن والد صاحب کی وفات ہوتے ہی ان کے اندر ایک انقلاب پیدا ہوا۔

حضرت تحریر فرماتے ہیں کہ:

"اب وہ نرے بڑے بھائی نہ تھے جو اپنی تعلیم کی تکمیل میں ہمہ تن مشغول، یکسو اور گھر کے قصوں سے بے تعلق اور فارغ تھے بلکہ وہ ہم چھوٹے بھائی بہنوں کے شفیق باپ اور والدہ صاحبہ کے ایک سعادت مند فرزند بلکہ خادم تھے میں نے ان سے صرف شفقت پدری کا اظہار ہوتے نہیں دیکھا بلکہ شفقت مادری کا بھی صاف صاف ظہور ہوتا تھا[۱۲۱]

والد صاحبؒ کی وفات کے بعد رائے بریلی کے عبوری قیام میں ڈاکٹر صاحبؒ نے تعلیم کے سلسلہ میں فکر رکھی اور جب لکھنؤ کے قیام میں اطمینان حاصل ہوا تو جلد ہی حضرت کو اپنے پاس بلا لیا۔ نواب نور الحسن صاحب کی کوٹھی پر قیام تھا ڈاکٹر صاحب نے وہاں دو باتوں کا خاص اہتمام رکھا ایک یہ کہ نماز باجماعت ادا کی جائے، اس میں کبھی ایسا بھی ہوا کہ وہ میڈیکل کالج سے آئے اور نماز کے بارے میں پوچھا، کچھ شبہ ہوا تو تینوں نمازیں ظہر، عصر، مغرب دوبارہ پڑھوائیں۔

دوسرے حضرت کو یہ تاکید فرما دی کہ کوٹھی کے ملازمین کے پاس (جن کی بڑی تعداد تھی) زیادہ نہ بیٹھیں اور بے تکلف نہ ہوں کہ اکثر ان میں بری عادتیں ہوتی ہیں۔ نو عمری اور لڑکپن کے زمانہ میں اس سے متاثر ہو جانے کا بڑا خطرہ ہوتا ہے، یہ بھی اہتمام تھا کہ کسی سے کوئی ناول وغیرہ لے کر نہ پڑھیں، ذاتی کتب خانہ سے وہ خود انتخاب فرماتے اور پڑھنے کے لئے کتابیں دیتے، ان کتابوں میں سب سے پہلے انھوں نے جو کتاب پڑھنے کو دی وہ "سیرت خیر البشر" تھی اس کے بعد غالباً رحمۃ للعالمین مطالعہ میں آئی[۱۲۲]

علم النفس کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ ابتدائی نقوش دیرپا اور گہرے ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی اس حکیمانہ تربیت کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیرت سے تعلق خاطر پیدا ہو گیا اور اس کے مزید مطالعہ کا شوق بیدار ہوا۔ اور اس کی عظمت دل میں بیٹھ گئی جس نے آگے چل کر امام ابن القیم کی "زاد المعاد" اور "سیرت ابن ہشام" کے مطالعہ پر آمادہ کیا، سیرت کے مطالعہ اور اس سے شغف کے نتیجہ میں اس کے گہرے نقوش دل پر ثبت ہوئے، نبوی مزاج پیدا ہوا۔ اور دین کی تڑپ اور درد کا وہ حصہ وافر ملا جو صاحب سیرت صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث ہے۔

خاندان میں فارسی کا بڑا رواج تھا جد امجد مولانا حکیم سید فخر الدینؒ جہاں فارسی ادیب و شاعر تھے والد صاحبؒ کو بھی اس کا اچھا ذوق تھا۔ برادر اکبر مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلیؒ خود بھی فارسی میں مہارت رکھتے تھے اور بے تکلف گفتگو کر لیتے تھے ان کی دور رس نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ اب فارسی کا ورق الٹ رہا ہے اور قریبی زمانہ ایسا آنے والا ہے کہ اس کی اہمیت بالکل ختم ہو جائے گی اور صرف اس حد تک اس کی افادیت محدود ہو کر رہ جائے گی کہ بزرگوں کے ملفوظات اور مکاتیب یا شعرا

کے دوادین سے استفادہ ممکن ہو سکے، حضرت
کی فارسی کی تعلیم اس حد کو پہونچ رہی تھی اس
لئے ڈاکٹر صاحب نے فارسی کو وہیں روک دیا
اور ایک طرف انگریزی کی ایک ریڈر شروع کرائی
اور دوسری طرف انھوں نے عربی تعلیم کی طرف
خصوصی توجہ کی اور اس کا ایسا حکیمانہ انتظام کیا
جس کو توفیق الٰہی کے علاوہ کسی اور چیز سے
تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ قرین قیاس تھا کہ حضرت
کو دارالعلوم میں داخل کردیا جائے، جس کے وہ
خود اہم ذمہ داروں میں سے تھے اور بعد میں اس کے
ناظم بنائے گئے۔ لیکن یہ ایک غیبی انتظام تھا اور
قدرت کی طرف سے حضرت کو عالمی سطح پر جو اصلاح
و تجدید دین کی خدمت انجام دینی تھی اور جس طرح
عربوں کو خطاب کرنا تھا اور ان کو ان کے فرائض
یاد دلانے تھے اور جھنجھوڑنا تھا، اس کی ایک غیبی
صورت تھی کہ ڈاکٹر صاحب نے حضرت کو شیخ
خلیل بن محمد عرب یمنی کے سپرد کیا جو اس وقت
عربی کے کامیاب ترین استاد اور بقول حضرت
کے کہ اس کا ذوق ہی نہیں ذائقہ رکھتے تھے،
ڈاکٹر صاحب سے دوستانہ تعلقات اور بے تکلفی
تھی۔ اور اسی محلہ میں ان کی بھی سکونت تھی جس
میں ایک طویل عرصہ... مولانا عبدالحی صاحبؒ
نے گذارا تھا۔ پھر جلد ہی ڈاکٹر صاحب بھی اسی
محلہ میں منتقل ہوگئے۔ عرب صاحب کے درس میں
حضرت کے شریک صرف ان کے حقیقی بھائی شیخ
حسین عرب تھے، اس لئے عرب صاحب کی توجہ اور
قدرت تدریس کا بڑا حصہ حضرت کو ملا جو عام
طور پر بڑی جماعت کے طلبہ کو میسر نہیں آتا، پھر
حضرتؒ کے ذوق کو دیکھ کر یقیناً عرب صاحبؒ
نے اپنا دل نکال کر رکھ دیا۔

عربی تعلیم کی ابتداء پر خاندان کے بعض
بزرگوں نے ڈاکٹر صاحب پر نکتہ چینی بھی کی اور
مطالبہ کیا کہ ان بی. سی. ا(آئی۔سی۔ایس) کے لئے
تیار کرنا چاہئے۔ یہ ذہین بچہ ہے اس کو عصری
تعلیم دلائی جانی چاہئے تاکہ ترقی کرسکے، ڈاکٹر صاحب
نے جو بڑے کم گو اور متین واقع ہوئے تھے
برجستہ کہا کہ ہم علی کو دینی تعلیم دے رہے ہیں
جو میاںؒ ان کو دیتے۔ یہ ایسا دوٹوک جواب تھا
کہ لوگوں کی زبانیں بند ہوگئیں۔ پھر زمانہ نے دیکھ
لیا کہ یہ فیصلہ کیسا حکیمانہ اور دور اندیشی پر
مبنی ثابت ہوا۔ بعد میں حضرت کا جب لاہور کا
پہلا سفر ہوا تو پھوپھا مولانا سید طلحہ صاحب
نے ایک روز اورینٹل کالج کے پرنسپل مولوی
محمد شفیع صاحب سے ملایا اور ان سے یہ مشورہ
طلب کیا کہ یہ بچہ کون سی لائن اختیار کرے تو
تو انھوں نے اس وقت کے بعض مضامین اور
تحریریں دیکھنے کے بعد کہا کہ یہ عربی کو ہی اپنا
مضمون بنائیں اور اس میں ترقی کریں اور کمال
پیدا کریں۔

عربی مضمون نگاری اور انشاء کی پختگی
کے لئے ڈاکٹر صاحب نے خاص انداز اپنایا اور
عربی کا پہلا مضمون جو حضرت سید احمد شہیدؒ کے
تذکرہ پر مشتمل تھا، ڈاکٹر صاحب کی رہنمائی میں
لکھا گیا، اس کا ایک فائدہ تو عربی تحریر کی مشق
و تمرین کا ہوا۔ اور دوسرا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ حضرت
سید صاحب کی تحریک سے واقفیت اور ان
سے گہرا تعلق پیدا ہوا۔ اس کے بارے میں حضرت
"کاروان زندگی" میں تحریر فرماتے ہیں:۔

" بھائی صاحب نے مجھے اس کے عربی ترجمہ
کی ہدایت کی اور مشورہ دیا کہ میں تاریخ وسیر
کی مستند اور سلیس کتابیں دیکھ لوں اور ان
کی خاص خاص تعبیرات اور مطالب کے
طریق ادا جس کی تاریخ اور سوانح میں ضرورت
پڑتی ہے نوٹ کرلوں، میں نے اس غرض
کے لئے ابن الاثیر کی "الکامل" دیکھی اور
خاص خاص الفاظ و محاورے نوٹ کرتا
گیا اس کے بعد مجھے ترجمہ میں بڑی آسانی
ہوئی ہے"

یہی وہ ترجمہ ہے جو علامہ تقی الدین ہلالیؒ
کے واسطے سے علامہ رشید رضا کو بھیجا گیا اور انھوں
نے اپنے مؤقر رسالہ "المنار" میں اس کو شائع کیا
پھر بڑے اہتمام سے الگ رسالہ کی شکل میں طبع
کرایا اور خط بھیج کر نوعمر مصنف کو داد دی، حضرت
تحریر فرماتے ہیں:۔

"اس سے بڑھ کر ایک ہندی نوعمر طالب علم
کا کیا اعزاز ہوسکتا ہے کہ اس کا رسالہ
علامہ سید رشید رضا مصر سے شائع کریں"

اسی طرح ڈاکٹر صاحب نے ایک
دوسرے عربی مضمون کا اردو میں ترجمہ کرایا جو مکہ
مکرمہ سے نکلنے والے اخبار "ام القریٰ" میں شائع
ہوا تھا اس میں باہر سے آنے والے حجاج کے
لئے ہدایتیں تھیں، یہ ترجمہ ڈاکٹر صاحب کی ہدایت
پر "زمیندار" میں بھیج دیا گیا اور اس میں "ابوالحسن
علی پسر مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب سابق ناظم
ندوۃ العلماء" کے نام سے شائع ہوا۔

ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں بڑی وسعت
اور فکر میں عالمیت تھی، عالم اسلام کے حالات
سے باخبر رہتے، اس کے لئے عربی رسائل و اخبارات
شوق سے پڑھتے تھے، متعدد عربی رسائل گھر
میں آتے تھے، حضرت بھی ان سے فائدہ اٹھاتے،
ڈاکٹر صاحب رہنمائی فرماتے اور جدید تعبیرات
و اصطلاحات کی تشریح کرتے، حضرت تحریر فرماتے
ہیں کہ:۔

"میں رفتہ رفتہ ان کو بے تکلف پڑھنے
لگا اور مجھے اس سے انشاء و تحریر میں
بڑی مدد ملی کہ اخبارات میں تنوع بھی

ہوتا ہے اور تکرار بھی "۔

ڈاکٹر صاحب کو حضرت مجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہ دہلوی، حضرت سید احمد شہیدؒ، امام ابن تیمیہ اور امام ابن قیمؒ سے بڑی عقیدت اور ان کی کتابوں سے بڑا شغف تھا، حضرت کو بھی ان حضرات کی کتابیں پڑھنے کی تاکید فرماتے رہتے، حضرت فرماتے ہیں کہ :-

" بھائی صاحب کی تاکید کے نتیجہ میں میں نے ان کتابوں کا مطالعہ کیا اور مجھے ان سے بڑا نفع ہوا "

ڈاکٹر صاحب کو حضرت کی تربیت و اصلاح اور دینی ترقی کا بڑا اہتمام رہتا تھا، اس کے لئے انھوں نے حضرت کو سب سے پہلے سیرت کے مدرسہ میں داخل کیا تھا، اور سیرت کی کتابیں مطالعہ کے لئے دی تھیں اور اسی مقصد کی خاطر سب سے پہلا مضمون حضرت سید صاحبؒ پر لکھوایا، جو اسی خاندان کے خاص طور پر نمونہ (آئیڈیل) تھے۔

ڈاکٹر صاحب نے ابتدا میں بانی ندوۃ العلماء حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ یا اپنے استاد حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب سے بیعت کا ارادہ فرمایا تھا، لیکن اس کی نوبت نہیں آسکی اور ان دونوں حضرات کی وفات ہوگئی ان کے بعد ڈاکٹر صاحب کی نگاہ جانشین شیخ الہند حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ پر پڑی، اور ڈاکٹر صاحب نے ان سے بیعت و ارادت کا تعلق قائم کرلیا، مولانا کو ڈاکٹر صاحب سے بہت جلد اتنا تعلق اور اعتماد پیدا ہوگیا کہ لکھنؤ میں ان کے مکان کو مستقل قیام گاہ بنالیا، حضرتؒ کو اسی زمانہ میں حضرت مدنی کی خدمت اور ان سے استفادہ کا موقع ملا، پھر ایک دن ڈاکٹر صاحب نے بطور خاص حضرت کو مولانا کی خدمت میں پیش کیا، اسی کے نتیجہ میں حضرتؒ نے دیوبند کا سفر کیا، اور چار مہینہ استفادہ کی نیت سے قیام فرمایا، لیکن حضرت مدنیؒ سے یہ تعلق استفادہ کی حد تک رہا، اس لئے کہ حضرت اس واقعہ سے ایک سال قبل حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ کے شیخ حضرت خلیفہ غلام محمد صاحب دینپوریؒ سے بیعت کا تعلق قائم فرما چکے تھے، اس سلسلہ میں یہ واقعہ بھی حضرتؒ سے سنا کہ جب میں دیوبند حضرت مدنیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تو حضرت کو یہ خیال ہوا کہ میں بیعت کی نیت سے حاضر ہوا ہوں، لیکن پھر حضرت کو شاید خود ہی ادراک ہوگیا کہ میں بیعت ہوچکا ہوں، دریافت فرمایا تو میں نے عرض کیا کہ حضرت خلیفہ سے بیعت کی ہے تو فرمایا کہ مجھے بھی ان سے اجازت ہے۔

حضرتؒ کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کے اسی اصلاحی و تربیتی اہتمام کا نتیجہ تھا کہ جب ۱۹۳۸ء کو حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ لکھنؤ تشریف لائے تو خود بھی پابندی کے ساتھ مجلس میں حاضری دیتے، اور حضرت کو بھی التزاماً اپنے ساتھ لے جاتے، حسن اتفاق کہ مولانا ظفر احمد عثمانی کا رسالہ " القول المنصور" زیر طبع تھا اور مولانا کی توجہ اور دلچسپی کا مرکز بنا ہوا تھا، اس میں طویل طویل عربی عبارتیں تھیں، واصل بلگرامی صاحب نے تصحیح و مقابلہ کا کام حضرتؒ کے سپرد کردیا، اس وقت حضرت کی عمر صرف چوبیس سال کی تھی، اس تقریب سے مزید قرب و حضوری اور استفادہ کا موقع ملا۔

حضرتؒ کی دینی ترقی اور خدمتِ اصلاح و تجدید کے لئے قبولیت کی ڈاکٹر صاحب کو بڑی فکر رہتی، حضرت مدنی کو بعض خطوط میں وضاحت کے ساتھ تحریر فرماتے ہیں کہ چاہتا ہوں کہ جس طرح حضرت سید احمد شہیدؒ سے اللہ تعالیٰ نے اصلاح و تجدید کا کام لیا ویسے ہی بلکہ اس سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ علی سے یہ کام لے، حضرت مدنیؒ ایک خط کے جواب میں فرماتے ہیں :-

" وہ کریم کارساز موصوف کو مفتاحِ خیر اور مغلاقِ شر بنائے اور حضرت سید صاحبؒ شہید قدس اللہ سرہ العزیز کی تجدید ملتِ اسلامیہ کی خدمت علیہ کا علمبردار بنا کر نعمائے لدنیہ سے مالا مال کرے "

ڈاکٹر صاحب حضرت کی تربیت کے لئے نئے نئے طریقہ اختیار فرماتے تھے، ۱۹۲۹ء کے امتحان میں حضرتؒ نے نمایاں کامیابی حاصل کی، ڈاکٹر صاحب نے بیس روپیہ دیئے کہ حضرت اپنے اساتذہ و رفقاء کی دعوت کردیں پھر کچھ وقفہ دے کر فرمایا کہ اس سے کوئی خاص فائدہ نہیں، لوگ ایک وقت کھانا کھائیں گے اور ذائقہ بدل جائے گا، اس رقم کو مدرسہ علوم شرعیہ مدینہ منورہ بھیج دو کہ ثواب ملے اور حقیقی و دیرپا فائدہ حاصل ہو، حضرت نے ایسا ہی کیا۔

لکھنؤ میں محلہ کے قریب ہی ایک ڈاکٹر صاحب رہتے تھے جو طبی سارٹیفکٹ دینے میں بہت فراخدل اور غیر محتاط تھے ایک دن ان پر تنقید ہو رہی تھی (غالباً ان کا انتقال ہوچکا تھا) حضرت تحریر فرماتے ہیں کہ :-

" میں نے بھی اس موضوع سے دلچسپی لی، اور ان کے اس طرزِ عمل پر تنقید کرنے لگا بھائی صاحب نے فوراً مجھے ٹوکا اور کہا کہ تم بچپن میں ایک مرتبہ سخت بیمار ہوگئے تھے انھوں نے بڑی ہمدردی اور دلچسپی کے ساتھ علاج کیا تم کو اس کا شکر گذار ہونا چاہئے اور ان کے حق میں کلمۂ خیر کہنا چاہئے مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا "

حضرتؒ کو ڈاکٹر صاحبؒ کی تربیت میں رہ کر نمایاں طریقہ پر جو امتیاز حاصل ہوا وہ فکر کا

دائرہ شاہ علم اللہؒ رائے بریلی میں حضرت مولاناؒ کی قیام گاہ

دائرہ شاہ علم اللہؒ رائے بریلی کی سئی ندی جس میں حضرت مولاناؒ جوانی میں پیراکی کی مشق کرتے تھے
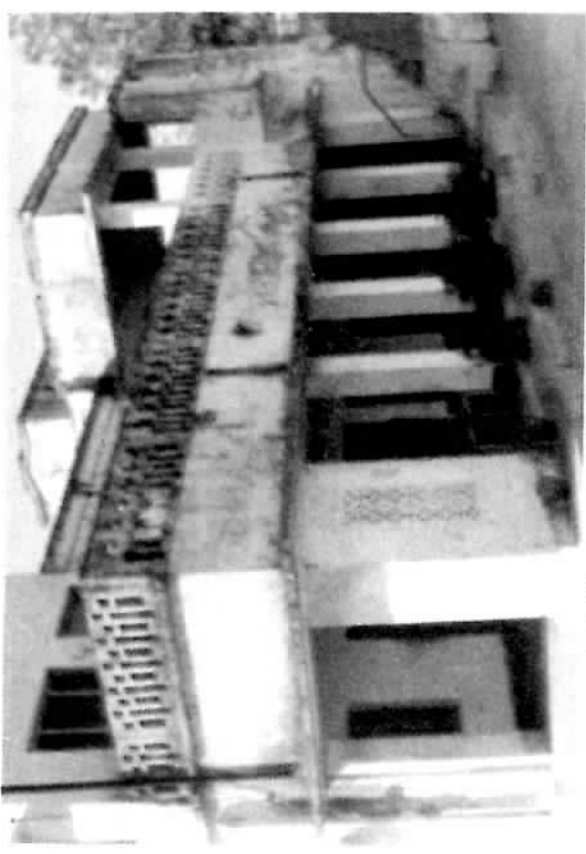
دائرہ شاہ علم اللہؒ رائے بریلی کا وہ میدان جہاں حضرت مولاناؒ نے بچپن گذارا

حضرت مولاناؒ کی نانہال (گھر)

دائرہ شاہ علم اللہؒ رائے بریلی میں حضرت مولاناؒ کا وہ بستر جس پر انتقال فرمایا
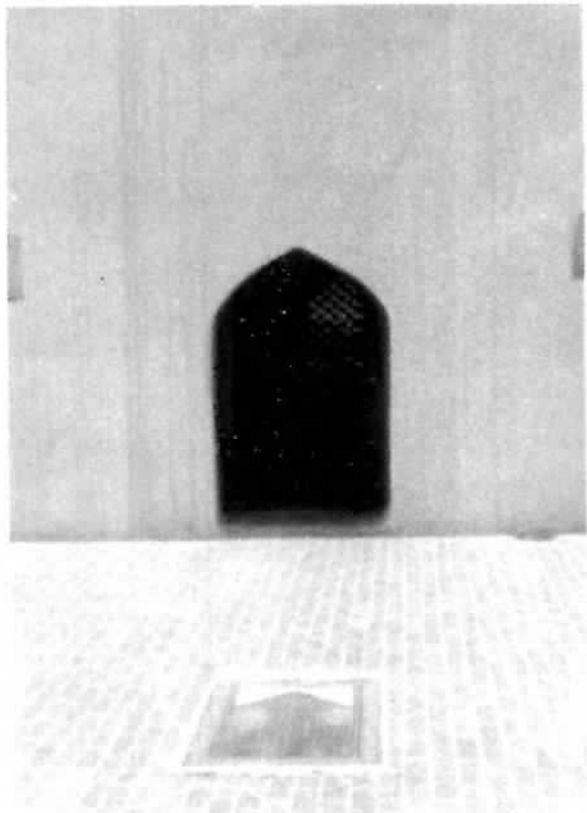
مسجد دائرہ شاہ علم اللہؒ رائے بریلی کی وہ جگہ جہاں حضرت مولاناؒ نے شعبان ۱۴۲۰ھ میں چاشت کی آخری نماز پڑھی

حضرت مولاناؒ کے گھر کا وہ کمرہ جس میں آپ کی زندگی کے اکثر شب و روز گذرے

حضرت مولاناؒ کی آخری آرام گاہ (روضہ حضرت سید شاہ علم اللہ حسنیؒ)
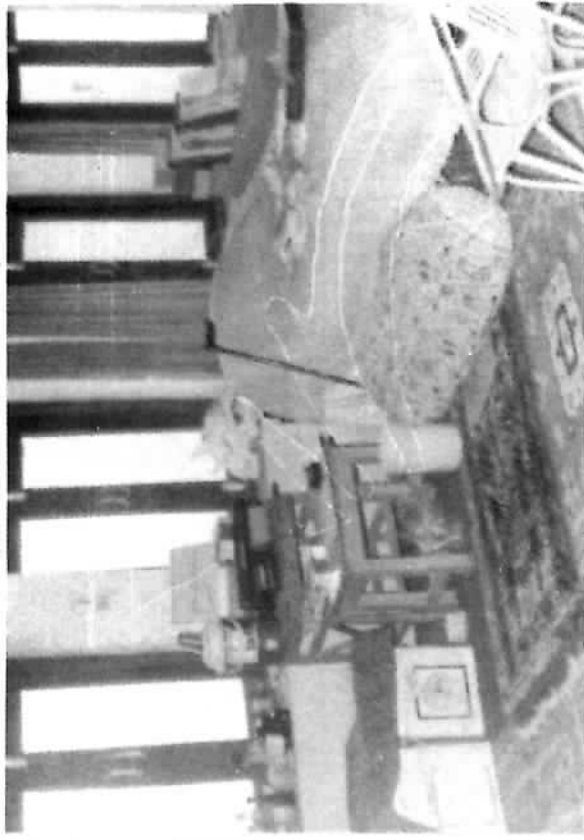
دائرہ شاہ علم اللہؒ رائے بریلی میں حضرت مولاناؒ کی آرام گاہ

دائرہ شاہ علم اللہؒ رائے بریلی میں حضرت مولاناؒ کی ہمشیرہ کا مکان جہاں
حضرت مولاناؒ اپنی ہمشیرہ اور اہل خانہ سے ملاقات کرتے تھے

مسجد شاہ علم اللہؒ کے صحن میں مولسری کا وہ درخت جسکے سایہ میں
حضرت مولاناؒ نے ارکان اربعہ و متعدد کتب تصنیف فرمائیں
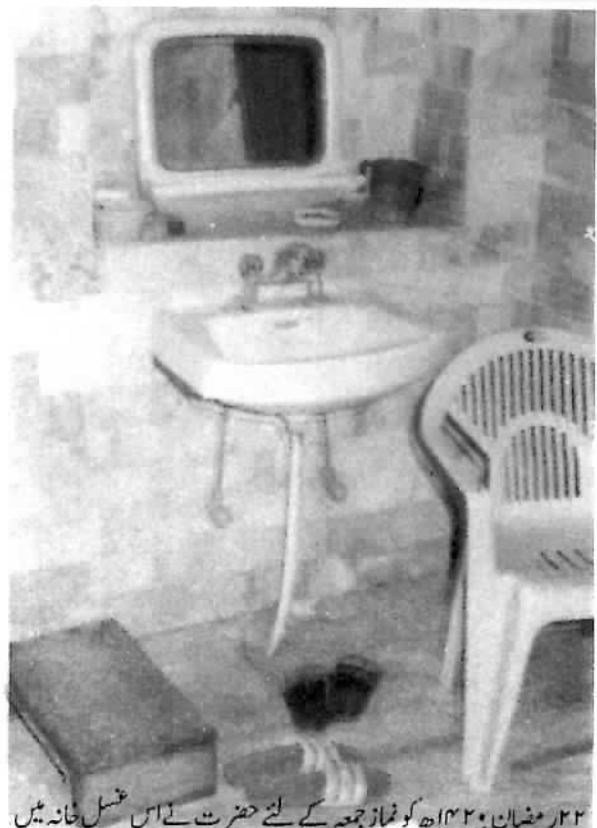
۲۲ رمضان ۱۴۲۰ھ کو نماز جمعہ کے لئے حضرت نے اس غسل خانہ میں
غسل کیا اور اسکے پانچ منٹ بعد وہ اپنے مالک حقیقی سے جا ملے

حضرت مولاناؒ کے دور نظامت میں مسجد کی ۱۶ صفوں کی توسیع اور بالائی منزل
کی تعمیر کے بعد مسجد کے جنوبی حصہ کا ایک منظر

دار العلوم ندوۃ العلماء میں حضرت مولاناؒ کی قیام گاہ (مہمان خانہ)

توازن واعتدال، حقیقت پسندی، منصوصات وغیر منصوصات اور مقاصد ووسائل کا فرق ہے جو خود ڈاکٹر صاحب کی ایک نمایاں صفت تھی۔ حضرتؒ ڈاکٹر صاحب کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"وہ اپنی ذاتی زندگی میں جتنے متقشف پختہ اور قدامت پسند تھے اپنے تعلیمی خیالات ونظریات جدید چیزوں کے مطالعہ اور دنیا سے واقفیت کے بارے میں اتنے ہی وسیع الخیال، حقیقت پسند تھے، انھوں نے محبت وعقیدت میں بھی حدود قائم کر رکھے تھے، بعض حضرات کو دیکھا ہے کہ ان کو کسی شخصیت سے عقیدت ہوئی تو انھوں نے جوش عقیدت یا فرط محبت میں اپنے عمر بھر کے تعلیمی خیالات ونظریات یہاں تک فکر ونظر اسلوب تحریر میں بھی تبدیلی کر دی لیکن ڈاکٹر صاحب کے یہاں اس بارے میں پورا اعتدال وتوازن تھا وہ کسی دور میں بھی اپنے کسی سوچے سمجھے تعلیمی نظریہ یا تحقیق سے دستبردار نہیں ہوئے، نصاب ونظام تعلیم، تصوف واصلاح باطن تقلید وعدم تقلید کے درمیان نقطۂ اعتدال اور سیاسیات اسلامی کے بارے میں ان کا جو مسلک جوانی میں تھا وہی اخیر تک قائم رہا۔"

حضرت کی حیات میں بھی ہمیں یہ صفات نمایاں طور پر نظر آتی ہیں، حضرتؒ خود اپنے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"میرا ایک علمی وفکری پس منظر تھا میں ہر دور میں منصوصات وغیر منصوصات اور مقاصد ووسائل میں فرق کرتا رہا، میرے نزدیک خوب سے خوب ترکی تلاش اور نافع سے انفع کی جستجو کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔"

ڈاکٹر صاحب کی اس حقیقت پسندی کا نتیجہ تھا کہ مغربی تہذیب کو قریب سے دیکھنے اور اس کے نظام تعلیم کے سایہ میں برسوں رہنے کے باوجود اس کے سخت ناقد تھے، لیکن ان کی تنقید جذباتی وسطحی نہیں تھی بلکہ وہ علم ومطالعہ پر مبنی تھی ان کی مجلسوں میں اس کے کمزور پہلوؤں کی نشاندہی اور اس پر اصولی تنقید ہوتی تھی، حضرتؒ فرماتے ہیں کہ:۔

"ان مجلسوں سے مجھے وہ فائدہ پہونچا جو مغربی تہذیب اور موجودہ نظام حیات پر درجنوں کتابیں پڑھنے سے نہیں ہوتا۔"

مضمون میں اگرچہ خاندان کے بعض ان بزرگوں کا بھی تذکرہ کر دیا گیا ہے، جن سے حضرت کی شخصیت کی تشکیل میں مدد ملی لیکن اس میں بنیادی طور پر ان ہی چار شخصیتوں کا حصہ ہے، جن کا تفصیل سے ذکر کیا گیا۔ اس کا بھی خلاصہ ہم اس طور پر کر سکتے ہیں کہ اخلاص وللّٰہیت، دینی حمیت، جوش دعوت اور خدمت اصلاح وتجدید کی بنیاد حضرت سید احمد شہیدؒ کی سیرت اور تحریک تجدید وجہاد سے پڑی، تاریخی وادبی ذوق آباؤکرام خاص طور پر والد ماجد حکیم مولانا سید عبدالحیؒ سے موروثی طور پر منتقل ہوا۔ قبولیت وشہرت میں سب سے بڑا حصہ والدہ ماجدہ کی دعائے نیم شبی اور آہ سحرگاہی کا ہے۔ برادر اکبر مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلیؒ کی تربیت کا اگرچہ حضرتؒ کی سیرت وشخصیت کی تشکیل میں سب سے بڑا اور بنیادی حصہ ہے، لیکن اس سے خاص طور پر فکری توازن واعتدال کی صفت پیدا ہوئی۔

اس مضمون کا اختتام حضرتؒ کے اس ملفوظہ سے کیا جاتا ہے جو اس عاجز نے اور دوسرے حاضر باشوں نے متعدد مجلسوں میں حضرت سے سنا ہوگا کہ:۔

"اللہ تعالیٰ نے جو کچھ بھی خدمت کی توفیق دی اور عربوں کو خطاب کرنے اور ان کو ان کے فرض منصبی یاد دلانے کا کام لیا وہ سب والد صاحبؒ کے اخلاص والدہ کی دعائیں، بھائی صاحبؒ کی تربیت اور اساتذہ ومشائخ کی شفقت ومحبت کا نتیجہ ہے۔"

۱؎ حیات عبدالحیؒ ص ۱۹-۲۰

۲؎ حضرت کے جد امجد مولانا حکیم سید فخرالدین خیالی۔ حضرت مولانا محمد ظاہر صاحب کے مجاز تھے جو براہ راست حضرت کے خلیفہ تھے دوسری طرف ان کو حضرت خواجہ احمد صاحب نصیر آبادی سے بھی اجازت تھی جو بیک واسطہ حضرت سید صاحب کے سلسلہ میں ہیں جب کہ ان کے والد مولانا عبدالعلی صاحب کو براہ راست حضرت سید صاحبؒ کی طرف سے اجازت ونسبت حاصل تھی۔

۳؎ کاروان زندگی اول ص۱۱۸

۴؎ ایضاً ص۱۶۷

۵؎ ایضاً ص۱۶۰

۶؎ سیرت سید احمد شہیدؒ جلد اول ص۵۴

۷؎ کاروان زندگی اول ص۹۴

۸؎ ایضاً ص۹۵

۹؎ ذکر خیر ص۴۷-۴۸

۱۰؎ ایضاً ص۵۱-۵۴

۱۱؎ ڈاکٹر عبدالعلی صاحبؒ کی عرفیت

۱۲؎ کاروان زندگی ج۱ ص۱۱۳

۱۳؎ شیخ خلیل بن محمد عرب حضرت کے استاد

۱۴؎ ان سے مولانا ابو محمد ابراہیم صاحب امروہی مشہور اہل حدیث عالم مراد ہیں جو حضرت کے نانا حضرت شاہ ضیاء النبی کے مرید اور بڑے ربانی حقانی عالم تھے۔

۱۵؎ مولانا سید خواجہ احمد نصیر آبادیؒ تذکرہ کے لئے ملاحظہ حضرت کی کتاب کاروان ایمان وعزیمت۔

(باقی ص۲۷۵ پر)

ارشادات وملفوظات

مرتب : ــــــــــــ سید محمود حسن حسنی ندوی

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیفات، خطبات، تعلیمات کا ایک بڑا ذخیرہ ہمارے آپ کے سامنے ہے۔ اس مضمون میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی مجالس کی حکیمانہ باتوں میں سے انتخاب کرکے چند نمونے پیش کئے جا رہے ہیں۔ ان ارشادات کو استاذ گرامی مولانا نذر الحفیظ صاحب ندوی نے جمع فرمایا ہے اور بعض راقم سطور نے جمع کردہ ہیں۔ نفع اللہ بہا الامۃ ۔

آبائی وطن (تکیہ شاہ علم اللہ) کی خصوصیت

تکیہ حضرت شاہ علم اللہ رائے بریلی کی خصوصیت اور اہل اللہ ومشائخ کبار کا اس جگہ سے تعلق کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ یہاں کی چار چیزیں بنیادی ہیں۔ (۱) اتباع سنت (۲) اعلاء کلمۃ اللہ (۳) توحید خالص۔ (۴) احیاء سنن۔

تعلیم کا آغاز قرآن سے

فرمایا میری علمی زندگی قرآن مجید ہی کے مطالعہ سے شروع ہوئی، میں نے کئی جگہ لکھا بھی ہے، مجھے اللہ نے ایک ایسا استاذ عطاء کیا تھا، جنھیں ذوق ایمانی اور ذوق قرآنی ملا تھا۔ وہ قرآن پڑھتے تھے اور روتے تھے، پہلا نقش جو مجھ پر پڑا وہ ان کی آواز کا تھا جو درد میں ڈوبی ہوئی تھی، میری خوش نصیبی تھی کہ پہلا معلم جو مجھے عطا کیا گیا، وہ رقیق القلب تھا۔ دل درد مند رکھتا تھا۔ یہ معلم شیخ خلیل عرب تھے

مرتب ـــــ

علامہ سید سلیمان ندوی اور فہم قرآن

فرمایا: لوگ مولانا سید سلیمان ندویؒ کو ایک مؤرخ اور سوانح نگار کی حیثیت سے جانتے تھے یا متکلّم کی حیثیت سے، لیکن میرا تأثر ہے کہ مجھے ہندوستان ہی نہیں بلکہ تحتی براعظم میں کوئی ایسا شخص نہیں نظر آیا جس کا مطالعۂ قرآن اتنا وسیع اور عمیق ہو جتنا سید صاحب کا تھا، مجھے ان کے مطالعۂ قرآن سے استفادہ کی سعادت ملی ہے۔

قرآن مجید کا اہم پہلو

قرآن مجید کے دو پہلو ہیں ایک اس کا تعلیمی اور تبلیغی پہلو ہے، یعنی وہ عقائد جن پر ہر شخص کو ایمان لانا چاہیئے، اور سمجھنا چاہیئے۔ اور قرآن سے اخذ کرنا چاہیئے۔ اس کے متعلق قرآن کا اعلان ہے کہ" بلسان عربی مبین" (روشن اور واضح عربی میں ہے) اس سے زیادہ واضح الفاظ میں بتا دیا "ولقد یسرنا القرآن للذکر فھل من مذکر" کہ ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان کر دیا ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا۔

قرآن ہر ایک کیلئے ہے

فرمایا: میری تحریروں کا تانا بانا قرآن مجید، سیرت نبویؐ اور تاریخ ہے اور تاریخ کو میں قرآن کی تفسیر سمجھتا ہوں، تاریخ کے بعد ادب سے بھی میں نے اپنی تحریروں میں استفادہ کیا ہے۔ قرآن میں ہر ایک کے لئے ہر موقع کی بات ہے، یہ ایک البم ہے جسمیں ہر ایک اپنی تصویر دیکھ سکتا ہے۔

اولین تصانیف

عرض کیا گیا کہ، حضرت والا کو اپنی کتابوں میں سب سے محبوب کون سی کتاب ہے، فرمایا" فضیلت تو "نبی رحمتؐ (السیرۃ النبویۃ) کو حاصل ہے، ویسے " ماذا خسر العالم با نحطاط المسلمین" جس سے عالم عرب میں ہمارا سب سے پہلے تعارف ہوا، اور عام وخاص سب حلقوں میں مقبول ہوئی اور خوب اس کی اشاعت ہوئی، اور سیرت سید احمد شہیدؒ ہے جس سے ہندوستان میں تعارف ہوا۔ اور دینی دعوتی حلقوں نے اس کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا، حضرت تھانویؒ نے تو بہت بلند الفاظ فرمائے حضرت مدنیؒ نے وقیع تقریظ لکھی، مولانا سید سلیمان ندویؒ نے بڑا جامع طاقتور مقدمہ لکھا جو ان کی تحریروں میں شاہکار ہے اور امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔

ندوۃ العلماء

فرمایا: ہم نے دنیا دیکھی ہے، یورپ کے دانشگاہوں کو دیکھا ہے، ازہر دیکھا، جامعات دیکھیں، ہم کسی عصبیت اور تنگ نظری کی بناء پر نہیں کہتے بلکہ اپنے مطالعہ اور تجربہ کی بناء پر کہتے ہیں

کہ ندوہ کے تخیل سے بڑھ کر کوئی تخیل نہیں ہے اور یہ بروقت اور مفید ہے اللہ تعالیٰ نے اس کو باقی رکھا، اور اس کو قبولیت سے نوازا ہے، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ نے اپنے خط میں اس تحریک سے بڑی امیدیں وابستہ کی ہیں، اور دعائیں کی ہیں، یہ مولانا محمد علی مونگیریؒ کے خلوص و للہیت کا اثر ہے، وہ تو اہل اللہ میں سے تھے، یہ تخیل اور فکر اللہ تعالیٰ نے ان پر القاء کیا تھا۔

ندوہ مجددی وولی اللّٰہی درسگاہ ہے۔

فرمایا: دارالعلوم ندوۃ العلماء ہندوستان کی دو عہد ساز شخصیتوں کے مدرسۂ فکر پر قائم ہوا ہے، ایک حضرت مجدد الف ثانیؒ، دوسرے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ، یہی دراصل اس کے بانی اس کے روح رواں اور معیار ہیں، علمی ارتقاء کا بھی اور فکری ارتقاء کا بھی، اور یہ دارالعلوم انہی دونوں شخصیتوں کے راستہ پر ہے، ان کی دعوت اور جد و جہد کی بنیادی خصوصیات میں عقیدۂ اسلام کہ جو صحابہؓ کا عقیدہ تھا۔ ائمہ اربعہ، مجددین و مصلحین کا عقیدہ تھا، دوسری چیز اشاعت دین ہے اور تیسری بات جو ان حضرات کا خاصہ تھا حمایت دین اور حمیت دین ہے، دین مخالف اور منافی کوئی چیز برداشت سے باہر ہوتی تھی۔

ندوہ کی خصوصیت

ایک موقع پر فرمایا: مطالعہ میں تعمق، توسع اور تنوع ہونا چاہئے۔ یہ ندوہ کی خصوصیت اور امتیاز ہے۔

رضائے الٰہی کا خیال

ایک خاص نشست میں جس میں ادباء زیادہ تھے فرمایا کہ دو چیزیں ہیں ایک لکھنا، تصنیف کرنا، دوسری مطالعہ اور علم کا حصول، تحریر و تصنیف کے پیش کرنے کے ذریعہ لوگوں کے سامنے آنا مقصد نہ ہو، بلکہ اس میں اللہ کی رضا پیش نظر رہنی چاہیئے، اور اس کے دین اور کلمہ کے اعلاء کیلئے اپنے قلم کا زور صرف کرنا چاہیئے۔ اسی طرح علم کا حصول محض معلومات بڑھانے کیلئے اور اونچا مقام پانے کیلئے نہیں ہونا چاہیئے، بلکہ علم کا تعلق رب سے مستحکم ہونا چاہیئے اسی لئے فرمایا گیا "اقراء باسم ربك الذی خلق"۔

ادبی مطالعہ کی افادیت

فرمایا کہ دینی دعوتی اور تبلیغی کام کرنے والوں کو یہ ضروری ہے کہ شروع میں ان کا مطالعہ ادبی ہو، اور ذوق ایسا بن جائے جس سے وہ دین کو عصری زبان میں طاقتور طریقہ سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ تک پہونچا سکیں، دینی حلقوں میں اس بات کی بہت کمی ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ جب وہ دینی موضوعات پر لکھتے ہیں، تو ان کی تحریروں میں قوت و تاثیر نہیں ہوتی ہے اور جدید طبقہ کو وہ متاثر نہیں کر پاتے ہیں اگر دینی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ طبقہ ادب پڑھتا ہے تو وہ اثر نہیں ہوتا جو ہونا چاہیئے اور نہ اس کا فائدہ ہوتا ہے۔

"کلموا الناس علی قدر عقولهم" میں یہ بھی ہے کہ ان کی سطح اور نفسیات کے متعلق ان کی زبان میں بات کی جائے، ادب، دعوت اور دین تینوں میں ربط ضروری ہے، فرمایا: شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، علامہ ابن الجوزی جیسے مصلحین اور اولیاء اللہ نے بھی ادب کی طرف توجہ کی تھی۔ اور ان کے اساتذہ میں ایسے نام ملتے ہیں جن سے انھوں نے ادب پڑھا تھا۔

اشتراکی اور غیر اشتراکی ادب

مولانا ڈاکٹر سید ضیاء الحسن ندوی صاحب راوی ہیں کہ ایک موقع پر حضرت مولانا نے فرمایا کہ جن ملکوں میں کمیونسٹ یا اشتراکی نظام قائم ہے وہاں تیار کئے جانے والے ادب کا غیر اشتراکی ملکوں کے ادب سے اگر غیر جانبدارانہ تقابلی مطالعہ کیا جائے تو صاف ظاہر ہوگا کہ فنی اور تاثیری لحاظ سے اشتراکی ادب غیر اشتراکی ادب کے مقابلہ میں خاصا بے حقیقت اور بے اثر ہے اور اس فرق کو سمجھنے کے لئے کسی بڑی ذہانت کی ضرورت نہیں، محض ذوق سلیم کافی ہے۔

ایک مرتبہ ایک طالب علم نے حضرت سے سامنے عرض کیا کہ انگریزی ادب میں افسانہ، ناول اور ڈرامہ سے متعلق ادب کیلئے فکشن (FICTION) کی اصطلاح مستعمل ہے، فکشن کے الفاظ میں جھوٹ اور غیر واقعی قصے کہانیوں کا مفہوم لغوی طور سے موجود ہے، کیا اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ انگریزی اور یورپی ادب کی بنیاد کذب و فریب پر ہے؟ حضرتؒ نے جواب میں فرمایا کہ نہیں، یہ محض ایک ادبی اور فنی اصطلاح ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ فکشن لٹریچر ایک طرح کا تمثیلی ادب ہے جس پر کذب و افتراء یا فریب اور دھوکہ کا اطلاق نہیں کرنا چاہیئے۔ آسمانی نصوص میں بھی تمثیل و تعبیر سے کام لیا گیا ہے۔

(روایت ڈاکٹر ضیاء الحسن ندوی)

دل و دماغ کا فرق

دل و دماغ کے فرق کو واضح کرتے ہوئے ایک موقع پر فرمایا: کہ دل اور دماغ میں جو بڑا فرق ہے وہ یہ ہے کہ دماغ ہفت زبان ہے، دل ایک زبان رکھتا ہے، دماغ انگریزی جانتا ہے، دماغ فرانسیسی جانتا ہے، دماغ عربی جانتا ہے، دماغ فارسی جانتا ہے، سنسکرت جانتا ہے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ تقریریں کرو، لطیف نکتہ پیدا کرو، بلند سے بلند فلسفیانہ بحثیں کرو، لیکن دل ایک ہی

زبان جانتا ہے، انصاف کی زبان جانتا ہے اور محبت کی زبان جانتا ہے، دل فلسفوں سے نہیں سمجھے گا باریکیوں سے نہیں سمجھے گا، سائنس سے منطق سے نہیں سمجھے گا۔ ہاں خدا کا نام لو تو دل جاگ اٹھے گا۔ خدا کے نام سے پکارو دل دوڑ پڑے گا۔ خدا کے نام کی دہائی دو دل سب کچھ نچھاور کر دیگا۔ دل کو جگا لینے اور دل کو ایک مرتبہ خیر کے راستہ پر ڈال دینے اور اس کے ساتھ دل میں انسان کی بھی محبت پیدا کر لینے کے بعد پھر کسی خیر کی کمی کا احساس نہ ہوگا۔ نہ وسائل کی، نہ لطافت کی نہ تنظیم کی، نہ دولت کی۔

اہل قلوب کی تاثیر و برکت

فرمایا: میرا یہ اعتقاد ہے، اور تھوڑا بہت مطالعہ بھی اس کی تائید کرتا ہے کہ جہاں کہیں جو کچھ دین کا کام ہوا ہے وہ تو اہل قلوب نے کیا ہے یا اہل قلوب کے سایہ میں ان کی دعاؤں سے ہوا ہے، اہل قلوب کی دعا اور آہ سحر گاہی کی تاثیر و برکت ہے۔ دین کا نظام اور اس کا فروغ اہل اللہ کے قلوب سے وابستہ ہے۔

تصوف کیا ہے؟

ایک مجلس میں فرمایا:

تصوف کا لب لباب اور خلاصہ یہی ہے کہ جو کچھ ہم صبح سے شام تک کرتے رہے ہیں بغیر کسی نیت کے اور بغیر کسی احتساب کے وہ ہم احتساب اور نیت کے ساتھ کرنے لگیں، ہمارے اندر اصلیت پیدا ہو جائے اور اس کی اہمیت پیدا ہو جائے، گویا نمک ہے، مگر اس میں نمکینی نہیں ہے، شکر ہے مگر اس میں مٹھاس نہیں ہے، پانی ہے مگر اس کے اندر پیاس بجھانے کی صلاحیت نہیں ہے، یہ صلاحیت پیدا ہو جائے۔

توکّل

اللہ تعالیٰ کی ذات پر توکل ــــ کی طرف متوجہ کرتے ہوئے فرمایا:

قرآن سے معلوم ہوتا ہے (اور تجربہ بھی بتاتا ہے) امر بالصلوٰۃ اور اس پر محافظت اور استقامت سے اللہ کے یہاں رزق کا استحقاق پیدا ہو جاتا ہے جس کا مطلب یہ نکلا کہ داعی کو اللہ تبارک و تعالیٰ انشاء اللہ بے یار و مددگار اور فاقہ کش کبھی نہیں رکھے گا۔ بلکہ اس کے طفیل میں ہزاروں آدمی کھائیں گے، ایک شیر شکار کرتا ہے اس کے طفیل میں جنگل کے سیکڑوں جانور کھاتے ہیں، حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا دسترخوان، اس عہد آخر میں مظاہر العلوم میں حضرت شیخ الحدیثؒ کا دسترخوان اور جن خوش قسمتوں نے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے دسترخوان کو دیکھا، وہ خوب جانتے ہیں کہ ایک شیر شکار کرتا تھا اور جنگل کے کتنے اس کے ہم جنس کھاتے تھے۔

بچوں سے!

ایک موقع پر ابتدائی درجات کے طلباء کی مناسبت سے فرمایا

بڑے تجربہ کی بات ہے کہ بچپن کا خیال حقیقت بن کر سامنے آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو بچپن کی معصومیت اتنی پسند ہے کہ اس وقت بچہ جو سوچتا ہے بعینہ اللہ تعالیٰ کسی نہ کسی موقع پر پورا فرما دیتا ہے۔ اس لئے میں بچوں سے کہتا ہوں کہ تم اونچے سے اونچا ارادہ کرو اور اچھی سے اچھی تمنا و آرزو کرو تم یہ ارادہ کرو کہ اسلام کا نام روشن کروگے، اور اس کے سچے اور مخلص داعی بنوگے اور اللہ کے ولی اور مقبول بندے بنوگے۔

آج حیرت اور حسرت کا مقام ہے

ایک مجلس میں فرمایا:

جتنا علم بڑھتا جا رہا ہے اتنا ہی آنکھوں سے پردے اٹھتے جا رہے ہیں چنانچہ اطمینان کے بجائے حیرت اور مسرت کے بجائے حسرت ہونے لگتی ہے، یہی وجہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ "لو تعلمون ما اعلم لضحکتم قلیلا و لبکیتم کثیرا" کہ تم جان لیتے جو مجھے معلوم ہے تو پھر تم ہنستے کم روتے زیادہ۔

غور کیجئے کہ ایک ضعیف اور بڑی عمر والے کی جوان اور صحتمند اولاد ہو بیٹے پوتے وغیرہ ہوں تو اس پر لوگ کیسے رشک کرتے ہیں کہ کتنا خوش نصیب ہے کہ اس کا سہارا ہے اور اس کو بھی دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ اس نے جو باغ لگایا تھا وہ پھل پھول رہا ہے۔ لیکن وہ اس وقت دل پکڑ کر رہ جاتا ہے جب دیکھتا ہے کہ ان میں ایک بھی اس کے مرتے ہوئے اس کے حلق میں پانی ٹپکانے کا روادار نہیں۔ آج یہی حالت ہماری ہوتی جا رہی ہے کہ اسلام جب اپنی اولاد پر نظر ڈالتا ہے تو کہتا ہے کہ بہت ہیں اگر کام کے ہوتے تو ان سے بہت کم بھی کافی تھے۔ یہ سب میرے ہی نام سے پکارے جاتے ہیں، اور میرے ہی کہلاتے ہیں، لیکن ان میں سے میرے کام کے تھوڑے ہیں" خدا کا شکر ہے کہ آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے اور عیب چھپے ہوتے ہیں۔ اگر پردہ اٹھ جائے تو آنکھیں دیکھیں کہ کمزوریوں کا، نقائص کا، عیوب کا اور گناہوں کا، بازار اور میلہ لگا ہوا ہے اور زرق برق لباسوں میں بہت سے جانور اور درندے ہیں۔

دو روزے

فرمایا: روزے دو ہیں ایک بڑا روزہ دوسرا چھوٹا روزہ، بڑے روزے کا افطار حوض کوثر پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک سے انشاء اللہ ہوگا، اور یہ چھوٹا روزہ اس بڑے روزے کی مشق ہے، اس کے مفسدات تو کھانا پینا وغیرہ ہیں، جبکہ بڑے روزہ کا سب سے بڑا مفسد شرک ہے اور پھر مکروہات، معاصی اور خلاف شریعت و خلاف سنت امور ہیں۔

مدارس و مکاتب کے قیام کی ضرورت و افادیت

فرمایا: مدارس و مکاتب کا قیام ضروری چیز ہے عقیدہ اس سے درست ہوگا، دین سے واقفیت ہوگی، ضروری مسائل کا علم ہوگا۔ اور اس کے بغیر دین کے ختم ہو جانے کا اندیشہ ہے جیسا کہ اسپین میں ہوا، ہندوستان میں بھی پورا نقشہ تیار ہے کہ اسے اسپین بنایا جائے۔ ان کا یہ منصوبہ ہے کہ ان کی دینی نسل کشی ہو جائے، کلچر کھو بیٹھیں، صرف نام اپنا رکھ سکیں کہ یہ مسلمان کی اولاد ہیں۔

صحبت کا کوئی بدل نہیں

فرمایا: صحبت کا کوئی بدل نہیں۔ اگر کوئی بدل ہوتا تو پھر صحابہ کرامؓ کو صحابہ نہ کہا جاتا۔ اولیاء اصفیاء کو یہ خطاب دیا جاتا۔ کثرت عبادت اور ذکر و تسبیح میں تابعین میں بھی لوگ بہت بڑھ گئے تھے۔ لیکن کوئی صحابہ کے مقام و مرتبہ کو نہ پہونچ سکا۔ صحبت میں اللہ تعالیٰ نے بڑی تاثیر رکھی ہے۔ چند لمحوں میں اس سے جو فائدہ ہوتا ہے وہ کسی بڑی ذہانت سے مطالعہ سے نہیں ہوتا۔ اسی سے حرارت، نورانیت اور اعتدال پیدا ہوتا ہے اور اسی سے کسی چیز کا اعتبار اور اس کی قدر و قیمت معلوم ہوتی ہے، جو نہ کتابوں میں ملتی ہے، نہ علم سے حاصل ہوتی ہے۔ گویا یہ ایک چراغ ہے۔ چراغ چراغ سے جلتا ہے۔

اہل اللہ کے یہاں حاضری کا فائدہ

ایک سوال کے جواب میں فرمایا:

بزرگوں کے یہاں حاضری کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنے کو حقیر سمجھنے لگتا ہے۔ ان کی زندگی کو دیکھ کر اپنے حالات پر شرمندگی ہوتی ہے، اور ان کے اخلاق، عبادت، روحانیت کو دیکھ کر اپنے وجود سے شرم آنے لگتی ہے اور سارے عیوب و کمزوریاں نظر آجاتی ہیں۔

ایک موقع پر فرمایا صحبت کی تاثیر کے واقعات تواتر سے ثابت ہیں۔

علماء سلف

فرمایا: پہلے علماء بزرگوں کی صحبت میں رہنا ضروری سمجھتے تھے اور ان سے استفادہ کرنا اپنے لئے مفید جانتے تھے۔ لیکن اب اس کا رواج اٹھ گیا۔ حتیٰ کہ طلباء اپنے اساتذہ کے پاس بھی نہیں بیٹھتے۔

اللہ کا ایک بڑا فضل اور انعام

فرمایا: جو کچھ مجھ پر اللہ نے فضل فرمایا اس میں چار چیزوں کو دخل ہے (۱) والد کا اخلاص۔ (۲) والدہ کی دعائیں، (۳) بھائی صاحب کی تربیت (۴) اور اساتذہ و مشائخ کی شفقت و توجہ۔

اخلاص اور اخلاق

فرمایا: کہ اللہ کے ساتھ اخلاص اور لوگوں کے ساتھ اخلاق ضروری ہے، اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اخلاق تو اہل اللہ کے یہاں ہوتے ہیں۔ اور فرماتے لوگ بزرگوں کے پاس کشف و کرامات دیکھنے آتے ہیں جبکہ بزرگوں کے پاس ان کے اخلاق دیکھنے آنا چاہیئے۔

معاشرہ کی بڑی خرابی

اکثر فرمایا کرتے تھے:

آج معاشرے کی بڑی خرابی اور اسکے بگاڑ کا سبب بدنیتی نہیں بے نیتی ہے، پھر حضرتؒ نے کوئٹہ کے ان صاحب کا واقعہ سنایا جنھوں نے روزہ افطار کرتے وقت یہ کہا تھا کہ ہم تو روزہ اس لئے رکھتے ہیں کہ جو مزہ افطار کے وقت ملتا ہے وہ اور کہیں نہیں ملتا۔

عقیدہ اور مقصد کی وحدت

ایک مجلس میں فرمایا:

عقیدہ کی وحدت، مقصد کی وحدت، اور محبت کی وحدت سے حیرت انگیز نتائج وجود میں آتے ہیں، مقصد اور عقیدہ ایسا ہو کہ رگ و ریشہ میں سرایت کر گیا ہو، ذوق و مزاج بن گیا ہو۔ اور مقصد سے صرف وابستگی کافی نہیں۔ مقصد سے عشق ہو۔

حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک اصلاح و جہاد

فرمایا:

حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک و دعوت کے خاص موضوعات توحید خالص، اعلاء کلمۃ اللہ اور جذبۂ جہاد ہیں۔ اور فرمایا کہ حضرت سید صاحب نے حضرت شاہ ولی اللہؒ کے کاموں کی تکمیل، دعوت توحید، اشاعت سنت اور اعلاء کلمۃ اللہ کی عملی جد و جہد سے کی اور اس کے اثرات بہت

دور تک پھیلے، جس کا انگریز مصنفین نے کھل کر اعتراف کیا، اور انگریزوں کو جو خطرہ تھا وہ یہیں سے تھا۔ اسی لئے انھوں نے حضرت سید صاحب کی تحریک کے اثرات کو زائل کرنے کے لئے توحید خالص اور جذبۂ جہاد کو کم کرنے بلکہ ختم کرنے کے لئے بریلی کے احمد رضا خاں اور قادیان سے مرزا غلام احمد کو کھڑا کیا۔ مرزا غلام احمد تو خود کہا کرتے تھے میں انگریزوں کا خود کاشتہ پودا ہوں۔ ان واقعات سے یہ بات بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ حضرت سیّد احمد شہیدؒ کی تحریک کے کتنے غیر معمولی اثرات مرتب ہوئے تھے۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے احسانات

اقبالؔ نے حضرت مجدد الف ثانی کے متعلق بالکل صحیح کہا تھا کہ ؎

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان
اللہ نے بروقت کیا اس کو خبردار

یہ انھیں کی کوششیں تھیں کہ ہندوستان کا رشتہ دین حجازی اور محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم سے کٹنے نہیں پایا اور وہ تہذیبی لحاظ سے برھمنیت اور فکری و اعتقادی لحاظ سے ویدانت کی گود میں جانے سے بچ گیا۔ اور اسلام و شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی تحویل میں رہا، اس کے پیچھے انھیں کا ہاتھ تھا جس نے اکبر کے تخت پر محی الدین اورنگ زیب عالمگیر جیسے غیور اور فقیہ بادشاہ کو بٹھایا جن کو شیخ علی طنطاوی نے سادس الخلفاء الراشدین لکھا ہے۔

پھر حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان کی خدمات ہیں، جن کے ذریعہ ملک میں تجدید و احیاء دین کا زبردست کام ہوا — دار العلوم دیوبند، مظاہر علوم اور ندوہ بلکہ یہاں کی کتاب و سنت کی تعلیم کی سبھی درسگاہیں اسی ایک چراغ سے روشن ہیں۔ ان سب کا سلسلۂ نسب شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کے اخلاف نامدار اور تلامذہ پر ختم ہوتا ہے۔

محبوبیت اور مقبولیت کا راز

فرمایا کہ نماز، تلاوت، روزہ، حج وغیرہ اور لوگ بھی کرتے ہیں لیکن اولیاء اللہ اونچے مراتب پر ان اعمال کو استحضار نیت، بیداری احتساب کے ساتھ کرنے کی وجہ سے فائز — اور ممتاز و فائق ہوتے ہیں۔ وہ دنیوی امور کو بھی استحضار نیت اور احتساب کی وجہ سے دینی امور بنا لیتے ہیں۔ اور یہی چیز ان کی محبوبیت اور مقبولیت میں اضافہ کا باعث بنتی ہے۔

اخلاص اور حسن نیت ضائع نہیں جاتا

اکثر فرمایا کرتے تھے:

"کہ اس کا بار بار مشاہدہ ہے کہ مخلص کی محنت اکثر ضائع نہیں ہوتی، مخلص کا سفینہ بارہا گرداب میں پڑنے کے باوجود کہ ساحل کے تماشائی ہر لحظہ ڈرتے ہیں اب ڈوبا کہ تب ڈوبا کنارہ پر لگ جاتا ہے۔ اور غیر مخلص کا سفینہ ساحل پر پہنچتے پہنچتے ڈوب جاتا ہے، بارہا دیکھا ہے کہ ایک شخص کی شہرت کا آفتاب نصف النہار پر ہے اور اس کا پورا عہد اس کا کلمہ پڑھتا ہے پھر اس کی زندگی ہی میں یا اس کی زندگی کے بعد اس کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ اور کوئی ناقد ایسا پیدا ہو جاتا ہے جو گویا اس کی تنقید یا تشریح (پوسٹ مارٹم) کے لئے مامور ہے اور اس کی شہرت و قبولیت کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کے مقابل ایک شخص گوشۂ نشیں گمنامی میں بیٹھ کر کام کرتا ہے اور اس کی زندگی تک اس کے کام کا تعارف نہیں ہوتا۔ اچانک ایسے اسباب پیدا ہوتے ہیں کہ اس کے بہائے ہوئے پسینہ کا ایک ایک قطرہ اس کے لئے آب حیات بن جاتا ہے۔ اور اسکی قبولیت کیلئے قدرت کی طرف سے ایسے سامان ہوتے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔

نیت کے اہتمام کی ضرورت

ہم نے مولانا الیاس صاحب کی حیات میں نظام الدین میں تقریر میں کہا تھا:

مسلمان بدنیت نہیں ہوتے لیکن بے نیت ہوتے ہیں۔ ہم میں سے بڑی تعداد ایسی ہے جو قرآن مجید کو بغیر نیت کے پڑھتی ہے، اور ختم کر لیتی ہے، اور ایصال ثواب کر لیتی ہے؛ فرمایا: ہم نے حدیثوں میں نیت کے بارے میں پڑھا تھا لیکن سب سے پہلے مولانا الیاس صاحب سے ایمان و احتساب کا صحیح مفہوم معلوم ہوا۔ مولانا نے سب سے پہلے اس کی طرف توجہ دلائی کہ ایمان و احتساب کا مطلب اللہ کے وعدوں پر یقین اور ثواب کی لالچ میں کوئی کام کرنا ہے، ہم میں سے بہت سے لوگ کام کرتے ہیں لیکن اس میں نیت نہیں کرتے وضو کرتے ہیں لیکن جیسا کہ حدیث میں آتا ہے جب ہاتھ دھوئے تو اس نیت سے کہ اس سے جو گناہ سرزد ہوتے ہیں وہ دور ہو گئے، جب چہرہ دھوئے اور کلی کرے تو اس کا استحضار رہے کہ آنکھوں اور منہ سے جو گناہ ہوئے ہیں وہ پانی کے قطرہ کے ساتھ دھل جائیں گے، ایسے ہی مریض کی عیادت ہے، تعزیت ہے، تکلیف دہ چیز کو راستہ سے ہٹانا ہے، غریب کی مدد کرنا خندہ پیشانی سے ملنا کہ ان سب باتوں میں اللہ کی رضا اور ثواب کا استحضار رہے اور اسی نیت سے کی جائے

دو انسانی چہرے

فرمایا: کہ ۱۹۴۷ء کے مارکاٹ کے زمانہ میں کتنے آدمیوں نے اپنی اسلامی وضع قطع اس خطرہ سے تبدیل کر دی، کہ اس میں مسلمان سمجھ کر مارے جانے کا خطرہ ہے، لیکن اس پر بھی ان کی جان بخشی نہ ہوئی۔ شاعر نے کہا ہے ؎

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم
نہ ادھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

اس کے مقابل قوتِ ایمانی کا ایک پرانا واقعہ سنئے! نصیر بلوچی اور پنجاب کی سکھ حکومت کے درمیان ایک مرتبہ جنگ ہوئی۔ ایک موقع پر اس جنگ میں نصیر خاں زخمی ہو کر گھوڑے سے گرے دو سکھ سپاہی پاس سے گذرے ایک نے چاہا کہ کام تمام کر دے، اس زمانہ کے بلوچی بڑے بڑے بال رکھتے تھے، نصیر خاں کی بھی لٹیں تھیں۔ دوسرے سکھ نے کہا نہیں، نہیں یہ ہمارا بھائی ہے۔ اس کو نہ مارو، جنگ ختم ہوئی اور نصیر خاں بلوچی اپنے دارالحکومت پہونچا تو اس نے خود بھی اپنے بال ترشوائے، اور پوری قوم کو بال ترشوانے کا حکم دیا۔ اس نے کہا ان منحوس بالوں نے میرے مسلمان ہونے کے بارے میں شبہ پیدا کر دیا اور میں شہادت سے محروم رہا۔

ایک وہ لوگ تھے، ایک یہ دونوں کے ذہنیتوں میں کتنا بڑا فرق ہے۔

دین اور سیاست

مختلف سیاسی لیڈر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں جمع ہو گئے تھے، اور ادھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے، ایک دو روز قبل ہی سورج گرہن ہوا تھا۔ اس کی طرف توجہ دلاتے ہوئے حضرت نے ان میں سے ایک سے کہا: سورج گرہن پورا تھا؟ انھوں نے کہا جی! پورا تھا۔ دوسرے نے تردید کی کہ یہاں نہیں الہ آباد میں پورا تھا۔ اس پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ایک نصیحت آموز واقعہ سنایا، فرمایا: پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی سورج گرہن ہوا تھا۔ اور اس دن ہوا تھا۔ جس دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیٹے کا انتقال ہوا تھا، لوگوں نے کہنا شروع کیا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے بیٹے کا انتقال ہوا ہے اس لئے اتنا بڑا واقعہ ہوا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً اس کی تردید کی اور فرمایا کہ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے، کسی کے موت وحیات سے اس کا تعلق نہیں۔ جب ایسا ہو تو مسجد جاؤ نماز پڑھو اور دعا کرو، اور صدقہ خیرات کرو اور اپنے گناہوں کی معافی چاہو۔ اگر پیغمبرؐ کی جگہ کوئی اور ہوتا، کوئی لیڈر ہوتا تو کہتا کہ یہ کتنا اچھا موقع ہے، ہم نے کہا بھی نہیں اور لوگ نسبت اس کی ہماری طرف کر رہے ہیں اور یہ کہتا کہ تمہارا کہنا صحیح ہے۔ اسی وجہ سے یہ ہوا ہوگا۔ اور کچھ نہیں تو خاموش ہی رہتا، فرمایا: یہ فرق ہے پیغمبرؐ میں اور لیڈر میں (

تعلیم و تبلیغ والوں کی ذمہ داریاں

فرمایا: سارے مسلمانوں کا گھروں سے نکل جانا اور دورہ اختیار کرنا نہ ممکن ہے اور نہ ضروری، لیکن اس کی ترغیب اور دعوت دی گئی ہے کہ ہر گروہ اور اسلامی مجموعہ ہی سے کسی تعداد کا نکلنا ممکن اور مطلوب ہے، اور اس کے دو مقصد ہونے چاہئیں۔ خود دین کی سمجھ حاصل کرنا۔ اس کے احکامات اور تعلیمات سے واقف ہونا اور واپسی پر اپنی جماعت کو اور تعلق والوں کو متنبہ اور بیدار کرنا۔ اور غلط عقیدہ اور بے عملی کے وبال کے نقصان سے آگاہ کرنا اور ڈرانا ہے اور یہ تو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا ہے۔ "وما کان المومنون لینفروا کافۃ فلولا نفر من کل فرقۃ منہم طائفۃ لیتفقہوا فی الدین ولینذروا قومہم اذا رجعوا الیہم لعلہم یحذرون"

اس آیت میں اللہ کے راستہ میں باہر نکلنے والوں کے لئے (خواہ ان کا نکلنا دعوت کے کام سے ہو یا تعلیم کے مقصد سے) دو بنیادی مقاصد و فوائد بیان کر دیئے گئے ہیں جن کا حصول اور جن پر عمل کرنا ضروری ہے، باہر نکلنے والوں کو اور دین کے خاطر اپنا وقت لگانے والوں کو اپنا محاسبہ کرنا چاہئے، کہ وہ ان دونوں مقاصد اور مطالبات پر کتنا عمل کر رہے ہیں اور ان کے دینی علم اور فرائض اور ذمہ داریوں کی معلومات میں کتنا اضافہ ہو رہا ہے اور دوسروں میں دین پہونچانے اور اشاعت کی کتنی کوشش ہو رہی ہے۔

قابل قدر حاکم

حاکم شارقہ کا استقبال کرتے ہوئے حضرت مولانا نے فرمایا: کہ ہم لوگوں کا تعلق ایک ایسے سلسلہ سے ہے اور ایک ایسے مکتب فکر سے ہے جس کا یہ پرانا مقولہ ہے" مبارک ہے وہ حاکم جو درویش کے دروازہ پر جائے۔ اور بہت نامبارک ہے وہ درویش جو کسی حاکم کا دروازہ کھٹکھٹائے۔

(تعمیر حیات ۱۰ رجون ۱۹۸۲ء)

ایک کام اصلاح رسوم کا بھی ہے

فرمایا: ایک کام اصلاح رسوم کا بھی ہے، میں

تبلیغ والوں سے کہتا ہوں کہ اسے نمبر نہ دیں، لیکن ذہن میں رکھیں حسب موقع اس کی ترغیب دیتے رہیں۔ لوگوں کو توجہ دلاتے رہیں کہ شادی کا مسئلہ جہیز، لاٹری، جوا، رشوت، وغیرہ اور اس قسم کے دوسرے معاملات جن سے معاشرہ میں فساد پھیلتا ہے انھیں نہ ہونے دیں ان امور کی اصلاح کریں۔ تب آپ تبلیغ کا فریضہ صحیح طور پر انجام دے سکیں گے۔

تبلیغ کے معنیٰ اور طریقہ

فرمایا: مولانا الیاس صاحب اس پر بہت زور دیتے تھے کہ تبلیغ کے معنی ہیں دوسروں کو بات پہونچانا۔ اسی طرح آپ کا بات کرنے کا طریقہ ایسا ہونا چاہیئے کہ مخاطب کو احساس نہ ہو کہ اسے تو مسلم یا جاہل ان پڑھ سمجھ رہے ہیں اس کے لئے سلیقہ چاہیئے۔

اندلس (اسپین) میں دعوتی کام کی ضرورت

اندلس کا جو کہ اب اسپین (SPAIN) کے نام سے مشہور ہے تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا: سب سے زیادہ ہمیں یہیں روحانیت محسوس ہوئی اور اب تک ہو رہی ہے، ڈاکٹر سعید رمضان نے بتایا کہ جب وہ وہاں گئے تھے، تو جگہ جگہ تلاوت قرآن کی آواز آتی تھی، جبکہ وہاں پڑھنے والا کوئی نہیں تھا۔ اسی لئے کہ کوئی مسلمان بچا ہی نہیں تھا، البتہ اب کام ہو رہا ہے، مجلس میں مولانا سید سلیمان ندوی صاحب موجود تھے، ان سے مخاطب ہو کر کہا کہ تم ان سے رابطہ رکھو، ہم تو کہتے ہیں کہ لوگ اسپینی زبان صرف اس لئے سیکھیں کہ وہاں جاکر دعوت کا کام کریں گے۔

فرمایا: جامع قرطبہ میں ایک کونے میں بولنے سے دوسرے کونے میں تیز آواز آتی تھی، ہم نے زور سے پڑھا "جاء الحق وزھق الباطل إن الباطل كان زھوقا" گائیڈ نے سمجھا پتہ نہیں یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ اس نے روکا، لیکن ہم نے پورے زور سے کہدیا، فرمایا کہ انشاء اللہ یہ ہوگا (اب وقت آگیا ہے)

بغیر معاوضہ درس وافادہ

تنخواہ نہ لینے پر فرمایا: اکثر ہمارے تبلیغی اسفار رہتے تھے۔ ہم نے مولانا الیاس صاحب سے کہا سوچتا ہوں کہ بغیر معاوضہ کے پڑھاؤں مولانا نے فرمایا کہ ہمارے بڑوں کا یہ اصول نہیں رہا ہے۔ تنخواہ لینی چاہیئے۔ اس کے دوسرے فوائد ہیں، ہم ٹھہر گئے۔ ایک دن مولانا الیاس صاحب نے ہم کو بلایا، کہا: کتنا معاوضہ ہے ہم نے کہا پچاس روپئے، مولانا نے فرمایا، مولوی صاحب! ایسے ہزاروں پچاس روپئے آپ کے غلاموں پر قربان ہوں، چنانچہ پھر میں نے لینا چھوڑ دیا۔

مولانا عمران خاں صاحبؒ کا ایک پر لطف واقعہ

مولانا عمران خاں صاحبؒ سابق مہتمم دارالعلوم (ندوہ) کے متعلق فرمایا کہ ندوہ کے چندہ کے سلسلہ میں گئے ہوئے تھے ایک صاحب ملے انھوں نے کہا مولانا آپ تو عالم ہیں، آپ لوگ جانتے ہیں کہ کسی ایسے کام کے لئے نکلتے ہیں تو صلوٰۃ الحاجۃ پڑھ لیا کرتے ہیں، وہ تو پڑھ لیجئے کام آسان ہوگا۔ مولانا نے فوراً کہا۔ اسی لئے تو اللہ نے آپ کو بھیجا ہے۔

توجہ کے فوائد اور اثرات

سلسلۂ گفت گو میں توجہ کے فوائد اور اس کے اثرات بتاتے ہوئے حضرت سید احمد شہیدؒ کی توجہ کی زیادہ تعریف کی، اور فرمایا کہ اعلیٰ توجہ وہ ہوتی ہے جس سے فرائض میں وابستگی پیدا ہونے لگے۔ نماز میں خاص لطف محسوس ہونے لگے۔ اور وہ توجہ جس سے کشف وکرامت اور خارق عادت احوال زیادہ پیش آنے لگیں وہ توجہ زیادہ معتبر نہیں۔

ریاضت ومجاھدہ میں زمانہ، حالات، استعداد کا لحاظ

اس استفسار پر کہ راہ طریقت میں جو تقلیل منام پر زور دیا جاتا ہے اور مشق کرائی جاتی ہے اس کی کیا حد ہے۔ فرمایا: اسکی کوئی تحدید نہیں ہے، زمانہ، حالات، استعداد کے مطابق ایسا کراتے ہیں۔ پوری رات جاگنے کو کوئی نہیں کہتا۔ نہ ہی کتابوں میں ملتا ہے کہ اس کی تاکید ہو، ہاں کم سونے اور اخیر شب میں جاگنے اور تہجد پر زور ملتا ہے۔

معمولات کی پابندی

ایک موقع پر فرمایا: بقدر گنجائش معمولات کی پابندی کرتے رہنا چاہیئے۔ کہ اس سے قلب میں نورانیت اور کام میں برکت ہوتی ہے۔

دینی شعور

فرمایا: دینداری کے ساتھ دینی شعور کا ہونا بھی ضروری ہے۔

کچھ ذمہ داریاں

فرمایا: باپ اگر بیٹے سے بلاوجہ بھی ناراض ہوتا ہے تو بھی بیٹے کو نقصان پہونچتا ہے۔

فرمایا: اولیاء اللہ اور عالم ربانی کے

سلسلہ میں زبان خاموش رکھنی چاہیئے اور اس
بات کا لحاظ رکھنا چاہیئے۔ کہ انھیں تمہارے
طرز عمل سے ذرا بھی تکلیف نہ پہونچے۔

اپنے ایک مسترشد سے فرمایا کہ اپنے لئے
تو مستحبات کو بھی ضروری سمجھو اور دوسرے
اگر فرائض کی ادائیگی کرلیں تو اس کو غنیمت جانو۔

فرمایا: زندگی ایسی ہونی چاہیئے جس سے
دوسروں پر اثر پڑے، وہ دعوت اسلام کا کام
دے، اعمال کے اعتبار سے بھی، عقائد، اخلاق،
معاملات، کوششوں اور ارادوں کے اعتبار
سے بھی، گو ہر طرح سے کہ وہ مشعل راہ بنے اور
مقناطیسیت کا کام دے، جاذبیت ہونی
چاہیئے۔

فرمایا: ہزار برس سے ہندو مسلم بھائی
اس دیش میں رہتے ہیں، پڑوسی ہیں، دیوار
سے دیوار ملی ہے، لیکن یہ عجیب بات ہے
کہ ایک دوسرے کی ابتدائی باتیں بنیادی
چیزیں بھی نہیں جانتے۔

اس کی ایک مثال دیتا ہوں۔ ایک مرتبہ
میں ٹرین میں چند ساتھیوں کے ساتھ سفر
کررہا تھا، نماز کا وقت ہوا ہم نے جماعت سے
نماز پڑھی۔ جب ہم نماز میں رکوع اور سجدہ
میں جاتے ہیں، تو اللہ اکبر کہتے ہیں، ہمارے
ساتھ سفر کرنے والے ایک ہندو بھائی نے
جو پڑھے لکھے آفیسر تھے، نماز کے بعد پوچھا،
"مولوی صاحب! آپ جب نماز پڑھتے
تھے تو کیا اکبر بادشاہ کو یاد کرتے تھے؟"

ملک میں ہر جگہ مسجدیں ہیں، ہر وقت
اذان، نماز میں اللہ اکبر کی آواز ہوتی ہوگی
لیکن انھوں نے کبھی یہ خیال نہیں کیا کہ پوچھیں
اللہ اکبر کا کیا مطلب ہے، اور نہ ہمیں خیال
آیا کہ ہم انھیں بتائیں، کتنی فکر اور افسوس کی
بات ہے کہ ہم اتنے قریب رہتے ہوئے بھی ایک
دوسرے کی ابتدائی باتیں اور بنیادی چیزیں
نہ جان سکیں۔

اس استفسار پر کہ رمضان کے کچھ ایام
حرمین شریفین میں، کچھ ہندوستان میں گذارنے
پر چاند کے فرق کی وجہ سے کمی یا زیادتی ہوجایا
کرتی ہے۔ اس صورت میں آپ کا معمول کیا ہے،
فرمایا کہ ہم کو روزوں کی تعداد نہیں بتائی گئی،
ہمیں حکم یہ دیا گیا ہے کہ جب رمضان کا چاند
دیکھیں تو روزے رکھنے شروع کردیں اور
شوال کا چاند دیکھیں تو روزے رکھنا بند کردیں
اب وہ ۲۸ کے ہوں یا ۳۱ کے۔

عقیدۂ ختم نبوت

فرمایا:
علامہ اقبال نے بڑی گہری بات کہی ہے
جو ان کی سطح سے بلند ہے۔ انھوں نے کیا کہا
اللہ نے کہلوائی۔
وہ یہاں لکھتے ہیں۔

" دین و شریعت کی بقاء و دوام کتاب و
سنت سے وابستہ و مربوط ہے، جب تک
کتاب و سنت باقی ہیں، دین و شریعت باقی
اور محفوظ ہیں۔ لیکن امت کی بقاء اور وحدت
ختم نبوت کے عقیدہ سے وابستہ ہے، جب
تک ختم نبوت کا عقیدہ ہے، یہ امت امتِ
واحدہ کی حیثیت سے باقی ہے۔

زندگی کیسی ہو

فرمایا:
زندگی ایسی گذارنی چاہیئے کہ جو دوسروں
کے لئے مشعل راہ بنے اور دعوت اسلام کا
کام دے۔ مقناطیسیت، جاذبیت ہونی چاہیئے
جو افراد کو بھی کھینچے، معاشرہ کو بھی، جب جب ایسا
ہوا تو انقلاب آیا۔ اور اسلام کو بڑا فروغ ہوا۔
خواجہ معین الدین چشتیؒ اجمیر آئے اور لاکھوں کی
تعداد میں لوگ مسلمان ہوئے۔ سید علی ہمدانی
کشمیر گئے وہاں کی اکثریت نے اسلام قبول کیا
اسی طرح حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے
رفقاء کو دیکھ لیجئے۔ جہاں سے گذر گئے وہاں
ہدایت پھیلی اور بڑی بڑی تعداد میں لوگ
تائب ہوئے۔

آخر میں جناب محمد حسن انصاری صاحب
کے جمع کردہ ملفوظات سے ایک انتخاب پیش
کیا جاتا ہے جو انھوں نے اپنی کتاب "حضرت
مولانا ندوی حیات کارنامے اور ملفوظات"
میں درج کئے ہیں۔ یہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی
کتابوں کے ہندی زبان میں خاص مترجم ہیں
اور حضرتؒ کا اعتماد رکھتے تھے، اور اسی انتخاب
پر ہم اپنے اس مضمون کو ختم کرتے ہیں۔
وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ
انیب،

بیکاری زیادہ تر خرابیوں کی جڑ ہے

فرمایا: بیکار رہنا خصوصاً نوجوانوں
کیلئے زیادہ تر خرابیوں کی جڑ ہے، میری سمجھ
میں نہیں آتا لوگ کیسے بیکار بیٹھ کر وقت
برباد کرتے ہیں، مولانا عبدالماجد دریا آبادی
مرحوم وقت کی بڑی قدر کرتے تھے۔ ان کا
ادھر کچھ برسوں سے یہ معمول بن گیا تھا، کام کی
خاطر ایک وقت کا کھانا ترک کردیا تھا، مجھے
جب کبھی ان کے یہاں حاضری کا موقع ملتا اور
پہلے سے پروگرام متعین ہوجاتا تو وقت معینہ
سے چار چھ دن پہلے اپنے کام کی رفتار اور کام
کرنے کا وقت کچھ بڑھا دیتے اور اس طرح وقت

مقرر آتے پندرہ بیس منٹ روزانہ زیادہ
کام کرکے وہ اتنا وقت بچا رکھتے جو میری
ملاقات میں صرف ہوتا. عام طور سے ملاقات
کے ایک کاغذ پر پہلے سے نوٹ کی ہوئی کچھ
باتیں ہوتیں کچھ کتابوں کے حوالہ دیتے، یہ سلسلہ
دو طرح کی ہوتی ایک سے وہ خود استفادہ فرماتے
دوسری میرے استفادہ کیلئے ہوتی اس طرح
استاد اور شاگرد دونوں کا کام بیک وقت کرتے

علاقائی زبانوں کی طرف توجہ کی ضرورت

فرمایا۔ "اس تحتی براعظم میں اسلام کی
اشاعت کے لئے یہ بہت ضروری ہے کہ
اسلامی لٹریچر کے تراجم علاقائی زبانوں میں
کئے جائیں۔ یہ ہمارے اوپر ایک اہم ذمہ داری
ہے اور اس کے لئے ہندو پاک کا دانشور طبقہ
جواب دہ ہوگا ضرورت ہے کہ مراٹھی، تمل
تیلگو، بنگالی وغیرہ علاقائی زبانوں میں
اسلامی لٹریچر کے ترجمہ کا ایک باقاعدہ
پروگرام مرتب کرکے اس کے تحت یہ جلد
سے جلد شروع کیا جائے، شمالی ہند میں
سب سے زیادہ ضرورت ہندی ترجموں کی ہے
مگر زبان ایسی ہو جس میں رس ہو وہ رس
جو پریم چند کی ہندوستانی زبان میں ملتا ہے"

حجاز مقدس سے قلبی تعلق ہونا چاہیئے

فرمایا: عرب کی مقدس سرزمین کا احترام
لازم ہے، سید احمد شہیدؒ جب حجاز مقدس
گئے اور دور وہ سرزمین نظر آئی تو آپ نے
دو رکعت شکرانہ کی نماز پڑھی، حاجی امداد اللہ
مہاجر مکیؒ فرماتے تھے، ہر جسم ہندوستان میں
ہو اور دل حجاز مقدس میں، یہ کیفیت اس
سے بدرجہا بہتر ہے کہ جسم حجاز مقدس میں ہو
اور دل ہندوستان میں؛

ایک بزرگ نے ایک شب خواب میں
دیکھا کہ جنت البقیع سے کچھ نعشیں دوسری جگہ
منتقل کی جا رہی ہیں اور کچھ دوسری جگہ سے وہاں
لائی جا رہی ہیں۔ ان کو فکر ہوئی کہ یہ کیا بات
ہے. تو خواب میں آپ کو بتایا گیا کہ لوگ یہاں سے
لے جائے جا رہے ہیں ان کے جسم یہاں ضرور تھے
مگر ان کے دل یہاں سے دور کہیں اور تھے، اور
جو لوگ یہاں لائے جا رہے ہیں وہ یہاں سے
دور ضرور تھے مگر ان کے دل حجاز مقدس میں ہی
لگے رہتے تھے۔

اپنے معائب اور دوسروں کے محاسن سامنے ہونے چاہئیں

فرمایا" انسان کو اپنے بارے میں "بدبین" اور
دوسروں کے بارے میں "خوب بین" ہونا چاہیئے۔
یعنی اپنی برائی اور دوسروں کی اچھائی پر نظر
ہونی چاہیئے۔ مگر آج کل معاملہ اس کے برعکس ہے
ہم اپنی اچھائی اور دوسروں کی برائی پر نظر رکھتے
ہیں. اور یہی صورتِ حال سارے فتنہ کی جڑ ہے۔

شئی کی حقیقت دیکھنی چاہیئے

فرمایا" حضرت علیؓ کا قول ہے کہ یہ نہ دیکھو کہ کس
نے کہا ہے، یہ دیکھو کیا کہا ہے۔ مگر آج جماعتی
عصبیت کا یہ حال ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ
دیکھو کہ کس نے کہا ہے، یہ نہ دیکھو کہ کیا کہا ہے"۔

"ذکر" کا موثر طریقہ

ایک صاحب نے پوچھا "حضرت دل میں
اللہ کی یاد کس طرح بٹھائیں؟" فرمایا" میں ابھی
آپ کو بتا دیتا ہوں!! اطمینان سے بیٹھ کر بغیر
زور ڈالے ہوئے تسبیح کی دانوں کو انگلی سے
اوپر بڑھائیں اور دل میں "اللہ" کہیں اس طرح
جس طرح گھڑی کی سوئی چلتی ہے کہ اس میں کوک
بھری ہوتی ہے اور وہ اپنا کام بغیر کوئی زور رو
طاقت کے کرتی رہتی ہے۔ در اصل مومن کے قلب
میں اللہ تعالیٰ کی یاد کی کوک پہلے سے بھری ہے
اب ضرورت ہے کہ قلب کی سوئی اپنا کام کرے
نقشبندی طریقہ یہی ہے۔

دعوت کے دو طریقے

فرمایا" داعی کے لئے دعوت تبلیغ کے دو طریقے
ہیں. ایک یہ کہ ایمان کرسی تک پہونچ جائے
یعنی ایمان والے برسر اقتدار آ جائیں۔ دوسرے
یہ کہ کرسی ایمان تک پہنچ جائے، شیخ جمال الدین
ایرانی نے دوسرا طریقہ اپنایا تھا، (اس کے بعد
حضرت مولانا نے تغلق تیمور کی تخت نشینی کا واقعہ
سنایا، اور یہ کہ کس طرح پوری تاتاری قوم مشرف بہ اسلام
ہوئی) آج کے دور کے لئے بھی یہی طریقہ کار
مناسب ہے۔

تواضع، تشکر اور اخلاص کا باہمی ربط

فرمایا" حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کی سب سے
نمایاں خصوصیت ان کا دینی جذبہ اور اخلاص تھا۔
بزرگانِ دین کے یہاں تواضع و احسان مندی، تشکر
اور اعتراف کی کثرت ہوتی ہے، احسان مندی بڑی
اہم بات ہے۔ انسان کو اس کا اعتراف کرنا چاہیئے
بھلے ہی احسان تھوڑا ہی کیوں نہ ہو۔ انسانی اخلاق کے
بنانے میں یہ بات بڑی اہم ہے۔ بزرگوں کا احسان
مشائخ کا احسان، استاد کا احسان، والدین کا احسان
تعلق والوں کا احسان، دوست و احباب رشتے داروں
کا احسان۔

حضرت شاہ علم اللہ کا اتباع سنت اور زہد

حضرت مولاناؒ نے فرمایا" شاہ علم اللہ حسنیؒ کے

نام سے یہ بستی موسوم ہے زہد و اتباع سنّت میں ممتاز تھے، عالمگیرؒ نے ایک شب خواب میں دیکھا کہ حضورؐ کا وصال ہوگیا۔ بادشاہ نے کہا یہ تاریخ نوٹ کرلو اور معلوم کرو کہ اس کی تعبیر کیا ہے؟ معلوم کیا گیا تو پتہ چلا کہ اسی شب شاہ علم اللہ کا انتقال ہوا تھا۔

فرمایا" شاہ علم اللہ کے زہد کا یہ حال تھا کہ ہم لوگوں کے بچپن میں جب کسی گھر میں کھانے کو کچھ نہ ہوتا تھا تو بچوں کو بتایا گیا تھا یہ نہ کہنا کہ کچھ نہیں ہے، بلکہ ہم لوگ یہ کہتے تھے آج ہمارے گھر، شاہ علم اللہ مہمان ہیں گویا ان کا زہد ضرب المثل بن گیا تھا۔

بات کم کرنے کی ترغیب

فرمایا" بات کرنے سے دل، دماغ اور اعصاب تینوں کی قوت خرچ ہوتی ہے اور یہ تینوں متأثر ہوتے ہیں اس سے روحانیت کم ہوتی ہے اسی لئے خانقاہوں میں بات کم کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے، حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ فرماتے تھے" یہاں آؤ جتنا ہو کھاؤ اور رہو مگر باتیں کم کرو"۔

خیر اور شر یکجا نہیں ہوسکتے

فرمایا، بھائیو! خیر و شر دو متضاد چیزیں ہیں اور یکجا نہیں ہوسکتے، مسلمان کا تعلق خیر سے ہے شر سے نہیں، اگر کمہار کے برتنوں کو کوئی دیدہ و دانستہ روندنے لگے تو کمہار یقیناً روندنے والے کی خوب خبر لے گا۔ یہی معاملہ خدا کا مخلوق کے ساتھ ہے۔

خدا کی مخلوق اس کے برتن ہیں اب اگر ہم اپنے شر سے اس سے نقصان پہونچاتے ہیں تو باوجود اس کے کہ غفاری اس کی سنت ہے خدا کے قہر کا ہم کو سامنا کرنا ہوگا، پیغمبر آخر الزماں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دنیا کو خیر کا پیغام دیا، اللہ کا پیغام جب اس کے آخری رسولؐ کے ذریعہ ہم تک پہونچ گیا تو ہماری ذمہ داری ہوتی ہے کہ دنیا کو فسادات کی زد سے بچائیں۔

چار صفات مطلوب ہیں

لاہور کے ایک جلسہ میں مولانا داؤد غزنوی اور مولانا عطاء اللہ حنیف کے کہنے پر تقریر فرماتے ہوئے کہا کہ اہل حدیث کے لئے چار چیزیں ضروری ہیں (۱) عقیدۂ توحید خالص (۲) اتباع سنت خالص (۳) نسبت مع اللہ خالص، (۴) جذبۂ جہاد۔

دعوت دین:- اندلس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ جب میں اندلس گیا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ روحیں لپٹ رہی ہیں۔ اور کیوں نہ ہو بڑے بڑے اولیاء اور مشائخ اس سرزمین پر پیدا ہوئے اور مدفون ہیں۔ لیکن بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہمارے اداروں اور علماء کو بالکل اس کی فکر نہیں کہ اندلس میں اسلام کا کام ہو اور چند آدمی بھی ایسے نہیں کہ جو اسپینی زبان سیکھ کر وہاں جاکر پڑھائیں، اسپین کی بات بڑی ہے ترکی جاننے والے نہیں دو چار نہیں ملتے۔

آخری بات:- حضرت رحمۃ علیہ کی مجلس علم وحیا کی مجلس ہوتی اور اس میں کسی فرد یا جماعت پر تنقید اشارے کنایے میں بھی نہ ہوتی، حتیٰ کہ ان لوگوں کا بھی ذکر نہ ہوتا جو حضرت والا کے خلاف مسلسل مضامین لکھتے اور تنقید کرتے، مثبت اصولی اور دعوتی و تربیتی باتیں ہوتیں، امت مسلمہ کی فکر، اس کے دینی تشخص کے بقاء و تحفظ کی تدبیروں کا ذکر اور اپنے عقائد و اعمال و اخلاق اور معاملات کو درست کرنے اور عبادات کے اہتمام کی ترغیب، مدارس کے قیام پر زور، اسلاف کرام و اصحاب دعوت و عزیمت مجددین و مصلحین امت اور مجاہدین اسلام کا ذکر احسان شناسی و شکر گذاری کے انداز میں ذکر ہوتا۔ ان محسنوں کے ساتھ حسن ظن سے کام لینے بلکہ ان کے لئے دعائے مغفرت کے اہتمام کی ترغیب و تلقین فرماتے خود بھی عملاً طلباء کے سامنے ترحم کے الفاظ کہتے اور دعائے مغفرت کے جملے ارشاد فرماتے۔ ان مجالس میں طلبہ ہوتے تو ان پر زور دیتے کہ اللہ کے ساتھ اخلاص کا معاملہ رکھیں اور دینی علوم میں اختصاص پیدا کریں زہد تقشف اور ایثار و قربانی کی زندگی اختیار کریں، کثرت سے دینی مدارس قائم کریں کہ یہ وقت کا سب سے بڑا جہاد ہے، کسی حال میں بھی سرکاری امداد نہ قبول کریں، غیر مسلموں کو اسلام سے قریب اور مانوس کریں علماء اور مدرسین ہوتے تو ان پر زور دیتے کہ دعوتی اور تدریسی کام کو عبادت سمجھ کر انجام دیں یہی ان کے لئے روحانی ترقی اور قرب الٰہی کا ذریعہ ہے، تاجروں اور ملازمین پر زور دیتے کہ عقائد درست رکھیں نماز کا اہتمام کریں جو کام بھی کریں اس میں رضائے الٰہی کی نیت کریں، شرک و بدعات سے دور رہیں۔ اپنے بچوں کی دینی تعلیم و تربیت کی فکر کریں غیر اسلامی رسوم و رواج سے پرہیز کریں، شادی بیاہ کی تقریبات میں سادگی سے اور سنت کے مطابق انجام دیں۔ وراثت میں شریعت کے مطابق حصہ دیں۔ یہ باتیں ایسی دلسوزی اور درد سے فرماتے کہ شرکائے مجلس بھی متأثر ہوتے اور کچھ کرنے کا جذبہ انگڑائی لینے لگتا، پوری انسانیت کی فکر دامن گیر اور اپنے وجود سے شرم آنے لگتی۔

مردِ مومن کا آخری سفر

روایت:
حاجی عبدالرزاق (خادم خاص)
مولوی سید بلال حسنی ندوی
مولوی سید محمود حسنی ندوی
ترتیب: مولانا نذرالحفیظ ندوی

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا معمول تھا کہ تہجد سے قبل بیدار ہو جاتے، استنجاء اور وضوء سے فارغ ہو کر نوافل کی نیت باندھ لیتے۔ کبھی چار، کبھی چھ، کبھی آٹھ رکعت پڑھتے، اس رمضان میں نوافل کا اہتمام بہت بڑھ گیا تھا، سحری ختم ہونے سے دس منٹ قبل سحری کھاتے، اس کے بعد کبھی تو ہاتھ اٹھا کر اور کبھی بغیر ہاتھ اٹھائے دعا فرماتے، اذان کے بعد فجر کی سنت پھر فرض کے بعد منزل پڑھتے اور لیٹ جاتے۔ آخری عشرہ میں فجر بعد جو لوگ واپس ہوتے وہ مصافحہ کے لئے حاضر ہوتے، ان کو لیٹے لیٹے رخصت فرماتے، اور دعائیہ کلمات کہتے۔ رمضان کے دنوں میں کوشش فرماتے کہ ساڑھے نو بجے اٹھ جائیں۔ استنجاء اور وضوء سے فارغ ہو کر دو رکعت نفل پڑھتے، پھر قرآن شریف کم از کم آدھا پارہ ورنہ عام طور پر ایک پارہ تلاوت فرماتے۔ ادھر کچھ عرصہ سے یہ معمول ہو گیا تھا کہ قرآن پاک کی تلاوت کے بعد صبح کو متن بخاری شریف سماعت فرماتے قیام لکھنؤ میں مولوی سید عبداللہ حسنی اور رائے بریلی میں مولوی سید بلال حسنی کو قرأت کا شرف حاصل ہوتا، پھر لکھنے لکھانے اور تصنیف و تالیف کا کام شروع ہو جاتا، والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی صاحبؒ کے مرتب کردہ مجموعہ احادیث "تہذیب الاخلاق" کو بھی مطالعہ میں رکھنے لگے تھے۔ اس کے بعد سورہ یٰسین روزانہ گیارہ مرتبہ اور جمعرات کے دن تیرہ بار تلاوت فرما کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر اس وقت تک کے تمام مجددین و مصلحین، مجاہدین اور اصحابِ دعوت و عزیمت، ربانی و حقانی علماء، اور اپنے اساتذہ اور محسنوں، اور عزیز و اقارب اور عام مسلمانوں کو ایصال ثواب کرتے، اس معمول میں کچھ کمی رہ جاتی تو عصر سے کچھ قبل یا بعد مغرب اس کی تکمیل فرماتے، عام طور پر ان معمولات میں ناغہ نہیں ہوتا تھا، عصر بعد کی مجلس میں بھی زیر لب کچھ پڑھتے رہتے، مغرب بعد اوّابین سے فراغت پر سورۂ فتح پابندی سے پڑھتے، سفر میں سورۂ فتح عام طور سے اوّابین سے پہلے اور بسا اوقات مغرب سے کچھ پہلے تلاوت کر لیتے۔ اسفار میں جس شہر اور بستی سے گذرتے وہاں کے مدفون مسلمانوں کے لئے ایصال ثواب کا اہتمام فرماتے۔

جان لیوا مرض سے سنبھالا لینے کے بعد اہل تعلق کا یہ تاثر تھا کہ یہ عارضی صحت ہے، کسی وقت بھی یہ دولت بے بہا ہم سے چھن سکتی ہے۔ خود حضرت والا بھی اس طرح کے جملے بڑے درد و کرب سے مختلف اوقات میں فرماتے تھے اللّٰھم لقاءك، کبھی فرماتے، اب ہم بھی چلے، خدایا عاقبت محمود کر دی، کبھی فرماتے اے اللہ اب تو بلا لے، اس معذوری کے ساتھ کب تک؟ ایک خادم سے مختلف وقتوں میں فرمایا کہ تم پر کام کا بوجھ بہت ڈال دیتے ہیں، بس کچھ ہی دن تک ہے۔ کبھی فرماتے۔ اب ہم بھی چلے۔ بس کچھ دن اور، کچھ دن اور۔

شعبان کا آغاز ہوتے ہی یہ سوال خدام اور حضرت کے معالجین کے درمیان گردش کرنے لگا کہ رمضان کا مہینہ کہاں گذرے گا۔ ڈاکٹروں نے اصرار کیا کہ ندوہ میں گذرے، آخر میں حضرت والا کے انشراح اور مرضی پر چھوڑ دیا گیا۔

حضرت نے فرمایا کہ رمضان سے قبل رائے بریلی جانا ہے۔ چنانچہ ٢٧ ر شعبان کو تکیہ تشریف لائے، ٢٨ ر کو قیام کر کے خلاف معمول مولوی سید بلال حسنی سے فرمایا کہ مجھے مسجد لے چلو، مسجد کے صحن میں جانماز بچھا دی گئی، دو رکعت نماز ادا کی، پھر مسجد کے اندرونی حصے میں تشریف لے گئے، وہاں بھی دو رکعت نماز ادا کی، پھر فرمایا کہ ندی کی طرف لے چلو، چنانچہ جہاں نئے زینے بنے ہیں وہاں کھڑے ہو کر چاروں طرف دیکھا۔ فرمایا ماشاء اللہ، ماشاء اللہ اس کے بعد فرمایا کہ مسجد کی پشت پر لے چلو، جہاں سید صاحب کے زمانہ کا ایک پتھر رکھا ہوا ہے۔ تکان کے خیال سے یہ فرمائش نہیں پوری کی گئی۔ مسجد سے نکلتے وقت سامنے ہی شاہ علم اللہؒ کا روضہ ہے جہاں محبوب والدین اور بھائی بہن کے علاوہ بھی گنجہائے گرانمایہ دفن ہیں۔ وہیں زینے کے پاس ٹیک لگا کر کھڑے کھڑے دیر تک ایصال ثواب کرتے رہے۔ وہاں سے واپسی پر تکان کے باوجود گھر کے اندر تشریف لے گئے جہاں گھر کی تمام مستورات جمع تھیں، مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب بھی موجود تھے۔ پندرہ منٹ کے بعد گھر سے واپس بنگلہ پر تشریف لے آئے۔ بعد نماز ظہر آرام کر کے اول وقت عصر

کی نماز پڑھی، پھر گھر تشریف لے جاکر ملاقات کی اور لکھنؤ روانہ ہوگئے۔

پہلا روزہ شروع ہوا تو فرمایا کہ معلوم نہیں پورا رمضان ملتا ہے یا نہیں۔ اے اللہ! تو پورے رمضان کی برکتوں سے نواز دے۔ اور فرمایا کہ جو کام دوائیں نہ کرسکیں وہ رمضان نے کردیا۔

وطن میں آخری عشرہ گذارنے کے بارے میں حضرت والا نے اپنے معالجوں سے اجازت لے لی تھی۔ ڈاکٹر نظر، ڈاکٹر عبدالمعبود خاں، ڈاکٹر سید قمرالدین اور ڈاکٹر کرنل شمسی اس مشورہ میں شریک تھے۔

٢٠ رمضان ١٤٢٠ھ ٢٩ دسمبر ١٩٩٩ء کو رائے بریلی ایک بڑے قافلہ کے ساتھ روانگی ہوئی۔ یہاں معتکفین سے مسجد بھر گئی۔ پہلے دن حضرت والا نے دریافت فرمایا کہ مسجد میں کتنے لوگ ہیں۔ مولوی سید بلال حسنی نے عرض کیا کہ مسجد بھر گئی ہے۔ فرمایا: "بانی کا اخلاص ہے۔" آخری شب تراویح کے بعد ساڑھے نو بجے مجلس میں معمول کے مطابق تشریف فرما مختلف سوالات کے جوابات دیئے، دمشق سے چھپ کر حضرت والا کی جو تصنیفات آئی تھیں ان کو دیکھ کر فرمایا کہ یہ سب اللہ تعالیٰ نے لکھوائی ہیں۔ ایک خادم نے جو باہر کے دورے سے حاضر ہوئے تھے، حضرت کو جب یہ اطلاع دی کہ ایک صاحب خیر نے ٢٧ ہزار ڈالر ترکی کے ایک ناشر اور مترجم کو دیئے ہیں کہ وہ حضرت کی تمام تصنیفات شائع کرکے ترکوں میں مفت تقسیم کریں۔ تو اس خبر پر بڑی مسرت کا اظہار فرمایا۔ مجلس میں "العاقبۃ للمتقین" سے متعلق سوال کیا گیا تو فرمایا کہ عاقبت مذموم بھی ہوتی ہے اور محمود بھی، آخر میں استفسار فرمایا کہ کیا کل جمعۃ الوداع ہے؟

وصال کے دن بھی مذکورہ بالا روزانہ کے تمام معمولات پورے فرمائے۔ ساڑھے نو بجے بیدار ہوکر استنجا کر گئے، وضو کے بعد نوافل پڑھے پھر قرآن شریف کی تلاوت کی، سجدہ تلاوت بھی کیا، لکھنؤ میں قرآن مجید ختم کرچکے تھے، تیرھواں پارہ آخری دن پڑھا، مولوی سید جعفر مسعود حسنی خدمت میں حاضر ہوئے اور تکیہ تشریف آوری پر اہل تکیہ کی مسرت اور شادمانی کا ذکر کیا اور عرض کیا کہ آپ تشریف لاتے ہیں تو بہار آجاتی ہے، فرمایا کہ یہ تکیہ کی خصوصیت ہے جو (انشاء اللہ) باقی رہے گی۔ تھوڑی دیر بعد لکھنؤ سے ڈاکٹر عبدالمعبود خان بھی حاضر ہوگئے، حضرت نے فرمایا کہ اتنی سخت سردی میں آپ آگئے، انھوں نے عرض کیا کہ حضرت سے وعدہ کیا تھا، یہ بھی کہا کہ ہم اپنے ساتھ آکسیجن اور مانیٹر بھی لائے ہیں تاکہ حضرت کو کوئی زحمت نہ ہو، یہ سن کر حضرت مسکرا دیئے۔ بھائی صابر جو برسوں سے حضرت کا خط بناتے آئے تھے ان سے خط بنوایا، اس کے بعد نہانے کی تیاری کی، بھائی ذکاراللہ خان اندوری راوی ہیں: غسل خانہ جانے سے پہلے سوال کیا کہ کیا آج ٢٢ رمضان ہے۔ پھر فرمایا کہ کیا نماز جمعہ ١٥ منٹ تاخیر سے ہوسکتی ہے؟ بھائی عبدالرزاق نے عرض کیا کہ آپ فرمائیں تو تاخیر سے نماز ہوگی، ساڑھے گیارہ بجے غسل کے لئے تشریف لے گئے، پندرہ منٹ بعد غسل سے فارغ ہوکر آگئے۔ کپڑے زیب تن کئے، شیروانی کے بٹن مولوی سید بلال حسنی نے لگائے۔ فرمایا کہ تم لوگ تیار ہوجاؤ، نماز میں پندرہ منٹ تاخیر کرادو، فرمایا کہ اب ہم سورہ کہف پڑھیں گے۔ (اس سورہ کے پڑھنے کا معمول آٹھ سال کی عمر سے تھا) یہ فرماکر بستر پر بیٹھ گئے، لیکن بجائے سورہ کہف پڑھنے کے سورہ یٰسین پڑھنے لگے، دس بارہ آتیں ہوئی ہوں گی کہ زبان رک گئی، (یہ آیت فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَّأَجْرٍ كَرِيمٍ تھی جیسا کہ حاضرالوقت خدام نے بتایا) جس طرح بیٹھے تھے اس سے تھوڑا پیچھے کی طرف جھک گئے، مولوی بلال حسنی نے سر کو اور خادم خاص بھائی عبدالرزاق نے پاؤں کو اٹھا کر تخت پر لٹادیا، ڈاکٹر سید قمرالدین اور ڈاکٹر عبدالمعبود خاں قریب ہی تھے، آکسیجن لگائی گئی۔ انجکشن جب رگوں میں نہیں لگ سکے تو کولھے میں لگائے گئے، ڈاکٹر قمرالدین صاحب نے ایک انجکشن دل پر لگایا، ہاتھ سے قلب کی مالش کی، اور منہ سے ہوا بھی بھرنے کی کوشش کی، لیکن راہ حق کا یہ مسافر ان تمام طبی کوششوں سے پہلے ہی روانہ ہوچکا تھا، اس وقت بارہ بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلی اور محبین واہل تعلق کے قافلے دیوانہ وار رائے بریلی پہونچنا شروع ہوگئے۔

مولوی سید حمزہ حسنی ندوی نے اس نازک موقع پر غسل، تجہیز وتکفین، نماز جنازہ اور تدفین کے سارے امور طے کئے۔

غسل دینے میں حسب ذیل حضرات شریک تھے، مولوی سید بنو ندوی (جنوبی افریقہ) جو رمضان گذارنے آئے تھے، حضرت کے مجاز بھی ہیں، خادم خاص بھائی عبدالرزاق، سید حسن عسکری طارق صاحب (مدینہ منورہ) مولوی سید بلال حسنی ندوی، حضرت کے کاتب خاص مولوی نثارالحق ندوی، مولوی نیاز احمد ندوی بھی شریک ہوگئے، اور اس موقع پر مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، مولوی سید سلمان حسینی ندوی، مولوی عبداللہ حسنی ندوی موجود تھے اور بھائی عبدالمعید پرتاپ گڈھی (خادم) عزیزان محمود حسنی، محمد معاذ کاندھلوی، سید شارق سلمہم اور خادم مصباح الدین صدیقی موجود رہ کر معاونت

کر رہے تھے۔ اس موقع پر مولوی سید حمزہ حسنی، سید جعفر مسعود حسنی، سید عمار حسنی اور دیگر افراد خاندان موجود تھے۔

بعد مغرب سات بجے سے پونے دس بجے تک آخری دیدار کرنے والوں کا ہجوم رہا۔ جو بتدریج بڑھتا ہی جا رہا تھا، نماز جنازہ کا اعلان دس بجے کیا گیا تھا، چنانچہ ٹھیک پونے دس بجے جنازہ اٹھایا گیا، دو منٹ کا راستہ پچیس منٹ میں طے ہوا، مسجد کے اندر منبر کے قریب جنازہ رکھا گیا، مولانا سید محمد رابع صاحب حسنی ندوی نے نماز جنازہ پڑھائی۔

ساڑھے دس بجے جنازہ قبر میں اتارا گیا، قبر میں جن لوگوں نے جنازہ اتارا ان میں مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، مولوی سید عبداللہ حسنی ندوی، خادم خاص بھائی عبدالرزاق تھے، بھائی عبدالرزاق اور سید بلال حسنی لکڑی کے پٹرے لگا رہے تھے، محبوب منصور پوری پٹرے دے رہے تھے، آخری پٹرا لگانے سے پہلے کسی نے توجہ دلائی کہ کفن کا بند کھولا نہیں جا سکا، چنانچہ مولوی بلال حسنی نے قبر میں اتر کر بند کھول دیا، پھر آخری پٹرا بھی لگا دیا گیا، تدفین روضہ شاہ علم اللہ میں ہوئی، جہاں آخری جگہ باقی تھی۔

مجمع غیر معمولی تھا، ساڑھے آٹھ بجے تھا نیدار ایس پی کو رپورٹ دے رہا تھا کہ پونے دو لاکھ آدمی آ چکے ہیں اور جوں جوں نماز کا وقت قریب آ رہا تھا موسم کی سختی، سردی اور شدید کہرے کے باوجود آنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا، اور سلسلہ تو تدفین کے بعد تک جاری رہا، دور دراز کی گاڑیاں سحر تک آتی رہیں۔ ع

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے

حادثہ جمعہ کو پیش آیا، جمعرات کو ڈاکٹر عبادالرحمٰن نشاط صاحب نے (جو حضرت کے مجاز بھی ہیں) حج کے سفر کی بات رکھی تھی حضرت نے منظور فرما لیا تھا اور ارادہ کر لیا تھا۔ اس کی بھی حضرت کو بڑی فکر تھی کہ روپئے پیسے جمع نہ رہیں، جو آ رہا ہے جا تا رہے، اس کے لئے بار بار بھائی عبدالرزاق کو آواز دیتے اور مولوی بلال اور مولوی محمود کو بھی تاکید کی کہ جہاں مناسب سمجھو بتا دو، ہم دیں گے۔

اس طرح حضرت حج کے سفر کی نیت کر کے، اور روزے کی حالت میں، نماز کی تیاری اور انتظار میں، دیتے دلاتے اور اپنی عملی زندگی سے زہد و عبادت و استغنا اور تعلق مع اللہ کی دعوت دیتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

وفات کے بعد

حضرت کے وصال کا صدمہ بہت غیر معمولی تھا. لیکن بزرگوں اور صلحاء کے انتقال کے وقت اہل تعلق اور مخلصین و محبین کو اللہ تعالیٰ برداشت کی قوت اور صبر و ضبط کا یارا عطا فرما دیتے ہیں، دوسری خصوصیت جو عام طور پر اولیاء اللہ اور ربانی علماء کے وصال پر دیکھی جاتی بلکہ کھلے عام محسوس کی جاتی ہے وہ یہ کہ وحشت و گھبراہٹ کے بجائے پوری فضا پر سکینت و طمانینت کا شامیانہ تنا ہوتا ہے کوئی گھبراہٹ و مایوسی نہیں ہوتی اور نہ ہی فکر مندی اور تشویش ہوتی ہے بلکہ ذکر و دعاء اور انابت کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ حضرت کے وصال کے وقت بھی ان ہی کیفیات اور احساسات کا غلبہ تھا۔ تیسرا احساس عام طور پہ بزرگوں کی وفات پر ہر شخص کو خواہ وہ کتنا ہی قریب اور برسوں سے ساتھ رہا ہو، اپنی محرومی اور اس نعمت عظمیٰ کی ناقدری کا ہوتا ہے اس کے دل پر ایک چوٹ سی لگتی ہے اور ساری عمر کی تقصیریں یاد آتی ہیں اور حسرت ہوتی ہے کہ کاش اللہ تعالیٰ کی اس عظیم نعمت کی قدر کر لیتے۔ ع

یک حرف کاشکے است صد جا نوشتہ ایم

اور

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

کا غم ناک احساس ستاتا ہے۔

اوروں کا حال تو نہیں معلوم البتہ ہم نیازمندوں کا ایک احساس یہ بھی ہے کہ اتنی مدت گزرنے کے باوجود حضرت ہمارے درمیان موجود ہیں کہیں تشریف لے گئے ہیں تھوڑی دیر میں تشریف لے آئیں گے۔

آخری دیدار کے لئے جو لوگ آ رہے تھے چہرہ مبارک پر پہلی نظر پڑتے ہی بے اختیار سسکی کی آواز نکل جاتی تھی۔ آنکھیں ضبط کے باوجود چھلک جاتیں۔ جذبات پر قابو پانا مشکل ہو جاتا زندگی میں جس طرح نظر بھر کر دیکھنا مشکل ہوتا تھا اسی طرح وفات کے بعد بھی چہرۂ مبارک پر چند لمحے سے زیادہ نظر جمانا ناممکن ہو رہا تھا آنکھیں بند کئے اور سر جھکائے غم سے نڈھال لغزیدہ قدموں سے کسی گوشے کی پناہ لینے نکل جاتے۔ تاکہ خاموشی سے گھٹ گھٹ کر کسی طرح اس کوہ غم کو اٹھا سکیں۔

دیدار کیلئے سب سے زیادہ مضطرب مسجد کے معتکفین تھے ان کی بیقراری اور بے چینی صبر و ضبط کے سارے بندھن توڑنے والی تھی لیکن مرضیٔ مولیٰ از ہمہ اولیٰ سمجھ کر خون کے آنسو پی گئے پھر بھی ذکر و تلاوت اور دعاؤں میں ان کا قلبی اضطراب ظاہر ہو جاتا اور آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی۔ تسکین اس وقت ہوئی جب حضرت کا جنازہ مسجد کے اندر منبر کے قریب اس جگہ لایا گیا جہاں حضرت ہمیشہ نمازیں

ادا فرماتے تھے۔

وصال کے بعد ہی مولانا سید محمد رابع صاحب کے مشورہ سے نماز جنازہ اور تدفین کا وقت دس بجے شب مقرر کر دیا گیا۔ اس کی اطلاع عام کر دی گئی۔ شدید سردی اور کہرے کے باوجود مجمع بڑھتا ہی گیا۔ لیکن یہ بھی اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و کرم رہا کہ لاکھوں کا یہ مجمع بے قابو نہیں ہونے پایا۔ گھر سے جنازہ جیسے ہی نکالا گیا مضبوط فولادی ہاتھوں نے تابوت کے پایئے اس طرح اپنے قبضے میں کر لیئے کہ اژدحام سے تابوت موجوں کی طرح ہلکورے لے رہا تھا۔ اور دائیں بائیں جا رہا تھا مگر لاش مبارک تابوت پر ہی رہی۔ آخری آرام گاہ تک کا سفر بڑے سکون سے طے ہوا۔ اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل وکرم اور بہت بڑا احسان تھا یہ بھی ہوا کہ نماز جنازہ کی ادائیگی بھی بڑے اطمینان اور خشوع وخضوع کے عالم میں ہوئی۔ مائیک اور روشنی کے انتظام سے بھی اس میں مدد ملی جنازہ کے انتظار میں جو وقت گذرا اس میں بھی ذکر و دعاء کا اہتمام ہو رہا تھا اور تسبیحات کی تلقین بھی مائیک سے کی جا رہی تھی۔

نماز جنازہ کے بعد بڑی تعداد اسی وقت روانہ ہوگئی۔ انتظامیہ نے دو کلومیٹر پہلے ہی تمام سواریوں کو روک دیا تھا۔ اس لئے آنے جانے میں یہ فاصلہ طے کرنا کمزوروں اور معمر حضرات کے لئے آسان نہ تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ کی خاص مدد رہی شدید کہرے کے باوجود تمام لوگ بخیر وخوبی اپنی منزلوں تک پہنچ گئے الحمدللہ کہ نہ کسی کو ٹھنڈک لگی اور نہ ہی کوئی حادثہ پیش آیا۔ دہلی سے مرکز نظام الدین۔ اور جامعہ ملیہ سے کچھ حضرات نے بذریعہ ہوائی جہاز آنے کی کوشش کی مگر شدید کہرے کی وجہ سے جہاز پرواز نہ کر سکا اور مسافروں کو جہاز سے اتر کر واپس جانا پڑا۔ ٹرین سے آنے والے بھی سولہ سترہ گھنٹے سے پہلے نہیں پہنچ سکے تعزیت کے لئے آنے والوں کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے خط تو ہزاروں کی تعداد میں دنیا کے کونے کونے سے آئے فیکس اور فون کے ذریعہ بھی تعزیت کا سلسلہ دو ماہ تک جاری رہا۔

اس خاندان والا شان کی یہ تاریخ رہی ہے کہ ہر دور میں تعلیم و تزکیہ کا سلسلہ جاری رہا ہے۔ خاندان میں کسی نے بھی مشیخت کی دوکان نہیں لگائی جو اہل ہوتا اسی کی طرف خاندان اور خاندان کے باہر کے لوگ خود بخود بغیر کسی رسمی اعلان کے رجوع کرنے لگتے۔ اور اسی کو بڑا مان لیتے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا معاملہ یہ تھا کہ دس سال کی عمر ہی سے خاندان کے بزرگ حضرات دینی معاملات میں آگے کرنے لگے تھے حضرت کی وفات کے بعد حضرت کے بھانجے اور خلیفہ مولانا سید محمد رابع حسنی صاحب ندوی کے ساتھ حضرت کے جانشین کی حیثیت سے لوگوں نے معاملہ شروع کر دیا۔ اور بغیر کسی رسمی کارروائی کے بیعت اور تجدید بیعت لوگ کرنے لگے۔

اللہ تعالیٰ نے ندوۃ العلماء کی نظامت کا مسئلہ بھی اسی طرح حل فرما دیا اور باتفاق آراء سب نے اس کو تسلیم کر لیا۔ حالات بہت جلد معمول پر آ گئے۔ خادم خاص حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب کے رفیق سفر وحضر کی حیثیت سے رہتے ہیں کاتب خاص مولانا نثار الحق کا قیام تکیہ پر ہے، اندرون و بیرون ملک دورے بھی شروع ہو گئے ہیں عشاء کے بعد کی مجلس مہمان خانے میں اور بعد عصر اساتذہ دار العلوم اور شہریوں کی آمد کا سلسلہ معمول کے مطابق جاری ہو گیا ہے۔

داتا رکھے آباداں ساقی تری محفل کو

(بقیہ) سرمایۂ ملت کے پاسباں

د راہنما اور مشفق و مربی سرپرست اور با خدا عارف ربانی سے محروم ہوگئی، اور مجالس علم وعرفان اور طبقہ اہل علم یتیم ہو گئے ہیں۔

حضرت مرحوم کی ذات سے اللہ تعالیٰ نے وہ کام لیا جو پوری ایک جماعت کے لئے مشکل ہے، یہ ان کی مقبولیت عنداللہ اور موفق من اللہ ہونے کی علامت ہے کہ ان کے لمحات زندگی کو دین اور اشاعت کے لئے قبول فرما لیا گیا۔

(بشکریہ "بینات" پاکستان)

ؔ افسوس کہ مولانا احقاق حق اور ابطال باطل کی سنجیدہ کوشش کرتے ہوئے کراچی پاکستان میں ۱۰ مئی ۲۰۰۰ء کو شہید کر دیئے گئے۔ (ادارہ)

اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

یہ شکوہ کرنا کہ ہمیں بہت نازک زمانہ ملا ہے اور ہماری راہ کانٹوں سے بھری ہوئی ہے: کم ہمتی کی بات ہے، بلند ہمتی کی بات یہ ہے کہ اگر راستہ آسان ہو تو آدمی کو شبہ ہونے لگے اپنے بارے میں کہ مجھے اس قابل نہیں سمجھا گیا کہ میں کسی مشکل پر چلوں، اگر زندگی ساری کی ساری سہولتوں سے لبریز ہوتی تو زندگی میں لطف نہ رہتا، شاعر نے خوب کہا ہے ؎

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موج حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

دو علمی خاندانوں کے باہمی روابط

پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شروانی

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی (١٨٦٧ء - ١٩٥٠ء) کئی حیثیتوں کے جامع تھے، وہ رئیس بھی تھے اور عالم بھی، ادیب بھی تھے اور خطیب بھی۔ ان کا تعلق مسلمانانِ ہند کے متعدد دینی، تعلیمی، ثقافتی اور ادبی اداروں اور انجمنوں سے رہا۔ ان کا حلقۂ احباب خاصا وسیع تھا اور اس میں مسلم وغیر مسلم کی شرط بھی نہیں تھی، ہاں! ایک شرط ضرور تھی: علم دوستی، سلامتی پسندی اور میانہ روی۔ وہ زندگی کے ہر میدان میں عدل وتوازن کے قائل تھے اور ایسے ہی لوگوں سے تعلقات استوار کرنا پسند کرتے تھے جو ان اوصاف سے متصف ہوں۔ ان کے سوانح نگار مولوی شمس تبریز خاں نے ان کی سوانح عمری "صدر یار جنگ" میں لکھا ہے کہ ان کے جن معاصرین سے ان کے دوستانہ روابط تھے ان میں ان سے بڑی عمر کے افراد بھی شامل تھے، ہم عمر بھی تھے اور ان سے چھوٹے بھی تھے لیکن ان کے ساتھ تعلقات میں مولانا شروانی نے فرقِ مراتب ہمیشہ ملحوظ رکھا۔[1] یہ بات بالکل صحیح ہے لیکن شمس تبریز خاں صاحب نے ان کے احباب کی جو فہرست دی ہے وہ نامکمل ہے کیونکہ اس میں غیر مسلم حضرات کے نام شامل نہیں کئے گئے ہیں۔ اسی طرح بعض مسلم اکابر کے نام بھی چھوٹ گئے ہیں۔

مولانا شروانی کے ان سب حضرات سے تعلقات ومراسم کے اسباب اور نوعیتیں مختلف تھیں۔ اس مضمون میں ان سب کا جائزہ لینا مقصود نہیں ہے بلکہ اسے محض ندوۃ العلماء اور اس سے متعلق حضرات تک محدود رکھنا مطلوب ہے اور ان میں بھی خصوصیت سے خانوادۂ سید احمد شہیدؒ کے باپ بیٹوں (مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی، مولوی ڈاکٹر سید عبدالعلی اور مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی) پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا، مولانا شروانی کا تعلق مسلمانوں کے مختلف دینی، تعلیمی، تہذیبی اور ادبی اداروں سے رہا تھا لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ ان میں جو خصوصیت ایم۔ اے۔ او کالج (بعد میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، ندوۃ العلماء اور دار المصنفین اعظم گڑھ کے ساتھ تھی وہ کسی اور ادارے کے ساتھ نہیں تھی۔ اس وقت علی گڑھ سے صرف نظر کرکے اگر بات صرف ندوۃ العلماء اور دار المصنفین کی کی جائے تو یہ واضح ہوجاتا ہے کہ ذہنی اور فطری مناسبت کے علاوہ اس میں سب سے زیادہ دخل مولانا شروانی کے علامہ شبلی نعمانی کے ساتھ روابط وہم خیالی کو تھا۔ علامہ شبلی سے وہ ان کے قیام علی گڑھ کے دوران مانوس ہوگئے تھے۔ علامہ کا تعلق علی گڑھ سے باقاعدہ ١٨٨٣ء میں قائم ہوا تھا[2] اور مولانا شروانی نے علامہ شبلی پر اپنے تعزیتی مضمون میں لکھا ہے کہ ان کی علامہ سے سب سے پہلی ملاقات اندازاً ١٨٨٧ء میں ہوئی تھی۔[3]

ندوۃ العلماء لکھنؤ کا پہلا سالانہ جلسہ کانپور میں ١٨٩٤ میں منعقد ہوا تھا اور مولانا شروانی اس میں شریک تھے اور نہ صرف شریک تھے بلکہ اس کی کارروائیوں میں عملاً حصہ دار تھے۔ وہ اس کے بعد بھی اکثر جلسوں میں پابندی سے شریک ہوتے رہے اور اس کے علمی اور انتظامی دونوں امور میں بھرپور دلچسپی لیتے رہے[4] اسی لئے ان کا شمار ندوۃ العلماء کے بانیوں میں کیا جاتا ہے۔

ندوۃ العلماء کے تعلق سے مولانا شروانی کے جن حضرات سے مراسم استوار ہوئے ان میں مولانا سید محمد علی مونگیری کا شمار ان کے ممدوحین میں ہوتا ہے اور مولانا شروانی کے بعد کی نسل کے اکابر کا (باستثناء مولانا ابوالکلام آزاد) مداحین میں علامہ شبلی کے علاوہ اپنی نسل کے جن حضرات سے ان کے اخلاص وصداقت کے رشتے قائم ہوئے ان میں سب سے زیادہ نمایاں مولانا سید عبدالحی حسنی اور منشی احتشام علی علوی ہیں۔ اول الذکر سے ان کے تعلق کی بنا دینی اور علمی یگانگت اور ہم آہنگی تھی اور ثانی الذکر سے ثقافتی اور مجلسی یک رنگی وہم خیالی۔

"صدر یار جنگ" میں مولانا شروانی کے مولانا عبدالحی کے نام جو خطوط نقل ہوئے ہیں وہ بھی اسی کی شہادت دیتے ہیں۔ ان میں بالعموم عربی اور فارسی کے قدیم نادر مخطوطات کا ذکر ہے یا پھر ان کی سخن شناسی کا اعتراف کرتے ہوئے اپنا فارسی کلام ان کی نذر کیا گیا ہے۔ مولانا عبدالحی اور مولانا شروانی نے اپنی مختلف تحریروں میں ایک دوسرے سے متعلق جن جذباتِ خلوص ومودّت کا اظہار کیا ہے اور ان سے ایک کا دوسرے کے لئے جو احترام اور قدر ومنزلت مترشح ہوتی ہے وہ کسی اور کے لئے مشکل سے ہوتی ہے۔ مولانا عبدالحیؒ نے "نزہۃ الخواطر" میں

مولانا شروانی کا ذکر جن الفاظ میں کیا ہے ان الفاظ میں کم لوگوں کا ذکر کیا ہوگا۔ "صدر یار جنگ" میں اس کا جو اردو ترجمہ مولوی شمس تبریز خاں نے نقل کیا ہے اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"..... انھوں نے علم و معرفت دونوں فضیلتوں کا احاطہ کر لیا۔ مکارم و فضائل، حسن خلق اور علم و عبادت کا اشتغال، محتاجوں کی خبر گیری، مسلمانوں کے لئے فکر مندی میں ان جیسا شخص مشکل سے ملے گا۔"

رسالہ جامعہ نئی دہلی کے جنوری تا مارچ ۲۰۰۰ء کے شمارے میں "مولانا آزاد کی شخصیت کے چند پہلو" کے زیر عنوان پروفیسر ظفر احمد صدیقی کا جو مضمون شائع ہوا ہے اس میں وہ لکھتے ہیں:۔

"مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی صاحب نے "نزہۃ الخواطر" میں "الشیخ الفاضل" کا اطلاق صرف ممتاز علماء ہی پر کیا ہے مثلاً ڈپٹی نذیر احمد، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی وغیرہ (پروفیسر صدیقی کا کہنا ہے کہ مولانا عبدالحی نے یہی اصطلاح مولانا ابوالکلام آزاد کے لئے بھی استعمال کی ہے) علامہ شبلی نعمانیؒ اور علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے لئے "الشیخ الفاضل العلامہ" کے الفاظ تحریر کئے ہیں اور سرسید احمد خاں کے لئے "الرجل الکبیر" (مرد عظیم)۔"

ظفر احمد صدیقی صاحب نے تو یہ بحث علماء میں مولانا آزاد کا مرتبہ متعین کرنے کے لئے چھیڑی ہے لیکن اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مولانا عبدالحیؒ، مولانا شروانی کو بھی علماء کے اسی زمرے میں شامل سمجھتے تھے۔ اگر ایک طرف وہ انھیں زمرۂ علماء میں شامل سمجھتے تھے تو ان کی بعض دوسری خصوصیات اور کمالات کے بھی کم معترف نہیں تھے۔ بقول مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ان کے والد ماجد نے "گل رعنا" میں بھی مولانا شروانی کے "ذکر کی تقریب" نکال لی۔ اور تحریر فرمایا:۔

"...... فضیلت علمی کے ساتھ خدا نے ان کو ایسی صفتیں عنایت کی ہیں جن پر ہمیشہ مجھ کو رشک آتا ہے۔ سب سے نمایاں صفت ان کی متانت اور اصابت رائے ہے۔ دوسری صفت ان کی انتظامی قابلیت ہے۔ تیسری صفت ان کی یہ ہے کہ باوجود نوجوانی اور رنگین مزاجی اور دولت مندی کے مذہبی جذبات کی پرورش و پرداخت سے غفلت نہیں کی۔ چوتھی صفت یہ ہے کہ باوجود ان تمام مشغولیتوں کے اپنے اوقات کا بیشتر حصہ ایسے کاموں میں صرف کرتے ہیں جن سے مسلمانوں کی فلاح و بہبود وابستہ ہے۔"

مولانا عبدالحی کی تصانیف میں "یاد ایام" کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ یہ گجرات کی اسلامی تاریخ ہے جو انھوں نے مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی جوائنٹ سکریٹری آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی فرمائش پر کانفرنس کے اجلاس منعقدہ سورت، ۱۹۱۸ء میں پڑھنے کے لئے تحریر فرمائی تھی۔ مولانا اس اجلاس میں کسی وجہ سے شرکت نہیں فرما سکے تھے اور یہ رسالہ وہاں نہیں پڑھا جا سکا تھا لیکن آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے اسے ۱۹۱۹ء میں طبع کرا کے شائع کر دیا تھا۔ مولانا عبدالحیؒ نے کتاب کے آغاز میں تحریر فرمایا ہے:۔

"...... جناب مولانا حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی رئیس بھیکن پور نے اس سال مجھے دعوت دی کہ میں محمڈن (اب آل انڈیا مسلم) ایجوکیشنل کانفرنس کے اس اجلاس میں جو بمقام سورت منعقد ہونے کو تھا شرکت کروں مگر اس کے ساتھ یہ بھی حکم تھا کہ خالی ہاتھ نہ جاؤں بلکہ گجرات کے علمی دور کی تاریخ مرتب کر کے جلسے میں پیش کروں۔ ان کا یہ ارشاد میری افتاد طبیعت کے خلاف تھا مگر کچھ اس طور پر فرمایا تھا کہ میرے زخم کہن تازہ ہوگئے۔ میں نے ان کے حکم کی تعمیل کی اور گجرات کے متعلق معلومات بہم پہونچائیں۔"

یہاں اتنا طویل اقتباس اس خیال سے نقل کیا گیا ہے کہ اس سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ مولانا عبدالحی کے دل میں مولانا شروانی کا اتنا احترام تھا کہ جو امر ان کی "افتاد طبیعت کے خلاف تھا" اس کے لئے بھی ان کی فرمائش پوری کرنے کی خاطر آمادہ ہوگئے تھے اور نہ صرف آمادہ ہوگئے تھے بلکہ ایک ایسی تاریخ تالیف فرمائی جس کے بارے میں مولانا شروانی نے اپنے مقدمے میں تحریر فرمایا:۔

"فاضل مؤلف نے جس خوبی سے اس مختصر رسالے میں گجرات کی اسلامی تاریخ کے مختلف پہلو دکھائے ہیں وہ فی الواقع مؤرخانہ اور ادیبانہ دونوں حیثیتوں سے قابل داد ہیں۔"

یہ تو مقدمے کا اقتباس تھا لیکن "یاد ایام" کا مسودہ موصول ہونے پر اسے پڑھ کر مولانا شروانی نے فاضل مصنف کو جو خط لکھا وہ اس سے بڑھ کر ان کے جذبات مسرت و طمانیت کا ترجمان ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"رب کریم عم نوالہ کی ایک نعمت عظیم تھی جو کل آپ کے رسالے کے پیرایہ میں ظاہر ہوئی۔ میں نے رات ہی کو اس

کو کل تقریباً پڑھ لیا۔ میرے سرور وانبساط کی عجیب کیفیت تھی، پڑھتا تھا اور فخر وخوشی کی موجیں دل میں اٹھتی تھیں اور بار بار رسالہ آنکھوں سے لگاتا تھا اور چومتا تھا۔ اگر آپ سامنے ہوتے تو یقین ہے کہ آپ کے ہاتھ چومتا، قدم چومتا، یہ کیا وفور جذبات ہے اور کس پیرایہ میں اس کا اظہار ہوا ہے۔

علامہ شبلی نعمانی سے مولانا شروانی کو جو قلبی تعلق تھا اس سے اہل نظر بخوبی واقف ہیں تاہم ندوۃ العلماء کے بعض معاملات میں علامہ شبلی کے مقابلہ میں مولانا شروانی کی مولانا عبدالحی سے زیادہ ہم خیالی تھی۔ ان میں ایک مسئلہ ندوۃ العلما میں انگریزی تعلیم کے اجراء کا تھا۔ اس بارے میں علامہ شبلی کو نہایت انہماک تھا جو مقتضائے وقت کے عین مطابق تھا لیکن مولانا عبدالحی اور مولانا شروانی دونوں اس میں کسی قدر متأمل تھے اور اس میں بھی خلوص نیت ہی کو دخل تھا۔ مولانا شروانی علی گڑھ تحریک کے حامی تھے، خود انگریزی کی تعلیم حاصل کی تھی اور اپنے بیٹوں کو علی گڑھ کے کالجیٹ اسکول اور ایم۔ اے۔ او کالج میں داخل کر کے انگریزی پڑھوائی تھی۔ اس کے باوجود ان کا یہ تأمل علامہ شبلی کو بہت کھلتا تھا اور اس کا اظہار انھوں نے اپنے کئی خطوط میں کیا ہے۔ در اصل مولانا شروانی کے پیش نظر علی گڑھ اور ندوۃ العلماء کے مقاصد کا فرق تھا۔ جب علامہ شبلی کا اضطراب اس باب میں بہت بڑھا اور انھوں نے مولانا شروانی سے ذرا ناگواری سے احتجاج کیا تو انھوں نے کہا میں آپ کی بدنامی کے ڈر سے متأمل ہوں۔ غالباً ان کے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ بیشتر علماء کرام اس دور میں انگریزی تعلیم کو عربی مدارس میں انگیخت کرنے کے لئے تیار نہیں تھے اور اتنی مدت گزر جانے کے بعد بھی ایسے مدارس اور ایسے علماء ہیں جن کا رویہ اس معاملے میں ابھی تک کچھ زیادہ تبدیل نہیں ہوا ہے اور جن مدارس نے اس پر اپنے کو آمادہ بھی کر لیا ہے ان کا بھی انگریزی کا معیار مشکل ہی سے قابلِ اطمینان قرار دیا جا سکتا ہے اگرچہ یہ تبدیلی اور معیار کی بلندی اب اور زیادہ ناگزیر ہو گئی ہے۔

—۲—

مولانا سید عبدالحی کی وفات کے بعد مولانا شروانی کا یہ تعلقِ خاطر ان کے صاحبزادگان والا تبار مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی طرف منتقل ہو گیا، اور ان حضرات نے بھی اس تعلق کی نگہداشت اور آبیاری میں کسر نہیں اٹھا رکھی بلکہ مولانا علی میاں نے تو اس تعلق کو خاندانی تعلق میں تبدیل فرما دیا۔ جیسا کہ عرض کیا گیا، مولانا شروانی کا ندوۃ العلماء سے شروع سے قریبی تعلق رہا تھا۔ اس کے پیش نظر بھی ندوہ کے اربابِ کار کے لئے لازم تھا کہ وہ مولانا شروانی سے ربط و تعلق برقرار رکھتے۔ مولانا شروانی کے نام ندوۃ العلماء کے جملہ ناظمین از مولانا سید محمد علی مونگیریؒ تا ڈاکٹر مولوی سید عبدالعلیؒ کے خطوط خاصی کثیر تعداد میں محفوظ ہیں۔ مولانا علی میاں، ندوہ کے ناظم مولانا شروانی کی وفات (۱۹۵۰) کے بعد مقرر ہوئے۔ ان کا صرف ایک خط ابھی تک ہمارے ہاتھ آیا ہے جو اپنے مقام پر نقل ہوگا۔ ناظمین ندوہ کے خطوط پر ایک نظر ڈالنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ تعداد میں سب سے زیادہ خطوط ڈاکٹر مولوی سید عبدالعلیؒ کے ہیں۔ اس کا سبب یہ محسوس ہوتا ہے کہ بڑھتی ہوئی عمر اور گرتی ہوئی صحت کی بنا پر غالباً مولانا شروانی کی شرکت ندوۃ العلماء کی مجالس میں کم ہو گئی تھی لیکن ڈاکٹر صاحب اہم امور میں مولانا شروانی سے مشورہ کرنا اور ندوہ کے حالات سے انھیں واقف کرنا ضروری خیال فرماتے تھے۔ اس لئے وہ برابر انھیں خطوط لکھتے رہتے تھے اور ان کی آراء سے مستفید ہوتے رہتے تھے۔

جہاں تک مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا تعلق ہے، میں اپنے ذاتی علم اور تجربے کی بنیاد پر بلا خوف تردید عرض کر سکتا ہوں کہ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا سید سلیمان ندوی کے بعد کی نسل میں جو تعلق خاطر مولانا علی میاں کو مولانا شروانی سے تھا، وہ ان کے جتنے مرتبہ شناس تھے، اپنی مختلف مجلسوں میں ان کا جتنا ذکر فرماتے تھے اور انھوں نے ان کے بارے میں جتنا لکھا ہے اتنا کسی اور نے نہیں کیا ہے۔ "نزہۃ الخواطر" میں مولانا سید عبدالحیؒ نے مولانا شروانی کا جو تذکرہ لکھا ہے اس پر مولانا علی میاںؒ نے معتد بہ اضافہ کیا ہے۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ اضافہ مولانا شروانی کی وفات (۱۹۵۰ء) کے بعد کیا گیا ہے اور اس وقت تک مولانا شروانی کے کارنامے اور ان کے فضائل و کمالات مکمل صورت میں نظروں کے سامنے آچکے تھے۔ تاہم ہمارے نزدیک اس کا اصلی سبب وہ مقام اور وہ مرتبہ ہے جو مولانا علی میاںؒ کے دل میں مولانا شروانیؒ کا تھا۔ "صدر یار جنگ" میں مولانا علی میاں کے اضافے کا اردو ترجمہ بھی نقل ہوا ہے۔ اس کا حسب ذیل اقتباس ملاحظہ طلب ہے:

"......مجموعی طور پر (وہ) یگانہ روزگار شخصیت کے مالک تھے۔ اس ایک شخصیت میں متنوع اور مختلف خصوصیات کا بڑا نادر اجتماع ہو گیا تھا۔ دین متین کی

شدید پابندی، عالی حوصلگی، شعر وادب کا نہایت پاکیزہ اور فطری ذوق، سلامتِ ذہن اور اصابت رائے، قوتِ ارادی، حسن انتظام، شیریں کلامی اور زبان کی پاکیزگی، غرض ہر طرح کی عزتیں اور فضیلتیں آپ کو حاصل تھیں۔"[11]

"صدر یار جنگ" کی تالیف مولانا علی میاں ہی کے حسن توجہ اور اخلاص وعقیدت کی مرہون منت ہے۔ انھوں نے خود اس کا مقدمہ تحریر فرمایا ہے جو ۱۳ صفحوں پر محیط ہے۔ اس میں انھوں نے اس "ادائے فرض" پر کس شیفتگی بلکہ وارفتگی کے ساتھ بارگاہِ الٰہی میں اظہار تشکر فرمایا ہے:-

"قلم وقلب دونوں بارگاہِ الٰہی میں سربسجود ہیں کہ ندوۃ العلماء کے ایک حقیر خادم کی حیثیت سے آج حیات شروانی کو ملک کے سامنے پیش کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے اور ایک دیرینہ اور عزیز آرزو پایۂ تکمیل کو پہونچ رہی ہے۔"

اور اس کے بعد لکھا ہے:-

"ابتدائے عمر سے جن چند شخصیتوں کی عظمت قلب ودماغ پر نقش ہوئی اور وہ ایک مثالی اور قابل تقلید (آئیڈیل) انسان کی حیثیت سے تصور ونگاہ کے سامنے کھڑی نظر آئیں ان میں ایک نمایاں شخصیت نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی تھی۔ جس چیز نے ہر دور میں سب سے زیادہ گرویدہ کیا وہ جامعیت واعتدال، توازن اور وسیع ومتنوع ثقافت (کلچر) تھی اور نواب صاحب مرحوم اس آخری دور میں (میرے محدود علم وتجربے میں) اس کا مظہر کامل تھے۔"[12]

"پرانے چراغ" حصہ دوم کو مولانا علی میاں نے مختلف عنوانوں کے تحت تقسیم کیا ہے اور ان عنوانوں کے ذیل میں ان اکابر کے حالات اور ان کے بارے میں اپنے تأثرات رقم فرمائے ہیں جو ان کے نزدیک ان عناوین کے مطابق ہیں۔ ان میں پہلا عنوان "ہندوستان کے چند اہل کمال ومشاہیر رجال" ہے۔ اس عنوان کے تحت چار بزرگوں کا ذکر کیا گیا ہے: مولانا محمد علی جوہر، نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر ذاکر حسین۔ خیر یہ ترتیب تو ان بزرگوں کے سنہ وفات کے مطابق رکھی گئی ہے لیکن اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی نظر میں مولانا شروانی کا کیا مقام تھا۔ اگر والد ماجد (مولانا سید عبدالحی حسنیؒ) نے ان کے لئے وہ الفاظ منتخب فرمائے تھے جو اہل علم کے لئے مخصوص کئے تھے اور انھیں علماء کے ساتھ ادبار کے زمرے میں بھی شامل کیا تھا تو فرزند ارجمند نے انھیں ملک کے چند مخصوص اہل کمال اور مشاہیر رجال میں شمار کیا۔ اس مضمون کے مطالعے سے مولانا شروانی کے مولانا علی میاںؒ کے ساتھ تعلقِ خاطر کا بھی بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ پہلے یہ ملاحظہ کر لیجئے کہ جب مولانا علی میاں نے مولانا شروانی کو ۱۹۲۵ء میں ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس منعقدہ لکھنؤ میں پہلی مرتبہ دیکھا، اور اس وقت مولانا علی میاں کی عمر صرف دس سال تھی، تو ان کا کیا تأثر ہوا۔

"ایک بزرگ کے چہرے پر میری توجہ مرکوز ہو کر رہ گئی جن کے حسن وجمال، وقار اور رکھ رکھاؤ، لباس کی پاکیزگی اور زیبائی کا نمونہ میری نظر سے اس وقت تک نہیں گزرا تھا۔ اس شخصیت میں علماء کی تمکنت اور قدیم رؤسا کی نستعلیقی اور وجاہت اس طرح جمع نظر آئی گویا وہ کسی اسلامی مملکت کا کوئی فاضل بادشاہ اور سربراہ ہے۔"[13]

ظاہر ہے کہ یہ شخصیت مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی ہی کی تھی۔ مولانا شروانی کی تصنیف "علمائے سلف" کو وہ اپنی محسن کتابوں میں شمار کرتے ہیں اور "سیرۃ الصدیق" کو "ان کے قلب ووجدان کے سرچشمے سے سیراب ہو کر ان کی تراوش قلم"[14] قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح اور اسی لہجے میں ان کی بعض دیگر تصانیف کا ذکر فرمایا ہے۔ ان کے ایک اور وصف پر خاص طور سے زور دیا ہے:

"انھوں نے صرف ان ہی علمی کمالات پر قناعت واکتفاء نہیں کیا بلکہ علم وفن کے پہلو بہ پہلو ایمان واحسان کے ذریعہ اپنی باطنی دنیا بھی آباد کی۔ اپنے اوقات عزیز کو اللہ کے ذکر سے معمور کیا اور اس طرح دین ودنیا کے حسنات کو جمع کرنے کی کوشش کی۔"[15]

انھیں اس کا ملال ہے کہ مولانا شروانی کی:

"...... جامعیت ان کی شخصیت کا بڑا حجاب بن گئی۔"[16]

اور اس طرح ان کے مختلف علمی، ادبی، اخلاقی اور روحانی امتیازات کا وہ اعتراف نہیں ہوا جو ہونا چاہئے تھا۔

مولانا شروانی کے ساتھ اپنی مختلف ملاقاتوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کی شفقت کے کئی واقعات تحریر فرمائے ہیں۔ ان میں سے بعض واقعات وہ خاکسار راقم سے بھی مختلف موقعوں پر بڑے شوق اور انہماک سے بیان فرماتے رہتے تھے مثلاً یہ کہ مولانا شروانی انھیں ہمیشہ "سید علی" کہہ کر مخاطب فرماتے یعض مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ بزرگوں کے

موجودگی میں نماز کی امامت کے لئے انھیں آگے
بڑھادیا۔ ایک مرتبہ مولانا علی میاں علی گڑھ تشریف
لائے اور مولانا ابوبکر محمد شیث ناظم سنی دینیات
کے ساتھ قیام فرمایا۔ مولانا شروانی سے ملاقات ہوئی
تو انھوں نے دریافت فرمایا کہاں ٹھہرے ہو۔ علی
میاں صاحب نے مولانا ابوبکر کا نام لیا تو تجاہل عارفانہ
سے کام لے کر فرمایا کون مولانا ابوبکر؟ جب علی میاں
صاحب نے مزید تشریح فرمائی تو کہا:۔

"ہم کو معلوم ہے کہ یہاں ایک شروانی
بھی رہتا ہے؟"

مولانا علی میاں کے لئے یہ تنبیہ کافی تھی اور پھر وہ
مولانا شروانی کے مکان "حبیب منزل" کو منتقل ہوگئے
ایک صحبت میں مولانا شروانی نے مولانا علی میاں سے
ان کے والد ماجد مولانا سید عبدالحی مرحوم کے
ساتھ اپنے تعلق خاطر کا اظہار بہت لطیف انداز میں
فرمایا۔ ارشاد ہوا:

"..... میں نے جب "گل رعنا" میں نواب سید
نورالحسن خاں مرحوم کا تذکرہ پڑھا۔ تو مولانا
مرحوم (مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب مصنف
"گل رعنا") کے ان کے متعلق یہ الفاظ پڑھ
کر بڑا رشک آیا کہ "مجھے ان کی خدمت میں
پندرہ سال سے نیاز حاصل ہے۔" لیکن جب
میں نے اپنا حال پڑھا اور اس میں دیکھا کہ میرے
ان کے تعلق کی مدت تیس برس سے ہے
(کذا)، تو رشک جاتا رہا۔"[لہ]

مولانا علی میاںؒ نے مولانا شروانی سے متعلق آل
ریڈیو دہلی سے ایک تقریر بھی بزبان عربی نشر
فرمائی تھی جو بعد میں مکہ مکرمہ کے موقر مجلہ "الحج" میں
شائع ہوئی تھی۔ اس کا اردو ترجمہ مولوی شمس
تبریز خاں کے قلم سے بعض اضافوں کے ساتھ
رسالے کی شکل میں شائع ہوا۔

جب ۱۹۴۰ء "الندوہ" کا سہ بارہ اجراء
ہوا اور مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی اور مولانا
علی میاں اس کے مدیر مقرر ہوئے تو مولانا شروانی
سے مولانا علی میاں کی مکاتبت کا آغاز ہوا۔ اس
سلسلے کے چار خطوط مولانا علی میاں کے نام
"صدر یار جنگ" میں شامل ہیں۔ جس رسالے
کا ابھی ذکر ہوا اس میں دو مزید خطوں کا اضافہ
ہے۔ ان تمام خطوط میں مولانا شروانی نے علی
میاں صاحبؒ کو "گرامی قدر" کے لقب سے مخاطب
فرمایا ہے۔ مولانا شروانی کے نام مولانا علی میاں کا
جو خط ہمارے پاس محفوظ ہے وہ ذیل میں درج
کیا جاتا ہے:۔

"مخدوم گرامی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ
تحفۂ گرامی موصول ہوا۔ عرض نہیں
کرسکتا کس قدر مسرت وعزت حاصل
ہوئی۔ بے شک اس مشرقی مطلع کا ذکر
تشنہ رہ گیا تھا۔ اس کی تکمیل کے لئے
اس سے زیادہ اہل کون ہوسکتا ہے
جو براہ راست اس مطلع انوار سے
مستنیر ہے۔ اطال اللہ بقائہ۔
مقالۂ گرامی بہت بروقت پہونچا۔
رسالے کی کتابت ہورہی ہے، انشاءاللہ
اسی اشاعت میں شائع ہوجائے گا
خیال ہوتا ہے اسی تقریب سے آئندہ
اشاعت میں والد مرحوم کا وہ مضمون
شائع کردیا جائے جس میں مرحوم نے
اپنی حاضری گنج مرادآباد کے واقعات
اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے بعض
ارشادات وملفوظات قلم بند کئے
ہیں۔ یہ مضمون جناب کی نظر سے ضرور
گذرا ہوگا مگر اب یادگار ہے اور
قارئین کے لئے بالکل جدید۔
امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

ابوالحسن علی ندوی
۱۹ محرم الحرام ۵۹ھ"

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ "پرانے چراغ" سے
مولانا شروانی کا وہ مکتوب بھی ملخصاً نقل کردیا
جائے جس کے جواب میں یہ خط تحریر کیا گیا ہے
تاکہ ناظرین پر صورت حال واضح ہوجائے۔

"۱۷ محرم الحرام ۱۳۵۹ھ
گرامی قدر سلمہٗ
السلام علیکم ورحمۃ اللہ
عزیزی مولوی سید سلیمان صاحب
نے "الندوہ" میں "ندوۃ العلماء کی تاریخ
کے پہلے صفحے" پر مضمون لکھ کر اگلی صحبتوں
کی یاد تازہ کردی ہے۔ اسی مضمون میں
جتایا ہے کہ "اس سلسلے کا رابطہ ایک
اور روحانی مرکز سے بندھا ہوا تھا جس
کا نام نامی حضرت مولانا فضل رحمٰن
صاحب مجددی گنج مرادآبادی تھا۔
مشرق ومغرب کے یہی دونوں مطلع تھے
جن سے ندوۃ العلماء کا آفتاب طلوع
ہوا"۔
مغربی مطلع کا ذکر مولوی صاحب
کے مضمون میں بہت کچھ آچکا۔ مشرقی مطلع
کا ذکر میں اپنی ایک پرانی تحریر کے ذریعہ
سے سناتا ہوں جو آج سے چون برس
پہلے لکھی گئی تھی۔
حبیب الرحمٰن

—۳—

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، مولانا سید
ابوالحسن علی ندوی نے اپنے والد ماجد مولانا
سید عبدالحی حسنی اور مولانا حبیب الرحمٰن
خاں شروانی کے تعلقات کو خاندانی مراسم میں
تبدیل فرمادیا۔ انھوں نے مولانا شروانی کے

فرزند اور میرے والد الحاج مولوی عبیدالرحمٰن خاں شروانی (۱۸۹۷ء-۱۹۹۲ء) کو نہ صرف ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ کا رکن منتخب کرایا بلکہ مسلمانوں کے بعض دیگر علمی، تعلیمی اور تہذیبی اداروں میں بھی ان کے ساتھ مل کر کام کیا۔ ان اداروں میں دارالعلوم دیوبند، دارالمصنفین اعظم گڈھ اور وقف نواب عظمت علی خاں مظفر نگر خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کی بازیابی کی تحریک میں بھی دونوں کا اشتراکِ عمل رہا۔ وہ مولوی عبیدالرحمٰن خاں شروانی کی انتظامی صلاحیت، وسیع انتظامی تجربے اور اصابت رائے کے بہت قائل تھے اور مختلف اداروں سے متعلق بعض اہم امور و مسائل میں ان کی رائے کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ ندوۃ العلماء کی مجلسِ انتظامیہ کے کئی جلسوں کی صدارت بھی ان سے کرائی۔ مولوی عبیدالرحمٰن خاں شروانی مولانا علی میاں سے عمر میں تقریباً سترہ سال بڑے تھے، اس لئے مولانا علی میاں ان کی بزرگی کا خیال رکھتے تھے اور خطوط میں بالعموم انھیں مخدومی لکھ کر مخاطب کرتے تھے، دوسری طرف عبیدالرحمٰن خاں شروانی صاحب مولانا علی میاں کے علم و فضل، خدمتِ ندوہ اور دینی و روحانی رجحانات کے بہت قائل اور مداح تھے اور ان کے دل میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کا جو احترام تھا اس سے بھی بہت متأثر تھے۔ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے بتایا کہ جب عبیدالرحمٰن خاں صاحب لکھنؤ ندوہ کے کام سے تشریف لے جاتے تو ان کا قیام مولانا علی میاںؒ ہی کے ساتھ رہتا تھا۔ اس لئے ایک کو دوسرے کے اور زیادہ قریب آنے کا موقع ملا اور رات دن کے مشاغل سے مزید واقفیت حاصل ہوئی۔ مولانا علی میاں جب علی گڈھ تشریف لاتے تو مدت سے ان کا معمول تھا کہ پروفیسر ابرار مصطفیٰ خاں کے ساتھ قیام فرماتے تھے لیکن "حبیب منزل" تشریف لاکر عبیدالرحمٰن خاں صاحب سے ملاقات ضرور کرتے تھے، ان دونوں کے روابط کو مستحکم کرنے والی ایک کڑی حضرت شاہ محمد یعقوب مجددی بھوپالیؒ کی ذات گرامی تھی۔ بھوپال کی ان مجالس میں اکثر دونوں کی یکجائی ہو جاتی تھی۔ مولانا علی میاںؒ نے ان صحبتوں کا جو حال اپنے دل نشین اور مؤثر انداز میں "صحبتے با اہل دل" میں بیان فرمایا ہے ان میں کئی جگہ مولوی عبیدالرحمٰن خاں شروانی کے شریکِ مجلس ہونے کا ذکر ملتا ہے۔

والد ماجد مولوی عبیدالرحمٰن خاں شروانی نے ۶ رمئی ۱۹۹۲ء کو تقریباً ۹۵ سال کی عمر میں سفر آخرت اختیار کیا۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔ مولانا علی میاںؒ نے مجھے تعزیتی مکتوب میں تحریر فرمایا:-

"نواب صاحب مرحوم سے ایسا موروثی، خاندانی اور روحانی تعلق تھا جو قدیم زمانے میں چھوٹوں کا بڑوں سے ہوا کرتا تھا اور وہ بھی ایسے ہی شفقت فرماتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔"

"کاروان زندگی" حصہ پنجم میں اس حادثے کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا ہے:-

"۵ رمئی ۱۹۹۲ء یا ۷ رمئی ۱۹۹۲ء (دوسری تاریخ صحیح ہے۔ ر۔ ش) کو اچانک مخدوم و محترم نواب عبیدالرحمٰن خاں صاحب شروانی کی وفات کی اطلاع ملی اور ایسا محسوس ہوا کہ اپنے ہی خاندان کے ایک بزرگ شفیق اور سرپرست کے ارتحال کا واقعہ پیش آیا۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔"

علی گڈھ مسلم یونیورسٹی نے طے کیا کہ مولوی عبیدالرحمٰن خاں شروانی مرحوم کی یونیورسٹی کی طویل اور گوناگوں خدمات کے پیش نظر یونیورسٹی میں ریسرچ کے طلبہ کے لئے ایک نیا ہال تعمیر کرا کے مرحوم کے نام سے منسوب کرے، اس زمانے میں مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر محمد نسیم فاروقی اور پرو وائس چانسلر پروفیسر ابوالحسن صدیقی تھے۔ ہال کا سنگ بنیاد رکھنے کے لئے پورے ملک میں حضرت مولانا علی میاں سے زیادہ مناسب کوئی دوسری شخصیت نظر نہیں آئی اور اس غرض سے انھیں ۱۹۹۴ء میں علی گڈھ تشریف لاکر سنگ بنیاد رکھنے کی زحمت دی گئی جو انھوں نے اپنی صحت کی کمزوری اور بیش از بیش مصروفیات کے باوجود اس تعلق کی بنا پر جو انھیں مولوی عبیدالرحمٰن خاں شروانی مرحوم اور ان سے بھی بڑھ کر مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم کے ساتھ تھا قبول فرمائی۔ اس جلسے کی کیفیت انھوں نے "کاروانِ زندگی" حصہ ششم میں اس طرح رقم فرمائی ہے:-

"...... اس مرتبہ نواب مولوی عبیدالرحمٰن خاں صاحب شروانی مرحوم کے نام سے جو ہاسٹل (ہاسٹل نہیں، ہال) تعمیر ہوا تھا (ہوا نہیں تھا ہونے والا تھا) اس کے افتتاح (افتتاح نہیں، سنگ بنیاد) کی تقریب میں یونیورسٹی کے ذمہ داروں (خصوصاً وائس چانسلر نسیم فاروقی صاحب اور پرو وائس چانسلر ابوالحسن صدیقی صاحب) کی طرف سے خاکسار کو دعوت دی گئی۔ نواب صاحب مرحوم (اور اس سے زائد) ان کے والد ماجد فخر ہندوستان نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن

خاں صاحب شروانی کی نسبت اور تعلق سے.....اس دعوت سے معذرت نہ کی جاسکی۔"

خاکسار راقم کو اپنے جس گرامی نامے کے ذریعہ اپنی علی گڈھ تشریف آوری کی اطلاع دی تھی اس میں اس سے بڑھ کر تعلق خاطر اور جذبات اخلاص و مودّت کا اظہار فرمایا تھا۔ مولانا علی میاںؒ نے تو اس عمارت کا سنگ بنیاد براہِ کرم لکھنؤ سے زحمت سفر فرما کر رکھا لیکن اس کے فوراً بعد مسلم یونیورسٹی کے نظم و نسق میں ایسی تبدیلی ہوگئی کہ وہ ہال آج تک ادھ بنا پڑا ہوا ہے اور جتنا تعمیر بھی ہوگیا ہے کسی دوسرے نام سے کسی دوسرے کام میں لایا جا رہا ہے۔ البتہ مولانا مرحوم کا نصب کردہ سنگ بنیاد اپنی جگہ قائم ہے۔ مولانا مرحوم نے خاکسار راقم سے اس ہال کے بارے میں کئی مرتبہ دریافتِ حال فرمایا لیکن میرے لئے طرح دے جانے کے علاوہ کچھ عرض کرنے کو تھا ہی نہیں۔

—— ۴ ——

مجھے ٹھیک سے یہ یاد نہیں ہے کہ حضرت مولانا علی میاں کی خدمت میں کب سے نیاز حاصل ہوا۔ البتہ یاد آتا ہے کہ میں انھیں ۱۹۵۰ء کے دہے میں کبھی کبھی علی گڈھ میں چلتے پھرتے یا مختلف جلسوں میں شرکت کرتے ہوئے دور سے دیکھتا تھا۔ غالباً ۱۹۶۰ء کے دہے سے آہستہ آہستہ ان کے قریب آنے کا موقع ملا۔ لکھنؤ اور علی گڈھ کے مختلف جلسوں اور تقریبوں میں ان کے ساتھ شرکت کی خوش وقتی حاصل ہوئی۔ انھوں نے شروع ہی سے میرے ساتھ شفقت اور مہربانی کا برتاؤ روا رکھا۔ پھر میرا یہ معمول ہوگیا کہ جب بھی کسی کام سے لکھنؤ جانا ہوتا تو وقت نکال کر ان کی خدمت میں ندوۃ العلماء ضرور حاضر ہوتا۔ وہ بہت خوش دلی سے پذیرائی فرماتے اور اگر میرا وہاں دو ایک دن مزید قیام ہوتا تو اگلے روز صبح کو اپنے ساتھ ناشتہ کرنے کی دعوت ضرور دیتے۔ ایک مرتبہ ایک ایسے دوست کے ساتھ حاضر ہوا جن کی طرف ان کی طبیعت راغب نہیں تھی تو اس سے اگلی صحبت میں فرمایا کہ پچھلی مرتبہ صحبتِ ناجنس تھی، اس لئے کھل کر باتیں نہیں ہوسکی تھیں۔ ایک اور موقع پر اتفاق سے ایک صاحب کے ساتھ قیام تھا اور ان ہی کی معیت میں حاضر خدمت ہوا تھا تو ان کے کمرے سے باہر چلے جانے پر فرمایا کہ بجائے ندوہ کے ان کے وہاں کیسے ٹھہر گئے۔ اسی دوران میری ان سے مکاتبت کا آغاز ہوا۔ کبھی میں ان سے کسی مسئلہ پر رہنمائی حاصل کرنے کے لئے خط لکھتا۔ وہ اس کا جواب ضرور مرحمت فرماتے اور کبھی وہ والد صاحب مرحوم کی خیریت معلوم کرنے یا ان کا پروگرام دریافت کرنے کے لئے خود اپنی طرف سے خط تحریر فرماتے۔ ان کے جو خطوط میرے پاس محفوظ ہیں ان میں زیادہ تر قمری کیلنڈر کی تاریخیں درج ہیں۔ ایک نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اوّلین مکاتیب ۱۳۹۲ھ مطابق ۱۹۷۲ء کے ہیں۔ جب میں ۱۹۸۰ء کے دہے میں صدر شعبۂ عربی و اسلامیات کی حیثیت سے سری نگر میں مقیم تھا تو میری دلی تمنا تھی کہ حضرت مولانا وہاں تشریف لاکر ہمارے طلبہ و اساتذہ سے خطاب فرمائیں۔ اس سے قبل ۱۹۸۲ء میں پروفیسر وحیدالدین ملک کے دور وائس چانسلری میں کشمیر یونیورسٹی ان کی خدمت میں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری پیش کرچکی تھی۔ (افسوس ہے کہ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی اس شرف سے محروم رہی) میرے ایک ایسے ہی خط کے جواب میں مولانا نے اپنی صحت کی کمزوری اور اپنی مصروفیات کی خاصی تفصیل بیان کرتے ہوئے وہاں تشریف آوری سے معذرت ظاہر فرمائی ہے۔

۱۹۸۹ء میں سری نگر سے واپس چلے آنے کے بعد جب بھی مولانا کو کوئی اعزاز پیش کیا جاتا یا وہ کوئی اعزاز قبول فرمانے سے معذرت ظاہر فرماتے یا ان کے والا مرتبت خاندان میں کوئی حادثہ پیش آتا یا ندوۃ العلماء کسی آزمائش سے گزرتا تو میں نیاز نامہ لکھ کر حسب موقع اپنے جذبات کا اظہار کرتا اور وہ جواب ضرور عنایت فرماتے جس میں قدیم خاندانی تعلقات کا ذکر لازماً ہوتا۔ جب انھیں حکومت ہند کی طرف سے "پدم بھوشن" کے اعزاز کی پیش کش ہوئی اور اس وقت کے وزیر اعظم نے خود ٹیلی فون کرکے ان سے یہ اعزاز قبول کرنے کی درخواست کی لیکن انھوں نے معذرت کردی تو میں نے انھیں عریضہ لکھا کہ یہ اعزازات یقیناً اہم اور قابلِ فخر ہیں لیکن بعض شخصیتیں اعزازات سے عظیم تر ہوتی ہیں اور ان ہی میں جناب والا کی گرامی قدر شخصیت شامل ہے۔ میں نے انھیں یہ بھی لکھا تھا کہ اس سے قبل غیر ملکی حکومت کے دور میں میرے جدامجد مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم کبھی کوئی خطاب قبول کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوئے اور جب آزاد ہندوستان میں ۱۹۵۴ء میں ان اعزازات کا آغاز ہوا تو مولانا ابوالکلام آزادؒ کا نام "بھارت رتن" کی فہرست میں مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کا "پدم بھوشن" کی فہرست میں شامل تھا لیکن ان دونوں حضرات نے معذرت کردی تھی۔ یہ تفصیل پڑھ کر مولانا نے حضرت جدامجدؒ کے تعلق سے تحریر فرمایا تھا:

"مجھے اس سلسلے میں اپنے عالی مرتبہ بزرگ و مخدوم نواب صدر یار جنگ رحمۃ اللہ علیہ کے واقعے کا علم نہیں تھا۔ برطانوی عہد میں ایک رئیس اور بڑے زمیندار

کی حیثیت سے ان کا اعزاز کے قبول کرنے سے معذرت کرنا ایک غیر معمولی جرأت کی بات تھی۔"

اسی طرح بابری مسجد کے واقعۂ ہائلہ پر جب طبیعت بہت مضطرب تھی تو حضرت مولانا ہی کو نیاز نامہ لکھ کر تسلی حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ جواب میں انھوں نے تحریر فرمایا تھا:۔

"آپ نے اپنے مکتوب میں جو تاثرات ظاہر کئے ہیں ان میں سے اکثر سے اتفاق ہے اور توارد معلوم ہوتا ہے۔ حالات ایسے غیر معمولی ہیں جو صدیوں میں پیش آتے ہیں۔"

۱۹۹۲ء میں والد صاحب مرحوم کی وفات کے بعد انھوں نے مجھے ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ کی رکنیت کا اعزاز بخشا اور اس طرح پچھلے آٹھ، نو برس میں متعدد بار انھیں مزید قریب سے دیکھنے اور ان کی شفقت اور مہمان نوازی سے بہرہ اندوز ہونے کا موقع نصیب ہوا۔ اب خاندان میں یا خاندان کے باہر کوئی ایسا بزرگ موجود نہیں ہے جو ان جیسی شفقت اور کرم کا اظہار کرتا ہو۔ اس لئے محرومی کا احساس زیادہ شدید ہے۔ ان کی وفات پر میں اپنے جذبات رنج والم کا اظہار ماہنامہ "معارف" اعظم گڈھ کی فروری ۲۰۰۰ء کی اشاعت میں کر چکا ہوں۔ اللہ تعالیٰ انھیں اعلیٰ علیین میں مخصوص مقام عطا فرمائے اور ان کی وفات سے ملت کی صفوں میں جو عظیم خلا پیدا ہو گیا ہے اسے اپنی رحمت بے پایاں سے پُر فرمانے کے اسباب مہیا فرمائے۔

حواشی

۱ شمس تبریز خاں: صدر یار جنگ، مکتبہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، ۱۹۷۲ء: ۲۳۰۔

۲ سید سلیمان ندوی: حیات شبلی، دار المصنفین اعظم گڈھ، ۱۹۴۳ء: ۲۲۰

۳ حبیب الرحمٰن خاں شروانی: مقالات شروانی، شروانی پرنٹنگ پریس علی گڈھ، ۱۹۴۷ء: ۱۷۷

۴ صدر یار جنگ: ۱۴۵ ۵ ایضاً: ۲۴۷

۶ رسالہ جامعہ، جنوری تا مارچ ۲۰۰۰ء، ڈاکٹر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی: ۱۲۷

۷ صدر یار جنگ: ۲۳۸-۲۳۹ ۸ ایضاً: ۲۴۳

۹ حیات شبلی: ۴۱۷ ۱۰ صدر یار جنگ: ۲۴۹

۱۱ ایضاً: ۶

۱۲ سید ابوالحسن علی ندوی: پرانے چراغ حصہ دوم مکتبہ فردوس لکھنؤ، ۱۹۸۰ء: ۲۳ ۱۳ ایضاً: ۲۴

۱۴ ایضاً: ۲۷ ۱۵ ایضاً: ۲۹ ۱۶ ایضاً: ۳۵

اک نور کا منار تھے حضرت علی میاںؒ

بشر فردوسی لکھنوی

مہکی ہوئی بہار تھے حضرت علی میاںؒ
اس دیش کا وقار تھے حضرت علی میاںؒ

انسانیت کا لے کے چلے تھے وہ اک مشن — انساں کے غم گسار تھے حضرت علی میاںؒ
کتنی ہی زرد فصلوں کو سرسبز کر گئے — اک ایسا آبشار تھے حضرت علی میاںؒ
علم و ادب کی تاجوری تھا انہی کا حق — وہ علم کا دیار تھے حضرت علی میاںؒ
پروردگار نے انھیں بخشیں تھیں عظمتیں — ملت کا افتخار تھے حضرت علی میاںؒ
آواز دے رہے تھے کہ سب جاگتے رہو — امت کے پہرے دار تھے حضرت علی میاںؒ
انسان دوستی کا سبق یاد کیجئے — کہتے یہ بار بار تھے حضرت علی میاںؒ
نفرت کی آندھیوں میں گھرا ہے مرا وطن — یہ کس کے بے قرار تھے حضرت علی میاںؒ
دنیا کے گوشے گوشے سے آتی ہے یہ صدا — رہبر وہ شاندار تھے حضرت علی میاںؒ
سب احترام کرتے تھے دنیا کے تاجدار — عالم کے تاجدار تھے حضرت علی میاںؒ
جب تک جئے جہاں کو ضیاء بانٹتے رہے — اک نور کا منار تھے حضرت علی میاںؒ
رتبے میں آج ان کے برابر کوئی نہ تھا — سب کے بزرگوار تھے حضرت علی میاںؒ

تھے بیسویں صدی کے وہی رہنما بشر
ہر دل کی وہ پکار تھے حضرت علی میاںؒ

تاریخ وصال

اخلاص کے لہجے کی خنک ختم ہوئی
سچائی کے لفظوں کی مہک ختم ہوئی
دنیا سے اٹھا کون کہ لگتا ہے رئیس
پیشانیٔ ملت کی چمک ختم ہوئی
۱۹۹۹ء

رئیس الشاکری

حضرت مولاناؒ کا آبائی وطن

تکیہ شاہ علم اللہ
ایک تعارف

نقل و ترتیب: ـــــــــ محمد ابرار الحق، دار العلوم ندوۃ العلماء

اس بستی کا جس کا امتیاز توحید خالص، جذبۂ جہاد، بدعت سے نفرت رہا ہے۔ اور جہاں تین سو سے زائد عرصہ گزرنے کے باوجود بھی بدعت کا نام نشان نہیں ملتا ہے۔ اور یہی نہیں بلکہ وہ مسلسل ایسی اولوالعزم ہستیاں پیدا کرتا رہا ہے، جنھوں نے دعوت توحید، تہذیب نفس، اصلاح معاشرہ تعلیم و تبلیغ، احیاء سنن، اور اعلاء کلمۃ اللہ کا عظیم کام انجام دیا۔ جن میں اس بستی کے بانی حضرت شاہ علم اللہ حسنیؒ حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے نام زیادہ نمایاں اور تاباں ہیں۔ ایک مختصر تعارف فخر عہد مخدوم العالم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب کاروانِ زندگی سے لے کر ان کی ہی تحریر میں پیش کیا جا رہا ہے کہ یہ بستی ان کا مولد و موطن ہے۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:۔

قبل اس کے کہ میں اپنے بچپن کا حال اس وقت کا ماحول اور ابتدائی نقوش اور یادوں کا ذکر کروں، اس چھوٹی سی دیہاتی بستی کا نقشہ دکھانا چاہتا ہوں جس کی بنیاد سنہ ۱۰۵۰ھ میں عارف کامل حضرت سید شاہ علم اللہ حسنی نقشبندیؒ (خلیفہ حضرت سید آدم بنوریؒ) کے ہاتھوں اسی جذبہ پر پڑی جو ان کے مورثِ اعلیٰ اور اس ملت کے مؤسسِ اول سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے سینہ میں موجزن تھا اور جس کا مقصد "ربنا لیقیموا الصلوٰۃ" کے الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے وہ بستی جس نے اپنے اپنے وقت میں کبار اولیاء اللہ مصلحین و مجاہدین پیدا کیے جن میں حضرت سید احمد شہیدؒ کا نام اور کام سب سے زیادہ روشن اور تاباں ہے۔

آپ جب شہر رائے بریلی سے مشرق و شمال کی طرف سے آئیں تو میل ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر سئی ندی کے کنارہ سادات کے چند گھروں کی ایک چھوٹی سی بستی نظر آئے گی، شہر کو اس بستی سے ملانے والا راستہ کھیتوں کے درمیان پگڈنڈیوں کا ہے جو بالکل خام اور بارش میں تقریباً ناقابل گذر ہو جاتا ہے[1]۔ اس بستی میں میرے بچپن میں صرف آٹھ گھر تھے جن کو دو دو پر تقسیم کیا جا سکتا ہے کہ ان میں ایک گھر سے دوسرے گھر جانے کا دروازہ تھا۔ پہلے جانب غرب دو مکان ذرا ہٹے ہوئے نظر آئیں گے جو اسی خاندان کی ایک شاخ کے افراد ہیں اگر مشرق و شمال کی طرف سے اس بستی میں داخل ہوں تو پہلے املی کا ایک نہایت تناور اور چھتناور درخت ملیگا جسکے نیچے پوری پوری باراتیں اور قافلے ٹھہر سکتے تھے ایک طرف سے متصل بلکہ اس درخت کے زیر سایہ ہمارے دادا صاحب کا بیٹھکہ جو خام اور خس پوش تھا ملیگا۔ جو ان کا دار التصنیف بھی تھا اور مطب بھی تھا، ملاقات کا کمرہ بھی، اس بیٹھکے کے (جس کو ابھی تک ہم لوگ تکیہ کی اصطلاح میں بنگلہ کہتے ہیں) بالمقابل ہمارا آبائی مکان[2] ہے۔ اس کے اور بیٹھکے کے درمیان صرف تین چار گز کی پتلی گلی ہے، اس گھر سے متصل ہی اس خاندان کے اس وقت کے سب سے زیادہ باوجاہت بزرگ اور ضلع کے زمیندار اور رئیس نیز آنریری مجسٹریٹ مولوی سید خلیل الدین صاحب اور ان کے چھوٹے بھائی سید امین الدین صاحب کی حویلی[3] ہے۔ ہمارے گھر سے اس گھر میں جانے کا زینہ ہے اور دونوں گھروں کی ہر وقت کی آمد و رفت ہے اس حویلی سے متصل سید خلیل الدین صاحب کا دیوان خانہ[4] ہے جو اس چھوٹی سی بستی میں سب سے شاندار اور باوقار بیٹھکہ یا بنگلہ[5] ہے، دونوں بھائیوں کا اسی میں قیام ہے۔ یہیں زمینداری کے معاملات طے ہوتے ہیں، ضلعدار اور لگان دینے والے کسان یہیں آتے ہیں۔ بستی کے معزز مہمان اور خاندان کے باوجاہت بزرگ یہیں مہمان رہتے ہیں، اس کے بالکل بالمقابل انکے چچا زاد بھائیوں سید احمد سعید صاحب اور حافظ سید عبید اللہ صاحب کا مکان اور بنگلہ ہے[6]۔ ان چاروں بھائیوں کی جائیداد مشترک ہے اور ضلع کے بڑے زمینداروں میں ان کا شمار ہے، ان دونوں مکانوں کے درمیان ایک کھلا میدان ہے جو بستی کے بچوں کے کھیلنے

کی جگہ اور تقریبات کے منعقد ہونے کا محل ہے اس کو قصداً خالی رکھا گیا ہے تاکہ بستی کی ہوا اور فضا اچھی رہے اور لوگوں کو جمع ہونے اور بچوں کو کھیلنے کا موقع ملے۔ میدان کے نیچے مغربی جانب مسجد اور جنوب کی طرف جانے والا راستہ ہے جس سے گاڑیاں بھی گزر سکتی ہیں۔ اس راستہ سے آپ جنوب کی طرف آگے بڑھیں گے تو چند قدم پر سید محمد نعیم صاحب عرف اچھے میاں صاحب کا بنگلہ ہے جو بہت خوش سلیقگی اور نستعلیقی کے ساتھ بنایا گیا ہے۔ اس سے آگے بڑھیے گا تو بائیں طرف ایک ٹیلہ سا نظر آئے گا جس پر کبھی اسی خاندان کے بعض بزرگوں کا مکان تھا جو اب منہدم ہو چکا ہے۔ آگے بڑھیں گے تو دائیں طرف ایک تالاب سا نظر آئے گا جس کو یہاں گڑھیا کہا جاتا ہے، اور جس میں سال کے بعض مہینوں میں پانی بالکل نہیں رہتا یا بر اسکے نام رہ جاتا ہے۔ غالباً یہیں سے مٹی لے کر مکانوں کی تعمیر ہوئی۔ اس لئے یہ ایک نشیبی قطعہ زمین بن کر رہ گیا ہے۔ اس کے کنارے املی کا ایک دوسرا نہایت تناور اور چھتا دری درخت ہے جسکے نیچے گرمیوں میں جنوبی حصہ کے رہنے والے چارپائیاں بچھا کر یا مونڈھے ڈال کر بیٹھتے ہیں، اور تفریح کرتے ہیں یہیں مشرقی جانب بلندی پر جہاں بڑے سیلاب میں بھی پانی نہیں پہونچتا تکیہ کے قدیم ترین مکانات اور وہ دائرہ ملے گا جس میں اسی نو آبادی کے بانی حضرت سید شاہ علم اللہؒ اور ان کی اولاد کا مسکن اور حضرت سید احمد شہیدؒ کا مولد و منشا ہے۔ یہاں بھی دو ہی مکانات تھے جو ایک دوسرے سے پیوست اور جڑواں تھے اور درمیان میں دروازہ ہے، اس کے پہلو میں جانب جنوب وہ بیٹھکہ یا بنگلہ ہے جو اس بستی کی سب سے زیادہ پر رونق اور آباد جگہ ہے۔ ٹونک کے اعزہ آتے ہیں تو عام طور پر یہیں ان کا قیام ہوتا ہے۔ سامنے وہ تاریخی اور بابرکت مسجد ہے جس کی پختہ تعمیر ۱۱۸۳ھ میں حضرت شاہ علم اللہ صاحبؒ کے مبارک ہاتھوں سے ہوئی۔ اس کی بنیاد دوں میں زمزم ڈالا گیا اور اس کو بیت اللہ شریف کے نقشہ پر تقریباً اسی طول و عرض کے ساتھ بلا مینار و گنبد کے تعمیر کیا گیا صرف ادباً چند انگل کم رکھا۔ یہی مدرسہ بھی تھا خانقاہ بھی تھی اور حضرت سید احمد شہیدؒ کے زمانہ میں جہاد کی تربیت گاہ بھی، اور جماعت مجاہدین کی قیام گاہ بھی مسجد کے بالکل بالمقابل مشرقی جنوبی گوشہ میں ایک چار دیواری یا حظیرہ ہے جس کو اہل خاندان قدیم زمانہ سے "روضہ" کہتے ہیں، اس کے اندر حضرت شاہ علم اللہؒ کے بڑے صاحبزادہ سید آیت اللہ شاہ صاحبؒ کی اہلیہ محترمہ اور نامور اور بلند مرتبت صاحبزادہ سید محمد عدل عرف شاہ لعل اور اسی خاندان کے چند افراد کی قبریں ہیں جو سب کی سب خام ہیں اور کسی پر لوح مزار یا کسی قسم کا امتیازی نشان نہیں ہے۔ مسجد کے دوسرے سرے شمالی مشرقی گوشہ پر حضرت شاہ علم اللہ صاحب کے تیسرے صاحبزادہ سید ابوحنیفہ اور حضرت سید احمد شہیدؒ کے والد محترم سید محمد عرفان صاحبؒ ایک چھوٹے سے چبوترہ میں مدفون ہیں جہاں قبور کا کوئی نشان نہیں رہا ہے مسجد کے قبلہ رخ مغربی جانب خاندان کا عام قبرستان ہے اور راقم کے داد یہالی و نانیہالی بزرگ شمالی جانب اور شاہ علم اللہ صاحبؒ کے چوتھے صاحبزادہ شیخ وقت سید محمد نقشبندیؒ اور انکے سلسلہ کے لوگ جنوبی، مغربی جانب مولسری کے درخت کے قریب آسودۂ خاک و محو خواب ہیں ؎

سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

مسجد کے نیچے سئی ندی بہتی ہے جو دیکھنے میں ایک حقیر و بے ضرر اور بے آزار ندی معلوم ہوتی ہے، لیکن سخت بارش و سیلاب کے زمانہ میں اس کی طغیانی و فتنہ سامانی کا یہ حال ہوتا ہے کہ اسکی حقیر حالت کو دیکھ کر فارسی کا یہ شعر پڑھنے کو جی چاہتا ہے ؎

گربۂ مسکیں اگر پر داشتے
تخم گنجشک از جہاں بر داشتے

گرمیوں میں شام کو مسجد کا جنوبی حصہ اور ندی کا کنارہ پوری بستی کی تفریح گاہ اور اجتماع کا مرکز بن جاتا ہے۔ شاید چند بڑے بوڑھوں کے علاوہ پوری آبادی یہاں مولسری کے اس درخت کے نیچے جو جانب جنوب مغرب ہے سمٹ کر آجاتی ہے ندی میں نہانے کا ایک ہنگامہ برپا ہوتا ہے، پیرنے والے اپنے کمالات دکھاتے ہیں اور جن کو پیرنا نہیں آتا ان کو فی سبیل اللہ پیرنا سکھاتے ہیں گویا یہ بڑا کار ثواب اور ان کا اخلاقی فریضہ ہے اور جو اس خطرناک کام سے ڈر کر بھاگتے ہیں ان کو ان مجاہدین کی پولیس پکڑ کر لاتی ہے، اور زبردستی پیرنا سکھاتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ کام بڑا اچھا تھا کہ یہاں سیلاب آتے رہتے ہیں اور یہاں ہر شخص کے لیے بقدر ضرورت پیرنا جاننا ضروری ہے۔ اس کار خیر میں ہمارے ٹونک کے اعزہ اور برادر محترم حافظ سید حبیب الرحمان صاحب پیش پیش رہتے تھے۔ مغرب کی اذان تک یہ ہنگامہ کارزار گرم رہتا ہے، ندی کے پار مغربی جانب تخمی آموں کا ایک گھنا باغ ہے جو میرے دادا صاحب اور ان کی اولاد کی ملکیت ہے۔ آموں کے موسم میں جب ندی بھری ہوتی ہے اور اس کا پاٹ بہت بڑا ہو جاتا ہے۔ پیراک لوگ ندی پار کر کے باغ میں جاتے ہیں۔

اور آموں سے ان کی ضیافت کی جاتی ہے۔ بستی کے مکانوں کے مغربی جانب باغات کا سلسلہ ہے مشرقی اور شمالی جانب ہرے بھرے کھیتوں کا جس کی وجہ سے یہ بستی اس بحر اخضر میں ایک جزیرہ معلوم ہوتی ہے بارش کے زمانہ میں خاص طور پر اس کی خوشنمائی اور بڑھ جاتی ہے لیکن ہر تھوڑی مدت کے بعد آنے والا سیلاب اس قابل رشک جائے وقوع اور ان دلفریب مناظر کی قیمت وصول کر لیتا ہے اور اکثر بستی کے رہنے والوں کو اپنا محبوب مسکن چھوڑ کر کہیں شہر میں یا آس پاس کسی بلند سطح گاؤں میں پناہ لینی پڑتی ہے، اس جبری منتقلی اور سیلاب کی لائی ہوئی پریشانیوں کی وجہ سے کبھی کبھی بستی والوں کو خیال ہوا کہ وہ مستقل طور پر اپنی سکونت کے لیے کوئی اور بلند جگہ انتخاب کر لیں جہاں وہ سیلاب کے گزند سے محفوظ رہیں لیکن پھر وطن کی کشش اور مسجد و مقابر کی حفاظت کا جذبہ نیز وہاں کی سہولتوں کا خیال دامن گیر ہوتا ہے۔ اس طرح اس خاندان نے تین سو برس یہاں گزار دیئے ہیں آگے کا حال اللہ کو معلوم ہے (ماخوذ از: کاروانِ زندگی)

۱؎ حال ہی میں پختہ سڑک بن گئی ہے جو اس بستی کو جانے والی سڑک سے ملا دیتی ہے۔ پگڈنڈیوں کا پرانا راستہ بھی موجود ہے۔

۲- اس بنگلہ کی پشت پر مولانا سید محمد طاہر صاحب کا زیر تعمیر مکان ہے۔

۳؎ اب یہ حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب مدظلہ اور ان کے بھائیوں کی رہائش گاہ ہے۔

۴؎ یہ دیوان خانہ بعد میں حضرت مولانا کے قریبی عزیز ڈاکٹر سید حسن صاحب کا مکان بنا۔

۵؎ اب یہ مولانا سید ابوبکر حسنی صاحب کی رہائش گاہ ہے۔

۶؎ یہ دونوں بزرگ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے حقیقی ماموں تھے۔ اور سید احمد سعید صاحب خسر بھی تھے۔

۷؎ اب یہ حضرت مولانا کے قریبی عزیزوں سید حسن مجتبیٰ، سید محمد سلم حسنی کے مکانات ہیں۔

۸؎ اب اسی جگہ پر مدرسہ تحفیظ القرآن حضرت سید احمد شہیدؒ کے نام پر قائم ہے۔

۹؎ یہی ایک خاندانی بزرگ سید محمد جعفر صاحبؒ کی نشست گاہ اور مہمان خانہ تھا۔ سید محمد جعفر صاحب حال مقیم کراچی حضرت شاہ ابوسعید صاحب کی اولاد میں ہیں۔ خاندان کے با وجاہت و با اثر لوگوں میں تھے۔

۱۰؎ ۱۱۰۵ھ میں جب شاہ صاحب یہاں منتقل ہوئے تو ضرورت کے لیے خام مسجد تیار کر لی تھی۔

۱۱؎ چونکہ یہ چار دیواری ایک چبوترہ پر واقع ہے اس لیے یہاں سیلاب کا پانی عام طور پر نہیں جاتا۔ بہت دیر میں جاتا ہے اس لیے سیلاب کے زمانہ میں جن خوش قسمت افراد کا انتقال ہوا ان کو اسی حظیرہ میں جگہ ملی، عرصہ کے بعد مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب حسنیؒ کے انتقال پر باتفاق خاندان یہ حظیرہ کھولا گیا اور ان کی تدفین عمل میں آئی۔ اس کے بعد حکیم صاحب کے ہی گھر کے متعدد افراد جن کا ذکر اپنی جگہ پر آئے گا دفن ہوئے، اور اخیر میں صرف ایک جگہ رہ گئی تھی وہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے حصہ میں آئی اور وہ ۳۱ر دسمبر ۱۹۹۹ء یکم جنوری ۲۰۰۰ء کی درمیانی شب وہاں آسودۂ خاک ہوئے۔

(بقیہ)
حواشی دو شاہکار تصنیفات

مقابلہ کے لیے پورے طور سے تیار بھی کیا اس لیے کہ اس سورہ میں ایسی روح اور اسپرٹ ہے جو جاہلیت اور اس کے علمبرداروں کے طرز فکر اور طریقۂ زندگی کی بڑی وضاحت اور قوت کے ساتھ نفی کرتی ہے اور اس پر سخت ضرب لگاتی ہے۔

۲؎ مثلاً حریت، اشتراکیت، جمہوریت، معیار زندگی کی بلندی، معاشی خوش حالی، فلاحی ریاست، یہاں تک کہ تہذیب و تمدن، فنون لطیفہ اور قانون و دستور جیسے الفاظ صرف نعروں کے طور پر استعمال کیے جا رہے ہیں۔

۳؎ عربی، اردو انگریزی، ترکی، ملیشین۔

۴؎ مصنف نے طالب علمی کے دور میں صحاح ستہ لفظ بلفظ پڑھی، اور عرصہ تک حدیث کا درس دیا (ملاحظہ ہو یوں البرہمچاری ندوی کی کتاب مولانا علی میاں اور علم حدیث)

۵؎ مثال کے لیے ملاحظہ ہو ص۲ تا ص۳۳ (ارکان اربعہ ساتواں ایڈیشن)، پوری کتاب میں اسی طرح کے فکر انگیز مباحث ہیں۔

(بقیہ)
حواشی کتاب کی کہانی

ہو کر (جس میں احتیاط و توازن، مؤرخانہ انصاف اور علمی تحقیق کی بالعموم کمی ہوتی ہے) تاریخی مباحث پر کس طرح قلم اٹھانا چاہئے اور کس انداز سے اس کو مرتب کرنا چاہئے۔ (ترجمہ ماذا خسر العالم کے اردو ایڈیشن "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" سے ماخوذ ہے)۔

۴؎ وہ لکھتے ہیں:

"میں شہادت دیتا ہوں کہ کتاب کا پہلا ایڈیشن جب نکلا تھا تو اسی وقت میں نے ایک دن سے کم وقفہ میں یہ کتاب پوری پڑھ لی تھی اور اس کا بہت قدردان بلکہ اس کا عاشق ہو گیا تھا یہاں تک کہ مطالعہ کے بعد اپنی کتاب کے آخر میں میں نے لکھا تھا کہ "اس کتاب کا مطالعہ ہر اس مسلمان پر واجب ہے جو از سر نو اسلامی شان و شوکت کو بحال کرنے کے لئے کچھ کرنا چاہتا ہو"

۵؎ اس وقت مندرجہ ذیل زبانوں میں یہ کتاب پڑھی جا رہی ہے۔ عربی، اردو، انگریزی، فرنچ، روسی، ترکی، انڈونیشی

ہمارے ابا جان

اللہ ان کی قبر کو نور سے بھر دے

از سید رشید احمد • سید خلیل احمد • سید محمد امین • خواہر سید منصور حسن

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ رحمۃ اللہ علیہ کو ان کے بھائیوں بھتیجوں کی اولادیں ابا جان کہا کرتی تھیں۔ اور وہ ان سب پر بڑے ہی مہربان اور شفیق تھے، ذیل میں خاندان کے چند نونہالوں کے تاثرات پیش کئے جا رہے ہیں۔ (ادارہ)

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی جنکو ہم لوگ ابا جان کہا کرتے تھے دنیا میں دور دور شہرت اور اونچا مقام رکھتے تھے وفات کے بعد سے ان پر جگہ جگہ جلسے اور پروگرام ہو رہے ہیں۔ جب آپ باحیات تھے تب بھی ان پر باہر ملکوں میں بڑے بڑے جلسے ہوتے تھے، سارے بزرگ انھیں دل و جان سے چاہتے تھے۔

اباجان کی والدہ بہت بزرگ خاتون تھیں۔ شادی سے پہلے انھوں نے خواب میں دیکھا کہ وہ ایک آیت دہرا رہی ہیں اور وہ آیت ان کی زبان پر صبح تک جاری تھی لیکن ترجمہ معلوم نہیں تھا، صبح کو اٹھ کر اس کا ترجمہ دیکھا تو بہت خوش ہوئیں اور ساری پریشانی ختم ہوئی وہ آیت یہ تھی۔ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (السجدة: ۱۷) ترجمہ، سو کسی کو نہیں معلوم جو چھپا دھرا ہے ان کے واسطے آنکھوں کی ٹھنڈک بدلہ اس کا جو وہ کرتے ہیں۔

ہم سب ابا جان کے پاس جب آکر بیٹھتے تو وہ اپنا واقعہ سناتے تھے ایک مرتبہ اپنے بچپن کا واقعہ سناتے ہوئے فرمایا کہ مجھے کتابوں کا بہت شوق تھا۔ جب والد صاحب کوئی کتاب ردی میں ڈال دیتے تو میں اس کو اپنے ایک چھوٹے سے کتب خانہ میں سجا لیتا، ایک مرتبہ مجھ کو گھر سے ایک یا دو آنے ملے میں تو خوشی خوشی اس کو لیکر کتاب خریدنے نکل پڑا لیکن اتنا چھوٹا تھا کہ کتاب کے بجائے دوا کی دوکان پر پہنچ گیا اور پیسے بڑھاتے ہوئے کہا کہ مجھے اچھی کتاب دے دو، اس نے مجھے دواؤں کی فہرست دے دی اور پیسے بھی واپس کر دیئے میں بہت خوش ہوا کہ پیسے بھی بچ گئے اور کتاب بھی مل گئی۔

ایک مرتبہ اباجان نے اپنی سب سے پہلی تقریر کی دلچسپ کہانی سناتے ہوئے فرمایا کہ میلاد یا سیرت کا جلسہ کرنے کا شوق ہوا۔ اپنے ہم جولی ساتھیوں کے گھر جا جا کر انھیں بلا لایا۔ میری ایک بہن نے میرے سر پر چھوٹی سی پگڑی باندھ دی، پھر میں نے ایک کتاب لی اور پڑھنی شروع کر دی اس وقت میں اتنا کم فہم تھا کہ عبدالمطلب کے بجائے عبد المُطَلِّب پڑھ رہا تھا اور والد صاحب کھڑے یہ سب دیکھ رہے تھے۔

اباجان کہا کرتے تھے کہ میری والدہ تربیت میں بہت ماہر تھیں۔ میں اگر کوئی غلطی کرتا تو وہ تادیب ضرور فرماتیں۔ ایک مرتبہ میں نے اپنے گھر کی خادمہ کے بچے پر ہاتھ اٹھا دیا تھا جس پر وہ میری والدہ کے پاس آئیں اور کہنے لگیں "بی بی دیکھو علی میاں نے میرے لڑکے کو مارا ہے"، یہ سننا ہی تھا کہ والدہ کے تیور بدل گئے، مجھ کو بلوایا اور اس بچہ سے کہا کہ مارو علی کو۔ اس کے بعد مجھ سے کہا کہ علی اس سے معافی مانگو اور کہو کہ آئندہ ایسا نہیں کریں گے۔

اباجان جب گھر آتے تو نانا دادا (مولانا سید ابوبکر حسنی مدظلہ) اور ابا (سید مسلم حسنی صاحب) خوب خوب باتیں کرتے، ابا کہتے کہ بچپن میں آپ کو جتنا مطالعہ کا شوق تھا اتنا ہی کھیل کا بھی تھا۔ ہاکی خوب شوق سے کھیلتے تھے، بہترین پیراک بھی تھے اور شکار کا بھی شوق تھا۔ اس کے علاوہ ماہر تیر انداز بھی تھے۔ اور ہمیں اس کے واقعات بھی سنایا کرتے تھے۔ پڑھائی میں اتنے تیز تھے کہ صرف ۱۴ سال کی عمر میں لکھنؤ یونیورسٹی سے فاضل ادب کا امتحان پاس کر لیا تھا۔

اباجان جب گھر آتے تو سب بچوں کو ٹافی کھلاتے تھے اور ہم بچوں کو بہت چاہتے تھے۔ جب سفر سے آتے تو ہمارے لئے کھلونے لاتے۔ اباجان نے بہت ساری کتابیں لکھی ہیں، سیرت سید احمد شہیدؒ اور تاریخ دعوت و عزیمت بہت مشہور کتابیں ہیں۔ گھر پر میں ان کا خوب تذکرہ سنا کرتا ہوں، میں نے یہ کتاب پڑھنی بھی شروع کی تھی لیکن سمجھ میں نہیں آئی شاید

اس لئے کہ میں ابھی بہت چھوٹا ہوں اور آباجان کی کتاب بہت اونچے معیار کی ہے۔

آباجان سے ملنے گھر پر بڑے بڑے لوگ آتے تھے۔ اور سب ان کا خوب احترام کرتے تھے، اس ملک میں بڑے بڑے لوگ ان کی عزت کرتے ہیں اور عرب میں تو سب ان پر جان دیتے ہیں۔ اسی لئے تو۔ ان سے صرف ملنے کے لئے عرب سے لوگ ہمارے گاؤں آتے ہیں اور ایک مرتبہ تو رمضان میں ان کو لینے دبئی کا شاہی جہاز بھی آیا تھا۔

آباجان ہمیشہ دین و اسلام کی باتیں کرتے تھے۔ اور کہا کرتے تھے کہ نیک کام کیا کرو۔ اور گندی چیزوں کے قریب بالکل نہ جایا کرو، لڑائی جھگڑا نہ کیا کرو اور کسی کو گالی بھی نہ دینا۔ اور کہا کرتے تھے کہ نماز پابندی سے پڑھا کرو۔ نماز کبھی بھی مت چھوڑنا ورنہ اللہ میاں ناراض ہو جائیں گے۔

اب ہمارے آباجان نہیں ہیں، ہمیں ان کی بہت یاد آتی ہے۔ ان کی ساری باتیں یاد آتی ہیں اور ان کی محبت و شفقت اب بھی ہمارے ذہنوں میں ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ آباجان پر ڈھیر سارے انعامات کرے اور ہم کو بھی ان کے جیسا بنائے۔ آمین۔

از۔ سید رشید احمد تکیہ رائے بریلی

آج ہمیں بہت افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ آباجان یعنی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ ہم میں نہیں ہیں ہم سب بچوں کو آباجان سے بڑی محبت تھی۔ اس لئے کہ وہ ہم سب کو بہت چاہتے تھے۔ اور ہم میں سے ہر بچہ سے محبت و شفقت کا معاملہ کرتے تھے یہاں تک کہ ہر بچہ سمجھتا تھا کہ اس کو سب سے زیادہ چاہتے ہیں۔ آپ جب اپنے وطن تکیہ کلاں رائے بریلی آتے تو ہم سب کے لئے وہ دن بڑی خوشی کا دن ہوتا۔ آپ کی گاڑی کو سب بچے گھیر لیتے، جب آپ گاڑی سے اترتے تو سب سے چھوٹا بچہ آپ کی انگلی پکڑ لیتا۔ اور سب بچوں کے گھیرے میں آپ گھر تشریف لے جاتے۔ ہر بچہ کوشش کرتا کہ آپ کے بیٹھنے کے بعد ان کی چھڑی لے لے، بعض مرتبہ ہم لوگوں میں جھگڑا بھی ہو جاتا۔ جب ایسا ہوتا تو بڑے چھڑی چھین لیتے۔ اور اونچائی پر ٹانگ دیتے آپ جب گھر تشریف لاتے تو سب بچوں کے لئے ٹافیاں لاتے، اور ہر ایک کو بلاکر ایک ایک ٹافی دیتے۔ اگر ٹافی کم ہو جاتی اور کوئی بچہ رہ جاتا تو باہر سے منگا کر دیتے لیکن سب بچوں کو ضرور دیتے۔ اور اگر کبھی ٹافی بچ جاتی تو خود بھی کھاتے، اس کے ساتھ ساتھ اگر کوئی بچہ ٹوپی نہ پہنے ہو تو فوراً ٹوکتے۔

ہم سوچتے تھے کہ سب آباجان کی عزت کیوں کرتے ہیں۔ خاندان میں اور بھی بڑے بوڑھے ہیں۔ آخر ایسا کیوں؟ جبکہ آباجان نہ بادشاہ ہیں، نہ ہی بہت زیادہ پیسے والے، نہ کوئی بڑا دنیوی عہدہ۔ پھر کیوں لوگ ان سے محبت کرتے ہیں۔ ان کے جوتے اٹھاتے ہیں ان کے پیر دباتے ہیں؟ یہی نہیں بلکہ اہم سرکاری عہدے والے اور وزیر اعظم تک آباجان کے پاس آتے ہیں۔ اور ان کی بات ایسے سنتے ہیں کہ جیسے شاگرد اپنے استاد کی بات سنتا ہے۔ ہم نے اپنے بڑوں سے وجہ پوچھی تو انھوں نے کہا کہ جو اللہ کا ہو جاتا ہے اللہ اس کا ہو جاتا ہے۔

آباجان کو بے ادبی بالکل گوارہ نہ تھی، ایسا کتنی بار دیکھا کہ کوئی بچہ چارپائی کے سرہانے بیٹھ جاتا اور اس کا بڑا پائنتے بیٹھا ہوتا تو چھوٹے کو پائنتے بیٹھنے کا حکم دیتے۔ سلام کرنے کو کہتے اور بچوں کے سلام کرنے پر انھیں شاباشی دیتے۔

پڑھائی کے بارے میں پوچھتے، زور سے بولنے کو ناپسند فرماتے، بچوں پر اتنے زیادہ شفیق تھے کہ ہم ان کی شفقت کو بیان نہیں کر سکتے، ہم لوگ غائب ہوتے تو بلاتے اور شفقت فرماتے کھیلنے سے کبھی روکتے نہیں تھے۔ بلکہ اگر کھیل کے وقت کوئی آکر بیٹھ جاتا تو فرماتے جاکر کھیلو لیکن پڑھائی کے وقت کھیل کو بہت ناپسند فرماتے تھے۔

ہم اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ ہم آج آباجان کی کتابیں "قصص النبیین" "القراۃ الراشدہ" پڑھ رہے ہیں۔ اس میں بڑا مزہ آتا ہے، نبیوں کے حالات اور واقعات کتنے اچھے انداز میں لکھے ہیں کہ انھیں پڑھ کر نبیوں سے محبت اور خوب تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح طریقے سے زندگی گزارنے کی اور نبیوں کے طریقہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اور ہمیں "آباجان" جیسا بنائے جن کے اندر اللہ میاں سے تعلق اتنا زیادہ تھا کہ انھیں ہر وقت اللہ میاں کے دین پھیلانے کی فکر لگی رہتی تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

(از سید خلیل احمد حسنی، تکیہ رائے بریلی)

آج "آباجان" ہمارے بیچ نہیں ہیں، لیکن ان کی محبتیں، شفقتیں اور ان کی دعائیں ہمارے ساتھ ہیں، اور آباجان کی شفقتیں صرف ہم ہی لوگوں کے ساتھ نہیں تھیں۔ وہ ہر کسی کے ساتھ شفقت سے پیش آتے تھے۔ اور ہر ایک کے کام آتے، غریبوں کو ان سے بہت آرام ملتا تھا۔ گھر تشریف لاتے تو ایک ایک بچہ کو یاد کرتے

اور کسی وجہ سے اگر گھر نہیں آسکے تو ہم بچوں کو بنگلہ پر بلاتے تھے، ٹافیاں ضرور لاتے تھے، کہ اس سے بچوں کو خوش کریں اور بچوں کو دینے کے بعد بچ جاتی تو ہم لوگوں سے کہتے اگر اجازت ہو تو ایک ہم بھی کھالیں، اس کے بعد وہ ٹافی خود بھی کھاتے۔

اگر ہم میں سے کوئی پیر دلبنے لگتا، تو فوراً روکتے، بلکہ ایک دو بار دبانے دیتے پھر بڑی محبت سے فرماتے کہ بس جاؤ کھیلو! اور بہت دعائیں دیتے۔ اور اگر ہم بچوں میں سے کوئی کسی بچہ کو مار دیتا تو پھر آپ سختی سے پیش آتے، ظلم و زیادتی آپ کو بہت زیادہ ناپسند تھی، ہماری امّی، خالہ، دادی، نانی، پھوپھی سب سے فرمایا کرتے تھے کہ اپنے بچوں کو ظلم سے بچاؤ، آپ نرمی سے گفتگو فرماتے اور شفقت سے پیش آتے، اور اس کی نصیحت بھی فرمایا کرتے تھے، ہم لوگ ابّا جان کو دنیا کا سب سے بڑا بزرگ سمجھتے تھے، کہ جن کو اللہ تعالیٰ نے دین پھیلانے کے لئے پیدا فرمایا ہے۔ اباجان کی ہم کس کس خوبی کو بتائیں۔ ان کی تقریر بھی بڑی زبردست ہوتی تھی اور لکھتے بھی بہت اچھا تھے، اور ہر وقت آپ کو دین کی، مسلمانوں کی اور ہم تو یہ دیکھتے تھے کہ سارے انسانوں کی فکر رہا کرتی تھی۔ بہت کم سو پاتے تھے، دوائیں بہت کھانی پڑتی تھیں، سو کر اٹھنے کے بعد ناشتہ کرکے اور سوتے وقت رات کو بھی دوا کھانی پڑتی تھی۔ صحت آپ کی برابر خراب رہتی تھی، لیکن دین کیلئے سفر کرتے رہتے تھے اور جو کوئی ملنے آتا اس کا بہت خیال کرتے اور اس کی بات کو بہت غور سے سنتے، کبھی کسی کا دل نہیں دکھاتے تھے۔

ابا جان کو بڑے بڑے ایوارڈ ملے، خیصل ایوارڈ ملا۔ دبئی کی حکومت نے ایوارڈ دیا، لیکن ہم دیکھتے تھے کہ اباجان کو ان چیزوں سے بالکل دلچسپی نہیں ہے۔ اباجان صبر اور شکر کو اپنانے پر بھی بہت زور دیتے تھے۔ اور بڑوں کا ادب کرنے کو کہتے تھے۔ اور ہر کام میں نیت صحیح رکھنے کو کہتے تھے اور فرماتے کہ حدیث شریف میں آیا ہے "إنما الأعمال بالنيات" گھر جب تشریف لاتے تو بزرگوں کے واقعات ایسے مزے لے لے کر بیان کرتے کہ سب بچوں میں یہ شوق پیدا ہونے لگتا کہ وہ انہی بزرگوں کی طرح بن جائے۔ اباجان کو عربی سے پھر اردو سے بہت تعلق تھا، ہم نے دیکھا کہ ہم میں سے کسی نے اگر ورق کو پنّہ کہہ دیا تو اس پر ٹوکا اور فرمایا کہ پنّہ کیا چیز ہوتی ہے، ورق کہا کرو، اس طرح ہم لوگوں کو اباجان کو دیکھ کر بھی اور سن کر بھی بہت کچھ ادب سیکھنے کو ملتا تھا۔ "اباجان" تو انتقال فرما گئے۔ اب ان کی یادیں ہیں، اللہ میاں ہم کو ان کے صحیح نقشِ قدم پر چلائے۔

سید محمد امین، تکیہ رائے بریلی۔

بیسویں صدی جاتے جاتے اپنے ساتھ ایسی شفیق ہستی کو لے گئی جس کی شفقت ہم سب پر ایک سایہ دار گھنے درخت کی مانند تھی، ایسی محترم ہستی کو ہم سے لے گئی جن کی دعاؤں کے سایہ میں ہم سب بڑے ہوئے۔ اب ہم سب تپتے صحراء کے مانند ہیں یہ ہمارے "اباجان" حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی تھے۔ جو اب ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ لیکن ان کی تقاریر، تصانیف تو ہمارے درمیان ہیں، ایسی شفیق اور محبت کرنے والی ہستی کو ہم سب کیسے بھول سکتے ہیں اباجان جب جب بھی سفر پر تشریف لے جاتے تو گھر ضرور تشریف لاتے، اور جب بھی سفر سے آتے تو گھر پہلے تشریف لاتے اباجان کے آتے ہی ہم لوگ جلدی کھڑے ہو جاتے اور سلام کرتے، اباجان بہت ہی محبت سے جواب دیتے رہتے۔ چھوٹے بچے سلام کرتے تو فرماتے جیتے رہو! اور سب بچوں کو جو وہاں ہوتے ٹافیاں دیتے، سر پر ہاتھ پھیرتے اور دعائیں دیتے۔ اور جب باہر جانے کے لئے تشریف لے جانے لگتے تو ہم سب لوگ جلدی سے کھڑے ہو جاتے۔ اور پیچھے پیچھے چند قدم ساتھ رہتے۔ اس پر اباجان کی دعائیں ملتیں۔ فرماتے! عزت سے رہو، ایمان کے ساتھ رہو، یہ دعا دیتے ہوئے تشریف لے جاتے۔ اباجان کے آنے سے تکیہ میں بہار آجاتی تھی۔ اور جب تشریف لے جاتے تھے تو سنّاٹا طاری ہو جاتا تھا، پھر ایک ایک دن اباجان کے آنے کے گنتے تھے، اس کے بعد اباجان جب تشریف لاتے تو پھر گویا عید ہو جاتی۔ اباجان کو بچوں سے بڑی محبت تھی، اور آپ ان پر بہت زیادہ شفقت فرماتے تھے، جس کی وجہ سے ہر بچہ یہ سمجھتا تھا، کہ اباجان ہم ہی سے زیادہ محبت کرتے ہیں، اباجان کے پاس اگر کوئی بچہ پیر دبانے پہونچ جاتا تو اس کی خوشی کیلئے بہت تھوڑا سا دبواتے۔ اور پھر روک دیتے، جس سے بچہ یہ سمجھتا، کہ واقعی میرے ہاتھوں میں جادو ہے تبھی تو اباجان کو اتنی جلدی سکون پہونچ گیا، لیکن وہاں بات کچھ اور ہی ہوتی۔ آپ بچوں میں اسلامی عنصر خاص طور سے ملاحظہ فرماتے تھے۔ اور ان کی اچھے انداز سے تربیت اور فکر کرتے تھے۔ اور گھر تشریف لاتے۔ پھر یہ بھی فرمایا کرتے کہ اپنی اولاد کو حرام اور مشتبہ مال سے بچاؤ، اباجان بچوں کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر نظر رکھتے اور خلاف ادب بات پر فوراً ٹوک دیتے، مثلاً اگر کوئی ٹوپی

پہن کر نہیں آتا تو اس کو ٹوپی پہننے کو کہتے۔ اگر کوئی مجلس میں خلاف ادب کام کرتا تو اس کو اسی وقت ادب سکھاتے۔ اور کسی کو زیادتی کرتا ہوا دیکھتے جیسے کہ بچوں کی یہ عادت ہوا کرتی ہے تو تنبیہ فرماتے اسی طرح بچوں کے چیخنے چلانے کو نا پسند کرتے لیکن ان کے رونے کو دیکھ کر فکر مند ہو جایا کرتے تھے۔

اباجان کے پاس عورتیں بیعت کیلئے آتیں تو ان کو توحید آخرت پر ایمان اور رسالت پر پورا یقین و اعتماد رکھنے کی تاکید فرماتے۔ کہ اللہ کی مرضی کے بغیر نہ کوئی پتہ ہل سکتا ہے نہ گر سکتا ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت ہی آخری شریعت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس چیز کو حلال کردیا وہ حلال ہے، جس کو حرام کر دیا وہ حرام ہے، قیامت تک اس میں کوئی تبدیلی ہونے والی نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔ اور وہی آخری نبی تھے اور اللہ کے سب سے محبوب نبی تھے۔ ان جیسے الفاظ کے ساتھ بیعت فرماتے، اور کچھ تسبیحات کے اہتمام کی تاکید فرماتے۔

ہمارے گھر میں بڑے چھوٹے سب یہ کہتے ہیں، اور ہم نے خود بھی دیکھا کہ اباجان کسی کا دل دکھانا نہیں جانتے تھے، ہمارے بڑے بتاتے ہیں، اباجان بھی فرمایا کرتے تھے۔ کہ "بی بی" (والدہ صاحبہ) کی سب سے زیادہ تاکید یہ رہتی تھی۔ کہ کسی پر ظلم نہ کرنا، کسی کا دل نہ دکھانا۔ ایک دفعہ گھر کی خادمہ پر ہاتھ اٹھانے پر اسی وقت اس سے معافی منگوائی۔

اباجان کا رمضان گذارنے کا معمول اپنے وطن تکیہ رائے بریلی کا ہوتا تھا۔ لیکن اس مرتبہ بیمار رہنے کی وجہ سے یہ مبارک ایام لکھنؤ میں ندوہ کے احاطہ میں گذارنے پڑے تکیہ پر رمضان نہ گذارنے کا ہم سب پر جو اثر تھا وہ بیان سے باہر ہے، اباجان کو بھی اس کا خیال تھا۔ اور وہ چاہتے تھے کہ گھر والوں کے بیچ ہی رمضان گذاریں اسی لئے تکیہ پر آخری عشرہ گذارنے کا شدید تقاضا ہوا۔ اور ۲۰ رمضان کو جب رائے بریلی تشریف لائے۔ تو تکیہ کی رونق پھر پوری طرح لوٹ آئی اور محسوس ہوتا تھا کہ ہر چیز بڑھ کر اباجان کا استقبال کر رہی ہے اور عجیب سا سماں تھا۔ لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اس نے ہمارے اباجان کو جو ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کا سکون تھے، اپنے پاس بلا لیا۔ دنیا روتی رہی لیکن اس کی مرضی ہو کر رہی۔ اللہ میاں نے اباجان کو دنیا کی تنگی سے نکال کر آخرت کی وسعت میں جگہ عطا فرمائی۔ آپ نے اپنی پوری زندگی ملت کی فکر و ہمدردی میں گذار دی آج۔ آپ کے حیات و کارناموں پر جگہ جگہ رسائل وکتب شائع ہو رہے ہیں " دنیا اس کو اپنے اوپر اپنا حق سمجھ کر کر رہی ہے جو آپ کی مقبولیت اور محبوبیت کی کھلی دلیل ہے۔ اب ان کے افکار و تعلیمات ہمارے سامنے ہیں جس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ اور یہی ان سے ملاقات اور ان کی مجلس کی جگہ پر ہے اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائے اور صحیح راستہ پر چلائے۔

ش۔ ع۔ حسنی

سبھی پہ یکساں تھی جن کی شفقت

سیدہ ہاجرہ حسنی بنت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

وہ محترم وہ شفیق ہستی — کرم سراپا خلیق ہستی
نگاہ و دل سے عزیز تر وہ — تھی وجہہ برکت لئیق ہستی
سبھی پہ یکساں تھی جن کی شفقت — سروں پہ جیسے تھا ابرِ رحمت
تھی وجہہ تسکین ان کی قربت — کہ جیسے واہو در سکینت
ہمارے گھر میں وہ جب بھی آتے — بس اچھی باتیں ہمیں بتاتے
بزرگ ہستی کا قرب پاکر — سب اہلِ خانہ سکون پاتے
یہاں کی رونق وہاں کی رونق — تھی اُن کے دم سے جہاں کی رونق
ہے اب پہ تکیہ کے ہر مکیں کے — گئی ہمارے مکاں کی رونق
ابھی تصوّر ہٹا نہیں ہے — ابھی یہ دل میں جما نہیں ہے
وہ اب یہاں سے چلے گئے ہیں — محبتیں وہ لٹا رہے ہیں
ہے سب کی تجھ سے دُعا خدایا — سکونِ دل کی عطا ہو دولت
ہمیں ہو توفیقِ صبر مولیٰ — انھیں عطا ہو جوارِ رحمت

مسلمانان ہند کی علمی و دینی خدمات

مرتبہ: حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۴۲۰ھ ۱۹۹۹ء)

۱۳۶۷ھ مطابق اپریل ۱۹۴۸ء میں جمعیۃ علماء ہند کا آل انڈیا جلسہ لکھنؤ میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی صدارت میں ہوا تھا مجلس استقبالیہ کے صدر حضرت مولانا ڈاکٹر سید عبد العلی صاحبؒ ناظم ندوۃ العلماء تھے۔ اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہارویؒ جمعیۃ کے سکریٹری جنرل تھے، ندوۃ العلماء نے مہمانوں کے لئے دارالاقامہ خالی کر دیئے تھے، اس موقع پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے جن کی عمر اس وقت صرف ۳۰۔ ۳۵ سال رہی ہوگی، بڑی محنت، توجہ اور عرق ریزی سے ہندوستان میں علمی و اسلامی تاریخ کے چارٹس تیار کیے جس نے بعد میں علمی نمائش کی شکل اختیار کرلی جو معلوماتی اور علمی لحاظ سے جاذب نگاہ اور جذبہ و فکر کے امتزاج کی ایک حسین و جمیل علمی و تعلیمی نمائش بن گئی، پھر انھیں علمی چارٹس کو سامنے رکھ کر ۸۵ سالہ جشن تعلیمی کے موقع پر ایسی نمائش کا اہتمام کیا گیا جو زیادہ شاندار تھی جو کھنٹوں میں پھیل گئی، اور اس سے مختلف اہل علم نے علمی فائدے حاصل کئے اور بہت سے دانشوروں نے اس کی نقلیں حاصل کیں۔ یہ چارٹس حضرت مولاناؒ کے طویل مطالعہ و مشاہدہ کا ماحصل اور عرق ریزی اور دیدہ وری کا اعلیٰ نمونہ ہیں جن کی افادیت آج بھی اسی طرح قائم ہے جس طرح آج سے پچاس سال پہلے تھی۔ ریسرچ کرنے والوں کو ایک نظر میں اتنا مواد مل جائے گا جو آسانی سے دوسری جگہ یکجا نہیں مل سکتا۔

نوٹ:- حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا نام اور آپ کے بعض علمی کارناموں کا ذکر کر کے ادارہ تعمیر حیات نے اضافہ کیا ہے۔

أعلام المفسرین في الهند
ہندوستان کے چند باکمال مفسرین

	الاسم	المتوفی فی سنہ	اسم التفسیر
١	الشیخ علاء الدین علی بن احمد المہائمی	٨٣٥ھ	تبصیر الرحمن وتیسیر المنان
٢	القاضی شہاب الدین الدولۃ آبادی	٨٤٩ھ	البحر المواج
٣	جان محمد اللاہوری	١١٢٠ھ	زبدۃ التفاسیر
٤	جمال الدین الگجراتی	١١٢٤ھ	تفسیر نصیری
٥	محمد محکم بن محمد بن شاہ علم اللہ الحسنی	١١٥٠ھ	محکم التنزیل
٦	ولی اللہ بن عبد الرحیم الدہلوی	١١٧٦ھ	فتح الرحمن فی تفسیر القرآن
٧	أہل اللہ بن عبد الرحیم	١١٨٧ھ	تفسیر القرآن
٨	ثناء اللہ الپانی پتی	١٢٢٥ھ	تفسیر مظہری
٩	عبد القادر بن ولی اللہ الدہلوی	١٢٣٠ھ	حواشی موضح القرآن
١٠	عبد العزیز المحدث الدہلوی	١٢٣٩ھ	فتح العزیز
١١	ولی اللہ الحسینی الفرخ آبادی	١٢٤٩ھ	نظم الجواہر
١٢	السید صدیق حسن القنوجی	١٣٠٧ھ	فتح البیان
١٣	محمد سعید الأسلمی المدراسی	١٣١٤ھ	تفسیر القرآن
١٤	احمد بن المتقی المعروف بسید احمد خاں	١٣١٥ھ	تفسیر القرآن
١٥	الشیخ محمد حسن الامروہوی	١٣٢٣ھ	مصالحات الاسرار
١٦	ابو القاسم بن حسین الکشمیری	١٣٢٤ھ	لوامع التنزیل وسواطع التاویل
١٧	فتح محمد اللکھنوی	١٣٢٨ھ	خلاصۃ التفاسیر
١٨	احمد حسن الدہلوی	١٣٢٨ھ	احسن التفاسیر
١٩	عبد الحق بن محمد امیر الدہلوی	١٣٣٥ھ	فتح المنان المعروف تفسیر حقانی
٢٠	امیر علی بن معظم علی الحسینی الملیح آبادی	١٣٣٧ھ	مواہب الرحمن
٢١	وحید الزماں بن مسیح الزماں اللکھنوی	١٣٣٨ھ	تفسیر وحیدی
٢٢	حمید الدین الفراہی	١٣٤٩ھ	نظام القرآن
٢٣	محمد اشرف علی التھانوی	١٣٦٢ھ	بیان القرآن
٢٤	ثناء اللہ الامرتسری	١٣٦٨ھ	تفسیر القرآن بکلام الرحمن
٢٥	شبیر احمد العثمانی	١٣٦٩ھ	حواشی علی ترجمۃ معانی القرآن (للشیخ محمود حسن الدیوبندی)
٢٦	ابو الکلام آزاد	١٣٧٧ھ	ترجمان القرآن
٢٧	محمد اویس النگرامی الندوی	١٣٩٦ھ	تفسیر ابن قیم
٢٨	عبد الماجد دریاآبادی	١٣٩٧ھ	تفسیر ماجدی
٢٩	ابو الأعلیٰ المودودی	١٤٠٠ھ	تفہیم القرآن
٣٠	امین احسن الاصلاحی	١٤١٨ھ	تدبر قرآن

الأعلام فی علم أسماء الرجال للحدیث فی الہند
فن اسماء الرجال اور اسانید کے چند ہندوستانی عالم

الرقم	الاسم	المتوفی فی عام	أہم مؤلفاتہ
١	الشیخ محمد بن طاہر علی البتنی الگجراتی	سنہ ٩٨٦ ھ	المغنی
٢	، عبد الحق بن سیف الدین الدہلوی	، ١٠٥٢ ھ	الاکمال فی أسماء الرجال
٣	، ولی اللہ بن عبد الرحیم الدہلوی	، ١١٧٦ ھ	الارشاد فی مہمات الإسناد
٤	، عبد الوہاب بن محمد غوث الشافعی	، ١٢٨٥ ھ	أکمل الوسائل لرجال الشمائل
٥	، علی کبیر الالہ آبادی	، ١٢٨٥ ھ	مطلوب الطالبین فی أسماء رجال الأربعین
٦	، محسن بن یحییٰ الترہتی	من رجال القرن الثالث عشر	الیانع الجنی فی أسانید الشیخ عبد الغنی
٧	، عبد الرحمٰن المبارکپوری	سنہ ١٣٠٠ ھ	مقدمۃ تحفۃ الاحوذی
٨	، عبد الحی الفرنگی محلی	، ١٣٠٤ ھ	مقدمۃ التعلیق الممجد، الرفع والتکمیل
٩	، احمد بن صبغۃ اللہ الشافعی المدراسی	، ١٣٠٧ ھ	فہرس الأسماء المبہمۃ
١٠	، السید صدیق حسن البوفالی	، ١٣٠٧ ھ	سلسلۃ العسجد
١١	، ابو الحسین احمد النوری المارہروی	، ١٣٢٤ ھ	النور والبہار فی أسانید الحدیث وسلاسل الأولیاء
١٢	، ادریس بن عبد العلی النگرامی	، ١٣٣٠ ھ	الکلام المسدد فی رواۃ مؤطا الامام محمد
١٣	، السید امیر علی الملکھنوی	، ١٣٣٧ ھ	التعقیب حاشیۃ تقریب التہذیب
١٤	، السید عبد الحی الحسنی البریلوی	، ١٣٤١ ھ	الأسانید
١٥	، خلیل احمد السہارنفوری	، ١٣٤٦ ھ	مسلسلات، أوائل

أعلام علم الفقہ فی الہند

علم فقہ کے چند ہندوستانی عالم و مصنف

الرقم	الإسم	المتوفی فی عام	أہم آثرہ
۱	الشیخ القاضی حمید الدین مخلص الدہلوی	سنہ ۷۶۴ ھ	شرح الہدایۃ
۲	〃 یوسف بن ابی یوسف الچشتی	〃 ۷۷۴ ھ	تحفۃ النصائح
۳	〃 حسین بن عمر النیاث پوری	〃 ۷۹۸ ھ	حاشیۃ الہدایۃ
۴	〃 وحید الدین العلوی الگجراتی	〃 ۹۹۸ ھ	حاشیۃ شرح الوقایۃ
۵	〃 نظام الدین البرہانفوری و الشیخ محمد حسین	من رجال القرن الحادی عشر	فتاویٰ عالمگیری
۶	〃 معین الدین بن خاوند محمود الکشمیری	سنہ ۱۰۸۵ ھ	فتاویٰ نقشبندیۃ
۷	〃 عنایت اللہ اللاہوری	〃 ۱۱۴۱ ھ	ملتقط الحقائق
۸	〃 ابو الوفا ر الحنفی الکشمیری	〃 ۱۱۷۹ ھ	کتاب الفقہ
۹	〃 علیم اللہ بن عتیق اللہ الجالندھری	〃 ۱۲۰۲ ھ	زبدۃ الروایات
۱۰	〃 ثناء اللہ الپانی پتی	〃 ۱۲۲۵ ھ	مالا بد منہ
۱۱	〃 عبد العزیز بن ولی اللہ الدہلوی	〃 ۱۲۳۹ ھ	فتاویٰ عزیزیۃ
۱۲	〃 عبد الحی الفرنگی محلی	〃 ۱۳۰۴ ھ	السعایۃ، الفتاویٰ
۱۳	〃 محمد حسن السنبھلی	〃 ۱۳۰۵ ھ	صرح الحمایۃ
۱۴	〃 وحید الزماں اللکھنوی	〃 ۱۳۳۷ ھ	نور الأبصار
۱۵	〃 أحمد رضا بن نقی علی البریلوی	〃 ۱۳۴۰ ھ	النیرۃ الوضیۃ
۱۶	〃 عبد الحمید بن عبد الرحیم اللکھنوی	〃 ۱۳۵۳ ھ	تکملۃ عمدۃ الرعایۃ
۱۷	〃 أشرف علی التھانوی	〃 ۱۳۶۲ ھ	بہشتی زیور، الفتاویٰ، بوادر النوادر

أعلام الفقه فی المذهب الشافعی فی الهند
فقہ شافعی کے چند ہندوستانی عالم و مصنف

الرقم	الإسم	المتوفی فی عام	أهم آثره
۱	الشیخ علاء الدین علی بن أحمد الشافعی المهائمی	سنة ۸۳۵ ھ	الرسالة
۲	” حبیب اللہ بن محمد درویش الشافعی الأليوری	” ۱۲۲۲ ھ	آئین توجیہ فی شرح التنبیہ
۳	” محمد غوث بن ناصر الدین الشافعی المدراسی	” ۱۲۳۸ ھ	کفایة المبتدی، تعلیقات
۴	” القاضی صبغۃ اللہ بن محمد غوث الشافعی	” ۱۲۸۰ ھ	المطالع البدریة والکواکب الدریة
۵	” إبراهیم بن عبد اللہ باعکظة الشافعی	” ۱۲۸۲ ھ	تحفة الإخوان
۶	” القاضی عبد الوهاب بن محمد غوث الشافعی	” ۱۲۸۵ ھ	هبة اللہ
۷	” عبد اللہ بن صبغۃ اللہ بن محمد غوث	” ۱۲۸۸ ھ	الفوائد الغوثیة
۸	” أحمد بن صبغۃ اللہ الشافعی المدراسی	” ۱۳۰۸ ھ	الفتاوی الصبغیة
۹	” عبید اللہ بن صبغۃ اللہ الشافعی المدراسی	” ۱۳۴۶ ھ	رسالة فی الفقه الشافعی
۱۰	” عبد القادر بن عبد الأحد الشافعی السورتی	من رجال القرن الرابع عشر	تحفة المشتاق فی أحکام النکاح والطلاق
۱۱	” زین الدین بن عبد العزیز الملیباری	” ”	فتح المعین شرح قرة العین
۱۲	” شریف محی الدین الشافعی	سنة ۱۳۸۶ ھ	توضیح المسائل، تسہیل الفقه

أعلام علم الفرائض فی الہند

علم الفرائض کے چند ہندوستانی عالم ومصنف

الرقم	الاسم	المتوفی فی عام	أهم مؤلفاته
۱	الشیخ شاہی بیگ	من رجال القرن التاسع	تعلیقات علی الشریفیة
۲	〃 السید عبد الأول بن علی الحسنی	سنة ۹٦۸ ھ	رسالة منظومة فی علوم الفرائض
۳	〃 عبد الفتاح بن مبارک الجریاکوٹی	〃 ۱۰۵۷ ھ	میراث نامہ
۴	〃 السید احمد بن مسعود الہرگامی	〃 ۱۱۵۷ ھ	الوجیز
۵	〃 القاضی نور الحق الکیرانوی	〃 ۱۱۸۰ ھ	رسالة فی الفرائض
٦	〃 عبد الباسط رستم القنوجی	〃 ۱۲۲۳ ھ	زبدة الفرائض
۷	〃 السید اسحٰق بن محمد عرفان الحسنی	〃 ۱۲۳۴ ھ	المائتان
۸	〃 معشوق علی الجونپوری	〃 ۱۲٦۸ ھ	الفرائض الاسلمیة
۹	〃 المفتی عنایت احمد الکاکوروی	〃 ۱۲۷۹ ھ	علم الفرائض
۱۰	〃 القاضی صبغة اللہ المدراسی	〃 ۱۲۸۰ ھ	عمدة الرائض فی الفرائض
۱۱	〃 نعیم اللہ بن حبیب اللہ اللکھنوی	〃 ۱۲۸۲ ھ	خلاصة الفرائض
۱۲	〃 انور علی المرادآبادی ثم اللکھنوی	〃 ۱۳۰۳ ھ	ضوء السراج
۱۳	〃 عبد الحی الفرنگی محلی اللکھنوی	〃 ۱۳۰۴ ھ	تعلیقات علی الشریفیة
۱۴	〃 عبد اللہ الغازی پوری	〃 ۱۳۳۷ ھ	تسہیل الفرائض
۱۵	〃 عبد الغفار بن احمد حسین الخیرآبادی	من رجال القرن الرابع عشر	کنز الفرائض
۱٦	〃 اصغر حسین الدیوبندی	سنة ۱۳٦۴ ھ	الوارثین ، میراث المسلمین

مؤلفات علماء الہند القیمة المنفردة فی موضوعاتہا

ہندوستان کی مایۂ ناز تصانیف جو اپنے موضوع پر منفرد ہیں

الرقم	اسم الکتاب	اسم المصنف	المتوفی فی عام	موضوع الکتاب
١	العباب الزاخر	الشیخ حسن بن محمد الصغانی اللاہوری	سنة ٦٥٠ھ	معجم عربی
٢	مکتوبات سہ صدی	" شرف الدین أحمد بن یحیی المنیری	" ٧٧٢ھ	التصوف والحقائق
٣	تبصیر الرحمن وتیسیر المنان	" علی بن أحمد المہائمی	" ٨٣٥ھ	التفسیر ولطائف القرآن
٤	کنز العمال	" علی المتقی البرہان فوری	" ٩٧٥ھ	الحدیث
٥	مجمع بحار الأنوار	" محمد طاہر البتنی	" ٩٨٦ھ	اللغة وشرح الحدیث
٦	مکتوبات (رسائل)	" أحمد السرہندی	" ١٠٣٤ھ	الشریعة والحقیقة
٧	أشعة اللمعات	" عبد الحق الدہلوی	" ١٠٥٢ھ	شرح الحدیث
٨	الشمس البازغة	" ملا محمود الجونفوری	" ١٠٦٢ھ	الفلسفة
٩	الفتاوی الہندیة	علماء عصر عالمگیر (سلطان الہند)	القرن الحادی عشر	الفقه
١٠	مسلم الثبوت	القاضی محب الله البہاری	سنة ١١١٩ھ	أصول الفقه
١١	التفسیرات الأحمدیة	الشیخ أحمد المعروف بملا جیون	" ١١٣٠ھ	التفسیر والأحکام
١٢	حجة الله البالغة	" ولی الله الدہلوی	" ١١٧٦ھ	أسرار الشریعة
١٣	إزالة الخفاء	" " "	" "	الخلافة الراشدة ونظام الخلافة
١٤	الفوز الکبیر	" " "	"	أصول التفسیر
١٥	الإنصاف	"	"	اسباب اختلاف الفقہاء والمجتہدین
١٦	کشاف اصطلاحات الفنون	" محمد أعلی التہانوی	من رجال القرن الثانی عشر	مصطلحات العلوم
١٧	تاج العروس فی شرح القاموس	السید مرتضی الزبیدی البلگرامی	سنة ١٢٠٥ھ	اللغة
١٨	ترجمة معانی القرآن الکریم	الشیخ عبد القادر الدہلوی	" ١٢٣٠ھ	التفسیر
١٩	تحفہ إثنا عشریة	" عبد العزیز الدہلوی	" ١٢٣٩ھ	الکلام
٢٠	صراط مستقیم	السید أحمد الشہید	" ١٢٤٦ھ	التصوف والأخلاق
٢١	منصب امامت	الشیخ اسماعیل الشہید	" "	الخلافة والامامة
٢٢	منتہی الکلام	" حیدر علی الفیض آبادی	" ١٢٩٩ھ	علم الکلام
٢٣	ابجد العلوم	" السید صدیق حسن القنوجی	" ١٣٠٧ھ	العلوم والفنون
٢٤	إظہار الحق	" رحمت الله الکیرانوی	" ١٣٠٩ھ	الرد علی النصاری
٢٥	شعر العجم	" شبلی النعمانی	" ١٣٣٢ھ	الشعر الفارسی
٢٦	نزہة الخواطر	" عبد الحی الحسنی الرائے بریلوی	" ١٣٤١ھ	تراجم اہل الہند وسیرہم
٢٧	الثقافة الاسلامیة فی الہند	" "	" "	تاریخ الہند العلمی
٢٨	جنة المشرق (الہند فی العہد الاسلامی)	" "	" "	خطوط الہند وآثارہا
٢٩	معجم المصنفین	" محمود حسن خاں التونکی	" ١٣٦٦ھ	المؤلفین فی الاسلام وسیرہم
٣٠	سیرة النبی	" السید سلیمان الندوی	" ١٣٧٣ھ	السیرة النبویة

أعلام الشعر العربي والإنشاء في الهند
ہندوستان کے چند عربی شعراء و أدباء

الرقم	الإسم	المتوفى في عام	أهم مؤلفات
۱	الشيخ مسعود بن سعد بن سلمان اللاهوري	من رجال القرن الخامس	القصائد
۲	″ خسرو بن سيف الدين الدهلوي	سنة ۷۲۵ ھ	القصائد
۳	″ القاضي عبد المقتدر الكندي الدهلوي	″ ۷۹۱ ھ	القصيدة اللامية
۴	″ أحمد بن محمد التھانيسري	″ ۸۲۰ ھ	القصيدة الدالية
۵	″ أبو الفتح بن عبد الحی بن عبد المقتدر الدهلوي	″ ۸۵۸ ھ	قصائد عربية
۶	″ أبو الفيض بن المبارك الناگوری	″ ۱۰۰۴ ھ	سواطع الإلهام
۷	″ غلام نقشبند بن عطاء الله الگھوسوی ثم اللكهنوی	″ ۱۱۲۶ ھ	القصيدة المدحية اللامية
۸	″ ولی الله بن عبد الرحيم الدهلوي	″ ۱۱۷۶ ھ	ديوان الشعر العربي
۹	″ عبد الجليل بن مير أحمد الواسطي البلگرامی	″ ۱۱۸۸ ھ	مختصر المستطرف
۱۰	″ غلام علی بن نوح الواسطي البلگرامی	″ ۱۲۰۰ ھ	السبعة السيارة
۱۱	″ باقر بن مرتضى المدراسی	″ ۱۲۲۰ ھ	العشرة الكاملة
۱۲	″ رفيع الدين بن ولی الله الدهلوي	″ ۱۲۳۳ ھ	مجموعة القصائد العربية
۱۳	″ عبد العزيز بن ولی الله الدهلوي	″ ۱۲۳۹ ھ	قصائد عربية
۱۴	″ رشيد الدين الدهلوي	″ ۱۲۴۳ ھ	كتب ورسائل إخوانية
۱۵	″ أوحد الدين البلگرامی	″ ۱۲۵۰ ھ	مفتاح اللسان في المحاورات العربية ونشوة السكران في شعر النسوان
۱۶	″ عبد الرحيم بن عبد الكريم الصفی پوری	″ ۱۲۶۷ ھ	شرح المعلقات السبع
۱۷	″ حسن علی بن حاجی شاہ اللكهنوی	″ ۱۲۷۵ ھ	رسائل
۱۸	″ أحمد حسن بن أولاد حسن القنوجی	″ ۱۲۷۷ ھ	قصائد عربية
۱۹	″ فضل الحق الخير آبادی	″ ۱۲۸۸ ھ	الثورة الهندية
۲۰	″ المفتی صدر الدين "آزردہ" الدهلوي	″ ۱۲۸۵ ھ	القصيدة العينية
۲۱	″ فيض الحسن السهارنپوری	″ ۱۳۰۴ ھ	ديوان الشعر
۲۲	″ عباس التستری اللكهنوی	″ ۱۳۰۶ ھ	الظل الممدود
۲۳	″ النواب صديق حسن القنوجی	″ ۱۳۰۷ ھ	سر من رأى - تذكار الغزلان
۲۴	″ القاضی طلا محمد البشاوری	″ ۱۳۱۰ ھ	نشأة الأدب في أسواق العرب
۲۵	″ نذير أحمد الدهلوي	″ ۱۳۲۲ ھ	قصائد عربية
۲۶	″ ذو الفقار علی الديوبندی	″ ۱۳۲۳	قصائد عربية
۲۷	″ عبد الحميد بن أحمد الله العظيم آبادی	″ ۱۳۲۳ ھ	شعر عربی
۲۸	″ عبد الرحمن الكاشغری الندوی	من رجال القرن الرابع عشر	الزهرات، أمثال اللغتين
۲۹	″ مسعود عالم الندوی	سنة ۱۳۷۳ ھ	مقالات وأبحاث
۳۰	″ السيد أبو الحسن علی الحسنی الندوی	″ ۱۴۲۰ ھ	كتب ومؤلفات

أعلام الفنون الرياضية والهيئة الهندسية في الهند

ریاضیات اور ہیئت وہندسہ کے چند ممتاز ہندوستانی عالم

الرقم	الاسم	المتوفی فی عام	أهم مآثره
۱	الشیخ عبدالباقی التهتهوی	سنة ۹۸۳ھ	الأشکال الجدیدة
۲	" أبوالفیض فیضی الناگوری	" ۱۰۰٤ھ	ترجمة لیلاوتی
۳	" فریدالدین الدهلوی	" ۱۰۳۹ھ	زیج شاہجہانی
۴	" عصمت اللہ السهارنفوری	" ۱۱۳۳ھ	ضابطة القواعد
۵	" تفضل حسین اللکهنوی	" ۱۲۱۵ھ	شرح مخروطات رسائل جبر ومقابلة
۶	" نجم الدین الکاکوروی	" ۱۲۳۹ھ	الستة الجبریة
۷	" رفیع الدین المرادآبادی	" ۱۲۳۳ھ	دستور المحاسبین، کنز الحساب
۸	" أحمد بن محمد المالکی المدراسی	" ۱۲۴۰ھ	زبدة الحساب
۹	" خواجه فریدالدین الدهلوی	" ۱۲۴۴ھ	فوائد الأفکار
۱۰	" نیاز أحمد البریلوی	" ۱۲۵۰ھ	رسالة فی الحساب
۱۱	" رستم علی بن طفیل علی السنبهلی	" ۱۲۶۲ھ	زیج سلیمان جاهی
۱۲	" غلام حسین الجونفوری	" ۱۲۷۹ھ	زیج بهادرخانی
۱۳	" عنایت احمد الکاکوروی	" ۱۲۷۹ھ	ملخصات الحساب
۱۴	" النواب فخرالدین الحیدرآبادی	" ۱۲۷۹ھ	شمس الهندسة والسنة الشمسية
۱۵	" غلام امام خان الحیدرآبادی	" ۱۲۸۵ھ	خورشید حساب
۱۶	" گلشن علی الجونفوری	" ۱۲۹۱ھ	شرح خلاصة الحساب
۱۷	" ذکاء اللہ الدهلوی	" ۱۳۲۸ھ	کتاب فی علم الحساب

اعلام المورخین فی الہند

ہندوستان کے ممتاز مؤرخین

الرقم	الاسم	المتوفیٰ فی عام	أھم مؤلفات
۱	الشیخ نورالدین محمد العوفی	من رجال القرن السابع	لباب الألباب
۲	〃 القاضی منہاج الدین عثمان الجوزجانی	〃 〃 〃	طبقات ناصری
۳	〃 ضیاء الدین البرنی	سنة ۷۵۸ ھ	تاریخ فیروزشاہی
۴	〃 ملا داؤد البیدری	〃 ۸۱۷ ھ	تحفة السلاطین
۵	〃 غیاث الدین الہروی	〃 ۹۴۴ ھ	حبیب السیر
۶	〃 السید رفیع الدین الشیرازی	〃 ۹۰۴ ھ	تذکرة الملوک
۷	〃 السید عبدالقادر بن ملوک شاہ البدایونی	〃 ۱۰۰۴ ھ	منتخب التواریخ
۸	〃 ابوالفضل بن المبارک الناگوری	〃 ۱۰۱۱ ھ	آئین اکبری
۹	〃 محمد قاسم بن غلام علی البیجاپوری	〃 ۱۰۱۷ ھ	گلشن ابراہیمی المعروف بہ تاریخ فرشتہ
۱۰	〃 عبدالحق بن سیف الدین الدہلوی	〃 ۱۰۵۲ ھ	أخبار الملوک
۱۱	〃 بختاور خان العالمگیری	〃 ۱۰۹۶ ھ	مرآة العالم
۱۲	〃 محمد ہادی کامور خاں	〃 ۱۱۳۴ ھ	ہفت گلشن
۱۳	〃 الأمیر عبدالرزاق الخوافی	〃 ۱۱۷۱ ھ	مآثر الأمراء
۱۴	〃 غلام حسین الطباطبائی	〃 ۱۲۰۰ ھ	سیر المتأخرین
۱۵	〃 عبدالرحمان الدہلوی	〃 ۱۲۴۶ ھ	مرآة آفتاب نما
۱۶	〃 عبدالقادر بن محمد اکرم الرامپوری	〃 ۱۲۶۵ ھ	کتاب فی أخبار الملوک
۱۷	〃 عبدالرحیم بن عبدالکریم الصفی پوری	〃 ۱۲۶۷ ھ	زبدة التواریخ
۱۸	〃 محمد حسین آزاد الدہلوی	〃 ۱۳۲۶ ھ	دربار اکبری
۱۹	〃 المنشی ذکاء اللہ الدہلوی	〃 ۱۳۲۸ ھ	تاریخ ہندوستان
۲۰	〃 العلامہ شبلی النعمانی	〃 ۱۳۳۲ ھ	الفاروق/المامون/سیرة النبیؐ ج-۱-۲-
۲۱	〃 السید عبدالحی الحسنی	〃 ۱۳۴۱ ھ	نزہة الخواطر، یاد ایام (تاریخ گجرات)
۲۲	〃 عبدالحلیم شررؔ اللکھنوی	〃 ۱۳۴۵ ھ	تاریخ مخدرات تیموریة
۲۳	〃 السید سلیمان الندوی الدسنوی	〃 ۱۳۷۳ ھ	سیرت عائشہ
۲۴	〃 السید ابوالحسن علی الحسنی الندوی	〃 ۱۴۲۰ ھ	رجال الفکر والدعوة فی الاسلام، اذا ھبت ریح الایمان، سیرت سید احمد شہید، المسلمون فی الہند

اعلام الشعر الفارسی فی الهند

ہندوستان کے چند فارسی شعراء

الرقم	الاسم	المتوفی فی عام
۱	الشیخ ابو الفرج بن مسعود اللاہوری	سنۃ ۴۸۴ھ
۲	〃 مسعود بن سعد اللاہوری	من رجال القرن الخامس
۳	〃 الأمیر خسرو الدہلوی	سنۃ ۷۲۵ھ
۴	〃 حسن بن علاء السجزی الدہلوی	〃 ۷۳۷ھ
۵	〃 ابو الفیض فیضی الناگوری	〃 ۱۰۰۴ھ
۶	〃 محمد طاہر غنی الکشمیری	〃 ۱۰۷۹ھ
۷	〃 ناصر علی السرہندی	〃 ۱۱۰۸ھ
۸	〃 مرزا عبد القادر بیدل	〃 ۱۱۳۳ھ
۹	〃 مرزا جان جاناں الشہید	〃 ۱۱۹۵ھ
۱۰	〃 اسد اللہ خاں غالب الدہلوی	〃 ۱۲۸۵ھ
۱۱	〃 ولایت علی الصفی پوری	من رجال القرن الرابع عشر
۱۲	〃 غلام قادر گرامی	〃 〃 〃
۱۳	〃 خواجہ عزیز الدین عزیز اللکھنوی	〃 〃 〃
۱۴	〃 فخر الدین فخر الرائے بریلوی	سنۃ ۱۳۲۶ھ
۱۵	〃 شبلی النعمانی	〃 ۱۳۳۲ھ
۱۶	〃 الدکتور محمد اقبال اللاہوری	〃 ۱۳۵۷ھ

اعلام العلوم العقلیة والفنون النظریة وآدابها فی الهند

علوم عقلیہ حکمت وفلسفہ کے چند باکمال ہندوستانی عالم ومصنف

الرقم	الاسم	المتوفی فی عام	أهم مؤلفاته
۱	الشیخ ملا محمود الجونفوری	سنة ۱۰۶۲ ھ	الشمس البازغة
۲	〃 القاضی محب اللہ البہاری	〃 ۱۱۱۹ ھ	سلم العلوم
۳	〃 الملا حمد اللہ السندیلوی	〃 ۱۱۶۰ ھ	شرح السلم
۴	〃 القاضی مبارک الگوپاموی	〃 ۱۱۶۲	شرح السلم
۵	〃 غلام یحییٰ البہاری	〃 ۱۱۸۰ ھ	حاشیة میرزاهد
۶	〃 الملا حسن اللکھنوی	〃 ۱۱۹۹ ھ	شرح السلم
۷	〃 عبد العلی بحر العلوم الفرنگی محلی	〃 ۱۲۲۵ ھ	العجالة النافعة
۸	〃 العلامة رفیع الدین الدہلوی	〃 ۱۲۳۳ ھ	ابطال البراهین الحکمیة
۹	〃 الفاضل فضل امام الخیرآبادی	〃 ۱۲۴۳ ھ	تلخیص الشفاء، مرقاة المنطق
۱۰	〃 عماد الدین اللبکنی الرامفوری	القرن الثالث عشر	العقیدة الوثیقة فی بعض المسائل الحکمیة
۱۱	〃 محمد غوث المدراسی	سنة ۱۲۳۸ ھ	برهان الحکمة
۱۲	〃 محمد اشرف بن نعمت اللہ اللکھنوی	〃 ۱۲۴۴ ھ	الأصول الراسخة
۱۳	〃 المفتی سعد اللہ المرادآبادی	〃 ۱۲۹۴ ھ	رسالة فی بحث قوس قزح
۱۴	〃 السید علی البلگرامی	〃 ۱۳۲۹ ھ	الحقائق

أعلام اللغة العربية وآدابها في الهند

عربی لغت وزبان کے چند ہندوستانی محققین

الرقم	الإسم	المتوفى في عام	أهم آثاره	مكان الولادة	المدفون في	الاختصاص في
١	الشيخ حسن بن محمد الصغاني	سنة ٦٥٠ھ	العباب الزاخر	لاہور	بغداد	المعاجم واللغات
٢	القاضي إبراهيم بن فتح الله الملتاني	″ ٩٣٢ھ	معارف العلوم	ملتان	ملتان	اللغة والحديث
٣	محمد طاہر البتني الگجراتي	″ ٩٨٦ھ	مجمع بحار الانوار	پٹن	پٹن	اللغة وشرح الحديث
٤	حبيب الله القنوجي	″ ١١٤٠ھ	القابوس ترجمة القاموس	قنوج	الہ آباد	اللغة
٥	السيد محمد حكم بن محمد بن علم الله الرائے بریلوی	″ ١١٥٠ھ	تلخيص الصراح	رائے بریلی	رائے بریلی	التفسير واللغة
٦	السيد محمد أعلى التهانوي	القرن الثاني عشر	كشاف اصطلاحات الفنون	تھانہ بھون	تھانہ بھون	اللغة والتاريخ
٧	القاضي عبد النبي الأحمد نگری	″ ″ ″	دستور العلماء	احمد نگر	احمد نگر	اللغة والفقه
٨	السيد مرتضى البلگرامي	سنة ١٢٠٥ھ	تاج العروس شرح القاموس	بلگرام	القاهرة	الادب واللغة والحديث
٩	أوحد الدين البلگرامي	″ ١٢٥٠ھ	نفائس اللغات، مفتاح اللسان	بلگرام	بلگرام	الادب واللغة
١٠	عبد الرحيم الصفي پوری	″ ١٢٦٧ھ	منتهى الأرب في لغات العرب	صفی پور	کلکتہ	اللغة
١١	المفتي سعد الله بن نظام الدين المراد آبادي	″ ١٢٩٤ھ	القول المانوس في صفات القاموس	مراد آباد	لکھنؤ	النحو، اللغة
١٢	النواب السيد صديق حسن القنوجي	″ ١٣٠٧ھ	لف القماط	قنوج	بھوپال	التفسير والحديث والادب والفقه
١٣	السيد كرامت حسين الكنتوري	″ ١٣٣٥ھ	فقه اللسان	جھانسی	لکھنؤ	الفلسفة، اللغة
١٤	وحيد الزمان بن مسيح الزمان اللكھنوي	″ ١٣٣٨ھ	انوار اللغة	کانفور	وقار آباد	الحكمة واللغة
١٥	المفتي اسماعيل بن الوجيه اللندني	القرن الثالث عشر	تاج اللغات	مراد آباد		الحكمة واللغة

ہندوستان کے عبقری سلاطین و امراء

عباقرة الاسلام فی الهند الملوک والأمراء

الرقم	الاسم	المتوفی فی	السمات الشخصیة	أهم مآثره	المصادر
۱	خوجه عماد الدین محمد گاوان الگیلانی	سنة ۸۸۰ ھ	النبوغ العلمی، حسن الإدارة، احتضان العلم والعلماء	احتضان العلم والعلماء وتأسیس جامعة اسلامیة کبیرة فی بیدر	تاریخ آصفی، الضوء اللامع
۲	السلطان سکندر اللودھی	〃 ۹۲۳ ھ	مکارم الأخلاق، اتباع الشریعة الإسلامیة وتقدیر الکفاءات العلمیة	ترویج العلم الدینی وتحکیم مبادی الشریعة الاسلامیة	گلزار ابراہیمی المعروف بہ تاریخ فرشتہ
۳	السلطان مظفر حلیم الگجراتی	〃 ۹۳۲ ھ	العلم والتقی، السماح والکرم مع الأعداء	فتح ماندو، الایثار	ظفر الواله فی تاریخ المظفر وآله
۴	شیر شاه السوری	〃 ۹۵۲ ھ	الادارة القویة الرفیعة، سن القوانین الحکیمة والعنایة بالدین	تنظیم المملکة، الأمور النافعة	تاریخ شیر شاہی
۵	عبد العزیز آصف خاں	〃 ۹۶۱ ھ	التفنن فی العلوم والفرائد، الاهتمام بالأمور الدینیة، أداء الواجب علی أکمل أوجه	نشر العلم فی الحرمین	رسالة ابن حجر المکی علی مناقب عبد العزیز آصف خاں
۶	عبد الرحیم خان خاناں	〃 ۹۳۶ ھ	الجمع بین الریاستین، السیف والقلم، الشعر البلیغ فی عدة لغات	تشجیع الشعراء والأدباء وتقدیر العلم والأدب	مآثر الأمراء
۷	السلطان أورنگ زیب عالمگیر	〃 ۱۱۱۸ ھ	علو الهمة والعمل بالعزیمة والعزة الدینیة	توسیع المملکة، وترتیب الفتاوی	مآثر عالمگیری، مرآة العالم
۸	فتح علی خاں ٹیپو سلطان	〃 ۱۲۱۳ ھ	علو الهمة، دقة الفهم، الذکاء النادر	الدفاع عن الوطن، والغیرة الدینیة، والکفاح المیت للحفاظ علی الکیان الوطنی	سلطنت خداداد ٹیپو سلطان

دور حاضر میں ہندوستان کی نابغۂ روزگار شخصیات

نوابغ الشعب الاسلامی فی الہند فی القرن الحاضر

الرقم	الاسم	المتوفی فی	الممیزات البارزہ	أھم مآثرہ	المصادر
۱	الشیخ عبد الحی الفرنگی محلی	سنۃ ۱۳۰۴ھ	النبوغ فی الفقہ والحدیث کثرۃ التالیف	السعایۃ، التعلیق الممجد، الفوائد البہیۃ	نزھۃ الخواطر
۲	السید صدیق حسن البوفالی	،، ۱۳۰۷ھ	خدمۃ الحدیث، احیاء التراث الإسلامی	ابجد العلوم، اتحاف النبلاء	نزھۃ الخواطر
۳	شبلی النعمانی	،، ۱۳۳۲ھ	سعۃ الاطلاع فی العلوم الاسلامیۃ، النبوغ فی الشعر والأدب، سرعۃ الملاحظۃ قوۃ الحجۃ والبیان	سیرۃ النبی ۱، ۲، شعر العجم، الفاروق	حیات شبلی
۴	محمود حسن الدیوبندی	،، ۱۳۳۹ھ	تنوع الاختصاصات العلمیۃ، علو الھمۃ، الغیرۃ علی الإسلام، الزود عن الخلافۃ والکفاح لتحریر البلاد	ترجمۃ معانی القرآن إلی اللغۃ الأردیۃ	نزھۃ الخواطر
۵	اکبر الٰہ آبادی	،، ۱۳۴۰ھ	الأدب الساخر الرفیع التھکم بالحضارۃ الغربیۃ فہم نفسیۃ الشعب، الضرب علی الوتر الحساس، استخدام وسیلۃ الأدب فی سبیل الاسلام والمسلمین	کلیات اکبر	الصراع بین الفکرۃ الغربیۃ والفکرۃ الاسلامیۃ
۶	السید عبد الحی الحسنی	،، ۱۳۴۱ھ	التضلع من العلوم، دقۃ النظر فی تاریخ الہند وسعۃ الاطلاع باحوالہا ورجالہا وطبقاتہا رسوخ القدم فی آداب اللغۃ العربیۃ والفارسیۃ وحب الحیاۃ للعلم والتالیف	نزھۃ الخواطر، یاد ایام	حیات عبد الحی
۷	الشیخ انور شاہ الکشمیری	،، ۱۳۵۲ھ	قوۃ الذاکرۃ، التفنن فی العلوم واتساع النظر	فیض الباری، إکفار الملحدین	حیات انور
۸	الدکتور محمد اقبال	،، ۱۳۵۷ھ	الشعر البلیغ المثیر للجنان والایمان الدعوۃ الی الاعتزاز بالاسلام	الدواوین الشعریۃ بالاردیۃ والفارسیۃ	اقبال کامل
۹	أشرف علی التھانوی	،، ۱۳۶۲ھ	کثرۃ الافادۃ، قوۃ التربیۃ اصلاح العواید الجاھلیۃ، کثرۃ التالیف	بیان القرآن، تربیۃ السالک	أشرف السوانح
۱۰	محمد الیاس الکاندھلوی	،، ۱۳۶۳ھ	دعوۃ المسلمین إلی علو الھمۃ والتطوع فی سبیل الدعوۃ ونشر الدین	جماعۃ التبلیغ	مولانا الیاس اور ان کی دینی دعوت
۱۱	السید سلیمان الندوی	،، ۱۳۷۳ھ	تنوع الاختصاصات، السیرۃ النبویۃ، والتاریخ الاسلامی علم التوحید	سیرۃ النبی، خطبات مدراس، سیرۃ عائشہ، خیام	حیات سلیمان
۱۲	ابو الکلام آزاد	،، ۱۳۷۷ھ	الذکاء النادر الذاکرۃ الواعیۃ حسن التصرف فی المعلومات الأدب الرفیع	ترجمان القرآن، تذکرۃ مقالات الھلال	سوانح مولانا آزاد
۱۳	الشیخ ابو الحسن علی الحسنی الندوی	،، ۱۴۲۰ھ	الذکاء الوقاد، والذاکرۃ النادرۃ، والفکر الاسلامی والدعوۃ الی الاسلام من جدید الغیرۃ علی الحق، الأسالیب المبتکرۃ فی الدعوۃ إلی اللہ الموھبۃ العلمیۃ والأدبیۃ،	ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین، الأرکان الأربعۃ، الصراع بین الفکرۃ الاسلامیۃ والغربیۃ	کاروان زندگی، میر کاروان

ہندوستان کے چند باکمال جن کی نظیر دوسرے ممالک میں مشکل ہے علماء و مشائخ

نمبر	نام	سنہ وفات	خاص وصف	کارنامہ	حالات کا ماخذ
۱	شیخ شرف الدین احمد بن یحیی منیری	سنہ ۷۸۲ھ	حقائق و معارف علوم عالیہ	مکتوبات سہ صدی	اخبار الاخیار
۲	شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ	″ ۱۰۳۴ھ	روحانی کمالات نصرت دین علوم وہبیہ	استیصال الحاد و تحریف	مکتوبات امام ربانی
۳	مولانا عبد الحکیم سیالکوٹی	″ ۱۰۶۸ھ	استحضار مسائل، حل مشکلات، کثرت درس	حاشیہ بیضاوی، حواشی کتب درسیہ	عمل صالح، خلاصۃ الاثر
۴	ملا محمود جونپوری	″ ۱۰۶۲ھ	علوم حکمیہ و ادبیہ میں رسوخ	شمس بازغہ، فرائد	ابجد العلوم، سبحۃ المرجان
۵	شاہ ولی اللہ محدث دہلوی	″ ۱۱۷۶ھ	علوم و مذاہب میں مجتہدانہ نظر	حجۃ اللہ البالغہ، ازالۃ الخفاء	الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف
۶	قاضی ثناء اللہ پانی پتی	″ ۱۲۲۵ھ	رسوخ در فقہ و حدیث	تفسیر مظہری	اتحاف النبلاء
۷	مولانا عبد العلی بحر العلوم لکھنوی	″ ۱۲۲۵ھ	تبحر و قوت تدریس	شرح و حواشی کتب درسیہ	الرسالۃ القطبیۃ
۸	شاہ رفیع الدین دہلوی	″ ۱۲۳۳ھ	تعمق علمی دقت فہم	تکمیل الصناعۃ، اسرار المحبۃ	اتحاف النبلاء
۹	شاہ عبد العزیز دہلوی	″ ۱۲۳۹ھ	جامعیت تبحر علمی	فتح العزیز، فتاوی، تحفہ اثنا عشریہ	نزہۃ الخواطر
۱۰	سید احمد شہید	″ ۱۲۴۶ھ	علو ہمت طریق نبوت سے مناسبت	صراط مستقیم، جہاد فی سبیل اللہ	سیرت احمد شہید
۱۱	مولانا محمد اسمعیل شہید	″ ۱۲۴۶ھ	ذکاوت و استعداد علمی، حمیت و تصلب دینی	تقویۃ الایمان عبقات منصب امامت	″ ″
۱۲	مولانا محمد قاسم نانوتوی	″ ۱۲۹۷ھ	مباحث کلامیہ مضامین نادرۃ	تقریر دلپذیر، آب حیات	سوانح قاسمی
۱۳	مولانا عبد الحی فرنگی محلی	″ ۱۳۰۴ھ	رسوخ در فقہ و حدیث کثرت تصنیف و تالیف	السعایۃ الفوائد البہیۃ	نزہۃ الخواطر
۱۴	نواب سید صدیق حسن بھوپالی	″ ۱۳۰۷ھ	خدمت حدیث، اسلامی علوم کا احیاء	ابجد العلوم، اتحاف النبلاء	″ ″
۱۵	مولانا شبلی نعمانی	″ ۱۳۳۲ھ	علوم اسلامیہ تاریخ و تنقید ادب میں گہری بصیرت اردو کے مثالی انشاء پرداز	سیرۃ النبی، الفاروق، الکلام شعر العجم	حیات شبلی
۱۶	مولانا محمود حسن دیوبندی	″ ۱۳۳۹ھ	بلند ہمتی، غیرت اسلامی، جہاد آزادی	ترجمہ قرآن مجید	نزہۃ الخواطر
۱۷	اکبر الہ آبادی	″ ۱۳۴۰ھ	فطری فلسفی، پاک مشرب صوفی زندہ دل شاعر	کلیات اکبر	اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش
۱۸	مولانا سید عبد الحی	″ ۱۳۴۱ھ	تاریخ میں گہری بصیرت ادب عربی و فارسی میں رسوخ، علمی اشتغال	نزہۃ الخواطر	حیات عبد الحی
۱۹	مولانا انور شاہ کشمیری	″ ۱۳۵۲ھ	ذہانت و ذکاوت تفنن علمی وسیع النظری	فیض الباری، اکفار الملحدین	حیات انور
۲۰	مولانا اشرف علی تھانوی	″ ۱۳۶۲ھ	کثرت افادیت مصلح رسوم و اخلاق کثرت تصنیف و تالیف	بیان القرآن، تربیت السالک	اشرف السوانح
۲۱	مولانا محمد الیاس کاندھلوی	″ ۱۳۶۳ھ	مسلمانوں کو بلند ہمتی اور دینی خدمات کی دعوت	تبلیغی جماعت کا قیام	حضرت مولانا الیاس اور انکی دینی دعوت
۲۲	مولانا سید سلیمان ندوی	″ ۱۳۷۳ھ	علوم اسلامیہ میں تبحر و تعمق اور وسعت معلومات	سیرۃ النبی خطبات مدراس سیر عائشہ، خیام	حیات سلیمان
۲۳	مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندوی	″ ۱۴۲۰ھ	غیرت دینی کی اعلی ترین مثال سیرت و دین کے تحفظ کا فطری امنگ کے ساتھ مسلسل عمل	مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر، تاریخ دعوت و عزیمت	میر کارواں، کاروان زندگی

دنیائے اسلام کے محبوب و محترم

— پروفیسر خورشید احمد۔ مدیر ترجمان القرآن۔ لاہور) —

بیسویں صدی نے ملت اسلامیہ کے جسم وجان پر بہت سے تیشے چلائے اور خصوصیت سے اس کے آخری عشرے میں کشتوں کے پشتے لگ گئے، ایک طرف افغانستان کے جہاد میں بے پناہ قربانیاں دی گئیں فلسطین لہولہان ہے، مسجد اقصیٰ محبوس ومحصور ہے، بوسنیا اور کوسووں میں خون کی ندیاں بہائی گئیں، کشمیر جل رہا ہے اور شیشان میں خون مسلم کی ارزانی حد سے گذر گئی ہے، تو دوسری طرف اس صدی میں اسلامی فکر کی معمار اور اسلامی احیاء کی تاریخ ساز شخصیت ایک ایک کر کے رخصت ہوگئیں۔ چلتے چلتے بھی بیسویں صدی ایک اور چرکا لگا گئی۔ برّاعظم پاک وہند کے صف اول کے دینی رہنماؤں کی آخری نشانی مولانا سیّد ابو الحسن علی ندوی بھی جدا ہوگئے، ۲۲ر رمضان المبارک بروز جمعہ ۳۱ر دسمبر ۱۹۹۹ء نماز جمعہ سے کچھ ہی قبل تلاوت قرآن مجید میں معروف مولانا علی میاں ایک عالم کو سوگوار چھوڑ کر رب حقیقی سے جاملے۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ، آنکھیں اشک بار ہیں، روح مضطرب وافسردہ ہے لیکن دل اللہ کے فیصلے پر مطمئن ہے کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ وَیَبْقٰی وَجْہُ رَبِّکَ ذُوالْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (الرحمٰن ۵۵: ۲۶-۲۸) (ہر چیز جو اس زمین پر ہے فنا ہو جانے والی ہے اور تیرے رب کی جلیل وکریم ذات ہی باقی رہنے والی ہے، پس اے جن وانس، تم اپنے رب کے کن کن کمالات کو جھٹلاؤ گے؟)

مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندوی ۶ر محرم ۱۳۳۲ھ (۵ر دسمبر ۱۹۱۳ء) رائے بریلی یوپی کے ایسے معزز ومحترم خانوادہ سادات میں پیدا ہوئے جو رشد وہدایت اور دعوت وجہاد میں بڑا نام رکھتا تھا، مجاہد ملت حضرت سیّد احمد شہیدؒ کا تعلق اسی خاندان سے تھا۔ علی میاں کے والد اور والدہ دونوں علم وتقویٰ کے اعلیٰ مرتبہ پر تھے آپ کے والد مولانا حکیم عبدالحیؒ رحمۃ اللہ علیہ "نزہۃ الخواطر" کے مؤلف تھے جو پانچ ہزار نامور ہندوستانی مسلمانوں کے تذکرے پر مبنی ایک انسائیکلوپیڈیا ہے، اور "گل رعنا" بھی آپ ہی کی تالیف ہے جو اردو کے نامور شعراء کا پہلا مبسوط تذکرہ ہے۔ مولانا عبدالحیؒ ندوۃ العلماء کے ناظم اور دینی وعلمی حلقوں میں ایک اونچا مقام رکھتے تھے، آپ کی والدہ محترمہ خیر النساء حافظ قرآن اور حسن اخلاق اور تقویٰ وشرافت کا نمونہ تھیں بڑے بھائی ڈاکٹر عبدالعلیؒ والد کے انتقال کے بعد اسکے ناظم تھے۔ علی میاںؒ نے اپنے گھر میں عربی، فارسی اور اردو کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اور پھر ندوہ، دیوبند اور مدرسہ قاسم العلوم لاہور (مولانا احمد علی)، سے علوم دینی کی تحصیل کی ۱۹۳۴ء میں ندوۃ العلماء لکھنؤ میں تدریسی زندگی کا آغاز کیا۔ ۱۹۵۱ء میں ندوہ کے دعوت وتبلیغ اور درس وتدریس کے ذریعہ لاکھوں انسانوں تک اللہ کے دین کو پہنچانے کا فرض ادا کیا، مشرق ومغرب اور عرب وعجم میں یکساں مقبولیت حاصل کی۔ عالم اسلام کے اعلیٰ ترین اعزازات حاصل کئے اور سب سے بڑھ کر دنیا کے ہر گوشے میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے پروانوں کے دلوں میں عزت اور محبت کا مقام پیدا کیا۔ دنیا میں رہے لیکن دنیا کی آلائشوں سے دامن بچائے رکھا دعوت وتبلیغ کو زندگی کا مشن بنایا اور حق یہ ہے کہ حق ادا کردیا۔ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاھَدُوا اللّٰہَ عَلَیْہِ فَمِنْھُمْ مَنْ قَضٰی نَحْبَہٗ۔" (الاحزاب ۳۳-۳۲) ایمان لانے والوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جنھوں نے اللہ سے کئے ہوئے عہد کو سچا کر دکھایا ہے ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا۔

مجھے نصف صدی کے چوٹی کے اہل علم وفضل سے ملنے اور ان سے استفادہ کرنے کی سعادت حاصل رہی ہے لیکن علی میاںؒ ان منتخب بزرگوں میں سے ہیں جن کی شخصیت سب میں منفرد تھی:

آفاق ہا گردیدہ ام
مہر بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام
لیکن تو چیزے دیگری

مولانا علی میاںؒ سے میرا تعارف ان سے بالمشافہ ملاقات سے بہت پہلے ان کی تصانیف کے ذریعے ہوا۔ اسلامی جمعیتہ طلبہ کے اولین دور ہی میں ان کی کتاب "سیرت سیّد احمد شہیدؒ" پڑھی اور اس کتاب سے نہ صرف سید احمد شہیدؒ ہی سے گہرا تعلق قائم ہوا بلکہ خود مولانا علی میاں کی شخصیت بھی دل میں گھر کر گئی۔

مولانا علی میاںؒ کے بڑے عزیز دوست اور ساتھی مولانا مسعود عالم ندوی نے جن سے میرا بہت ہی قریبی تعلق تھا۔ اور جمعیت کے اس دور کے تمام ہی ذمہ داران سے بہت گہرا ربط رکھتے تھے اور وہ بھی ہم سب پر بڑی شفقت فرماتے تھے۔ مولانا علی میاں کی محبت اور عظمت کے نقوش ہمارے دلوں پر مرتسم کر دیئے ان کے علم وفضل ان کی للّٰہیت اور کیفیت عبادت ان کی عربی دانی اور شوق دعوت وتبلیغ، یہ سب دل ودماغ پر نقش ہوگئے۔ ان کی کتاب "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر" جو ان کی شہرۂ آفاق عربی کتاب "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین"

کا اردو ترجمہ تھا پڑھی جس نے فکر و نظر ہی کو جلا بخشی بلکہ روح کو تڑپا اور گرما بھی دیا۔ اس کے بعد مولانا علی میاںؒ کی ہر تحریر بڑے ذوق و شوق سے پڑھی۔ اور اس طرح دل و نگاہ میں ان کی شخصیت کا ایک خاص مقام بن گیا۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور مولانا امین احسن اصلاحیؒ کے بعد میں نے جس شخصیت کی تحریروں سے سب سے زیادہ استفادہ کیا، وہ مولانا علی میاں ہی ہیں۔

مولانا علی میاں سے پہلی ملاقات ۱۹۵۴ء میں لاہور میں ہوئی، میں اس وقت جمعیت کا ناظم اعلیٰ تھا۔ بالمشافہ ملاقات میں ان کو اس ذہنی تصویر سے ہم آہنگ پایا جو ان کی کتب کے مطالعے سے بنائی تھی آخری ملاقات برطانیہ میں ۱۹۹۶ء میں ہوئی، جب وہ اسلامک فاؤنڈیشن میں تشریف لائے اور خطاب فرمایا۔ ہمارے ساتھ خصوصی نشست بھی ہوئی اور پھر اس کے بعد ناٹنگھم میں مسجد دارالعلوم کے افتتاح کی تقریب میں میں نے خرم مراد اور مناظر احسن نے شرکت کی یہ ان سے آخری ملاقات تھی۔ درمیان کے ۴۲ برسوں میں درجنوں بار ان سے ملنے اور استفادہ کرنے کا موقع ملا اور الحمدللہ ان کی شفقت اور ان کے پیار میں اضافہ ہی کا گمان رہا۔ میرے لئے تو استاذ، مربی اور محسن تھے لیکن ان کی عظمت ہے کہ انھوں نے اس طرح کا معاملہ کیا کہ لطف عام بھی لطف خاص کا مزہ دے گا۔

مولانا علی میاں ایک نامور عالم دین، ایک بلند پایہ مصنف اور دانشور، ایک صاحب طرز ادیب، ایک سحر انگیز خطیب اور ایک منفرد مؤرخ اور سیرت نگار تھے لیکن سب سے بڑھ کر وہ ایک داعی، ایک مبلغ، ایک مصلح اور ایک صاحب دل مزکی اور مربی تھے۔ ان تمام اوصاف کے اجتماع نے ان کو بیسویں صدی کے اسلامی احیاء کے معماروں میں ایک درخشاں مقام پر متمکن کیا۔ میں جب بیسویں صدی کی اسلامی فکر کی قوس و قزح پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے ان کا فکر و اسلوب ایک ایسا گلدستہ معلوم ہوتا ہے جس میں اس دور کے کئی اہم مفکرین اور داعیوں کے متفرق پہلوؤں کا اجتماع نظر آتا ہے۔ ان کے یہاں علامہ اقبال کا سوز و گداز، مولانا مودودی کی عقلیت اور تصور دین کی جامعیت علامہ شبلیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کا ذوق تاریخ اور مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا محمد الیاسؒ، مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ اور مولانا محمد زکریاؒ کی روحانیت کا امتزاج نظر آتا ہے۔ علی میاںؒ کے یہاں یہ سب ایک دوسرے کے ناقض نہیں ایک دوسرے کی تکمیل کرنے والے ہیں اور یہی وہ نکتہ ہے جسے ناقدین علم و فن نے نظر انداز کر دیا ہے۔

مولانا علی میاںؒ کا اصل میدان تاریخ اور دعوت ہے، سیرت اور انسان سازی ہے، روح کی بیداری اور امت کی ترقی کے لئے اسلاف کے نمونے کا احیاء ہے۔ ان کے یہاں خانقاہ اور جہاد، تزکیہ اور انقلاب دونوں دھارے ساتھ ساتھ رواں نظر آتے ہیں، کبھی وہ ایک کو نمایاں کرتے ہیں اور کبھی دوسرے کو۔ پہلی تالیف سے (جو ۱۹۳۹ء میں شائع ہونے والی "سیرت سید احمد شہیدؒ" تھی) (تاریخ دعوت و عزیمت) تک تزکیہ اور جہاد کا چولی دامن کا ساتھ باقی رہتا ہے ان کا ذوق اور خاندانی اور دعوتی ماحول جب ان کو "دین کی جدید تعبیر و تفہیم" کے باب میں کچھ خدشات اور خطرات سے دوچار کرتا ہے، اور وہ کچھ تصور اور اسالیب کے بارے میں تردد اور اضطراب کا اظہار کرتے ہیں تب بھی دین اور قوت کے تعلق احیاء اور اقامت کی خواہش اور طلب اسلامی حکومت کے قیام اور غلبے کی تمنا کے اظہار پر اپنے کو مجبور پاتے ہیں "دعوت و عزیمت" کی آخری جلد میں "سیرت سید احمد شہیدؒ" کے پہلے ایڈیشن کی ان عبارتوں کو جوں کا توں رکھتے ہیں جن میں "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحات" کا عکس دیکھا جا سکتا ہے۔ ۱۹۷۷ء میں شائع ہونے والی "سیرت سید احمد شہیدؒ" (سلسلہ تاریخ دعوت و عزیمت) حصہ اول میں کتاب سے اسی مقصد کا اعادہ کیا گیا ہے جو ۱۹۳۶ء میں رقم کیا گیا تھا۔ یعنی "اسلام کی خدمت اور نوع انسانی کی سعادت کا ایک ہی لائحہ عمل ہے جو اس کتاب میں بیان کیا ہے۔ اور وہ وہی ہے جس کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے خلفائے راشدینؓ اور بعض مجددین امت نے عمل کیا۔ یعنی دنیا میں اسلامی شریعت اور خلافت کا صحیح نظام قائم کرنا اور اسلام کے اخلاقی و روحانی، مادی، سیاسی غلبے کی کوشش کرنا" (ص ۲۷) پھر "سید صاحبؒ کی سیرت پر اجمالی نظر کے باب میں دعوت دین کا کام کرنے والے تمام بزرگوں کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے صاف الفاظ میں لکھتے ہیں کہ "نفس کے مجاہدے کے ساتھ کفار سے جہاد" اور "شرعی حکومت" کا قیام اسوۂ رسالت مآبؐ کا جزء لاینفک ہے۔ دعوت اور خدمت کے تمام کام اہم اور لائق تحسین لیکن" "ان سب کے حلقے اور عمل کے دائرے محدود ہیں" اور "سید صاحبؒ نے اس نکتے کو اچھی طرح سمجھا کہ حکومت الٰہی کے قیام اور اسلامی نظام، قوانین و حدود کے اجراء اور ماحول کی تبدیلی کے بغیر یہ سب کوششیں" کوہ کندن و کاہ برآوردن" ثابت ہوں گی" (ص ۵۰-۵۱)

میں نے مولانا مودودی اور مولانا علی میاں دونوں کے افکار اور کارناموں سے خوشہ چینی کی ہے لیکن دونوں کے مزاج اور اسلوب میں جو فرق تھا اسے میں کبھی کبھی اس طرح بیان کرتا ہوں کہ مولانا مودودی انسان کے دماغ کے ذریعے اس کے دل میں اترتے ہیں اور قلب پر چھا جاتے ہیں۔ جبکہ مولانا علی میاں دل کے راستے فکر و نظر کی دنیا میں قدم رکھتے ہیں اور روح کو تازگی فراہم کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اس دور کے مسلمانوں کے ان دونوں محسنوں کو بہترین اجر سے نوازے۔ ان کے درجات بلند کرے اور جو شمعیں انھوں نے روشن کی ہیں وہ ہمیشہ تابندہ رہیں۔ اللہ تعالیٰ مولانا علی میاں کو جنت الفردوس کے اعلیٰ ترین درجات میں جگہ دے۔ آمین

نوٹ: یہ مضمون، مضمون نگار اور مضمون کی اہمیت کے پیش نظر ترتیب میں مقدم تھا مگر طباعت کے وقت ترتیب میں غلطی کی وجہ سے یہ مضمون آخر میں چلا گیا۔ اس لئے مجبوراً مضمون کی تلخیص بھی کرنی پڑی۔ (ادارہ)